آجکل

1946

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
نیپال
ہندوستان
عربستان
مصر
برما
انڈو چائنا

اردو زبان کے مشہور شاعر مولانا عبدالباری آسی لکھنوی (مرحوم)
آپ کی محاسن کلام پر سید اظہار حیدر صاحب کا مقالہ اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۸
سے ملاحظہ کیجئے۔

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی و جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت عہ

ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

تیسرا ایڈیشن قیمت عہ

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے اہلِ ذہنی خوراک ہیں آج ہی آرڈر دیجئے۔ نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب - اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تشریح اور استدلال سے مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال، نماز، روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے کامل ۱۷ حصے بلا جلد پچیس ۲۵ روپے مجلد اکتیس ۳۱ روپے۔

معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب فریڈرک لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔

قیمت مجلد آٹھ روپے

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی

حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گراں مایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے۔

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ

روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو کس خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سیپارے بھی شائع ہوتے ہیں۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اوراق پارینہ

از شیر جنگ ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات۔ غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت عہ

اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ہاروی۔ اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سر انجام دی ہیں یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔

قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات متعلقہ سے اخلاق کے ان جوابات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔

تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ:- **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور**

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۳ | یکم دسمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیرِ اعلیٰ: سید وقار عظیم ایم ـ اے

نائب مدیران: فضل حق قریشی دہلوی — بھگت سروپ ایم ـ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

ادارۂ اقوام متحدہ اور تجاویز الحاق

پچھلے دنوں ادارۂ اقوام متحدہ کے مختلف اجلاسوں میں اس مسئلے پر کہ اور کن کن ملکوں کو ادارے کا رکن بنایا جائے، بڑی گرما گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت ہندوستانی وفد کے اراکین کو حاصل رہی۔ سر مہاراج سنگھ نے جو کئی سال جنوبی افریقہ میں رہنے کے باعث وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں، سختی سے اس امر پر زور دیا کہ جنوبی افریقہ کو ادارۂ مذکور میں ہرگز شامل نہ کیا جائے کیونکہ گذشتہ نصف صدی سے وہاں کی یونین کا رویہ نسلی امتیازات کے ماتحت افریقیوں اور ہندوستانیوں کے خلاف اتنا قابل اعتراض رہا ہے کہ آئندہ اس پر کسی قسم کا اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ اس کے طرز عمل سے ساری دنیا میں فضائے امن و عافیت مکدر ہونے کا احتمال ہے اس لئے منشور کی طے شدہ شرائط کے ماتحت اسے حق رکنیت نہیں دیا جا سکتا۔ بالکل اسی رنگ میں مسز وجے لکشمی پنڈت نے پرتگال کی درخواست رکنیت کی مخالفت کی۔ انھوں نے گوا کی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا کہ نوآبادیات کے سلسلے میں حکومت پرتگال کا طرز عمل بہت برا بلکہ انسانیت سوز رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ اصل باشندگان ملک کو ان کے جائز حقوق سلب کرتے ہوئے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا ہے۔ مسز پنڈت نے یہ بھی کہا کہ پرتگال کے برعکس آئرلینڈ رکنیت کا بہت زیادہ مستحق ہے۔ شروع میں امن پسند ملکوں کی تعریف اس پر عائد نہیں ہوتی تھی کیونکہ اسوقت امن پسند ملک صرف اسی کو سمجھا جاتا تھا جو اتحادیوں کے ساتھ مل کر اعلان جنگ کر دے۔ اب زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ الفاظ کا مفہوم بھی بدل گیا ہے اور آئرلینڈ کو اس کی امن پسند پالیسی کے ماتحت ادارے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مشرق وسطیٰ کے ملک شرق اردن کو بھی جس نے حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے مستحق رکنیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی وفد کے اراکین کی رائے ہے کہ البانیہ کی شمولیت کے مسئلہ پر نظر ثانی کی جائے کیونکہ اس ملک نے دوسری جنگ عظیم میں نازیت و نالسیت کا قلع قمع کرنے میں بڑی قربانیاں پیش کی ہیں۔ افغانستان، آئس لینڈ اور سویڈن کے الحاق کا مسئلہ بھی جنرل اسمبلی میں پیش ہوا اور تمام ملکوں کے نمائندوں نے اظہار مسرت کرتے ہوئے تجاویز کی تائید کی۔

روس میں نئے صنعتی ادارے

سوویت روس کے ماہرین صنعت و اقتصادیات اپنے ملک میں صنعت و حرفت کے پانچ ہزار نو سو ادارے قائم کرنے کے خاکے تیار کر رہے ہیں۔ یہ ادارے ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۰ء والے پنج سالہ خاکے کے ماتحت قائم ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ماہ ایک سو باہر آٹھ گھنٹے کے بعد ایک بڑا کارخانہ کھل جائے گا۔ اس سلسلے میں کوہ یورال کی وادیوں میں بحیرۂ بالٹک کے ساحل کے ساتھ ساتھ لینن گراڈ میں میگنٹو گورسک کے مقام پر اور مشرق بعید میں کوئلے اور مختلف دھاتوں کے نئے مرکز بننے شروع ہو گئے ہیں۔ یوکرین کے بعض علاقوں میں لوہے اور فولاد کے ان پرانے کارخانوں کو جو جنگ میں تباہ ہو گئے تھے نئے سرے سے تعمیر کیا جا رہا ہے کیونکہ موقع و محل کے لحاظ سے وہ مقامات بہت مناسب و موزوں ہیں۔ اسی پنج سالہ خاکہ کے تحت اکیڈیمی آف سائنٹسٹس کے شعبۂ طبعیات و ریاضی کے اراکین سائنسی تحقیقات کا کام بھی شروع کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے مادوں کی نئی خاصیتیں اور ماہیتیں معلوم کرنے کے بعد کوشش کی جائے گی کہ ان سے نت نئی چیزیں تیار کی جا سکیں۔ زمین کی بناوٹ اور اس کے طبقات کی نوعیت پر بھی چھان بین ہوگی تاکہ زیادہ تحقیقات کی مدد سے صنعت و حرفت کے مجوزہ اداروں کو خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکے۔

ایشیائی طلبا کی کانفرنس

کل ہند طلبا کی کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کرسمس کے موقع پر لاہور میں ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں تمام ایشیا اور نوآبادیات کے طلبا شریک ہوں۔ یہ اجلاس تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا اجلاس ہوگا۔ اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ تمام ایشیائی اقوام کے مابین پہلے کی طرح دوستی اور اخوت کا رشتہ قائم ہو جائے اور وہ نوجوان جو سارے ایشیا کو آزاد اور نئی منزل کی طرف گامزن دیکھنا چاہتے ہیں، ایک مشترک نظام کے ماتحت آ جائیں۔ اس سلسلے میں ایک مجلس عاملہ مرتب کر لی گئی ہے جس میں ہندوستان اور انڈونیشیا کے طلبا شامل ہیں۔

جاپان کے مجرمین جنگ

مشرق بعید میں لڑائی ختم ہو جانے کے بعد جب اتحادیوں نے جاپان پر تسلط حاصل کر لیا تو ان لوگوں کی گرفتاری شروع ہوئی جنھوں نے آگ کے شعلے بھڑکائے تھے یا جو اس سلسلے میں ممد و معاون تھے۔ اس وقت سے ابتک ۵۰۸ مجرمین جنگ پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان میں سے ۶۳ رہا کر دئے گئے کیونکہ ان کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا یا ان کے جرم کو زیادہ سنگین نہیں سمجھا گیا۔ ۲۶۰ کو مختلف میعاد کی سزائے قید دی گئی جو اسوقت تاریک کوٹھڑیوں میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ باقی ۱۸۵ کو سزائے موت دی گئی۔ ان میں سے ۱۰۹ اب تک دار پر چڑھ چکے ہیں اور ۷۶ اپنے آخری وقت کے لئے ایک ایک لمحہ گن رہے ہیں۔ ۱۶ اشخاص نے مقدمات کی صعوبتوں اور اس کے ہولناک انجام سے بچنے کے لئے خودکشی کر لی کیونکہ جاپانی روایات کے مطابق خودکشی کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ آج کل ۷۰ مجرموں پر مقدمہ چل رہا ہے۔ ساری دنیا ان کے نتائج کی منتظر ہے۔ ۹۶ مزید مجرموں کی فہرست بن چکی ہے۔ موقع ملتے ہی ان پر بھی مقدمہ شروع کر دیا جائے گا۔

ہندوستان اور امریکہ کے درمیان نیا معاہدہ

۱۴ نومبر کی صبح کو حکومت ہند اور حکومت امریکہ کے مابین فضائی حمل و نقل کے سلسلے میں ایک نیا معاہدہ عمل میں آیا ہے۔ حکومت ہند کی جانب سے پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار عبدالرب نشتر نے اور حکومت امریکہ کی جانب سے جارج میریل اور جارج اے براؤنل نے دستخط کئے۔ معاہدہ تیرہ دفعات پر مشتمل ہے اور اس میں وہ شرائط بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان خاص خاص حصوں میں فضائی حمل و نقل کا سلسلہ قائم ہوگا۔ یہ معاہدہ دراصل اس "برموده" نامی معاہدے سے مشابہ بلکہ اس کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے جو فروری ۱۹۴۶ء میں برطانیہ اور امریکہ کے مابین عمل میں آیا تھا۔ اس میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہوائی جہازوں کے ذریعے لائی اور لیجائی جاسکیں گی، نرخنامے کی وضاحت کی گئی ہے جس کے مطابق دونوں ملکوں کے درمیان محصول وغیرہ وصول ہوا کریں گے۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ پرووژنل انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائزیشن اور انٹرنیشنل ایئر ٹرانسپورٹ ایسوسی ایشن کے جہاز کن اصول و شرائط کے ماتحت کام میں لائے جاسکیں گے۔ ضمیمے میں ان ہوائی راستوں کا ذکر ہے جو اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے جہازوں کو اختیار کرنے پڑا کریں گے۔ عبوری حکومت ہند کی تشکیل بلکہ دوسری جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد یہ پہلا اہم معاہدہ ہے جو ہندوستان نے بین الاقوامی تجارتی اصولوں پر کسی دوسرے ملک سے کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ آئندہ اس عبوری حکومت کی پالیسی ممالک خارجہ کے ساتھ کیا رہا کرے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ معاہدہ ہندوستانی تجارت کے لئے حد درجہ مفید اور ایک خوشگوار مستقبل کا پیش خیمہ ثابت ہوگا خصوصاً آجکل جبکہ دنیا کا ہر ملک دوسرے ملک کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی تدبیریں سوچ رہا ہے یہ موقع ہندوستان کے لئے جسے ابتک بین الاقوامی سیاست میں کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی، بہت ہی غنیمت ہے۔ اصولاً ہندوستان کو فضائی حمل و نقل کا سلسلہ سب سے پہلے مشرق وسطیٰ، ملایا اور چین اور پھر ممالک یورپ کے ساتھ شروع کرنا تھا امریکہ کی باری بعد میں آتی۔ لیکن یہ غیر متوقع صورت زیادہ امید افزا ثابت ہوگی۔ طے شدہ شرائط کے مطابق یہ معاہدہ ایک سال کے نوٹس پر کسی بھی ملک کی طرف سے کالعدم کیا جاسکتا ہے لیکن معمول کے مطابق یہ گنجائش رکھی گئی ہے۔ اسکی نوبت شاید کبھی نہ آئے۔ اگرچہ اسوقت بہت سی دشواریاں حائل ہیں تاہم یہ سلسلہ ایک دو ماہ کے اندر اندر عمل میں آجائے گا۔

بانس سے نقلی ریشم

میسور کے جنگلاتی تحقیقات کے ادارے نے بڑی چھان بین کے بعد معلوم کیا ہے کہ بانس کے ریشوں سے بہترین قسم کا نقلی ریشم تیار کیا جاسکتا ہے۔ ریاست میسور کے جنگل بانسوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے حکومت میسور نے فیصلہ کیا ہے کہ اس قدرتی پیداوار سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے اور آئندہ بانس دوسرے کم اہم کاموں میں صرف نہ کئے جائیں۔ چنانچہ میسور سے سولہ میل کے فاصلے پر کنامبیڈی کے مقام پر نقلی ریشم کاتنے کا ایک بہت بڑا مل قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔ یہ ہندوستان میں اپنی قسم کا پہلا کارخانہ ہوگا نیز ریاست نے ابتک جو بڑے بڑے خاکے مرتب کئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ اہمیت اسی مجوزہ خاکے کو دی جائیگی۔ میسور کا کپڑا اور بہت سی دوسری مصنوعات پہلے سے مشہور ہیں۔ یہ کارخانہ ریاست کی ترقی کی راہ میں ایک اور سنگ میل ثابت ہوگا اور دنیا یہ بھی جان لے گی کہ ہندوستان کے تحقیقاتی ادارے دنیا کے دوسرے ملکوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔

کولمبس سے پہلے

ابتک یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ پرتگال کا مشہور سیاح کرسٹوفر کولمبس پہلے پہل امریکہ پہنچا اور وہی اس نئی دنیا کا محقق ہے۔ لیکن حال ہی میں امریکہ کے ایک ماہر آثاریات مسٹر ایم میلیری نے اس کی تردید کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے بھی پانچو سال پہلے ناروے کے لوگ امریکہ گئے اور انہوں نے نیو فاؤنڈ لینڈ میں خلیج پسٹو لیٹ کے قریب ایک بستی بسائی۔ وہ اس مقام پر قدیم وائکنگ تہذیب کا کھوج لگا رہے ہیں۔ وہ شمال بعید میں خلیج ابیض سے لے کر خلیج پسٹو لیٹ کی طرف روانہ ہوئے اور زمین کا سینہ چیر کر وائکنگ تہذیب کے بہت سے نوادر برآمد کرتے رہے۔ ایک جگہ انھیں نورس تہذیب کے کھنڈر ملے، اور دوسری جگہ ریلے کے قریب پتھر کی انگیٹھی جو نورس قوم کے لوگ استعمال

کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ دسویں صدی میں لیف ایرکسن نامی شخص نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ خلیج لپٹولیٹ کے قریب اپنا ڈیرا جمایا تھا۔ اور ان کے بعد نارو ے کے بہت سے باشندے وہاں جاکر آباد ہوئے تھے۔ کولمبس پندرھویں صدی میں یعنی اس واقع کے پانچسو سال بعد وہاں پہنچا تھا۔

آسٹریا کا گاندھی

آسٹریا کے شہر گراز میں ایک بالکل ننگ دھڑنگ شخص پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا اور نعرے لگاتا ٹاؤن ہال کے سامنے آیا اور ببانگِ دہل کہنے لگا کہ "میں گاندھی ہوں، میں نے آسٹریا کو آزاد کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے"۔ چونکہ اسکی مجنونانہ حرکتوں اور اس قسم کے نعروں سے نقصِ امن کا اندیشہ تھا، اسلئے پولیس نے فوراً اسے گرفتار کر لیا۔

امریکہ میں ایٹم بموں کا ذخیرہ

امریکہ میں جو ایٹم بم بڑی تیزی سے تیار ہو رہے ہیں، ان کی ساخت اور تعداد کے متعلق چند دلچسپ حالات اور اعداد و شمار معلوم ہوئے ہیں۔ سوا سال سے زیادہ عرصہ گذرا۔ سب سے پہلا ایٹم بم ناگاساکی میں پھٹا تھا۔ اس کے بعد امریکی کارخانے اوسطاً چھ بم ہر ماہ بناتے رہے۔ اس دوران میں دو بم بکینی کے تجربات میں استعمال ہو گئے۔ ان کو نکال کر اسوقت امریکہ کے پاس ۹۶ بموں کا ذخیرہ ہونا چاہیئے جنکا وزن کم و بیش نو ہزار پونڈ ہوگا۔ ہر بم کا طول پچیس فٹ ہوتا ہے۔ اب جو بم تیار ہو رہے ہیں ان میں پلوٹونیم نامی مادّہ استعمال ہو رہا ہے جو بھڑک کر پھٹنے میں یورینیم سے بھی زیادہ تیز ہوتا ہے۔ ہر بم کا وزن ۱۱۲ من کے قریب اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی ساخت میں بندوق کی طرح دو وسیع نالیاں اور بہت سے پرزے فولاد کے ہوتے ہیں۔ سیسے کے دو دبیز خول ان کے علاوہ ہیں۔ یہ خول اس لئے ہوتے ہیں کہ آتش گیر مادّے کی تابانی بم پھینکنے والے جہازوں میں بیٹھنے والے لوگوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ ان سمیت بم کی گولائی کا قطر دو فٹ سے کسیقدر کم ہوتا ہے۔ یورینیم والا وہ بم جس نے ہیروشیما کے اسّی ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، سطح زمین سے ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پھٹا تھا۔ یہ بلندی زیادہ تباہ کاری کے لئے ضروری تھی۔ چنانچہ دوسرا بم جس میں یورینیم کی بجائے پلوٹونیم تھا اور جو ناگاساکی پر پھینکا گیا، چھتری ٹوٹ جانے کے باعث زیادہ تیزی سے زمین کی طرف گرا اور عین زمین پر یا اس سے کچھ اوپر پھٹا جس کے باعث کچھ زیادہ تباہ کاری نہ پھیل سکی۔ اگر وہ بھی ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پھٹتا تو ہیروشیما سے زیادہ وہاں نقصان ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ سطح زمین سے کچھ بلندی پر پھٹنے کی صورت میں آتشگیر مادّے کا دھماکا اور دھچکا بہت ہی شدید ہوتا ہے۔ زمین پر آکر یہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔

بچۂ غزال

گذشتہ موسم سرما میں صحرائے شام سے ایک طفل انسان پکڑا گیا جسے اس اعتبار سے "بچۂ غزال" کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پرورش صحرا کے ہرنوں کے جھرمٹ میں ہوئی تھی۔ ایک عورت نے اسے اچھی طرح پہچان لینے کے بعد کہا کہ وہ میرا بچہ ہے۔ اس نے بیان کیا کہ ایک بار میں دمشق اور بغداد کے درمیان صحرا کو اونٹ کے ذریعہ عبور کر رہی تھی کہ بچہ گم ہو گیا۔ میں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر باقی نہ رکھی لیکن ناکام رہی۔ بچہ ہسپتال میں مشہور معالجوں کے سپرد ہے۔ وہ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح اس کی بربریت ختم ہو اور وہ انسانوں میں رہ کر انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھ جائے مگر ابھی تک کوششیں بار آور نہیں ہو سکی ہیں وہ اب بھی گھاس خوش ہو کر کھاتا اور ہرنوں کی طرح حرکتیں کرتا اور انہی کی طرح بولتا ہے۔ تاہم کچھ نہ ملنے پر بادل ناخواستہ کچا گوشت یا دوسری سبزیاں کھا لیتا ہے۔ پکی ہوئی کسی چیز پر منہ نہیں ڈالتا۔ کبھی کبھی آدمیوں کی طرح بولنے کی کوشش بھی کرتا ہے مگر زبان صحیح لب و لہجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ گرفتاری کے بعد سے یہ بچہ زیادہ موٹا ہونے لگا ہے اور وزن بھی بقدر ستر پونڈ بڑھ گیا ہے۔ تین بار وہ ہسپتال سے نکل بھاگا اور بمشکل ہاتھ آسکا۔ ایک بار دو موٹر گاڑیوں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کی رفتار تیس میل فی گھنٹہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس میل فی گھنٹہ سے بھی زیادہ دوڑ سکتا ہے۔ بہرحال کوشش کی جا رہی ہے کہ اس کو کسی طرح انسان بنا لیا جائے۔

سانحات ارتحال

صاحبزادہ محمد عمر

ادبی حلقوں میں خصوصاً ڈراما اور تھیٹر سے ذوق رکھنے والوں پر یہ سن کر سخت رنج و غم کی کیفیت طاری ہو جائے گی کہ صاحبزادہ محمد عمر کچھ عرصے جدا رہنے کے بعد اپنے جگری دوست اور ادبی ہمنوا یعنی نور الٰہی مرحوم کے ساتھ عالم بقا میں جا ملے۔ ان دونوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ "ناٹک ساگر" اردو ادب میں ایک غیر فانی تصنیف ہے۔ صاحبزادے صاحب نے اپنے ساتھی کے بعد بہت سے ڈرامے اور ادبی مضمون بھی لکھے ہیں۔ انکی بلندپایہ شخصیت اور انکی ادبی خدمات کے سلسلے میں ایک مفصل مضمون انکی تصویر کے ساتھ کسی آئندہ شمارے میں شائع کیا جائیگا۔ ادارہ آجکل کو اس حسرتناک وفات پر سخت افسوس اور مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

پنڈت مالویہ جی

نہایت افسوس کیساتھ یہ خبر سننے میں آئی کہ بروز منگل بتاریخ ۱۲ نومبر ۱۹۴۶ء بوقت شام چار بجکر تیرہ منٹ پر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کا انتقال ہو گیا اسوقت بنارس کی ہندو یونیورسٹی کے علاقے میں وہ اپنی قیامگاہ پر زیر علاج تھے انکی بلندپایہ شخصیت اور انکی تعلیمی خدمات کے سلسلے میں ایک مفصل مضمون ان کی تصویر کے ساتھ کسی آئندہ شمارے میں شائع کیا جائیگا۔ ادارہ آجکل کو اس حسرتناک وفات پر سخت افسوس اور آنجہانی کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے۔

تبرکات

آسی لکھنوی

جذبۂ بے اختیارِ شوق کام آ ہی گیا — آتے آتے مجھکو ان کا پورا نام آ ہی گیا
زد میں مستقبل کے ماضی کا نظام آ ہی گیا — صبحِ ناکامی پہ غالب رنگِ شام آ ہی گیا
پھر بھی میرے دیدۂ دیدار جو کا کیا علاج — فرض کر لیجے کہ ان کا اک سلام آ ہی گیا
اب محبّت ہی محبّت ہے نہ ہم ہیں اور نہ تم — جسکے آگے کچھ نہیں ہے وہ مقام آ ہی گیا
کروٹیں لینے لگی بزمِ مسرت کی زمیں — اُٹھئے جلد اُٹھئے کہ ہنگامِ قیام آ ہی گیا
کیا وہ ہو سکتا ہے میرے شوقِ پیہم کا بدل — میں نے یہ مانا کہ ان کا اک سلام آ ہی گیا

ضبط کرتا ہوں مگر دیوانگی دیوانگی
کیا کروں گا پھر جو لب پر انکا نام آ ہی گیا

(نا تمام)

ازل کے دن سے ہیں اہلِ محبّت نوحہ خواں ابتک — مگر اپنی جگہ پر ہیں زمین و آسماں اب تک
ہے معمور انقلابوں سے فضائے گلستاں اب تک — کچھ اُجڑے کچھ جلے کچھ بن رہے ہیں آشیاں اب تک
کبھی اک شمعِ امیدِ وفا میں نے جلائی تھی — اسی رخ پر چلی آتی ہیں لاکھوں آندھیاں اب تک
زمینِ کوچۂ قاتل سے اے حشر اُٹھ کے آیا ہوں — میری آنکھوں میں ہے کیفیتِ خوابِ گراں اب تک
سحر کو ناز سے کس نے درِ دل پر قدم رکھا — فضا میں گونجتے ہیں نغمۂ قدوسیاں اب تک
سحر کو ڈھونڈتا ہوں ہستیاں دورِ شبانہ کی — کہیں ساقی نہ کہہ بیٹھے کہ غائب تھے کہاں اب تک
نہ شمعیں ہیں نہ محفل ہے نہ کوئی سننے والا ہے — مگر ہم ہیں کہ بیٹھے کہہ رہے ہیں داستاں اب تک
ادھر امیدِ مستقبل کا دل میں موجزن طوفاں — ادھر لاکھوں سوالوں پر نہیں ابتک نہ ہاں اب تک

نہیں یہ غم کہ چھینے اس نے جذباتِ شباب آسی
بڑا افسوس تو یہ ہے کہ دنیا ہے جواں اب تک

آسی لکھنوی

سیّد اظہار حسین

ہر ادب کی تاریخ میں ایک ایسا بھی زمانہ آتا ہے جب عوام کا مذاق انتہائی پستی کی طرف مائل ہوتا ہے چنانچہ اردو ادب کی تاریخ میں غالباً یہ زمانہ غدر اور انیسویں صدی کے اواخر تک کا ہے۔ درحقیقت اس زمانہ میں عوام کا مذاق اتنا سوقیانہ اور بازاری تھا کہ شرفاء نے غزل کو دور سے سلام کر لیا تھا۔ دماغوں میں زہر لبا تھا۔ کان زہر عشق اور دیوان جان صاحب کے نغموں سے گونج رہے تھے مختصر یہ کہ شعریت کی فضا مسموم تھی۔ لیکن انیسویں صدی کی آخری چوتھائی صدی میں کچھ حساس افراد عوام کے مذاق کو سدھارنے کے لئے اٹھے جنھوں نے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ ان افراد کا ذکر ادب کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے ہر عہد کا ادبی مبصر ان حضرات کے ادبی کارناموں پر نذر عقیدت پیش کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان حضرات کی حیثیت سنگ راہ کی سی ہے۔ آج اس گروہ کے چند افراد ہم میں باقی رہ گئے ہیں اور زیادہ تر افراد ایک ایک کرکے داغ مفارقت دیتے جا رہے ہیں۔ کچھ افراد آج بھی ہم میں موجود ہیں لیکن ان کی موت اور زندگی میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ اب ان میں زمانہ کے ساتھ چلنے کی طاقت اور صلاحیت ہی نہیں باقی رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی آواز شکست خوردہ ذہنیت کی غمازی کر رہی ہے۔ لیکن افسوس ان ہستیوں کے اٹھ جانیکا ہے جن میں ابھی زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود تھی اور جن کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہمارے درمیان سے اٹھا لیا۔ مولانا آسی مرحوم کا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن میں زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔

مولانا عبدالباری آسی موضع اُلدن تحصیل ہاپوڑ ضلع میرٹھ میں ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی تہذیب و تمدن کی روشنی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ اور مغربیت اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی، پھر بھی شرفاء کے گھرانوں میں غدر سے قبل کا اچھا خاصہ ماحول دیکھنے میں آ جاتا تھا۔ آسی اسی ماحول کے پروردہ اور پرداختہ تھے۔ پندرہ برس کی عمر میں آسی نے رائج الوقت فارسی اور عربی نصاب ختم کرکے حدیث و فقہ کی کتابوں کا استفادہ شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد طب اور حکمت کا مطالعہ شروع کیا۔ اسی زمانہ میں حکیم نواب جان کی فنی علمیت کا چرچا ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ مولانا آسی نے انکی فاضل استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ لائق شاگرد کی ذکاوت اور بڑھتی ہوئی قابلیت نے شفیق استاد کے دل میں گھر کیا چنانچہ آسی تھوڑے ہی عرصے کے بعد نسخہ نویسی کے اعزازی عہدہ پر مامور ہوئے۔ آسی کی ذہنیت کی تشکیل کچھ اس طرح کی ہوئی تھی کہ دیکھنے والا کچھ دیر کے لئے کشمکش و تذبذب میں ضرور پڑ جاتا ہے۔ یکرنگی اور یکسانیت کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کار تلون مزاجی کے پیہم تقاضوں سے تنگ آ کر ۱۹۰۸ء میں شاہجہاں پور کے انگریزی اسکول میں فارسی ٹیچر ہو گئے۔ اسکول کی زندگی کچھ دنوں کے لئے قابل توجہ تو ضرور رہی لیکن یہاں بھی وہ ذہنی آسودگی جس کی تلاش تھی نہ نصیب ہو سکی۔ لہٰذا کچھ عرصے کے بعد اسکول کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر جہان آباد کا رخ کیا۔ اسی زمانہ میں مولانا محمد علی دلی سے "ہمدرد" نکال رہے تھے۔ مولانا آسی ہمدرد کے ادارہ میں شامل ہو کر مشہور صحافت نگار جالب دہلوی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہندوستان کی سیاسی حالت نے کروٹ لی اور ہمدرد کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ آخر کار دلی سے دل برداشتہ ہو کر آسی نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ شام اودھ کی اجڑی ہوئی بہار اس نووارد کی نظر میں ایسی سمائی کہ نہ صرف مرتے دم تک اسکا دم بھرتا رہا بلکہ مرنے کے بعد بھی یہیں کا پیوند خاک ہوا ——— ظاہر ہے کہ جس شخص کی زندگی قنوطیت اور رجائیت کا حسین امتزاج ہو اس کی شاعری کسی ترغیب یا تشویش کی کیسے ممنون ہوگی۔ غالباً ۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے کہ آسی کہیں جا رہے تھے کہ اثناء راہ میں یہ شعر موزوں ہو گیا۔ ؎

ارے تم نے زخمی کیا دل ہمارا ؛ بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

اس کے بعد سلسلہ مشق جاری رہا۔

آسی نے آنکھ کھولی تو داغ، امیر اور جلال کو قریب پایا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شاگرد داغ کے تھے لیکن تقلید اور انتخابیت نے ان کو امیر سے زیادہ نزدیک کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی ناسخ کے رنگ میں طبع آزمائی کی۔ کبھی حالی کے طرز پر اشعار موزوں کئے اور اسی طرح کبھی کبھی داغ کے رنگ میں رنگین اور روزمرہ میں ڈوبے ہوئے اشعار کہے۔ کہیں کہیں پر غالب کی پیروی میں فارسی تراکیب کو اپنے اشعار میں قصداً جگہ دی۔ آسی نے اگر کبھی اپنی شاعری کو ابہام سے زینت بخشی تو صنائع لفظی کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفہ اور تصوف کو ثانوی سے زیادہ اہمیت نہ دے سکے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی رنگ کی غمازی کر رہے ہیں۔ ؎

عہد وفائے دوست سجا لیکن اے ندیم
کیونکر کہوں کہ بھول گیا آسماں مجھے

ہمیں ناواقف رسم چمن تھے اے قفس والو!
فلک سے عہد لیتے تو فکر آشیاں کرتے

دشمت عدم سے وحشت لائی ہے سوئے ہستی

دونوں جہاں ہمارے روندے ہوئے پڑے ہیں

چھوڑا ہی کیا ہے لوٹنے والوں نے میرے پاس

اک زندگی ہے سو وہ کوئی دن کی اور ہے

سمجھ تو لی ہے دنیا کی حقیقت ❊ مگر اب اپنا دل بہلا رہا ہوں

آسی کے نزدیک شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو مگر ندرت بیان اور جوش کلام اس میں پایا جانا لازمی ہے۔" شعریت کے متعلق اتنا قابلِ تعریف نظریہ رکھنے کے باوجود بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسی خود اس نظریہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ چنانچہ کچھ غزلوں میں وہ سپردگی اور خود رفتگی نہیں ہے جو تغزل کی اصلی جان ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک ٹھہری اور سنبھلی ہوئی دردمندی انکے اشعار میں ملتی ہے جس سے ہر صاحبِ ذوق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کے اشعار میں نہ کہیں سستے قسم کی جذبات نگاری ملتی ہے نہ جھچھورے انداز کی معاملہ بندی۔ الفاظ کا صحیح اور برمحل استعمال۔ محاوروں اور فقروں کی برجستگی اور بے ساختگی۔ تخیل کی بلندی، اور لب و لہجہ کی متانت ہے۔ ان کی شاعری میں رنگینی اور دلکشی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آسی کے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جو رچے ہوئے ذوقِ جمال کا پتہ نہ دیتی ہو۔ آسی کی شاعری جملہ خصوصیات کی حامل تو ضرور ہے لیکن ایک بات قاری کے ذہن میں رہ رہ کر کھٹکتی ہے۔ یعنی ان کی شاعری میں اس محویت کا مطلق احساس نہیں ہوتا جو دوسروں کو بھی محو کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کا کم و بیش دل پر وہی اثر ہوتا ہے جو گذرے ہوئے زمانہ کی دھندلی یادوں سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آسی کا ایک شعر جس میں انتہائے بیخودی کی تصویر کشی کی ہے پیش کرتا ہوں یہ شعر ان کی مشاقی اور آرٹ کا اچھا نمونہ ہے!!! ؎

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھکو

میں نے اوروں سے سُنا ہے کہ پریشاں ہوں میں

یا دوسری جگہ محویت کا نقشہ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے ؎

ایسا بھی اتفاق مجھے بارہا ہوا ❊ اُن سے ملا ہوں انکا پتہ پوچھتا ہوا

اسی ضمن میں چند اشعار اور پیش کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

اس سال فصلِ گل میں جڑا تھا بختِ تمیز ❊ رہتا تو آشیاں کو اب ایک سال ہوتا

متاعِ زندگی کے دینے والے یہ تو سمجھا دے ❊ کہ اتنا بوجھ سر پر رکھ کے لیجانا کہاں ہوگا

شوخیاں معمورۂ ہستی کی حد سے بڑھ چلیں ❊ پھینکدوں دو چار ذرّے اپنے ویرانے کے کیا

کہیں سے ڈھونڈھ کے لائے ہیں بھی لائے گل تر ❊ وہ زندگی جو گذر جائے مسکرانے میں

آسی کی شخصیت ان کی شاعری میں نمایاں طور سے جھلکتی ہے انھوں نے غمِ دوراں اور غمِ جاناں کو غزل میں اس طرح سمویا کہ ان کے بعد مستقل طور سے دوسرے شاعروں نے بھی اسکا اظہار بڑے شد و مد کے ساتھ کیا۔ آسی کا آرٹ اس مقام پر انتہائی کمال پر پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ؎

دیکھکر اہلِ جہاں کی بے رُخی تیرے بغیر ❊ ہنس رہا ہوں آج اپنی بیکسی پر تیرے بغیر

آزردہ ہے افسردہ ہے حیراں ہی رہے ہم ❊ تم مل بھی گئے پھر بھی پریشاں ہی رہے ہم

دورِ گذشتہ بھی یونہی گذرا ہے اے ہمدم ❊ بنا رکھی تھی اک صورتِ خوشی کی شادماں کیا تھا

آسی کی زندگی فانی کی طرح غم و الم کا مجموعہ تو نہ تھی لیکن اتنا ضرور ہے کہ آسی کو بھی قدرت نے ایک دکھا ہوا دل عطا کیا تھا۔ فانی کی شاعری میں عیشِ غم بھی ہے اور عرفانِ غم بھی۔ آسی میں زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اگر یہ صلاحیت ان سے چھین لی جاتی تو ان کی شاعری میں عوام کا دُکھ درد نہ ملتا بلکہ شخصی اور ذاتی غم کا عنصر غالب ہوتا۔ آسی نے بالکل غیر شعوری طور پر عوام کے دکھ درد کے احساس کا غزل میں تجزیہ کیا۔ چنانچہ بعض مقامات پر آسی کے لہجے میں متانت کم اور تلخی کے ساتھ ساتھ جھلاہٹ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ایک ہلکی افسردگی ایک میٹھا درد اور ایک خاموش الم ملتا ہے۔ آسی زندگی کے حوادث سے کھیلتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ حالانکہ اس کی زندگی میں کئی بار خونی ڈرامے کھیلے جا چکے ہیں لیکن وہ زندگی سے ہراساں یا مغرور نہ ہوا۔ چنانچہ اسی ذہنیت کا عکس آئینۂ تغزل میں ملاحظہ ہو:-

رہا برقِ تپاں سے سابقہ تقدیر میں اتنا ❊ کہ اب اپنا نشیمن ہم بناتے ہیں شراروں میں

جا سکون زندگانی میری قسمت میں نہ ڈھونڈھ ❊ ٹھوکریں کھائیں یہاں میں نے عمر بھر تیرے لئے

غموں کے غم پھیلے پڑتے ہیں ایامِ جوانی میں ❊ اضافے ہو رہے ہیں واقعاتِ زندگانی میں

دفا زُبَینی/ ذوقِ تپش کی قدر کرتی ہی ❊ وہ پھولوں میں کہاں جو بات پاتا ہوں شراروں میں

آسی حریمِ حسن میں بھی اپنی خودداری پر نگاہ رکھتا ہے اس کی نگاہیں حسن و عشق کی قدر و منزلت سے بخوبی آشنا معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ محبوب کی نگاہِ التفات اس کی پریشاں حالی کو دور کرنے کے بجائے رگِ احساس پر نشتر کا کام کرتی ہیں۔ آسی نے شاید نقاد کی نگاہ سے حسن و عشق کی واردات کا جائزہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کا پیامِ شوق دیدۂ دیدار جو کی تسکین کا ساماں فراہم کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح اس کے شوقِ پیہم کا بدل محبوب کا ایک سلام کسی حالت میں رد نہیں ہو سکتا۔ ؎

پھر بھی میرے دیدۂ دیدار جو کا کیا علاج ❊ فرض کر لیجئے کہ اُن کا اک سلام آ ہی گیا

کیا وہ ہو سکتا ہے میرے شوقِ پیہم کا بدل ❊ میں نے یہ مانا کہ انکا اک سلام آ ہی گیا

اب ہم آسی کے اس کلام کی طرف متوجہ ہونا چاہتے ہیں جس پر متقدمین خصوصاً میر و درد کا نرم اور پرگداز تغزل چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ آسی کے ان

اشعار کو پڑھنے کے بعد جن میں میرؔ کا تتبع کیا ہے۔ قاری کا ذہن نامعلوم راہوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسیؔ خود انھیں لوگوں میں مل جل گئے ہیں۔ آسیؔ کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاعر کا کام قدیم رسوم و روایات کو اپنے اندر جذب کر کے محفوظ رکھنا ہے بشرطیکہ ان روایات و رسوم میں جذب ہونے کی صلاحیت ہو۔ شاعر کا فرض یہ ہے کہ ادب اور زندگی کے روایات میں سے ان عناصر کو لے جو زمانی اور مکانی حیثیت سے محدود نہ ہوں یعنی جن کی ہمہ گیری مسلّم ہے۔ شاعر اور نقاد دونوں کی نظر ادب کے ان اجزاء پر ہونا چاہیئے جن میں بقاء و ارتقاء کی صلاحیت موجود ہو۔ آسیؔ نے یہی کیا ہے۔ انھوں نے پرانے اسالیب و صور کو اختیار کر کے نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ان کو از سر نو ترتیب دیکر ان کے اندر نئے امکانات پیدا کئے۔ آسیؔ کی زبان اگرچہ میرؔ۔ دردؔ اور سوداؔ کے مقابلہ میں زیادہ سلجھی ہوئی اور شستہ ہے لیکن اس میں دردمندی۔ دل برشتگی اور سوز و گداز کافی حد تک ویسا ہی عاشقانہ انفعال اور خود گداشتگی ہے جو غزل کی اصل جان ہے اور جو میرؔ۔ دردؔ کا مخصوص انداز ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کچھ ان کو ہمارا پاس نہیں جو چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں
ہم سنتے ہیں سر دھنتے ہیں منہ تکتے ہیں رہ جاتے ہیں

بیتاب سا پھرتا ہے کئی روز سے آسیؔ ٭ بیچارے نے پھر تمکو کہیں دیکھ لیا ہے
کھل گیا دنیا پہ رازِ حسن و عشق ٭ وہ ہنسے مجھکو پسینہ آگیا

میرؔ اور دردؔ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر چھوٹی چھوٹی سادہ اور شگفتہ بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں بجائے خود وہ گداز اور بے ساختہ پن ہوتا ہے جسکا دوسرا نام تغزل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آسیؔ کو بھی انھیں اکابرین متغزلین کی طرح چھوٹی اور دلآویز بحروں کے ساتھ خاص اُنس ہے جس میں انھوں نے بھی بڑے پُر تاثیر اشعار کہے ہیں۔ آسیؔ کی اگر انھیں غزلوں کو پڑھا جائے تو بالکل متقدمین کے رنگ کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ کچھ اشعار سنئے ؎

مرا حال پوچھا مری بات مانی ٭ توجہ، عنایت، کرم، مہربانی
نظر نیچی عرق آیا ہوا سا ٭ ملا بھی وہ تو شرمایا ہوا سا
بہار آتی ہے اور میں ڈر رہا ہوں ٭ کہ اکثر مجھکو راس آتی نہیں ہے
حالِ دل اور ایک لمبی سانس ٭ ایسا حال اتنا مختصر، توبہ!!!

آسیؔ ایک زبردست قوت آخذہ کے مالک تھے اور جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان کی سب سے بڑی انفرادی خصوصیت تقلید اور انتخابیت ہے یعنی دوسرے کے اثرات کو اخذ اور قبول کرنیکا خاص ملکہ تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ غزل میں ہر رنگ کے اشعار ہوتے تھے کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ آسیؔ انتخاب اور تقلید کی طرف فطرتاً مائل نظر آتے ہیں۔ اس سے ان کو فائدہ بھی پہنچا اور نقصان بھی۔ فائدہ تو یہ پہنچا کہ متقدمین کے رنگ کو اپنے کلام میں اسقدر جذب کر لیا ہے کہ وہ گویا ان کا اپنا رنگ ہے مگر آسیؔ نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اپنے وقت کی خصوصیات اور میلانات پر بھی نظر رکھی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دنیا میں ان کا مرتبہ دوسرے معاصرین سے بہت بلند رہا، لیکن تقلید بجائے خود کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں۔ اسی تقلید نے اردو شاعری کے مزاج کو خراب کیا تھا۔ اسی تقلید سے آسیؔ کو بھی نقصان پہنچا یعنی زمانہ سازی کی غرض سے بعض اوقات انھوں نے اپنی قوت ضائع کی۔ بعض اوقات ایسا رنگ بھی اختیار کرنا پڑا جس سے ان کو کوئی طبعی مناسبت نہ تھی۔ مثلاً جہاں آسیؔ نے میرؔ۔ سوزؔ۔ دردؔ وغیرہ کے رنگ کی تقلید کی ہے وہیں سوداؔ کی بھی تقلید کچھ کم نہیں کی ہے اور اکثر سنگلاخ زمینوں میں مرکب اور طویل ردیفوں کے ساتھ غزلیں لکھی ہیں۔ جس میں صرف تکلف اور تصنع برتا جاسکتا ہے اور تغزل کو کسی صورت سے نباہا بھی نہیں جاسکتا ؎

اُف وہ آغاز محبت کی نگاہِ مدہوش ٭ ہمہ آفت ہمہ غارت ہمہ طوفاں ہمہ جوش
اسطرف وہ نگہ ہوش ربا بادہ فروش ٭ اسطرف ذوق وفا مینا بہ کف ایماں بردوش
وعدۂ دوست ہے تاریکیٔ مستقبل میں ٭ اور میرے عالمِ حیرت میں نہ فردا ہے نہ دوش

یہ آسیؔ کی قادر الکلامی تھی جس نے ایسی سنگلاخ زمین پر تغزل کے سوتے بہا دئے۔ آسیؔ کے دیوان میں ایسی غزلیں بھی کافی تعداد میں ہیں جن کے لطف کا دار و مدار ردیفوں پر ہے اور جو اپنے اندر پوری غزلیت رکھتی ہیں۔

آسیؔ کی شاعری میں دہلوی اور لکھنوی دونوں دبستانوں کی خصوصیات شاعری باہم دست و گریباں نظر آتی ہیں اور وہ بیچارے کفر و ایمان کی کشاکش میں بری طرح مبتلا دکھائی دیتے ہیں، اپنی شخصیت اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے شعراء اردو میں آسیؔ بالکل اکیلے ہیں وہ بیک وقت ماضی کی یادگار، حال کی کشاکش میں مبتلا اور مستقبل کے میلانات کا اشاریہ ہیں۔ متقدمین کے گائے ہوئے راگ نہ صرف ان کے کانوں میں بلکہ ان کی ہستی کی ایک ایک تہ میں گونج رہے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود ان کے زمانہ میں دوسرے راگوں کی مانگ تھی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک لطیف اور پُر کیف قسم کی انتخابیت یا ہم آہنگی تھی جو آسیؔ کے دم سے شروع ہوئی اور انھیں پر ختم ہوگئی۔ آج کا نقاد یہ ماننے پر مجبور ہے کہ آسیؔ ہی نے اپنی غزلوں میں اپنے لطیف اور نازک احساسات۔ اپنے شاعرانہ خلوص۔ اپنے شیریں تغزل۔ اپنے سُبک ترنم اور اپنی مدھم مگر دلنشیں آواز کی ترجمانی کی ہے ٭

ہندوستان کی مشترک تہذیب

۲

عابد حسین

یہ ہے آجکل کے روشن خیال ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی مذہبی تصورات کا عکس جو ہمیں ٹیگور اور اقبال کے خیالات کے آئینے میں نظر آتا ہے۔ ان تصورات میں جو فرق ہے وہ دونوں فرقوں کے مذہبی ادارات، رسوم و عبادات اور مذہبی قوانین کے اختلاف میں اور بھی زیادہ نمایاں ہے۔ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے آجکل تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی ریاستیں موجود نہیں ہیں جن میں مقابلہ کیا جا سکے۔ لیکن تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جو ریاستیں عہد قدیم میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مذہب کی بنا پر تعمیر کی تھیں وہ بہت مختلف تھیں اور آج بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی ریاست کے تصورات ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔

غرض جذبات اور مصلحتوں کو چھوڑ کر معروضی علمی نظر سے دیکھا جائے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے دھارے جہاں وہ مذہب کے سرچشموں سے نکلتے ہیں ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ خود ان مذہبوں کے سوتے ایک عظیم الشان خزانے سے نکلے ہیں، جو سطح کے نیچے ایک بحر بے کنار کی صورت میں موجزن ہے۔ لیکن اس وحدت کا احساس صرف ایک صوفی کو مراقبے کی گہرائیوں میں ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایک کیفیت کے طور پر، جو چھلاوے کی طرح دل میں جھلک کر چھپ جاتی ہے اور ذہن اس کو پکڑنا چاہے تو ہاتھ نہیں آتی۔ البتہ جب ان دھاروں کو زمانے کی ہوائیں اس طرح بہاتی ہیں کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تو تاریخ اور جغرافیے کی متحدہ قوتیں ان کو ملا کر ایک عظیم الشان دریا بنانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ اب ہم کو دیکھنا ہے کہ اس کوشش کا نتیجہ اس وقت تک کیا نکلا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے ذہنی عناصر سے قطع نظر کر کے بنیادی عناصر پر نظر ڈالی جائے تو یہ دکھائی دیگا کہ جو اشتراک عہد مغلیہ کی ہندوستانی تہذیب نے ان میں پیدا کیا تھا وہ ناسازگار حالات کے باوجود بہت جگہ اب تک باقی ہے اور اس کے علاوہ جدیدیت کے اثرات نے جو مغرب سے آئے ہیں اشتراک کی نئی صورتیں نکالی ہیں۔ مثلاً اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نظام اخلاق کا مذہبی اساس مختلف ہے لیکن زمان و مکان کے حالات نے اسکے مقررن مظاہر یعنی دونوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ مجموعی طور پر دونوں ایک سی اخلاقی خوبیاں اور خامیاں رکھتے ہیں۔ اسکے لئے دو مثالیں کافی ہوں گی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہاں خدا کی محبت اور عبادات کے بعد سب سے بڑی قدر خلق خدا کی محبت سمجھی جاتی ہے۔ ایثار، خدمت، خیرات، صلہ رحم، مہمان نوازی۔ غرض وہ سب صفات جن سے انسانی محبت ظاہر ہوتی ہے، دونوں کے ضابطۂ اخلاق میں بڑا اونچا درجہ رکھتی ہیں، اور یہ دونوں کے ہاں زمانۂ انحطاط میں یہ چیزیں عموماً اپنے صحیح مصرف سے ہٹ کر غلط طریقے پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ ایثار خدمت اور مہمان نوازی استحصال کا تختۂ مشق ہو کر رہ گئی ہے۔ خیرات پیشہ ور گداگروں کو پیدا کرنے کا بہانہ بن گئی ہے۔ صلۂ رحم نے عزیز نوازی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ مروت یعنی ہمدردی کی ایک مستقل اور عام کیفیت جو ہندوستانیوں کی عام صفت سمجھی جاتی تھی ایک مہلک اخلاقی کمزوری بن گئی ہے جو انسان کی اخلاقی جرأت کو فنا کر دیتی ہے اور اسے موم کی ناک بنا دیتی ہے، جس کو ہر شخص جدھر چاہتا ہے موڑ لیتا ہے۔ اسی طرح عفت اور پاکبازی، خصوصاً جنسی ضبط نفس کو بھی ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے ہندوستانیوں کی نظر میں یکساں اہمیت حاصل ہے۔ ان کے اور اہل یورپ کے اخلاقی ضابطہ میں ایک صریح فرق یہ نظر آتا ہے کہ ہندوستانی عموماً جنسی جرائم کو ان جرائم سے، جو ملکیت کے خلاف ہوں، کہیں زیادہ سنگین سمجھتے ہیں۔ دراں حالیکہ اہل یورپ جنسی لغزشوں کو قابل درگذر اور چوری، خیانت وغیرہ کو ناقابل معافی جانتے ہیں۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی روح نے اپنے آپ کو باضابطہ اجتماعی ادارات میں دکھایا ہے، ان میں بہت اختلاف ہے۔ لیکن جہاں اس نے اپنے آپ کو زندگی کی واقعی قوتوں سے مطلق کر کے، طرز عمل اور طرز معاشرت یا مادی اشیا کی شکل میں ظاہر کیا ہے وہاں بڑی حد تک اشتراک نظر آتا ہے۔ عملی اخلاق کا یہ اشتراک دونوں کی معاشرتی زندگی، خصوصاً خاندانی زندگی کی یکسانی میں اور بھی زیادہ نمایاں ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ ہندو ذات پات کے نظام کے معتقد ہیں اور مسلمان معاشرتی مساوات کے قائل ہیں اس لئے دونوں کی معاشرتی زندگی کی ساخت مختلف ہونی چاہیے لیکن واقعہ یہ ہے کہ صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں نے بھی اصلاً نہ سہی مگر عملاً نسل اور پیشے کی بنا پر جتھے بندی اختیار کر لی ہے اور جہاں تک قبائلی روح کا تعلق ہے دونوں میں فرق نوعیت کا نہیں بلکہ صرف درجے کا ہے۔ سچے مسلمان کسی طبقے اور کسی درجے کے ہوں ساتھ کھانے پینے میں پرہیز نہیں کرتے۔ لیکن شادی بیاہ میں ان کے ہاں بھی ذات اور برادری کا خیال ہندوؤں سے کم نہیں۔ جہاں تک

سیاسی اور معاشی زندگی کا تعلق ہے روشن خیال مسلمانوں کے اوپری طبقے کو چھوڑ کر عام مسلمانوں میں ذات برادری کی عصبیت ہندوؤں سے کم نہیں ہے، جس کا اظہار میونسپل کمیٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ایک حد تک صوبائی اور مرکزی کونسلوں کے انتخابات میں ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ غرض ہندو سماج اور مسلمان سماج دونوں بحر حیات کے اندر چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹی ہوئی ہیں۔ البتہ مسلمان جزیروں میں فاصلے مقابلۃً کم ہیں، ان کے درمیان نقل و حمل کا انتظام کچھ بہتر ہے اور انہیں پل باندھ کر ایک دوسرے سے ملا دینا زیادہ آسان ہے۔ دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرتی روح اپنے آپ کو خاندانی زندگی میں ظاہر کرتی ہے۔ خاندان ان کے ہاں، میاں بیوی اور بچوں کی چھوٹی سی اکائی نہیں، جیسی اہل یورپ کے ہاں ہوتی ہے، بلکہ ایک بہت بڑا حلقہ ہے جس میں بہت دور تک کے رشتہ دار شامل ہیں۔ ہندوؤں کے دھرم شاستر نے خاندانی ملکیت کو مشترک قرار دیا ہے اور شرع اسلام کے مطابق ہر شخص کی املاک اس کے بیٹوں اور بیٹیوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن عملاً ہندو اور مسلمان خاندانوں کی آمدنی اور خرچ کا بجٹ عام طور پر مجموعی ہوا کرتا ہے بلکہ اکثر صرف ایک شخص کمانے والا ہوتا ہے اور اس پر سارے خاندان کے خرچ کا بوجھ پڑ جاتا ہے۔ خاندان کے لوگ نہ صرف ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک ہوتے ہیں بلکہ ہر شخص اپنے آپ کو دوسروں کی خانگی اور عمومی زندگی کے ہر معاملے میں دخل دینے کا حقدار سمجھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خاندان کے ارکان خصوصاً عورتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتی رہتی ہیں۔ مگر جب سارے خاندان کے مفاد اور آبرو کا معاملہ ہو تو عموماً سب ایک ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کی خصوصاً ماں باپ کی عزت اور اطاعت ہر شخص کا مقدس فرض سمجھا جاتا ہے اور جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے، شوہر کی تابعداری اور خدمت پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ عورتوں کی حیثیت، ہندو اور مسلمان خاندان میں ایک سی ہے۔ اگرچہ اسلام نے عورتوں کو ہندو دھرم کے مقابلے میں بہت زیادہ حقوق دیئے ہیں لیکن آج دونوں معاشروں میں ان کا درجہ تقریباً یکساں ہے۔ مسلمان عورتوں میں مقابلۃً پردے کی سختیاں زیادہ اور تعلیم کم ہے اور وہ ان حقوق سے جو انکے مذہب نے ان کو دیئے ہیں بالکل فائدہ نہیں اٹھا سکتیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھوڑ کر، ہندو مسلمان، دونوں کی نظر میں عورت کسی مستقل شخصیت کی مالک نہیں، بلکہ مرد کا ضمیمہ ہے اور اسے احساس، خیال اور عمل میں مرد کے تابع ہونا چاہیئے۔

دونوں فرقوں کا رہنا سہنا، کھانا پینا اور پہناوا، جزوی اختلافات کے ساتھ یکساں ہے۔ ایک خطے کے ہندو مسلمانوں میں، ان چیزوں کے لحاظ سے جو تھوڑا بہت فرق ہے وہ اس سے کم ہے جو ایک خطے اور دوسرے خطے کے ہندوؤں میں آپس میں موجود ہے۔ جہاں کہیں ہندوستانی تہذیب کا اثر اب تک باقی ہے، خصوصاً شمالی ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں، شادی - بیاہ پیدائش اور موت کی رسموں میں عام طور پر زندگی کے آداب و رسوم میں بہت کچھ اشتراک پایا جاتا ہے۔

ہم لوگ تو تنگ نظری کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو حد سے زیادہ اہمیت دینے کے عادی ہو گئے ہیں، لیکن غیر ملک کے لوگ جو ہندوستان میں مدتوں رہ چکے ہیں، مختلف صوبوں کے باشندوں میں تو آسانی سے تمیز کر لیتے ہیں لیکن ہندو مسلمان میں تمیز کرنا ان کے لئے نہایت ہی مشکل ہے۔ اور یہ تجربہ تو ہم میں اکثر کو ہوا ہوگا کہ ایک ہی صوبے کے لوگ اگر انگریزی لباس، یا ہندوستانی تہذیب کا عام لباس یعنی کرتا پاجامہ وغیرہ، یا اپنے صوبہ کا مخصوص لباس پہنے ہوں اور انگریزی میں یا صوبے کی زبان میں گفتگو کرتے ہوں تو بغیر گہری واقفیت کے مدتوں تک پتہ نہیں چلتا کہ یہ ہندو ہیں یا مسلمان۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے، جسے اہل نظر مشترک تہذیب کے اہم ترین عناصر میں شمار کرتے ہیں، اب تک صورت حال تقریباً وہی ہے جو عام طرز زندگی میں ہے یعنی ہر صوبے کے ہندو مسلمان اپنی صوبائی زبان بولتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سب صوبوں میں (زیادہ تر شہروں میں) کچھ لوگ انگریزی اور بہت سے لوگ ہندوستانی زبان بھی بول سکتے ہیں، جو ملک کی قومی زبان بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے لیکن بدقسمتی سے خود ہندوستانی زبان کے گھر یعنی صوبہ متحدہ میں یہ جھگڑا چھڑ گیا ہے کہ اردو قومی زبان بن سکتی ہے اور بننی چاہیئے یا ہندی۔ قومی زبان کا پیچیدہ مسئلہ تفصیلی بحث چاہتا ہے۔ لیکن یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ زبان کے میدان میں اب تک یہ امکانات موجود ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں اتنا تہذیبی اتحاد ہو جائے جو سیاسی اتحاد کیلئے ضروری ہے۔ مگر جس طرح ان امکانات کو اتحاد کے مخالف بالارادہ اور اتحاد کے حامی بلا ارادہ مٹا رہے ہیں اس سے زیادہ مشترک تہذیب اور مشترک قومیت کیلئے کوئی چیز خطرناک نہیں ہو سکتی۔

سب سے بڑی وحدت آفریں قوت، عہد مغلیہ کی طرح آج بھی فنون لطیفہ کی ہے۔ باوجود اسکے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے نزدیک آرٹ کا ذہنی تصور الگ الگ ہے (جیسا کہ ٹیگور اور اقبال نے ہمیں بتایا ہے) جب دونوں تصورات آرٹ کو حقیقت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے دل کی گہرائیوں سے وجدان اور احساس کی وحدت اس زور شور سے ابلتی ہے کہ سارے ذہنی اختلافات کو بہالے جاتی ہے۔ آرٹ کی دنیا میں پہنچ کر ہندو مسلمان اور مادر ہند کے دوسرے فرزند یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ سب کے اندر زندگی کا ایک ہی دھارا بہتا ہے، اس کی لہریں ایک ہی تال سے اٹھتی اور گرتی ہیں، طوفان ایک ہی طرح کے آتے ہیں۔ سکون ایک ہی انداز کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف خطوں اور مختلف فرقوں کے اہل ذوق ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں ایک دوسرے کے دل کی زبان جو رنگوں اور سروں سے کام لیتی ہیں، اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یوں تو تہذیب کے اور

شعبوں کی طرح ہمارے ہاں آرٹ میں بھی عہد قدیم، عہد وسطیٰ اور عہد جدید کے اثرات پہلو بہ پہلو موجود ہیں، اجنٹا کی نقاشی راجپوت قلم اور یورپ کے مختلف طرز مصوری، کلاسیکی ہندو موسیقی، مسلمانوں کے عہد میں ایجاد کئے ہوئے طرز اور ریڈیو کی موسیقی کی سستی نقلیں جو تھیٹر اور فلم میں مقبول ہیں، اور ان سب کے پیروؤں کے الگ الگ حلقے ہیں لیکن ان کی تقسیم مذہب و ملت کی بنا پر نہیں، بلکہ ذوقِ فن کے مدارج کے ارتقائی بنا پر ہے، ہر حلقے کے فن کاروں اور مبصروں میں ہندو مسلمان بلاتفریق پائے جاتے ہیں اور ان میں یک جہتی اور برادری کی وہ روح نظر آتی ہے جو قومی اتحاد کے حامیوں کے دلوں میں امید کا چراغ روشن رکھتی ہے۔

یہ تو اس مشترک زندگی کے چند پہلو ہیں جو عہد وسطیٰ سے خصوصاً مغلوں کے زمانے سے ورثے میں ملی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ تاریخ کے عہد جدید نے انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کے سابقے کے ذریعے سے اشتراک کے کون کون سے نئے عناصر پیدا کر دئے ہیں۔ ہمارے ملک کے قوم پرور حلقوں میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ انگریزی حکومت نے پیدا کئے ہیں۔ یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے اور اسے قائم رکھنے میں ہمارے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھایا اور اپنی سیاسی اور تعلیمی پالسی کے ذریعے ان کو بڑھانے کی کوشش کی مگر یہ صحیح نہیں کہ ان کے پیدا کرنے کی ذمہ داری انگریزی حکومت پر ہے۔ اختلافات ایک حد تک ابتدا سے موجود تھے۔ سلطنت مغلیہ کی وحدت آفریں قوت نے ایک حد تک انہیں دبائے رکھا، لیکن اس کے زوال کے ساتھ پھر ابھرنے لگے۔ یہاں تک کہ انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کے خلاف ردعمل نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذہن کو صدیوں کے پیچھے ان کی تہذیبوں کے سرچشموں تک پہنچا کر ان کے باہمی فرق کو عارضی طور پر اور بھی بڑھا دیا۔ لیکن یہ انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب کا بالواسطہ اثر تھا۔ ان کے بلاواسطہ اثرات تو مجموعی طور پر ہندوستانیوں کی زندگیوں میں وحدت اور ربط پیدا کرنے کا باعث ہوئے، جس کے دو پہلو تھے، منفی اور مثبت۔ منفی پہلو تو مخالفت کی وہ مشترک روح ہے جو غیر ملکی تسلط کے خلاف سارے ملک میں سلگ رہی تھی جسکے شعلے غدر کے زمانے میں بھڑک کر رہ گئے اور جسکی چنگاریاں راکھ میں دبی ہوئی اب تک موجود ہیں۔ یوں تو لوگوں کے دل میں بدیسی حکومت کی طرف سے میل ہوا ہی کرتا ہے لیکن انگریزوں کی حکومت میں بعض ایسی خصوصیات تھیں جنہوں نے اہلِ ہند کے احساسِ محکومی کو تیز کر کے سوہانِ روح بنا دیا اور اسکی مخالفت کو عداوت کے درجے تک پہنچا دیا۔ اول یہ کہ یہ شخص یا ایک خاندان کی حکومت نہ تھی بلکہ ایک پوری قوم کی، جسے ہندوستانی یہ سمجھ کر کہ معمولی سے معمولی انگریز کو ان کا حکمراں بنا دیا گیا ہے، اور زیادہ باعث ذلت خیال کرتے تھے۔ ان کے اس خیال کو انگریزوں کی معاشرتی علیحدگی، اور نسلی غرور سے جو انیسویں صدی کی سامراجی ذہنیت نے ان میں پیدا کر دیا تھا اور تقویت پہنچی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں مخالفت کی روح کو اکسانے کی زیادہ ذمہ داری خود انکے عقیدۂ کمتری پر ہے یا انگریزوں کے عقیدۂ برتری پر۔ بہر حال یہ مخالفت حقیقی ہے، شدید ہے اور عام ہے اور ہندوستانیوں میں ایک منفی رابطے کا کام دیتی ہے۔ دوسرے، انگریزی حکومت نے جس طرح سیاسی اقتدار کو معاشی استحصال کا ذریعہ بنایا اسکے تباہ کن اثرات سے ہندو مسلمان سبھی متاثر ہوئے اور اس چھوٹے سے طبقے کے سوا جو استحصال کے آلۂ کار کی حیثیت سے انگریزوں کے ساتھ شریک تھا، ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک ہی ظالم قوت کے ظلم کا شکار ہونے کی وجہ سے ہم جنسی اور ہمدردی کی ایک اندرونی قوت پیدا ہو گئی۔

مثبت پہلو اس وحدت کا جو انگریزی حکومت نے ہندوستان کے اندر پیدا کی، قومیت کی سیاسی تحریک اور جدیدیت کی ذہنی تحریک کے اندر نظر آتا ہے۔ سارے ہندوستان کو ایک ہی قانون کی پرامن حکومت کے اندر لا کر مختلف خطوں میں باہم آمد و رفت کی سہولتیں پیدا کر کے، انگریزی زبان کے ذریعے ملک کے اونچے اور متوسط طبقوں کو تبادلۂ خیالات کا موقع دیکر، مغربی طرز معاشرت کے ذریعے ان میں ایک ظاہری ہم رنگی پیدا کر کے، انگریزوں نے ہندوستانیوں کے دبے ہوئے احساسِ وحدت کو ابھارا اور اسے ایک زندہ شعور بنا دیا، بلکہ انگریز قوم کے بعض افراد نے اس عام شعور کو ایک منظم قومی تحریک کی شکل میں لانے میں بھی مدد دی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی انگریزی حکومت قومی تحریک کو، جب سے کہ اس نے تحریک آزادی کا رنگ اختیار کیا برابر کچلنے کی کوشش کرتی رہی اور بعض حق پرست انگریز ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید میں اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ جب کبھی ہندوستان کے لوگ ان مخالفانہ جذبات سے آزاد ہو کر، جو اس وقت قدرتی طور پر ان کے دلوں پر مسلط ہیں، پچھلے سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو انہیں ماننا پڑے گا کہ ہندوستان میں سیاسی وحدت پیدا کرنے میں انگریزی حکومت اور انگریزی قوم کا حصہ کچھ کم نہیں۔

اب رہی وہ مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم جو انگریزی حکومت کے ساتھ ہندوستان میں آئی تو اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں اس کے اثرات زیادہ مضر ثابت ہوئے۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ہندوستانی ذہن مغربی تہذیب کی سطح کے نیچے، گہرائی میں اترا اور ان مقامی عناصر سے قطع نظر کر کے جو یورپ اور امریکا کے مخصوص حالات اور روایات کی پیداوار ہیں، جدیدیت کی عالمگیر روح کو جذب کرنے لگا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر نہ صرف ہندوستانیوں کے ذہنی

جمود میں حرکت پیدا کرنے کا بلکہ ان کی تہذیب کے منتشر اجزا کو ایک رشتے میں مربوط کرنے کا سامان موجود ہے۔ اپنی اس فطری خصوصیت کی وجہ سے کہ وہ ہر قسم کے تغیر و تبدل کی منزلیں بجائے انقلابی رفتار کے ارتقائی رفتار سے طے کرتا ہے، ہندوستانی ذہن نے ابھی تک جدیدیت کی راہ میں بہت تھوڑی ترقی کی ہے مگر اس محدود ترقی کے نتائج بھی امید افزا ہیں۔ اس کی بدولت مختلف فرقوں کے روشن خیال افراد زندگی کے بہت سے مسائل کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور ایک ہی معیار پر جانچنے لگے ہیں۔

جدیدیت کے جن عناصر کو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے جذب کرنا شروع کیا ہے ان میں سے دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک علمی طرز فکر اور دوسرے جمہوری تصور زندگی۔ جمہوریت کا اشتراکی نقطۂ نظر جس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد سے یورپ میں بڑی مقبولیت حاصل کرلی ہے ابھی نیا نیا ہندوستانیوں کے سامنے آیا ہے۔ لیکن جتنی توجہ اسکی طرف ہو رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد ہندوستانی ذہن میں ایک اہم جگہ حاصل کرلے گا۔ جمہوریت اور اس کے لوازم یعنی آزادیٔ فکر، مذہبی اور تہذیبی رواداری، اجتماعی زندگی کی بنیاد جبر و تشدد پر نہیں بلکہ افہام و تفہیم پر رکھنے کا اصول قومی اتحاد کی بڑی زبردست قوتیں ہیں۔ اسلئے ہر فرقے کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں جمہوریت کے ایک قومی رجحان کا موجود ہونا متحدہ قومیت کے نشو و نما کے لئے ایک مفید صورتِ حال ہے۔

جہاں تک علمی طرز خیال کا تعلق ہے، اس کا اصل تصور یعنی علم کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر رکھنا، ہندوؤں اور مسلمانوں کی ذہنی تاریخ میں کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ہندوؤں کے ہاں نیائے اور ویشیشک کے فلسفیانہ نظام اسی طرز فکر پر مبنی تھے۔ اور مسلمانوں کی ساری ذہنی زندگی میں صدیوں تک علمی روح جاری و ساری رہ چکی تھی۔ لیکن یہ پرانی باتیں ہیں۔ دو ہزار سال سے ہندوستان میں ہندوؤں کی اور ساڑھے سات سو سال سے مسلمانوں کی علمی زندگی میں مشاہدے اور تجربے کو نظر انداز کرکے تجرد خیال آرائی پر زور دیا جا رہا ہے۔ ان میں علمی فکر کی تجدید جسکے آثار آج نظر آرہے ہیں سراسر مغربی تہذیب کی روح جدیدیت کی منت پذیر ہے اور یہ جدید علمی طرز خیال جس نے ہندوستانی ذہن میں جڑ پکڑنی شروع کی ہے صرف یہیں تک محدود نہیں کہ مشاہدے اور تجربے کو علم کا ماخذ اور اسکی صحت کا معیار قرار دیا جائے بلکہ اس میں یہ بھی داخل ہے کہ علم سے ایک طرف فطرت کی قوتوں کی تسخیر اور انسان کے بقا و راحت کے اسباب میں اضافہ کرنیکا اور دوسری طرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کی معقول تنظیم کا کام لیا جائے۔ ہندوستانی ذہن نے اس طرز خیال کو جوں کا توں اختیار نہیں کیا بلکہ اس کو خالص مادیت اور واقعیت کی سطح سے بلند کرکے مادی اور روحانی، واقعی

اور عینی اقدار میں امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، جیساکہ آپ کو ٹگور، اقبال اور رادھاکرشنن کے ہاں نظر آتا ہے۔ پھر بھی جدیدیت کا یہ بنیادی اصول تسلیم کرلیا گیا ہے کہ روحانی فکر اور عینی تصورات کو عملی زندگی میں برتنے سے پہلے انہیں مفیدیت کی کسوٹی پر کسنا، یعنی اس معیار پر جانچنا چاہئے کہ وہ ہماری واقعی دنیا کی متقرون اور محسوس ضرورتوں کو کس حد تک پورا کرتے ہیں۔ یہ مشترک اور متحد تہذیب کی ایک نئی بنیاد ہے جس کی اہمیت کو ہم نے ابھی پوری طرح نہیں سمجھا ہے۔

اس سرسری جائزے سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہبی شعور جو ان کی تہذیبوں کا سرچشمہ ہے، یکساں ہے لیکن اس باطنی شعور کی ذہنی تعبیر میں فرق ہے اور یہ فرق مذہبی اور نیم مذہبی تصورات و ادارات کے اختلاف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ زبانوں کا اختلاف دراصل فرقہ واری نہیں بلکہ صوبہ واری ہے لیکن فرقہ واری بن گیا ہے۔ تاہم چونکہ دونوں تقریباً ہزار سال سے ایک ہی طبیعی اور عمرانی ماحول میں رہتے آئے ہیں، فطرت اور تاریخ کے یکساں سانچے میں ڈھلتے رہے ہیں، اس لئے ذہنی اختلافات کے باوجود ان کی مادی زندگی میں بلکہ ان کے عام مزاج اور مذاق میں ان کے اخلاق اور معاشرت میں بڑی حد تک یکسانی پائی جاتی ہے۔ اشتراک کا ایک نیا میدان جدیدیت نے پیدا کیا ہے۔ جو مغربی تہذیب کے ساتھ آئی ہے۔ اس میں غیر ملکی تسلط کی مخالفت، قومی آزادی کا ولولہ، جمہوریت پسندی اور (سب سے بڑھ کر) علمی طرز خیال۔ یہ عناصر وحدت آفریں قوتوں کا کام کر رہے ہیں۔

ان حقیقتوں کو پیش نظر رکھ کر قومی تہذیب کے مسئلے پر غور کیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک مشترک قومی تہذیب کی تعمیر کے لئے کافی مسالہ ہے، لیکن بنی بنائی عمارت موجود نہیں۔ اس کے بنانے کیلئے شعوری کوشش کی، ایک معقول نقشے کی اور ایک مضبوط بنیاد کی ضرورت ہے، مگر یہ بدقسمتی سے اب تک قومی اتحاد کے حامی عام طور پر اس دھوکے میں رہے کہ قومی تہذیب کی عمارت صرف بالقوۃ ہی نہیں بلکہ بالفعل وجود رکھتی ہے، اس لئے انہوں نے اس کے لئے نقشہ بنانے کی یا بنیاد تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ جن چند اشخاص کو حقیقی صورت حال کا احساس ہوا انہوں نے ہندوستانی تہذیب کیلئے یورپ کی وحدانی قومی تہذیبوں کا نقشہ اور مذہبی اتحاد کی بنیاد تجویز کی۔ انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں نسلی اور لسانی اختلاف کی وجہ سے زمانۂ قدیم کے ان عہدوں میں بھی جب مذہبی اتحاد موجود تھا جدید مغربی

ملکوں کی سی وحدانی تہذیب نہ بن سکی تو ہمارے زمانے میں جب مختلف صوبہ داد تہذیبوں کے علاوہ جداگانہ فرقہ وارانہ تہذیبیں بھی موجود ہیں، ان سب کو مٹا کر ایک واحد ہمہ گیر تہذیب کیونکر بنائی جا سکتی ہے؟ انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ مذہب کو قومی تہذیب کی بنیاد قرار دے کر ان حالات میں جو مغربی ملکوں کے حالات کے مقابلے میں قومی وحدت کے لئے کم سازگار ہیں، وہ مغربی قومیت سے بھی زیادہ مکمل وحدت کا خواب دیکھ رہے ہیں، جو خواب کی حیثیت سے اچھا ہو، لیکن عملی پالیسی کی حیثیت سے ناقابلِ عمل اور مضر ہے۔

ناقابل عمل ہونا تو خیر ظاہری ہے مگر مضر ہم اس پالیسی کو اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کا نام لیتے ہی ایک طرف تو صوبائی تہذیبوں کے حامی بھڑک گئے اور یہ سمجھ کر کہ مشترک تہذیب کی تحریک ان کی زبانوں کو اور دوسری تہذیبی خصوصیات کو مٹا دے گی، اس تحریک کی مخالفت کرنے لگے اور دوسری طرف ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب میں شدید رقابت پیدا ہوگئی۔ اور چونکہ ہندو نشاۃ ثانیہ کی تحریک اپنے آپ کو ہندوستان کی قومی تحریک کہتی ہے اور لوگ بھی ہندو قومی اور ہندوستانی کا لفظ بے تکلف اپنی فرقہ وارانہ مذہبی تحریکوں اور اداروں کے لئے استعمال کرتے ہیں اسلئے مسلمانوں کے دل میں یہ اندیشہ اٹھ کھڑا ہوا کہ قومی تہذیب کے نام سے ہندو تہذیب ان پر مسلط کر دی جائے گی۔ اس اندیشہ کی وجہ زیادہ تر قومی زبان کی تحریک تھی۔ اس کے علاوہ جو کوششیں بعض قوم پروروں نے نہایت نیک نیتی سے اس امر میں کیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی اتحاد پیدا کریں، ان کا رجحان عام طور پر یہ تھا کہ دونوں مذاہب میں صرف اس کے شعور باطنی کو لے لیں جو دونوں میں مشترک ہے اور ان ذہنی نظریات اور اجتماعی ادارات کو جو انہوں نے اس شعور کی مختلف تعبیروں کی بنا پر تعمیر کئے ہیں، یعنی مذہب کے پورے نظاموں کو رد کر دیں۔ اس رجحان کو عام طور پر ہندوؤں نے بھی پسند نہیں کیا اور مسلمانوں نے تو اسے اپنی مذہبی زندگی کیلئے مہلک سمجھا، اس لئے کہ ان کے نزدیک باطنی شعور بجائے خود محض ایک داخلی اور عارضی کیفیت ہے اور اس میں سچی مذہبی شان اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ پیمبرانہ شعور کی رہنمائی میں تصورات اور ادارات کی معین اور مستقل شکل اختیار کر لے۔ اس لئے وہ نظام مذہب کو اصل مذہب سمجھتے ہیں اور اس کو کسی طرح قربان کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ خود یہ چیز کہ مذہبی وحدت کی بنا سیاسی مصالح پر رکھی جائے، ہندوستانی طبیعت کے خلاف ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی اتحاد کی جو کوششیں سیاسی یا دوسرے غیر مذہبی محرکات کی بنا پر کی گئیں مثلاً اکبر کی توحید الٰہی کا حلقہ بنانے کی کوشش، انہیں ہندوستانی ذہن نے نفرت کے ساتھ رد کر دیا۔ البتہ کبیر، نانک اور دوسرے صوفی بزرگوں کی مذہبی تحریکیں جو حقیقی اور خالص دینی محرک سے پیدا ہوئیں عام طور پر قدر اور عزت کی نظر سے دیکھی گئیں اور اگرچہ وہ مذہبی اتحاد پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئیں لیکن ان سے مصالحت اور رواداری کی ایک عام فضا کے پیدا ہونے میں بہت مدد ملی۔

غرض ہندوستان کی تاریخ بھی ہمیں یہ سبق دیتی ہے اور موجودہ حالات بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہمیں "وحدانی" تہذیب بنانے اور اس کی بنا مذہب پر رکھنے کا خیال ترک کر دینا چاہیئے۔ بلکہ عہدِ مغلیہ کے نمونے کو سامنے رکھتے ہوئے ایک "وفاقی" تہذیب کا نقشہ بنانا چاہیے جس میں صوبوں اور فرقوں کی جداگانہ تہذیبیں برقرار رہیں لیکن ان کی تہ میں ایک مشترک ہندوستانی تہذیب بھی ہو، جو سارے ملک کو ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط کر دے۔ اس نئی تہذیب کی تعمیر میں ہمیں اس سارے مسالے سے کام لینا ہے جو ہمیں عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تہذیب سے ورثے میں ملا ہے یعنی ایک مشترک زبان جو قریب قریب سارے ملک میں سمجھی جاتی ہے اور جس میں اخلاقی، معاشرتی، جمالی تہذیب اور مادی تمدن کے بے شمار مشترک عناصر ہیں۔ لیکن ان سب چیزوں کو ہم اپنی نئی تہذیب میں بجنسہٖ داخل نہیں کر سکتے، بلکہ ان میں سے بعض بوسیدہ اور فرسودہ اجزا کو چھانٹنا پڑے گا اور بعض میں اتنی ترمیم کرنی پڑے گی کہ وہ اس روح جدیدیت کے ساتھ کھپ جائیں جسے ہم نہ صرف تاریخی بلکہ حیاتی ضرورت کے تقاضے سے اختیار کر رہے ہیں۔ یہ روحِ جدیدیت جس کی اہم ترین خصوصیات علمی طرز اور جمہوری تصورِ زندگی ہیں ہماری مشترک تہذیبی میراث میں سرایت کر کے ایک طرف اس میں ایک نئی قوتِ حیات اور نئی معنویت پیدا کر رہی ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے فرقوں میں ذہنی اتحاد کی ایک نئی اور مستحکم بنیاد قائم کر رہی ہے، جو عہدِ مغلیہ کی ہندوستانی تہذیب میں موجود نہیں تھی۔ نئی ہندوستانی تہذیب کی تعمیر میں علاوہ ان مشترک عناصر کے جو جغرافی، معاشی اور تاریخی قوتوں کی بدولت پہلے سے موجود ہیں فرقہ واری یا صوبہ واری تہذیبوں کے ایسے عناصر سے کام لیا جا سکتا ہے جن کے متعلق عام طور پر مان لیا جائے کہ جدیدیت کے علمی اور جمہوری معیاروں پر پورے اترتے ہیں۔ یعنی بجائے خود معقول اور مناسب ہیں اور کسی ایک فرقے یا صوبے کے لئے نہیں بلکہ سارے ملک کیلئے مفید ہیں۔

غزل — شاعر لکھنوی

ہر اشک آئینہ ہے مرے اضطراب کا
ہر سانس دے رہی ہے پتہ انقلاب کا

ہستی یہ ہے گھمنڈ تجھے ناسمجھ تو دیکھ
اٹھ اٹھ کے سطح آب پہ مٹنا حباب کا

اے ضبط المدد تیرے ہاتھوں ہے میری بات
ساغر چھلکنے پائے نہ چشم پر آب کا

ظالم نہ پوچھ مجھ سے مری بیقراریاں
رکھ دل پہ ہاتھ دیکھ لے حال اضطراب کا

شاعر رہے گا یاد تجھے تا بہ زندگی
وہ بے خودی کسی کی وہ عالم شباب کا

چنگی کا صدر

مصنّفہ: آنتون چیخوف
مترجمہ: بشیر الدین

(روسی افسانہ)

یورال کی پہاڑیوں کے دوسری طرف بسے ہوئے ایک شہر میں ایک دن یہ خبر گرم ہوئی کہ راحت حلم نامی ایک معزز ایرانی افسر شہر میں آیا ہے اور ہوٹل "جاپان" میں مقیم ہے۔ عام شہریوں پر اس خبر کا کوئی اثر نہ تھا، ایرانی آیا ہے، آیا ہوگا۔ لیکن شہر کی چنگی کے صدر استیپان الوانچ کوتسین کو دفتر کے منشی سے جب یہ خبر معلوم ہوئی تو ان پر بڑا اثر پڑا وہ سوچ میں پڑ گئے اور پوچھنے لگے

"کہاں کا قصد ہے ان کا"

"پیرس یا لندن کا"

"تو بڑی آسامی ہے"

"خدا بہتر جانتا ہے"

دفتر سے گھر لوٹ کر صدر چنگی نے کھانا کھایا اور پھر سوچ میں پڑ گیا۔ یہاں تک کہ شام اسی غور و فکر میں گذر گئی۔ معزز ایرانی افسر کی تشریف آوری سے انھیں گہری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ ان کو ایسا معلوم ہوا گویا ان کی تقدیر ہی راحت حلم کو یہاں کھینچ کر لائی ہے اور گویا وہ مبارک گھڑی آن پہنچی جس کا انھیں شدت سے انتظار تھا، جس کا وہ مدتوں سے خواب دیکھ رہے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ کوتسین دو تمغوں کے مالک تھے، ان میں سے ایک تمغہ تیسرے درجہ کا سرخ صلیب کا تھا اور دوسرا ڈوبتوں کو بچانے والی انجمن کا، علاوہ ان دو تمغوں کے کوتسین نے ایک چھوٹی سی بندوق بھی صلیب کی شکل کی بنا رکھی تھی جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ اس کھلونے کو بھی وہ ایک تمغہ تصور کرتے تھے اور اس کو ایک زنجیر میں باندھ کر اپنی وردی پر لٹکائے رہتے تھے۔ اس خیال سے کہ آدمی کے پاس جتنے زیادہ تمغے ہوں اتنی ہی زیادہ اس کی عزت ہوتی ہے اسی لئے صدر چنگی کے دل میں یہ حسرت تھی کہ وہ کسی طرح "شیر اور سورج" کا ایرانی تمغہ بھی حاصل کرے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس تمغے کو حاصل کرنے کے لئے نہ اس کو لام پر جانے کی ضرورت تھی نہ عطیہ دینے کی اور نہ چناؤ میں حصہ لینے کی۔ معزز ایرانی افسر کی تشریف آوری کو اس نے اپنے مقصد کے حاصل کرنے کا ایک زرین موقع سمجھا۔

اگلے دن دوپہر کو کوتسین بنے ٹھنے ہوٹل "جاپان" کی طرف روانہ ہوا۔ قسمت نے اس کا ساتھ دیا، جب وہ ایرانی کے کمرہ میں داخل ہوا تو اس کو تنہا پایا۔ راحت حلم ایک لحیم شحیم ایشیائی تھا، اس کی ناک طوطے کی ناک کی طرح نوکیلی تھی اور آنکھیں باہر کو نکل پڑ رہی تھیں۔ ترکی ٹوپی پہنے وہ فرش پر بیٹھا ایک بکس میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔

"حضور کی مصروفیت میں مخل ہونے کی معافی چاہتا ہوں"

کوتسین نے مسکراتے ہوئے کہا "حقیر استیپان ایوانچ کوتسین۔ خاندانی، ذی اقتدار، شہری، مقامی چنگی کا سردار حضور کی سرکار میں باریابی کا شرف حاصل کرنے کی اجازت چاہتا ہے، خادم اپنا فرض سمجھتا ہے کہ دوستانہ اور ہمسایہ طاقت کے نمائندے کی خدمت میں اپنی کورنش پیش کرے۔"

ایرانی مڑا اور بگڑی ہوئی فرانسیسی زبان میں اور ایسی آواز میں جو تختہ پر ہتھوڑا مارنے سے پیدا ہوتی ہے، بڑبڑایا۔

کوتسین نے جس نے خیر مقدم کے لئے کچھ الفاظ پہلے ہی سے تیار کر رکھے تھے، کہنا شروع کیا۔ "ایران کی سرحد ہمارے وسیع ملک کی حدود سے ملتی ہے۔ لہٰذا باہمی ہمدردی کا یہ تقاضا ہے کہ میں ان دو بڑے ملکوں کے درمیان استحکام کے جذبات کا اظہار کروں"

ایرانی اٹھا اور پھر بھدی آواز میں کچھ بڑبڑایا۔ کوتسین نے جو کہ زبانوں سے ناواقف تھا، سر کی حرکت سے اشارہ کیا کہ وہ کچھ نہیں سمجھ سکا۔

"پھر میں اس سے بات چیت کیسے کروں" وہ سوچنے لگا۔ "مجھے چاہئے کہ میں کسی مترجم سے مدد لوں، مگر معاملہ ٹیڑھا ہے، مطلب کی بات دوسروں کے سامنے میں ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ مترجم تو فوراً سارے شہر میں ہماری باتوں کا ڈھنڈورا پیٹ دے گا"

اب کوتسین نے وہ چند اجنبی الفاظ یاد کرنے شروع کئے جنھیں وہ برابر اخباروں میں دیکھا کرتا تھا۔

"میں شہر کی چنگی کا صدر ہوں" وہ بڑبڑایا "یعنی لارڈ میر میونسپلٹی۔ ہاں۔ سمجھ میں آیا آپ کے"

کوتسین نے چاہا کہ الفاظ کے ذریعہ یا نقالی سے اپنی سماجی حیثیت کو ایرانی پر ظاہر کر دے۔ پر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر نے جس کے نیچے بڑے حروف میں "شہر وینس"

؎ اس افسانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ترجمہ روسی زبان سے براہ راست اردو میں کیا گیا ہے۔

لکھا تھا، اس کی مدد کی۔ اس نے انگلیوں سے لفظ شہر کی طرف اشارہ کیا اور پھر اپنے سر کی طرف، گویا اپنے خیال میں اس نے اس طریقہ سے "شہر کا سر" (یعنی سردار) ترتیب دے دیا۔ ایرانی کچھ نہ کچھ سمجھ سکا۔ فقط مسکراتے ہوئے کہا "کیا خوب، کیا خوب" اس قصہ میں آدھ گھنٹہ گذر گیا۔

اس کے بعد کوتسین نے ایرانی کے زانو اور کندھے کو چھو کر کہا۔

"سمجھ میں آیا آپ کے۔ جی ہاں بحیثیت لارڈ میر میونسپلٹی کے میں حضور سے درخواست کرتا ہوں کہ حضور ایک مختصر سی سیر کو تشریف لے چلیں۔ سمجھے حضور ۔ سیر کو"

کوتسین نے تصویر میں شہر ونیس پر ایک انگلی رکھی اور دو انگلیوں کو چلا کر ٹہلنے کی نقل اتاری، راحت حلم، جو کوتسین کے تمغوں پر نظر جمائے ہوئے تھا، یہ سمجھا کہ کوتسین شہر کا سب سے زیادہ معزز شخص ہے۔ لفظ سیر اس کی سمجھ میں آگیا اور وہ مسکرایا۔ دونوں نے اپنے اپنے اوورکوٹ پہنے اور کمرے سے نکل کھڑے ہوئے نیچے اتر کر رسٹورانٹ کے دروازہ پر کوتسین رک گیا اور سوچنے لگا، ایرانی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو کوئی ہرج نہ ہوگا۔

روسی رواج کے مطابق بے جا نہ ہوگا اگر حضور کچھ خورد و نوش ۔ شمپین ۔ وغیرہ ۔ سمجھے حضور ۔ معزز ایرانی اشارہ کو فوراً سمجھ گیا دونوں رسٹورانٹ کی بہترین میز پر بیٹھ گئے اور شمپین کے ساتھ کھانے کا لطف اٹھانے لگے۔

"ایران کی خوش اقبالی کا جام صحت" کوتسین نے کہا "ہم روسیوں کو ایرانی بیحد پسند ہیں۔ گو ہم دونوں قومیں مختلف مذاہب کی پابند ہیں لیکن مشترک مفاد، باہمی مفاد، ایشا کا بازار، صلح آمیز فتوحات گویا کہ"

معزز ایرانی نے جی کھول کر کھانا کھایا اور خوب شراب پی، اس نے کانٹے کو مچھلی کے ٹکڑے پر لگا کر لطف اندوزی کے ساتھ سر کو ہلایا اور کہا۔

"خوب بہت خوب"

"آپ کو یہ مچھلی پسند ہے" کوتسین نے خوش ہو کر کہا "بہت بہتر، اچھی بات" اور نوکر کی طرف مڑ کر "دیکھو ایسی دو بہترین مچھلیاں فلاں کمرے میں پہنچا دو"

اس کے بعد جنگی کے صدر اور معزز ایرانی چڑیا گھر کی سیر کو نکلے۔ شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ ان کا استیپان ایوانچ جس کی رنگت شراب سے بھی زیادہ سرخ ہو رہی تھی اور جو بیحد خوش معلوم ہو رہا تھا، ایرانی کو ساتھ لئے ہوئے شہر کی مشہور گلیوں، کوچوں کے نظارے دکھاتا ہوا جا رہا تھا کوتسین ایرانی کو دیدبان پر لے گیا۔ دونوں دیدبان کے پتھر کے بنے ہوئے پھاٹک پر رکے پھاٹک پر شیروں کے بت بنے ہوئے تھے، وہاں اس نے پہلے شیروں کی طرف اشارہ کیا، پھر سورج کی طرف اور پھر اپنے سینہ کی طرف دوبارہ شیروں کی طرف، پھر سورج کی طرف اور اپنے سینہ کی طرف۔ ایرانی نے سر کو جنبش دی ۔ گویا کہ اس کو ان اشاروں سے اتفاق ہے اور اپنے سفید دانت نکال دئے۔ شام کو دونوں نے ہوٹل "جاپان" میں بیٹھ کر موسیقی سنی اور جب رات ہوئی ... رخ کیا۔

اگلے روز کوتسین دفتر پہنچا، دفتر کے ملازمین اس کے انداز کو دیکھ کر بھانپ گئے کہ ضرور کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے۔ ان کے منشی نے مسکراتے ہوئے ظنز آمیز لہجے میں کہا۔

"ایرانیوں میں ایک رسم ہے کہ جب کبھی کوئی معزز مہمان کسی کے یہاں آئے تو اس کی شان میں میزبان ایک بکرا اپنے ہاتھوں سے ذبح کرتا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد کوتسین کو ایک لفافہ ملا۔ لفافہ کو چاک کیا تو دیکھا کہ کاغذ پر ایک خاکہ کھنچا ہے، اس خاکہ میں ایرانی کی تصویر تھی، ایرانی کے سامنے کوتسین ہاتھ پھیلائے دو زانو بیٹھا تھا۔

یہ خاکہ دیکھ کر کوتسین کو کچھ تشویش ہوئی لیکن اس کا یہ جذبہ دیرپا نہ تھا: دوپہر کو پھر وہ معزز ایرانی کے یہاں پہنچا۔ پھر اس کی خاطر تواضع کی اور پھر شہر کا نظارہ دکھاتے ہوئے پتھر کے پھاٹک کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے شیروں کی طرف پھر سورج کی طرف اور پھر اپنے سینہ کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں سے چل کر ہوٹل "جاپان" میں رات کا کھانا کھایا اور چیروٹ منہ میں دبائے شراب میں مست دیدبان پہنچے۔ وہاں کوتسین نے ایرانی کو ایک خاص تماشہ دکھانا چاہا۔ چوکیدار کو آواز دی کہ وہ خطرہ کا الارم بجائے لیکن اس وقت آگ بجھانے والا عملہ چھٹی پر تھا۔

وہاں سے چل کر ہوٹل "لندن" میں چائے پی، وہاں ایرانی ان سے رخصت ہونے لگا۔ اس کو خیرباد کہتے ہوئے استیپان ایوانچ نے اس کو تین بار پیار کیا اور روسی رسم کے مطابق آنسو بہائے۔ جب گاڑی چلنے لگی تو کوتسین نے باآواز بلند کہا "ایرانیوں کو میری طرف سے پیغام محبت پہنچائیے"۔

اس واقعہ کو گذرے ہوئے ایک سال چار مہینے ہوئے۔ دھواں دھار پالا پڑ رہا تھا، بلا کی سردی تھی، ہوا اس قدر ٹھنڈی اور تیز چل رہی تھی کہ انسان کے جسم میں سے آرپار ہو جائے۔ استیپان ایوانچ کوٹ کے بٹن کھولے ہوئے سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ راہگیروں میں کوئی بھی اس کی طرف مڑ کر اس کے تمغے "شیر اور سورج" کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح ساری شام بڑی دیر تک ٹہلتا رہا سردی میں سینہ کھولے ہوئے۔ رات اس نے بستر پر کروٹیں بدل کر کاٹی لیکن نیند کسی طرح نہ آئی تھی نہ آئی۔ اسے سانس بھی تکلیف سے آ رہی تھی۔ سینہ میں ایک قسم کی جلن تھی اور دل میں دھڑکن۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اس کو ستر ہیا کا تمغہ حاصل ہو جائے

اردو اور سائنس [۱]

رضی الدین صدیقی

یہ[۱] حقیقت ہے کہ اردو زبان میں ہر قسم کے سائنسی اور علمی خیالات کو بیان کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، اب کسی تعلیم یافتہ ہندوستانی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے اب اس کا قطعی ثبوت پیش کر دیا ہے اور پچیس سال کے ذاتی تجربے کے بعد میں بلا خوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں تک علوم و فنون کو ظاہر کرنے کی 'صلاحیت' کا تعلق ہے اردو زبان دنیا کی کسی قدیم یا جدید زبان سے پیچھے نہیں ہے۔ میں نے یہاں لفظ "صلاحیت" کا عمداً استعمال کیا ہے۔ کسی چیز کی صلاحیت یا اس کا امکان اور واقعتاً اس کا وجود دو مختلف چیزیں ہیں، اس میں شک نہیں کہ علمی اور سائنسی تحریروں اور کتابوں کی اردو زبان میں ابھی بہت کمی ہے اور اس لحاظ سے ہماری زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو کے لکھنے والوں کی زیادہ تر توجہ ادب لطیف، انشاء، افسانہ نگاری اور شاعری کی طرف مبذول رہی ہے اور جامعہ عثمانیہ کے سوا ملک کی تمام تر تعلیم انگریزی میں ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کی کتابوں کو اردو میں لکھنے یا پڑھنے کا خیال کسی کے ذہن میں اب تک بہت کم آیا ہے۔ چونکہ ملک کے ایک بڑے حصے میں اردو مادری زبان کے طور پر بولی جاتی ہے اور ویسے بھی سارے ملک میں عام مشترک زبان کا درجہ رکھتی ہے اس لئے اب اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے کہ علوم و فنون کو اردو زبان میں پیش کیا جائے تاکہ اہل ملک تعلیم سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کام میں رہنمائی کے لئے قدرتی ہے کہ سارے ملک کی نظریں جامعہ عثمانیہ پر لگی ہوئی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ملک کے ہر گوشہ سے جامعہ کے اساتذہ اور دوسرے حضرات کے پاس مختلف علوم و فنون کی کتابیں اور مضامین لکھنے کی فرمائش آیا کرتی ہے۔

تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ انفرادی کوششوں کے علاوہ جس طرح آج اردو زبان کی سب سے زیادہ منظم اور سب سے زیادہ قابل لحاظ علمی خدمت کرنے کا شرف حیدرآباد کو حاصل ہے اسی طرح ابتدائی زمانے میں بھی اس کام کو سرانجام دینے کا بیڑا حیدرآباد نے اٹھایا تھا۔ حیدرآباد میں یہ کام شمس الامراء کے خاندان کی سرپرستی میں انجام پاتا تھا۔ شمس الامرائے ثانی اور ثالث دونوں نے اس کی باضابطہ کوشش کی کہ حکمت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ کی کتابیں اردو میں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے ترجموں پر مشتمل تھیں ان میں سے بعض کتابیں اب بھی پائیگاہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔

مختلف سائنسوں اور علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرنے کی دوسری منظم کوشش آخری شاہان اودھ کی سرپرستی میں لکھنؤ میں کی گئی۔ ان بادشاہوں کو طبیعی علوم خصوصاً علم ہیئت سے بہت دلچسپی تھی اور ان کے حکم سے بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

اس کے بعد تیسری منظم کوشش دہلی میں کی گئی اور ۱۸۴۳ء میں دہلی کالج میں اس کام کے لئے ایک باضابطہ سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ چونکہ دہلی کالج میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا اور سوائے انگریزی کے باقی تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے اس لئے لازمی تھا کہ درسی کتابیں اردو میں تیار کی جائیں۔ دہلی سوسائٹی نے اردو کتابوں کی تیاری کا کام اپنے ذمہ لیا اور اس کے اخراجات کی بجائی کے لئے حیدرآباد اور لکھنؤ کے امراء نے گراں قدر عطیے دیئے۔ جدید علوم و فنون کو اردو میں منتقل کرتے وقت سب سے بڑی دقت اصطلاحات کی پیش آتی ہے۔ دہلی سوسائٹی والوں نے اصطلاحات کے متعلق یہ اصول مرتب کئے۔

۱۔ اگر سائنس کے کسی لفظ کا مترادف اردو میں نہ ملے تو ایسے لفظ کو اردو میں بجنسہ لے لینے میں کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً سوڈیم کلورین وغیرہ۔

۲۔ اگر سائنس کے کسی لفظ کا مترادف اردو میں موجود ہے تو اردو لفظ کو استعمال کرنا چاہیئے مثلاً لوہا، گندھک وغیرہ۔

۳۔ کیمیائی مرکبوں کے نام انگریزی ہی برقرار رکھے جائیں جیسے سوڈیم آکسائڈ وغیرہ۔

۴۔ یہ ضروری نہیں کہ جو انگریزی لفظ اردو میں لئے جائیں ان کو بجنسہ لکھا جائے۔ بلکہ ان کو اردو میں ادا کرنے کی کوشش کیجائے۔

ایک سو سال پہلے کے یہ اصول وہی ہیں جو آجکل بھی عام طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں ان اصولوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

اگر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد دہلی کالج کو برخاست نہ کر دیا گیا ہوتا تو یقیناً اس وقت سارے ہندوستان میں تعلیم کی نوعیت تقریباً وہی ہوتی جو جامعہ عثمانیہ میں ہے اور اردو زبان میں علوم و فنون کے ایسے خزانے موجود ہوتے کہ وہ دوسری ترقی یافتہ زبانوں

۱؎ بہ اجازت رسالہ "نوا" حیدرآباد۔

کے ہم پلہ ہوتی۔ لیکن بقول مولوی عبدالحق صاحب "اس کالج کو بلاوجہ اور بغیر کسی الزام کے ملکی اور سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا" اور اس طرح ملک کی ترقی کا شاید سب سے زیادہ اہم ذریعہ مسدود ہوگیا۔

دہلی کالج کی مسدودی کے چند سال بعد سر سید نے اس کام کا از سر نو بیڑا اٹھایا اور ۱۸۶۳ء میں غازی پور میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تاکہ اس کے ذریعہ سے اردو میں جدید علوم و فنون کی اشاعت ہو سکے۔ جب ایک سال بعد سر سید کا تبادلہ علی گڑھ ہوگیا تو یہ سوسائٹی بھی اپنے جملہ ساز و سامان کے ساتھ علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اور اب تک "سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

اس سوسائٹی کے زیر اہتمام ہر مہینہ متعدد علمی جلسے منعقد ہوتے تھے جن میں جدید موضوعوں پر تقریریں ہوتی تھیں اور ایک رسالہ بھی نکلتا تھا جس کا نام "انسٹی ٹیوٹ گزٹ" تھا۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس علمی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ ان کتابوں کی زبان عام فہم اور سلیس ہونے کے علاوہ آج کل کی زبان سے بہت کافی مشابہت رکھتی ہے۔

سر سید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے رسالہ "تہذیب الاخلاق" بھی جاری کیا جس کی ایک بڑی اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کے سائنسی اور علمی کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا جاتا تھا۔ ان مضمونوں کے ذریعہ سے بہت سی قدیم علمی اور سائنسی اصطلاحیں معلوم ہوگئیں جن میں سے اکثر اپنی موزونیت کی وجہ سے جدید اردو کتابوں میں رائج ہوگئیں۔

اس کے بعد منشی محمد ذکاء اللہ نے انیسویں صدی کے اواخر میں جدید علوم فنون کی اردو کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا۔ یہ کتابیں حال حال تک بھی بہت مقبول تھیں اور درسی کتابوں کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں۔ سچ پوچھئے تو ان کی ان گراں بہا خدمات کی وجہ سے منشی ذکاء اللہ کو سائنسی اردو کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے۔

زبان اردو کی ترقی کے لحاظ سے بیسویں صدی کا اہم ترین کارنامہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے جس کی تاسیس میں دہلی کالج کی طرح بھی بنیادی تخیل کارفرما تھا کہ تمام علوم و فنون کی تعلیم اردو میں دی جائے۔ اس مقصد کو بطریق احسن انجام دینے کے لئے ایک دارالترجمہ کی بنا ڈالی گئی اور طبیعی، حیاتی، عمرانی تمام علوم و فنون کی جدید ترین معلومات کو اردو میں منتقل کرانے کے لئے بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا چنانچہ اب تک دارالترجمہ سے مختلف علوم و فنون کی تقریباً ڈھائی سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور ایک سو زیر طبع ہیں۔ اس ٹھوس کام کے علاوہ دارالترجمہ اور جامعہ عثمانیہ نے ایک بڑا انقلابی کام یہ کیا کہ ہندوستانی زبان میں اعلیٰ ترین اور جدید ترین تعلیم کے امکان کو ثابت کر دیا۔ ورنہ جامعہ عثمانیہ سے قبل مختلف وجوہات کی بنا پر اہل ملک کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ پہلے پہلے تو سارے ہندوستان نے جامعہ عثمانیہ کے تجربہ کو شک اور شبہ کی نظروں سے دیکھا لیکن آخر میں سب کو ماننا پڑا کہ اردو زبان میں تمام علوم و فنون کو بیان کرنے کی کامل صلاحیت موجود ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے کارناموں سے چونکہ اکثر سامعین واقف ہیں اس لئے میں تفصیلات کو نظر انداز کر رہا ہوں اور صرف اس امر کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں کہ جامعہ میں اب اعلیٰ ترین مدارج یعنی ایم ایس سی، پی۔ ایچ ڈی وغیرہ تک جدید ترین نظری عملی اور ٹیکنیکل علوم و فنون کی تعلیم اور تحقیق کی جاتی ہے اور اس میں کوئی غیر معمولی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

جب جامعہ عثمانیہ اپنے مقصد میں کامیاب ہونے لگی تو ہندوستان کے دوسرے مقامات پر بھی لوگوں کو اپنی زبانوں کی ترقی کا خیال آیا اور انہوں نے کوشش شروع کی کہ اگر اعلیٰ مدارج تک نہیں تو کم از کم میٹرک یا ایف اے تک تعلیم مقامی زبانوں کے ذریعہ دی جائے خصوصاً ہندی بھی اردو کی حریف بن گئی اور پھر ہندی، ہندوستانی اردو کا

"حدیثِ دل" — عاصی کرانوی

نیر نظر سے چھیڑ کئے جا رہا ہوں میں
زخموں کو بار بار سیئے جا رہا ہوں میں

ہمدم تحملِ دل حسرت زدہ نہ پوچھ
سائے ہیں تجلیوں کے جئے جا رہا ہوں میں

افشا نہ ہونے پائے کہیں رازِ زندگی
آنکھوں میں آنسوؤں کو پئے جا رہا ہوں میں

ہوں دینے والا برق کو پھر دعوتِ عمل
پھر تنکا تنکا جمع کئے جا رہا ہوں میں

دل کو سکھا رہا ہوں میں آدابِ بندگی
احسان شکری کیلئے جا رہا ہوں میں

نظریں وہ جن میں سنکڑوں پنہاں ہیں بجلیاں
قلب حزیں پہ جذب کئے جا رہا ہوں میں

بگڑے نہ عاصی بات کہیں آج دیکھئے
دفتر شکایتوں کا لئے جا رہا ہوں میں

تعصب زور شور سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمیں اس مضمون میں ان تمام جھگڑوں سے سروکار نہ ہوتا لیکن بات یہ ہوئی کہ ان جھگڑوں کی وجہ سے علمی اردو بھی لپیٹ میں آگئی اور اصطلاحات اور علمی زبان کے بارے میں اختلافات رونما ہوگئے۔ ایک جماعت کا یہ خیال کہ علمی اصطلاحیں خالص عربی یا فارسی ہونی چاہئیں، ان کے مقابل ایک دوسری انتہا پسند جماعت ہے جو اصطلاحوں کو خالص سنسکرت شکل میں لینا ضروری سمجھتی ہے، ان دونوں فریقوں کے درمیان مختلف مکاتیب خیال کے لوگ موجود ہیں جو ایک طرف یا دوسری طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں اور بعض ان دونوں کے بالکل درمیان ہیں۔

ایک عرصہ تک یہ بحث مختلف افراد اور پبلک انجمنوں کی حد تک محدود رہی۔ آخر اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے صوبہ جاتی اور مرکزی حکومتوں نے خود عملی اقدام شروع کیا۔ چنانچہ صوبہ بہار کی کانگریسی حکومت نے ایک "ہندوستانی کمیٹی" قائم کی، اس کمیٹی میں مولوی عبدالحق صاحب بھی شریک ہیں۔ لیکن زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو سنسکرت کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں اور ان الفاظ کو بھی لینا نہیں چاہتے جو ایک عرصۂ دراز سے ٹکسالی اردو بن گئے ہیں۔ اس کمیٹی کی بنائی ہوئی اصطلاحات میرے پاس بھی رائے کے لئے آئی تھیں۔ میں نے تفصیلی طور پر ان کا تجزیہ کرکے بتایا تھا کہ نہ صرف زبان کے لحاظ سے بلکہ علمی لحاظ سے بھی یہ اصطلاحات نہایت ناموزوں ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ اصطلاحیں منظور نہیں ہوئیں۔ ورنہ سائنسی اردو کا خاتمہ ہی ہوگیا ہوتا۔

حال میں حکومت ہند نے تعلیمات کے لئے ایک مرکزی مشاورتی کمیٹی قائم کی ہے جو سائینٹفک اور ٹیکنیکل اصطلاحوں کے مسئلہ پر بھی غور و فکر کر رہی ہے اس کے اجلاسوں میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا ہے اس کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان میں علمی اصطلاحیں تین اجزا پر مشتمل ہونی چاہئیں۔

(۱) ایک تو بین الاقوامی جزو۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں میں اسی شکل میں رائج ہو تو اس کو بجنسہ لے لینا چاہیئے۔ اور ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں مثلاً موٹر ٹیلی فون وغیرہ۔

(۲) دوسرے اس خاص زبان کا جزو مثلاً لوہا، گندھک وغیرہ۔

(۳) مقامی زبانوں مثلاً بنگالی، گجراتی کے لئے عام ہندوستانی جزو مثلاً اگر کوئی لفظ پورے ہندوستان میں رائج ہو تو بنگال والے اس ہندوستانی لفظ کو لے لیں اور بنگال میں علیحدہ اصطلاح نہ بنائیں۔

آپ ملاحظہ کریں گے کہ پہلے دو اصول وہی ہیں جو اردو میں زمانہ قدیم سے رائج ہیں اور جن کو جامعہ عثمانیہ میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں میں عربیت اور فارسیت زیادہ تھی اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے علوم کی عربی اور فارسی کتابیں موجود تھیں اور لوگ ان سے واقف تھے۔ نئی اصطلاحیں بنانے کی بجائے یہ مناسب سمجھا گیا کہ انہی قدیم اصطلاحوں کو باقی رکھا جائے لیکن رفتہ رفتہ ان اصطلاحوں کو تجربہ کی روشنی میں سادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ "ذوالاربعۃ السطوح" کی بجائے اب "چار سطحی" کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اس کام کے لئے یعنے اصطلاحوں پر نظر ثانی کرنے اور ان کو سادہ بنانے کے لئے جامعہ میں کوششیں برابر جاری ہیں۔

میں خود اس امر کا قائل ہوں کہ علمی اصطلاحیں اور علمی کتابوں کی زبان حتی الامکان سادہ اور مانوس ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ زبان بالکل بازار کی یا دیوان خانہ کی زبان ہو۔ جو لوگ اردو کی موجودہ اصطلاحوں پر اعتراض کرتے ہیں انہیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اکثر اصطلاحوں سے عام لوگوں کو کبھی سابقہ نہیں پڑتا اور اس لئے علمی زبان کا دارومدار عوام کی بول چال پر رکھنا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ سائنس میں مفہوم کے خفیف سے ٹکنیکل فرق کے لئے دو مختلف لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جس کا عام بول چال میں کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ مثلاً لفظ "متناہی" کو لیجئے۔ آپ کہیں گے کہ یہ ایک ثقیل لفظ ہے اور اس کی بجائے لفظ "محدود" پہلے ہی ایک دوسرے مفہوم کے لئے اختیار کرلیا گیا ہے۔ اور اس لئے "محدود" کے علاوہ ایک اور لفظ کی بھی ضرورت ہے (باقی آئندہ)

نادر شاہ کا آخری غیور سپاہی

۲

اشہر لکھنوی

پردۂ دوم

(وہی کمرہ ہے۔ اللہ یار بیگ توشک پر سیدھی طرف کروٹ لئے سو رہا ہے۔ سر پر پشمینے کا کنٹوپ ہے۔ اور ایک موٹا لحاف اوڑھے ہوئے ہے۔ پہلو میں ایک چھوٹی تپائی پر چمچہ۔ پیالی۔ اور دوا کی پڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ جس وقت کمرے کا دروازہ اٹھتا۔ اللہ یار بیگ گہری نیند میں ہے۔ بائیں ہاتھ کے دروازے سے فلک ناز۔ چادر نمازی اوڑھے ہوئے اندر داخل ہوتی ہے)

فلک ناز:۔ (آہستہ سے) حکیم صاحب تشریف لائیے۔

میرزا مسیح:۔ (طبیب۔ دبے پاؤں اندر داخل ہوتے ہوئے آہستہ سے۔ "تکلیف نہ دو۔ اچھا ہے۔ سونے دو۔ میں تھوڑی دیر یہاں ہوں۔ اگر اس عرصے میں مریض بیدار ہوا تو دیکھ لوں گا۔ (دونوں وسطی کمرے میں چلے آتے ہیں۔ فلک ناز کچھ دور گردن جھکائے کھڑی ہے)

میرزا مسیح:۔ کس وقت سے یہ کسالت پیدا ہو گئی ہے؟

فلک ناز:۔ میرے والد کے جانے کے چار روز بعد سے۔ اس حالت کو ایک ماہ سے کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔

میرزا مسیح:۔ اوّل ہی سے اتنی شدت تھی۔ یا رفتہ رفتہ یہ کمزوری پیدا ہوئی۔

فلک ناز:۔ پہلے دو تین روز تو ذرا کم اثر تھا۔ مگر اس کے بعد سے تقریباً ایک ماہ ہوا کہ صاحب فراش ہو گئے ہیں۔

میرزا مسیح:۔ اس قدر کمزوری کا سبب کیا ہے؟

فلک ناز:۔ ٹھیک ٹھیک تو میں نہیں بتا سکتی لیکن ہاں اتنا جانتی ہوں کہ جس روز میرے والد شریک جنگ ہونے جا رہے تھے۔ اِن کو کچھ غیر معمولی غیظ و غضب آ گیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد دو تین روز کچھ فکرمند سے رہے۔ چار طرف عجب مایوسانہ نظروں سے دیکھتے تھے اور بعض کو آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ اس کے بعد کچھ دیر سکوت اختیار کر لیتے تھے۔ اور اس طرح بے حس و حرکت ہو جاتے تھے۔ چار پانچ روز کے بعد ان کے ہاتھ پاؤں سست ہو گئے۔ کوئی چیز اگر پکڑ لیتے تو ہاتھ کانپ جاتے تھے۔ اور کھڑے ہوتے تو پاؤں لڑکھڑانے لگتے تھے۔ ایک روز نہ معلوم کوئی ترش چیز کھا لی یا کیا؟ بلغمی کھانسی ہو گئی —— ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کھڑے سے گر پڑے۔ ہاتھ پاؤں تو بیکار ہیں ہی۔ اس وقت سے اب تک جسم کا سیدھی طرف کا حصہ بے حس ہو گیا ہے۔ ایک آنکھ مستقلاً بند ہے اور زبان بھی گفتگو کے وقت کچھ موٹی معلوم ہوتی ہے۔۔ سوتے میں زیادہ تر اول فول بکا کرتے ہیں۔

(اس وقت اللہ یار بیگ کے بستر سے یہ آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں)

اردشیر! جان پدر! اس ہاتھ کے قربان۔۔۔ بزن۔۔۔ بزن۔۔۔ مردود جانے نہ پائے (خاموش ہو کے کچھ وقفے کے بعد) افسوس! میں نہ ہوا جو تیرے مردانہ بازوؤں کو چوم لیتا۔۔۔ بزن۔۔۔ میرے رشید فرزند۔۔۔ بزن۔۔۔ یہ حرام اللہ ہرگز رحم کے قابل نہیں۔۔۔ اس وار کے صدقے۔۔۔ بزن۔۔۔ نادر شاہ اس کے صلے میں کل تجھے سپاہیانہ خلعت عطا کرے گا۔ میں خود شال و رومال تیری گردن میں لپیٹوں گا (خاموش ہو جاتا ہے)

میرزا مسیح:۔ کیا بیدار ہوئے؟

فلک ناز:۔ ہذیان بک رہے ہیں۔ زیادہ تر یہی حالت رہتی ہے اور ایسے ہی الفاظ زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ بزن۔ بکش۔ قربان دست و بازوئے تو۔

میرزا مسیح:۔ اس مدت میں سوائے اس روز کے کہ تمہارے والد پر غصہ ہوئے تھے۔ کیا اور کسی روز بھی کسی موقع پر غصے کا اظہار کیا تھا؟ یا نہیں؟

فلک ناز:۔ نہیں۔ اس روز سے برابر ان کی طبیعت سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ جو بھی آتا ہے اس سے نہایت روکھے منہ ملتے ہیں۔ آپ نے ملاحظہ کیا برابر روسیوں کو سخت سست کہتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات فضا میں خواہ مخواہ گھونسے چلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں "حرامیو! مرتے چلے جاؤ۔ افسوس میں نہ ہوا۔ ایک ایک کے باپ کو چن چن کر جہنم واصل کر دیتا!" ایک روز خلاف معمول اضطراب کا اظہار کیا تھا۔ ہاں! ٹھیک یاد آیا۔۔۔۔ چار روز قبل حسن علی بیگ مزاج پرسی کے لئے آئے تھے۔ نہ معلوم کیا ہوا کہ دادا جان کا حال بے

بدتر ہوگیا۔ حسن علی بیگ سے میں نے لاکھ لاکھ پوچھا کہ کیا بات ہوئی لیکن انھوں نے کہا کہ صرف میں نے یہ کہا تھا "روسیوں نے جنگ نخجوان میں فتح حاصل کرلی ہے"۔

میرزا مسیح۔ (فکر میں غرق ہوجاتا ہے اور اس درمیان میں اس کی انگلیاں ڈاڑھی کے بالوں کے لئے شانہ بنی ہوئی ہیں تھوڑے سے عرصے کے بعد) خانم اس معاملہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھنا چاہئے۔ مرض بہت خطرناک ہے۔ یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہئے کہ بالکل ناامیدی ہے۔ اگر اچھی تیمارداری ہوگئی تو کوئی خطرہ نہیں۔ صرف ہر لحظہ دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اگرچہ فالج گر پڑا ہے مگر زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ کوئی ایسی وجہ نہ ہونی چاہئے جس سے ان کے جذبات بھڑک اٹھیں۔ اور سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ جنگ سے متعلق کوئی خبر بد ان کے کانوں تک نہ پہونچنی چاہئے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ معلوم ہو کہ نابکار روسی اس جنگ میں کامیاب ہوگئے اور وزیر جنگ کی فوج نے شکست کھائی تو یہ خبر ان تک نہ پہونچنی چاہیے۔ بلکہ اس کے خلاف لشکر ایران کی فتح و ظفر کی خبریں ان کو دی جائیں۔ اور متواتر دی جائیں تو زیادہ مناسب ہے ——— اس طرح اگر مریض کی خبرگیری کی گئی تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔ ماشاء اللہ تمہارے دادا کا بڑا اچھا ہے ممکن ہے چند سال اور زندہ رہیں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ کوئی خبر بد ان تک نہ پہونچے ورنہ خدا ہی حافظ ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ جسم کا دوسرا حصہ بھی مفلوج ہوجائے یا اسی میں ترقی ہوجائے۔

فلک ناز:- بہت خوب۔ لیکن حکیم صاحب خبر بد ان تک نہ پہونچنے کا بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے کیونکہ ہماری فوج کی شکست کے اخبار برابر شہر میں مشہور ہو رہے ہیں۔ یہ خبریں کہاں تک ان سے پوشیدہ رکھی جائیں گی۔

میرزا مسیح:- خانم! اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میرا فرض اونچ نیچ سمجھا دینے کا تھا سو سمجھا دیا۔ جہاں تک ہوسکے مریض کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ ہو۔

(اس درمیان میں اللہ یار بدقت کروٹ لے کے بیدار ہوتا ہے)

اللہ یار بیگ:- (لکنت آمیز لہجے میں) بیٹی فلک ناز!

فلک ناز:- پدرجان!

اللہ یار بیگ:- تھوڑا . . . پانی . . . پلا دو۔ (فلک ناز آبخورے میں پانی لاتی ہے اور میرزا مسیح خم ہو کے حالت مریض کا اندازہ کرتا ہے)

فلک ناز:- (پانی دیتے ہوئے) پدرجان! حکیم صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ بہت دیر سے منتظر تھے کہ آپ بیدار ہوں۔)

میرزا مسیح:- (بستر کے پاس بیٹھ کے) ماشاء اللہ آپ کا حال بہتر ہے۔

اللہ یار بیگ:- الحمد للہ۔ مگر میرے دل کی عجیب حالت ہے۔ برابر وحشت ناک خواب دیکھتا رہتا ہوں۔

میرزا مسیح:- کچھ نہیں۔ بہت جلد یہ حالت رفع ہوجائے گی . . . لیکن کامل آرام درکار ہے۔ حرکت کرنا آپ کے لئے سخت مضر ہے۔ یوں ہی لیٹے رہئے۔ کوئی بات ایسی نہ کیجئے گا جس سے مزاج پر ناگوار اثر پڑے ذرا ہاتھ تو دیجئے (غور سے نبض دیکھ کے) آپ کی نبض کی رفتار بہت اچھی ہے کوئی غیر طبیعی حرکت نہیں پائی جاتی۔ ذرا زبان تو دکھلائیے گا۔ زبان بھی موٹی نہیں ہے۔ (میرزا مسیح قلم دوات لے کے نسخہ لکھنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد فلک ناز سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔)

خانم! یہ دوا پاؤ بھر پانی میں جوش دیکے اور یہ سفوف ڈال کے گنگنی گنگنی تھوڑی تھوڑی دیر میں دن بھر پلائی جائے تین روز تک یہی نسخہ جاری رہے گا۔ تیسرے روز میں خود آجاؤں گا۔ بلوانے کی ضرورت نہیں غذا میں سوائے نیم برشت انڈا۔ دودھ اور ہلکے شوربے کے اور کچھ نہ دیا جائے۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ہر تدبیر سہولت و آسانی سے انجام پائے۔ ایسا نہ ہو کہ مریض کو غصہ آجائے اور خون جوش کھا جائے۔ (جاتے وقت ان الفاظ کا اعادہ کرتا ہے) انشاء اللہ بہت جلد طبیعت سنبھل جائے گی۔ ذرا بھی بددل نہ ہونا چاہئے۔

پردۂ سوم

(اسی کمرے میں اللہ یار بیگ مصروف خواب ہے فلک ناز ایک طرف کھڑی دل سے باتیں کر رہی ہے۔)

فلک ناز:- یا اللہ! عجب ناگوار زندگی گذر رہی ہے مسلسل پانچ ماہ سے دادا جان صاحب فراش ہیں۔ اس مدت میں ایک لمحہ کے لئے مجھے آرام میسر نہ ہوا۔ تکالیف کے اعتبار سے یہ گھر میرے لئے جہنم سا بن گیا ہے۔ کیا فائدہ اگر اتنی تکالیف برداشت کرنے کے بعد بھی دادا جان اچھے نہ ہوئے۔ سب سے زیادہ مایوس کن یہ بات ہے کہ مرض کا مداوا طبیب نے یہ تجویز کیا ہے کہ انھیں دل تنگی نہ ہو۔ کوئی خبر ایسی نہ پہونچ جائے جس سے انھیں رنج ہو بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ بڑی مشکل کی بات ہے ——— کل صبح سے روسی فوج نے شہر کا محاصرہ کرلیا ہے اور غالباً آج دو ایک گھنٹے بعد شہر میں داخل بھی ہوجائیں گے

حکیم صاحب نے عجیب کشمکش میں مجھے ڈال دیا ہے۔ پانچ ماہ سے برابر دادا جان کو لڑائی کی خبریں اپنی طرف سے بنا بنا کر سناتی رہتی ہوں کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ان سے یہ جھوٹ نہ بولوں کہ آج ایرانی فوج فتحمند ہوئی۔ دن بھر اسی دروغ بافی میں گذرتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں یقین بھی آجائے۔ آخر جھوٹ کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔ اب تو معاملہ بڑی خطرناک حد تک پہونچ چکا ہے۔ روسی فوج تو تبریز کا محاصرہ کئے ہی ہوئے ہے۔ مگر میں ان سے کہتی رہتی ہوں کہ ایرانی فوج نے روس کے پایۂ تخت ماسکو کا محاصرہ کر لیا ہے جنگ قریب ختم ہے ایرانی فوج مظفر و فتحمند واپس آنے والی ہے۔ آج عصر کے وقت حسن علی خاں اور جعفر قلی بیگ مزاج پرسی کے لئے آئے تھے۔ وہ تو کہہ گئے کہ روسی فوج شہر میں داخل ہونے والی ہے۔ مگر بے چارے دادا جان کو میں نے اس خوبصورتی سے فوج ایران کی فتحمندی کی خبریں سنائی ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ بجائے روسی فوج کے ایرانی فوج فتحمند واپس ہو رہی ہے۔ (آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے رونے لگتی ہے) میرے بدنصیب دادا! تمہیں نہیں معلوم کہ کیا کیا مصیبتیں ہم پر نازل ہونے والی ہیں۔ تمہیں خبر نہیں کہ تم پر کیا سخت گھڑی گذرنے والی ہے۔ ۔ ہائے میرے ضعیف۔ عاشق وطن دادا جان! تم کیسے جانبر ہو سکو گے؟ مجھے تو یقین ہے کہ بابا جان بھی آخر وقت تمہاری بالین پر موجود نہ ہوں گے۔ (رونے لگتی ہے) اس قیامت خیز موقع پر جب کہ شہر کے ہر شخص کو نفسی نفسی کی پڑی ہوگی۔ میں عورت ذات بے یار و مددگار! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے لاوارثوں کے والی وارث میری مدد کر! از برائے رسول میری مدد کر! (پھر رونے لگتی ہے)

ہائے میرے ضعیف و ناتوان دادا۔ اگر تم اپنی فطری موت مرتے تو چنداں قلق نہ ہوتا، کیونکہ اتنی طویل عمر ہو چکی ہے۔ لیکن آہ۔ آہ۔ اس تکلیف سے خدا محفوظ رکھے جو تھوڑی دیر کے بعد تمہاری روح قبض کرے گی۔

ہائے بلاشبہ صورت حال کو وہ خود جان جائیں گے۔ اگرچہ اللہ نے مجھے اتنی ہوشمندی عنایت کی ہے کہ دو تین روز تک اور خبر شکست کو حیلے حوالے کر کے ان سے پوشیدہ رکھوں۔ لیکن۔ آہ۔ آہ۔ جب فوج روس شہر میں داخل ہو جائے گی تو میں اسے کس طرح چھپا سکوں گی۔ میرزا مسیح تو کہہ گئے ہیں کہ خبر بد مریض کے لئے خطرناک ہے۔ اس سے بدتر اور کونسی خبر ہوگی۔ بار الہا رحم کر! رحم! (رونے لگتی ہے اور چند منٹ بعد سر اٹھا کے چاروں طرف دیکھنے لگتی ہے۔)

صبح ہو گئی! اُف وہ بے خوابی سے میرا سر پھٹا جاتا ہے۔ یا اللہ کیا کروں؟ ایک طرف تو میرا جی نہیں مانتا کہ مریض کو چھوڑ کے چلی جاؤں۔ ممکن ہے کہ اس پر کوئی بلا نازل ہو جائے۔ دوسری طرف اگر ذرا دیر سوتی ہوں تو یہ خوف ہے کہ تیمارداری میں فرق آیا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مریض ختم ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کی ہر مصیبت آ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میرے سر پر چھا جا! (یہ کہہ کے سر جھکا دیتی ہے۔) پھر ذرا طبیعت سنبھال کے کہتی ہے۔ سب کا مالک خدا ہے۔ بندے کو اسی پر بھروسہ چاہیئے! اچھا۔ دادا جان جب تک مصروف خواب ہیں۔ میں بھی جا کے تکیہ پر تھوڑی دیر سر رکھ لوں اور پھر فوراً ان کی خبر گیری کے لئے موجود ہو جاؤں۔ خدا سے امید ہے کہ جب تک میں واپس نہ آجاؤں وہ بیدار نہ ہوں گے۔ (نہایت سست رفتار سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔

فلک ناز کے چلے جانے کے بعد اللہ یار بیگ بستر پر کچھ کسمسانے لگتا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اس کے جسم میں زیادہ حرکت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ بایاں ہاتھ ٹیک کر بڑی مشکل سے بستر پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے۔ پہلے تو زبان سے کچھ ادھورے الفاظ نکلتے ہیں لیکن کچھ دیر بعد زبان سلیس ہو جاتی ہے۔)

غ ۔ ۔ ۔ ۔ خ ۔ دایا ۔ ع ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ع ۔ جب ۔ خواب بد تھا۔ آہ ۔ ۔ ۔ میں کیا دیکھ رہا تھا! خدایا رحم کر کہ بدبخت روسی اس خاک پاک پر قدم رکھیں گے۔ مگر ایسا ممکن نہیں۔۔ ہائے یہ پاک زمین اور نجس روسیوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں۔ نہیں۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ غیر ممکن ۔ ۔ ۔ مجھے یقین نہیں آتا! ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک اللہ یار زندہ ہے ۔ ۔ جب تک اس کے فرزند اردشیر کے دم میں دم ہے ۔ ۔ ۔ جب تک ایرانی نسل باقی ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ (کچھ ٹھہر کے) بہترین دلیل اس کی یہ ہے کہ فوج نادری کے مقابلے میں ایک لاکھ روسی فوج کچھ نہ کر سکی۔ نابکار رسوائے خلق ہوئے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ فوج ایران سے مقابلہ کوئی بازیچہ نہیں۔ اور نہ سرزمین ایران ایسی جگہ ہے کہ جس کا جب جی چاہے اس میں داخل ہو جائے (اپنی طرف دیکھ کے کچھ سوچتا ہے اور مسکرا دیتا ہے)

ہاں! ایران کی غیرت مند نسل ابھی باقی ہے ۔۔۔ میں باوجود ضعیفی و بے طاقتی اپنے میں اتنی جرأت پاتا ہوں کہ سو روسیوں کے سر تن سے اڑا دوں (اپنے بازوؤں کی طرف دیکھ کے) ہاں انہی بازوؤں سے جنہوں نے تمام عالم کے پہلوانوں کے منہ

سی دے —— انھیں بازوں سے جنکی نادر ایسے بہادر سپاہی نے تعریف کی!

روسیو! اپنی خودسری کا مزہ چکھو اور ایران پہ حملہ کر کے اپنے کئے کی سزا پاؤ!

(خاموش ہو کے اپنے چہرے اور سر پہ ہاتھ پھیرنے لگتا ہے)

اس میرزا مسیح۔طبیب احمق کو تو دیکھو کہ میرے حال پر افسوس کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میرا خون اس قدر جلد سرد پڑ جائے گا۔ اسے گمان ہے کہ ایک ایرانی اتنی آسانی سے دم توڑ دے گا۔ ایرانی بڑا سخت جان ہے! ہاں! ہدایت کر گیا ہے کہ مجھے خبر بد نہ پہونچنے پائے؟ اسے خبر نہیں کہ ایران جب کسی سے برسر پیکار ہوتا ہے تو خبر بد نصیب دشمناں ہوا کرتی ہے۔ (غصہ آجاتا ہے) یہ احمق طبیب کیا کہہ گیا۔ کہ میں بڈھا اور کمزور ہوں۔ کیا یہ سمجھا کہ میرے ان بازوں میں طاقت نہیں رہی (جوش میں آ کے) نہایت دقت سے اپنا بازو سر کے قریب لاتا ہے پھر اسے تکان دے کے آسمان کی طرف بلند کرتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اسے دبانے لگتا ہے)۔ یہ ہے وہ بازو جسے بیکار کہا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ وہ بازو جس نے نادر کے ساتھ شمشیر زنی کی ہو آسانی سے بیکار ہو جائے۔ ممکن ہے کہ وہ چند روز کیواسطے بے حس ہو جائے لیکن وہ اس شیر کے مانند ہے جو اپنے شکار کی گھات میں خاموش ہو جاتا ہے۔ مگر جب موقع آجاتا ہے تو بجلی کی طرح ڈنکارتا ہوا کمین گاہ سے نکل پڑتا ہے اور اپنے فولادی پنجے دشمن کے سینے میں پیوست کر دیتا ہے۔ (بازو کو تیزی سے حرکت دیتے ہوئے) مجھے ان بازوں سے ابھی کام لینا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ یکبارگی بیکار ہو جائیں —— چاہئے تو یہ ہے کہ آج شمشیر نادری اس ہاتھ میں ہو۔ اور جب فوج ایران پرچم فتح لہراتی ہوئی شہر میں داخل ہو تو اسی شمشیر سے فوجی سلام دیا جائے۔

یہ احمق طبیب کہہ گیا ہے کہ میرا سیدھا پاؤں بے حس ہو گیا ہے (جس طرح پہلے ہاتھ کو حرکت دی تھی اسی طرح پاؤں کو بھی حرکت دیتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے . . . . . . اے احمق طبیب! آ دیکھ لے کہ ایک ایرانی سپاہی کا پاؤں مرتے دم تک دشمن کا تعاقب کرنے اور فاتح فوج ایران کا استقبال کرنے کے لئے تیار ہے۔ آج یہ پاؤں وزیر ایران کے استقبال کے لئے اور اس کے بعد اپنے فرزند رشید . . . اردشیر بیگ کو گلے سے لگانے کے لئے آگے بڑھے گا —— آج اس پاؤں کا یہ کام ہو گا کہ نادر شاہ کے نمائندے کو اس فتح وظفر کے موقع پر حاضر کرے (کچھ سوچ کے) درست ہے کہ آج فوج ایران فاتح واپس ہو رہی ہے —— اچھا مجھے اپنا فوجی لباس زیب جسم کر لینا چاہئے پیٹی کس لینی چاہئے اور ڈاب میں تلوار رکھ لینی چاہئے۔ (صندوق کی طرف بڑھتا ہے اور اسے کھول کے فوج نادری کی وردی نکال لیتا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے پہننے لگتا ہے اور کہتا ہے) اس لباس کو خدا نے اسی روز کے لئے بنایا ہے! آج نادر شاہ موجود نہیں جو اپنی مبارک زبان سے فتحمند فرزندان ایران کی تحسین و آفرین کرے۔ لہذا اللہ یار بیگ اس کے ایک سردار کو گھر میں آرام سے نہ بیٹھنا چاہئے بلکہ استقبال کے لئے میدان میں جانا چاہئے (کاٹھی سے تلوار کھینچ کے) مجھے لازم ہے کہ اس تلوار سے جس طرح نادر شاہ اعظم کو میدان جنگ میں سلامی دیا کرتا تھا اسی طرح غیر تمند و فتح نصیب فرزندان ایران کو آج سلامی دوں . . . (تلوار کو چوم کے) اے شمشیر عزیز! اے اے یادگار نادر شاہ بزرگ! برسوں سے تو اس صندوق سے باہر نہیں نکلی تھی لیکن آج موقع آہی گیا کہ تو اپنے چمکتے ہوئے پھل کو آفتاب کی طرح اس شہر میں چمکا کے دکھا دے (تلوار کی دھار الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتا ہے) ہا! یہ تیغہ دشمنان ایران کے خون سے صیقل ہوا ہے۔ اس میں زنگ کی مجال کہاں ویسا ہی چمکتا رہے گا . . . . . . یہی وہ تلوار ہے جو نادر شاہ نے محاصرہ دہلی کے وقت مجھے اپنے ہاتھ سے عنایت فرمائی تھی۔ اللہ یار بیگ! اس تلوار کے قبضے پر اپنا مضبوط پنجہ جما دے . . . . . اور یاد رکھ کہ جب تک جسم میں ہاتھ لگا رہے اس کی روانی نہ رکے! . . . . . .

اے میری پیاری تلوار . . . ابھی میرے جسم میں ہاتھ ہیں۔ یہ وہی ہاتھ ہے۔ یہ وہی بازو ہے جس نے نادر شاہ کے ہاتھ سے تجھے لیا تھا۔ آج تجھ سے یہ کام لینا باقی تھا کہ ایران کے فرزندان غیور کی سلامی کے لئے بلند ہو —— ٹھیک ویسے ہی جیسے قتل عام کے بعد دہلی میں تجھے بلند کر کے نادر کو سلامی دی گئی تھی۔ (جسم سمیٹ کے اور تلوار کھینچ کے سلامی دیتا ہے) اے پیاری تلوار! آ تجھے پھر ایک مرتبہ زیب کمر کر لوں (تلوار کمر سے باندھ لیتا ہے) —— ہا! صحرائے مغاں میں بھی میں یہی لباس پہنے تھا اور یہی تلوار میرے ہاتھ میں تھی —— آج تبریز کے میدان میں بھی اسی لباس اور اسی تلوار کے ساتھ لوگ فوج نادری کے ایک سردار کو دیکھیں گے۔

(چاروں طرف دیکھ کے کہتا ہے —— صبح ہو گئی۔ دیکھوں شہر میں

کیا خبر ہے۔ بالاخانے پر آ کے کھڑکی کھولتا ہے۔ باہر نظر ڈال کے مجنونانہ انداز سے کہتا ہے)۔ . . . . خدایا ـــ میں کیا دیکھ رہا ہوں ہر طرف خاموشی! کیا ردزِعزا ہے . . . . . عجب بے حمیت اور بے غیرت لوگ ہیں! آخر ـ نابکارو ـ یہ خوشی کا روز ہے ـ تمہارے برادران وطن فاتح واپس آ رہے ہیں ـ آخر عورتوں کی طرح کیوں گھر میں گھسے بیٹھے ہو ـ آج تو لباس عید پہننا چاہیئے ـ اپنے سروں کو فوج ایران کا فرش راہ بنانا چاہیئے . . . . . لو ـ وہ دور سے غبار اٹھا ـ وہ آ رہے ہیں ـ اب وزیر جنگ فاتح فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہوتے ـــ بے شبہ میرا فرزند عزیز نادر شیر بھی انکے عقب میں آ رہا ہے ـ وہ آئے ـ وہ آ پہنچے! اور آگے بڑھو تاکہ اللہ یار بیگ تمہارے بازؤں کے قربان ہو جائے!!

(عجب حیرت سے دیکھتا ہے اور اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے)

خدایا! . . . . میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ خواب ہے یا بیداری! خدا نہ کرے کہ درست ہو . . . ہائے ـ کیا دیکھ رہا ہوں ـ ہائے . . . . ہائے . . . . . یہ کیسا دلخراش منظر ہے! سفید ٹوپی! سرخ قزاقانہ لباس! یا اللہ ان ملعونوں سے اور اس مقدس سرزمین سے کیا واسطہ! کیا غیور ایرانی مر گئے؟ آہ . . . . . ان بدبختوں کو مادرِ وطن میں کیوں گھسنے دیا! (جسم میں شدید لرزہ پیدا ہو جاتا ہے) یہ پدر سوختہ مجھے دھوکہ دے رہے ہیں! یا خدا ـ یہ کیسا عذاب ہے جس میں تو نے اپنے اس ناچیز بندے کو آخر عمر میں مبتلا کیا؟ (تلوار نیام سے کھینچ کے) ہا! تم تبریز میں داخل ہو گئے! دشمنو! تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اللہ یار بیگ ابھی زندہ ہے؟ تمہاری کیا مجال کہ اب ایک قدم آگے بڑھ سکو! خدایا اس وقت نادر کہاں ہے! کہاں ہے نادر!!! (زمین پر گر کر بیہوش ہو جاتا ہے)

غزل

ذابر محمد قاسم

مسکراہٹ سے یہ ہوا ظاہر ۔۔۔ دلبری میں ہے تو بڑا ماہر
تیرے ماتھے پہ جگمگاتے ہیں ۔۔۔ میرے آنسو برنگ آب خضر
کیوں بلاتی ہے موجۂ دریا! ۔۔۔ ڈوبنے میں ہوں میں ہی کیا ماہر؟
ساتھ میرا نہ دے سکے تارے ۔۔۔ چار جھونکوں میں سو گئے آخر

اپنی سنگین گود پھیلا دے
موت آتا ہے اس طرف ذابر

دکن کی برسات

ماہر القادری

ہوائیں مسکراتی جا رہی ہیں ۔۔۔ گھٹائیں لڑکھڑاتی جا رہی ہیں
بہ عنوانِ تراوش نرم بوندیں ۔۔۔ پکھاوج سی بجاتی جا رہی ہیں

دلِ پُر درد کی دیرینہ چوٹیں
ابھر کر کام آتی جا رہی ہیں

چمن کا پتہ پتہ دھل رہا ہے ۔۔۔ اندھیرے میں اُجالا گھل رہا ہے
کسی بدمست دوشیزہ گھٹا کا ۔۔۔ سر کہسار جوڑا کھل رہا ہے

خوشی ماحول پر چھائی ہوئی ہے
کہ پھولوں میں زمانہ تل رہا ہے

پپیہا اک قیامت ڈھا رہا ہے ۔۔۔ بڑے اونچے سُروں میں گا رہا ہے
ارے! یہ گرمئ کیف و مسرت ۔۔۔ گھٹاؤں کو پسینہ آ رہا ہے
بہت ہلکی پھواریں پڑ رہی ہیں ۔۔۔ کہ جیسے عطر چھڑکا جا رہا ہے

میں خود ہوں اپنے تیروں کا نشانہ
کوئی میری غزل کو گا رہا ہے

جگر میں درد پایا جا رہا ہے ۔۔۔ مجھے شاید بُلایا جا رہا ہے
نقابِ رخ اٹھایا جا رہا ہے ۔۔۔ وہ نکلی دھوپ بہ جا رہا ہے
ستارے سسکیاں سی لے رہے ہیں ۔۔۔ کسی کا دل دُکھایا جا رہا ہے
وہ خاکِ دل سے بچ کر چل رہے ہیں ۔۔۔ ابھی تک آزمایا جا رہا ہے
رواں اس غم نہاں ہیں شبنم کے آنسو ۔۔۔ کلی کو کیوں ہنسایا جا رہا ہے
مریضِ غم کو آ کر دیکھ جاؤ ۔۔۔ کہ تم پر حرف آیا جا رہا ہے

سناتے ہو کسے روداد ماہر
وہاں تو مسکرایا جا رہا ہے

گلی کے موڑ پر جھٹکے[1] کھڑے ہیں ۔۔۔ بہت ہی تیز موٹر چل رہے ہیں
کہیں پر ڈھیر باں ہیں دُ نشانکی[2] ۔۔۔ کہیں پر قفلیاں ہندوستانکی[3]
وہ آئی سامنے سے آم والی ۔۔۔ لبوں پر پان کے بیڑے کی لالی
بہت ہی چاق چوبند اور چنچل ۔۔۔ زباں اردو مگر لہجہ تلنگی

پھلوں کا ٹوکرا سر پر دھرا ہے
گھٹا کا جس پہ سایہ پڑ رہا ہے

بہت پُر کیف رم جھم ہو رہی ہے ۔۔۔ گھٹا جیسے فضا کو دھو رہی ہے
فضا میں تیرتے ہیں ابر پارے ۔۔۔ نم آلودہ ہواؤں کے سہارے

حسرت کارواں در کارواں ہے
دکن برسات میں جنت نشاں ہے

[1] یکہ کی قسم کی ایک سواری [2] آم کی ایک قسم [3] اہل دکن یوپی کو ہندوستان کہتے ہیں

دو غزلیں

اختر شیرانی

نو بہاروں کا سماں دکھلا چلے — جب بھی آئے پھول سے برسا چلے
راندنِ کب تک سنائے جائیگا — بس کر اے غم، اب تو ہم گھبرا چلے
کب تک آئینگے وہ اے صبحِ فراق! — اب تو سارے پھول بھی کمھلا چلے!
پہلے ساتھی تھا نہ اب ساتھی کوئی — آئے تھے تنہا یہاں، تنہا چلے!
وہ نہ آئے لے کے پیغامِ بہار — آرزوؤں کے چمن مرجھا چلے
تیرے پائے نازنیں پر گر سکیں — ساقیا اک دور تو ایسا چلے

آہ، اختر وہ نگاہِ فتنہ گر
دل کے ارماں، سب کے سب مرجھا چلے

نذرِ حافظؒ

پلائے جا، پیئے جا خوب ساقی! — کہ ہستی ہے سراسر اتفاقی!
جہاں کی لذتوں سے تھک چکے ہیں — نہیں کوئی تمنا دل میں باقی
ٹھہر اے ساربانِ محملِ ناز! — "الی رکبانکم طال اشتیاقی"
کسی صورت بہلتا ہی نہیں دل — "سلیمیٰ منذ حلّت بالعراقِ"
وہ جانِ آرزو ہے دور جب سے — "اُلاقی فی ہوا ہا ما اُلاقی"
غموں کا سایہ کب تک زندگی پر؟ — گنوا دے میکدے میں عمر باقی!
چھلک جائے نہ مینائے دو عالم — ہمارا ہات ہے اور زلفِ ساقی!
بتانِ ہند سے جی بھر چکا ہے — کدھر ہیں نازنینانِ عراقی؟

نہیں ہے عشق اگر اختر تو کیوں ہیں
یہ راتیں اور غزلہائے فراقی!

«یونیسکو» میں هندوستانی نمائندے

«یونیسکو» کی جنرل کانفرنس کے پہلے اجلا
میں هندوستانی نمائندوں نے بھی شرکت کی۔
میں سے چند پہلے سے وهاں موجود تھے
صرف تین نمائندے ۱۲ نومبر کو نئی دهلی سے
روانه هوئے جو اس تصویر میں موجود هیں
(بائیں طرف سے) مسٹر آغا محمد اشرف (حکومت
هند کے شعبۂ تعلیم کے ایک افسر) محترمہ
راجکماری امرت کور اور مسٹر غلام السید
(هندوستانی ریاستوں کے نمائندے) سر راد
کرشنن اس وفد کی قیادت فرمائینگے۔

۱۱ نومبر کو حکومت هند اور حکومت امریکه کے مابین
هوائی حمل و نقل کے سلسلے میں ایک نیا معاهده عمل میں
آیا ہے۔ حکومت هند کی طرف سے پنڈت جواهر لال نهرو
اور سردار عبدالرب نشتر دستخط فرما رهے هیں۔ تفصیل
کیلئے «رفتار زمانه» صفحه نمبر ۵ ملاحظه هو۔

شاہ فیصل والئی عراق

عراق کے بادشاہ اعلیحضرت شاہ فیصل عربی
زبان کا مشهور ماهانه رساله «النفیر» بڑے
شوق سے مطالعه فرما رهے هیں جو ا
متحده دهلی سے شائع هوتا ہے۔

ن کے شہر مقدبہ میں ترکوں سے تیل کے کنوئیں چھیننے میں
لیا کی لائٹ ھورس بٹالین نے بڑی بہادری دکھائی تھی۔ اس موڈل
ں اسی سوار فوج کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔
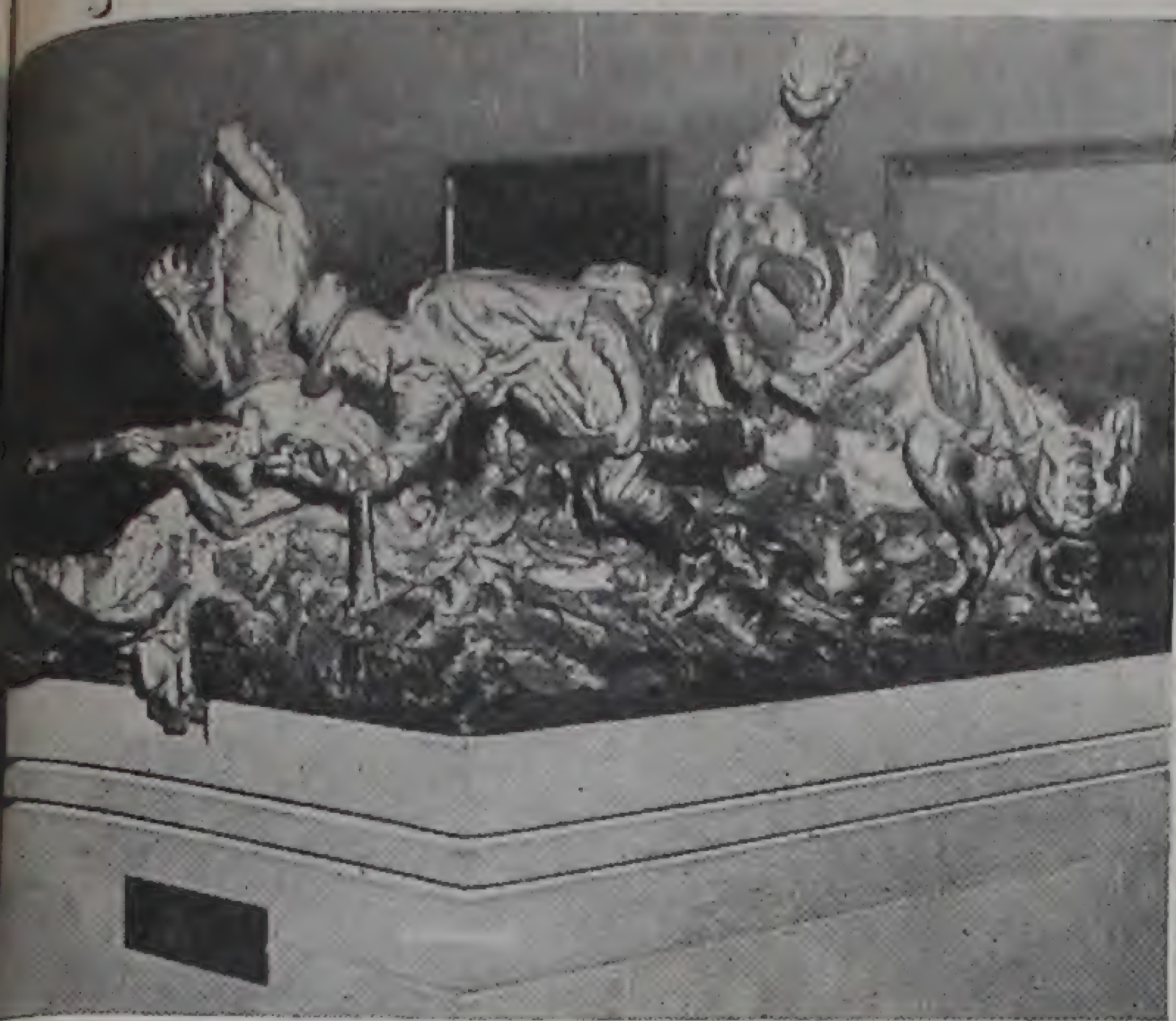
فلسطین اور سینا میں لڑنے والی آسٹریلیا اور نیوزیلین
کی فوجوں کی یادگار قائم کرنے کیلئے جورج لیمبر
نے کانسے کے یہ خوبصورت مجسمے تیار کئے تھے

پہلی جنگ عظیم میں مرنے والوں کی یادگار آسٹریلیا میں

ٹھیک انہوں دنوں جبکہ آسمان مغرب پر پہلی جنگ عظیم کے تاریک بادل چھائے ہوئے تھے آسٹریلیا کے ایک جنگی نامہ نگار نے جو خبریں بھیجنے
س میں مقیم تھا - اپنے ہم وطن سپاہیوں کی یادگار قائم کرنے کے خیالی خاکے بنانے شروع کردئے - اس خواب کی تعبیر ۲۴ سال بعد دوسری جنگ
کے دوران میں نکلی - یعنی ۱۹۴۱ ع میں قومی جنگی یادگار تعمیر کرائی گئی - جس پر ڈھائی لاکھ پونڈ خرچ ہوئے - لیکن وہ نوادر جو اسکے اند
ھیں بہت بیش قیمت ھیں - اس میں خشکی تری اور ہوائی لڑائیوں کی ایسی ہزاروں تصویریں جمع ھیں جنکا ثانی ڈھونڈے نہیں مل سکتا - وہ سو
لدوں میں ھیں اوران کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے - جنگی روز نامچے ، رپورٹیں ، تاریخی نقشے وغیرہ ان کے علاوہ ھیں- مورخ اور طالب
فائدہ اٹھا سکتے ھیں - آسٹریلیا کے فوجی سپاہیوں اور افسروں نے اس تاریخی یادگار کو ہر لحاظ سے مکمل کرنے میں بڑی مدد کی ہے - ڈاکٹر ب
ی طور پر جنگی مورخ قرار
ر اپنے کارنامے کے صلے میں
وف لٹریچر ہوئے - اب دوسری
عظیم کے سلسلے میں مسٹر
ونگ آسٹریلیا کے جنگی مورخ
ونے ھیں - وہ بھی قابل یادگار
جمع کرنے میں مصروف ھیں -
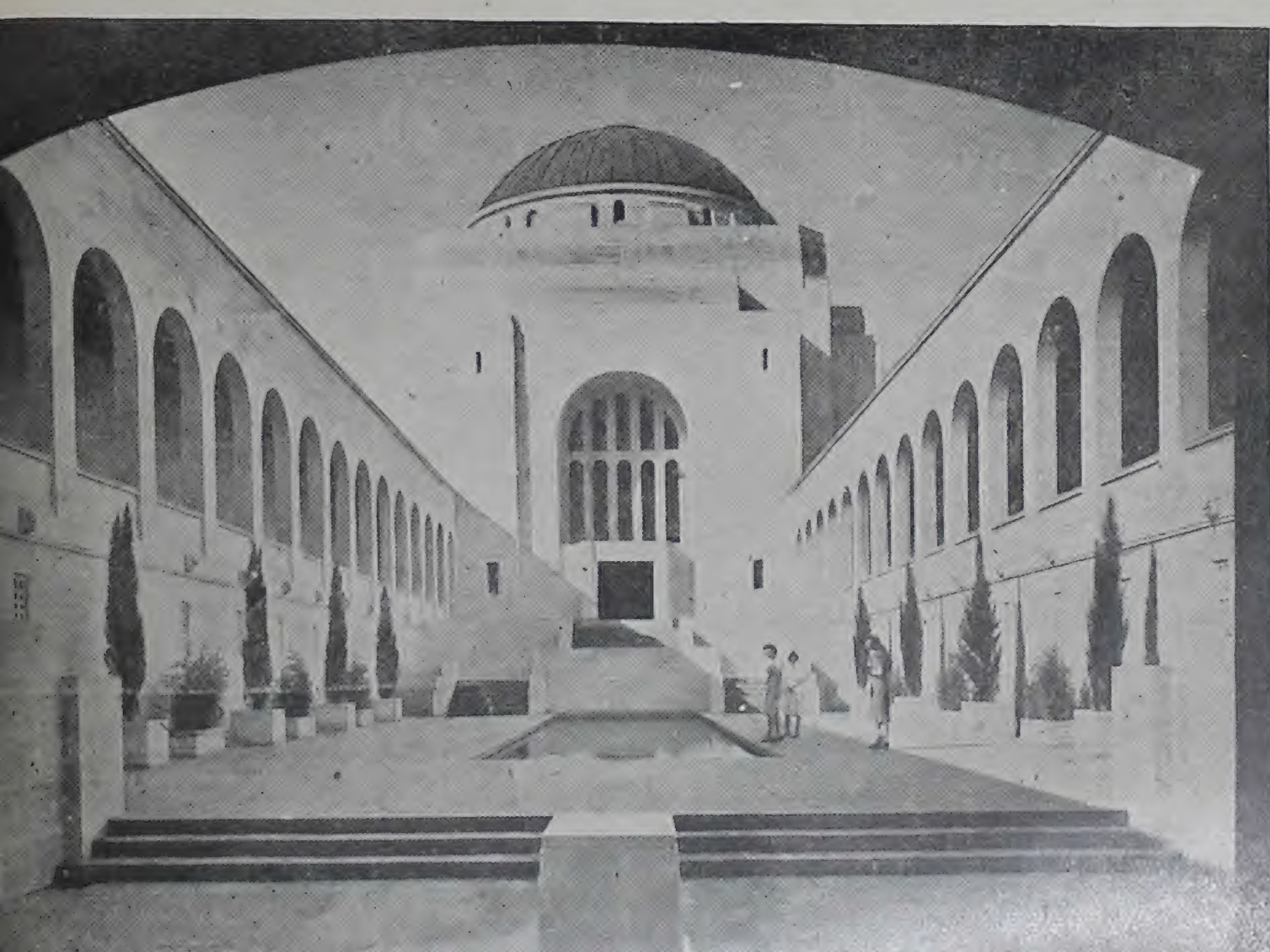
لیا میں یادگار جنگ کی یہ
۳۹۰ فٹ لمبی اور ۱۹۶
وڑی ھے. گنبد ۱۱۷ فٹ
ھے- وسطی صحن میں ایک
وض ھے جس کے پانی پر
کے مناظر کا عکس پڑتا ھے -
کی صحنچیوں میں کانسی
سی تختیاں نصب ھیں جن
ٹریلیا کے ان بہادر
ں کے نام کندہ ھیں جو

سقف و بام کی آرائشیں

ایران کی سر زمین پر جس شخص نے ایک بار قدم رکھ لیا یا جس نے وہاں کی مصنوعات کو قریب سے ایک نظر دیکھ لیا بس وہ دل و جان سے اسکا والہ و شیدا ہوگیا. مشہور استادان فن کی مصوری اور نقاشی کے شاہکار ابتک پوری آب و تاب کے ساتھ برقرار ہیں اور صحیح ذوق رکھنے والوں کی روحوں کو لطف و نشاط بخشتے ہیں لوگوں کے فطری ذوق کے ساتھ وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور قدرتی مناظر کی دلچسپ کیفیات مل کر فنون لطیفہ کی ترقی کا باعث ہوتی ہیں۔ بادشاہوں کے محل تو ایک طرف مسجدوں اور مدرسوں کی دیواریں، چھتیں، محراب و منبر اور مینار بھی نقاشی، مصوری۔اور کاشیکاری کے وہ دیدہ زیب نمونے پیش کرتی ہیں کہ عقل انسانی انہیں دیکھکر دنگ رہ جاتی ہے۔ خراسان و آذربائیجان، ہمدان و شیراز اور یزد و اصفہان ایسے شاہکاروں کے مرکز رہے ہیں۔ اس صفحے کی تصاویر ان کمالات کے چند عکس پیش کرتی ہیں۔
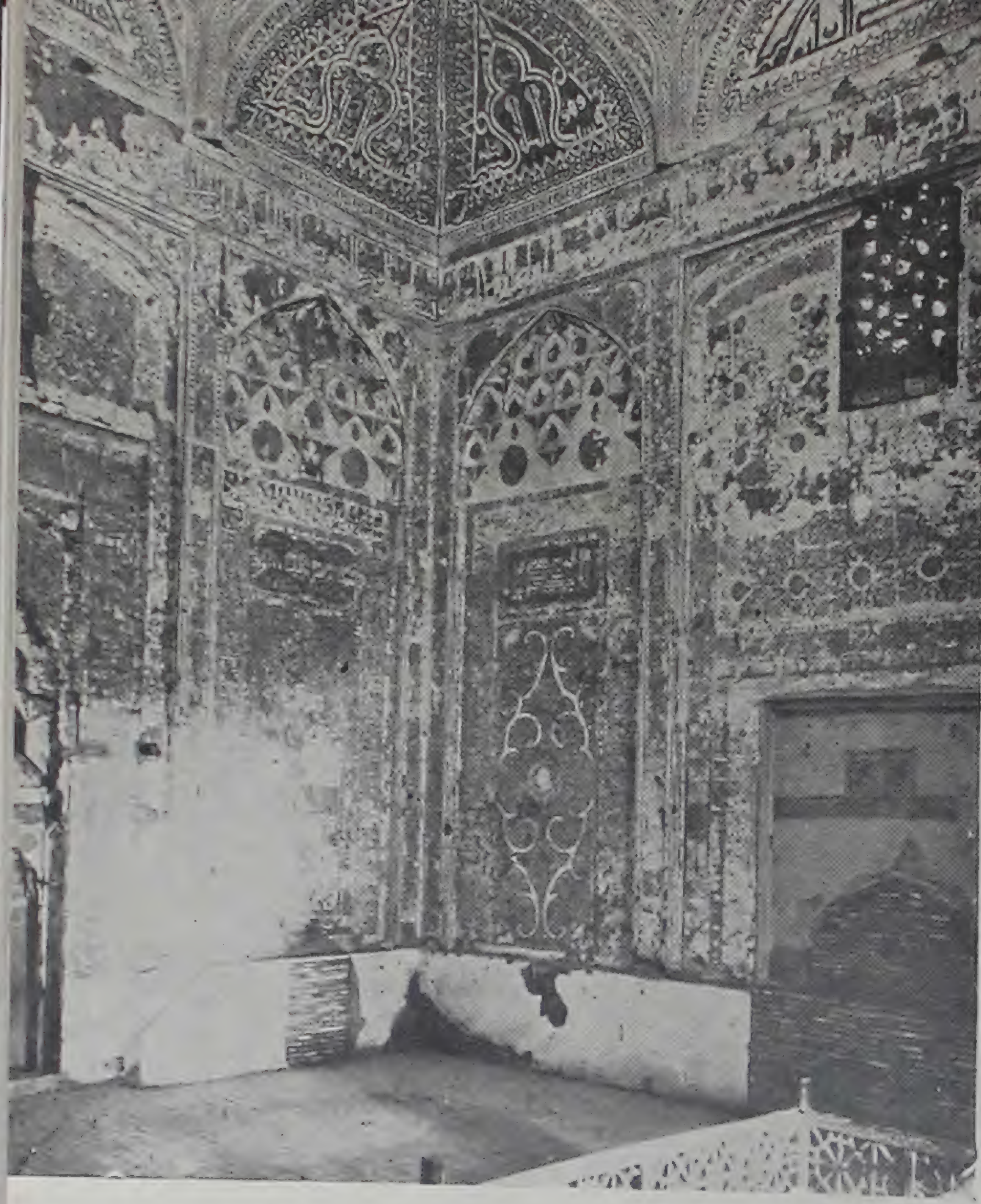
شہر یزد کی مسجد «وقت الساعت» کا ایک خوشنما حصہ۔ محرابوں کی نقاشی اور گلکاری قابل دید ہے۔
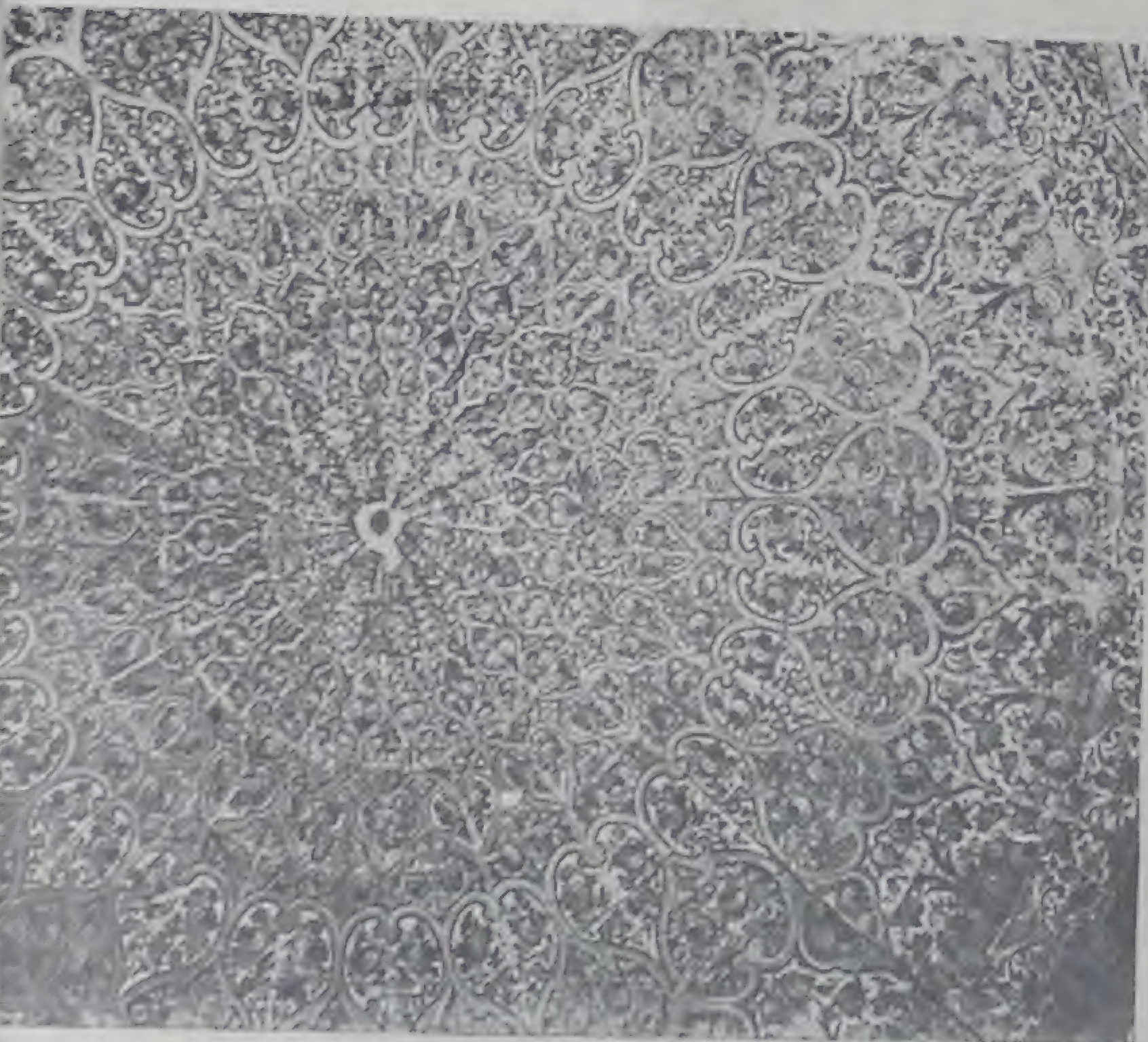
«مدرسۂ خان» کی چھت کا ایک اور منظر۔ یہ خاندان زندیہ کے عہد کی یادگار ہے۔

شیراز میں «مدرسۂ خان» کی چھت کا ایک حصہ جسکی

دیال باغ۔ آگرہ۔

رادھا سوامی فرقے کے پانچویں گرو نے ۱۹۱۵ء میں آگرہ کے قریب "دیال باغ کے نام سے ایک بستی قائم کی تھی جو اسوقت تین ہزار ایک سو ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس پر ستر لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ وہاں چھ ہزار سے زیادہ لوگ آباد ہیں جن میں سے ایک ہزار کے قریب صرف طالب علم ہیں؟ ان میں ہندوستان کے ہر حصے اور ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں۔ بستی بالکل نئی وضع کی ہے۔ رہنے سہنے کے انتظام میں آرام کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

دیال باغ کے مدرسے میں لڑکے مٹی کے گلدانوں اور دوسرے برتنوں پر ہاتھ سے نقش و نگار بنانے سیکھ رہے ہیں۔

قابل استاد . . اسکول کے طلبا کو علم الحیوانات پر سبق دے رہا ہے۔ (نیچے) اس بستی میں خاص وضع کے ایسے مکانات بنائے گئے ہیں جو خوبصورت بھی ہیں اور آرام دہ بھی۔
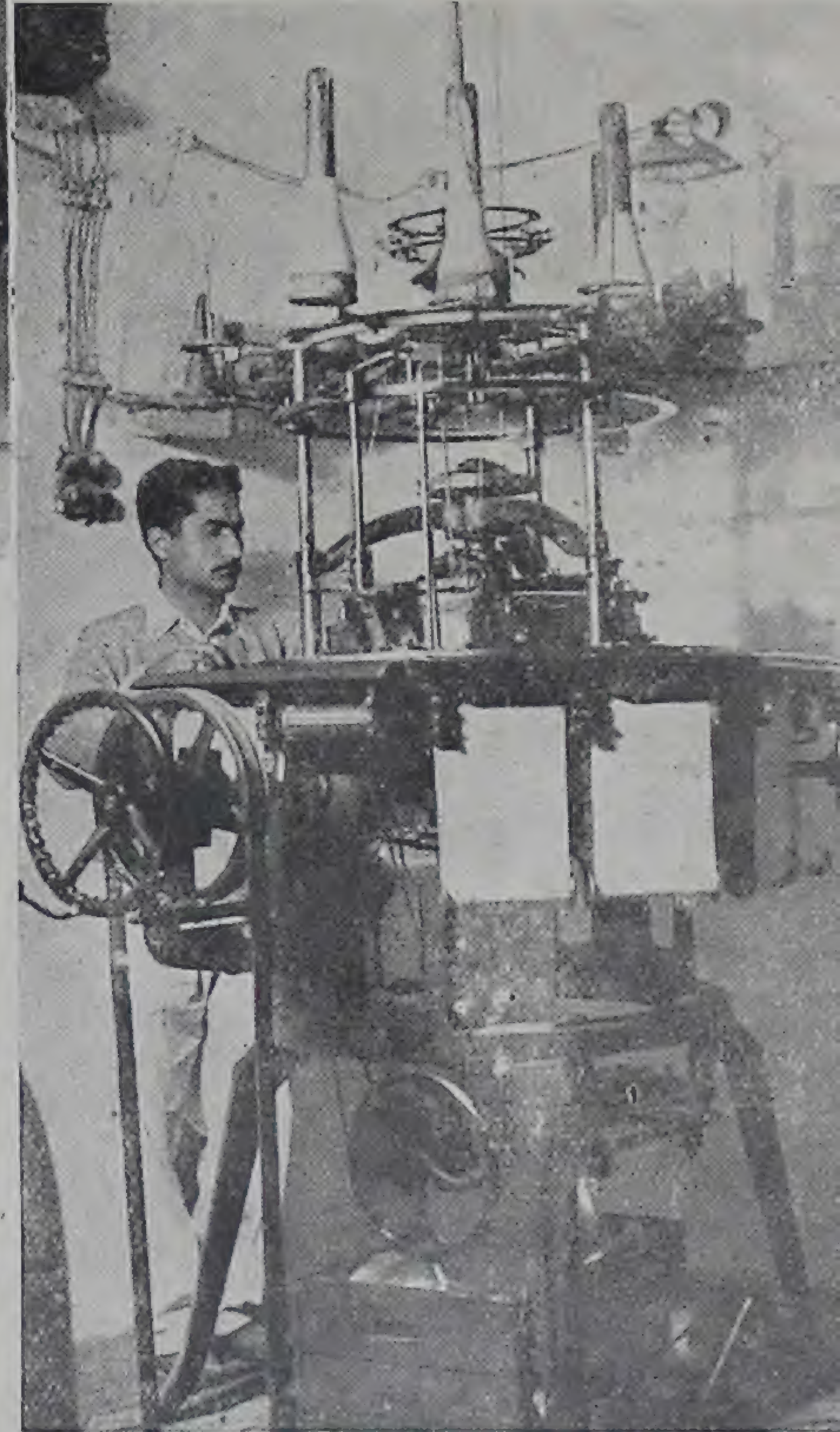
یال باغ کے ایک کارخانے میں مشین سے یان بنے جارہے ہیں۔ یہاں ہوزری کا

لڑکیوں کے کالج کا نام 'بریم ودیالیہ' ہے۔ لڑکیاں فرسٹ ایڈ کا کام سیکھ رہی ہیں۔ (بائیں طرف) کالج کی ایک لڑکی جلترنگ سیکھنے کی مشق کر رہی ہے۔ یہاں موسیقی کے سب ساز بجانے سکھائے جاتے ہیں۔
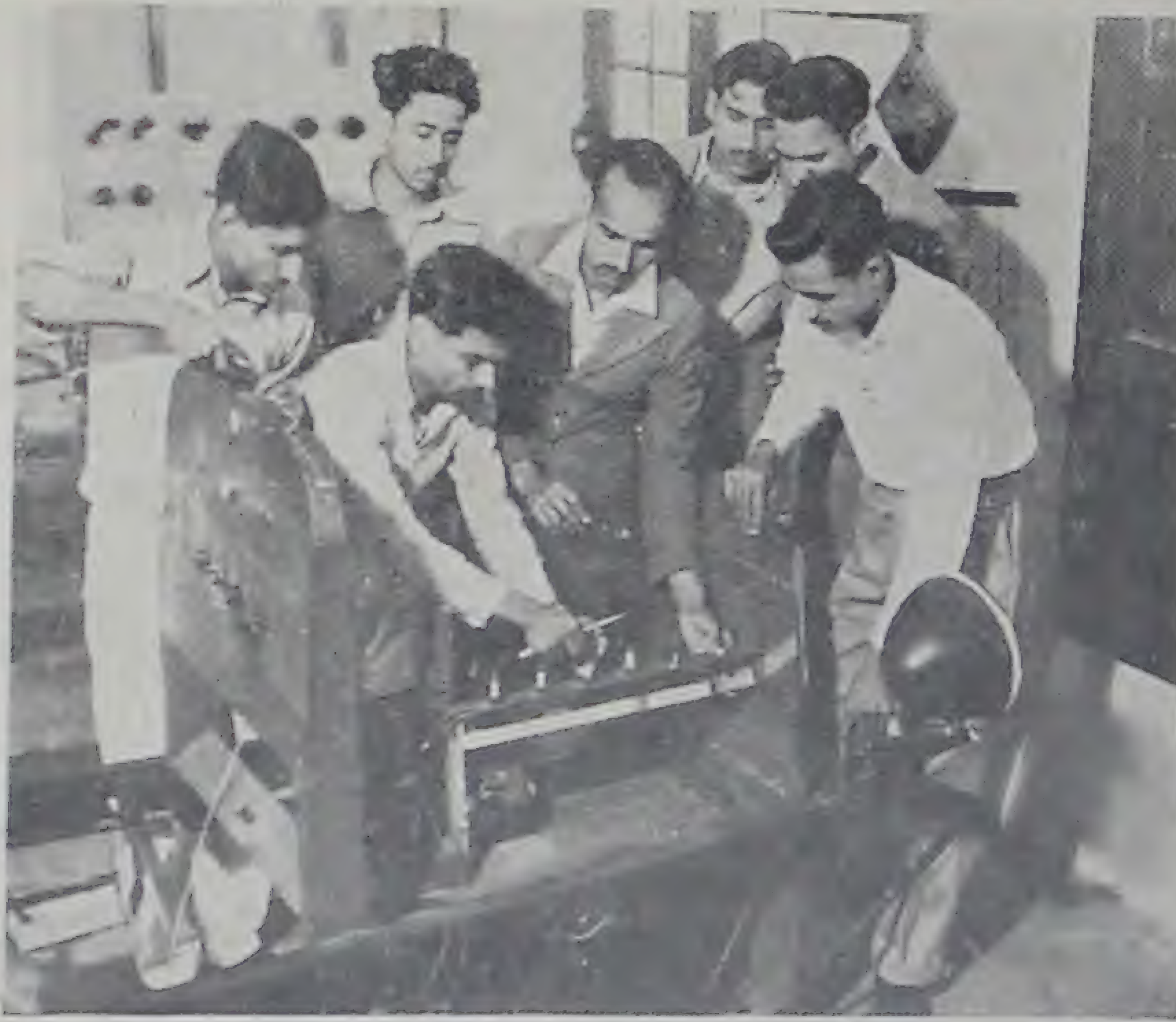
اسمیں ہر قسم کی تعلیم و تربیت کے مدرسے اور ہر صنعت و حرفت کے کارخانے قائم ہیں۔ اس فرقہ کے چھٹے اور موجودہ گرو سری مہتاجی مہاراج خود اسی بستی میں رہتے ہیں اور دینی اور دنیاوی معاملات میں اپنے پیروؤں کی رہبری کرتے ہیں۔

جدید صنعتوں کے سلسلے میں بھی ہر قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ ٹکنیکل کالج کے طلبا گاڑی کے موٹر پر تار لپیٹنا سیکھ رہے ہیں (نیچے) بجلی والے کارخانے میں بجلی کے پنکھے بنائے جا رہے ہیں۔

ڈیری میں بجلی سے چلنے والی مشین مکھن تیار کر رہی ہے۔

برما کا نیادور

کاشتکار ایک اجلاس میں شریک ہونے کیلئے جارہے ہیں۔

ابراودی ڈیلٹے کا ایک برمی کاشتکار۔ چوڑے
کا ٹوپ چہرے کے علاوہ پائپ کی بھی حفاظت کرتا

برما کی سرزمین ساڑھے تین
تک لڑائی کی تباہکاریوں کے زیر
رہی ہے - لیکن وہاں کی موج
سیاسی بیداری نے زندگی کا ایک
دور قائم کردیا ہے - اکتوبر ۱۹۴۵
میں وہاں شہری حکومت کا قیام
میں آگیا تھا - دارالعوام کے تاز
کے مطابق نئے انتخابات اپریل ۱۹۴۷
میں ہوجائیں گے - برما کے دیہاتوں
مسلح ڈاکوؤں کے جتھے ہمیشہ شو
بپا کئے رکھتے ہیں - چنانچہ کہا
ہے کہ ڈاکو برما کا سب سے بڑا د
ہے - اسلئے برما کے امن پسند
یعنی کاشتکار اور مزدور نئی انتظ
تنظیم کے ساتھ ساتھ امن وعافیت بھی چ
ہیں - امید ہے کہ پچھلے سال کی بہ ن
اس سال بیس لاکھ ایکڑ زیادہ ز
جوتی اور بوئی جائیگی اور اسط
وہاں بیس لاکھ ٹن چاول بچ رہیگ
برما کے معاملات میں ہندوستانیوں
ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے - یہ
آئندہ بھی قائم رہیگا۔

شہر ہنزادہ میں ڈسٹرکٹ کونسل افسران کی عمارت۔

سوڈان

شمالی افریقہ کے مشہور و معروف ملک سوڈان کی تصاویر اس صفحے پر شائع کی جارہی ہیں۔ مفصل مضمون آپ اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۵۵ سے ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔

خرطوم میں کچنر اسکول اوف میڈیسنز کی عمارت۔ ←
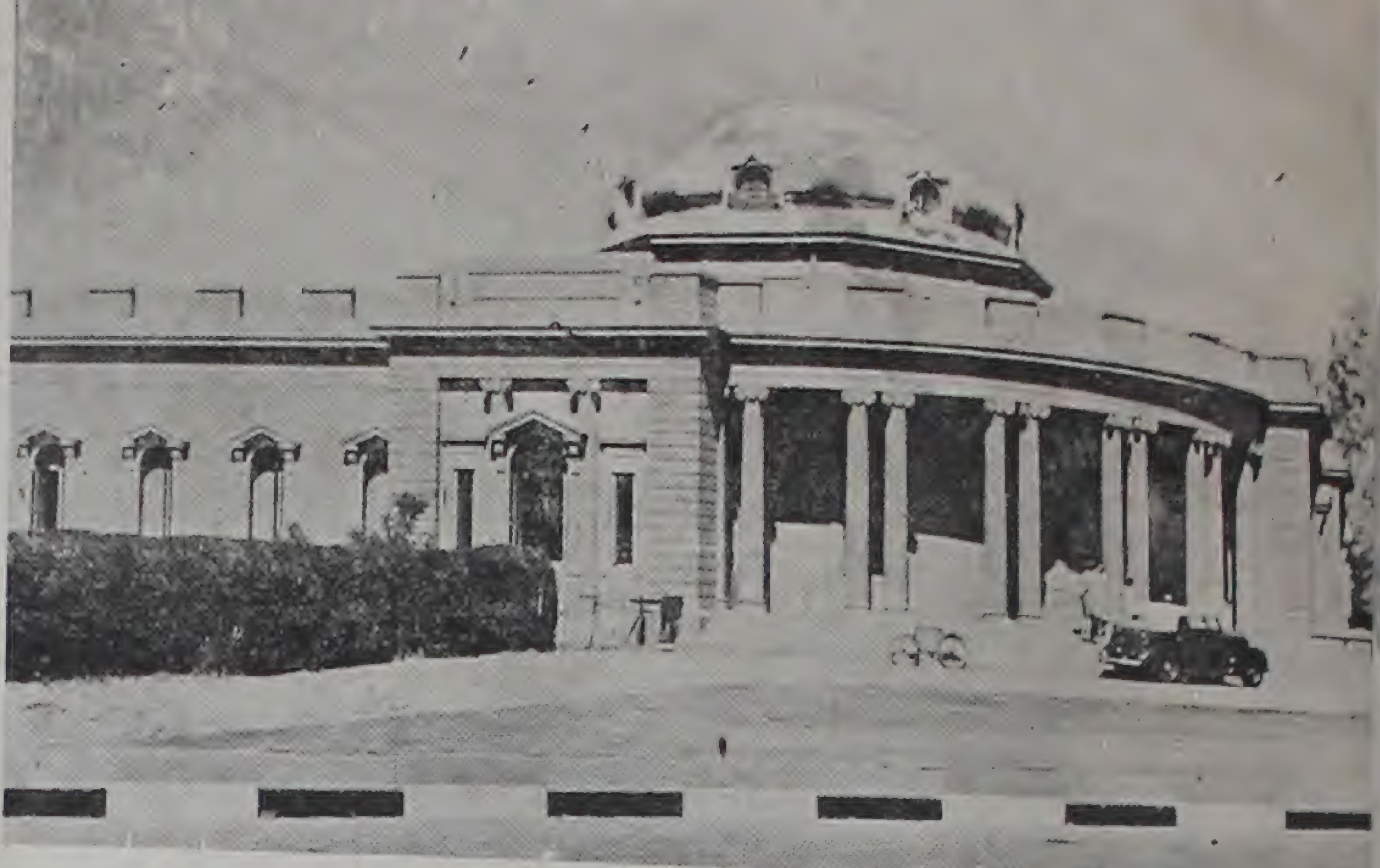
سوڈان میں برطانوی حکومت کو قائم ہوئے چالیس سال ہوگئے ہیں۔ اس دوران وہاں کے طبی اداروں نے ترقی کرکے اعلیٰ [illegible]ت حاصل کرلی ہے۔ خرطوم کا "کچنر [illegible]ول اوف میڈیسنز" سب سے اہم ادارہ ہے۔ [illegible] ڈاکٹروں، حفظان صحت کے انسپکٹروں، [illegible]کروں اور دائیوں وغیرہ کی تربیت ہوتی ہے۔ [illegible] میں سوڈانی بڑی دلچسپی اور ذمہ داری [illegible] ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ حفظان صحت کے امور کے علاوہ سوڈان کا طبی محکمہ اور بھی [illegible]ات انجام دیتا ہے مثلاً ایسی وبائی [illegible]یوں کے سلسلے میں تحقیق و تفتیش جو [illegible] ملکوں میں عام ہوتی ہیں۔ اس محکمے [illegible] دویات کی فراہمی کے علاوہ ایسا طبی عملہ بھی تیار کیا جسنے محاذ جنگ پر بڑے کارہائے نمایاں پیش کئے۔

ڈاکٹری سیکھنے والے ہونہار طلبہ اپنے مدرسے کی جماعت میں۔

حفظان صحت کا کام سیکھنے والے طلبہ خوردبینوں کے ذریعہ بیماری پھیلانے والے کیڑوں کی حقیقت سمجھ رہے ہیں ←

سربندر — ایک فلمی اداکار۔

میخانے

روشؔ صدیقی

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے
نگاہِ یار سلامت، ہزار میخانے

یہ کیا ہوا؟ اے دلِ ناداں کہ ان کی محفل تک
پہونچ گئے تری خاموشیوں کے افسانے

چراغِ دیر و حرم کا تو اک بہانہ ہے
خود اپنی آگ میں جلتے ہیں تیرے پروانے

شریکِ خلوتِ محبوب ہے یہ تنہائی
فروغِ انجمنِ ناز ہیں یہ ویرانے

مری شراب میں زہرِ خود آگہی تو نہ تھا
بدل دئے ہیں کسی خوش نظر نے پیمانے

کنارِ درد میں نیند آ گئی محبت کو
ہوئے تمام فریبِ سکوں کے افسانے

تری خبر ہے نہ اپنی خبر ہے کچھ، پھر بھی
الجھ رہے ہیں غمِ آگہی سے دیوانے

یہاں بھی رحمتِ پیرِ مغاں سے ہو محروم
وہاں کی بات بھی اے واعظو خدا جانے

نہ پوچھ گردشِ چشمِ سیاہ کا عالم
اتر رہے ہیں فلک سے زمیں پہ میخانے

کمال ہے مرے ذوقِ صنم پرستی کا
طوافِ ارضِ حرم کر رہے ہیں بتخانے

گناہ پاکیٔ داماں ہوا معاف روشؔ!
کیا ہے یاد کسی غیرتِ زلیخا نے

غزل

نجمؔ آفندی

نہ اب اہلِ دل ہیں نہ اب درد والے
محبت کے مالک محبت اٹھا لے

اب اس پر بھی ہے غیرتِ عشق راضی
ہمارا نہ بن ہم کو اپنا بنا لے

بدلتا نہیں ہے مزاجِ محبت
جفا آزما لے وفا آزما لے

سنا ہے تمہیں سے تمہیں مانگتے ہیں
بڑے بے جگر ہیں طلب کرنے والے

کوئی جان لے کر بھی اب دل نہ دیگا
کہاں دل کے بدلے میں دل دینے والے

محبت میں ہے یہ نزاکت کا پہلو
ہمیں کر گئے ہیں ہمارے حوالے

کسی کی بڑائی کا دشمن کے منہ میں
یہ گر ہیں دلوں کی زبانوں کے چھالے

وطن میں غریب الوطن ہو رہے ہیں
کسی پر خدایا مصیبت نہ ڈالے

یہاں دل ہی دل میرا در افسردگی ہے
کہیں ایک دل ہو تو سو دل سنبھالے

جہنم میں جاؤں تو اے نجمؔ رضواں
اٹھا کر جہنم کو جنت میں ڈالے

غزل

شرقیؔ خالدی

رہوں جو پائے اسرارِ بقا کیا
فنائے ہوش میں ہوشِ فنا کیا

عدم ہے زندگی سے آشنا کیا
نہ ہونے پر نظر آتا ہے کیا کیا

پشیمانی مآلِ نازشِ دل
ترا لطفِ تلون آشنا کیا

نہیں اٹھتی یہ تہمت زندگی کی
سرِ سودائے دردِ دل دوا کیا

جزاک اللہ خوئے سرد مہری
سپاسِ ہمتِ اہلِ وفا کیا

زمانہ نقشِ پائے اولیں ہے
جنوں کی شورشوں کا پوچھنا کیا

ہمیں خود مر مٹے ہیں زندگی پر
نگاہِ نازِ قاتل کا گلا کیا

ترے ہوتے بھی دل بیچین سا ہے
جنوں ہے مصلحت سے آشنا کیا

تمہیں ہر دل عزیزی سے تعلق
ہمارے غم سے تم کو واسطا کیا

نظر ملتے ہی شرقیؔ فیصلہ ہے
زباں کے واسطے سے التجا کیا

ایک نہ بھولنے والی رات

خواجہ محمد شفیع

میرا شباب کا زمانہ تھا،
آنکھوں میں چمک تھی، رخساروں پہ
سرخی، دل میں امنگ، جسم پر روپ
رانوں پہ قیامت کا گداز، کمر میں
چیتے کی سی لچک، سینہ بھرا ہوا، بازو
بنے ہوئے، رفتار میں مستی تھی، گفتار میں شوخی۔

گرمی کا زمانہ آیا۔ جون، جولائی کی لوؤں سے بچنے حسب دستور مسوری جا پہنچا ـــــ کون جوان بول روم' ڈانسنگ کا دلدادہ نہ ہوگا۔ از انجملہ ہم بھی تھے۔ سیکھا بھی اس شوق سے کہ سارے سارے دن کمرہ بند کر کے نئے سے نئے سٹیپس کی مشق کرتے رات بھر بول روم کے تختے ہمارے زیر پا رہتے۔ ایک روز لنچ کے بعد میں اپنی رقص کی استانی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا کہ ایک چاند کی سی کرن دروازہ میں داخل ہوئی۔ میں نے اپنی عمر میں بہت سی حسین عورتیں دیکھی ہیں لیکن اس کے چہرہ کی گرما گرمی ہی کچھ اور تھی۔ شعلہ جوالہ ہماری جانب آتا نظر آتا تھا۔ سرو چراغاں نے کبک خرامی سیکھ لی تھی۔ بقعۂ نور شمع کافور صرف رقص۔ اس آتشِ خرمن سوز نے بیک نگاہ برق پاش میرا صبر و شکیب پھونک دیا۔ عجیب شکر بار حسن تھا ـــــ اس سراپا حسن کا سراپا کیا بیان کروں۔ اس جمال لامحدود کو الفاظ کی آغوش میں لایا نہیں جاتا۔ اس آتشیں کا ذکر کرتے ہوئے نکتہ سپند وار سرِ حرف جلے جاتے ہیں۔ دوائر موئے آتش دیدہ ہیں تو کشش آہن گلخن رسیدہ۔

صنوبر قامت، لالہ رخ، سرو جوئبار حسن۔ آنکھوں میں سیاہی اور سفیدی کے ساتھ ہلکی سی سرخی کی جھلک ایسی نظر آتی تھی جیسے سیپی میں در سیلہ ہو اور اس پر شفق اپنا ہلکا سا سایہ ڈالے ـــــ پھر اس پر سیاہ پلکیں قیامت پر قیامت تھیں۔ محشر میں ایک اور حشر۔ بعینہ ایسا نظر آتا تھا جیسے کوثر و تسنیم پر بوقت شام سنبل کا سایہ پڑ رہا ہو۔ چاند سے ماتھے پہ بھنویں جیسے سینۂ شیریں پر تیشۂ فرہاد کی پرچھائیں، اس پر سیاہ بال صبح بنارس پر شام اودھ منڈلاتی ہوئی ـــــ سرخ و سفید سڈول گردن، بلوریں صراحی میں پگھلا ہوا یاقوت۔ رخساروں کی سرخی قلب مانی میں خیالِ مئے احمر۔ یا سمنی کی پتی پر شفق یا ہیرے کی تختی پر لعل یمانی کا پرتو۔ سینہ کا ابھار جیسے قلب زاہد میں سیب بہشتی کا خیال یا سنگ مرمر پر پولی برف کی نازک ڈھیریاں ـــــ بلوریں شکم چاندنی کی آبشار جہاں زہد دو را، بہ جائے۔ یا چاندی کی بنی ہوئی نرم و نازک چادر جس پر عابد شب زندہ دار سونا چاہے۔

کمر میں بید مجنوں کی لچک۔ شاخ صنوبر کا لوچ ـــــ سرین کا گداز جیسے دودھ کے جھاگ، رانیں موتیوں کے مخروطی ستون پنڈلیاں زہد مجسم کو پا بہ جا نہ رہنے دیں پر لپک خرام۔ یہ حسن مجسم پیکرِ شباب، خوابوں کی دیوی۔ ملکۂ جمال روپ رانی اٹھلاتی ہوئی ہمارے قریب آئی۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کرسی کا سہارا لے کر تعظیماً اٹھا۔ وہ وجد آفریں و نغمہ بار عجب نقرئی آواز میں بولی۔ 'میں مس ڈورس سے ملنا چاہتی ہوں'۔ یہ ڈانسنگ انسٹرکٹرس کا نام تھا۔ میں نے تعارف کراتے ہوئے ایک کرسی آگے کو سرکاتے ہوئے تشریف فرما ہونے کی التجا کی۔

وہ کچھ اس انداز سے بیٹھی جیسے کوئی نازک ہاتھ گلدان میں پھول رکھے۔ پھر مس ڈورس سے مخاطب ہوئی RUMBA رمبا ناچ سیکھنا چاہتی تھیں۔

طرز بتانے کے بعد مس ڈورس نے سبق دینا شروع کر دیا۔ عورت رقص آشنا تھی فوراً یہ نئے قدم سیکھ گئی۔ بعدہٗ اس کمترین کے ساتھ استانی کی تجویز پر پریکٹس شروع ہوئی۔ جب میں نے اس فردوس منظر حسینہ کو اپنی آغوش میں لیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جنت در بغل ہوں۔

کوئی ایک گھنٹہ ہم ساتھ ناچتے رہے۔ میں عجیب کیف و خمار کی دنیا میں تھا۔ ہر عضو بدن سرور محسوس کرتا اور میں میکدہ در کنار۔

خاصی مشق کرا دینے کے بعد میں نے شام کو انھیں ہیک مین میں مدعو کیا۔ ان محترمہ کا نام مس رعنا یوسف تھا۔ میں چار بجے سے ہمہ تن انتظار دیدہ و دل فرش راہ ہو بیٹھا۔ بوائے سے تین بار کرسی بدلوائی۔ گلدان کے پھولوں کو درست کیا۔ ٹیبل کلوتھ کی خیالی سلوٹیں نکالیں۔ ہر چاپ پر نگاہ دروازہ پر جاتی کہ آخر کار وہ جانِ انتظار آ ہی گئیں۔ میں پیشوائی کو گیا دل نے قدم چومے۔ آنکھوں نے بلائیں لیں۔

پہلے چائے کا دور رہا اس میکدہ بدوش سرور مجسم کے ہاتھ سے چاء میں بھی کیفِ مے تھا۔ شراب میں بھی اچھوتی سرخوشی کا عالم۔

بینڈ بج رہا تھا۔ دور چل رہا تھا۔ ساغر سے ساغر کھنک رہے تھے بوتلیں اپنا راز درون گلاسز میں الٹ رہی تھیں۔ گلاس چھلکے پڑتے تھے قلب آدم جھوم رہا تھا۔ ابن آدم لغزیدہ پا۔ حوا کی بیٹیاں مائل بہ گناہ تھیں۔ آدم کے بیٹے آمادہ بہ معصیت۔ سرمستی کی گھٹائیں چھائیں تھیں۔ عیش و عشرت کے مینہ برس رہے تھے۔ عشق کو نیاز تھا حسن مست ناز۔ عجب مستی و سرمستی و بدمستی کا دور تھا۔ ساری رات اسی عالم نشاط میں کٹی ـــــ صبح ہوتے

شبنم کے موتی روندتے ہم باہر نکلے۔

ایک ہفتہ تک صحبتیں رچتی رہیں۔ محفلیں جمتی رہیں۔ اوراق بہار عشق گردانے گئے۔ زندگی واسوخت امانت بنی رہی۔ چاندنی راتوں میں سیریں رہیں۔ اندھیری راتوں میں خلوت۔

ایک روز میرا عزیز ترین دوست اشرف میرے بلاوے پر مسوری آیا شام کو نووارد کو ہمراہ لے میں حسب دستور ہیک میں جا پہنچا۔ وہاں اشرف کا رعنا سے تعارف کرایا۔ اس حسن مردافگن نے اشرف پر بجلی سی گرائی۔ آنکھوں سے حال دل ظاہر۔ ہاتھوں کا ارتعاش روح کی تڑپ کا آئینہ دار تھا۔ واپسی پر اشرف نے کہا ظالم میں مر گیا۔ اس ایک لفظ میں پوری داستان قلب پوشیدہ تھی ـــــ دوسرے روز شام کا انتظار وہ کچھ ایسی بیتابی سے کرتا رہا کہ اضطراب پروانہ کا شبہ ہوتا۔

بہر نوع ہر صبح کے بعد شام ہے۔ اپنے وقت مقررہ پر مسوری کی شام آئی۔ زلف محبوب کی مستیاں و تاریکیاں لئے ہوئے۔ کسی سیہ مست کی لغزشوں کی حامل۔ ضمیر کی روشنی پر گناہوں کے کالے پردے ڈالتی۔ عصمت و عفت پرستاروں بھرے خندۂ دنداں نما کی بجلیاں گراتی آئی ولیصدناز آئی۔

ہیک مین میں رنگ رہا۔ ساغر شراب بھی چھلکا مینائے شباب بھی اس دور ثانی وملاقات دیگر نے اشرف کو کہیں کا نہ رکھا ـــــ اس ساحرہ پر طبیعت میری بھی آئی تھی۔ دل کو میرے بھی یہ موہنی صورت بھائی تھی۔ لیکن اشرف کا حال ہی کچھ اور تھا۔ ہر دم اسی کی دھن تھی اسی کا خیال تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پروانے کو قرب شمع کا حق بجنسا سوختن ہے۔ میں صرف فانوس سے کھیل رہا تھا وہ لو پر سینہ رکھنے کو آمادہ۔ پھر دوست کا معاملہ آخر ہمیں میدان چھوڑنا پڑا۔

اکثر ہم تینوں پروگرام ساتھ بناتے۔ اکثر میں کچھ دیر بعد ہوٹل جاتا۔ گاہ گاہ رعنا روکتی بھی لیکن میں دو میں تیسرا آنکھوں پہ ٹھیکرا بننا نہیں چاہتا تھا۔ ایک روز صبح سے اشرف نے تیاریاں شروع کیں۔ معلوم ہوا کہ دلدار نے کامٹی فول پر ملنے کا وعدہ کیا ہے تخلیہ کی ملاقات ہوگی تنہائی کی مدارات۔ لنچ عاشق و معشوق ساتھ کھائیں گے۔ سارا دن وہیں بتائینگے۔ اشرف نے ہوٹل سے نت نئے کھانے ٹفن باسکٹ میں بھروائے۔ رنگا رنگ شرابیں ساتھ لیں ـــــ ساتھ جانا پروگرام میں نہ تھا۔ وہاں ملنے کا وعدہ تھا۔ بریک فسٹ کے بعد ہی سے اس نے کپڑے پہنے شروع کئے۔ کبھی اسپورٹنگ کٹ پہنتا تو گاہ خاص ڈرائنگ روم سوٹ۔ ٹائیوں پر ٹائیاں بدل رہا تھا ـــــ ہوٹل کے مالی کو حکم تھا کہ سب قسم کے بٹن ہول بنا کر رکھے ـــــ عطروں میں اپنے کو کچھ ایسا بسایا کہ گلاب گندھی کی دکان کی مہک آتی تھی۔ غرضیکہ ابھی دس نہیں بجے تھے کہ جوبہ بن سنو رکے روانہ ہوئے۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک ناول سے دل بہلا رہا وقت گذار رہا تھا کہ دروازہ پر کسی نے آہستہ سے دستک دی میں نے اندر آنے کو کہا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو رعنا سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ میں نے تعظیم دی۔ دل میں یہ سوچ کر متعجب ہوا کہ ان بیگم کو تو اسوقت کامٹی فول پر ہونا چاہئے تھا پھر خیال آیا کہ کہیں اشرف کو ڈھونڈتی ہوئی تو یہاں نہیں چلی آئی ہیں۔ بہر نوع میں نے پوچھا کہ آپ ابھی کامٹی فول نہیں گئیں۔ اشرف تو بڑے بڑے احتراموں کے ساتھ یہاں سے گیا ہے۔ رعنا کے رخ ماہتاب پر ایک لکۂ ابر سا آیا اور گذر گیا۔ بولی مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی تھیں اس وجہ سے آئی ہوں۔ اب مجھے خیال آیا کہ شاید یہی سبب اشرف کو ٹالنے کا تھا۔ چونکہ میں اور وہ ہمہ وقت ساتھ رہتے تھے اور رعنا کو مجھ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

رعنا مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے اور تنہائی میں۔ اس کا میلان طبع میری طرف ہے اور دل میرا متلاشی اس کی نظروں کے مبہم پیام آج منت کش معنی ہو رہے ہیں اس تخیل کے آتے ہی فضائے قلب پر ایک چاندنی سی چھٹک گئی۔ روح متبسم محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی کسی نے گوش قلب سے کہا۔ یہ اشرف کے ساتھ غداری ہوگی۔

اس خیال کے آتے ہی میرے دل نے دست گناہ کو ایک عفیفہ کی طرح جھٹکا اور ستون عزم و دوستداری کی آڑ لی ـــــ یہ لغزش و استقامت سب چند سکنڈ میں ہوگئی۔ رعنا نے اپنی ساڑی کے پلو سے کھیلتے ہوئے میرے دامان دل پر ہاتھ ڈالا۔ میں اس انداز دراز دستی کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے سے وا دلے میں کھیلتا رہا چاہتا رہا جب تک بات اشاروں کنایوں میں رہی میں ٹالے بالے دیتا رہا۔ آخر نوبت با ایں جا رسید کہ بیگم نے صاف کہہ دیا کہ مجھے محبت تم سے ہے اشرف بلاوجہ میرے گلے پڑ رہا ہے ـــــ میں نے اس وقت تک قطعاً کوئی ہمت افزائی نہیں کی وہ تو کچھ پہلے ہی روز سے دیوانہ ہوگئے ہیں۔ مدعا یہ کہ اشرف کو والہ و شیدا کر لینے کے بعد اب یہ مرد شکار مجھے مسخر کرنا چاہتی تھی۔

حسن گلو سوز بھی تھا۔ نگہ سینہ دوز بھی۔ گاہ گاہ میری جانب دیکھ کر تنفس کی تیزی سے سینہ کا مدوجزر سفینۂ حیات تہ و بالا کر رہا تھا۔ پھر لب لعل پر دردنداں باندازِ تاسف آتے قلب آدم نشتر الماس کی

برش محسوس کرتا ——— غرضیکہ میں عجیب کش مکش میں تھا۔ وہ ایمان دشمن اپنے حسین سنان وتیر لئے آمادہ بہ صید لگتی تھی۔ ادھر قلب و دست دار پابرجائی پہ کمر بستہ۔ در دے وسخت در دے کا رہے وسخت کا رہے۔

میں نے اشرف کی بے قراری اور اس وعدہ خلاف سے ملاقات کی تیاری اور شوق بے پایاں کا تصور ذہن میں مستحضر کیا پھر اس حیلہ جو کی عیاری پر نگاہ ڈالی ——— کید زن دیکھئے۔ اشرف کو وعدہ ملاقات پر ٹالا اور پھر میدان خالی کرا میرے پاس آن پہنچی۔ ایک کو شکار کر چکی تھی دوسرے کو فتراک سے باندھنا چاہتی تھی ——— تخیلات کے اس نتیجہ نے رعنا کے چہرہ کی حسین نقاب تار تار کر دی۔ اس جذبات حق آشنا کی شمع نے پیشانیٔ حسن تزویر کار پر کذب وریا کی تحریریں اجاگر کر دیں ——— مجھے اپنے سامنے ایک اور رعنا نظر آنے لگی ——— گل رخسار وہی تھی لیکن پتیاں کچھ متنفر کن زاویوں میں مڑی ہوئی تھیں ——— ہونٹ اب بھی گلابی ریشم کے ڈورے تھے لیکن ناگ کے سے بل کھائے ہوئے۔ آنکھیں اب بھی کنول کے سے پھول نظر آتیں لیکن نوک مژگاں نیش عقرب دکھا رہی تھیں ——— ماتھا بے شک مہ ہفت روز تھا لیکن خرد سوز دیوانہ کن تابانیاں لئے ہوئے ——— سیاہ بال بلاشبہ انگور کے خوشہ نظر آتے تھے لیکن اب ان میں کیف سم تھا سرور مے نہیں۔

غرضیکہ یہ آغوش نور دحسینہ میرے پاس سے محروم و ناکام۔ مایوس و نامراد لوٹی ——— تیسرے پہر اشرف آیا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں تکان انتظار سے مضمحل ——— ایک طرف کرسی پر ہو بیٹھا میں ظاہرہ کتاب میں منہمک رہا۔ تھوڑی دیر بعد بولا رعنا تو ادھر نہیں آئی۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ بولا وہ آئی نہیں میں انتظار دیکھتا رہا۔

شام کو ہیک مین میں ملاقات ہوئی حسن حیلہ جو نے بیک نگہ شرمسار عشق اعتبار جو کے سارے گلے شکوہ ختم کر دیے ؎

جہاں پہ جھک گئیں وہ نظریں منفعل ہو کر
وہیں پہ ختم غم عشق کا فسانہ تھا

آج ہیک مین کی ایک میز پر ایک سرحدی خان تشریف فرما تھے۔ اس شہر کوتاہ آستینان میں تعارف کے لئے زیادہ ہاتھ بڑھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رندان ازل ومخمور چشمان رند نواز دیکھتے دیکھتے ملحوں میں آشنا ہو جاتے ہیں۔

ہمارا بھی تعارف ان خان صاحب سے ہو گیا ——— خوش رو جوان متواضع انسان چہرہ سے سرداری آشکارا داے سرداری میں ہلکا سا انکسار ——— باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ یہ جس علاقہ پر حاکم ہیں وہاں لال کافروں کی آبادی ہے۔ یہ سنتے ہی رعنا کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہوئی اور فوراً چند فقرہ ایک اجنبی زبان میں بولے۔ خان نے اسی زبان میں جواب دیا۔ پھر یہ عقدہ کھلا کہ یہ بت ایمان سوز ایک کافرہ کے بطن سے تھی ——— رعنا کا حسن پرست باپ ایک لال کافر لڑکی کو لے آیا تھا۔ اسے تہذیب وتمدن سے مزین کیا ——— رعنا اسی نہال کوہی کا غنچہ ہے۔

خان نے ہم سب کو اپنے علاقہ میں آنے کی دعوت دی۔ رعنا نے بھی اصرار کیا اور کہا ایک بار اپنا مادری وطن دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ اشرف اور میں راضی ہو گئے۔

غرضیکہ کچھ روز بعد یہ قافلہ مسوری سے سوئے کافرستان روانہ ہوا۔ راہ کے حسین مناظر دیکھتے۔ قدرت کی کرشمہ کاریوں پر عش عش کرتے منزل بمنزل پہونچ گئے اور رخت سفر جائے قیام پر جا کھولا۔

پٹھان تواضع۔ برفانی اور کوہستانی مناظر۔ لب جو دامان کوہ۔ نغمۂ ہزار۔ ہوا عطر بیز چشم ساقی بادہ ریز۔ فطرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ پیش نظر تھی اور رعنا اپنی خمار بار ومست کن اداؤں کے ساتھ ستمگر فگن۔

اس کافرہ کا حسن ایماں دشمن اس فضائے تقویٰ شکن وکفر پرور میں کچھ ایسا نکھرا کہ چشم خرد خیرہ ہوئی جاتی تھی۔ دل پروانہ کی طرح اس شمع رخسار کے قدموں پہ گرتا نظر بلائیں لیتی۔

ایک روز خان نے کہا آئیے آج آپ لوگوں کو لال کافروں کی ایک خاص رسم دکھائیں۔ ہم سب اپنے میزبان کے ہمراہ دروں کے اندر گئے۔ چاند نکلا تھا۔ فضائے بسیط پر سیم سیال بہ رہی تھی۔ ایک جانب سے عجیب مست کن سازوں کی آواز اٹھی۔ فضا شراب برسا رہی تھی۔ سرسوتی دیوی خم لنڈھا رہی تھی۔ اہرمن نے جذبات گناہ بے لگام کر دیے تھے۔ کافروں کی وحشیانہ چیخیں معبد قلب میں معصیت کے دیوتا جگا رہی تھی۔ لعل والماس کی نتراشیدہ کوہستانی حسین دوشیزائیں محو رقص تھیں۔ شراب وشباب نے ان برف وگلاب کی دیویوں کو دیوانہ کر دیا تھا۔

اس ہنگامۂ حسن وسرور میں ایک جوان مجسمۂ شباب بھونرے کی طرح ہر گل نورسی کا رس چوس رہا تھا۔ اس سراپا شباب وجذبات پر کام دیوتا کا شبہ ہوتا تھا۔ اس غول حسن میں اس طرح اینڈتا پھر رہا تھا جیسے کالا ہرنیوں میں، طاؤس مورنیوں میں۔

خان نے ہم کو بتایا کہ یہ شخص بڈا لک کہلاتا ہے۔ ان کافروں کا یہ دستور ہے کہ حسین اور قوی نسل قائم رکھنے کے لئے ایک مرد سانڈ کی

حیثیت سے پالتے ہیں اور اسے بڈالک کہتے ہیں۔ سال بھر تک اس کی حفاظت کی جاتی ہے۔ آج اسے حق ہے جس جس حسینہ سے چاہے نسل کشی کرے۔ موسیقی کی گونج پہاڑوں کے سینے چیرے ڈال رہی تھی۔ شراب خام کی روانی سر چکرا رہی تھی۔ بڈالک کی ہر چیخ پہ جذبات خفتہ جاگ جاگ اٹھتے۔ پہاڑی دوشیزاؤں کی تمناؤں بھری گرم نگاہیاں دل چیرے ڈالتی تھیں تمام فضا پر اہرمن کا تسلط تھا۔ کام دیوتا کی حکمرانی ہو الٹر کھڑا رہی تھی۔ تمام کائنات لغزیدہ بالنظر آ رہی تھی ــــــــ رعنا ہاداقی بہن آئے ہوئے سرو چنار کی مانند جھوم رہی تھی۔ صدات کو ایک بجے کے قریب ہم سب وہاں سے مست و مخمور لوٹے۔

ابھی دو کا عمل ہو گا۔ چاند وسطِ سما رسے گذر چکا تھا کہ میں نے اپنے دروازہ کے سامنے سے ایک سایہ سا گذرتے ہوئے دیکھا۔ ابھی کوئی پندرہ منٹ نہیں گذرے تھے کہ ایک اور سایہ گذرا۔ اب میں نے باہر نکل کر دیکھا تو اشرف ایک سوتے میں چلنے والے کی طرح منہ اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ میں بھی پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ دور سے وہی موسیقی کی آواز گونجی۔ اور بڈالک کی چیخ سنائی دی۔ ہم گھاٹی کے ایک موڑ سے مڑ رہے تھے کہ رعنا اور بڈالک ہم آغوش نظر آئے۔

ابھی میرا دماغ اس منظر کو پوری طرح سمجھا نہ تھا کہ بندوق سر ہوئی بڈالک اور رعنا اک تیر تھا کہ جس نے دونوں چھید کے پڑے تھے۔ ایک جگہ سے برف تڑخی ہوئی تھی اس نے ان دونوں کی پردہ پوشی کی۔

جھلکیاں ــــــ اقبال فاروقی

سوزشِ درد میں اگر لذتِ بیخودی نہیں ٭ عشق میں زندگی نہیں حسن میں دلکشی نہیں
دل نہیں گر شریکِ غم غم نہیں گر شریکِ دل ٭ پھر تو حیاتِ عشق میں کوئی خوشی خوشی نہیں

کاش یارب وہ دن بھی آ جائے ٭ جبکہ انسان خود کو پا جائے
وہی ہوتا ہے بہرہ یابِ حیات ٭ اپنی ہستی کو جو مٹا جائے

دل میں اگر تلاطمِ جذبۂ اضطراب ہو ٭ حسن بھی کامیاب ہو عشق بھی کامیاب ہے
مجھکو نہیں ہے کوئی غم آپ کی مشقِ ناز کا ٭ لاکھ ہجومِ غم سہی پھر بھی لبِ شباب ہے

خود کو دنیا میں کھو رہا ہوں میں ٭ ہاتھ عقبیٰ سے دھو رہا ہوں میں
اب تو یہ بھی خبر نہیں اقبال ٭ ہنس رہا ہوں کہ رو رہا ہوں میں

دل کو نثارِ حسن کر۔ حاصلِ عاشقی نہ دیکھ ٭ محوِ غمِ فراق رہ۔ فرقِ غم و خوشی نہ دیکھ
یہ میری شانِ بیخودی۔ تیری نظر کا فیض ہے ٭ اپنی نظر کو آزما۔ تو میری بیخودی نہ دیکھ

غزل ــــــ جاں نثار اختر

کبھی آہوں کبھی نغموں کا طوفاں
یونہی گونجے گا کب تک سازِ دوراں

ترا حسنِ نظر اور میرے ارماں
کرن میں جس طرح ذرّے پرافشاں

ہر اک ذرہ کے سینے میں ہیں پنہاں
نہیں معلوم کتنے ماہِ تاباں

ارے مطرب کوئی غمگین نغمہ
کہ غم ہے زخمۂ سازِ رگِ جاں

نگاہیں جھک گئیں اہلِ جنوں کی
یہ کس نے چاک کر ڈالا گریباں

محبت کی بدولت زندگی سہل
محبت کی بدولت موت آساں

وفائیں کیں تو اپنے واسطے کیں
وفاؤں کا مری کیا تجھ پہ احساں

سمندر کو یقیں آئے گا کس دن
کہ ساحل سے بھی اٹھ سکتے ہیں طوفاں

نوائے ساز و بوئے گل پہ کیا ہے
بہت کچھ ہے ابھی نظروں سے پنہاں

یہ عالم ہے ابھی تمہیدِ عالم
یہ انساں ہے ابھی امیدِ انساں

یہ گل بھی زخم یہ شبنم بھی آنسو
مجھے دھوکا نہ دے فصلِ بہاراں

مزاجِ عشق کی افتاد اختر
محبت ہے شکستِ دل پہ نازاں

ے:- باوامی۔ وہ تیز و تند ہوا جو برفانی چوٹیوں پر چلتی ہے اور ہر شے کو اپنے ساتھ اکھاڑ کر لے جاتی ہے۔

برطانیہ اور نئے شہروں کی تعمیر

فتح چند کپور

یوں تو آج برطانیہ میں ایسی بہت سی باتیں ظہور میں آ رہی ہیں جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں لیکن کم سے کم اس شخص کے لئے جسے شہروں کی ترقی کے ساتھ دلچسپی ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں انگلستان آج ایک ایسی تبدیلی سے دوچار ہو رہا ہے جو صنعتی انقلاب سے لے کر آج تک کبھی وجود میں نہیں آئی۔ اور وہ تبدیلی یہ ہے کہ اپنے ملک میں نئے شہر تعمیر کرنے کا جو تصور آج ہمارے سامنے ہے وہ ان تیرہ و تار شہروں کے تصور سے بالکل مختلف ہے جو انیسویں صدی کی صنعت کے دور میں بنے اور تعجب تو یہ ہے کہ یہ شہر جس دور میں بنے وہ دور نفاست کا دور سمجھا جاتا تھا۔

آج ہمارے سامنے جس قسم کے شہروں کے خاکے تیار کرنے کے منصوبے ہیں وہ ایسے شہر ہیں جن میں سبزہ زاروں کی کثرت ہو گی اور جن کے مکان ان تمام ضروریات کو پورا کر سکیں گے جو انسانی زندگی کے موجودہ ترقی یافتہ معیار نے پیدا کی ہیں۔

جو لوگ مدت سے اس قسم کے مکانوں کے حامی تھے ان کے لئے شہروں کی تعمیر کا نیا قانون ایک ایسے معجزے سے کم نہ تھا جو اچانک وجود میں آ جائے لیکن یہ معجزہ ایک حقیقت نکلا اور اس نے ثابت کر دیا کہ مدت سے فضا میں بہتر قسم کی زندگی کے جراثیم موجود تھے، محض موقع کی دیر تھی کہ یہ کسی جگہ اکٹھا ہو جائیں اور جڑ پکڑ لیں۔ یہ موقع انگلستان پر جرمنی کے ہوائی حملوں نے بہم پہنچا دیا۔

لڑائی سے پہلے بھی انگلستان مکانوں کے نقشے اور شہروں کی تعمیر کے خاکے بنانے کے سلسلہ میں عملی طور پر دنیا میں پیش پیش تھا۔ ایبانیزر ہاورڈ جنوں نے اب سے پچاس سال پہلے شہروں کی تعمیر کا وہ نیا تخیل پیش کیا جس میں ہر شہر کو باغوں سے پر کر دینے کی تجویز تھی اور جس نے شہروں کی تعمیر کے فن کو ایک نئی زندگی بخشی، انگلستان ہی کے رہنے والے تھے۔ اس قسم کے دو شہر لیچ ورتھ اور ویلوین بھی انگلستان ہی میں بطور نمونے کے تیار ہوئے۔ اس کی تجدید کرنے والوں میں دوسرے مشہور شخص سر ریمانڈ آیون ہیں۔ یہ بھی انگلستان ہی کے رہنے والے تھے۔ پھر یہ خصوصیت بھی انگلستان ہی کے حصہ میں آئی کہ جنگ سے کچھ عرصہ پہلے بارلو رپورٹ نے اس قومی پروگرام کا خاکہ پیش کیا جس میں جدید قسم کے شہروں کو ملک میں عام کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

شہروں کی تعمیر کے سلسلہ میں ہماری جو موجودہ پالیسی ہے وہ دراصل انھیں کوششوں کی انتہا ہے۔ اس پالیسی کو پارٹی بندی سے اونچا رہنا چاہیئے اور اگر اب تک یہ اونچی نہ رہ سکی تو یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ نئی پالیسی قوم کے لئے اتنی دلکش کیوں ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انگریز، خواہ وہ شہری زندگی کا کتنا ہی عادی ہو چکا ہو، دیہات کے ساتھ ایک قلبی تعلق رکھتا ہے اور وہ ان تیرہ و تار شہروں میں اپنے آپ کو اجنبی سمجھتا ہے۔ دیہات کے ساتھ اس کی یہ وابستگی اس وجہ سے ہے کہ گزشتہ دو سو برس میں، تنہا انگلستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا بھر میں صنعتیت کا زور رہا اور نفع کمانے کی خواہش ترقی پر رہی۔ اس وجہ سے نہ شہری زندگی کو درست کرنے کی طرف توجہ کی گئی اور نہ اس مصیبت کا بدل سوچنے کی کوشش کی گئی۔

انگلستان کے قدیم شہروں میں جو بہترین شہر ہیں ان کے وسطی حصوں میں آج بھی جو پرانے پارک اور کھلے میدان نظر آتے ہیں مثلاً کرائسٹ چرچ میڈو، ان کا مقصد یہی تھا کہ شہر کے بیچ میں دیہاتی منظر پیدا کر دیا جائے۔ ہمارے نئے قصبوں میں بھی اسی قسم کے سبزہ زار اور سبزہ سے ڈھکی ہوئی روشیں تیار کی جائیں گی۔ اس طرح ان نئے شہروں کے رہنے والوں کو اپنی چھٹیاں گزارنے کے لئے جس دیہات کی فضا کی تلاش ہوتی تھی وہ ان کو گھر بیٹھے مل جائے گی اور وہ تمام دلچسپیاں اور تفریحیں جن کی تلاش میں ان کو لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے تھے گھر کے دروازے پر میسر آ جائیں گی۔

اس وقت شہروں میں مکانوں کی جو کمی ہے اس کے پیش نظر آپ ضرور یہ خیال کریں گے کہ سب سے پہلے ہمیں شہری علاقوں میں نئے مکان تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ واقعی نئے مکانوں کی ہمیں سخت ضرورت ہے لیکن اگر ہم نے صرف مکانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی تو ہم اسی غلطی کو دہرائیں گے جو ہم نے اس سے پیشتر کی اور جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ ہم نے اپنے قصبوں کی بے تک توسیع کی، جہاں چاہا صنعتی علاقے بنا دیئے، لاپروائی کے ساتھ تجارتی ہنگامے کو بڑھنے دیا، سڑکوں اور راستوں پر گھمسان کی آمد و رفت ہو گئی، آبادی کے علاقے ایک دوسرے سے

دور ہو گئے۔ ان چیزوں نے ہماری زندگی کو بالکل بے لطف بنا دیا۔

آج انگلستان کو جس چیز کی ضرورت ہے، وہ محض مکان نہیں ہیں بلکہ ایسا ماحول ہے جس میں نفاست کے ساتھ زندگی گزاری جاسکے اور جہاں بہتر قسم کی گھریلو زندگی بن سکے۔

بچوں کی ضروریات برطانیہ کی سب سے اہم ضروریات ہیں

آج برطانیہ کی شرح پیدائش پر نظر کی جائے تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری آبادی گھٹ رہی ہے اور صدی کے ختم تک اس میں زیادہ عمر والوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ اس لئے اپنے بقا کی خاطر ہمیں "خاندان" اور "گھر" کو وہی اہمیت دینی پڑے گی جو آج سے سو برس پہلے ہم نے مشینوں کو دی تھی۔ یہ سچ ہے کہ محض اچھے قصبوں کی تعمیر نوجوانوں کو ماں باپ بننے کی ترغیب نہیں دے سکتی پھر بھی اگر ہم خاندان کی ضروریات سامنے رکھ کر نئے قصبے تعمیر کر دیں اور پرانے قصبوں کو بدل دیں تو اس معاملہ میں ترقی کے راستہ پر ہم کئی قدم آگے بڑھ جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ میں آج کل کے قصبوں کے نقشہ بنانے والوں اور میونسپل افسروں سے ہر موقع پر یہ کہتا ہوں کہ قصبوں کا وہ تصور چھوڑ دو جس میں پہلے تو موٹر کی سڑکوں اور عام شاہراہوں کا جال بچھایا جاتا ہے، پھر کارخانے پھیلائے جاتے ہیں، اس کے بعد جو جگہ بچتی ہے اس میں مکان، اسکول، دارالاقامے اور سینما ہاؤس بنائے جاتے ہیں۔ بلکہ اب قصبوں کے جو خاکے تیار کئے جائیں ان میں سب سے پہلے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ماں کے لئے قصبہ میں ایسا راستہ ضرور ہو کہ جب وہ سودا سلف خریدنے کے لئے بازار جائے تو بچہ کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر ساتھ لے جاسکے۔ یہ راستہ مختصر ہو، محفوظ ہو، خوش نما ہو۔ اسی طرح شہر کے باغوں کو آپ خواہ کم جگہ دیں یا زیادہ اس بات کا خیال ضرور رکھئے کہ شہر میں ماؤں کے لئے ایک ایسا ہال بن جائے جہاں وہ جمع ہو کر آپس میں تفریح کر سکیں اور ساتھ ہی بچوں کی دیکھ بھال بھی کر سکیں۔ پھر کھلے میدانوں میں بھی ایسا انتظام ہونا چاہئے جہاں بیٹھ کر

مائیں گپ شپ کر سکیں اور ان کے بچے سامنے کھیلتے کودتے پھریں۔ عورت کو موقع ملنا چاہئے کہ شوہر اور بچے کے مشاغل کے علاوہ اپنے پڑوس میں اس کے تفریحی مشاغل بھی جاری رہیں تاکہ وہ یہ محسوس کرے کہ ماں یا بیوی بننا کوئی مصیبت کی بات نہیں ہے۔ اور کارخانہ یا دفتر کی ان انتہائی غیر دلچسپ ملازمتوں سے کہیں بہتر ہے جن کی طرف ہماری عورت آج مائل نظر آتی ہے۔ اگر ہمارے نئے قصبوں کے نقشے بنانے والے موقع سے فائدہ اٹھائیں اور ہم بھی اپنے مشوروں سے ان کی قدر کریں تو امید ہے کہ ہمارے نئے قصبے بچوں کے لئے اتنے ہی مفید ثابت ہوں گے جتنے لیچ ورتھ اور ویلوین ہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان سے بھی زیادہ مفید بن سکیں۔ اور یہ ہمارا بڑا کارنامہ ہوگا۔

متوازن آبادی

کی اہم قومی ضرورت کے بعد ایک سماجی ضرورت بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے اور وہ ضرورت بھی وقت کی اہم ضروریات میں سے ہے۔

ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے شہروں کی اس طرح پر تنظیم کریں کہ ان کے باشندوں کو پڑوسی کے ساتھ رواداری برتنے اور عمدہ شہری بننے کی ترغیب ہو اور طبقوں، جماعتوں اور فرقوں کے درمیان نفاق کی جو خلیجیں حائل ہیں وہ دور ہو جائیں۔ خلیجیں اتنی زیادہ ہو چکی ہیں کہ وہ لوگ بھی جن کی مالی اور سماجی حیثیت ذرا بھی اونچی ہے اپنے سے نیچی حیثیت والوں سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ اسی نفاق کی وجہ سے یہ لوگ اتفاق اور اشتراک کے ساتھ ان بڑے مشاغل کو بھی انجام نہیں دے سکتے جن پر آج نوع انسانی کی قسمت کا دارومدار ہے۔ جب تک ان چھوٹی جماعتوں میں جن کا ہر شخص کم و بیش مساوی حیثیت رکھتا ہے اور آپس ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔

جمہوریت کے اصول پر عمل نہیں کیا جائے گا یہ بہت مشکل ہے کہ بڑی جماعتوں میں ذمہ دار خود اختیاری حکومتیں قائم کی جاسکیں جو اپنی بناوٹ کے اعتبار سے پیچیدہ ہیں۔ اگر ہم اپنے شہروں کی تعمیر اس طریقہ پر نہ کریں گے کہ ان میں صحیح قسم کے شہری تیار ہو سکیں تو ہماری ساری سماج ایک بے جان مشین ہو کر رہ جائے گی جن میں صرف دو جماعتیں

"یاد"

خامشی — ہم دبستر — ساون کی تاریکی
اور اس کی تنہائی
چار سُو رات کا فسوں طاری
جاگ اٹھا درد لے کے انگڑائی
سن رہا ہوں کھڑا دریچے میں
دور — بجی حسین شہنائی
جانے کیوں پھر تصور میں
میری آنکھ بھر آئی

پرویز لدھیانوی

ہوں گی، ایک حاکم اور دوسرے محکوم یا زیادہ نفسیاتی طریقہ پر یوں کہئے کہ ایک زبردست اور دوسرے زیردست۔

اس طرح نئے قصبوں کا خاکہ تیار کرنے میں اگر ہمارے خاکہ بنانے والے انسانی معیار کو سامنے رکھیں گے تو اس کا بہت موقع ہے کہ ہمارے نئے قصبے اور شہر بھی ملک میں عمدہ قسم کی سیاسی زندگی پیدا کرنے میں ممد ثابت ہوں۔ چنانچہ میرے خیال میں اس سلسلہ کی سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ شہر کے ہر حصہ میں ایسے ہال ہوں جہاں لوگ جلسے کرسکیں اور براہ راست مباحثوں میں حصہ لے سکیں۔ میں نے مانچسٹر کے محل ہوم میں ایک ایسا ہال دیکھا ہے۔ یہ بڑی عمر کے لوگوں کے لئے تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کے ہال صرف بوڑھوں کے لئے کیوں ہوں جو ان کی ضرورت سے قریب قریب بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے میری تجویز یہ ہے کہ شہر کے ایک حصہ میں وہاں کے لوگوں کا اپنا ہال ہو، اتنا بڑا کہ جس میں سیاسی جلسے ہو سکیں، اتنا خوبصورت جس میں شادیاں رچائی جاسکیں اور اتنا باوقعت کہ وہاں میت کی تجہیز و تکفین ہو سکے۔ یہ وہ آسانیاں ہیں جو ہر جگہ عوام کو حاصل ہونی چاہئیں اور ان کی طرف اگر ہم نے معمولی سی بھی توجہ کر لی تو اس سے وہ بڑی تلخی ذرا کم ہو جائے گی جو جنگ نے پیدا کی ہے اور جس کا ابھی مدتوں تک دنیا کو سامنا کرنا ہے۔ آپ کو غالبًا یاد ہوگا کہ قدیم زمانہ میں اتھنیس فوج کا یہ شیوہ تھا کہ ان کا ہر فرد ادنیٰ سے ادنیٰ نجی معاملہ میں تو جزرسی سے کام لیتا تھا لیکن جہاں رفاہ عام کے کام ہوتے تھے وہاں اس کی فیاضی اور دریا دلی کی کوئی حد نہ رہتی تھی۔

یہ ہیں وہ حالات جن کو سامنے رکھ کر آپ کو نئے قصبے اور شہر بنانے ہیں۔ اس وقت اپنے اس کام میں اگر آپ نے جلدی کی تو دو خطرے ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ نئے قصبے بنانے کے لئے شاید آپ کوئی ایک مقررہ اصول بنالیں اور دوسرا یہ کہ جو کچھ کرنا ہے وہ سب ایک ہی دفعہ میں ختم کر دیں۔ آنے والی نسلوں کے سامنے آپ کا آرٹ اس طرح آئے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ ان کے لئے آپ نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔

اب پہلا خطرہ لے لیجئے یعنی کسی ایک مقررہ اصول پر تعمیر کی بنیاد رکھنے سے کیا نقصان واقع ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ بہتر سے بہتر اصول بھی اپنے اندر کوئی نہ کوئی خامی ضرور رکھتا ہے۔ مثلاً آپ کا ایک پرانا اصول ہے کہ ایک ایکڑ زمین میں بارہ سے چودہ تک مکان بنائے جائیں۔ ابتدا میں تو یہ اصول ٹھیک تھا کیونکہ اس زمانہ میں مکان بہت گنجان بنائے جاتے تھے اور آپ کا اصول اس مروجہ طریقہ کے خلاف ردعمل تھا لیکن ہم بعد میں بھی اسی اصول کی پیروی کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بسا اوقات بالکل غیر ضروری طور پر اس اصول کو برتا گیا اور اس کی وجہ سے آپ کے بہت سے اعلیٰ درجہ کے مکانوں میں یکسانیت کا عیب پیدا ہو گیا۔ ورنہ یہ وہ مکان تھے جو اپنی تمام دوسری خوبیوں کی وجہ سے دنیا کے معیاری مکان کہلائے جانے کے مستحق تھے۔ اس قسم کے معاملات میں حکومت کو تفصیلات کے متعلق فیصلہ کام کرنے والوں ہی کے ہاتھوں میں چھوڑنا چاہئے کیونکہ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ غیر ذمہ دار کام کرنے والا قانون کی آڑ لے کر کام کو نا تمام چھوڑ دیتا ہے۔

اب رہا دوسرا خطرہ یعنی قصبوں کو مکمل چھوڑنا۔ میرا خیال یہ ہے اس کو مختلف طریقوں پر بچایا جا سکتا ہے۔ اور ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ خاکے میں اس کا ایک حصہ ایسا ضرور چھوڑ دیا جائے جہاں کچھ نہ بنایا گیا ہو گیا اور جو بعد کو استعمال میں لایا جائے۔ اس تجویز کا ذکر وتھن شا پلان میں بھی ہے۔ دوسرا مفید طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر تعمیری حصے کے بعد کچھ حصہ خالی چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح پورا شہر تقریبًا پچیس سال میں مکمل ہو گا لیکن اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ابتدا میں جو غلطیاں ہوئی ہوں گی ان کی اصلاح ہو سکے گی، ان نئی ضروریات کو جن کا پہلے خیال نہ تھا تعمیر میں شامل کیا جا سکے گا اور اس وقت کے شہریوں کو موقع ملے گا کہ وہ اپنے شہر کی ترقی میں خود حصہ لیں۔

اخیر میں میں یہ عرض کروں گا کہ اپنے نئے قصبے بنانے میں ہمیں عجلت اور لاپروائی سے کام نہیں لینا چاہئے کیونکہ ایسا کرنے میں ہمارے ہاتھ سے ایک نہایت فائدہ مند موقع کے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ مثلاً میں نے دیکھا کہ بمباری کی وجہ سے تباہ ہونے والے شہروں میں سے ایک شہر کی دوبارہ تعمیر کا نقشہ انجینیر نے بنایا اور اس میں بازار کو ایک نہایت گھمسان آمد و رفت والی سڑک کے انتشار اور پراگندگی سے دور کر دیا۔ تاجروں نے تعمیر کے وقت نقشے کی مطلق پروا نہ کی اور بازار کو اسی سڑک کے کنارے بنایا۔ بعد میں کاروبار جو کچھ بڑھا اس کو سڑک کی بھیڑ بھاڑ پر محمول کیا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کاروبار کو بڑھانے والی چیز سڑک نہ تھی بلکہ بسوں اور موٹروں کے وہ اڈے تھے جہاں سے اتر کر مسافر کافی بڑی تعداد میں ان دوکانوں تک آتے تھے۔ اس قسم کی ترمیمیں جیسی اس بازار کے تاجروں نے کیں ہمارے مقصد کے لئے مفید نہیں ہو سکتیں۔ ہماری نئی تعمیروں کو ایسا ہونا چاہئے جو ہمارے شہروں کو نہ صرف مفید بلکہ ہمارے لئے دلکش اور دلفریب بنادیں۔ (باقی صفحہ ۴۶ پر)

ہنسی

افسانہ

فہمیدہ زہرا قزلباش

"لیکن سنئے تو"۔۔۔ اس نے اپنی تمام قوتوں کو جمع کرکے کہا
"میں کچھ سننا ونا نہیں چاہتا" سن رسیدہ پروفیسر درشتی سے بولا جس کی آنکھوں میں سنگدلی جھانک رہی تھی۔

نوجوان کے چہرے پر زردی چھاگئی لیکن اس نے پھر ایک بار جرأت کی۔

"میری مفلسی پر نظر کیجئے اور میرے نوجوان ارمانوں پر بھی!"
مجھے اقرار ہے کہ میں کالج کا قرضدار ہوں۔ لیکن میں ہمیشہ شرمندۂ احسان رہونگا جلد ہی ادا کردوں گا۔۔۔ سوچئے تو اتنا روپیہ میں بدبخت کیسے ادا کرسکتا ہوں لیکن بہت جلد۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں"

پروفیسر نے اطمینان سے دوسرا سگرٹ سلگایا اور یہودیوں کی طرح کاروباری انداز میں کہنے لگا۔ "جب تک آپ ایک ایک پائی ادا نہیں کردیں گے۔ آپ کو ایم اے میں داخلہ نہیں مل سکتا!"

پھر وہ جھک کر بکھرے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا۔

"میں غریب ہوں" اس نے لرزیدہ تمنا سے کہا۔

"میں کیا کروں" پروفیسر نے حیوانیت سے جواب دیا۔

"آپ بہت کچھ کرسکتے ہیں"

"تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو"

"پروفیسر صاحب!"

"میرا فیصلہ اٹل ہے"

"آہ میں کیا کروں" لڑکے کے منہ سے غیرارادی طور پر نکل گیا۔

"جان دے دیجئے" پروفیسر لاپرواہی سے ہنسا۔۔۔ حقارت کی ہنسی نوجوان کو محسوس ہوا کہ اس کی تمام رگوں کا خون منجمد ہوگیا۔

"آپ جاسکتے ہیں"۔ پروفیسر بے نیازی سے بولا۔

نوجوان نے دیوانی نظروں سے اس کے مطمئن چہرے پر نظر ڈالی۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔۔۔ ہنسی۔۔۔ وہ لاپرواہ ہنسی! اس کے دل میں دھڑکتی رہی اس کے دماغ پر ہتھوڑے چلاتی رہی۔

جب صبح ہوئی، اس کی ہیبت ناک بے چینی خاموش ہوچلی تھی۔ وہ پرسکون طریقہ سے مسکرا رہا تھا۔

"یہ صبح میری زندگی کی حسین ترین صبح ہے" وہ زیرلب بڑبڑایا۔
کھلے ہوئے دریچہ میں سے اس نے پھولوں کے رقص کی محویت کو دیکھا۔
"آج ان کے انداز میں کتنا کیف ہے۔ اس کی نظر ایک حسین پھول پر جم کر رہ گئی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ حسین پھول گر کر بکھر گیا اور ہوا اس کی پتیوں کو اڑا لے گئی۔

وہ سوچنے لگا شاید دنیا کا یہی دستور ہے۔

"اوہ! چائے! شبراتی آج تو تم نے انڈے نہایت اچھے تلے ہیں"۔ اس نے ایک روپیہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اور شبراتی سوچنے لگا آج میاں کو ہو کیا گیا ہے۔ برے جلے ہوئے انڈوں پر۔۔۔ لیکن سمجھ گیا۔ ان کا دماغ روز ہی ایسا ہوجایا کرے۔ میری بخار میں جلتی ہوئی لڑکی کے دودھ کا سامان تو ہو ہی گیا۔ وہ جلدی سے چلا گیا کہ کہیں سلیم میاں کا دماغ پھر ٹھیک نہ ہوجائے۔

سلیم دس روپیہ بجا بجا کر گننے لگا جو اس نے کچھ دن ہوئے برج میں جیتے تھے۔ انڈے ٹھنڈے ہو رہے تھے اور ایک سیاہ بلی انہیں جلدی جلدی کھا رہی تھی۔

اس کی ابھری ہوئی ہڈیاں! وہ مسکرایا! بلی سہم کر ہٹی۔۔۔ "ہیں ہیں، پیاری بلی اطمینان سے کھاؤ اگر اس سے پیٹ نہ بھرے تو یہ لو"۔۔۔ اس نے دو بسکٹ اس کی طرف پھینک دیئے۔۔۔ "ننھی سی جان! اگر اب بھی بھوکی ہو تو جلدی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا جاؤ"

وہ ہنس پڑا۔۔۔ مایوس ہنسی۔ اسے دل کی دھڑکن گھڑی کی ٹک ٹک سے زیادہ نمایاں محسوس ہوئی۔ آٹھ بج گئے۔۔۔ وہ چونکا لیکن جلدی کیا ہے، اس نے اطمینان سے کہا۔۔۔

آہستہ سے الماری کھولی اور اپنے کپڑوں کا نہایت اطمینان سے جائزہ لینا شروع کیا۔۔۔ آہ یہ کپڑے۔۔۔ یہ نیلی دھاری کی ٹائی مجھے کس قدر محبوب ہے یہ ایک دو خوبصورت شیروانیاں۔۔۔ اور یہ ایک سوٹ۔ وہ بھی برج کی آمدنی کا۔ تعلیم کے یہ سال کیسے مشکل سال تھے۔ اور اب یہ روپیہ۔۔۔ مجھے کون قرض دے گا۔ "جان دے دیجئے" اس کے دل میں یہ الفاظ طوفانی جھکڑ بن کر چلنے لگے ہوں۔ وہ پھر اپنی اچکنوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس نے تین تین مرتبہ اپنے اکلوتے سوٹ کو پہنا۔

اور یہ سینٹ کی شیشی۔۔۔ جب لڑکیاں مشاعرہ میں آتی تھیں تو ایک دفعہ میں ساری انڈیل لیتا تھا اور پھر سارے مہینہ ٹائیں ٹائیں فش۔

"ایف اے میں بھی ٹوپ کیا اور بی اے میں بھی بازی لے گیا۔ اب ایم اے میں بھی۔۔۔" ہماری باری تو آچکی قریب کے کمرے میں اس کا حریف کہہ رہا تھا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا اور مسکرانے لگا۔۔۔ ایک پھیکی مسکراہٹ۔

نہیں میرے دوست۔۔۔ تمہاری قسمت کا ستارہ عروج پر ہے۔ میرا تو

تو ٹوٹ چکا۔

ہندوستان کو ذہین آدمیوں کی ضرورت نہیں"

یہ کہکر اس نے اطمینان کی سانس لی ــ وہ غسل خانہ میں گھس گیا دیر تک نہاتا رہا ــ جیسے اس کے جسم پر برسوں کی غلاظت جمی تھی۔

یہ پانی کی لطیف ٹھنڈک ــ اے ہیں ــ میری جان کو بھی سرد کردے لیکن آہ میری روح جھلس رہی ہے ــ ہیں ہیں ــ میں کتنا خوش ہوں۔

وہ باہر نکل آیا۔ شیو کرتے وقت اس کی کھال کئی جگہ سے کٹ گئی اور وہ اطمینان سے اپنے بہتے ہوئے خون کو دیکھا کیا ــ اپنے جسم کے خون کو نہانے کے بعد شیو ــ یہ زندگی میں پہلا اتفاق تھا ــ وہ دیر تک استرا پھیرا کیا اور اپنا پسندیدہ گانا گنگناتا رہا

کیسے چھپوگی ......

دھوپ میں تمازت پیدا ہو گئی اور چڑیوں کا چہچہانا تو مدت ہوئی بند ہو چکا تھا لیکن اس کی حرکات میں جلدی نام کو بھی نہ تھی۔

ایسا اطمینان ــ اس قدر مطمئن وہ کبھی نہ تھا۔ جب اس نے اپنی محبوب شیروانی پہنی تو وہ بے اختیار آئینہ کے سامنے چلا گیا۔ کریم کی شیشی کھلی پڑی تھی۔ تمہیں بھی کیوں محروم رکھوں۔ یہ کہہ کر اس نے بہت سی کریم اپنے چہرہ پر مل لی۔ کیا میں بہت حسین لگ رہا ہوں۔

دریں چہ شک ــ آئینہ نے جواب دیا ــ اس کے چہرہ پر ناگواری چھا گئی۔ جان بہت سستی ہے کیا حقارت کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ وہ بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا ــ کرہیہ قہقہہ ــ نو بج گئے ــ بھئی بہت جلدی۔

وہ خراماں خراماں کالج چلا گیا .... زیادہ چہل پہل نہ تھی ــ ابھی کھلے ہوئے دو ہی روز تو ہوئے تھے۔

بھئی اب کل کے لئے کچھ باتیں اٹھا رکھو اس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا

"کل کے لئے"، وہ مسکرایا

آج تو تم غضب کے حاضر جواب نظر آرہے ہو۔

حاضر جوابی سر بھی تو قلم کرا دیتی ہے۔

"اب ایسے سنگدل کہاں" وہ پروفیسر کہتا ہوا چلا گیا۔

دنیا کبھی کنگال رہی ہے۔ سلیم نے سوچا وہ اپنے کمرہ میں آگیا جب اس کی نظر گرد آلود ستار پر پڑی تو اس نے بڑی محبت سے اسے اٹھا لیا اور بہت دیر تک صاف کرتا رہا۔ پھر اس کا دل بے اختیار ہو گیا اور اس کی انگلیاں تھرکنے لگیں۔

اس کو ــ سنبھلنے دے ذرا اے ناامیدی کیا قیامت ہے

اس کو وہ زمانہ یاد آتا رہا، جب لڑکیوں نے مکرر اور سہ کرر اس سے یہی مصرعہ گانے کی فرمائش کی تھی۔

اس کا سر چکرانے لگا اور اس کو نیند آگئی

جب آنکھ کھلی ــ تو دھوپ دھندلی ہو چکی تھی ــ اور شام پر کیف تھی۔ اس نے جلدی جلدی منہ دھویا اور سوٹ پہن لیا۔

اس کو محسوس ہوا کہ اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا ہے اور اس کی پیشانی پسینہ کے قطروں سے نم ہے ــ اس نے شاہدہ کی تصویر کو صرف ایک لمحہ کے لئے دیکھا اور گھبرا کر البم بند کر دیا ــ "خدا حافظ" اس نے اپنے کمرے پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔

"بڑی صبح صبح سے نکلے ہو یار" کسی دوست نے مسکرا کر کہا۔

"اس شان سے تم نے کسی کو نہ دیکھا ہوگا"

"سچ بتا ــ آج تیری آنکھوں میں ایسی انوکھی چمک کیوں ہے" ــ؟

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

جب وہ راستہ طے کر رہا تھا تو چند دوست پکار اٹھے۔

"ارے کہاں ذرا دو تین ہاتھ بیڈمنٹن" ــ "ضرور"

"آج تو بڑے پینترے دکھا رہا ہے میرے یار"

"پارک چلتے ہو" ــ ایک نے تجویز پیش کی ــ "آج تو لڑکیاں بھی زیادہ ہوں گی" دوسرے نے اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے کہا

"نہیں اسٹیشن چلو"

"ارے بھئی یہ احتراز کیسا؟ ہم تو سمجھے تھے کہ آج یہ بانکپن اسی لئے اختیار کیا ہے"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ ان سب کو کیفے میں لے گیا ــ سورج دم توڑ رہا تھا۔

بیرا ــ توس انڈے ...... بریانی ...... کباب ...... مونگچھیاں۔

اور بیرا سوچنے لگا کیا اس سے پہلے کبھی یہ کیفے میں آئے ہیں۔

"یہ کیا خبط ہے سلیم"

"خوب کھاؤ میرے یار ــ جتنا کھا سکو کھائے چلے جاؤ"

"ہاں ہنس لو خوب ہنس لو"

وہ سب اس کا منہ تکنے لگے۔

پھر وہ سب پلیٹ فارم پر نکل آئے ــ وہ بے انتہا خاموش تھا۔ سیٹی گونجی ــ اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے انجن دندناتا ہوا آیا

اور وہ آناً فاناً میں کود گیا۔

ذہین کھوپڑی دور جا پڑی ——— ایسا کیوں ہوا ——— دوست متحیر رہ گئے ——— وہ ہاسٹل دوڑ گئے ——— اور جوش و سراسیمگی کی حالت میں اس کی میز پر پڑا ہوا لفافہ کھول ڈالا۔ لکھا تھا:۔

پروفیسر صاحب تسلیم

نسخہ تو آپ نے بہت لاجواب بنایا لیکن اس کے بعد شاید آپ کو کسی کی بیچارگی پر ہنسنے کی ضرورت نہ پڑے۔

سلیم

لڑکوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ——— انہوں نے کھوپڑی کا جلوس نکالا اور پروفیسر کے پاس لے گئے۔

اس کے ہاتھ سے سگار چھوٹ پڑا۔

نہیں ایک بار ——— اور ہنس لیجئے ——— مجمع چلایا .... پروفیسر کی مٹھیاں بھنچ گئیں ——— وہ کانپ رہا تھا

اور اب وہ اکثر باتیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں۔ اس کی مضطرب آنکھوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی غیر معمولی اذیت میں مبتلا ہے۔ اکثر وہ بالکل خبطی معلوم ہوتا ہے۔

وہ محفل رقص و سرود میں کبھی نہیں بیٹھ سکتا ...... رقاصہ ہمیشہ کھوپڑی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

جب کسی مسرور موقعہ پر محفل ہنستی ہے تو وہ بھی ہنستا ہے ——— ہمیشہ ——— ایک مجروح ہنسی! ———

برطانیہ اور نئے شہروں کی تعمیر ——— بقیہ صفحہ ۴۳

جس طرح ہم برطانیہ کے رہنے والے آج سے دو سو برس پہلے میکانیکی ایجادوں میں دنیا میں پیش پیش رہے ہیں ہمیں امید ہے کہ نئے شہروں کی تعمیر کے ذریعہ معاشرتی زندگی کو ترقی دینے میں بھی ہم دوسروں پر سبقت لے جائیں گے۔ کیا اپنے نئے شہروں کی تعمیر میں آپ اس خوش تدبیری، اشتراک عمل اور ہمت کی مثال پیش نہ کریں گے جو آپ نے زندگی کے ہر شعبے میں اس وقت پیش کی تھی جب کہ جرمنی کے حملہ کا ہر وقت خوف تھا اور آپ کے گھروں پر بم برس رہے تھے۔ اگر آپ اس وقت بھی ایسا کر سکے تو یقین رکھئے کہ برطانیہ نہ صرف مکانوں کی تعمیر کے معاملہ میں دنیا میں آگے آگے ہوگا بلکہ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی کوششوں میں یہ دنیا کی رہنمائی کرے گا۔ ("لسنر" سے ماخوذ)

انہیں کے دم سے

اُف وہ تخئیل جو افکار پریشاں میں نہیں
اُف وہ تصویر جو بتخانۂ ایماں میں نہیں
اُف وہ جلوے جو ترے دیدۂ حیراں میں نہیں
ہے نفس تیغ شرر بار انہیں کے دم سے

ولولے دل کے جو اندازۂ طوفاں میں نہیں
حوصلے دل کے جو ارباب گلستاں میں نہیں
فیصلے دل کے جو امیدِ گریزاں میں نہیں
ہے طلب برسرِ پیکار انہیں کے دم سے

نشۂ تند جو اے دوست کسی مے میں نہیں
نغمۂ سوز جو اے دوست کسی لے میں نہیں
مطمحِ فکر جو اے دوست کسی شے میں نہیں
روحِ خوابیدہ ہے بیدار انہیں کے دم سے

وہ نگینے جو صد فہائے سلیماں میں نہیں
وہ سفینے جو ابھی حلقۂ طوفاں میں نہیں
وہ جبینیں جو ابھی دامنِ یزداں میں نہیں
زندہ ہے روحِ طلبگار انہیں کے دم سے

وہ تسلی جو تری چشمِ پشیماں میں نہیں
وہ تجلی جو ترے حسنِ فراواں میں نہیں
وہ تعلی جو ترے وعدۂ فیماں میں نہیں
مشتعل ہے دلِ بیمار انہیں کے دم سے

شعلۂ طور جو اب جلوۂ برہم میں نہیں
دردِ مہجور جو اب زادۂ مریم میں نہیں
جذبِ منصور جو اب ہمتِ آدم میں نہیں
سیکڑوں ہیں رسن و دار انہیں کے دم سے

رو بہ اصلاح کبھی ہوگی یہ تقدیر جمیل
کیا بگڑتی ہی چلی جائے گی تدبیر جمیل
مضمحل کیوں نظر آتی ہے یہ تصویر جمیل
پیچ در پیچ ہیں اسرار انہیں کے دم سے

جمیل ایوبی

جاپان۔ اتحادی تسلط کے ایک سال بعد

مہر لال گپتا

ذرا فرض کیجئے کہ ایک روز صبح کے وقت آپ بیدار ہونے پر اپنے باغیچے میں ایک مردہ وھیل مچھلی کو پڑا دیکھتے ہیں۔ اسے دیکھ کر کچھ دیر حیرت واستعجاب میں غرق رہنے کے بعد آپ یہ سوچنا شروع کرتے ہیں کہ اس لاش کو ٹھکانے کس طرح لگایا جائے۔ لیکن جلدی ہی آپ محسوس کر لیتے ہیں کہ اس سلسلے میں دماغ سوزی بے سود ہے۔ کیونکہ آپ موجودہ حالات کے پیش نظر اس سے کسیطرح بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اور اس لئے آپ مایوس ہو کر ارادہ ترک کر دیتے ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہی آرزو کر سکتے ہیں کہ وہی معجزہ جو اسے وہاں لانے کا باعث ہوا تھا، ایک بار پھر اپنا رنگ دکھائے اور اسے واپس لیجائے بس سمجھ لیجئے کہ اسوقت جاپان کی بالکل یہی حالت ہے۔

جب تک آپ تباہی اور بربادی کا اصل نقشہ بچشم خود نہ دیکھ لیں آپ اس مایوسی۔ حرماں نصیبی اور مردہ دلی کا ذرا بھی اندازہ نہیں لگا سکتے جو اسوقت ایک زہرناک بلائے ناگہانی کی طرح جاپانیوں پر نازل ہے۔ وہ ایک تباہی ہے جس کا تصور بھی یورپ میں نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کو یقین کرنا چاہئے کہ اکثر جاپانی شہر نئی وضع کی مضبوط عمارتوں سے پٹے پڑے ہیں۔ لیکن نوے فیصدی مکانات اور کارخانے تک لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ بیشتر قصبات میں خالی ڈھانچ باقی ہیں۔ وہ شکستہ حالت میں ہیں تاہم استعمال ہو سکتے ہیں ۔ باقی ہر چیز قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ آپ کو میلوں دور تک راکھ کا ایک وسیع صحرا نظر آئے گا۔ وہاں نہ اینٹ پتھر کے انبار ہوں گے نہ دیواروں کے سرے بس راکھ ہی راکھ ہو گی۔

مثلاً ٹوکیو کی مثال لیجئے۔ وہاں بم زدہ علاقے کی مرمت کا سوال اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ سارا شہر نئے سرے سے تعمیر ہونا ہے۔ اسوقت صرف سڑکوں کے نشانات باقی ہیں یا ان غیر ہموار راستوں پر گذرتی ہوئی ڈھچر گاڑیاں نظر آ جاتی ہیں۔ اسوقت ٹوکیو ایک ایسے جسم انسانی سے مشابہ ہے جس کا صرف ڈھانچ اور شریانی نظام باقی رہ گیا ہو اور باقی گوشت وغیرہ گل سڑ کر گر چکا ہو۔ کچھ بھی ہو اسے ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑا کرنا ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ یہ کام کیسے کیا جائیگا۔ مثلاً شہروں کی مکرر تعمیر کے لئے جاپان میں لکڑی بکثرت حاصل ہو سکتی ہے لیکن دقت یہ ہے کہ اسے ڈھو کر جنگل سے کس طرح لایا جائے کیونکہ ریلوں کا نظام ابھی تک بگڑا پڑا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بھی جاپانی ایسا نہیں ملیگا جو برضا ورغبت اور صحیح ذوق وشوق کے ساتھ عمدہ مکان تعمیر کرنے کے لئے تیار ہو جائے جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ فوراً اس پر ان دشمنوں کا قبضہ اور نفاذ حکم ہونے لگے گا جو ملک پر تسلط قائم کئے ہوئے ہیں۔

لڑائی سے پہلے ٹوکیو کی آبادی ستر لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اب کم ہو کر تیس لاکھ رہ گئی ہے۔ اس آبادی کا بھی بہت تھوڑا حصہ خاص شہر میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ زیادہ تر لوگ مضافات شہر میں جا بسے ہیں اور وہاں بھی ایک مختصر سے مکان میں جو دو آدمیوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا، چار چار پانچ پانچ گھرانے بیک وقت آباد ہیں۔ لیکن خیر انگلستان کے بالمقابل جاپان میں یہ صورت پھر بھی کم تکلیف دہ ہے۔ کیونکہ جاپانی گھروں میں لوگ زمین پر بستر بچھا کر سو جانے کے عادی ہیں اور اس کے علاوہ خلوت و تنہائی کا احساس بھی ان لوگوں میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات تو کسی جاپانی کو بھی گوارا نہیں ہو سکتی کہ آٹھ دس قریبی رشتہ دار ایک مدت نامعلوم کے لئے آپس میں مل جل کر ایک ہی خوابگاہ میں گذارہ کرتے رہیں۔

روزانہ شہر آنے اور وہاں سے واپس جانے میں چھ سات گھنٹے ضائع ہو جاتے ہیں اور پھر گاڑیوں میں ٹھس کر سفر کرنے والے ان لوگوں کو ٹین بند مچھلیوں سے تشبیہ دی جائے تب بھی حقیقت کی پوری ترجمانی نہیں ہو سکتی کیونکہ مچھلیاں بہر حال ٹھونس کر ڈبوں میں نہیں بھری جاتیں۔ تمام گاڑیوں میں سے بیٹھنے کے تختے نکال دئے گئے ہیں، اور مسافروں کو ڈبوں میں اسطرح زبردستی دھکیلا جاتا ہے جیسے انجن میں کوئلہ جھونکتے وقت فائرمین کا بیلچہ کام کرتا ہے۔ ان لوگوں میں ایسے بوڑھے بھی شامل ہوتے ہیں جن کو دوسرے ملکوں میں اس طرح کبھی نہ بھیجا جا سکتا۔ اسی ٹھونسا ٹھانسی کے باعث اکثر حادثات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ قابض فوجوں کے اراکین اسپیشل ٹرینوں میں سفر کرتے ہیں اور وہ بھی اس ٹھاٹ کے ساتھ کہ سونے اور کھانے کے ڈبے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

ٹوکیو اور بہت سے دوسرے شہروں میں بھی قابض فوجوں کے افراد ان علاقوں میں آباد ہیں جو لڑائی کی تباہ کاریوں سے بچے رہے اور جن پر مغربیت کا رنگ غالب ہے اور اس طرح وہ مغربی دنیا کا ایک حصہ

معلوم ہوتے ہیں۔ وہاں اکا دکا جاپانی بھی نظر آجاتا ہے لیکن اس طرح جیسے وہ غلطی سے اس طرف آنکلا ہو۔ فوجیوں میں سب سے بڑا موضوع گفتگو "مراجعت وطن" اور اس کی تاریخ کا تعین ہے۔ اس کا نتیجہ لازمی طور پر برا نکل رہا ہے۔ کیونکہ یقینی طور پر جاپانیوں کو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ امریکی ان کے ملک میں رہنا نہیں چاہتے اور اسی لئے بہت سے قابل اور مفید جاپانی اپنے آپ کو عام سماجی زندگی سے الگ تھلگ رکھ رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ قلیل عرصہ قیام کی صورت میں کوئی تلافی مافات ممکن نہیں ہے۔ اس کا ثبوت ان جنگی مقدمات کی شہادتوں سے مل سکتا ہے جو ٹوکیو میں چل رہے ہیں۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ان واقعات کی پوری تفصیل ہمیں معلوم ہونے نہیں پاتی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ استغاثہ کا گواہ کچھ نہ کچھ عرصہ بعد مدافعت کا گواہ بن گیا۔ حالانکہ ان مقدمات کی پیروی میں بڑی تلاش کے بعد ایسے شاہد جمع کئے گئے تھے جن کو اصل حالات کا صحیح علم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان گواہوں کو پورے وثوق کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہے کہ پرانا نظام یکسر بدل چکا ہے۔ میری رائے میں اتحادیوں کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ مدت قیام کے سلسلے میں اپنا صحیح بیان شائع کر دیں۔ اس کے بغیر جاپان میں کوئی اصلاحی کام ممکن نہیں ہو سکے گا اور اس کا برا نتیجہ آئندہ نسلوں پر پڑے گا۔

جاپان میں مادی افراتفری کی موجودہ صورت کے ماتحت یہ امر کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے کہ ان کے اخلاق کا شیرازہ بھی بڑی حد تک بکھر چکا ہے۔ میرا مقصد جنسی اختلاط سے نہیں ہے حالانکہ اس کی مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں بلکہ میرا مطلب اس بد اخلاقی سے ہے جس کا اثر شہر کی پرسکون زندگی پر پڑتا ہے۔ یعنی رشوت ستانی، جعلسازی اور بدمعاملگی۔ نیز نیک و بد میں کوئی امتیاز قائم نہ رہنا۔ مجھے بہت سے جاپانیوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا اتفاق پڑا۔ لیکن ایسا ایک شخص بھی نظر نہیں آیا جسے جنگ کے مجرمانہ پہلوؤں کا ذرا بھی احساس ہو۔ حتیٰ کہ عام بازاری لوگ بھی ان باتوں کی ذمہ داری نہیں لیتے جو جنگ کے ارباب حل و عقد کر گزرتے ہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جنرل ٹوجو کو ساری دنیا نے قربانی کا بکرا بنا ڈالا ہے۔ وہی پرانے خبیث اب بھی دفتروں میں کام کر رہے ہیں اور اگر آپ کسی سرکاری اہلکار سے ملیں تو وہ یہی کہے گا کہ میں ذاتی طور پر لڑنے والوں کی حکمت عملی سے متفق نہیں تھا اور یہ کہ میں نے اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کی۔ حتی الامکان ہر شخص اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔

اب تک میں نے شہروں اور قصبوں کی زندگی پر اظہار خیال کیا ہے دیہاتوں میں حالات زندگی تقریباً وہی ہیں جو لڑائی سے پہلے تھے۔ اب جبکہ شہروں میں خوراک کا مسئلہ بڑی حد تک ناقابل برداشت ہو گیا ہے دیہاتوں میں کھانے پینے کی چیزیں بڑی افراط سے موجود ہیں۔ ایسی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تقسیم ٹھیک طور پر کیوں نہیں کی جا سکتی؟ اس کے کئی سبب ہیں۔ سب سے اہم درجہ یہ ہے کہ جاپان میں ریلوں کا نظام عام طور پر بالکل بگڑ گیا ہے۔ اس سے قطع نظر لوگوں کو پوری طرح یقین نہیں ہوتا کہ حکومت کس قسم کے قانون جاری کرنے والی ہے۔ فطرتاً یہ ناممکن ہے کہ اشیائے خوراک پیدا کرنے والے اپنی کل پیداوار حکومت کے سپرد کر دیں۔ جبکہ انھیں معلوم ہے کہ شہر سے آنے والے عام لوگوں کے ہاتھ وہ اپنا مال چور بازار کے ذریعہ زیادہ قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں۔

اب رہا قبضہ و تسلط کے اصل پہلو پر غور کرنا۔ یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ جاپان میں صورت حالات جرمنی سے بالکل مختلف ہے۔ جرمنی میں اسوقت بھی کوئی نظام حکومت قائم نہیں ہے۔ اس کے برعکس جاپان میں لڑائی ختم ہونے کے بعد بھی حکومت موجود تھی اور اتحادیوں کی حکمت عملی یہ رہی کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اتحادیوں کے صدر مقام سے حکومت جاپان کے نام ہدایات جاری ہوتی ہیں اور وہ انکو عملی جامہ پہنانے کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے۔ اتحادی حکام عوام سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتے اور یہ صورت جرمنی سے بالکل مختلف ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپان میں بہت سے ایسے اہلکار جن کے وجود کو کسی طرح بھی گوارہ نہیں کیا جا سکتا۔ اب بھی ملک میں خصوصاً دیہاتی اضلاع میں اپنے عہدے سنبھالے بیٹھے ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جن کو لڑائی سے پہلے بھی اقتدار حاصل تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انکو برطرف کر دینا ضروری تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ انکی جگہ کام کرنے کے لئے دوسرے لوگ نایاب ہیں۔ جاپان میں جنگ سے پہلے شہری ملازمتوں میں حتیٰ کہ شعبہ تعلیم میں بھی زیادہ تر ایسے لوگ شامل تھے جن کے خیالات جنگجویانہ تھے۔ دراصل انہی لوگوں کو عام معاملات کا شعور اور تجربہ تھا۔ ایسی صورت میں یہ امر نہ تو ممکن العمل ہے اور نہ قرین مصلحت کہ ان کو فوراً الگ کر دیا جائے تاوقتیکہ ان کی جگہ کام کرنے کے لئے نئے اصولوں پر تربیت دیے ہوئے دوسرے لوگ میسر نہ آجائیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ قبضہ و تسلط کے بعد جو دشواریاں پیدا ہوئی ہیں ان کا لب لباب یہی ہے۔ تسلط کا سب سے پہلا مقصد یہ تھا کہ جاپان میں فوج شکنی کی صورت پیدا ہو جائے اور اس میں شک نہیں کہ یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ ہزاروں میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے تباہ شدہ کارخانے اس امر کا کافی ثبوت ہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ تمام بحر الکاہل میں لڑائی کے نہایت اہم اڈوں پر اتحادیوں کا قبضہ ہو جانا یقین دلاتا ہے کہ اب ہمارے لئے جاپان سے باہر رہ کر

جاپان میں نظم و نسق قائم کرنا ممکن ہو گیا ہے لیکن اس مسئلہ پر اس طرح غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کم نظر فوجی زاویۂ فکر سے کام لیا جا رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کوئی ظالمانہ لڑائی شروع کرنے کے لئے جاپان میں کبھی بھی اتنی صلاحیت پیدا نہ ہو سکے گی بلکہ عزم و ارادہ بھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ اس امر کو پورے یقین کے ساتھ تسلیم کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اس ملک پر اتحادیوں کا تسلط زیادہ مدت تک قائم رہے تاکہ آئندہ کم سے کم دو نئی نسلوں کی تعلیم کا انتظام جمہوری بنیادوں پر کیا جا سکے۔ پھر یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ مقصد پوری طرح پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے یا نہیں مسلط فوج کو بھی زیادہ عرصہ وہاں قبضہ جمائے رکھنا چاہیئے۔ تاکہ جب یہ دو نئی نسلیں امور عامہ میں عملی حصہ لینے کے لائق ہو جائیں تو وہ ان کو کسی قسم کے رونما ہونے والے ردِ عمل سے باز رکھ سکیں۔ میرا اندازہ ہے کہ بہ صورت پندرہ بیس سال میں ظہور پذیر ہو سکے گی فی الحال مجھے کچھ معلوم نہیں کہ موجودہ تسلط کا سلسلہ کتنی مدت تک جاری رہے گا تاہم صورت واقعات اس امر کا پتہ دیتی ہے کہ غالباً وہ اتنی مدت تک جاری نہیں رہے گا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جبتک ہم طویل مدت کا اصول پیش نظر رکھنے کے لئے تیار نہ ہوں جاپانیوں کو صحیح معنوں میں جمہوریت پسند بنانے کا ذرا بھی موقع پیدا نہ ہو سکے گا۔

سرکاری اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قابل لحاظ ترقی حاصل ہو رہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے غلط فہمیوں میں مبتلا کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہاں نافذ کئے ہوئے احکامات اور ان کے عملی پہلوؤں میں کوئی فرق واقعیا ذ پیدا نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت بہت سے جاپانی جمہوریت نوازی کا ثبوت دے رہے ہیں اور انھیں اس امر کا پورا احساس بھی نہیں ہے کہ وہ نئے زاویۂ فکر پر غور کرنے کی بجائے نئی راہ عمل پر گامزن ہیں۔

اب رہا تعلیم کا میدان عمل۔ سو اس سلسلہ میں بہت کم تنظیمی کام کیا گیا ہے اور جو کچھ ہوا ہے وہ بالکل منفی حیثیت رکھتا ہے۔ تسلط قائم رکھنے والے حکام نے چند خاص موضوعات مثلاً جغرافیہ، تاریخ اور اخلاقیات کی تعلیم کو اسوقت تک کے لئے ممنوع قرار دیدیا ہے جب تک کہ قومی تعصبات سے الگ ہٹ کر کوئی نیا نصاب تیار نہ کر لیا جائے۔ اس وقت یہ بات بھی زیر غور ہے کہ جاپان کے مدرسوں اور کالجوں میں پڑھانے والے موجودہ استادوں کی جن کی تعداد تقریباً چار لاکھ چودہ ہزار ہے، خوب اچھی طرح جانچ پڑتال کی جائے اور پھر فیصلہ کیا جائے کہ انھیں اس خدمت پر مامور رکھنا چاہیئے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نتیجے پر پہونچنے میں بڑی دیر لگے گی۔ پھر اس دورِ تذبذب کی حالت میں یہ امر کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے کہ اسوقت نہ تو استاد تعلیم و تربیت کی پابندی کرتے ہیں اور نہ طلبار کو اس کی پروا ہے۔ بہر حال یہ تجاویز نصف مرحلوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ طلبار جاپان کے غلط انداز نظام تعلیم سے بچے رہیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ مشورہ نہیں دیا جاتا کہ اس ملک کے لئے نئے اور مختلف قسم کے استاد کہاں سے لائے جائیں۔ دشواری یہ ہے کہ اس مسئلہ کا فوراً کوئی حل بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ اصل حل کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم طویل مدت کے اصول پر کاربند ہوں ؏

غزل

مسرور منگر

کسی پر اس طرح آیا شباب آہستہ آہستہ
کلی جیسے بنے کھل کر گلاب آہستہ آہستہ!

وہ اُٹھی روئے روشن سے نقاب آہستہ آہستہ
محبت ہو رہی ہے کامیاب آہستہ آہستہ!

الٰہی خیر جب مجھ سے نگاہیں چار ہوتی ہیں!
حیا آتی ہے آتا ہے حجاب آہستہ آہستہ

یہ مطلب ہے کہ ہم گھبرا نہ جائیں ظلم سہنے سے
اسی باعث تو ہوتا ہے عتاب آہستہ آہستہ

سکونِ دل، سکونِ روح، اب تیرا خدا حافظ
کہ بڑھتا جا رہا ہے اضطراب آہستہ آہستہ

مجھے تشنہ لبی کا لطف بھی لینے دے اے ساقی
بڑھا میری طرف جام شراب آہستہ آہستہ

کسی کے غم میں اے مسرور اب یہ دل کا عالم ہے
کہ جیسے ڈھل رہا ہو آفتاب آہستہ آہستہ

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔

ریویو کیلیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ورنہ اپر کسی قسم کی رائے قلمبند نہیں کیجائیگی

(ادارہ)

ہندوستانی موسیقی کے ساز

شاہد احمد دہلوی

ہندوستانی موسیقی میں سینکڑوں ساز ہیں۔ ان میں سے بعض ہزاروں سال پہلے کی ایجاد ہیں۔ بعض ایجاد ہوئے اور اپنی پیچیدگی اور دشواری کی وجہ سے رواج نہ پاسکے اور گمنامی کے پردے میں چھپ گئے۔ بعض نے اتنی اہمیت حاصل کرلی کہ ان کی ایک مستقل ضرورت اور جگہ ہوگئی اور اس کے بغیر گانا نامکمل یا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بعض ساز ایسے ہیں جنہوں نے وقتی ضروریات کو پورا کیا اور بعد میں ان کا رواج نہیں رہا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ہمارے سنگیت میں تبدیلیاں ہوتی گئیں ہمارے سازوں میں بھی حسب ضرورت ایجادیں، اختراعیں اور ردوبدل ہوتا گیا۔ ویدک زمانے کے کچھ اور ساز تھے۔ ہندو حکمرانوں کے زمانے میں ان میں تبدیلیاں اور اضافے ہوئے۔ اسکے بعد جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ عرب، ایران اور توران کے ساز بھی لائے۔ ان میں سے کئی اب تک برتے جاتے ہیں۔ کئی یہاں کی موسیقی سے میل نہ کھا سکے اور روپوش ہوگئے۔ ان کے علاوہ یہاں کے بعض گنیوں نے چند ساز بنائے جنہیں یہاں کی فضا ایسی راس آئی کہ جگ بیت جانے پر بھی ان کی ضرورت اور دلکشی میں کمی نہیں آئی بلکہ آنے والی نسلوں کے فنکاروں نے انہیں اور بھی مکمل کر دیا یا نئی زندگی بخش دی۔ جب فرنگیوں نے یہاں چھاؤنی چھائی تو ان کے بعض آلاتِ موسیقی نے بھی ہمارے سنگیت میں جگہ پائی۔ اس طرح ہماری موجودہ موسیقی میں بھانت بھانت کے ساز جمع ہوگئے ہیں۔

ہندوستانی موسیقی کے سازوں کی تعداد ہزاروں پر ہے۔ لیکن بعض زمانے کا ساتھ نہ دے سکے اور محفلوں کی بجائے عجائب گھروں میں انہیں جگہ ملی۔ بعض صرف مقامی ضروریات پوری کرسکے اور ایک محدود حلقے میں گھٹ کر رہ گئے۔ اسلئے ہزاروں پر نہیں تو سینکڑوں پر اب بھی ان کی نوبت ہے، ہم صرف ان سازوں کا ذکر کرینگے جو مشہور ہیں اور آجکل بجائے جاتے ہیں۔

ساز دو قسم کے ہوتے ہیں:۔ (۱) سُر کے ساز اور (۲) تال کے ساز:۔

اس تقسیم کے بعد سازوں کو چار اور قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:۔

(۱) پہلی قسم کے ساز وہ ہیں جو مضراب یا چوبے سے بجائے جاتے ہیں جیسے بین، سرود اور ستار۔

(۲) دوسری قسم کے ساز وہ ہیں جو گز یا کمانی سے بجائے جاتے ہیں جیسے سارنگی، دلربا اور وائلن۔

(۳) تیسری قسم کے ساز وہ ہیں جو ہاتھ یا چوب کی ضرب سے بجائے جاتے ہیں۔ جیسے طبلہ نقارہ اور جلترنگ۔

(۴) چوتھی قسم کے ساز وہ ہیں جو پھونک یا ہوا سے بجائے جاتے ہیں۔ جیسے بانسری، شہنائی اور ہارمونیم۔

یوں تو سارے ہی ساز گانے کی نقل کرتے ہیں اور جو سُر گلے سے پیدا ہوتے ہیں وہی سُر تار یا تانت سے پیدا کئے جاتے ہیں لیکن ان سازوں میں سے بعض ایسے ہیں جو صرف گانے ہی کے ساتھ بجائے جاتے ہیں جیسے تانپورہ۔ بعض ایسے ہیں جو علیحدہ بجائے جاتے ہیں، جیسے بین اور سنکھ۔ اور بعض ایسے ہیں جو سنگت میں بھی بجتے ہیں اور علیحدہ بھی، جیسے سارنگی، دلربا اور طبلہ۔

اب ان سب سازوں کا مختصر حال پیش کیا جاتا ہے۔

تانپورہ مروجہ سازوں میں سب سے زیادہ برتا جانے والا ساز ہے اسے طنبورہ بھی کہتے ہیں۔ یہ قدیم ترین سازوں میں سے ہے۔ چار ہزار سال پہلے کی مصری نقاشی میں یہ ساز موجود ہے۔ اسلئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ قدیم مصریوں کی ایجاد ہے۔ تانپورہ میں چار تار ہوتے ہیں۔ بیچ کے دو تار گانے والے کے بنیادی سُر میں ملائے جاتے ہیں اور انہیں جوڑا کہتے ہیں۔ چوتھا تار بھی سُر میں ملایا جاتا ہے اور کھرج کہلاتا ہے۔ پہلا تار راگ کی مناسبت سے مدھم، پنچم یا نکھاد میں ملایا جاتا ہے۔ یہ صرف آس کا ساز ہے اور اسکے چاروں تار باری باری سے چھیڑے جاتے ہیں۔ اس میں بجانے کا کوئی کام نہیں ہے۔ صرف سُر قائم رکھنے کیلئے تانپورہ چھیڑا جاتا ہے۔

بین ہندوستان کے قدیم ترین سازوں میں سے ہے۔ روایت ہے کہ مہادیو نے پاربتی جی سے متاثر ہوکر اسے بنایا۔ اس کی کئی شکلیں تھوڑے تھوڑے سے فرق کے ساتھ بنائی گئی ہیں، جنمیں سے مشہور چار ہیں۔ (۱) رودر بین (۲) نارد بین (۳) سرسوتی بین اور (۴) وچتر بین۔ دو تونبوں پر ایک ڈانڈ لگاکر بین بنائی گئی ہے کسی میں پردے ہوتے ہیں اور کسی میں نہیں ہوتے۔ کندھے کے سہارے لگاکر یا فرش پر دونوں تونبے ٹکا کر بجائی جاتی ہے۔ تنت کاروں کا کہنا ہے کہ بین دسوں انگلیوں سے بجتی ہے، سیدھے ہاتھ کی چاروں انگلیوں میں مچھلی کے چھلکے کے ناخن جیسے حلقے پہنے جاتے ہیں بین میں آٹھ تار اور انیس پردے ہوتے ہیں

سازوں میں بین سے زیادہ مشکل ساز اور کوئی نہیں ہے دچترہ بین زمانہ حال کی ایجاد ہے اس میں پردے نہیں ہوتے۔ اور بائیں ہاتھ میں بٹہ لیکر بجائی جاتی ہے۔ اسی لئے اسے بٹہ بین بھی کہتے ہیں۔ یہ پٹیالہ والے عبدالعزیز خاں کی ایجاد ہے۔

ستار بین کی آسان شکل ہے۔ یہ حضرت امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ اسمیں پہلے تین تار ہوتے تھے اسی لئے اس کا نام سہ تار رکھا گیا تھا۔ اس میں صرف ایک تونبہ ہوتا ہے اور تانت سے بندھے ہوئے پردے ہوتے ہیں جو راگ کے سروں کے مطابق کھسکائے جاتے ہیں۔

سُر بہار ستار کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کی ڈانڈ نسبتاً چوڑی ہوتی ہے اور باج کے تاروں کے نیچے طرب بین آس دینے کے لئے لگائی جاتی ہیں۔ الاپ کے لئے سُر بہار اور گت بجانے کے لئے ستار موزوں ہے۔

رباب ارسطو کی ایجاد ہے نیچے کا حصہ بیضوی ہوتا ہے اور اسپر کھال منڈھی ہوتی ہے۔ اس میں چار تار اور سات طربین ہوتی ہیں۔

سرود رباب کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ قد و قامت میں رباب سے ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ چٹکی میں زخمہ یا جوا پکڑ کر سیدھے ہاتھ سے ضرب لگائی جاتی ہے اور بائیں ہاتھ سے تاروں کو دبایا اور کھینچا جاتا ہے۔

سُر سنگھار سرود کی ایک اور شکل ہے جو پیارے خاں لکھنوی کی ایجاد ہے۔ نیچے ایک لمبوترا تونبہ ہوتا ہے اور بین کی طرح اوپر ایک چھوٹا تونبہ ہوتا ہے۔ رباب، سرود اور سرسنگھار میں پردے نہیں ہوتے۔

سارنگی بقراط کی ایجاد ہے۔ سروں کی تمام خوبیاں اس ساز میں ادا کی جاسکتی ہیں۔ اسلئے اسے سو رنگی کہا گیا گلے کا ساتھ سارنگی سے بہتر اور کسی ساز پر نہیں ہو سکتا۔ اس میں باج کے تین تار ہوتے ہیں اور طربوں کے دوسٹ ہوتے ہیں۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں باج کے تار کے پہلو میں تار سے ملا کر رکھی جاتی ہیں اور دائیں ہاتھ میں گز ہوتا ہے۔ گلے کی پوری نقل اتارنے کے علاوہ اس ساز میں دوسرے سازوں کا باج پیش کرنے کی بھی صلاحیت ہے چنانچہ بین، رباب، دلربا، طبلہ وغیرہ کے نقشے بھی سارنگی میں استاد بندو خاں دہلوی نے پیش کر کے اس دعوے کا ثبوت دیا ہے۔

سُر ساگر سارنگی ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسمیں بھی باج کے تین تار ہوتے ہیں اور دلنبر باج پسنگیں ادا کی جاتی ہیں۔ اسکے علاوہ کئی اور تار ہوتے ہیں۔ جن پر بائیں ہاتھ سے چھالے لگائے جاتے ہیں۔ سُر ساگر قد و قامت میں سارنگی سے ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ یہ محسن خاں دہلوی کی اختراع ہے۔

طاؤس اسم بامسمّیٰ ساز ہے۔ اس کی شکل مور کی ہوتی ہے۔ اور رنگ بھی وہی ہوتا ہے۔ مور کی دم ڈانڈ کا کام دیتی ہے۔ اس میں ستار کی طرح پردے لگے ہوتے ہیں جو حسب ضرورت کھسکائے جاسکتے ہیں۔ یہ ساز مضراب سے نہیں گز سے بجایا جاتا ہے۔

کمانچہ سارا لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ نچلے حصے پر سارنگی کی طرح کھال منڈھی ہوتی ہے اور ڈانڈ پر ستار کی طرح پردے ہوتے ہیں۔ اسے ستار اور سارنگی کا آمیزہ سمجھنا چاہئے۔ گز سے بجایا جاتا ہے اور طاؤس کی طرح بائیں ہاتھ کی انگلیاں باج کے تار پر ٹکائی جاتی ہیں۔ پنجاب کا عام ساز ہے۔

دلربا یا اسراج اس کا اصول وہی ہے جو طاؤس اور کمانچہ کا۔ صرف شکل میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔

موسیقار اس ساز کو اس روایتی موہوم پرندہ کی شکل دی گئی ہے جو موسیقی کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ یہ پرندہ ایک ہزار سال تک زندہ رہتا ہے۔ اس کی چونچ میں سات سوراخ ہوتے ہیں جن سے ساتوں سُر پیدا ہوتے ہیں۔ جب یہ مرنے لگتا ہے تو تنکے اور خشک ٹہنیاں وغیرہ جمع کر کے ایک ڈھیر لگاتا ہے اور اس پر بیٹھ کر دیپک راگ الاپتا ہے۔ اس کی تاثیر سے خشک ڈھیر میں آگ لگ جاتی ہے اور موسیقار جل کر بھسم ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی خاک سے ایک کیڑا پیدا ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ پھر ایک موسیقار بن جاتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔ اس روایتی پرندہ کی تصویری شکل پر یہ ساز بنایا گیا ہے اور اس کی پشت اور دم پر سارنگی کے اصول پر تار لگائے گئے ہیں اور اسکے بجانے کا بھی وہی طریقہ ہے جو سارنگی کا یہ ساز بندو خاں صاحب دہلوی کی اختراع ہے۔

سارندہ ایک مختصر سا ساز ہے جو نہایت خوش آواز ہے۔ سارنگی کی طرح بجایا جاتا ہے۔ گرو امر داس بانیٔ امرتسر کی ایجاد ہے۔

وایولن فڈل یا بیلا یورپ کا ساز ہے جو ہمارے سنگیت میں شامل ہو گیا ہے۔ اس میں چار تار ہوتے ہیں اور کمانی سے بجایا جاتا ہے۔ اصول کے اعتبار سے اسے یورپ کی سارنگی سمجھنا چاہئے۔

چیلو قد و قامت میں وایولن سے تین گنا ہوتا ہے۔ بجانے کا اصول وہی ہے جو بیلے کا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وایولن اٹھا رکھ کر بجایا جاتا ہے اور چیلو بھاری ہونے کی وجہ سے فرش پر سیدھا ٹکایا جاتا ہے اس کی آواز بہت بھاری اور گمبھیر ہوتی ہے۔ یہ بھی یورپی موسیقی کا ساز ہے۔

ڈبل بین یہ ساز بھی یورپ سے آیا ہے اور چیلو کی شکل اور قد و قامت میں اس سے بڑا ہوتا ہے۔ اس میں بھی چار تار ہوتے ہیں اور چٹکی سے بجایا جاتا ہے۔ اس کی آواز دھنئے کی تانت سے مشابہ

ہوتی ہے اور ہلکے پھلکے گانوں میں اس کی سنگت بڑا لطف دیتی ہے۔

ٹوشی کوٹو جاپانی ساز ہے۔ اس میں کئی تار ہوتے ہیں اور چابیاں لگی ہوتی ہیں۔ تار جوے سے چھیڑے جاتے ہیں۔

بربط عربی موسیقی کا پرانا ساز ہے۔ یہ فیثاغورث کی ایجاد ہے۔ اس میں ایک تختے پر چالیس تار اس طرح لگائے گئے ہیں کہ ان کی لمبائی کم ہوتی جاتی ہے۔ پتلی پتلی چوبوں سے بجایا جاتا ہے۔

قانون بربط ہی کی دوسری شکل ہے۔ یہ ابونصر فارابی کی اختراع ہے۔ بربط میں تار سیدھے چڑھے ہوتے ہیں اور قانون میں آڑے۔ اسے سُرمنڈل بھی کہتے ہیں۔ ایک ایک سُر کے دو دو تار کھچا چڑھائے جاتے ہیں اور یہ بھی سبک اور آبنوسی چوبوں سے بجایا جاتا ہے۔

بانسری پھونک سے بجائے جانے والے سازوں میں سب سے عام بانسری ہے۔ اسے کنہیا جی کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ اس میں چھ سوراخ ہوتے ہیں جن پر دونوں ہاتھوں کی تین تین انگلیاں رکھی جاتی ہیں۔ مختلف سوراخوں کے کھولنے سے مختلف سُر پیدا ہوتے ہیں۔

نے لوہے کی بڑی بانسری ہوتی ہے۔ یہ عمرو عیار کی ایجاد ہے۔

الغوزہ یہ بھی ایک قسم کی بانسری ہی ہے۔ عام طور سے دیہاتوں میں اس کا جوڑا بجایا جاتا ہے۔

شہنائی اصل میں سینائی ہے، یہ بوعلی سینا کی ایجاد ہے۔ اس میں ایک پتّی لگائی جاتی ہے جس سے سُر پیدا ہوتا ہے۔

نفیری شہنائی ہی کی دوسری شکل ہے، اسکے بجانے کے وہی تمام اصول ہیں جو شہنائی کے۔

سنکھ ہندوؤں کا مقدس گھونگا ہوتا ہے۔ یہی ناقوس بھی کہلاتا ہے۔ مندر میں پجاریوں کو جمع کرنے کے لئے یا عبادت کے وقت بجایا جاتا ہے۔ سنکھ ترنگ اسی کی ایک اور شکل ہے۔

سرسنگھا یہ سینگ ہوتا ہے اور لوگوں کو جمع کرنے کیلئے بجایا جاتا ہے۔

پونگی ایک گول چھوٹی تونبی میں اوپر ایک سوراخ کرکے ایک نلی لگائی جاتی ہے اور نیچے ایک سوراخ کرکے دو نلیاں ملی ہوئی لگی ہوتی ہیں۔ ان میں سوراخ ہوتے ہیں جن پر انگلیاں رکھی جاتی ہیں۔ یہ سپیروں کا مخصوص ساز ہے، اور اس کی آواز ایک خاص اثر رکھتی ہے جس پر سانپ جھومنے لگتا ہے۔

کلارنٹ بانسری کی بہت ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ ساز یورپ سے آیا ہے۔ اس میں بانسری کی طرح سوراخوں کے علاوہ چابیاں بھی لگی ہوتی ہیں۔ اس کی آواز بہت گمبھیر ہوتی ہے۔

کارنٹ یہ بھی یورپی ساز ہے۔ یہ بگل کی شکل کا ہوتا ہے۔ چھوٹا سا پیتل کا باجہ ہے جس میں صرف تین چابیاں ہوتی ہیں۔ انہی سے سالے سُر ادا ہو جاتے ہیں۔

پیانو اسے ارغنوں بھی کہا جاتا ہے۔ یورپ کا ساز ہے مگر اب ہمارے آلاتِ موسیقی میں شامل ہے ہلکے گانوں اور آرکسٹرا میں بجایا جاتا ہے۔

ہارمونیم ہوا سے بجنے والے سازوں میں یہ ساز سب سے زیادہ مقبول ہوا کم قیمت اور آسان ہونے کی وجہ سے گھر گھر اس کا چرچا ہوا۔ اس کی شکل پیانو سے ملتی جلتی ہے لیکن پیانو ضرب لگانے سے بجتا ہے اور ہارمونیم ہوا دینے سے۔ دوسرے سازوں کی طرح اس میں سُر ملانے کی دشواری نہیں ہے۔ ہر سُر کی ایک چابی ہے اور بارہ بارہ سُروں کی اس میں تین سپتکیں ہوتی ہیں۔ تھوڑی سی مشق سے یہ باجہ بجایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں عیب یہ ہے کہ ہمارے سنگیت کی باریکیوں اور نزاکتوں کو ادا نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے اسے ایک نامکمل اور ناموزوں ساز قرار دیا گیا ہے۔

پکھاوج گنیش جی کی ایجاد ہے۔ ایک طرف سیاہی ہوتی ہے اور دوسری طرف آٹا لگایا جاتا ہے۔ اس کی آواز ایسی ہوتی ہے جیسے سہانی توپیں چھوٹ رہی ہوں۔ کبھی بادل کی سی گرج سنائی دیتی ہے اور کبھی کڑکتی بجلیوں کے تڑاخے ہونے لگتے ہیں اور جب اس پر کوئی پرن سنائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ چڑیوں کا ایک غول چہچہا رہا ہے۔

طبلہ پکھاوج کے دو ٹکڑے کرکے امیر خسرو نے ایجاد کیا ہے۔ اسکے بول پکھاوج سے الگ مقرر ہیں اور رباج کا طریقہ بھی علیحدہ ہے۔ پکھاوج میں پورے ہاتھ سے ضرب لگائی جاتی ہے اور طبلہ میں انگلیوں کے پوروں سے۔

ڈھولک یہ بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے اور قوالوں کا ساز ہے۔ اس کی آواز اور باج پکھاوج اور طبلہ دونوں سے الگ ہے۔

خول پکھاوج کی شکل کا ساز ہے۔ اس کی دائیں بڑی بہت چھوٹی ہوتی ہے۔ بنگال کا خاص ساز ہے۔

کھڑتال بھجن گانے والوں کے ساتھ بجائی جاتی ہے۔ یہ لکڑی کے ٹکڑے ہوتے ہیں جن میں پیتل کی چھوٹی چھوٹی تھالیاں لگی ہوتی ہیں۔

مجیرے پیتل کی دو کٹوریاں سی ہوتی ہیں۔ طوائفوں کے ساتھ بجائی جاتی ہیں۔

نوبت اصل میں نو باج ہے۔ اس میں دو شہنائی والے، دو نقارچی، ایک جھانج والا، ایک قرنا والا، ایک دمامہ (ڈھول والا) ایک جمعدار (بینڈ ماسٹر) اور ایک باری دار یعنی خدمت گذار۔ یہ نو آدمی ہوتے تھے۔ نوبت شان و شکوت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ ہر پہر پر نوبت بجا کرتی تھی یعنی ہر تین گھنٹے کے بعد۔

نقارہ اس کی جوڑی ہوتی ہے۔ ایک بڑا جو بائیں ہاتھ کو رکھا جاتا ہے اور ایک چھوٹا جو دائیں ہاتھ کو رکھا جاتا ہے۔ نقارہ چوبوں سے بجایا جاتا ہے۔ اس کے بول پکھاوج، طبلہ وغیرہ سے الگ ہوتے ہیں۔

ڈھول بڑے پیٹ کا دو رُخہ ہوتا ہے۔ دایاں رُخ چوب سے اور بایاں ہاتھ سے بجایا جاتا ہے۔ منادی کرنے یا لوگوں کو جمع کرنے کے لئے بجایا جاتا ہے یا شادیوں کے جلوسوں میں بجتا ہے۔ اسے ڈہل یا طبل بھی کہتے ہیں۔

تاسہ اور مرفہ چپٹے ہوئے طبلے کی شکل کے ساز ہیں اور چوبوں سے بجتے ہیں۔ ان کی آواز بہت اونچی ہوتی ہے۔ بیاہ براتوں میں اس کے بجائے جانے کا عام رواج ہے۔ تاسہ دو چوبوں سے اور مرفہ ایک چوب سے بجایا جاتا ہے۔

دھومس اور چانپ تاسہ کی شکل کے چھوٹے مٹی کے پیالے ہوتے ہیں جن پر کھال منڈھی ہوتی ہے۔ انہیں گلے میں ٹکا کر بجایا جاتا ہے۔ نفیری کے ساتھ اب بھی بجتے ہیں۔

جھانجھ کمان کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس میں پیتل کے گول گول ٹکڑے لگے ہوتے ہیں جنہیں ہلانے سے جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے۔

دف افلاطون کی ایجاد ہے۔ لکڑی کے ایک گول پٹھے پر کھال منڈھی ہوتی ہے۔

دائرہ دف کی شکل کا ہوتا ہے مگر اس سے چھوٹا۔

کھنجری دف سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس میں پیتل کی چھوٹی چھوٹی تھالیاں بھی لگا دی جاتی ہیں ناچنے والیاں اسے ناچنے میں بجاتی جاتی ہیں

ڈیرو اور ڈمرو مہادیوں کی ایجادیں ہیں۔ ڈیرو ایک رخہ ہوتا ہے اور ڈمرو دو رُخہ۔

جل ترنگ چینی کے سولہ پیالے ہوتے ہیں جو بتدریج چھوٹے ہوتے جاتے ہیں ان پیالوں میں حسب ضرورت پانی ڈالا جاتا ہے تاکہ سُر قائم ہو سکیں۔ سب پیالے نصف دائرے کی شکل میں رکھے جاتے ہیں اور دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چوب لیکر بجایا جاتا ہے۔ طبلہ ترنگ نلکی ترنگ گھنٹی ترنگ، بوتل ترنگ، اور لکڑ ترنگ وغیرہ بھی اسی اصول پر بنائے گئے ہیں۔

یہ ہمارے وہ ساز ہیں جو آجکل کے سنگیت میں برتے جاتے ہیں ورنہ صرف تال ہی کے تین سو سے اوپر ساز ہیں جو وجود میں آچکے ہیں۔

نوٹ:- ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ورنہ ان پر کسی قسم کی رائے قلمبند نہیں کی جائے گی ــــــــ ادارہ

سوڈان

سوڈان شمالی افریقہ کا ایک مشہور ملک ہے۔ اسکے جنوب میں افریقہ کے مغربی ساحل والے وہ بحری ملک واقع ہیں جو دریائے کونگو کی وادی میں پھیلے پڑے ہیں شمال میں صحرائے اعظم اور مصر کا کچھ علاقہ ہے۔ مغرب میں بحر اوقیانوس ہے تو مشرق میں بحیرۂ احمر۔ اس کی لمبائی تقریباً چار ہزار میل اور کل رقبہ بیس لاکھ مربع میل کے لگ بھگ ہے۔ پچھلی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی چار کروڑ ہے۔

سوڈان خاصی اونچی جگہ ہے۔ اسکا زیادہ حصہ کھلے میدانوں کی صورت میں ہے جن کو دریائے سینیگل اور دریائے نائجر سیراب کرتے ہیں۔ یہ منطقۂ حارّہ میں واقع ہے اور بلندی سطح سمندر سے صرف ڈیڑھ دو ہزار فٹ ہے اس لئے آب و ہوا گرم ہے دریاؤں کی وادیاں صحت کے اعتبار سے ناقص ہیں۔ صحرائے اعظم کے باعث شمالی افریقہ سے الگ ہو گیا ہے اس لئے وہاں کے باشندوں نے جو حبشی نسل کے ہیں، شروع ہی میں مشرقی علاقے کا تمدن اختیار کر لیا تھا۔

مغربی سوڈان میں عربوں کے اثرات اور مذہب اسلام کے عقائد نویں صدی کے شروع میں پھیلنے لگے اور گیارہویں صدی تک انہوں نے خوب جڑ پکڑ لی۔ البتہ مشرقی سوڈان میں نوبیہ کی دیسی عیسائی ریاستوں کے ہاتھوں اسلام کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ انیسویں صدی کے بالکل آخر میں اقوام یورپ کو اس ملک پر حکمرانی نصیب ہوئی۔ اسوقت بھی سوڈان بہت سی ریاستوں میں منقسم ہے جو سب کی سب یورپی طاقتوں کے ماتحت ہیں وہ ریاستیں جو دریائے نائجر کے مغرب میں ہیں، فرانسیسی نظام میں شامل ہیں، وہ ریاستیں جو دریائے نائجر اور جھیل چڈ کے درمیان ہیں، کلیتہً برطانوی تحفظ میں ہیں اور وہ ریاستیں جو جھیل چڈ اور دریائے نیل کی وادی کے درمیان ہیں، فرانسیسی استوائی افریقہ میں شامل ہیں۔ باقی علاقہ جو نیل کی بالائی وادی میں ہے، مشترکہ طور پر برطانیہ اور مصر کے ماتحت ہے۔

۱۸۹۶-۹۸ء کی برطانوی مصری مہمات نے مصری سوڈان کو دوبارہ فتح کر لیا تھا۔ اسوقت سے وہ علاقہ برطانیہ اور مصر کی مشترکہ شہنشاہیت میں ہے سچ پوچھو تو اب سوڈان صرف اسی علاقہ کا نام ہے جو برطانیہ اور مصر کی حفاظت میں ہے۔

شمالی سوڈان کو درحقیقت جنوب مشرقی صحرائے اعظم کا ایک حصہ ہی کہا جا سکتا ہے اسکا جنوبی حصہ زرخیز ہے کیونکہ اس علاقے میں پانی کی بڑی افراط ہے۔ بیشتر حصہ گھنے جنگلوں میں چھپا پڑا ہے، جنوب سے شمال کی جانب بہنے والا دریائے نیل اور اس کے تمام بڑے بڑے معادن اسی کی حدود میں واقع ہیں نیل کے جانب غرب وسیع میدان ہیں جن میں کہیں کہیں دو ہزار فٹ بلند پہاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں مشرقی ساحل جو بحیرۂ احمر کے ساتھ ساتھ ہے، تقریباً چار سو میل لمبا ہے۔ اس حصہ میں سب سے زیادہ اہمیت راس روایا کو حاصل ہے جسکا شمالی ساحل خلیج ڈو دکلانا کی جانب ہے۔ اس طرف پورٹ سوڈان اور سواکن مشہور بندرگاہیں ہیں۔

چونکہ ملک منطقۂ حارّہ میں واقع ہے اور بیشتر حصہ سمندر سے دور ہے، اس لئے آب و ہوا شدید گرم ہے۔ حرارت وسطی طبقات میں سب سے زیادہ اور صحرائی علاقے میں سب سے کم ہے۔ خرطوم کے شمال میں موسا کے ٹھنڈ کہیں کہیں صحرا میں نظر آتے ہیں۔ البتہ ان اضلاع میں جو زیادہ خشک نہیں ہیں کچھ جڑی بوٹیاں بھی دکھائی دی جاتی ہیں۔ نیلے نیل کے دونوں ساحلوں میں بابونہ کے درخت ہیں جس کی عمارتی لکڑی افریقہ بھر میں مشہور ہے اس کے علاوہ حشاب اور تالطہ کے درخت بھی بہت مشہور ہیں جن سے گوند بڑی مقدار میں حاصل ہوتا ہے۔

جنگلی جانور اور پرندے بے شمار ہیں۔ بحر الغزال اور بحر الجبل کے جنگلوں میں ہاتھیوں کی کثرت ہے۔ نیلے نیل کی وادیوں میں یہ اکا دکا نظر آتے ہیں۔ دلدلی علاقوں میں دریائی گھوڑوں اور مگرمچھوں کی افراط ہے۔ ان میں مرغابیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ شیر، چیتے، زراف اور کئی قسم کے تیندوے وسیع میدانوں اور چھدرے جنگلوں میں ملتے ہیں۔ بعض جنگلوں کے شوخ رنگ والے بے شمار پرندے اور کئی قسم کے بندر ہوتے ہیں۔ سانپوں کی بھی کثرت ہے۔ جو زیادہ تر زہریلے ہوتے ہیں۔ کوہ دوفان، دارفور اور صحرائے نوبیہ کے ڈھلوان علاقوں میں سیمرغ بے شمار ہوتا ہے۔ حشرات الارض میں سے موسمی بخار کے مچھروں اور بھونرے کے برابر بھوری مکھیوں کو جو مویشیوں پر حملہ کرتی ہیں، سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

امانت سنگھ

عام اور سام نسل کے قبیلے، جن کے افراد زیادہ تر خانہ بدوش ہیں، شمالی سوڈان میں آباد ہیں۔ ان کو عربوں کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے خرطوم کے جانب شمال دریائے نیل کی وادی میں رہنے والے نوبیہ کے باشندے مخلوط النسل ہیں۔

نوبیہ کے صحرا میں بڑے قبیلے ابابدا اور بشارن ہیں حبشی قبیلوں میں سے چار اقسام خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کے نام شلوک، ڈنکا، نوبہ اور بونگو ہیں۔ مصریوں کے برعکس سوڈانی قبیلوں کے لوگ جن میں عرب اور حبشی دونوں شامل ہیں بہت زیادہ کاہل اور مجہول ہیں۔ جہاں ضروریات زندگی مختصر اور سادی ہوں، جہاں مکانات تعمیر کرنے کی حاجت نہ ہو۔ جہاں سردی سے بچنے کے لئے کپڑا پہنانہ پڑے وہاں ظاہر ہے کہ محنت اور جانفشانی کے کام کو جی نہیں چاہتا۔ بہت سے غریب

چیتھڑے پہنے نظر آتے ہیں۔ مکان کی بجائے صرف ایک چٹائی ان کے پاس ہوتی ہے وہ صحرا کے آزاد منش لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا ریوڑ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، وہ اس بے سروسامانی کے ساتھ رہتے ہیں۔ برطانوی نظام قائم ہونے کے بعد لوگوں کو زبردستی غلام بنانا یا انکی تجارت کرنا بالکل ممنوع ہو گیا۔ عربی بولنے والے باشندوں میں اپنا تعلیم حاصل کرنے کی آرزو بیدار ہو چلی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اخلاقی ترقی آہستہ لیکن نمایاں طور پر نظر آرہی ہے۔ تجارت کے کاموں میں ڈونگولی ملک بھر میں سب سے زیادہ چالاک ہیں۔ حبشی قبیلوں میں زیادہ تر بت پرست ہیں لیکن وہ جو شمالی علاقوں میں رہتے ہیں اسلام قبول کر چکے ہیں۔

سوڈان مدیریوں (صوبوں) میں اور پھر ہر مدیریہ معموروں (ضلعوں) میں منقسم ہے۔ شمالی میں حیفہ، بحیرۂ احمر، ڈونگولا اور بربر، وسطی علاقے میں خرطوم، نیلانیل اور سفید نیل، مشرق میں کسالا اور فنڈ، مغرب میں دارفور، کوردوفان اور نوبہ اور جنوب میں بحر الغزال، بالائی نیل اور مونگلا مشہور صوبے ہیں رقبے کے لحاظ سے یہ چھوٹے بڑے ہیں۔

ملک کا صدر مقام خرطوم سفید اور نیلے نیلوں کے سنگم پر واقع ہے خرطوم کے بالمقابل سفید نیل کے مغربی کنارے پر شہر بربر، ابوحمید، میرادی، ڈونگولا اور وادیٔ حلفہ آباد ہیں۔ بحیرۂ احمر کے کنارے دو بندرگاہیں پورٹ سوڈان اور سواکن ہیں۔ دریائے گاش کے کنارے ایک شہر کسالا ہے۔ انکے علاوہ کاملن، سینار، واد میدانی بھی مشہور شہر ہیں۔

خرطوم کے شمال میں رسل و رسائل کا سب سے بڑا ذریعہ ریل ہے۔ جنوب میں دخانی کشتیاں چلتی ہیں۔ دو طرفہ ریل سوڈان کو مصر سے ملاتی ہے۔ انکی رسائی بحیرۂ احمر تک ہے۔ ریلیں حکومت کی ملکیت اور اسی کے اہتمام میں چلتی ہیں۔ دریائے نیل پر کرما اور کریما کے درمیان دخانی کشتیاں چلتی ہیں۔ اور خرطوم سے آگے جانب جنوب گوندوکرو تک حکومت نے دخانی کشتیوں کا باقاعدہ سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ بالائی نیل اور بحر الغزال میں رسل و رسائل کے سلسلے کو کھلا رکھنے کے لئے آبی خس و خاشاک چھانٹنے کی مشینیں استعمال کی جاتی ہیں۔ قافلوں کے قدیم راستوں، کوردکو، ابوحمید اور بربر۔ سواکن پر ریلیں بچھائی گئی ہیں تاہم شہروں اور دریا کے درمیان بڑے بڑے راستوں پر کنوؤں، اور آرام گاہوں کی دیکھ بھال اب بھی کی جاتی ہے۔ تلغراف کا نظام اچھی طرح پھیلا ہوا ہے۔ خشکی کے ذریعہ خرطوم کے ڈانڈے مصر اور اگنڈا سے ملے ہوئے ہیں۔ اس طرح اسکندریہ اور ممباسا کے درمیان براہ راست تار برقی کا سلسلہ قائم ہے بعض مقامات پر تلغراف کے تار ساڑھے سولہ فٹ اونچے ہیں تاکہ زرافوں سے محفوظ رہیں۔

ہرموں، مندروں، گرجاؤں اور دوسری یادگار عمارتوں کے کھنڈر دریائے نیل کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ وادئ حلفہ سے جنوب کی طرف سفر کیا جائے تو سیاح کو وہاں کے آثار نظر آتے ہیں جو بارہویں خاندان کی حکومت کے دوران میں قائم ہوا تھا۔ اٹھارویں خاندان کے بنائے ہوئے ایک عمدہ مندر کے کھنڈر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اسی سمت میں تینتالیس میل اور آگے کسما اور سمنا نامی قلعوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ تل العمارہ میں ایسے مندروں کے کھنڈر ہیں جن پر ہیروغلیفی کتبے اب تک برقرار ہیں۔ جانک کے قریب ایک طویل و عریض ناتمام بت رکھا ہے۔ دریا کے مشرقی کنارے پر کرما کے قریب ایک مصری شہر کے آثار ہیں۔ ذرا آگے بڑھکر جزیرہ آرگو خانقاہوں، گرجاؤں اور قلعوں کے کھنڈرات سے بٹا پڑا ہے۔ مردو نالی موجودہ گاؤں سے ایک دو میل پرے بہت سے اہرام اور منادر پائے جاتے ہیں۔ یہ اہرام ۵۰ سے ۹۰ فٹ تک بلند ہیں۔ ان سے قدیم حبشہ کے مذہبی صدر مقام نپاتا کا سراغ ملتا ہے۔ یہاں سے رب عموں کی پوجا شروع ہوئی تھی۔ شہر شنندی سے تیس میل جانب شمال میرو کے اہرام باقی ہیں۔ انہی میں کے ایک ہرم سے کہ کاندیس کا خزانہ برآمد ہوا جو برلن کے عجائب گھر میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

سوڈان میں اثریاتی تحقیقات سے اچھے نتائج برآمد ہوئے ہیں حال ہی میں مندروں اور آثارِ قدیمہ کے تحفظ کے لئے حکومت نے ایک کثیر رقم منظور کر دی تھی۔ خالص مصریاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو سوڈان کی ان یادگاروں سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ پرانے کتبات سے ثابت ہوتا ہے کہ بہت قدیم زمانے ہی میں مصریوں نے اس ملک میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔ ایک ہزار یا اس سے زیادہ مدت تک مصری تسلط قائم رہنے کی بہت سی قابل ذکر یادگاریں موجود ہیں۔ سرکاری وفد نے آسوان اور کوردسکو کے درمیان ابتدائی زمانہ سے نصرانی عہد تک تمام اہم دوروں کی یادگاریں کھیں حاصل شدہ نمونے قاہرہ کے عجائب گھر میں ایک الگ کمرے کے اندر رکھدئے گئے ہیں۔ یہ ذخیرہ بڑا قیمتی سمجھا جاتا ہے۔

بین سلومینی مہم کے کارناموں نے افریقی قوموں کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول کر رکھدیا۔ زیریں نوبیہ کے نصف جنوبی علاقے کے انکشافات ایک ایسی خود مختار تہذیب کا پتہ دیا ہے جو بعد مسیح کی ابتدائی چھ صدیوں میں پروان چڑھی تھی۔ وہ ایک ایسی قوم کی پیداوار تھی جو سلطنتِ روما کی سرحدوں پر آباد تھی۔ اور جس نے ان فنون کے ضمن میں یونانی روایات کو ورثے میں پایا تھا لیکن اپنی خداداد قابلیت سے کام لیکر انہیں اسطرح مخلوط کیا تھا کہ ہر فن طبعزاد معلوم ہونے لگا تھا۔ نئے انکشافات کی سب سے بڑی قدر و قیمت اس حقیقت سے واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے زمانۂ قدیم کی تاریخ سے متعلق نئے مصدقہ مواد کی بنیاد رکھدی۔

دریائے نیل کے دونوں جانب تنگ قطعات اراضی زراعت کے لئے مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ خرطوم کے شمال میں صحرائے لیبیا کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ایسے ہیں جن پر کھیتی باڑی کرلی جاتی ہے۔ نیلے دریائے نیل اور اتبارا کے درمیان مزروعہ زمین کے وسیع قطعات کو آبپاشی کے ذریعہ اتنا زرخیز کرلیا ہے کہ ان پر کپاس کی کاشت ہوتی ہے۔ اسی کی پیداوار پر ملک کی خوشحالی کا انحصار ہے۔ اناج کی سب سے بڑی فصل ذرا ہے جو سوڈانیوں کی بنیادی خوراک کا کام دیتی ہے۔ کئی اضلاع میں ہر سال دو فصلیں تیار ہوتی ہیں۔ دریاؤں سے ملحقہ زمینوں پر ذرا سیلاب ختم ہونے کے بعد اور موسم برسات کے شروع میں بویا جاتا ہے۔ گیہوں اور جو بھی بڑی مقدار میں بوئے جاتے ہیں۔ دوسری اشیائے خوراک میں سورج، سیم، پیاز اور خربوزے شامل ہیں۔ خرطوم سے نیچے ہٹ کر وادیٔ نیل کے ساتھ، خصوصاً ڈونگولا مدیریہ کے مغربی کنارے پر اور اس کے آس پاس کے شاداب حصوں میں کھجور کی کاشت کی جاتی ہے۔ کھجور بھی دارفور اور کوردوفان میں خاص پیداوار کی حیثیت رکھتی ہے۔ تیل کی خاطر تل اور مونگ پھلیاں بھی بڑی مقدار میں بوئی جاتی ہیں۔ سوڈان مصری کپاس کا ابتدائی گھر تھا اور جو روئی اب اگتی ہے وہ دہانے کے قریب کی پیداوار کے برابر ہوتی ہے۔

ساحلوں کے پاس کی زمین پر ساقیاؤں (رہٹوں) کے ذریعہ آبپاشی ہوتی ہے انھیں بیلوں کی جوڑی چلاتی ہے۔ غزیرہ میں آب پاشی کے لئے نہروں کا ایک خاکہ ۱۹۲۵ء میں مکمل ہوا تھا۔

خاص جنگلی پیداواروں میں گوند اور ربڑ قابل ذکر ہیں۔ گوند مشرقی کوردوفان اور بالائی نیلے نیل کے جنگلوں میں پیدا ہوتا ہے۔

سونا بنی شانگل میں ملتا ہے جو سینار کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ڈونگولا کے علاقوں سے ٹلنائٹ اور دارفور اور جنوبی کوردوفان سے کچا لوہا برآمد ہوتا ہے۔

برآمدی اشیا میں روئی باقی تمام چیزوں کی مجموعی مقدار سے بھی زیادہ بھیجی جاتی ہے۔ اس کے بعد گوند، بنولے، تل، کھال اور چمڑے کے نمبر آتے ہیں۔ مویشی، کھجور، ہاتھی دانت اور سونا بھی باہر بھیجا جاتا ہے۔ بحیرۂ احمر کی بندرگاہیں زیادہ تر ممالک عرب سے تجارت کرتی ہیں۔ ان بندرگاہوں پر سیپیاں نکالنے کا کاروبار بھی قائم ہے۔ درآمدی اشیاء میں سوتی پارچہ جات، اشیائے خوراک (آٹا، چینی، چائے اور قہوہ) عمارتی لکڑی، تمباکو، کوئلہ، ریل کا سامان، لوہے اور مشینوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جو مال سوڈان سے بھیجا گیا اس کی قیمت پچاس لاکھ پونڈ تھی۔ اسمیں سے نصف حصہ کچی روئی کا تھا۔ اسی سال اکسٹھ لاکھ پچپن ہزار پونڈ کا مال درآمد ہوا۔ برآمدی اشیاء کا بیشتر حصہ برطانیہ جاتا ہے اور درآمدی میں اس کے بھیجے ہوئے مال کی مقدار تہائی سے زیادہ ہوتی ہے۔

تربیت عامہ کا محکمہ تعلیم کا ذمہ دار ہے۔ ابتدائی تعلیم جو عربی زبان میں ہوتی ہے دیہاتی مدرسوں میں دی جاتی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں ایسے ابتدائی مدرسے بھی ہیں جن میں انگریزی، عربی اور ریاضی کا انتظام ہے۔ سرکار کی طرف سے کچھ صنعتی کارخانے ہیں اور کچھ زنانہ مدارس بھی۔ خرطوم کے گورڈن کالج میں بہت سے حرفوں کی مناسب تعلیم دیجاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ استادوں اور اسلامی عدالتوں کے منصفوں کی تربیت کا بھی انتظام ہے۔ اس کالج میں سائنسی تحقیقات کے لئے عمدہ ساز و سامان سے لیس تجربہ گاہیں بھی ہیں۔

سوڈان میں برطانوی حکومت کو قائم ہوئے چالیس سال ہو گئے ہیں اس دوران میں وہاں کے طبی ادارے نے ترقی کرکے اعلیٰ حیثیت حاصل کرلی ہے۔ خرطوم کا کچنر اسکول اوف میڈیسنز سب سے اہم ادارہ ہے جہاں ڈاکٹروں، طبی نائبوں حفظان صحت کے انسپکٹروں، نرسوں اور دائیوں وغیرہ کی تربیت ہوتی ہے۔ اس میں سوڈانی بڑی ذمہ داری کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔

حفظان صحت کے امور عامہ کے علاوہ سوڈان کا طبی محکمہ اور بھی خدمات انجام دیتا ہے۔ مثلاً ایسے وبائی امراض کے سلسلے میں تحقیق، تفتیش جو گرم ملکوں میں عام ہوتے ہیں، حفظان صحت کا خیال اور کیڑوں سے بچنے کی تدابیر، دیہاتی علاقوں میں طبی خدمات، نیز ٹیکوں کے لئے ویکسینوں اور سیرموں کی تیاری۔ اس محکمے نے ادویات کی فراہمی کے علاوہ ایسا طبی عملہ بھی تیار کیا جس نے محاذ جنگ پر بڑے کارہائے نمایاں پیش کئے۔

سوڈان کو نئے سرے سے فتح کرنیکا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ تھا کہ بالائی حصۂ نیل پر اثر و اقتدار حاصل کرنے کی سخت ضرورت تھی کیونکہ مصر کی تمامتر خوشحالی نیل کے آبی ذخیروں پر منحصر ہے۔ سوڈان کو جب برطانیہ اور مصر کی فوجی اور مالی مشترکہ کوششوں سے دوبارہ فتح کرلیا گیا تو حکومت برطانیہ نے مطالبہ کیا کہ اس ملک کے انتظامی اور قانون اختیارات میں اسے "حق فتح" ملنا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں برطانیہ اور مصر کے مابین ایک معاہدہ عمل میں آیا جسکی رو سے دونوں حکومتوں کو سارے ملک سوڈان پر مشترک شہنشاہیت کا حق حاصل ہوگیا۔ ملک کی تنظیم نو اس طرح پر شروع ہوئی کہ سوڈان کا گورنر جنرل حکومت برطانیہ کی سفارش پر رکھا جانے لگا۔ چنانچہ اسکا پہلا گورنر جنرل لارڈ کچنر ہوا۔ نئی حکومت کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ عوام میں امن و عافیت کی فضا قائم کرے ۱۹۰۳-۰۴ء میں سوڈان اور حبش کے درمیان نئے سرے سے حد بندی ہوئی اور اس طرح اس شورش پسند علاقے میں کچھ صلح و آشتی کا رنگ جم سکا۔ نتیجہ یہ کہ آبادی بڑھنے لگی۔ اس صورت حالات کو دیکھتے ہوئے حکومت سوڈان نے اپنی توجہ زراعت و تجارت کی تجدید کی طرف مبذول کی، باشندگان ملک کی تعلیم کی داغ بیل رکھی اور مناسب عدالتی نظام قائم کردیا۔ جہاں تک ممکن ہوسکا اس سلسلے میں سوڈان کا ملکی قانون اور وہاں کے رسم و رواج کو مدنظر رکھا گیا۔ یہ کوشش نہیں ہوئی کہ سوڈانیوں کو مصری یا انگریزی رنگ میں رنگ دیا جائے۔

عربی بولنے والے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انکی مذہبی اور لسانی روایات کا احترام ہو رہا ہے، اس لیے انہوں نے نئے نظام سے خاطرخواہ فائدہ اٹھانا چاہا۔ بت پرست علاقوں میں حکومت سوڈان نے تبلیغی جماعتوں کی ہمت افزائی کی۔

۱۹۲۵ء میں سر جیفری آرچر ملک کا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ اس نے مرکزی نظام قائم کرنے کے اصول کو پوری تقویت دی۔ اس نے بہتیرا نظم ونسق مقامی حکام کے سپرد کر دیا۔ ۱۹۲۶ء میں سینار بند کی تعمیر نے گزیرہ کے بہت بڑے حصے میں آبپاشی کی صورت پیدا کر دی۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء سوڈان کے لیے بالکل خشک سال تھے لیکن آبپاشی کی بدولت مادی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ حکومت نے وزن چنے کا مرکزی ذخیرہ قائم کرکے قیمت پر کنٹرول کر دیا۔

مارچ ۱۹۲۵ء میں برطانیہ اور مصر کے مابین ایک نیا معاہدہ ہونا تھا۔ جسے مصری کابینہ نے مسترد کر دیا۔ اس پر حکومت برطانیہ نے مصر کو یاد دلایا کہ ۱۸۹۹ء کے معاہدہ کی رو سے برطانیہ سوڈان پر اپنا نظام قائم رکھیگا۔ تاہم ۱۹۲۹ء میں جہاں تک نیل سے آبپاشی کی اسکیم کا تعلق تھا، دونوں جماعتوں کے مابین پورے اطمینان کے ساتھ معاہدہ عمل میں آگیا۔ اس معاہدے کی رو سے مصری حکام کو فوراً اجازت مل گئی کہ وہ سفید نیل پر جبل اولیا کے قریب ایک بند تعمیر کر لیں۔ یہ جگہ خرطوم سے تیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

اسوقت ان مسائل میں سے جو حل طلب ہیں، سب سے زیادہ مشکل مسئلہ سوڈان کے مستقبل سے متعلق ہے۔ سوڈان کا موجودہ مسئلہ پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی جذبات کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ مصر کی آرزو جس کا اظہار وفد نے اپنے بیانات میں کیا ہے لیکن جو تمام جماعتوں کے دل کی پکار ہے، صرف یہ ہے کہ وادئ نیل میں پوری طرح اتحاد ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ سوڈان میں جو برطانوی مصری نظام قائم ہے، اسے ختم کرکے خالص مصری (یا بالفاظ دیگر مصری سوڈانی) نظام قائم کر لیا جائے۔

یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سوڈانیوں نے برطانوی مدد سے اتنی زیادہ ترقی کرلی ہے کہ وہ صرف مصری اعانت سے ممکن نہیں تھا۔ لیکن مصری اسے تسلیم نہیں کرتے۔ قابل اطمینان سیاسی مفاہمت کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ ہے پانی کی افراط۔ اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نیل میں پانی کی روانی ہمیشہ بڑھتی رہے تو ظاہر ہے کہ قلتِ آب کا اندیشہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح جو اندیشے لگے رہتے ہیں ہمیشہ کے لیے مٹ سکتے ہیں۔ فراہمی کو دو طریقوں سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ جھیل ٹینگ کے دہانے کے پاس نیلے نیل سے آگے بڑھکر ایک اور بند تعمیر کیا جائے۔ اس صورت میں حکومت حبش سے بھی معاہدہ کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سفید نیل سے براہ راست ایک نہر کاٹی جائے جو وسیع دلدلی علاقوں یا بحر الغزال میں سے ہو کر نکلے۔ یہ دونوں صورتیں بہت مہنگی ہیں۔ خصوصاً بحر الغزال کے علاقے میں نہر نکالنا دشوار بھی ہے۔

لہذا ملک کے لیے سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ برطانوی مصری نظام کو کم سے کم ایک نسل تک کیلئے بدستور قائم رہنے دیا جائے۔ اس ضمن میں مصر کو وہ اختیارات ضرور دیدیے جائیں جو ۱۹۲۴ء میں اس سے لیے گئے تھے۔ نیز سوڈانیوں میں خود اختیاری حکومت کو ترقی دیا جائے جسکی عملی تشکیل تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ رونما ہو چلی ہے۔ اس اثناء میں آبپاشی کے دشوار مسئلے کو بھی حل کر لیا جائے جس پر ملک کی خوشحالی منحصر ہے۔

آنسو ——— اشعر ملیح آبادی

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
سبزۂ نرم پہ پھیلی ہوئی شبنم تو نہیں؟
چاند تاروں کا حسیں جلوۂ برہم تو نہیں؟
حسن کے نور سے بکھرا ہوا عالم تو نہیں؟

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
گنبدِ عرش سے ٹوٹے ہوئے تارے تو نہیں؟
کسی مغموم کے آزردہ سہارے تو نہیں؟
سنگِ مرمر کے تراشے ہوئے پارے تو نہیں؟

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
طاقِ مفلس میں یہ مغموم دیے ہیں روشن؟
یا دہکتے ہوئے پُرسوگ شراروں کا چمن؟
تیز ہوتی ہی چلی جاتی ہے دل کی دھڑکن

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
چشمِ بے رنگ ہی کیوں آج چمک سے محروم؟
نور سے دھوئے ہوئے گال دمک سے محروم؟
کیوں یہ ٹوٹے ہوئے تارے ہیں فلک سے محروم؟

تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!
مانتا ہوں کہ مرے "فرض" کا ہے تجھکو خیال
روکتا ہے مجھے لیکن ترے اشکوں کا یہ جال
پونچھ بھی ڈال انھیں ہنس کے مری روحِ جمال
تیری پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو اے دوست!

نقد و نظر

شیطان

مترجم :- حکیم حبیب احمد خاں صاحب اشعر دہلوی - ملنے کا پتہ :- رائل ایجوکیشنل بک ڈپو - اردو بازار دہلی - $\frac{20\times30}{16}$ کے ۱۲۴ صفحات - مجلد - قیمت ڈیڑھ روپیہ - یہ جبران خلیل جبران کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے جنکا ترجمہ اشعر صاحب نے براہ راست عربی سے کیا ہے - ان افسانوں میں بھی مصنف کی رنگین بیانی پورے کمالات کے ساتھ اپنا نقش جماتی نظر آتی ہے - ہر افسانہ کی حلاوت اور جادو اثری پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے اور ہر جملہ قلب و روح کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے جی چاہتا ہے کہ فقرہ مکرر کا مزا لینے کیلئے اس کا مطالعہ بار بار اور مسلسل کیا جائے - تیسرا افسانہ "شیطان" جس کی نسبت سے کتاب کا نام رکھا گیا ہے، اس مجموعے میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے - اس میں طنز کی تلخی اتنی شدید ہے کہ شاید جبران کے کسی دوسرے افسانے میں نہ مل سکے. افسانہ ختم کرنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ زیادہ شیطنت اس شیطان میں ہے جسے راندۂ درگاہ کیا گیا ہے یا اس انسان میں جسے اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے . ترجمہ کی خوبیوں پر اظہار خیال کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اشعر صاحب کو اس سلسلے میں پورا کمال حاصل ہے اور اسپر ہم اپنی رائے پہلے بھی پیش کر چکے ہیں موصوف نے جناب قیسی رامپوری کی انسانیت سے متاثر ہوکر "شیطان" کو ان کے نام سے منسوب کیا ہے . یہ نسبت خاص توجہ کی مستحق ہے ہر چہ از دوست می رسد نیکو ست

شیطان

مصنف :- حضرت قیسی رامپوری - ملنے کا پتہ :- نگارستان ایجنسی اردو بازار - دہلی - $\frac{20\times30}{16}$ کے ۲۳۶ صفحات - مجلد - قیمت تین روپے - یہ دوسرا "شیطان" ہے لیکن استعارے کے انداز میں - ایک ایسا شخص ہے جو اپنی فطری خباثتوں کے باعث شیطان کہلائے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے . وہ اس ناول کا ہیرو نہیں ہے لیکن اسکے افعال کی ہمہ گیری اسکی اہمیت کا باعث بن سکتی ہے قیسی صاحب کے دوسرے ناولوں کی طرح اس کا تعلق بھی ہماری سماجی زندگی اور اس کی کمزوریوں سے ہے - اس میں بھی جا بجا طنز و ظرافت کی تلخیاں اور لطافتیں ملی جلی نظر آتی ہیں - چونکہ ہیرو ایک کامیاب مصور ہے، اسلئے انداز بیان میں رنگینی قدرتی طور پر جھلک دکھانے لگی ہے مگر کہیں کہیں عبارت کی بے ربطی یا پلاٹ کی الجھن ایسا نقص پیدا کر دیتی ہے جو طبیعت پر گراں گذرنے لگتا ہے . مثلاً یہ جملہ "رات کو دیر تک شبنم گیلی جھاڑی اور خنکی میں بیٹھنے سے باوجود مضبوط جسم کی مالک ہونے کے نادیہ کی صبح طبیعت خراب ہو گئی" بندش کے اعتبار سے بہت ہی ناقص ہے . یا دو مختلف کرداروں کا ایک ہی نام (رضیہ) رکھ دینا جبکہ اس یکسانیت سے پلاٹ میں کوئی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی، بالکل بے معنی کہا جا سکتا ہے - غالباً ادبی خدمت کے تحت قیسی صاحب کا ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا جوش جس کے زیر اثر وہ ہر مہینے ایک ناول لکھ ڈالتے ہیں، ان خرابیوں کا ذمہ دار ہے - لیکن اس کے باوجود ناول نہایت دلچسپ اور مفید ہے - عین مناسب ہوتا اگر قیسی صاحب اپنے اس "شیطان" کو اشعر صاحب کے نام منسوب کر دیتے . شاید وہ ابھی تک ان کی انسانیت کے اسیر نہیں ہوئے ہیں -

آیاتِ وجدانی (جدید)

مصنف :- امام الغزل حضرت میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی - ملنے کا پتہ :- میرزا حیدر بیگ چنگیزی سلطان بہادر روڈ لکھنؤ $\frac{20\times30}{16}$ کے ۴۰۰ صفحات - مجلد قیمت پانچ روپے - غالب کی طرح میرزا صاحب کے بھی دو تخلص ہیں، یاس اور یگانہ - لیکن جس طرح غالب کا پہلا تخلص زبان زد خلائق نہیں ہے اسی طرح یاس کو جاننے والے کم اور یگانہ کے واقف بے شمار ہیں لیکن خیر تخلص سے کیا غرض - اصل چیز کلام ہے - میرزا صاحب نے اپنی جادو بیانیوں سے دوست اور دشمن سب پر اثر جما رکھا ہے - ہر شخص انکے محاسن کلام کا قائل ہے - وہ غزل اور رباعی دونوں اصناف سخن پر پوری طرح حاوی ہیں - جدتِ خیال اور ندرتِ بیان ان کے ہر شعر میں موجود ہے - وہ ہر لمحے زندگی کے حقائق بیان کرتے اور نفسیاتی اعتبار سے اس کے ہر پہلو کا تجزیہ پیش کرتے نظر آتے ہیں - انکے ہاں یاس اور افسردگی کی بجائے جوش اور امنگ کی فراوانی ملتی ہے لیکن جب غالب، جوش یا کسی اور شاعر کی مذمت میں قلم اٹھاتے ہیں تو لب و لہجے کا انداز معیار سنجیدگی سے گر جاتا ہے - چنانچہ پیش نظر کتاب کا آخری حصہ اسی رنگ کا حامل ہے - ابتدائی صفحات کے مطالعہ سے میرزا صاحب کے محاسن کلام کو اچھی طرح سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے - اس حصہ کو کلام یگانہ کی شرح کہنا چاہیئے جس میں عمیق ترین خیالات کی وضاحت نہایت سادہ لفظوں میں کی گئی ہے . اپنی فلسفیانہ موشگافیوں کے باعث یہ کتاب مقبول ہوئی اور اس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا -

رباب ہفتہ وار کا نیا سالنمبر

مدیران :- محمد عثمان صاحب (علیگ) اور حسینی شاہد صاحب بی اے (عثمانیہ) ملنے کا پتہ :- دفتر رباب ہفتہ وار، چارکمان، حیدر آباد - سالانہ چندہ دس روپے قیمت سالنامہ عہ "رباب" کے عام ہفتہ وار شمارے بھی اس شان کے نکلتے ہیں کہ ان کو ماہانہ رسائل کی صف میں رکھا جاتا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ خاص نمبر کن خوبیوں کا حامل ہوگا - اس میں اردو کے بہترین ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ چند نئے لکھنے والے بھی نظر آتے ہیں - ادبی مضامین میں مخدوم محی الدین، سبط حسن، حسینی شاہد اور عطا محمد کے رشحاتِ قلم توجہ کے مستحق ہیں - عطا محمد صاحب نے "نئے زاویے" پر اچھی تنقید لکھی ہے . اشفاق حسین صاحب نے "اردو شاعری کے مرقع" فیچر کے انداز میں دکھائے ہیں "تیس روپے" اور "کافی ہاؤس میں" اچھے افسانے ہیں - منظومات میں جوش ملیح آبادی، جاں نثار اختر، ساغر نظامی، مسلم ضیائی، سلام مچھلی شہری، مجاز لکھنوی اور کیفی اعظمی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں - فضل الرحمن صاحب نے اردو فلموں پر گہری نظر ڈالی ہے - یہ سالنامہ ہر لحاظ سے معیاری اور قابلِ مطالعہ ہے -

ف - ح

الطاف کے نغمے

مصنف جناب الطاف مشہدی - ملنے کا پتہ :- منیجر دار البلاغ، محمد نگر، بیبو روڈ - لاہور - $\frac{20\times30}{16}$ کے ۱۳۴ صفحات - مجلد - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - اردو شاعری میں

ہیئت کے تجربے کرنے والوں میں الطاف صاحب کا نام بھی قابل ذکر ہے اور اس لحاظ سے زیادہ بلند ہے کہ انہوں نے بحر و عروض اور ردیف وقافیہ کی پابندیوں کے ساتھ اپنے تجربات کی نئی بنیادیں رکھیں۔ انہوں نے طرح توڑ ڈالی لیکن روایتی حدود میں رہ کر۔ غلط طریقے سے مغربی تقلید نہیں کی چنانچہ ان کی غزلیں، نظمیں، گیت، دوگانے اور ماہئے اس حقیقت کے ترجمان ہیں اور ان سب کے نمونے اس کتاب میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ ان کے گیتوں ہی میں ترنم نہیں ہے بلکہ ان کی غزلیں حتیٰ کہ نظمیں بھی گائی اور ساز کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہیں۔ رفعتِ خیال کے لحاظ سے بھی بعض اشعار اتنے وزنی ہیں کہ ان کو اس زمانے کے مشہور ترین شعراء کے کلام کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو ؎

مقام پرستش اک آئیگا ایسا — جبیں کو ترس جائینگے آستانے
مرے ڈوبنے کا سبب بس یہی ہے — سہارا دیا تھا مجھے ناخدا نے

روزگار کا شادی نمبر ماہنامہ "روزگار" رامپور نے ہز ہائنس نواب رامپور کے صاحبزادے کرنل محمد مرتضےٰ خاں بہادر کی تقریب شادی کے سلسلے میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔ یہ ۱۴۶ صفحات کا بیشتر حصہ اسی موضوع کے مضامین نثر و نظم پر حاوی ہے۔ اگر غیر متعلقہ مضامین اور افسانے وغیرہ شامل نہ ہوتے تو اسے "شادی نمبر" کہنا زیادہ صحیح ہوتا۔ بصورتِ موجودہ یہ نام محض "تبرکاً" کہا جا سکتا ہے۔ ایک روپے میں دفتر روزگار، رامپور سے طلب کیجئے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ تخمیس حسرت بر غزل حافظ ..... رئیس المتغزلین حضرت حسرت موہانی
۲۔ یارم کی یاد میں (مع تصویر) ..... پروفیسر رشید احمد صدیقی
۳۔ آواز (ہندوستانی افسانہ) ..... نواب جعفر علیخاں اثر لکھنوی ....
۴۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء ..... جناب فکر ندوی
۵۔ اردو اور سائنس (۲) ..... ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
۶۔ کچھ غزل کے بارے میں (۱) ..... حضرت مخمور اکبر آبادی
۷۔ کرگسوں کا سماج (افسانہ) ..... جناب اصغر علی
۸۔ یورپ نے اسلامی تمدن سے کیا استفادہ کیا؟ ..... ڈاکٹر حفیظ سید
۹۔ امجد حیدر آبادی کی نثر نگاری ..... جناب نصیر الدین ہاشمی
۱۰۔ آپ کیا چاہتے ہیں ..... محترمہ بلدیپ کور
۱۱۔ چین میں شادی کی رسمیں ..... فضل حق قریشی دہلوی
۱۲۔ کیمبرج یونیورسٹی کا دار التجسس ..... جناب مادھورام
۱۳۔ ترکی ادب کے بنیادی عناصر ..... جناب ایس کے چودھری

نیویورک کے شہر میں مشرقی
دریا کے اوپر یہ منہاٹن
نامی شاندار پل ۱۹۰۹ء
میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ
پل جزیرۂ منہاٹن کو
بروکلین نامی قصبے سے
ملاتا ہے۔ دریا کے دونوں
کناروں پر دنیا کے ہر
حصے کے دخانی جہاز آکر
لنگر انداز ہوتے ہیں۔
کچھ فاصلے پر ۱۲۵۰
فٹ اونچی ایمپائر اسٹیٹ
بلڈنگ نظر آرہی ہے۔

نیو یورک کی شاہراہیں

رات کے وقت نیویور
شہر کی ویسٹ سا
اکسپریس نامی شاہر
جسکا چوراہا دیکھن
میں لونگ کے پتے
مشابہہ ہے۔ شہر می
سیکڑوں میل لمبی ای
بہت سی شاہراہیں
ہیں، جنکا انتظام ب
حد قابل تعریف ہ
پس منظر میں دریا
ہڈسن اور نیوجر
کے کنارے کی روشنی
نظر آرہی ہیں۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	-	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں - ایک سو اسی صفحات - دو نقشے - کپڑے کی جلد - قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) -

« میزان نیوز لیٹر » (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) -

خاص رعایت « عربی - انگریزی جملے » نوے صفحات - گتے کی جلد - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ - کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ -

« فارسی انگریزی جملے » کپڑے کی جلد - قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) -

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ - پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ - دھلی .

آج کل

"Dahr" Nasri

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
نیپال
ہندوستان
برما
عربستان

سید سجاد حیدر یلدرم

اس شمارہ کے صفحہ ٦ پر سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون یلدرم کی یاد میں ملاحظہ فرمائیے۔

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے	سال ۵ - نمبر ۱۴	فہرست	۱۵ دسمبر ۱۹۴۶ء	قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

نائب مدیران
فضل حق قریشی
دہلوی

بھگت سروپ گھلر
ایم۔ اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

لاہور کی بادشاہی مسجد

لاہور میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تعمیر کی ہوئی بادشاہی مسجد امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں بوسیدہ اور بے رونق ہو چلی تھی کہ لوگوں کی توجہ اسطرف مبذول ہوئی اور وہ اس کی تجدید و مکرر تعمیر کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ مغل شہنشاہ کو اسکی تعمیر پر چھ لاکھ روپے خرچ کرنے پڑے تھے لیکن تب زمانے کا رنگ اور تھا اور ہر چیز سستی ملتی تھی۔ اب اس کی محض مرمت اور زیبائش پر بیس لاکھ خرچ ہو چکے ہیں اور دس لاکھ خرچ ہونے باقی ہیں۔ اس سلسلے میں پنجاب کے کسی بھی طبقے نے چندہ دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ سب سے زیادہ فیاضی مسلمان کاشتکاروں نے دکھائی۔ انھوں نے ایک انجمن بناکر ہر شخص کی سالانہ آمدنی پر ایک اوسط رقم مقرر کی اور دل کھول کر اس کارِ خیر میں حصہ لیا۔ اس انفرادی امداد کے علاوہ مرکزی حکومت، حکومتِ پنجاب اور حکومتِ نظام نے بھی مالی مدد کے علاوہ ماہرین فن کے مشوروں سے مستفیض فرمایا۔ تینوں حکومت کے چیف انجنیئر یکجا جمع ہوکر اس کے بناؤ سنگھار پر غور کرتے رہے۔ بنیادی اعتبار سے کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی بلکہ اس امر کا خیال رکھا کہ اورنگ زیبؒ کے زمانے میں جو مسالۂ تعمیر استعمال ہوا تھا، حتی الامکان وہی فراہم کیا جائے۔ چنانچہ دھولپور سے سنگِ سرخ، مکرانہ سے سنگ مرمر اور شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقے سے ابرقی پتھر کی سلیں منگائی گئیں۔ ۵۳۰ فٹ مربع وسیع صحن کی اینٹیں گھس گھسا کر ختم ہو چلی تھیں۔ انکی جگہ سلیں بچھادی گئیں جس سے مسجد کی ظاہری رونق کو چار چاند لگ گئے۔ اورنگ زیبؒ کے انجنیروں نے کنکریلے چونے کو لیپ کر چنائی کا گارا تیار کیا تھا۔ اب سیمنٹ نے اسکی جگہ لے لی۔ اسی طرح پتھروں کے جوڑ ملانے کے لئے لوہے کی بجائے تانبے کی پتیاں استعمال کی ہیں۔ اسطرح زیبائش کے ساتھ ساتھ اس کی استقامت بھی بڑھ گئی ہے۔ وسیع صحن کے چاروں کونوں پر پہریدار سپاہیوں کی طرح کھڑی ہوئی میناریں بھی کچھ تھکن ظاہر کر رہی تھیں۔ خصوصاً شمال مغربی اور جنوب مشرقی گوشے کی دو میناریں بہت ہی زدہ حالت میں تھیں۔ ان سب کو نئی زندگی بخشی گئی ہے۔ یہ میناریں جنکا بیرونی محیط ۶۷ فٹ اور بلندی ۱۴۳ فٹ ہے، ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے بگلے کی طرح زمانے کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ چکی ہیں۔ ان کے تھوڑے تھوڑے حصے مسمار کر کے نئے سرے سے بنائے گئے اور برجیاں بھی دوسری ہی چڑھائیں کیونکہ زلزلے سے ان کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ شاندار صدر دروازے اور اس کے باہر کی مدور سیڑھیوں کی مرمت ہونی باقی ہے۔ اس لئے فی الحال اس میں اور باقی مسجدوں میں وہی تضادِ حسن موجود ہے جو مور کے خوبصورت پروں اور اس کے پیروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ کوٹھریاں بھی جن میں کبھی مسجد کے طالب علم رہتے تھے آجکل زیرِ مرمت ہیں۔

سر مانک جی دادابھائی

مسلسل چودہ سال تک کونسل آف اسٹیٹ کے صدر رہنے کے بعد ۳۰ نومبر کو سر مانک جی دادابھائی اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو گئے۔ ایسا بڑا اعزاز اور اتنی طویل مدت کے لئے ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوا کرتا ہے۔ وہ گذشتہ اڑتیس سال تک ہندوستان کی مجلس قانون ساز کے رکن رہے ہیں۔ ان کے ہمعصروں میں سے مسٹر سرینواس شاستری، سر پی۔ ایس۔ سواجی آئر، مسٹر جی کے گوکھلے، سر سریندرناتھ بنرجی، اور پنڈت مدن موہن مالویہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ کونسل کو خیرباد کہتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ گذشتہ چند سال دونوں ایوانوں کے طریقۂ کار اور عملی پہلوؤں میں یکجہتی اور یگانگت مفقود رہی ہے۔ تاہم اب یقین ہے کہ نئی حکومت کے ماتحت یہ فضا سازگار ہو جائے اور باہمی اعتماد و تعاون پر کام چلنے لگے بشرطیکہ اقلیت کے مسئلے کو جسے ہندوستانی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہے، کسی بہتر طریقے سے سلجھا لیا جائے۔ اگر ایسا ممکن ہو سکے تو ہمیں شک نہیں کہ مرکزی حکومت کو ان سے بے دریغ مدد مل سکتی ہے۔ ان کی یہ بھی رائے ہے کہ موجودہ صورتِ حالات کے ماتحت زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہندوستان سلطنتِ برطانیہ میں شامل رہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان کو اسٹرلنگ بیلنس حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ صنعت کو فروغ دینے کے علاوہ اناج کی کمیابی کا مداوا بھی صرف اسی طرح ممکن ہے۔ ہندوستان کو ترقی کی مہنگی اسکیموں کو ترک کر کفایت شعاری سے بھی کام لینا ہوگا۔

سائنس کانگریس کا اجلاس

انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کا چونتیسواں سالانہ اجلاس ۲ سے ۸ جنوری ۱۹۴۷ء تک دہلی یونیورسٹی کی عمارات میں منعقد ہوگا جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو فرمائیں گے۔ رسم افتتاح ہز ایکسیلینسی وائسرائے ہند کے ہاتھوں ادا ہوگی۔ یہ اجلاس غیر معمولی طور پر نہایت شاندار رہے گا کیونکہ ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ نے تعمیر قومی کے پیش نظر ایک خاص اجتماع کا انتظام کیا ہے جس میں بڑے بڑے سائنسداں اور ماہرین علم حصہ لیں گے۔ برطانیہ، امریکہ، روس، فرانس، بلجیم، چین، مصر، ڈنمارک، سوئسٹان اور دوسرے ملکوں کے مشہور اور نامور سائنسدانوں کو دعوت نامے بھیجے جا چکے ہیں معلوم ہوا ہے کہ سر ہنری ڈیل، سر رابرٹ رابنسن، پروفیسر ٹزارڈ، ڈارون، بلیکٹ اور گرے نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ پروفیسر ہکسلے کے آنے کی امید ہے نیشنل اکیڈمی اوف سائنسز واشنگٹن، رائل سوسائٹی اوف لندن اور رائل سوسائٹی اوف کینیڈا کے صدروں نے اپنے اپنے نمائندے بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ حکومت ہند کے شعبۂ تعلیمات نے ایسوسی ایشن کو پچھتر ہزار روپے کی رقم عطا کی ہے۔ امید ہے کہ غیر ملکی نمائندے سارے ملک کا دورہ کرینگے اور مختلف مقامات پر اپنے خیالات کا اظہار بھی فرمائیں گے۔

ایٹم بم اور مدافعت

پروفیسر البرٹ آئن سٹائن اور ان کے رفیق کار سائنسدانوں کی ایک جماعت نے عوام سے دس لاکھ ڈالر چندہ کا اپیل کیا ہے۔ یہ کثیر رقم، اگر جمع ہو گئی تو ملک کے نوجوانوں کو ایٹمی قوت کی سماجی پیچیدگیاں سمجھانے اور اگر ضرورت ہوئی تو تہذیب و تمدن کو تباہی سے روکنے کے سلسلے میں صرف کی جائیگی۔ موصوف نے بتایا کہ مندرجہ ذیل حقائق کو سب سائنسداں تسلیم کرتے ہیں:—

(۱) اب ایٹم بم کم قیمت پر اور زیادہ تعداد میں تیار کئے جا سکتے ہیں وہ زیادہ تباہ کن بھی ثابت ہو سکیں گے۔

(۲) ایٹم بم سے بچنے کے لئے کوئی فوجی قوت موجود نہیں ہے اور نہ اسکی توقع کی جا سکتی ہے۔

(۳) دوسری قومیں ذاتی کوششوں سے ہمارے خفیہ طریقوں کو نئے سرے سے تحقیق کر سکتی ہیں۔

(۴) ایٹمی طریقۂ جنگ کے برعکس کسی قسم کی تیاری کرنا محض حماقت ہے اور اگر ایسی کوشش ہوئی تو ہمارے سماجی نظام کا شیرازہ بکھرے بغیر نہ رہ سکیگا۔

(۵) اگر لڑائی چھڑ گئی تو ایٹم بم لازمی طور پر استعمال ہونگے اور اس میں شک نہیں کہ وہ ہمارے تمدن کو تباہ کر دینگے۔

(۶) ان مشکلات کا حل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایٹمی قوت کے استعمال پر بین الاقوامی پہرا احتساب لگائی جائے اور اس طرح جنگ کے امکانات کا یکسر قلع قمع ہو۔

جرمنوں کو وسیع تر اختیارات

جرمنی کے برطانوی علاقے میں جو فوجی حکومت قائم ہے، اس نے فیصلہ کیا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۴۷ء سے تین صوبوں میں باشندگان ملک کو مقامی طور پر خود مختار حکومت کے اختیارات دیدئے جائیں۔ خصوصاً تقسیم خوراک کے سلسلے میں بیشتر ذمہ داری خود انہی پر عائد کر دی جائے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا ہے کہ خوراک اور نیز دوسرے شعبوں کی صوبجاتی وزارت جرمنوں کو تفویض کر دی جائے اور برطانوی فوجی حکومت کے افسران محض مشیران خاص کی حیثیت سے کام کریں۔ ہمبرگ سے اطلاع ملی ہے کہ پانچ سو ٹن اناج سے بھرا ہوا جہاز روس سے جرمنی کی بندرگاہ روٹردام پہنچ گیا ہے اور امید کیجاتی ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کنٹرول کمیشن کا اعلان ہے کہ صوبہ روہر کے لئے جہاں اسوقت سب سے زیادہ قحط پڑ رہا ہے، فوری تقسیم کے واسطے امریکہ نے ایک ہزار ٹن گیہوں بھیجدیا ہے۔ علاقہ رائن کی برطانوی فوج کے پاس بیس ہزار ٹن بسکٹ فالتو تھے، وہ بھی اہل جرمنی کو دیدئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ بیس ہزار جرمنوں کو ملازمت دیکر انہیں فکر معاش سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ دوپہر کا کھانا انہیں سرکاری طور پر دیا جاتا ہے۔ برطانوی سپاہی اپنے راشن میں کمی کر کے کرسمس کے تحفے جرمن بچوں کو بھیج رہے ہیں۔

انڈونیشیا کا مستقبل

بٹاویا سے اعلان ہوا ہے کہ ولندیزی اور انڈونیشیائی حکومتوں کے مابین ایک سیاسی معاہدہ عمل میں آیا ہے جسکی رو سے تمام ولندیزی جزائر شرق الہند کو وفاقی بنیادوں پر ایک حکمراں سلطنت کی حیثیت دیدی گئی ہے۔ انڈونیشیا کی اس جمہوری حکومت کو جاوا، مدورا اور سماٹرا پر پورا اقتدار حاصل ہوگا۔ معاہدے کے مسودہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام علاقے بھی جو فی الحال اتحادیوں یا ولندیزیوں کے زیر تسلط ہیں باہمی مفاہمت کے اصول پر بتدریج آزاد ہو کر اس جمہوریت میں شامل ہو جائیں گے۔ اقرار نامے میں بیان کیا گیا ہے کہ "مفاد مشترک" پر دونوں حکومتوں کو اختیار حاصل ہوگا۔ اس "مفاد مشترک" کے ضمن میں امور خارجہ، دفاع اور حسب ضرورت مالیات نیز اقتصادی اور ثقافتی قسم کے موضوعات

نئے سال کا تحفہ

ادارۂ آجکل سال بھر تک اپنے قارئین کو ادبی تحفے پیش کرتا رہا ہے تاہم نئے سال کے موقع پر وہ کیلنڈر کی صورت میں فن مصوری کا ایک ایسا شاہکار ہدیۂ قارئین کرنا چاہتا ہے جو ہر کمرے اور ایوان کی زینت خاص بن سکتا ہے۔ لہٰذا التماس ہے کہ یکم جنوری کا آجکل خریدتے یا ڈاکئے سے وصول کرتے وقت یہ ضرور معلوم کر لیا جائے کہ کیلنڈر اس شمارے میں موجود ہے یا نہیں۔

شامل ہیں پچھلے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انڈونیشیا کیلئے یہ صورت بہر نوع زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔

قوتِ برداشت کی اعلیٰ مثال

لندن کے ایک شخص مسمی برٹ کوزنیس نے جس کی عمر ۴۷ سال ہے تین ہزار میل کا طویل فاصلہ پیدل چل کر صرف ۴۸ دن میں طے کر لیا جس سے ساری دنیا محوِ حیرت ہو گئی۔ قوتِ برداشت کی یہ سب سے بڑی مثال ہے۔ کیونکہ اس اثنا میں اس نے صرف چھبیس گھنٹے آرام کیا اور سو گیلن چائے پی۔ آرام کی مدت نکال دی جائے تو گویا اس نے روزانہ ۶۵ میل کا پیدل سفر کیا۔ اتنی قلیل مدت میں کثرتِ استعمال سے جوتیوں کے چھ جوڑے خستہ حال ہو گئے۔ اس سلسلے میں اسے کسی خاص حصۂ ملک کا سفر اختیار کرنا نہیں پڑا بلکہ رومفورڈ نامی میدان میں مسلسل چکر لگائے گئے۔ تاہم اب اس کا ارادہ ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایسی ہی قلیل مدت میں عبور کرے۔ اس سے ۱۳۷ سال پہلے قوتِ برداشت کی مثال کپتان جے بارلی نامی ایک اور برطانوی باشندے نے قائم کی تھی۔

مشینی دماغ

لندن میں ریڈیو انجینیرز کی برٹش انسٹیٹیوٹ میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ لوئی ماؤنٹ بیٹن نے فرمایا کہ برطانوی سائنسدانوں نے ایک ایسی مشین بنالی ہے جو انسان کی طرح واقعات کو یاد رکھ سکتی اور "دماغ" سے سوچ کر جواب دے سکتی ہے۔ اسے ایسے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرنے میں صرف چار سکنڈ صرف کرنے پڑتے ہیں۔ جن کا جواب ماہرین ریاضی سے دس دن میں بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ ابتک جو مشینیں استعمال ہو رہی ہیں وہ ریاضی سے زیادہ متعلق ہیں لیکن عنقریب ایسی صورت بھی پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے فیصلے اور اپنی ذاتی پسند کا اظہار کر سکیں گی۔

ہوائی موٹر

امریکہ کے ایک ٹکنیکل انجینیر نے اعلان کیا ہے کہ ہیں نے حقیقی معنوں میں اڑنے والی موٹر ایجاد کر لی ہے یعنی ایک ایسی گاڑی جو بظاہر موٹر کار معلوم ہوتی ہے لیکن اسے ہوائی جہاز بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ پنکھوں اور بازوؤں کی تبدیلی کے بعد زمین پر اور ہوا میں برابر کام دے سکتی ہے۔ پنکھوں اور بازوؤں کو لگانے یا الگ کرنے میں صرف پانچ منٹ لگتے ہیں۔ اس میں ڈیڑھ سو گھوڑوں کی قوت والا چھ سلنڈر کا انجن لگایا گیا ہے۔ ہوا میں اس کی رفتار ۱۲۰ میل اور زمین پر ۵۰ میل فی گھنٹہ ہے۔ زمین پر ۲۵ میل اور ہوا میں ۱۳ میل فی گیلن کے حساب سے پٹرول خرچ ہوتا ہے۔ موجد کے دل میں اس کا خیال اس وقت پیدا ہوا جبکہ وہ دورانِ جنگ میں پرواز کا ساز و سامان ساتھ لیکر جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔ لڑائی ختم ہوتے ہی اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔

مچھلی کے پیٹ میں

پچھلے مہینے کے آخر میں ایک زبردست طوفان باد و باراں آیا جس نے بمبئی کے قرب و جوار میں بہت سی بستیوں کو اجاڑ کر رکھدیا۔ جھونپڑے اڑ گئے، عمارتیں بیٹھ گئیں اور کچھ انسان بھی سیلاب کی نذر ہو گئے۔ جب یہ بلائے ناگہانی ختم ہوئی تو لوگوں کے مشاغل نئے سرے سے شروع ہو گئے۔ مچھیروں نے بھی مچھلیاں پکڑنے کے لئے سمندر میں جال ڈالدئے۔ چنانچہ بمبئی سے کوئی تیس میل کے فاصلے پر بارہ فٹ لمبی ایک ایسی شارک مچھلی پکڑی گئی جس کا وزن سات سو پونڈ تھا۔ جب اس کا پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں سے ایک آدمی کا پورا ڈھانچ اور لباس نکلا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ شخص اسی سیلاب کی نذر ہو کر سمندر میں پہنچا ہوگا اور وہیں مچھلی نے اسے نگل لیا ہوگا۔ غالباً اس نے صرف غرقِ دریا ہونے کی آرزو کی تھی تاکہ جنازہ اٹھنے کی صورت میں جو رسوائی ہوتی اس سے بچ جاتے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ غرقاب ہونے کے بعد انسان کو مچھلی نگل بھی لیتی ہے اور اس کا پیٹ چاک ہونے پر جب جنازہ ہڈیوں کے ڈھانچ کی صورت میں برآمد ہوتا ہے تو وہ زیادہ رسوائی کی صورت ہوتی ہے۔ خدا بچائے ایسی موت سے۔

ہندوستان کیلئے اناج

امریکہ نے حسب وعدہ ہندوستان کیلئے مزید اناج بھیجنا شروع کر دیا ہے چنانچہ اسکی پہلی قسط کے طور پر نو ہزار ٹن گیہوں کراچی پہنچا اور اس میں سے آٹھ ہزار ٹن دہلی بھیج دیا گیا کیونکہ دہلی میں غلے کی کمی نے نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ امریکہ سے آٹھ ہزار ٹن گیہوں اور آنے والا ہے۔ اس کے علاوہ ترکی سے آٹھ ہزار ٹن گیہوں اور آٹھ ہزار ٹن جَو اور عراق سے آٹھ ہزار چھ سو ٹن جَو بہت جلد آنے کی امید ہے۔ اس مقدار میں سے بیشتر حصہ دہلی، یو پی، صوبہ سرحد، بلوچستان اور راجپوتانے کے لئے وقف ہے۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ ۲۲ نومبر کو لکھنؤ کے مشہور غزل گو شاعر حضرت مرزا ثاقب لکھنوی دنیائے شعر و ادب سے منہ موڑ کر خلد آشیاں ہو گئے۔ اِنَّ للہ و اِنَّا الیہ راجعون۔ آپ کی تصویر کے ساتھ آپ کی شاعری پر پروفیسر آغا آشہر لکھنوی کا لکھا ہوا ایک مفصل مضمون یکم مئی ۱۹۴۶ء کے آجکل میں شائع ہوا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ وہ اس سال کے آخر میں ہم سب کو داغِ مفارقت دے جائینگے۔ دعا ہے کہ خداوندِ کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو توفیق صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

مرحوم اکبر آباد میں پیدا ہوئے لیکن تمام عمر لکھنؤ میں رہنے کے باعث لکھنوی کہلانے لگے تھے۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی — اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

تخمیس حسرت بر غزل حافظ

رئیس المتغزلین حضرت حسرت موہانی

مرے حق میں کیا نہ ہوگا کبھی رحم کا اشارا — نہ کبھی خطابِ پنہاں نہ عتابِ آشکارا؟
کہ یہ ہو تو بیکسی کا مجھے غم بھی ہے گوارا — بہ ملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دعا را
کہ بہ شکر پادشاہی ز نظر مراں گدا را

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے غم کی بے پناہی — ہے بیاں کی حد سے بڑھ کر مرے حال کی تباہی
یہ کچھ اور دے رہی ہے مری آرزو گواہی — ہمہ شب امید وارم کہ نسیمِ صبح گاہی
بہ پیامِ آشنائی بنوازد آشنا را

یہی التجا ہے کہ "بہ زہد نخوت انگیز" — یہ جو تھا بصد تکلف مجھے شغلِ مے سے پرہیز
اسے کردے ختم ساقی "بہ عطائے رافت آمیز" — بخدا کہ جرعۂ دہ تو بہ حافظِ سحر خیز
کہ دعائے صبح گاہی اثرے کند شمارا

یلدرم کی یاد میں

رشید احمد صدیقی

اپنے رفقاء اور طلباء سے مجھے اکثر اس مسئلہ پر بحثنے کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی نامعقول شاعر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں۔ اس میں فنون شریفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں۔ مرحوم اصغر گونڈوی اور سید سجاد حیدر میرے پیش نظر ہیں۔ ان کی دل فریب شاعری اور انشاء پردازی تمام تر انکی دلآویز شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ میرے سامنے ایسے اشخاص بھی ہیں جو شاعر اور انشا پرداز کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اور انشاء پردازی میں خامی بھی اسی حد تک ملتی ہے جس حد تک بحیثیت انسان یہ گھٹیا واقع ہوئے ہیں۔

میرے نزدیک فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں۔ ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو۔

یلدرم مرحوم علی گڑھ کے ساختہ پرداختہ تھے اور علی گڑھ کے اس زمانہ کے طالب علم تھے جب زندگی خوش باشی نہ تھی تو کچھ نہ تھی نہ اب جب زندگی سوا خوش باشی سب کچھ ہے۔ میں نے ان کی طالب علمی نہ دیکھی لیکن علی گڑھ کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب ع

بزم کو برہم ہوئے مدت نہ گذری تھی بہت

جب سے اب تک زمانہ کے رویہ اور روانی میں بہت کچھ فرق آگیا ہے کیا کچھ فرق۔ جن قدروں پر جب مرنے والے لاکھوں تھے" اب ان پر "رونے والا کوئی نہیں"۔ لیکن سجاد حیدر کی حیثیت جداگانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی اور یہ ان کی سیرت و شخصیت کا بہت اہم اور بہتم بالشان پہلو ہے۔

انھوں نے روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں اور سہیں، ایسی کروٹیں جو معمولی اشخاص کو یکسر زیر و زبر کر سکتی تھیں۔ لیکن یلدرم میں فن کا ایسا اعتماد و امید آفرینی تھی کہ ان کو بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ سیاسی فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے انتظامی اور ادبی بھی لیکن وہ شروع سے آخر تک اور سر تا پاؤں تک شریف شاعر اور ادیب رہے۔

مسلم یونیورسٹی کے ابتدائی عہد میں سجاد حیدر اس کے رجسٹرار رہے انھوں نے مہاراجہ صاحب محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب، نواب سر مزمل اللہ خاں، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، سب کے ساتھ کام کیا۔ ان میں سے ہر ایک کا وطیرہ جداگانہ تھا اور ان سب سے جدا سجاد حیدر کا تھا۔ انھوں نے کام سب کے ساتھ کیا۔ سازش کسی سے نہ کی میرے نزدیک یہی ایک بات یلدرم کی شرافت نفس اور سیرت کی پختگی کی بڑی محکم دلیل ہے۔

سجاد حیدر کو ڈپٹی کلکٹری راس آئی نہ رجسٹراری، وہ یونیورسٹی میں بھی رہے اور کالا پانی میں بھی لیکن روزگار کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ وہ کالا پانی تو گئے لیکن کسی کردہ یا ناکردہ گناہ کی پاداش میں نہیں جن کے بغیر کالا پانی کے تصور میں نہ گرمی آتی ہے نہ روشنی، اور یونیورسٹی آئے تو ایسے منصب پر جیسے دنیا بھر کی سرگرمیوں سے سروکار ہو سکتا ہے اِلّا شعر و ادب سے۔

اس یونیورسٹی میں شعر و ادب کے دیوانے میں نے دو ہی پائے۔ دونوں ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکے ہیں۔ ایک مولینا احسن مارہروی دوسرے سید سجاد حیدر یلدرم۔ ترکی، ترک اور ترکی ادب سے سجاد حیدر کو عشق تھا ان کا نام آتے ہی ان پر عجیب وارفتگی طاری ہوتی تھی۔ میں ترکی سے واقف نہیں ہوں لیکن ترکی ادب سے آشنا مختلف اصحاب کے ترکی کے اردو تراجم دیکھے ہیں۔ سجاد حیدر اور دوسروں کے ترجموں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ میں نے ایک بار سید صاحب سے پوچھا کہ ترکی ادب ہی جاندار ہے یا اس میں آپ کی شائستہ خوبیٔ تحریر کا بھی کچھ دخل ہے؟ ایک دفعہ جھوم ہی تو گئے، آنکھوں میں روشنی پیدا ہو گئی، اور چہرہ جگمگا اٹھا۔ کہنے لگے، جناب (سید صاحب جوش میں آتے تو جناب کا لفظ ضرور استعمال کرتے اور اس پر مخصوص انداز سے زور دیتے) ترکی زبان جانتے ہیں کس کی زبان ہے، ہماری آپ کی نہیں ہے میں نے بات کاٹ کر کہا جی ہاں میں کہہ رہا تھا کہ میری تو یقیناً نہیں ہے۔ آپ کی تو کہیں نہیں ہے۔ مسکرائے اور بولے ترکی ترکوں ہی کی زبان ہے اور انھیں کی ہو سکتی ہے یہ ان لوگوں کی زبان ہے جو نہ کبھی غلام رہے نہ کسی کو غلام رکھا۔ معرکہ آراؤں کی زبان ہے۔ اس میں ترک تازی ہے۔ سید صاحب پر اب کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے بس کے تھے نہ میرے۔ نامق کمال کا مشہور ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ میری ہی درخواست پر سید صاحب نے اردو میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا جس کا بیشتر حصہ سہیل میں شائع ہوا۔ سید صاحب قلم کاغذ لے کر خود ترجمہ نہیں کرتے تھے بلکہ کسی کو مامور کر دیا جاتا۔ سید صاحب ترجمہ بولتے جاتے وہ لکھتا جاتا۔ شاذ و نادر کہیں ترمیم کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ترجمہ پڑھتے جا رہے ہیں۔ میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مترادفات کیسے ہوتے لیکن جہاں تک اردو الفاظ فقروں اور ترکیبوں کا تعلق ہے میں سید صاحب کے اس کمال کا معترف ہوں کہ وہ بڑے اچھوتے بڑے جاندار اور بڑے گوارا اردو الفاظ استعمال کرتے تھے۔ الفاظ کے انتخاب اور ترکیبوں کی اختراع کا ترجمے میں بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات صرف کسی غیر معمولی مترجم کے حصہ میں آتی ہے۔ یہاں مجھے مولوی عنایت اللہ مرحوم دہلوی یاد آتے ہیں جن کا سا باکمال ترجمہ کرنے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ اردو اور انگریزی

دونوں زبانوں کو سمجھنے کی استعداد عنایت اللہ مرحوم میں خرق عادت کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ یہ بات انہیں کے حصہ میں آ بھی سکتی تھی۔ وہ اردو کے گہوارہ میں نہیں پلے تھے بلکہ اردو ان کے گہوارہ میں پلی تھی۔ وہ اہل زبان ہی نہ تھے اہل تمدن بھی تھے۔

یلدرم نے ترکی سے تراجم زیادہ کئے ہیں۔ اردو مضامین نسبتاً کم لکھے ہیں۔ ترکی انشا پردازی کا انداز ان میں کچھ ایسا رچ گیا تھا کہ اردو لکھنے میں ان کا قلم ترکی تال وسم قبول کر لیتا تھا۔ سید صاحب کے اس رنگ و آہنگ پر بعض لوگوں میں چہ میگوئیاں بھی ہوئیں ہیں بذات خود میں اردو میں اس انداز ترکانہ کو بڑا اچھا اضافہ سمجھتا ہوں۔

سید کے اسالیب انشاء اور ان کی موضوعات سید کی شخصیت کی بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ اردو میں انشاء لطیف کی ابتداء شرر، ریاض اور یلدرم کی تحریروں سے ہوئی۔ انشاء لطیف کا رشتہ کھینچ تان کر ملّا وجہی کی سب رس سے بھی ملایا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک سب رس کا انداز متغزلانہ تصوف کا ہے جو انشاء لطیف سے جوڑ نہیں کھاتا۔ انشاء لطیف نے آگے چل کر ٹیگوریت کا رنگ اختیار کر لیا اور ٹیگوریت نے اردو میں سستے اور ادنیٰ درجے کی تحریروں کو اس درجہ عام اور مقبول بنایا کہ ثقات ادب کو سختی سے احتساب کرنا پڑا اور یہ انداز جلد ہی نظروں سے گر گیا یہاں تک کہ جو اصحاب اس کے سب سے بڑے حامی تھے وہ سب سے پہلے تائب ہوئے۔ اردو میں ٹیگوریت کی جس طرح ابتدا ہوئی اور جیسا اسکا انجام ہوا، مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نئے شعر و ادب کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے جس کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔

شرر اور ریاض کے عاشقانہ مضامین اور یلدرم کی انشاء لطیف میں فرق ہے۔ شرر کا اسلوب انشاء اور اُن کا عشق دونوں کتابی ہیں۔ بندھے ٹکے ڈھلے ڈھلائے۔ شخصی تاثرات کی ترجمانی نہیں۔ شاعرانہ زبان و بیان کی نمائش ملتی ہے۔ ریاض میں زبان و بیان کا مظاہرہ شرر سے زیادہ غیر معتدل ہے۔ ریاض کی شاعری میں جو پُر تفنن لیکن سطحی شوخی ملتی ہے وہ انکی نثر میں پہنچکر سستی اور عامیانہ بن گئی ہے۔ شاعری میں جو انداز بیان شاعری کا حسن ہے وہ نثر میں پہنچکر مصنوعی اور مہمل ہو جاتا ہے۔ موضوع اور مطمح نظر کو یکساں ہونے کے باوجود نثر اور نظم کی مقتضیات میں فرق ہے۔ ریاض اور ناصر علی دہلوی نے اس امتیاز کو اپنی اپنی نثر میں نظر انداز کر دیا ہے۔

یلدرم کے ہاں بھی حسن و محبت کا کاروبار ہے لیکن یلدرم میں مجاز کی طرفگی و تازگی ہے۔ شرر اور ریاض کی پیداوار یکسر منفی ہے۔ سجاد کی دھتی، سجاد انصاری کو بھی انشاء لطیف کا پیرو قرار دیا جاتا ہے لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ سجاد انصاری کے یہاں نفسیاتی تحلیل ملتی ہے جس کو انشائے لطیف سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ انشاء لطیف اور غزل سرائی کا سرچشمہ ایک ہے بقولے

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے

لیکن جس طرح غزلوں میں آرٹ اور اقدار کے اختلافات ملتے ہیں، ادب لطیف میں بھی یہ امتیازات نظر آتے ہیں۔ یلدرم اور ادب لطیف کے بعض دوسرے علم برداروں میں یہ فرق واضح ہے۔ سجاد حیدر کے ہاں شوخی بھی ہے شرارت بھی لیکن شہدپن نام کو نہیں۔ یلدرم کے ہاں عورت کا بڑا عمل دخل ہے لیکن ان کے ہاں خیالات کی رعنائی ملتی ہے۔ اعصاب کا تشنج نہیں مہدی افادی کے ہاں خیالات کی رعنائی اتنی نہیں ہے جتنی جذبات کی رنگینی۔ مہدی کے اعصاب پر اگر عورت سوار نہیں ہے تو کچھ بیدل بھی نہیں ہے۔ افادی کہیں کہیں تو شوق کی مثنویوں سے جا ملی ہے اور میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی تحریروں میں جہاں تک عورت کا تعلق ہے مراتب جنسی کا اتنا ہی فرق ہے جتنا تفاوت زمانی کی بنا پر ہونا چاہیئے۔ اگر ان دونوں کو ایک دوسرے کے عہد میں منتقل کر دینا ممکن ہوتا تو مہدی شوق بن جاتے اور شوق مہدی۔

سجاد حیدر کی تحریروں میں ایک بات نہایت واضح طور پر ملتی ہے یعنی وہ جذبات کی رَو اور روانی میں بھی اپنے وزن اور وقار کو یہ نہیں جانے دیتے۔ سجاد صاحب کے جذبات کچھ زیادہ تیز اور تند نہ تھے جس کے ہاں خیالات کی رعنائی ہو اس کے ہاں جذبات کا ہیجان و طغیان یوں بھی کم ہوتا ہے۔ پھر بھی جہاں کہیں ایسے مواقع آ گئے ہیں سجاد صاحب نے ایک ہلکی جنبش قلم سے ان کو معتدل کر دیا ہے اور اس طور پر معتدل کیا ہے کہ اظہار مطلب میں کوئی فرق نہ آیا اور شرم و شرافت کا دامن بھی داغ دار نہ ہوا۔

میرے نزدیک انشائے لطیف میں خیال کی رنگینی اور نزاکت کے ساتھ جذبہ کی متانت و عفت کو جس طرح یلدرم نے متوازن رکھا ہے کسی اور نے نہیں رکھا ہے۔ سجاد حیدر کی تحریروں میں جذبات سے زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ قاضی عبدالغفار اس بارے میں یلدرم سے ملتے جلتے ہیں لیکن دونوں کی ذہنی پرداخت میں تفاوت ہے۔ غفار کی تحریر میں طنز کی تیزی و تلخی بھی شامل رہتی ہے۔ اس طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبدالغفار، سجاد حیدر کے بجائے سجاد انصاری سے زیادہ قریب ہیں مجھے اکثر یہ محسوس کر کے خوشی اور اطمینان ہوا ہے کہ انشائے لطیف کے تین بڑے اچھے اور مکمل نمونے ہمارے یہ تین چوٹی کے انشاء پرداز بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ سجاد حیدر، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار۔

بعض اعتبار سے سجاد حیدر شروع سے آخر تک نوجوان رہے۔ وہ اس زمانہ میں بھی جوان تھے جب جسم و جان کے اعتبار سے نحیف و نزار ہو چکے تھے تعلیم نسواں، اردو ٹائپ، اسالیب شاعری میں نئے تجربات اور اس قبیل کی اور باتوں میں اوائل عمر سے سجاد حیدر ترقی پذیر واقع ہوئے تھے اردو ٹائپ کو مقبول بنانے میں تمام عمر کوشاں رہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کی نئی شاعری کے بڑے مداح تھے اور انکی ایک مخصوص نظم بڑے مزے لے لیکر پڑھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک فارسی مجلہ "ایرانشہر" نامی برلن سے ٹائپ میں شائع ہوتا تھا اسکا پہلا نسخہ سجاد صاحب کو موصول ہوا۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ سجّاد صاحب اپنی کوٹھی سے دفتر آرہے تھے۔ سربمہر بہت سارے لفافے، سرکاغذات کے کچھ منتشر اجزا، ایک آدھ اخبار و رسالے بغل میں دبائے ایک رسالہ پڑھتے چلے جارہے تھے۔ میں ان سے کوئی بیس بائیس قدم پیچھے آرہا تھا۔ اس کی خبر سجّاد صاحب کو نہ تھی۔ سیّد صاحب کے چلنے کا خاص انداز تھا۔ خود ہلکے پھلکے تھے۔ رفتار اس سے بھی زیادہ ہلکی پھلکی، ہموار۔ کسی قدر تیز، چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے تھے۔ نگاہ نیچی تقریباً عمودی۔ دس بارہ قدم چل کر اک ذرا کی ذرا رک سے جاتے اور ٹھیک سامنے ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر پھر گرم رفتار ہو جاتے۔ اس پر ان کے ایک بے تکلف دوست نے ایک فقرہ چست کیا تھا کہ سجاد تم چلنے میں سانپ کو شرماتے ہو وہ بھی چلتے چلتے رک جاتا ہے۔ سر اٹھاکر ادھر ادھر دیکھتا ہے اور پھر چل دیتا ہے۔ اس فقرے سے بہت محظوظ ہوئے۔ کہنے لگے۔ سانپوں میں رہ کر صرف سانپوں کی چال آئی اس کی تعریف نہ کرد گے! اسی انداز سے چلے جارہے تھے کہ یکایک ایک لفافہ سرک کر زمین پر آرہا۔ سجّاد صاحب کو مطلق خبر نہ ہوئی۔ میں نے اٹھالیا۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ دوسرا لفافہ گرا، وہ بھی میں نے اٹھالیا۔ باب العلم کے قریب پہنچے کہ تیسرے لفافہ نے مفارقت کی وہ بھی میں نے قبضہ میں کیا۔ سجّاد صاحب برابر رسالہ کے مطالعہ میں منہمک رہے۔ سیّد صاحب کے پیچھے میں بھی یونیورسٹی آفس پہونچا۔ آفس پہنچکر موصوف نے بچے ہوئے لفافے متعلقہ لوگوں کے حوالے کئے۔ معلوم ہوا تین لفافے گم ہیں چونک پڑے اور تھوڑی دیر تک سخت متفکر رہے میں نے تینوں لفافے کچھ وقفے سے واپس کئے۔ سیّد صاحب فرمانے لگے کہ آپ بھی کمال کرتے ہیں فوراً کیوں نہ دے دئیے۔ اس وقت مجھ پر کیا گزر گئی۔ میں نے کہا آپ مطالعہ میں منہمک تھے میں نے مخل ہونا مناسب نہ سمجھا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ سب کچھ بھول گئے۔ فرمایا خوب یاد دلایا یہ ملاحظہ فرمائیے "ایرانشہر" ہے۔ ٹائپ میں کتنا ستھرا چھپا ہے اور کیسے اچھے اور جان دار مضامین و نظمیں ہیں۔ ایرانی وطن پرستوں نے برلن سے اسے شائع کیا ہے۔ کاش اردو میں ایسا پاکیزہ اور دیدہ زیب ٹائپ رواج پا جائے۔ اور جناب بات تو یہ ہے کہ جب تک آپ "بت سنگی" (لیتھو کی چھپائی) سے رشتہ نہ توڑیں گے اردو کی اشاعت محدود رہے گی۔ میں نے کہا۔ سیّد صاحب "بت سنگی" کا تو ہمارے شعروادب میں ایک درجہ بھی ہے۔ بت آہنی میں کیا رکھا ہے۔ بقول شخصے ع

"حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا"

کسی قدر تیز ہو کر فرمایا یہی تو ستم ہے، آپ سب کا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ اچھی بھلی باتوں میں بھس ملا دیتے ہیں۔ اکبر نے ٹائپ کی خواہ مخواہ مٹی پلید کردی۔ میں نے عرض کیا سیّد صاحب اکبر نے کہیں بھس نہیں ملائی صرف بھس میں چنگاری لگائی ہے ہنسے پھر فرمایا اور جناب بھی تو کچھ دور نہیں کھڑے ہیں۔

سیّد صاحب نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ بلحاظ کوئی غیر معمولی شاعر نہ تھے۔ ان کی سب سے پہلی نظم مرزا پھویا بتائی جاتی ہے۔ اس میں شاعرانہ خوبیاں کچھ بہت زیادہ نہیں ہیں لیکن گزشتہ علی گڑھ کی زندگی کے بعض دل کش پہلو لطیف انداز سے بیان کئے گئے ہیں۔ ہلکی پھلکی تفریحی نظموں میں اس کو اچھا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ سیّد صاحب کی نقاشی نازک خطوط اور ہلکے رنگوں کی ہے۔ ان کا مزاج رومانی تھا، وہ رومان جو انسان کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے پستی کی طرف ہرگز نہیں۔ موجودہ عہد میں رومان کی حیثیت مسخ کردی گئی ہے۔ اس کو مزاج و خیال کی رنگینی کی بجائے مطالبات جنسی قرار دیا گیا ہے، وہ بھی اس طور پر کہ جو چیز صحت کی دلیل تھی وہ مستقل (اور لاعلاج) مرض قرار پائی۔

سجّاد صاحب کی ایک نظم جوانی کی رنگینی، رسائی طبع، سیرت کی پاکیزگی اور ان کے نقطۂ نظر کی دل آویزی کی ترجمان ہے۔ شملہ کالکا لائن پر ایک نظارہ کے عنوان سے سب سے پہلے تہذیب میں شائع ہوئی۔ سیّد صاحب کی یاد کے ساتھ نظم ہمیشہ وابستہ رہے گی سہ

ماتھے پہ بندی — آنکھ میں جادو
ہونٹوں کی بجلی — گرتی تھی ہر سُو
چال لچکتی — بات لہکتی
جیسے کسی نے — پی ہو دارُو
انکھڑیاں ایسی — جن میں تھے رقصاں
لمحہ میں رادھا — لمحہ میں راہُو
ایسی پھڑک تھی — خلق تھی حیراں
ریل پر آیا — کہاں سے آہُو!

سجّاد صاحب کو جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں، ترکی، ترکی ادب اور ترکوں سے والہانہ شغف تھا۔ ان میں سے کسی کا نام آجاتا تو سیّد صاحب وجد میں آجاتے جس زمانہ میں وہ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے ایک بار ان کو ترکی جانے کا موقعہ مل گیا! میں کیا بتاؤں ان پر کیا نشاط طاری تھا۔ صحت اچھی نہ تھی۔ میں نے کہا سیّد صاحب سفر طویل ہے تکلیف دہ بھی کیسی گزرے گی؟ فرمایا ٹرکی کے خیال میں طبیعت مگن ہے۔ یہ شگون اچھا ہے اور ہر اعتبار سے اچھا یا یہ خاک وہاں کی خاک میں مل جائے گی یا پھر دیکھئے گا کیسا رقصاں شاداں واپس آتا ہوں۔ چند ماہ بعد واپس آئے۔ سیّد صاحب یوں بھی سبک رفتار تھے۔ واپسی پر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پاؤں میں اسپرنگ لگے ہوئے ہیں، جسم میں توانائی، چہرہ پر بشاشت اور سرخی آگئی تھی۔ میں نے پوچھا ٹرکی میں کوئی تبدیلی پائی؟ فرمایا شروع سے آخر تک تبدیلی ہی تبدیلی نظر آئی، لیکن مجھے تو

ترکی سے الفت ہے بدلنے نہ بدلنے سے کیا سروکار۔

ترکی ادیبہ خالدہ خانم اور ان کی ابتدائی تحریروں کے بڑے دلدادہ تھے۔ موصوفہ علی گڑھ تشریف لائیں تو یونین میں سجاد صاحب نے ان کا خیر مقدم کیا اور ضمناً موصوفہ کے ابتدائی مضامین اور انشاء پردازی کو بڑے لطف سے سراہا۔ خالدہ خانم نے فرمایا کہ اب وہ اپنے اگلے اسلوب انشاء سے تائب ہوگئی ہیں اور اسے صرف ایام جہالت کی یادگار سمجھتی ہیں۔ سجاد صاحب خاموش ہو گئے بعد میں ایک صحبت میں اس واقعہ کا ذکر آیا تو فرمانے لگے خالدہ خانم کو کیا معلوم ان کی ایام جہالت کی باتوں نے کیا شگوفے کھلائے۔ پھر خلط بحث سے کیا حاصل سوال یہ نہیں ہے کہ خالدہ خانم کو کیا پسند ہے۔ اصل یہ ہے کہ میں کیا پسند کرتا ہوں۔

سجاد حیدر بڑے پاکیزہ اور معصوم سرشت انسان تھے۔ ان کو توڑ جوڑ بالکل نہ آتا تھا۔ وہ اپنے آپ پر کبھی فخر کرتے نہیں سنے گئے۔ دوسروں پر بڑی فیاضی سے اکثر فخر کرتے پائے گئے۔ ایک سچے آرٹسٹ اور ادیب کی طرح وہ اہل مناصب سے کبھی مرعوب نہ ہوئے لیکن فن کے کمال کی داد دینے میں بڑے سخی تھے۔ سید صاحب کو میں نے شاید کبھی "تم" کے لفظ سے کسی کو مخاطب کرتے سنا ہو۔ انھوں نے اپنے منصب اور اپنی غیر معمولی مقبولیت کو ذاتی رفعت اور منفعت کا کبھی وسیلہ نہیں بنایا۔ ان کو میں نے برہمی میں آپے سے باہر نہ پایا اور ہنسی دل لگی میں ان کے منہ سے کبھی ایسے الفاظ نہ سنے جو مذاق سلیم پر بار ہوں۔ یلدرم جیسے کڑھے ہوئے آدمی بہت کم دیکھے گئے ہیں وہ تمام آداب ان میں رچے ہوئے تھے جو ثقافت کی جان و جواز ہیں۔ ان آداب کو وہ اس لطف اور آسانی سے برتتے تھے جیسے ایک تندرست سانس لیتا ہو یا ایک حسین اپنے حسن کا حامل ہوتا ہے بغیر کسی ارادے یا تکلف کے۔ یلدرم میں رسمی تکلف بالکل نہ تھا۔ انکی بے تکلفی میں دوستانہ اور شریفانہ شان پائی جاتی تھی۔ وہ اسی حد تک تکلف کرتے تھے جس حد تک شرافت اور سلیقہ کا اقتضا ہوتا تھا اور بے تکلف بھی اسی حد تک ملتے تھے جس حد تک بے تکلفی حسن معاشرت کا جزو اعظم سمجھی جاتی ہے، وہ ان لوگوں میں تھے جو اونچی سے اونچی اور بڑی سے بڑی صحبتوں میں ہماری اور خود اپنی نمائندگی کر سکتے تھے۔ شعر و ادب کا انکا ذوق محض فطری نہ تھا بلکہ وہ شعر و ادب کے رنگ و رفتار پر حکیمانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ وہ اچھی ادبی تکلف انگریزی لکھتے تھے جو بات انکے عہد کے ہندوستانیوں میں بہت کم ملتی ہے انکی قدر کرنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ شعر و شرافت کے جو لوگ حامل یا قدر دان تھے وہ تمام کے تمام خواہ ہندستان کے کسی گوشہ میں ہوں یلدرم سے واقف اور انکی خوبیوں کے معترف تھے۔

سید سجاد حیدر ان لکھنے والوں میں تھے جنکا قائل نہ ہونا کم سواد ہونے کی دلیل ہے کم لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں جنکی تحریر اور شخصیت میں اس درجہ تک یک رنگی اور توازن ہو۔

وہ ہم سے جدا ہو گئے لیکن ہم اور ہمارے بعد آنے والے ان سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ مجھے یقین ہے فردوس میں ان کو وہ رنگینیاں اور نزہتیں بھرپور نصیب ہونگی جن کی صرف جھلکیاں ان کی تحریروں میں ہم کو نصیب ہیں +

"اب یاد نہیں" — نکہت نسیم

تاروں سے سونا برسا تھا چشموں سے چاندی بہتی تھی
پھولوں پر موتی بکھرے تھے ذرّوں کی قسمت چمکی تھی
کلیوں کے لب پر نغمے تھے شاخوں پہ وجد سا طاری تھا
خوشبو کے خزانے لٹتے تھے اور دنیا بہکی بہکی تھی

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

سورج کی نرم شعاعوں سے کلیوں کے روپ نکھرتے تھے
سرسوں کی نازک شاخوں پر سونے کے پھول لچکتے تھے
جب اودے اودے بادل سے امرت کی دھاریں بہتی تھیں
اور ہلکی ہلکی خنکی میں دل دھیمے دھیمے تپتے تھے

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

پھولوں کے ساغر اپنے تھے شبنم کی صہبا اپنی تھی
ذرّوں کے ہیرے اپنے تھے تاروں کی مالا اپنی تھی
دریا کی لہریں اپنی تھیں لہروں کا ترنم اپنا تھا
ذرّوں سے لے کر تاروں تک یہ ساری دنیا اپنی تھی

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

ہم دونوں ایک حقیقت تھے ہم دونوں ایک فسانہ تھے
ہم آپ ہی اپنی دنیا تھے ہم دنیا سے بیگانہ تھے
ہم اپنے راگ پہ ہنستے تھے ہم اپنی آگ میں جلتے تھے
ہم اپنے ہی عیش کا نغمہ تھے ہم اپنے ہی غم کا گانا تھے

اے دوست تجھے شاید وہ دن اب یاد نہیں اب یاد نہیں

یہ ساز کے پردے یہ مطرب سب اپنا ترنم کھو بیٹھے
یہ پھول یہ کلیاں یہ تارے سب اپنا تبسم کھو بیٹھے
یہ نرم ہوائیں یہ بادل سب بھول گئے شاید ہم کو
خاموش مناظر فطرت کے سب اپنا تکلم کھو بیٹھے

اے دوست تجھے بھی وہ لمحے اب یاد نہیں اب یاد نہیں

آواز

پولستانی افسانہ

مصنفہ
جوزف ولیین ہاف

مترجمہ
آثر لکھنوی

پولینڈ کے دیہات میں موسم گرما کا دن ختم ہونے کے وقت ایک ایسا لمحہ آتا ہے جب کھیتوں کی پکی فصل کا فرستادہ ہوا کا ایک جھونکا پھولوں سے معمور چمن کے تن بدن میں سنسنی ڈال دیتا ہے اور گراں بار خوشبوؤں کو آزاد کرنے پر مجبور کرتا ہے، گرم ہوا کے لمس میں آدمیوں کی آوازیں، جانوروں کی پکاریں، خواہشات نفس کے بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں جو اپنی تسکین کی توقع میں خوشی سے تھرتھراتے ہیں۔ یہی اسباب درختوں کی لطیف موسیقی میں بھی کارفرما ہوتے ہیں نیز اس دھندلی اور پر اسرار روشنی میں جو غم انگیز گیتوں میں تحلیل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ صرف جنگلی فاختائیں بدرجۂ کمال خوش و خرم نظر آتی ہیں جب اپنے بچھڑے جوڑے سے ملنے کا اعلان سب سے اونچے سفیدے کے درخت کی پھنگی سے کرتی ہیں ایسے آسمان کے نیچے جو شدت اہتزاز سے زرد ہو گیا ہے۔

اگر الزبتھا ہیوسنکا[1] اپنے اثرات کا اظہار کرتی تو اسی طرح کرتی۔ وہ ایک نیچے کوچ پر اپنے آرام کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اور کھلی کھڑکی سے باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی اس کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر جس کے نقوش نازک اور متناسب تھے سرخی کی تیز جھلک گورے گورے گالوں پر گلاب کے پھولوں کی مصوری کر رہی تھی۔ باریک بلاؤس کے نیچے اس کے سینے کا طوفانی اتار چڑھاؤ اتنک نمایاں تھا اور چھوٹے چھوٹے پاؤں بے چینی سے ہل رہے تھے، لیکن اس کی سیاہ آنکھیں جو سفیدے پر بیٹھی فاختاؤں پر جمی ہوئی تھیں ایک خوابناک محویت کے عالم میں آسمان کی پہنائیوں میں گم ہو گئی تھیں۔

یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے، کیا انیٹنی تم ہو؟" الزبتھ نے اپنا منہ پھیرے بغیر پوچھا۔

"جی ہاں بیگم صاحبہ میں ہی ہوں" یہ کہتا ہوا پرانی وضع کا ایک دراز قامت ملازم جس کے بال سفید تھے داخل ہوا۔ اس کی وردی خوشنما اور فیشن کے مطابق تھی۔ "آپ کے مہمانوں نے مجھے یہ عرض کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے بغیر وہ سخت اداس ہیں"

"اوہ، ان سے کہدو کہ میں ان کی صورت سے بیزار ہوں اور اسی وجہ سے چلی آئی" یہ کہکر وہ کھڑکی کے قریب جاکر جھانکنے لگی تاکہ انیٹنی کو یقین ہو جائے کہ وہ اپنے مہمانوں سے کتنی بے پرواہ ہے، لیکن اس ادا میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ بڈھے ملازم نے حکم کی تعمیل میں جلدی نہیں کی۔ ذرا دیر بعد جب اس نے انیٹنی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں بجلیاں تڑپ رہی تھیں، البتہ انیٹنی سے ناراضگی کا اظہار نہیں ہوتا تھا اور اپنے پہلے حکم میں اتنا اضافہ کیا:۔ "ان سے کہدو کہ...... نہیں ٹھہرو...... ان سے کہو کہ میں ان کے لئے کھانا پکا رہی ہوں۔ ہاں ان سے کہدو کہ میں بہت مصروف ہوں"۔ کہنے کو تو کہدیا مگر اپنے بہانہ کے ناقابل قبول ہونے پر خود ہی قہقہہ لگایا کیونکہ ہر شخص آگاہ تھا کہ الزبتھ ایسی مالکہ نہیں جو گھر بار کے دھندوں میں الجھی رہے۔ محل کے انتظام میں جو کچھ سلیقہ یا سگھڑاپا نمودار تھا وہ دراصل انیٹنی اور داروغہ کی توجہ اور محنت کا منت پذیر تھا۔

انیٹنی جو دیگر ملازموں اور مہمانوں کی طرح اپنی مالکہ کی پرستش کرتا تھا یہ باتیں رواداری سے مسکراتا ہوا سنتا رہا اور پھر کمرے سے چلا گیا۔

الزبتھ کا عمل سے بیگانہ مزاج اس کے خاندان والوں میں اکثر زیر بحث رہتا تھا کیونکہ اس کی ولادت کے حالات، زندگی میں اس کی منفرد جگہ، نیز قسمت کے داؤں اس کے متقضی تھے کہ وہ سراپا عمل ہو۔ وہ خاندان کڈناسکی سے تھی۔ اس کے دو بن دراز سوتیلے بھائی، ایک سوتیلی بہن اور ایک پورا دھاڑ خالاؤں کا تھا جن کے پاس تاریخی شجرہ اور ہوس نام و نمود کے علاوہ کچھ نہ تھا یا پھر روپے پیسے کا ہوکا۔ بیس برس پیشتر قدرت نے ان کی تنگدستی دور کرنے کا وسیلہ الزبتھ کی شکل میں بھیجا۔ ایک ننھی منی قبول صورت لڑکی کا ورود خالص "افلاطونی" تسلی کا باعث ہو سکتا ہے مگر قابل ہاتھوں میں یہ بظاہر ناچیز مخلوق کل قبیلہ کڈناسکی کے لئے ایک بیش بہا خزانہ اور ان کا واحد سہارا ثابت ہونے والی تھی۔ الزبتھ بڑھتی اور بڑھنے کے ساتھ نکھرتی گئی۔ والدین کی وفات کے بعد اس کے اعزہ نے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ان کے سرگرم تخیل نے اسے ابھی سے کسی پریوں کے شہزادے سے منسوب دیکھا، لیکن آجکل پریوں کے شہزادے اکّا دکّا ہی نہیں بلکہ دوراندیش بھی ہیں اور ایسی بیوی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو ڈھیروں جہیز لائے۔ دوسرے بڑے آدمی مثلاً لوہے یا روئی یا کافی کے "بادشاہ" شاذ ہی ملتے ہیں اور بالعموم دور دراز مقامات مثلاً امریکہ میں براجتے ہیں۔ معاملے کی اہمیت اور نزاکت بڑھتی گئی کیونکہ قبیلہ کڈناسکی کے افراد اس پر تلے ہوئے تھے کہ ان کا عروج، ان کی شہرت انہیں کے عین حیات میں ہو اور یہ شرف ان کے بعد کی آنے والی نسلوں کے لئے نہ اٹھا رہے۔ اس تمام بلند حوصلگی اور حب جاہ کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ سترہ برس کی الزبتھ مائکسلاف ہیوسنکی سے بیاہ دی گئی، وہ کروڑپتی تھا مگر ایک ایسے خاندان سے جس نے حال ہی میں دولت کمائی تھی اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

مائکسلاف ابھی جوان تھا۔ اس نے مال و زر، زمین اور کارخانے اپنے باپ سے ترکہ میں پائے تھے۔ اسی شخص سے خاندانی خوش حالی کا آغاز ہوا تھا اور جو

---

[1] آئندہ سے ہم اس کو اختصار کے لئے الزبتھ کہیں گے۔

حال ہی میں سونا کمانے اور سٹے بازی کی جنگ میں موت کے گھاٹ اترا تھا۔ مانکسلاف بہت خوش رو تھا اور اس بنا پر ایک روایت قائم ہو گئی تھی کہ وہ ہنومنکی کا لڑکا نہ تھا بلکہ کسی شہزادے کے صلب سے تھا کیونکہ ہنومنکی کی شکل و شباہت کچھ یوں ہی سی تھی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ اسے گھوڑ دوڑ کا شوق اور ذی رتبہ اشخاص کی صحبت میں وقت گزاری کا چسکا تھا۔ خاندانی امراء روسا بھی اس سے بہت جلد گھل مل جاتے تھے اور بے تکلف ہو کر پیار کے نام سے پکارتے تھے اور یہ لطف بعض اوقات مٹھی گرم ہونے کا دست نگر نہ ہوتا تھا۔ لیکن دوسری طرف مانکسلاف کی کاروباری ذہانت اور کسب زر کی ہوس باآواز بلند اعلان کرتی تھی کہ نہیں صاحب ہم اپنے ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ قصہ مختصر مانکسلاف الزبتھ کے لئے موزوں بر تھا۔

دو برس ادھر شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی اور ملک کے اخباروں نے اس کی طمطراق کا دیس اور بدیس میں خوب ڈھنڈورا پیٹا۔

افواہیں ضرور پھیلیں کہ الزبتھ نے اپنی اس خالہ کے گھر سے بھاگ جانا چاہا جہاں سے اس کی شادی ہو رہی تھی اور جب گرجے میں پادری نے پوچھا کہ وہ مناکحت بخوشی و بلا جبر و اکراہ قبول کرتی ہے تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ لیکن آپ جانئے لڑکیاں بعض وقت حماقت کر بیٹھتی ہیں چاہے یتیم ہی کیوں نہ ہوں۔ حقیقت جو کچھ ہو شادی ہو گئی اور ہنومنکی سے رشتہ قائم ہونے سے خاندان کڈ ناسکی کی خوش حالی میں بیّن اضافہ ہو گیا۔

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ الزبتھ اپنی حاصل کردہ حیثیت کی اہل ثابت نہ ہوئی۔ "پیارے مانکسلاف" کے مال و زر سے کھچا کھچ بھرے ہوئے صندوقوں پر قبیلہ کڈ ناسکی کے مطالبات کثیر اور متواتر ہوتے تھے مگر اسی فراخدلی سے پورے نہ ہوتے تھے کیونکہ ان مطالبات کو واجبی اور مضبوط بنانے میں سفارش کیسی الزبتھ نے کبھی زبان نہ ہلائی۔

اس طرف مانکسلاف جز بز تھا کہ ایک خوبصورت بیوی کا مالک ہونے کے باوجود اس کی ذات سے حسب توقع مالی منفعت اور رسوخ حاصل نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اس جنس خوب و گراں بہا کی نمائش کرتا مگر نتیجہ ہمیشہ ناقابل اطمینان نکلتا، حالانکہ ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ الزبتھ کے ذریعہ سے گھوڑ دوڑ کے میدان یا سرکاری حلقوں میں بالا مارنا یا کسی ذی اثر متنفس کو قابو میں لانا ایک خواب تھا جو کبھی شرمندۂ

بھول گئے ——— سردار جلیل

طوفانِ محبت میں دل کی کشتی کا بچانا بھول گئے
بس ایک ہی جلوے میں ان کے ہم ہوش میں آنا بھول گئے

پہلے تو اٹھایا کرتے تھے طوفان ہم اپنی آنکھوں سے
اب اشک بہانے کے دن ہیں اور اشک بہانا بھول گئے

اللہ رے شوخیٔ قسمت جب پرسشِ غم کو وہ آئے
غیروں کے فسانے یاد رہے اپنا ہی فسانہ بھول گئے

انجامِ محبت تک ہمدم کیا جانئے کیا کیا ہو جائے
آغازِ محبت ہی سے جب ہم ہنسنا ہنسانا بھول گئے

جب سے کہ پلائی ہے ہمکو اک شوخ نے آنکھوں آنکھوں میں
اس وقت سے ہم دخترِ رز کو ہونٹوں سے لگانا بھول گئے

بتلاؤ جلیل آخر کچھ تو ہر آن تبسم کیا معنی؟
چھپ چھپ کے بہاتے تھے آنسو کیا اب وہ زمانہ بھول گئے

تعبیر نہ ہوا۔ ایسی تمہید اٹھاتی نہیں کہ الزبتھ کی طرف سے ضدی پن بلکہ قریب قریب وحشیانہ مخالفت کا مظاہرہ شروع ہوا۔ ہنومنکی کو کاروباری مہمات پیش آتے رہتے تھے اور یہ بالکل فطری تقاضا تھا کہ اپنی بیوی سے وقت پر مدد کی امید رکھے۔

اس کے علاوہ بھی الزبتھ میں متعدد معائب تھے جن کی وجہ سے خاندان والے نالاں رہتے تھے۔ مثلاً اس کی نظر میں روپے پیسے کی وہ "مذہبی" توقیر نہ تھی جو زیرکی اور اونچے گھرانوں کی شان امتیاز ہے۔ فیاض شوہر سے جتنا روپیہ ملتا "بے معنی" کتابوں یا صناعت کے شاہکاروں کی بہم رسانی میں اڑا دیتی۔ ایک عادت تو ایسی خراب، ایسی خراب تھی کہ اغماض ناممکن تھا۔ وہ کیا؟ جو کچھ روپیہ پیسہ موجود ہوتا بلا کسی تفریق کے آوارہ گردوں، فقیروں اور محتاج کسانوں میں تقسیم کر دیتی یا ایسے لوگوں کو بخش دیتی جو چلتے ہوئے فقرے گھڑ لاتے کہ ہم کام کرنا اور اپنی زندگی سدھارنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک سے زیادہ "اصلاح یافتہ" حضرات پیشہ ور چور بن چکے تھے!

حاصل کلام دو خاندانوں کی اس شادی کو جو سراسر مصلحت اور دور اندیشی پر مبنی تھی اور اس سے وابستہ منصوبوں کو من موجی الزبتھ کا "تلون" ملیامیٹ کر رہا تھا۔ وہ ایک طرف تو ناقابل اصلاح "بہن" اور ایک طرف سرکش "بیوی" تھی۔

ابھی ابھی عزائم میں ایک شدید تصادم ہوا تھا۔ کس قدر حماقت! کیا یہ امر فطری نہیں کہ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ اپنے خاندانی افراد و اثر کو حصول مقصد کے لئے استعمال کریں؟ جب ایسے مواقع حاصل ہیں تو ان سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا جاتے۔

قدرے مزید وضاحت کی ضرورت ہے:۔

ایک کارخانے مسمی انڈور، وڈن اینڈ کمپنی کو فکر تھی کہ اسکے بنائے ہوئے گیس کے چولہے روسی ریلوں میں رواج پائیں۔ اس کا دارومدار ایک بڑے عہدہ دار پر تھا جو "اکسلنسی" تھا اور پیٹرسبرگ میں رہتا تھا، وہ مانکسلاف سے بخوبی واقف تھا اور اس سے زیادہ کاؤنٹ وٹیولڈ سے جو اسی غرض سے ہنومنکی سے اس کی دیہی فرودگاہ میں ملنے آیا تھا۔ حال ہی میں "ہز اکسلنسی" اور الزبتھ سے ایک دعوت میں تعارف ہوا تھا۔ "ہز اکسلنسی"

ابھی جوان تھے، بہت جلد ترقی کی تھی اور مستقبل میں مزید ترقی کی توقع بے جا نہ تھی انہوں نے کھلم کھلا پری جمال الزبتھ کو پسند کیا تھا اور اعلان فرمایا تھا کہ اس کے ہر حکم کی بسر و چشم تعمیل کرینگے۔ اب موقع آیا تھا۔ مائکلاف اور کاؤنٹ ڈیٹولڈ الزبتھ کو لے کر پیٹرسبرگ جانے کے عازم تھے تاکہ ہز اکسلنسی سے گیس کے چولہوں کا سوال طے ہو جائے اور مائکلاف اور کاؤنٹ ڈیٹولڈ دونوں کی جیبیں اعزازی "حق الخدمت" سے گرم ہوں۔ یہ ذکر ہی بیکار ہے کہ اس طرح وہ اپنے مالک کا بھی حق خدمت ادا کرتے۔ لیکن بغیر الزبتھ کے ہاتھ بٹائے بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل تھا کیونکہ ہز اکسلنسی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ رضامندی کی سند الزبتھ کے نرم و نازک ہاتھوں میں شرف قبول پائے گی۔ لیکن الزبتھ کا دوٹوک جواب تھا کہ مجھے اس جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں، بھاڑ میں جائیں گیس کے چولہے! اور جب اس سے (غالباً نادانستہ) یہ کہا گیا کہ فابرگ کے بنائے ہوئے زیورات عجیب و غریب ہوتے ہیں تو اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بھلا بتائیے کیا حرج تھا اگر وہ پیٹرسبرگ تک چلی جاتی جہاں کئی سربرآوردہ اشخاص سے ملاقات ہوتی اور گھاتے میں فابرگ کے تیار کئے ہوئے زیور بھی دیکھنے میں آتے۔ لیکن ان ضدی عورتوں کو اپنے حسن و جمال کا صحیح مصرف آتا ہی نہیں۔

وہ کوچ پر لیٹی ہوئی تھی اور آنکھوں کی کھڑکیوں سے کبھی محبت جھانکتی تھی اور کبھی نفرت — نفرت، اس وقت جب دروازے کی طرف گھورتی کہ بہترین "سوسائٹی" کا کوئی تازہ نمونہ داخل نہ ہو، محبت اسوقت جب پائیں باغ کی طرف تکتی جہاں شام کے سائے پھیل پھیل کر خنکی میں اضافہ کر رہے تھے اور شفاف نیلگوں آسمان کی گہرائیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ فطرت کا تناسب اور مقدس سکون دعوت نظر دے رہا تھا اور اس کے علی الرغم زر پرست دنیا داروں کے سرد و بے مہر ذہن سے تازہ تصادم کی وجہ سے اس کا رویاں رویاں کانپ رہا تھا، اور اس کا ضمیر احتجاج پر آمادہ تھا۔

دوبارہ کسی نے دستک دی اور انیٹنی نے داخل ہو کر بادل ناخواستہ کہا کہ ایک کسان حاضری کا سائل ہے۔ کسان کبھی دتکارے نہیں گئے اگر انھوں نے الزبتھ سے اپنا دکھ درد کہنا چاہا۔

وہ کوچ سے اٹھ بیٹھی اور کہا کہ بلاؤ۔ انیٹنی نے ادب مگر استقلال سے عذر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی اجنبی ہے اور تنہائی میں ملنا چاہتا ہے، میں نے سمجھایا بھی کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ آپ کے یہاں مہمان ٹکے ہوئے ہیں لیکن وہ نہیں مانتا... ... ایسے وحشی کے ساتھ آپ کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"کیوں، وہ میرا کیا بگاڑے گا؟"

"کچھ بگاڑے کہ نہ بگاڑے، اس کی صورت ایسی خونخوار ہے کہ ڈاکو معلوم ہوتا ہے۔ مناسب ہوگا کہ جب وہ آئے تو میں موجود ہوں تاکہ گستاخی پر آمادہ ہو تو فوراً حواس ٹھکانے کر دوں"۔ انیٹنی نے کہا۔ اس کا انداز بدستور مودبانہ تھا مگر ہاتھ کی مبہم گردش ایسی تھی گویا کسی کی گردن مروڑ رہا ہے۔

"انیٹنی اسکو بلا لاؤ اور پھر تم چلے جاؤ گے، کیوں نا؟ میرا دل بولتا ہے کہ اس آدمی کو مجھ سے ضرور کچھ نہ کچھ کہنا ہے۔ میرے انیٹنی، میرے اچھے انیٹنی مجھے اس سے اکیلے ہی میں باتیں کرنے دو"۔ یہ کہکر الزبتھ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جسکو بوڑھے انیٹنی نے پر جوش بوسہ دیا اور چلا گیا۔

جلدی جلدی بھدے قدموں کی دھمک سنائی دی اور دروازے تک آکر ایک کسان رک گیا۔ اس کی وضع درحقیقت اطمینان میں خلل ڈالنے والی تھی۔ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں رسمی سلام بجا لایا اور تعظیماً کمر خم کی۔ چپ چاپ کھڑا تھا، نظر اس بھورے قالین پر جمی ہوئی تھی جس پر الزبتھ کھڑی تھی۔

وہ دراز قد اور صنوبر کے درخت کی طرح کشیدہ قامت تھا۔ خوشنما سیاہی مائل بغیر کالر کا سکمانا[1] پہنے تھا جس پر نیلے فیتوں کا کام تھا۔ بالوں کی لٹیں جھالر کی طرح پیشانی پر لٹک رہی تھیں جو دریائے بگ کے اس پار کی ترکیب ہے۔ وہ بظاہر رکھ[؟]نیبن نہ تھا۔ ابتک جوان تھا، مگر چہرہ ستا ہوا، رنگ بجھا بجھا جس سے پریشانی کے آثار نمایاں تھے، آنکھیں وحشتناک اور خوفزدہ تھیں، ترشی ہوئی مونچھیں اور کلے اس طرح ہلتے تھے گویا ان جملوں کو چبا رہا ہے جن کا زبان سے ادا ہونا مشکل ہے۔ ہاتھ پہلوؤں سے ملے ہوئے یوں لٹک رہے تھے جیسے درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سزائے موت ملی ہے اور پھانسی کے تختے پر چڑھنے کو ہے۔

جب وہ اس طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا الزبتھ نے ایسی آواز میں جذبات کا غلبہ جس کا گلا گھونٹ رہا تھا پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"ہاں جنگل سے....." یہ کہکر وہ زور زور سے سانس لینے لگا[2] معلوم ہوتا تھا کہ صنوبر کے درختوں میں ہوا سرسرا رہی ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"یان کلوڈا"

اس اطلاع سے وہ دہشت دور نہیں ہوئی جو اس جنگلی آدمی کے ساتھ کمرے میں گھس آئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے وحشت اور صیدکی صیاد سے دید[؟] برستی تھی، وہ دیوار کا سہارا لئے ہوئے تھا اور الزبتھ اس سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی اس "مرقع الم" کو ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ اس کے دل میں کوئی فاسد خیال نہیں ہے بلکہ مبتلائے کرب و اضطراب ہے، تاہم اس کی آواز کی قدرتی موسیقیت اور ہمت آفرینی جواب دے گئی۔ دونوں خاموش کھڑے تھے۔ آخر کار کسان نے

---

[1] غالباً کوٹ۔ سکمانا کے صحیح معنی مجھکو معلوم نہیں۔ اثر

[2] بے اختیار دل چاہا کہ "زور زور سے" کی جگہ "زورے زورے" لکھدوں مگر محاسبین زبان کے خوف سے باز رہا۔ (اثر)

محسوس کیا کہ گفتگو کا سلسلہ اسے شروع کرنا چاہیئے۔

"مہربان خاتون، میں جنگل سے آیا ہوں......"

"بلاشبہ ڈاکو ہے" الزبتھ دل ہی دل میں سوچی، "لیکن چونکہ یہاں علانیہ اور انکسارانہ طور سے آیا ہے غالباً اس کا مطلب یہ التجا کرنا ہے کہ اس کو چھپا کر اس کے پیچھا کرنے والوں سے پناہ دوں، مجھے سنبھل جانا چاہیئے، کئی منٹ گزر چکے ہیں اور یہ اللہ کا بندہ ہکلا ہکلا کر اپنا نام دہرانے اور "جنگل سے آیا ہوں" بڑبڑانے کے سوا کچھ نہیں پھوٹتا!"

"تم جنگل سے بھاگ آئے ہو؟" اس نے پوچھا، "کس سے بھاگے ہو؟"

"بھاگ آیا ہوں!" اس دیو پیکر نے گھبرا کے کہا اور پہلی مرتبہ آنکھ اٹھا کر الزبتھ کی طرف دیکھا۔ اس کے بھنچے ہوئے ہونٹ کھلے، سفید دانتوں کی چمک پھیلی، سامنے ایک مجسمۂ حسن دیکھکر چہرے کا تناؤ ڈھیلا پڑا اور خشونت نرمی میں بدل گئی۔

اب اس نے جلد جلد بولنا شروع کیا۔

"میں جنگل سے نہیں بھاگا بلکہ جنگل میں بھاگا جب میرے اندر کی آواز نے پکارا۔ تین برس سے میری زبان بند ہے لیکن مہربان خاتون اب میں آپ کے پاس آیا ہوں کیونکہ لوگ کہتے ہیں آپ دیوی ہیں......"

الزبتھ کانپ گئی کہ یہ تو کوئی باؤلا ہے۔

"یہاں ایک آواز ہے....." کسان نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا اور اپنے سینے پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ اس کی آواز میں ارتعاش پیدا ہوگیا۔

"کیسی آواز؟" الزبتھ نے پوچھا۔

کسان نے منہ پھیر لیا اور اپنے آگے کی طرف پھیلے ہوئے اور ایک دوسرے سے گتھے ہاتھوں کو یوں مروڑا کہ گوشت سے خالی انگلیاں کڑکنے لگیں، پھر ایک عجیب لہراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مہربان خاتون جنگل پھر جنگل ہے۔ وہاں خدا کی آواز درختوں کی چوٹیوں سے سرگوشی کرتی ہے مگر نیچے زمین پر ایک ناپاک روح رنگینی اور پھنکارتی اور اکثر انسان کے جسم میں اتر جاتی ہے جب وہ آس پاس ہوتا ہے گویا آدمی جانتا ہے کہ اسے کس آواز پر دھیان دینا چاہیئے کیونکہ یہاں خود اس کی آواز موجود ہے" یہ کہتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنے سینے پر گھونسا مارا۔ الزبتھ کو اب بھی گمان تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور ہے، لیکن خوف دور ہو چکا تھا اور کسان کی باتیں زیادہ تندہی سے سن رہی تھی۔

"تم جنگل سے اچھی طرح واقف ہو؟" اس نے پوچھا

"جی ہاں، جنگل کے ملازم کے لئے جنگل کا جاننا ضروری ہے" جواب ملا۔

"تو تم ہمارے ہاں کے جنگلوں میں نوکر ہو؟"

"مہربان خاتون اس سال تک نوکر تھا جب یہ افتاد پڑی"

"کیا افتاد پڑی؟"

کسان نے آنکھیں پھیر لیں اور پھر اپنی انگلیاں توڑنے مروڑنے لگا۔ الزبتھ نے بھانپ لیا کہ اس کی بے چینی بڑھ گئی ہے کیونکہ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جمع ہو رہی تھیں۔

"مہربان خاتون میں آپ کے سامنے سارا کچا چٹھا بیان کر دوں گا، لوگوں کا کہنا سچ ہے کہ آپ دیوی ہیں۔ جنگل میں کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے عام لوگ ناواقف رہتے ہیں لیکن جنگل کے ملازم کو جاننا چاہیئے، یہ تو اسکا اٹل فرض ہے۔ رات کے وقت جنگل ہمیشہ چوکس رہتا ہے اور آپ جھیل کے کنارے کھڑی ہو جائیں تو کوسوں ادھر کی آواز سن لیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ میرا یہ فرض تھا کہ اونچ نیچ پڑے تو فوراً اس کی اطلاع دوں......"

الزبتھ بے صبر ہوتی جا رہی تھی کہ اس تمام ہذیان کا مطلب کیا ہے، لہذا ہمت دلانے کو مسکرا کر کہا۔ "ارے بھئی صاف صاف کہدو نا کہ کیا ہوا۔ ڈرو مت"

"میں جانتا ہوں..... میں غریب ہوں اور تنخواہ سے کبھی کچھ بچا نہ سکا۔ گناہوں کا اقرار کرنے اور بچوں کو بپتسمہ دلانے گیلسیا لے جایا کرتا تھا، اس میں بہت پیسا اٹھتا تھا کیونکہ گنتی کے پادری ہیں اور بہت دور رہتے ہیں۔ تین برس سے کسی گرجے کے اندر پاؤں نہیں رکھا اور دو بچے مذہب کی برکتیں حاصل کئے بغیر بڑے ہو رہے ہیں[1] حالانکہ یہ روبل (روسی سکہ) میرے پاس ہیں اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں......"

یہاں تک پہنچ کر اس نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے جیب سے ایک چکٹی ہوئی تھیلی اور تھیلی سے کچھ ملگجے نوٹ نکالے۔

"تم نے..... تم نے کسی کا روپیہ لے لیا؟" الزبتھ نے پوچھا

"کیا آپ کا مطلب ہے کہ میں نے چرا لیا؟ جی نہیں انہوں نے خود دیدیا"

"کھل کے کہو! شاید ریاست کی لکڑی بیچ ڈالی؟"

---

[1] زار کے عہد حکمرانی میں یونانی کیتھلک گرجا جسے یونیٹ بھی کہتے ہیں تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ ایسے گرجوں میں عبادت کی ممانعت تھی اور خلاف ورزی پر سزا دی جاتی تھی، اس وجہ سے پولینڈ اور روتھینیا کے کاشتکار جو اس عقیدے کے پیرو تھے اور آسٹروی پولینڈ کی سرحد کے قریب رہتے تھے جہاں یہ پابندیاں عائد نہیں تھیں کوشاں رہتے تھے کہ وہاں چوری چھپے جائیں، بچوں کو بپتسمہ دلائیں اور دیگر مذہبی رسوم ادا کریں۔ یہ کسان مذہب سے بہت شغف رکھتے تھے اور عبادت سے محروم ہو جانے کو بڑی مصیبت سمجھتے تھے۔ یہ لوگ اپنے عقائد پر سختی سے قائم رہے گو حکومت کی طرف سے برابر کوشش ہوئی اور جبر و تشدد کیا گیا کہ روسی آرتھوڈاکس مذہب قبول کریں۔ انہوں نے جان دینا گوارا کیا مگر اپنے عقائد سے جو ان کو محبوب تھے منحرف نہ ہوئے۔ کاشتکاروں کی متعدد آنے والی نسلیں ان لوگوں کو شہید کا مرتبہ دیتی رہیں۔

"جی نہیں"

"تو پھر کیا کیا؟ کسی کو قتل کر ڈالا؟"

"مہربان خاتون! اس سے بھی بری بات!"

الزبتھ نے اسکے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں، وہ آنکھیں جن سے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور جن کی تاب لانا دشوار تھا۔ اس نے تحکمانہ طریقہ سے ہاتھ بلند کر کے کہا۔

"ہاں کہو! کہو!"

کسان نے سر اٹھا کر دیکھا اور دیکھتے ہی چہرے پر مردنی چھا گئی، اسے خبر ہو گئی کہ اعتراف جرم کا لمحہ آ گیا۔

"میں...... میں نے عدالت کے سامنے جھوٹا حلف اٹھایا اور ایسا کرنے کے لئے انہوں نے مجھے دس روبل دیئے......"

"کہے جاؤ، پورا حال بیان کرو۔" یہ کہکر الزبتھ اس سے اور تھوڑی قریب ہو گئی۔

"میں نے انہیں دیکھا...... درخت کاٹتے سنا...... دبے پاؤں ان تک پہنچا اور ان کو دیکھا...... انہوں نے بھی مجکو دیکھا...... جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو وہ میرے پاس آئے اور مجھے دس روبل دیئے کہ ان کے خلاف گواہی نہ دوں...... میں بہت غریب تھا...... میری بیوی بیمار تھی...... میں نے روپیہ لے لیا...... اور جھوٹی قسم کھائی......"

الزبتھ برابر اس کی طرف تک رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پوری روح کھنچ کر اس کی آنکھوں میں آ گئی ہے، اس قدر سرگرمی سے ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا کہ مجرم کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ آزادی سے گفتگو کر سکتا تھا، دل کا بوجھ ہلکا ہو چلا تھا۔

"لیکن میں نے روبلوں کو خرچ نہیں کیا...... اس تھیلی میں وہی روبل ہیں...... مہربان خاتون آپ لے لیجئے...... تین سال سے مصیبت بھگت رہا ہوں، لڑکوں کو بپتسمہ نہیں دلایا، بیوی کے علاج کو ڈاکٹر نہیں بلایا...... ان روبلوں کو نہیں چھوا...... کیا آپ کا مطلب ہے کہ اعتراف گناہ کے وقت میں خود کسی پادری کو دے دوں؟ لیکن اسے ڈھونڈنے کہاں جاؤں اور میں نئے روسی پادریوں کے سامنے اپنے کو ذلیل بھی نہیں کر سکتا...... اسی الجھن میں جنگل کے لگاتار پھیرے لگاتا رہا تاکہ اپنے اندر کی آواز سے پوچھوں کہ کیا یہ جھوٹے حلف کا روپیہ گلیسیا میں بچوں کے بپتسمہ پر لگا سکتا ہوں لیکن آواز نے منع کیا۔ اگلی سال موسم بہار میں آواز نے مجھ سے کہا کہ محل کی مہربان خاتون کے پاس جا کیونکہ وہ دیوی ہے۔ یہ روبل اس کے حوالے کر کے رحم کی التجا کر۔ میں کئی دفعہ باغیچہ میں آیا، باورچی خانے کے گرد بھی چکر کاٹے لیکن درخواست کی ہمت نہ پڑی...... آج آواز نے حکم دیا کہ فوراً جا...... مہربان خاتون یہ روبل لے لیجئے اور میری روح کا بوجھ ہلکا کیجئے!"

تیسری مرتبہ اس نے وہی میلے کچیلے نوٹ الزبتھ کی طرف بڑھائے

وہ اس کے قریب گئی اور نفرت زدہ نوٹ اس کے ہاتھ سے لیکر اپنے پس پشت پھینک دیئے۔

کسان اس کے قدموں میں گر پڑا اور اس کے گھٹنوں سے لپٹ کر چلایا۔

"مقدس خاتون کیا خدا مجھے معاف کر دے گا؟"

الزبتھ نے جھکے ہوئے دیو کا سر اپنے دونوں ننھے ننھے ہاتھوں میں لے لیا اور گردن قدرے خم کر کے اس کے الجھے ہوئے اور جنگل کی خوشبو سے بسے ہوئے بالوں کو چوم لیا نیز اس چہرے کو جو خود آزاری کے پسینے اور ندامت کے آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ پھر گرفتہ آواز میں کہا:۔

"تمہاری خطا...... تمہارا گناہ سنگین ہے۔ لیکن تم نے اپنے اندر کی آواز سنی اور اس کے حکم کی تعمیل کی، خدا تم کو معاف کر دے گا۔"

کسان ابتک جھکا ہوا تھا، ہاتھ جوڑے ہوئے اور آنکھیں بند کئے، گویا دعا میں محو ہے۔ عالم رویا نیز اس "مرئی خواب" سے جو پیش نگاہ تھا طمانیت کی ایسی کرنیں پھوٹیں جنکی جوت نے اسکے چہرے کو بھی منور کر دیا۔ اس کا چت آنند سے بھر گیا، اب وہ تھا اور از خود رفتگی۔ جب آنکھیں کھولیں اور اس معجز نما مجسمہ کو دیکھا اور اپنی نجات کا مژدہ ان لبریز ترحم آنکھوں میں پڑھا تو اس نے متانت سے کہا "بوجھ دور ہو گیا......"

وہ دوبارہ جھکا اور دوبارہ الزبتھ کے گھٹنوں سے لپٹ کر آنسو بہاتا رہا۔

بعد ازاں وہ ایستادہ ہوا تو عظیم پرشکوہ تھا لیکن اس رحم سے چوندھیایا ہوا جس کا سزاوار ٹھہرا تھا۔ اس نے ادب سے سر تسلیم خم کیا اور چلتا ہوا۔ وہ بشاش تھا کیونکہ اس عذاب سے مخلصی پا چکا تھا جو سوہان روح تھا۔

دیر تک الزبتھ جہاں کھڑی تھی کھڑی رہ گئی، چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھوں میں چمک تھی وہ خیالات جو محل سے جنگل اور جنگل سے محل آ جا رہے تھے لفظوں میں باآواز بلند اس طرح ادا ہوئے "کم سے کم جنگل کے بسنے والوں میں ابتک روح باقی ہے......"

اس شام کو وہ کچھ ایسی کھوئی ہوئی اور اپنی ہٹ پر اڑی ہوئی تھی کہ اسکے شوہر یا کاؤنٹ وٹبو لڈ نے گیس کے چولہوں کا تذکرہ بالکل فضول سمجھا۔ انہوں نے گفتگو کے مختلف موضوع کرید کرید کر نکالے مگر الزبتھ کی طرف سے بے پروائی کا اظہار ہوتا رہا، البتہ کبھی کبھی یہ عجیب و غریب فقرہ دہراتی تھی جو ان خیالات سے یک لخت غیر متعلق تھا جو اعلی سوسائٹی کی کسی فرد کے ذہن میں آ سکتے ہیں۔

"ہاں اب بھی روحیں موجود ہیں...... جنگل کے ان لوگوں میں"۔

اس ناقابل فہم فقرہ نے بعض لوگوں کو کھوج لگانے پر ابھارا۔ یقیناً محل کا کوئی ملازم جھانک رہا تھا جب یان کلوڈ او الزبتھ کا واقعہ رونما ہوا کیونکہ بہت جلد یہ افواہ پھیل گئی کہ بیگم الزبتھ کسانوں کا منہ چومنے کی خوگر ہے!

کیمبرج یونیورسٹی کا دار التجربہ

مادھورام

ٹھیک سو سال پہلے کی بات ہے۔ ۱۹۴۶ء کی گرمیوں کا آغاز تھا کہ اسکاٹ لینڈ کے مشہور سائنسداں ولیم ٹامسن نے جو بعد میں لارڈ کیلون کے نام سے مشہور ہوئے۔ گلاسگو یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے شراب خانہ پر قبضہ کیا۔ خالی پیپوں کو باہر پھنکوایا۔ نالیاں بنوائیں، نل لگوائے، اور اس طرح برطانوی یونیورسٹیوں کے سب سے پہلے معمل کی بنیاد پڑی۔

آج ہمیں یہ ساری باتیں بالکل معمولی اور غیر اہم نظر آتی ہیں۔ لیکن بات یوں ہے کہ ابھی انگلستان میں بھی دوسرے ملکوں کی طرح سائنس کا باقاعدہ مطالعہ کے خیال نے عوام کے دلوں میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔ پھر بھی سائنس یہ ابتدائی معمل کیمبرج یونیورسٹی کی موجودہ مشہور معمل کیونڈس لیبوٹری کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس لیبارٹری کو سلطنت برطانیہ کا بہترین دار التجربہ کہا گیا ہے۔ اور ساری دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ جتنے بڑے بڑے اہم تجربات اس مرکزی لیبارٹری میں ہوئے ہیں دنیا کی کسی اور لیبارٹری میں نہیں ہوئے۔

گلاسگو یونیورسٹی کی بنیاد کے چند سال بعد کیمبرج کے چند ماہرین سائنس نے اپنی ایک لیبارٹری قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر خرچ کا اندازہ چھ ہزار پونڈ سے زائد کیا گیا۔ اس زمانہ کے معیار کے مطابق اتنی بڑی رقم کسی کالج میں سائنس کی لیبارٹری کے لئے بہت غیر معمولی تھی۔ اس لئے اگر ڈیون شائر کے ڈیوک خاندان کیونڈش کی فیاضی اور دوربینی سہارا نہ دیتی تو اس مشہور عمارت کے بننے میں ابھی نہ جانے کتنا عرصہ لگتا۔ انھیں کی دی ہوئی رقم سے یہ دار التجربہ تیار ہوا۔

ان دنوں یونیورسٹی کے چانسلر ڈیون شائر کے ڈیوک ہفتم تھے۔ جو ہنری کیونڈش سائنسداں کے رشتہ دار تھے۔ ان کی مربیانہ عنایات کے سایہ میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جیمز کلارک میکسویل جنہوں نے گرمی۔ روشنی اور مقناطیسی قوت کے متعلق بہت سا کام کر رکھا تھا۔ اس نئے کام کی صدارت کے لئے منتخب ہوئے۔ اور ۱۸۷۳ء تک اس لیبارٹری کا کچھ حصہ بن کر تیار ہو گیا۔ اگلے سال ۱۶ جون کو ڈیوک اوف ڈیون شائر نے یونیورسٹی کے چانسلر ہونے کی حیثیت میں اس کا افتتاح کیا۔ موجودہ صدی کا ماہر سائنس اس لیبارٹری کے ساز و سامان کی فہرست کو پڑھ کر بہت حیران ہوگا۔ پروفیسر میکسویل نے جو فہرست تیار کی تھی اسے دیکھ کر بے حد حیرت ہوتی ہے۔

کیونڈش لیبارٹری میں جو اولین تجربات کئے گئے ان کا دائرہ عمل بے حد وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہر سچے طالب علم کو کیونڈش لیبارٹری استعمال کرنے کی پوری پوری اجازت تھی۔ ان کے نصاب تعلیم سے ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کا ہر ایک ممبر جو تجرباتی طریقہ جات یا طبیعاتی تحقیقات کو سمجھنے کی خواہش رکھتا ہو۔ اس لیبارٹری میں آزادی سے کام کر سکتا ہے۔

کیونڈش لیبارٹری نے اپنی اوائل عمر میں ہی وہ عزت اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی جو اس کو آج حاصل ہے یعنی یہ کہ وہ پوسٹ گریجویٹ تحقیقات کا مرکز بنی اور وہ بے شک و شبہ سب جگہ سلطنت متحدہ کے مشہور ترین ماہران سائنس کا کارخانہ بن گئی۔ میکسویل کے بعد اس شعبہ کے صدر ایک دوسرے شہرۂ آفاق سائنسداں لارڈ ریلے ہوئے جنہوں نے کیونڈش لیبارٹری میں برقی مزاحمت کی اکائی کے شبہات کو نہایت خفیف لمبائی، چوڑائی، گہرائی کی صورت میں ظاہر کیا۔ نچلی منزل پر آخری کمرہ کے اینٹ کے ستون پر ایک پیتل کے کتبہ پر کندہ ہے کہ سپننگ کائل (Spinning Coil.) کو جس کی بدولت لارڈ ریلے نے کامیابی حاصل کی اسی جگہ نصب کیا گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ کے ہر حصہ سے کامیابی کی بو آتی ہے۔ مثلاً اسی جگہ پروفیسر جے جے ٹامس نے برقیہ (Electro.) کی حقیقت کو ثابت کیا۔ یہیں کچھ عرصہ کے بعد ایک اور کیمبرج یونیورسٹی کے سائنسداں لارڈ ردرفورڈ آٹم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے یعنی بناوٹی تجزیہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور یہ کام ایٹم کی زبردست قوت کو اپنے قبضہ میں لانے کی سب سے پہلی منزل تھی حقیقت میں اس قدر ضروری اور اہم تجربات و انکشافات کیونڈش لیبارٹری میں کئے گئے ہیں کہ اگر ان کی اہمیت بتانے کے لئے بھی انسان کو بے حد ماہر سائنس داں ہونا چاہئے۔ بہر حال ہمیں ایک یا دو تجربات پر جن کی اہمیت مسلمہ ہو چکی ہے توجہ دینی چاہئے۔ مثلاً ۱۹۳۲ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے دو سائنس دانوں کاک کرافٹ اور والٹن نے ایٹم کے محرکوں کے ذریعے جن کو ایک بندوق سے چلایا گیا تھا۔ ایٹم کے مرکزی حصہ کے ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ اس سے کچھ عرصہ پیشتر سر جیمز چیڈوک نے جو کیمبرج کے ایک اور مشہور سائنسداں ہوئے ہیں۔ نیوٹرون (newtron) کے انکشاف کا اعلان کیا۔ دو اور اشخاص ولیم بریگ اور اس کا بیٹا لارنس (جو ۱۹۳۸ء میں کیونڈش پروفیسر کے عہدہ پر ممتاز ہوا) کیونڈش لیبارٹری سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں انہیں نائٹ ( ) کا خطاب ملا اور ۱۹۱۵ء میں دونوں کی تحقیقات کی اہمیت کو تسلیم کر کے نوبل پرائز (Prize.) دیا گیا۔ آج کیونڈش لیبارٹری کو اس کے بانی ڈیون شائر کے ڈیوک ہفتم اگر دیکھے تو پہچان نہ سکیں گے۔ یہ اس قدر ترقی پا گئی ہے کہ اگر اس کو دنیا کی عظیم ترین تجربہ گاہ کہا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔ انڈر گریجویٹ عورتیں مردوں کے ساتھ آزادانہ طور پر اس کو استعمال کر سکتی ہیں۔ اس کا ساز و سامان کس قدر فراخدلی سے مہیا کیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو اس بات سے ہو جائے گا کہ لارڈ آسٹن مرحوم نے اس لیبارٹری کی ایک نئی شاخ کی تعمیر کے لئے جو ابتدائی تجربوں کے لئے بنائی گئی تھی ڈھائی لاکھ پونڈ دئے تھے۔

اس جنگ عظیم میں جو ابھی ختم ہوئی ہے کیونڈش لیبارٹری کا بہت سا سامان گورنمنٹ نے لے لیا تھا۔ اور وہ وقت شاید دور نہیں جب دنیا کو یہ معلوم ہوگا کہ کیونڈش لیبارٹری میں کام کرنے والے ماہران سائنس نے جرمنی اور جاپان کے خلاف لڑائی جیتنے میں کس قدر نمایاں حصہ لیا ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء

فکر ندوی

گذشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں مسلمانوں کے "امراض تنزل" کے لئے جو بے شمار نسخے لکھے گئے تھے منجملہ ان کے ایک نسخہ "ندوۃ العلماء" کی تحریک بھی تھا۔

قوموں اور ملکوں کے عروج وزوال کے ہر ایسے موسم میں کچھ لوگ وقت سے پہلے بیدار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ تمام ملک خواب غفلت میں سرشار ہوتا ہے۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس وقت بھی بعض ذکی الحس اور صاحب فکر طبائع وقت کے اثرات سے متاثر ہوئیں۔ اور اپنی حالت پر مغرب کے اقتدار اور عروج کے مقابلے میں غور کرنے لگیں ——— اس طرح تغیر و اصلاح کی تحریکوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ——— جس کا محرک اصلی تو مغربی تمدن کے اقتدار کا انفعالی اثر تھا ——— لیکن اس اثر نے مایوسی کی جگہ سعی و کوشش کے جذبات پیدا کر دئے۔ مطالعہ و مشاہدہ تنزل کے اسباب پر غور کرنے کا ذریعہ بن گیا ——— اور اصلاح و درستگی کی تدابیر پر غور کیا جانے لگا۔

ہندوستان کے ارباب علم وفضل بھی ان حالات سے بےخبر نہ تھے۔ اور اب وہ بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ آج مسلمانوں کی سرفرازی و سربلندی کا راز محض دین و دنیا کے اجتماع" میں مضمر ہے۔ چنانچہ وہ اسی جد وجہد میں انتہائی انہماک سے مصروف ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے مصلحین بلاد اسلامیہ کے مقابلے میں ذرا دیر سے بیدار ہوئے۔ لیکن انھیں اس اثنار میں کافی غور وفکر کا موقع مل گیا۔ اور بہت سے مشاہدات و تجربات حاصل ہو گئے جو ان کے لئے شمع راہ ثابت ہوئے۔

ندوۃ العلمار کا قیام

۱۸۹۲ء میں کانپور کے مشہور مدرسہ فیض عام کا جلسہ تھا۔ دور دور سے علمار وقت شرکت کے لئے آئے۔ دوران گفتگو میں یہ مسئلہ بھی آیا۔ گفتگو نے عمل کا قالب اختیار کیا اور "ندوۃ العلماء" کے نام سے ایک انجمن کی تشکیل ہو گئی ——— اس انجمن کے اہم مقاصد یہ تھے:

(۱) ایسے علمار تیار کرائے جائیں۔ جو علوم مذہبی قرآن وحدیث و فقہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال رکھتے ہوں اور خصوصاً علم کلام میں۔ تاکہ غیر مذہب والوں کے مقابلے میں اسلام کی حقانیت وصداقت ثابت کر سکیں۔

(۲) قوم میں ایسے علمار کی بھی ایک جماعت موجود ہونی چاہیئے جو علوم وفنون مثلاً صرف ونحو، ادب وانشاء منطق وفلسفہ وغیرہ میں مہارت تامہ رکھتی ہو۔ دوسری قوموں کے سامنے جب اسلام کی علمی عظمت کا تذکرہ آتا ہے۔ تو خواہ مخواہ خلیل سیبویہ۔ عبدالقاہر جرجانی۔ سکاکی۔ فارابی۔ ابن سینا کا نام لینا پڑتا ہے۔

(۳) ایسے علمار بھی پیدا کئے جائیں جو دنیا کے حالات اور واقعات سے باخبر ہوں۔ اور ان کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بستے ہیں اس کے اصول سلطنت کیا ہیں اور اس وقت مسلمانوں کی دنیاوی ضرورتیں کیا ہیں سلطنت کے انتظام میں جو تبدیلیاں پیش آتی رہتی ہیں ان سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑے گا۔ المختصر واقفیت، انتظام تدبر، حزم اور مصلحت اندیشی میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہو۔

جب یہ طے ہو گیا کہ مذکورہ جماعت کے بغیر اسلام اور اسلامی علوم کی ترقی و استحکام ممکن نہیں تو پھر یہ غور کیا گیا کہ وہ کن ذرائع اور اسباب سے پیدا ہو سکتی ہے۔ بڑے غور وفکر اور مشورہ و استصواب کے بعد جو رائے اس معاملے میں قائم ہوئی وہ یہ کہ جب تک طلبار کو ابتدائی زمانہ تعلیم سے اواخر تعلیم تک ایک خاص قسم کی تربیت وتعلیم نہ دیجائے اس قسم کے علمار پیدا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یہ قرار پایا کہ چند مخصوص اصولوں پر ایک عظیم الشان درسگاہ قائم کی جائے۔

کچھ دنوں کی ابتدائی جد وجہد کے بعد اس نقطۂ نظر کے تحت لکھنو کے مقام پر جو کسی زمانے میں اسلامی علوم ومعارف کا مرکز رہ چکا ہے ایک درسگاہ "دار العلوم ندوۃ العلمار" کے نام سے قائم کی گئی جو کہ روز اول سے آجتک انتہائی کامیابی سے چل رہی ہے۔

درسگاہ کی شاندار دو منزلہ عمارت شہر سے باہر ایک پر فضا اور پر سکون مقام پر واقع ہے جس میں بیس بڑے بڑے کمرے تعمیر کئے گئے ہیں اور ہر ایک کمرہ ایک خاص فن کیلئے مخصوص ہے اور اس فن سے متعلق انتہائی سہولتیں بھی اسی کمرہ میں بہم پہنچا دی گئی ہیں۔

حال ہی میں چند ایسی عمارتیں بھی تعمیر ہوئی ہیں جن کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی تھی۔ مثلاً دار الاقامہ جس میں بیرونی طلبا کے لئے خوش فضا کمرے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ایک شاندار اور خوبصورت مسجد جو دار العلوم کی عمارتوں کے درمیان دور سے ایسی نظر آتی ہے گویا انگوٹھی میں نگینہ جڑا ہو۔

نظامِ عمل

دارالعلوم کا پورا انتظام ایک مجلس کے سپرد ہے جو بچھیتر ارکان پر مشتمل ہے۔ ان ارکان میں جہاں علماء اور مشائخ وقت ہیں وہیں جدید تعلیم یافتہ اصحابِ فکر و نظر بھی موجود ہیں تاکہ قدیم و جدید تہذیب کے امتزاج سے جو جماعت تیار ہو وہ بہت سی خصوصیات کی حامل ہو۔

روزمرّہ کے انتظامی معاملات کی سربراہی اور انجام دہی کے لئے معتمد مالیات کے عہدے قائم ہیں۔ دارالعلوم کا اندرونی انتظام ایک پرنسپل کے سپرد ہے جو اپنے عہدے کے لحاظ سے مہتمم اور ناظر کہلاتا ہے۔ ناظر دارالعلوم کے تمام تعلیمی اور انتظامی معاملات کا بھی ذمہ دار ہے۔ اس کی وہی ذمہ داریاں ہیں جو ایک کالج کے پرنسپل کی ہوتی ہیں اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی۔

دارالعلوم کے مہتمم کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تبحر علمی، حسن انتظام، وسعتِ نظر اور زہد و تقویٰ کی صفات کا بخوبی حامل ہو۔

ناظر دارالعلوم کی امداد و اعانت اور عام دفتری امور کی دیکھ بھال کے لئے "منصرم" کا عہدہ قائم ہے۔ اس کی ذمہ داریاں وہی ہوتی ہیں جو ایک یونیورسٹی کے رجسٹرار کی ہوسکتی ہیں۔

درس و تدریس کے لئے لائق ترین اساتذہ کی جماعت ہے جو بڑے انہماک و توجہ اور پوری دلچسپی کے ساتھ تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اساتذہ کے انتخاب میں دارالعلوم کا روزِ اوّل سے یہ مطمح نظر رہا ہے کہ ہر فن کے معلم علیحدہ علیحدہ ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ اہتمام کے ساتھ وہ اپنے خاص فن میں درس دے سکیں اور طلباء میں علم کا ذوق اور فنی تعلیم حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ سلیقہ پیدا کرسکیں۔

خصوصیات

دارالعلوم ندوۃ کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا نصاب تعلیم ہے۔ دارالعلوم کے نصاب تعلیم میں قدیم و جدید علوم کے امتزاج کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی لازمی ہے۔ دارالعلوم نے زبان انگریزی کے سلسلے میں ایسا نصاب مرتب کیا ہے جس کی مدد سے جلد سے جلد طالب علم میں انگریزی کے رسائل و اخبارات پڑھنے کا سلیقہ آجاتا ہے اور حسب ضرورت دوسری کتابوں سے استفادہ حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

انگریزی کے ساتھ جغرافیہ، حساب، جومیٹری اور تاریخ کی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں تاکہ اگر کوئی متعلم میٹرک کا امتحان دینا چاہے تو بلا کسی مزید تیاری کے دیدے۔

ان ابتدائی علوم کے علاوہ علوم جدیدہ معاشیات و سیاسیات سے بھی طلباء کو روشناس کرایا جاتا ہے۔ معاشیات و سیاسیات کی تعلیم میں اصول و نظریات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے معاشی و سیاسی حالات بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ موجودہ معاشی مسائل کے حل میں اسلامی اصول سے بھی کام لیا جاتا ہے اور یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کا معاشی نظام طلباء کے سامنے آجائے۔

سیاسیات کی تعلیم میں نظریات کی تشریح کے بعد سب سے پہلے ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے بحث کی جاتی ہے۔ واسکوڈی گاما کی آمد سے برطانوی قبضہ تک کی ساری سرگذشت سنا دی جاتی ہے۔ پھر منٹو مارلے اصلاحات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگست ۱۹۱۷ء کے تاریخی اعلان کا ذکر آتا ہے اور مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات پر گفتگو ہوتی ہے۔ اور اس سلسلے میں ملک کے ترقی پسند عناصر کا ذکر بھی آتا ہے اور ساتھ ہی قومی مطالبات کا تذکرہ بھی ہوتا ہے آخر میں موجودہ اصلاحات پر گفتگو ہوتی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر بحث کیجاتی ہے اور اختصار کے ساتھ تمام ضروری باتیں بتائی جاتی ہیں تاکہ طلباء موجودہ مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے مطالعہ کے بعد بصیرت اور سنجیدگی سے کوئی رائے قائم کرسکیں۔ اس سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر بھی واضح کیا جاتا ہے اور اسلامی نظام حکومت کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کشاکش حیات میں شمع راہ بن سکے۔ سیاسی مسائل کو زیادہ ذہن نشین کرانے کی غرض سے ایک نقلی پارلیمنٹ بھی قائم ہے تاکہ نظری بحثوں کی عملی مشق ہو جائے۔

دارالعلوم کے نصاب تعلیم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عربی زبان کی تعلیم ایک زندہ زبان کی طرح ہوتی ہے۔ طلباء کو محض کتاب فہمی کا عادی نہیں بنایا جاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لکھنے اور بولنے کی مشق بھی کرائی جاتی ہے اس سلسلہ میں دارالعلوم ندوہ کا طریق تعلیم تمام عربی یونیورسٹیوں کے مقابلے میں بالکل مختلف ہے۔

سب سے پہلے طلباء کو روزمرّہ کے مفردات ایک خاص ترتیب سے یاد کرائے جاتے ہیں اس کے ساتھ قواعد کے طرز پر آسان اور دلچسپ طریقے سے جملوں کی مشق کرائی جاتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جب صرف و نحو کے ضروری قواعد آجاتے ہیں تو "حکایات اطفال" کا پہلا حصہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔ بالعموم یہ منزل ایک مہینہ میں ختم ہو جاتی ہے۔ جب اس طرح ایک حصہ ختم ہو جاتا ہے تو اسی انداز میں استاد چھوٹے چھوٹے قصے لڑکوں کو سناتا ہے اور پھر ان سے وہی قصے باربار زبانی کہلواتا ہے چند مشقوں کے بعد "القراۃ الرشیدہ" کا سلسلہ شروع کرا دیا جاتا ہے۔ اس طرح تین چار ماہ میں متعلم میں اتنی استعداد اور صلاحیت پیدا کرا دی جاتی ہے کہ وہ سادہ زبان میں چھوٹی چھوٹی حکایتیں لکھ سکے اور روزمرّہ کی ضروری بات چیت کرسکے۔ ایک عرصۂ دراز کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دو سال میں متعلم لکھنے بولنے اور سمجھنے میں کافی مشّاق ہو جاتا ہے اور آسانی سے ہر قسم کے خیالات عربی زبان میں ظاہر کرسکتا ہے

آگے چل کر مصر کے ابتدائی ثانوی مدارس کے دو منتخب مجموعے پڑھائے جاتے ہیں۔ جو اسی غرض سے "وزارت معارف" نے مرتب کرائے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں ایک میوزیم بھی قائم ہے جس میں تمام چیزوں کے نمونے جمع ہیں تاکہ ترجمہ کے بغیر چیزوں کا تصور قائم ہو سکے۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً لڑکوں کو مشاہدۂ اشیاء کی غرض سے باہر بھی لے جایا جاتا ہے۔

دار العلوم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس نے عربی ادب کیجانب خصوصیت سے توجہ کی۔ اس لئے کہ ادب ہماری تعلیم کی حقیقی روح ہے۔ قرآن و حدیث کے بیشتر خزائن و علوم اس کے اندر مدفون ہیں۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ہندوستان میں اسی فن کی جانب نسبتاً کم توجہ کی گئی۔ چنانچہ دار العلوم نے فن ادب پر خاص زور دیا تاکہ طلباء فصاحت و بلاغت کے ساتھ صحیح عربی لکھ پڑھ سکیں۔ دار العلوم کا یہ طریق تعلیم قدیم عربی مدارس کے ارباب حل و عقد کے لئے ایک عجوبۂ روزگار بن گیا اور اس وقت ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دار العلوم ندوہ کے طلباء کو عام جلسوں میں عربی زبان میں فی البدیہہ تقریر کرتے اور برجستگی سے گفتگو کرتے دیکھا۔ اس سے عام لوگ بہت متاثر ہوئے اور خصوصیت سے ندوہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

دار العلوم ندوہ میں عربی ادبیات کے ساتھ تاریخ ادب بھی پڑھائی جاتی ہے تاکہ ادب کے متعلم کے سامنے عہد جاہلیت سے آجتک کے تمام ادبی تغیرات آجائیں۔

دار العلوم کی ایک خاص چیز یہ ہے کہ اس نے اپنے نصاب تعلیم میں دینیات کی تعلیم پر خصوصیت سے زور دیا ہے۔ علوم اسلامیہ کی درس و تدریس کا اصل مقصد قرآن پاک تھا لیکن عام طور پر معقولات اور فلسفہ مطمح نظر بنکر رہ گئے۔ قرآن اور علوم قرآن بالکل نظر انداز کر دئے گئے۔ اسی چیز کو مدنظر رکھتے ہوئے دار العلوم نے عربی ادبیات کے بعد قرآن پاک کی جانب خاص طور پر توجہ کی اور معانی و مطالب اور تفسیر و ترجمہ کے لحاظ سے اسے مختلف ادوار میں تقسیم کر دیا اور ایسی کتابیں خصوصیت سے داخل درس کی گئیں جن میں علوم قرآن سے بحث کی گئی ہے اور بالخصوص وہ جن سے قرآن پاک کا اعجاز ثابت ہو جیسے "اعجاز القرآن باقلانی" وغیرہ۔

دار العلوم نے اپنا طریقۂ تعلیم بہت حد تک فطری رکھا ہے اور ہر فن کو تین ادوار میں تقسیم کر دیا ہے۔ سب سے پہلے وہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جنمیں سلیس زبان میں نفس مسائل مذکور ہوں۔ دوسرا دور ان کتابوں کا ہے جن میں مسائل کے ساتھ ان کے دلائل بھی واضح طور پر بیان کئے گئے ہوں۔ اور تیسرا دور ان کتابوں کا آتا ہے جن کی عبارت دقیق اور پیچیدہ ہو تاکہ متعلم میں دقت نظر اور مشکل عبارتوں کے سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن پاک کی تعلیم بھی اسی ترتیب سے دی جاتی ہے۔

سب سے پہلے قرآن مجید کا تشریحی ترجمہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد علمی انداز میں تعلیمی مسائل پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے اور پھر اس کے بعد مفسرین کی کاوشیں اور ان کی تحقیقات انہی کے الفاظ میں بتائی جاتی ہے۔ بالکل یہی ترتیب حدیث کی تعلیم میں بھی رکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں خاص کوشش یہ کی جاتی ہے کہ متعلم میں ذاتی تحقیق و جستجو کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے۔ اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ پر خصوصیت سے زور دیا جاتا ہے اور طلباء کو اسلامی عہد سے متعلق سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور تمدنی مسائل سے آگاہ کیا جاتا ہے تاکہ وہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان پر غور کر سکیں اور اس عہد نو کی تشکیل میں ماضی کے ان تجربوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یونین "الاصلاح"

طلباء کو ذہنی و فکری تربیت کے لئے علمی ادبی مجلس "الاصلاح" قائم ہے جس کے تحت تمام علمی ادبی اور تفریحی مشاغل انجام پاتے ہیں۔ اس انجمن کا تمام انتظام طلباء کے ہاتھ میں ہے اور انہی کے نمائندے انتظام کرتے ہیں۔ ہر سال نئے انتخابات ہوتے ہیں اور ایک نئی مجلس انتظامیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ "ناظم" اس انجمن کا سب سے بڑا عہدہ ہے اور اس کی امداد و اعانت کی غرض سے متعدد عہدے دار ہوتے ہیں۔ انجمن کے پاس اپنا ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں اردو کی تقریباً تمام اہم مطبوعات موجود ہیں۔ کتابوں کے ساتھ پرانے اخبارات و رسائل کے فائل بھی موجود ہیں۔ اس کتب خانہ کے علاوہ ایک "ریڈنگ روم" بھی قائم ہے جس میں اردو، انگریزی، عربی اور فارسی کے تمام موقر جرائد و مجلات آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلامی ممالک کی سیاسیات سے واقفیت کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

مصر کے مشہور روزنامہ "البلاغ" کے علاوہ (جو سارے عالم اسلامی کی کیفیات اور واقعات کا حامل ہوتا ہے) افغانستان، عراق، شام، حجاز، الجزائر اور ٹیونس وغیرہ کے اخبارات بھی آتے ہیں تاکہ براہ راست ان ممالک کی سیاسیات پر گہری نظر پڑ سکے۔ طلباء اپنی مشق کے لئے خود بھی قلمی رسائل و اخبارات نکالتے ہیں۔ عربی اردو کی تقریروں کے لئے ہفتہ وار جلسے بھی ہوتے ہیں جن میں مختلف عنوانات تقریریں کی جاتی ہیں۔ ان جلسوں میں اکثر اساتذہ بھی شرکت کرتے ہیں اور بعض اوقات خود بھی حصہ لے لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں باہر کے مشاہیر اور ماہرین فن کو بھی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے خیالات سے طلباء کو مستفید کر سکیں۔

دار العلوم ندوہ نے تکمیل فن خاص (ایم۔ اے) کی کلاس بھی قائم کی ہے تاکہ طلباء اپنی طبعی مناسبت کو دیکھ کر دو سال کے عرصہ میں کسی ایک فن میں مہارت تامہ حاصل کر سکیں جس سے انھیں طبعی مناسبت ہے۔

دار الاقامہ

دار العلوم ندوہ نے طلباء کے قیام کے لئے ایک عالیشان دار الاقامہ تعمیر کرایا ہے۔ یہ دار الاقامہ

"شبلی ہوسٹل" کے نام سے موسوم ہے۔ ہوسٹل کے اندرونی انتظامات کے لئے نگراں مقرر ہیں جو طلباء کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ ہوسٹل میں لڑکوں کی تقسیم عمروں کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ بڑے چھوٹے اور متوسط عمر کے طلباء کو علیحدہ علیحدہ کمروں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ متعدد استاد مقرر ہیں جو شب و روز ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ اور پورے انہماک و توجہ کے ساتھ طلباء کی ذہنی صلاحیتوں کو ترقی دینے کی فکر میں مصروف رہتے ہیں۔ شبلی ہوسٹل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں رہنے والے طلباء کے باہمی تعلقات دوستی کی حد سے گذر کر یگانگت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور یگانگت کا یہ رشتہ تعلیمی زندگی ہی میں نہیں بلکہ عمر بھر قائم رہتا ہے۔ ایک "ندوی" خواہ دنیا کے کسی حصہ میں کیوں نہ ہو دوسرے "ندوی" کے لئے اپنی آغوش ہمیشہ وا رکھتا ہے۔

ندوہ کے اس نظام تعلیم سے گزشتہ تیس چالیس برس کے عرصہ میں جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں ان کے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری سا معلوم ہوتا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں ندوہ کے تربیت یافتہ "فرزند" موجود ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔

رموز و اسرار

دنیا کی فضا سے مسکراتا ہوا جا
جینے والوں کے دل بڑھاتا ہوا جا
وہ ترکِ وطن تھا اور یہ عزمِ وطن
روتا ہوا آیا تھا تو گاتا ہوا جا

نعمت ایک باد آ سکتی ہے
دل میں امید مسکرا سکتی ہے
احسان شناس ہے تو سو غم تیرے
اک صبح کی تازگی بھلا سکتی ہے

انسان کی زندگی کو شرماتے ہیں
خوش خوش آتی ہیں خوش چلے جاتے ہیں
پھولوں میں نہ جھگڑا ہے کوئی اور نہ فساد
کھلتے ہیں مہک دیتے ہیں مرجھاتے ہیں

کیا کیجیے نگاہ عارفانہ لیکر
چلتا ہے مجھے ساتھ زمانہ لیکر
دم بھر جو تردد میں قدم رکتا ہے
قسمت بڑھتی ہے تازیانہ لیکر

چڑھتی ہوئی دھوپ دم میں ڈھل جاتی ہے
گردوں کی طرح نظر بدل جاتی ہے
پھرتی ہی زمیں ہے جیسے اس طرح نہ چل
یہ پاؤں سے بھی کبھی نکل جاتی ہے

نجم آفندی

دار العلوم ندوۃ العلماء

دار العلوم ندوہ اے مرکزِ ترقی
گہوارۂ علوم دینی و فکرِ عصری

اے مہد علم و حکمت۔ سر چشمۂ ہدایت
اے گلشن ذہانت اے محفلِ فطانت

تو نے ہمیں سکھایا دانش فروز ہونا
تو نے ہمیں بتایا۔ ہنگامہ سوز ہونا

اسلاف کے علوم و حکمت کا رازداں ہے
تو اس جہاں میں گویا اک باغ بے خزاں ہے

ماضی کی نکتہ سنجی۔ ماضی کی نکتہ دانی
افکارِ اہلِ مغرب۔ با صد ضیا فشانی

اسلام کی نظر سے تو نے دکھائے ہم کو
اسرارِ علم و دانش تو نے بتائے ہم کو

رازی کا رازِ پنہاں۔ بحتری کا فخرِ حکمت
یعقوب کا تخیل۔ فارابی کی فطانت

بغداد و قرطبہ کے پُرنور کارنامے
ہم نے تری بدولت عصرِ رواں میں دیکھے

ہندوستاں میں جتنے اربابِ علم و فن ہیں
وابستہ ہیں وہ تجھ سے یا تیرے ہم سخن ہیں

شبلی کی روحِ علمی رگ رگ میں تیری جاری
اے مرکزِ سلیماں۔ ہر چیز تجھ پہ واری

ہندِ جدید میں ہے از ہر کا ہم نوا تو
امت کا راہبر تو۔ ملت کا رہنما تو

بخشی ہے تو نے ہم کو فکر و نظر سلف کی
پائی ہے ہم نے تجھ سے گویا خبر سلف کی

ندوہ کا نام روشن ہو بزمِ زندگی میں
پنہاں ہے اپنا رازِ علم و عمل اسی میں

اربابِ علم و دانش تابندہ باد یا رب
دار العلوم ندوہ۔ پائندہ باد یا رب

علم و عمل کی رو سے یہ گھر ہے ہمارا
ندوہ ہر اک طرح سے از ہر ہے ہمارا

محمود الحسن قریشی

اُردو اور سائنس

۲

رضی الدین صدیقی

اصطلاح بناتے وقت اس امر کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ اس لفظ کے مرکبات اور مشتقات آسانی سے حاصل ہو سکیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ لفظ (Axiom) کے لئے آپ نے بہار کمیٹی کی سفارش پر اصطلاح "آپ سچ" اختیار کر لی۔ اب بتائیے کہ اس کی جمع کیسے بنائی جائے گی (Axiomatic Method.) اور (AXiomatisation) کے لئے کیا الفاظ ہوں گے۔ غرض وضع اصطلاحات کے موقع پر ایسے ہی باریک نکتوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود اگر اردو اصطلاحوں پر مشکل اور غیر مانوس ہونے کا الزام برقرار رکھا جائے تو پھر میں عرض کروں گا کہ یہ الزام دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں پر بھی اسی طرح عائد ہوتا ہے۔ مثلاً انگریزی میں ایک اصطلاح (Transversal.) ہے اگر ایک لکیر کسی دائرے کو کاٹے تو اس لکیر کو دائرے کی (Transversal.) کہتے ہیں حالانکہ انگریز سائنس داں اس کو (Casser) بھی کہہ سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریزی زبان ہو یا جرمن اور فرنچ صرف معدودے چند اصطلاحیں ایسی ہیں جو شاید عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ سے مطابقت رکھتی ہیں ورنہ بے شمار اصطلاحیں عام زبان سے بالکل مختلف ہیں اور سائنسی ادب میں یہ عمل بالکل ناگزیر ہے۔

غرض عربی اور فارسی سے علمی اردو میں استفادہ نہ کرنے کا جو رجحان آج کل عام طور پر پیدا ہو گیا ہے، وہ اردو کی فطری ترقی اور تقاضوں کے حق میں سراسر ناانصافی ہے۔ ماہرین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ ہندی فارسی اور عربی، اردو کے اہم اور بنیادی ترکیبی عناصر ہیں اس لئے کہ اصطلاحوں کے بناتے وقت سب سے پہلے انہی زبانوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ہندی زبان سے شروع سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ اردو کی قدیم ترین سائنسی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی الفاظ کو اصطلاحات کے سلسلے میں مناسب حد تک شروع ہی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اور یہی طریقہ دہلی کالج اور علی گڑھ سوسائٹی کے علاوہ آج کل جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو میں بھی رائج ہے۔

بقول میر حسن صاحب "اگر اردو زبان اپنی علمی اور سائنسی ضرورتوں کو پورا کرنے کے سلسلے میں ہندی سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی زبان کا سرمایہ زیادہ تر عشق و عاشقی کے محدود مضامین، مناظر فطرت کی عکاسی، ہندو تصوف و فلسفہ اور روزمرہ کی عام باتوں تک محدود ہے اور ہندی میں علمی اور سائنسی ضرورتوں کو پورا کرنے والے لفظوں کی بہت کمی ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے کہ انگریزی زبان ابتداء میں ترجمہ کے دور سے گزر رہی تھی تو اس نے سائنسی اور علمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ویسی زبان یعنی اینگلو سیکسن سے زیادہ لاطینی اور یونانی زبان سے استفادہ کیا۔ اینگلو سیکسن زبان سے زیادہ استفادہ اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس زبان کا سرمایہ تخیلی اور رومانی ادب، شعر و شاعری اور روزمرہ تک محدود تھا۔

غرض میری رائے میں سائنسی اور علمی اردو کی تشکیل اور ترقی کے لئے عربی اور فارسی سے مناسب استفادہ ناگزیر ہے۔ اور اگر مصنوعی طور پر ان کے استعمال کو ممنوع قرار دیا جائے تو ہماری علمی زبان خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکے گی اور ملک کو ہمیشہ انگریزی یا دوسری غیر زبانوں کا محتاج رہنا پڑے گا۔

ایک اور اعتراض اردو اصطلاحوں پر یہ کیا جاتا ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی یا فارسی کے لاحقے اور سابقے لگائے گئے ہیں اور یہ طریقہ غلط ہے اور اس قسم کے بہت سے لفظ جیسے پان دان اگال دان وغیرہ موجود ہیں۔ اگر نئی اصطلاحیں بھی اسی قدیم اصول پر بنائی جائیں تو کیا مضائقہ ہے دوسرے یہ کہ ہر زبان میں وسعت اسی طرح پیدا کی جاتی ہے کہ مختلف زبانوں سے ضروری لفظ لے لئے جائیں۔ چنانچہ جدید کوانٹم نظریے میں انگریزی سائنسدانوں نے جرمن اصطلاح (Eigenwert) کا ترجمہ اپنی زبان میں (Engenvalve) کر لیا یعنی جرمن لفظ (Eigen.) کو انگریزی لفظ (Value.) سے ملا کر ایک لفظ بنا لیا۔

غرض علمی زبان کی تشکیل میں اردو ٹکنیکل اصطلاحوں کے بناتے وقت نہ صرف مختلف علوم و فنون کی واقفیت بھی ضروری ہے اور جامعہ عثمانیہ کے علاوہ انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو، جامعہ ملیہ وغیرہ میں انہی اصولوں پر کام ہو رہا ہے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں یہ زبان لوگوں کو قدرتی طور پر نامانوس سی معلوم ہوئی لیکن اب یہی اصطلاحات اخباروں رسالوں اور کتابوں کے علاوہ ریڈیو میں بھی استعمال ہونے لگی ہیں اور جب انگریزی زبان کی مرعوبیت دور ہو جائے گی اور اردو ہندی کے تعصبات سے نجات ملے گی تو اس وقت جامعہ عثمانیہ کی زبان سارے ملک میں تعلیمی زبان کی حیثیت سے عام ہو جائے گی۔ ہندوستان میں آئے دن اردو کی جو کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے بہت کم کسی علمی معیار

کو پورا کرتی ہیں ان کی حیثیت سراغ رسانی کے ان افسانوں کی سی ہوتی ہے جن کو لوگ ریل کے سفر میں یا چھٹی کے دن محض وقت کاٹنے اور دل بہلانے کی خاطر پڑھتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ اس قسم کی کتابوں کی قطعی ضرورت نہیں، لیکن ان کا تناسب ہمارے ادب کی مجموعی پیداوار میں اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہئے جتنا کہ ایک سنجیدہ انسان کی زندگی میں تفریح کے اوقات کا ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے اخباروں اور رسالوں کا ہے۔ یوں تو اردو کے بیسیوں نئے اخبار اور رسالے نکلتے رہے ہیں لیکن دو چار کے سوا ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کسی ترقی یافتہ قوم کے رسالوں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ بعض اس قسم کی کتابوں اور رسالوں کی بنا پر ہماری زبان اور ہمارے ادب میں ترقی نہیں ہو سکتی۔

کسی شخص کی عمر نوحؑ کی طرح اتنی طویل تو نہیں ہوتی کہ وہ طبع ہونے والے تمام رطب و یابس کو پڑھ سکے۔ اس مختصر زندگی میں کوئی انسان صرف چند منتخب کتابیں ہی پڑھ سکتا ہے اور اس لئے اعلیٰ معیار کی چند کتابوں کا شائع کرنا ناقص معیار کی بہت سی کتابوں کے شائع کرنے سے بہتر ہے۔ مصنفین کے علاوہ ناشرین کو بھی چاہئے کہ جب تک کوئی تصنیف یا تالیف نہایت اعلیٰ معیار پر پوری نہ اترے اس کو شائع نہ کیا جائے۔ پرانی اور فرسودہ باتوں کو دہرانا اپنے اوقات ضائع کرنے کے علاوہ سننے اور پڑھنے والوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اچھا مصنف بننے کے لئے زبان پر مہارت کے علاوہ تین چیزیں نہایت ضروری ہیں

(۱) مشاہدہ (۲) مطالعہ (۳) غور و فکر بدقسمتی سے ان تینوں اجزا کی ہم میں بہت کمی ہے اور اس کمی کی وجہ سے ہماری تقریریں اور تحریریں ایک لایعنی طومار ہو کر رہ جاتی ہیں جن میں چند خیالات کی تکرار اور بار بار تکرار کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ ادب اور شاعری میں بڑا عنصر غیبی الہام اور القا کا ہوتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ شاعر اور ادیب تو کجا پیغمبروں پر بھی الہام اسی وقت ہوتا ہے جب وہ پہاڑ کے غاروں میں اپنی عمر کا بڑا حصہ سوچ بچار میں صرف کر دیتے ہیں۔

بہر حال جس طرح محض افراد کی تعداد سے کوئی قوم بلندی کے مدارج طے نہیں کر سکتی اسی طرح محض کتابوں کی تعداد میں اضافہ سے کوئی زبان اور ادب ترقی نہیں کر سکتا۔ پھر اس کے لئے محض افسانوں یا نظموں کی کتابیں کافی نہیں بلکہ شدید ضرورت ہے کہ ہماری زبان میں ہر قسم کی علمی، فنی اور سائنسی کتابیں اعلیٰ سے اعلیٰ معیار کی اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں شائع ہوں۔ کسی ترقی یافتہ قوم کی زبان مثلاً جرمن، فرنچ یا انگریزی ہی کو لیجئے۔ اس زبان میں بھی معمولی افسانوی اور نظموں کی کتابیں کافی تعداد میں چھپتی ہیں لیکن کیا کوئی سمجھ دار شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس زبان کی اس قدر عالمگیر اہمیت محض ان افسانوں اور نظموں کی وجہ سے ہے۔ دنیا کے ہر خطہ میں رہنے والوں کی ایک کثیر تعداد جو اس زبان کو سیکھتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس زبان میں تاریخ، معاشیات، فلسفہ، عمرانیات، ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، انجنیئری، طب، قانون، فن تعلیم وغیرہ تمام علوم و فنون کی بیش بہا اور بلند پایہ کتابیں زیادہ شائع ہوتی ہیں۔ اگر ہم اردو زبان کے معیار کو بلند کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہئے کہ اردو میں اعلیٰ درجہ کی علمی اور فنی کتابیں کثیر تعداد میں شائع کریں جن میں سے بعض ماہرین اور محققین کے لئے ہوں اور بعض عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے۔

اگر پورے ہندوستان کے باشندے نہیں تو کم از کم دس بارہ کروڑ ہندوستانی تو ضرور اردو لکھ پڑھ سکتے ہیں اور بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ جرمن اور فرانسیسی بولنے والوں کی تعداد ابھی اس قدر نہیں لیکن اس کے باوجود یہ زبانیں جیسی کچھ ترقی یافتہ ہیں اس سے کم و بیش سب لوگ واقف ہیں۔ اگر ہمارے ملک کی معاشی اور تعلیمی حالت اچھی ہو تو ہماری زبان کو بھی اس کے ہم پلہ بننے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی لیکن ملک سے جہالت اور پستی کو دور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ علم کی روشنی کو عام کیا جائے اور علوم و فنون کی مختلف کتابوں کا جال سارے ملک میں بچھا دیا جائے۔ اگر یہ کتابیں مسلمہ ماہرین کی لکھی ہوئی ہوں اور اچھے پیرایہ میں لکھی جائیں تو لوگ ان کو ایسی دلچسپی سے پڑھیں گے جیسے آج کل افسانوں کو پڑھتے ہیں۔ یہ ہمارا چشم دید واقعہ ہے کہ انگلستان میں سر جیمس جینس اور سر آرتھر ریڈنگٹن کی کتابیں افسانوں کی کتابوں سے زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔ حالانکہ ان مصنفوں نے جدید ترین سائنسی انکشافات کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح ہمارے جلسوں اور کانفرنسوں میں علمی مضامین کو بیش بیش جگہ دینے سے دو گونہ فائدے حاصل ہوں گے۔ اول تو یہ کہ اردو زبان میں ہر قسم کے جدید ترین علمی خیالات کے اظہار کی صلاحیت پیدا ہوگی، دوسرے یہ کہ اس سے خود اہل ملک کی ذہنیت میں بڑا انقلاب ہوگا یعنی آج کل نظموں اور افسانوں کو پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے جو غلبہ جذبات کا ان کے دل و دماغ پر ہو گیا ہے اس کی بجائے وہ زیادہ معقولیت پسند ہو جائیں گے۔ اور اس طبعی کائنات کی حقیقت سے بھی انہیں واقفیت ہو جائے گی۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سائنسی ذہنیت کی ہم میں بہت کمی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے اکثر افراد جو تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے ہیں شاعری اور لفاظی میں گم ہو جاتے ہیں۔ علوم و فنون سے ہماری ناواقفیت کا یہ عالم ہے کہ معمولی سے معمولی ایجاد یا انکشافات بھی ہمارے نزدیک ایک خطرہ سے کچھ کم حیرت انگیز اور ناقابل فہم نہیں۔

(باقی صفحہ ۲۵ پر)

کچھ غزل کے بارے میں

محمود اکبرآبادی

(۱)

غزل کے بنیادی عناصر کی تلاش کے لئے، پہلے لفظِ غزل کے لغوی معنی اور پھر صنفِ شعر کی حیثیت سے، غزل کے تاریخی ارتقا پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

غزل کے لفظی معنی، راز گفتن بہ معشوق ہیں۔ غزلیہ شاعری فی الجملہ جذباتی شاعری ہے اور جذبات کے دائرے میں ذاتی تجربے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے غزل کا موضوع بہت وسیع ہے۔ وہ سارے رموز و تاثرات، وہ تمام مسائل و مباحث، جن سے کوئی فرد واحد دوچار ہوسکتا ہے اور جن پر وہ اپنے ذہنی ماحول اور علمی ساز و برگ کے حدود کے اندر، اپنی محبوبہ سے گفتگو کرنا چاہے، غزل کا موضوع بن سکتے ہیں۔

حقیقی تغزل، اصل میں ہلکی پھلکی، پیاری پیار، لطیف اور نازک باتوں کا نام ہے جو دل سے نکل کر بالراست دل تک پہنچتی ہیں اور پہنچتی ہوئی محسوس بھی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ، بہت سے محسوسات، بہت تجربات کا جی پر بوجھ سا ہوتا ہے۔ ان کی موجودگی سے جیون بھاری بھاری محسوس ہوتا ہے۔ ان کے کہہ ڈالنے سے جی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے، بھڑاس سی نکل جاتی ہے، دل کی تھکن سی اتر جاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ خود اپنے نفس میں ان کے کہہ ڈالنے کی شدید خواہش بیتاب معلوم ہوتی ہے اور ان کے کہہ ڈالنے سے خود بہ خود مزہ بھی آنے لگتا ہے۔ اس بوجھ کے اتار دینے کا ایک ادبی نام (Self-Realisation.) بھی ہے اور یہی تغزل کا مترادف ہے لیکن تغزل کا اقتضا یہیں تک محدود نہیں، بسا اوقات، یہ عظمت و وقار، دقت و عمق، تفکر و تصور کا مطالبہ بھی کرتا ہے، اور ان تمام منازل و کوائف میں رومانیت کی ایک لہر، جمال پرستی کا ایک خفیف شائبہ ضرور شامل ہوتا ہے۔ ان سب سے بالاتر سچی واقعیت ہے۔ رومانیت قلب پر یکسر چھا جاتی ہے، لیکن سچی واقعیت کو رومانیت پر یہ فوقیت ہے کہ وہ قلب انسان کو اس مقام پر کھینچ لاتی ہے جہاں دل سجدہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں، سچی رومانیت، خود بیرنگ واقعیت کا دوسرا نام ہے۔ بہرحال، اگر ہلکا پھلکا تغزل، جوہی اور چنبیلی کی بھینی بھینی بو کے پروں پر سوار کر کے، فضا میں لے اڑتا ہے تو گمرا تغزل، جو میر اور غالب کے بیشتر اشعار میں میسر آتا ہے، یونانی حزنیہ کی طرح، تصفیۂ باطن کا موجب بن جاتا ہے۔

اب رہا، غزل کا تاریخی ارتقا، تو اس موضوع پر دو حیثیتوں سے بحث ہوسکتی ہے۔ ایک غزل کی ظاہری اور دوسری اس کی باطنی صورت۔ شعر کی ظاہری صورت کے لئے، میں ہمیشہ پیکر کا لفظ استعمال کرتا ہوں۔ اس مقالے میں بھی یہ لفظ یعنی پیکر، انگریزی لفظ (Form.) کے مترادف کے طور پر بار بار استعمال ہوا ہے۔ (Form.) کے لئے ہیئت کا استعمال، میرے خیال میں غلط ہے۔ اس کی ایکسپیشن یا ادفتادہ وجہ یہ ہے کہ "ہیئت" ایک علم کا نام ہے اور مدت مدید سے علمی اصطلاح کے طور پر رائج ہے۔ اس لئے ہیئت کے استعمال سے ذہن میں وہ تصور بیدار نہیں ہوتا جو انگریزی شعری اصطلاح (Form.) کے اندر مرکوز ہے اور جو اس کے ذریعے سے پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

بیان اپنے مرکز سے ہٹ گیا۔ بہرحال، یہاں غزل کے تاریخی ارتقا سے بحث ہے۔ اس سلسلے میں پہلے غزل کے پیکر کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

غزل کا پیکر، مدت ہوئی عربوں نے وضع کیا تھا جو ایران کے واسطے سے ہندوستان تک پہنچا۔ رسمی بحریں تعداد کے لحاظ سے انیس ہیں اور زحافات کی مدد سے زیادہ ہو جاتی ہیں اور غزل چند بحروں کے علاوہ جو صرف عربوں کے لئے مخصوص ہیں، سب ہی بحروں میں کہی جاسکتی ہے۔ استادوں کے کلام میں کم و بیش سب ہی بحروں کے پیکر میسر آجاتے ہیں۔ بہر عنوان سترہویں صدی کی ابتدا سے، بیسویں کے وسط تک غزل کے پیکر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ولی نے اپنا غزلیہ کلام جس پیکر میں پیش کیا تھا، عہد حاضر کا متنزل غزل گو بھی اپنا کلام اسی پیکر میں پیش کر رہا ہے۔

غزل کے پیکر میں تغیر نہ ہونے کا خاص سبب ہے جو اردو فن شعر کے اصولوں سے وابستہ ہے۔ اردو شعر کے بعض اصناف، بعض بحروں سے تو ضرور وابستہ ہیں، مثلاً یہ کہ مثنوی اور رباعی کے لئے بحریں مخصوص ہیں لیکن کوئی موضوع، کسی خاص پیکر سے مربوط نہیں۔ کہانی اور مرثیہ، مثنوی اور مسدس سے بہ ظاہر مربوط نظر آتے ہیں لیکن یہ رابطہ لاینفک یا لازمی نہیں ہے۔ تاریخ اس لزوم کا بطلان کرتی ہے۔ نظیر نے کہانیاں، مثنوی کے پیکر کے علاوہ، دوسرے پیکروں میں بھی پیش کی ہیں۔ بیسویں صدی کے پہلے ربع میں، چکبست نے رامائن کا ایک سین، مسدس کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ سودا کے مرثیے مربع یعنی چو مصرعے ہیں اور حالی نے، غالب کی نوحہ خوانی کے لئے ترجیع بند کا پیکر تجویز کیا ہے۔

غزلیہ صنف سخن، بیشک، ایک خاص پیکر میں پیش ہوتی رہی ہے لیکن وہ محسوسات و تاثرات، وہ انفرادی تجربے اور مشاہدے، وہ حقائق و معارف، جن کا نام تغزل ہے، غزل کے روایتی اور مروجہ پیکر کے علاوہ، مثلث، مربع، مخمس اور بعض دوسرے پیکروں میں

بھی بیان ہوئے ہیں۔ بعض استادوں نے مثنوی اور قصیدے کے متن میں غزل پیش کی ہے۔ تضمین جس نوع بیان کا نام ہے وہ بھی کوئی مختلف پیکر، اختیار کر سکتی ہے اور تضمین عموماً غزل ہی کی ہوتی ہے۔

ایک پہلو تو یہ ہوا، دوسرا رُخ یہ ہے کہ غزل کا روایتی پیکر، تغزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن کا بھی حامل ہے۔ مثلاً یہ کہ سہرا عموماً غزل کے پیکر میں کہا جاتا ہے۔ ہجو، واسوخت اور شہر آشوب جیسے موضوعات کے لئے غزل کا پیکر اکثر استعمال ہوا ہے۔ قصیدہ خود، غزل کے پیکر کی ایک طولانی صورت ہے۔

تو جب غزل کا پیکر، تغزل سے اور تغزل کسی خاص پیکر سے ناقابلِ انفکاک رشتے وابستہ نہیں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان میں نفسِ شعر کو پیکر سے اتفاقی علاقہ ہے، لازمی علاقہ نہیں۔

چنانچہ ظاہر ہے کہ اردو غزل کے پیکر میں تین صدیوں کی مدت میں بھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ ارتقا فطرت کا مطالبہ ہے۔ ہر ذی حیات شئے کو، جہد للبقا میں، ماحول سے مطابقت کرنی پڑتی ہے ورنہ وہ فنا ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ اصول اس ماحول میں نافذ ہے جہاں، فرد یا جنس، کی فطرت ارتقا کا جواز پیدا کر دیتی ہے۔ اگر بطون شئے خود مطابقت کا مطالبہ نہ کرے تو ارتقا کے منازل و مراحل پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ غزل کے پیکر میں، اس کی اتفاقی حیثیت کے باعث، کسی تغیر کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لئے زمانے کا امتداد اس میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکا۔

انیسویں صدی کے شعری سماج میں بات بات پر سند کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں شاعروں کی اس خُو نے علالت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ رام پور کے دبستان میں یہ مرض، اپنی انتہائی شدت کے ساتھ خیال کی آزادی پر چھایا نظر آتا ہے۔ بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں ہم نے ذہنی غلامی کے بہت سے بت توڑ ڈالے ہیں، پابندیوں کی بہت سی بیڑیاں کاٹ دی ہیں، لیکن بعض مشرقی بیڑیاں پاؤں سے نکل، ہاتھوں کی مغربی ہتکڑیاں بن گئی ہیں۔ آج، مرعوب کرنے کے لئے مغربی ادیبوں اور مغربی نقادی کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔ اس نوع کے حوالے اعتدال اور دیانت کے ساتھ بالکل جائز اور قابل قبول ہے لیکن جہاں ان کا بے جا اثر، مشرقی شاعری کو مشرقی انفرادیت اور مشرقی کیف و رنگ سے محروم کرتا نظر آئے، اس کا ٹھکرا دینا ضروری ہے۔ تنقید، وہ تنقید ہے جو فطری اور داخلی ہو اور جو ادب و شعر کے بطون سے پیدا ہو کر توازن کا اہتمام برقرار رکھے۔

چنانچہ غزل کو مغربی نقادی کے اصولوں سے پرکھنا، غزل کے مزاج کی سچی تشخیص نہیں ہے۔ غزل، خالص مشرقی صنف ہے۔ اور بحیثیت مغربی نقادی کے کانٹے پر نہیں تولی جا سکتی۔ جس طرح بعض مغربی دوائیں ہندوستانی مرض کی خُو پر کارگر نہیں ہوتیں اور بعض مغربی لذائذ اور مشروبات مثلاً سارڈن اور بیئر، ہندی ذوق و طبیعت سے فی الفور مطابقت نہیں کرتے اور ان کا مذاق کوشش سے پیدا کرنا پڑتا ہے اسی طرح نقادی کے وہ اصول، جو مغرب کے ادب کے نفس سے پیدا ہوئے ہیں، غزل کا پورا پکا جائزہ نہیں لے سکتے۔

حُریتِ خیال کا جو اصول ہم نے مغربی نقادی سے سیکھا ہے، اسی کا مطالبہ ہے کہ، ہم خود اپنے طور پر، جانچیں کہ آیا پیکر کی وہ بحث جو خالص مغربی ادب سے متعلق ہے، مشرقی شاعری پر صادق آتی ہے یا نہیں اور غزل کے پیکر کی لطافت و نزاکت اس بحث کا بارگراں برداشت کر سکتی ہے یا نہیں۔ انگریزی ادب میں، پیکر کا بیان سے خاص علاقہ ہے انگریزی فورم (پیکر) لفظوں کی ترتیب اور بیان کے اسلوب کو متاثر کرتا ہے۔ پیکر، بیان کو اور بیان موضوع کو متاثر کرتا ہے۔ ہر موضوع ہر بیان سے اور ہر بیان، ہر پیکر سے مطابقت نہیں کرتا۔ اس لئے ہر موضوع ہر پیکر میں بیان نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ فن کی روایت بھی، اس نوع کے تداخل میں حائل ہے۔ لیکن اردو شعر کی دنیا میں، بیان، پیکر سے اس حد تک متاثر نہیں ہوتا اور پیکر اور موضوع کے درمیان اتنے موانع حائل نہیں جتنے انگریزی ادب میں ہیں۔ اس لئے پیکر اور موضوع کا رابطہ بھی اتنا شدید نہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ اردو کی غزلیہ شاعری کے باب میں، ارتقا کا اصول، حقیقت میں پیکر پر نہیں بلکہ موضوع پر نافذ ہے۔ ہمارا معاشری اور سیاسی ماحول، نفس غزل سے اب تغیر کا مطالبہ کرتا ہے اور ارتقا کی قہری قوت، غزل کے موضوع کو برابر متاثر کر رہی ہے۔ پیکر میں تغیر، تناقض کا مترادف ہے۔ جبریہ تغیر ایک نیا پیکر ضرور خلق کر سکتا ہے جو غزل کا پیکر نہ ہوگا اور خود غزل کے پیکر کی موت کا باعث ہوگا۔ اس نوع کی تباہ کاری جسے اصطلاح میں (   ) کہا جاتا ہے، صناعت یا آرٹ کی تاریخ میں کبھی جائز نہیں سمجھی گئی۔

پیکر کے ذکر کے بعد اب میں اردو غزل کے موضوع کا ذکر چھیڑتا ہوں۔ موضوع سے، میرا وہی مفہوم ہے جو عموماً لفظ "مضمون" کے استعمال سے ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں غزل کی لفظی صورت کے لئے "پیکر" اور معنوی کے لئے موضوع استعمال کرتا ہوں۔ غزل کا موضوع وسیع ہے، بہت وسیع ہے اور اتنا وسیع کہ حیات، کائنات اور ماورائے حیات و کائنات، اس کے ظرف امکان میں سما سکتے ہیں۔ اس کا بلند، ملاءِ اعلیٰ کو چومتا ہے اور اس کا پست، حضیض زمین کی گہرائی میں لوٹتا نظر آتا ہے۔ شاعری کا وہ عنصر جس کو جدید نقادی آفاقیت کے نام سے موسوم کرتی ہے، غزل کی فطرت سے ہم آہنگ ہے اور بہ آسانی غزل کے قالب میں سمویا جا سکتا ہے۔

اس کا موضوع نہ صرف عالمگیر وہمہ گیر کو محیط ہے، نہ صرف ان رموز کا مترادف ہے جن کی صداقت ازلی وابدی ہے بلکہ ایسا دریا ہے جو کوزے میں بھی بند کیا جاسکتا ہے۔ پھیلاؤ کو مختصر اور اشارتی بنانا، آرٹ کا منتہائے کمال ہے اور غزل کے موضوع، آرٹ کی اس قدرت سے پورا استفید ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ اردو زبان کا سرمایہ شعر وسخن، اتنا حقیر وفرومایہ نہیں، جتنا بعض حلقوں میں سمجھا یا بعض دائروں کی طرف سے بتایا جاتا ہے۔ یہ ذہنیت، کمتری کا شدید احساس ہے اور ذاتی لاعلمی اور بے اعتنائی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہمارے بہت سے تعلیم یافتہ حضرات کو اردو ادب کا اگر علم ہے تو سطحی ہے اور عرفان تو بالکل نہیں۔ اس کے علاوہ ہم میں سے بعض کو، ٹین کے ڈبے کی مچھلی تازے جہاشیر سے زیادہ لذیذ معلوم ہونے لگی ہے۔ ہم اپنے اخلاق کے محاسن کو اغیار کی کسوٹی پر کس کر، کھوٹے کھرے کا فرق سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری محرومی ہے اور سیاسی غلامی سے بدتر لعنت ہے۔ غزل کے باب میں بھی ہمارے بہت سے فیصلے، مغربی نقادی کے بے محل انطباق کی پیداوار ہے۔ غزل کے موضوع کے اجزاء اپنی لطافت اور پاکیزگی کے لحاظ الہامی وو ہی ہیں اور ان شعری قدروں کے حامل ہیں جو انسانی مشاہد اور تجربے کے ذخیرے میں منفرد کہی جاسکتی ہیں۔ ان میں عمومیت بھی ہے اور خصوصیت بھی ہے، وہ اجتماعی قلب اور واحد قلب دونوں کی روئداد ہیں اور اپنی اپنی جگہ، دونوں پر صادق آتے ہیں۔ غزل کے موضوع میں شاعرانہ اور فلسفیانہ قدروں کے علاوہ انسانی قدریں بھی معتد بہ مقدار میں شامل ہیں۔

جس وقت اردو زبان کے یہ اشعار زبان پڑھے جاتے ہیں:۔

کہتے ہو کہ غیر کو نہ چاہا ہو — معلوم ہوا کہ تم خدا ہو

میں تری یاد میں ہوں او کافر — مسجدوں میں نماز ہوتی ہے

دامن دوست کا خیال شام الم جنوں ہے — اشک غم آ کہ پونچھ لیں، اپنی ہی آستین بھی

تو فرشتے عرش پر ساز بجاتے ہیں اور حوریں رقص کرتی ہیں۔

آخری شعر میں جذباتی شاعری کا پورا کیف واثر، ذاتی تجربے کے عناصر کے ساتھ سمویا گیا ہے اور ان سب سے بالاتر حسن بیان کی پوری قوت موجود ہے۔

غزل میں تسلسل کا سوال، پیکر اور موضوع دونوں سے متعلق ہے لیکن بیشتر موضوع سے علاقہ رکھتا ہے۔ اول تو یہ الزام غلط ہے کہ اردو شاعری میں مسلسل غزلیں، بڑی تعداد میں میسر آتی ہیں۔ اقبال اور جوش نے اس خصوص میں نظیر کا اتباع کیا ہے۔ دوسرے غزل میں تسلسل کا فقدان عیب نہیں، ایک حسن ہے جو غزل کی فطرت سے پیدا ہے اور اس کی نوعی خصوصیت ہے: ہمیں غزل کو اس کی حدود وتعینات اور اس کی جلب وقبول کی قوت کے دائرے کے اندر جانچنا چاہیئے۔ تسلسل، نہ صرف غزل کے فن سے انحراف کا نام ہے بلکہ غزل کی صناعانہ نفاست اور اس کے پیکر کے ہلکے پھلکے پن کے بھی منافی ہے۔ غزل کا ہر شعر فی نفسہ ایک واحدہ (   ) ہے، ایک عالم اصغر ہے، آرٹسٹ کی پیدا کی ہوئی ایک چھوٹی سی دنیا ہے، جس کی صنعتی وحدت زائل دینے سے، اس کی یکتائی، اس کا اچھوتا پن، اس کا جمال، زائل ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اس کے علاوہ، فن کے اعتبار سے بھی، ہمیں اس تحریف وتصرف کا حق حاصل نہیں، غزل کا ہر فرد، ایک مکمل نفسیاتی تجربے، ایک بسیط مطالعے، ایک وسیع مشاہدے کے نتائج کا حامل ہوتا ہے اور غور وفکر کے لئے غذا بہم کرتا ہے۔ وہ ایک نوع کا صنعتی اشارہ، ایک قسم کی نفیس علامت ہے جو ذہن کو بیدار وہشیار کردیتی ہے اور جس کی مدد سے مجرد حقائق کے وسیع میدانوں کی سیر ممکن ہے، وہ ایک لوح ہے جس کے نقوش کی رہنمائی سے، قلب کائنات کے رموز وحکم کا انکشاف ممکن ہے، وہ ایک شمع ہدایت ہے جس کی روشنی سے زندگی کے غیر محدود وبے پایاں مگر تاریک اور اندھیرے صحراؤں کی وسعت وپہنائی میں راہ مل سکتی ہے۔ جس طرح ماء اللحم کا ایک جرعہ بہت سے مفید وحیات پرور لطیف نشاط آور اجزا کی روح ہوتا ہے، اسی طرح، غزل کا ہر شعر، اپنے پس منظر کا پورے عالم کو محیط ہوتا ہے:۔

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب کا یہ مقطع، ایک پوری زندگی کے تلخ تجربے کا نچوڑ ہے۔ جن حضرات کو، ہارڈی کی مشہور ہیروئن (   ) کی زندگی کے پے در پے ناکامیوں، اور اندھی، گونگی، بہری فطرت کی بے ہنگام اور پرستم ظرافت کا علم ہے، وہ جانتے ہیں کہ غالب نے ایک پوری داستان، ان دو مصرعوں میں سمو دی ہے۔ شالامار کی نئی تصویر، من کی جیت میں، جو ٹیس (   ) کی کہانی سے، بنائی گئی ہے، (   ) یا آرسی کی زبان سے، جوش کا یہ گیت "دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی" غالب کے محرک خیال کا پرتو اور اسی کے انداز بیان کا سچا انعکاس ہے۔ جب ایک پوری واردات محبت، ایک پوری روئداد حیات، ایک شعر میں، اس قدرت سے بیان ہوسکتی ہے تو تسلسل کی اتنی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ محض، اس کے فقدان پر غزل کے آرٹ کو نامکمل اور تشنہ ٹھہرا دیا جائے۔

اس کے بعد، اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ غزل کی صنف، اپنے پیکر کی اہلیت اور موضوع کی پہنائی کے اعتبار سے مستقل اور مکمل ہے تو بیجا نہ ہوگا (باقی آئندہ)

اُردو اور سائنس

بقیہ صفحہ ۲۲

مختصر یہ کہ ملک کی فضاء حد درجہ غیر سائنسی ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سرکاری اور خانگی طور پر علمی اور فنی تحریروں اور تقریروں کی ایسی قدر افزائی نہیں کی جاتی جس کی وہ مستحق ہیں۔ اگر ہماری زبان اور ادب کے معیار کو بلند کرنا ہے تو پھر ان تمام اقدار کو بھی بدلنا پڑے گا اور علوم وفنون کو شعر وسخن کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت دینی ہوگی۔

غزل

شفیق کوٹی

تمہارے درد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
محبّت کو مرادِ کاروانِ دل سمجھتے ہیں
نہیں زیبا ہمارا شکوہ سنج بے رخی ہونا
یہ سوچا تھا کہ دل ہی دل میں شکوہ حسن کا کر لیں
وہ کیا جانیں وہ کیا سمجھیں کسی پر کیا گزرتی ہے
بنا ڈالا سراپا دردِ آلامِ محبت نے
حرم ہو دیر ہو یا ہو کلیسا یا ہو بُت خانہ
حوادث سے جہاں بھی کشتیٔ عمرِ رواں ڈوبے
انھیں کی روشنی میں ڈھونڈ لیں گے وہ تمہیں اک دن
انھیں جب توڑتا ہے کوئی تو دل ٹوٹ جاتا ہے
تمہارے عشق کو پروردگارِ دل سمجھتے ہیں
وفا کو ہم فقط گردِ رہِ منزل سمجھتے ہیں
یہ کیا کم ہے وہ ہم کو جور کے قابل سمجھتے ہیں
مگر مشکل تو یہ ہے وہ زبانِ دل سمجھتے ہیں
جو بسمل ہیں وہی دردِ دلِ بسمل سمجھتے ہیں
جہاں پڑتی ہیں اٹھتی ہے اسی کو دل سمجھتے ہیں
جہاں درشن تمہارے ہوں وہیں منزل سمجھتے ہیں
اسی ہنگامۂ طوفاں کو ہم ساحل سمجھتے ہیں
جو دیوانے مآلِ داغ ہائے دل سمجھتے ہیں
شفیق ان بند کلیوں کو ہم اپنا دل سمجھتے ہیں

اداؤں نے مارا

بڑی خیریت ہو گئی زندگی کی بڑھاپے نے بخشا کچھ آکر سہارا
رہا وقفِ الفت جوانی کا عالم نگاہوں نے تاکا اداؤں نے مارا
بہت کوششیں کیں بہت ہم نے چاہا بہت پاؤں پیٹے بہت زور مارا
رہے سطح پر ہم نہ ڈوبے نہ اچھلے نہ حاصل ہوا بحرِ غم سے کنارا
کلیجے نے بھی چوٹ پر چوٹ کھائی جگر چھن گیا دل ہوا پارا پارا
ستم کی نظر نے تو ناوک بھی پھینکے کرم کی نگاہوں نے کیا تیر مارا
اسی کے سبب ہیں مرے ہوش قائم اسی کا ہے صدقہ جو میں جی رہا ہوں
تری یاد کو دل سے کیونکر نکالوں کہ ہے یہ مری زندگی کا سہارا
مریضِ محبّت کا عالم جو دیکھا تو اٹھے یہ کہہ کر مسیح و اطبا
نہیں اس کے بچنے کا اب کوئی نقشا نہیں کوئی جز موت اب اسکا چارا
نہ رکھو قیامت پر انکو اٹھا کر نہ جانے قیامت میں ہو کیا قیامت
یہ دنیا کے جھگڑے ہیں دنیا میں طے ہوں یہیں فیصلہ ہو ہمارا تمہارا
یہ کیا مجھ کو سوجھا یہ کیا ان کو سوجھی جو بیٹھے بساطِ محبّت بچھا کر
برابر کی بازی لڑی بھی برابر نہ وہ مجھ سے جیتے نہ میں انسے ہارا
نہ کچھ اور رودادِ غم ان کو لکھیں جو لکھیں تو خط میں یہ ہم انکو لکھیں
ستم تو جو ہونے تھے وہ ہو چکے سب کرم اتنو کیجیے ہم پہ کیجیے خدارا
یہ مانا نئے تم ہو دنیا نئی ہے مگر بات کچھ اہلِ ماضی کی بھی ہے
آزل رنگِ بازارِ الفت یہی ہے یہاں نفع ویشتر ہے خسارا

آزل شاہجہانپوری

غزل

جو ہے مری نگاہ میں حسن کا وہ جہاں ہے اور
دسترس نظر سے دور وہ کوئی آسماں ہے اور
تیرا خیال ہے غلط بات ہی راز داں ہے اور
تیرا گمان کچھ بھی ہو میرا مگر گماں ہے اور
میں تو قفس نصیب ہوں۔ تجھ کو خبر ہے ہم صفیر
جس پہ گری ہیں بجلیاں کیا کوئی آشیاں ہے اور
جس کی بہار ہو خزاں۔ داغ ہی جس کے پھول ہوں
دل کے سوا جہان میں کیا کوئی گلستاں ہے اور
بڑھتی ہیں اور الجھنیں دل کو نہ کشمکش میں رکھ
صاف بتا پیامبر! مجھ سے وہ بدگماں ہے اور
اس میں وہ دل کشی کہاں اس میں یہ بے لسی کہاں
قصۂ عشق اور ہے حسن کی داستاں ہے اور
دیر و حرم کا امتیاز مٹنے نہ پائے عشق میں
سجدۂ شوق ہے روا جس پہ وہ آستاں ہے اور
لے تو چلا ہے ساتھ ساتھ جذبۂ بےخودی مجھے
راستہ میرا اور ہے جادۂ کارواں ہے اور
درد کی جستجو نہیں۔ سوز کی آرزو نہیں
آج تو دل کا حال ہی رمزیؔ ناتواں ہے اور

رمزی بھوپالی

ہندوستان

میں

ہوائی جہاز

ی جہازوں سے متعلق ایک
سنائی کارخانے میں ایک
ف انسٹرکٹر «کیٹیلینا»
اڑن کشتی کے انجن پر
ں بیٹھا دو ہندیوں کو
انجن کی ساخت اور
رزوں کا طریقۂ عمل سمجھا
رہا ہے۔
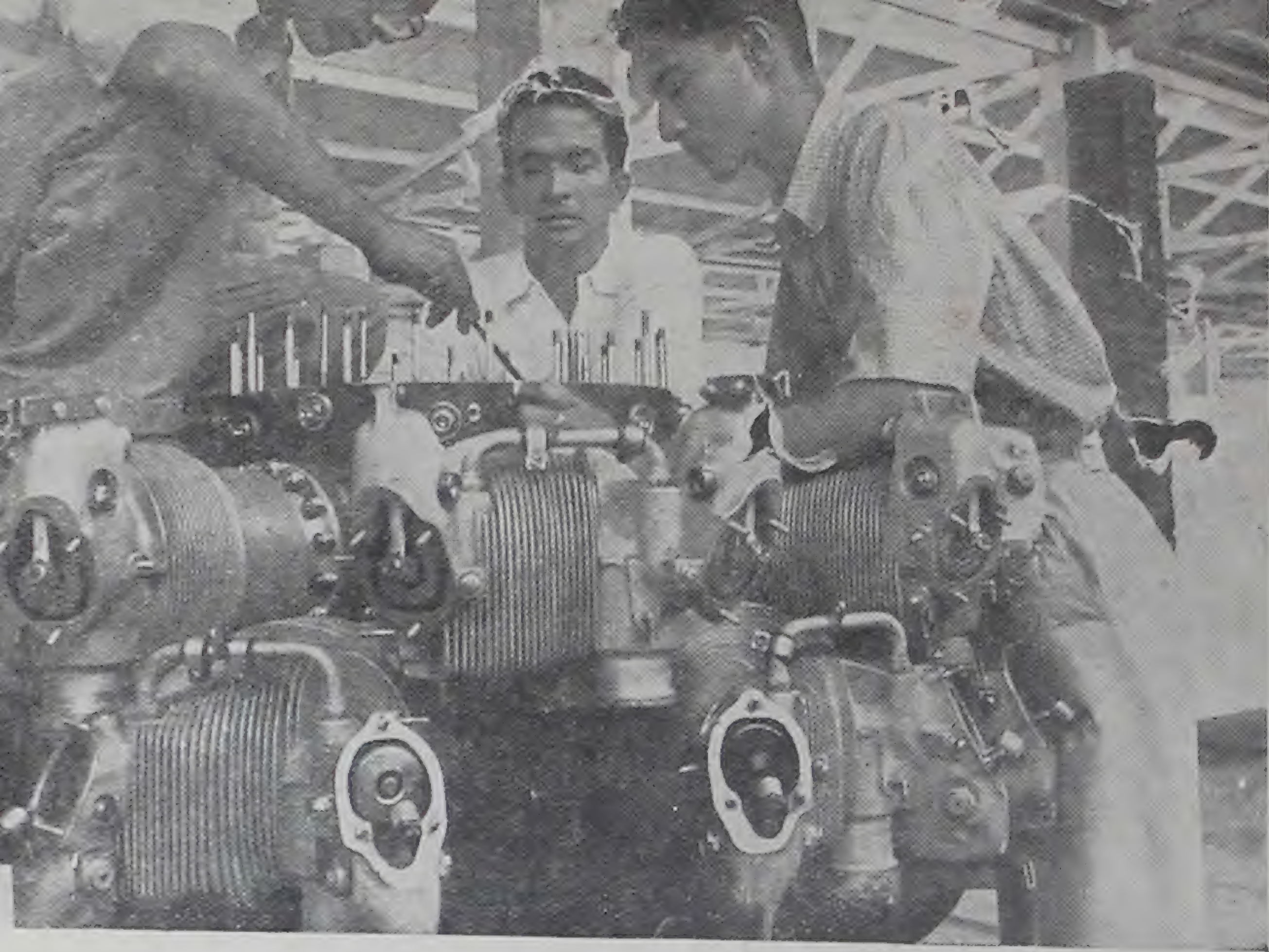
ہندوستان میں ہوائی جہازوں کی صنعت نے دوران
میں جنم لیا اور بڑی تیزی سے فروغ پانا شروع کر دیا۔ سر
اور نجی کارخانے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں
گئے۔ پہلا جہاز بھی ۱۹۴۱ء میں بنایا گیا۔ ان تمام کارخ
نے اتحادیوں کی بڑی مدد کی' خصوصاً ان ہوائی فوجوں
جنہوں نے اپنے مورچے ہندوستان میں لگا رکھے تھے
کارخانے مرمت' جڑائی اور دیکھ بھال کے فرائض انجام دیتے
اگرچہ ماہرفن کاریگروں کی بڑی کمی تھی اور صحیح اوزا
نایاب تھے تاہم ان کارخانوں نے بہت سے فالتو پرزے وغیرہ
ڈالے جن میں وہ خاص قسم کی ٹنکیاں بھی ہیں جن کو
سامان سے تیار کیا گیا ہے۔ اب آڑائی ختم ہوچکی ہے لیکن

ـ کاریگر جہاز کے اندرونی حصے میں ایک پیچ کس رہا ہے۔

انوں کو بند کرنے کی بجائے زیادہ وسعت دینے کے خاکے
کئے جارہے ہیں تاکہ ضروریات عامہ کو پورا کرنے کے
فضائی محکمہ اچھی طرح ترقی پاسکے۔

ڑا کا ہوائی جہاز میں [illegible] اور [illegible] لگائی جا رہی ہیں۔

دارالعلوم ندوۃ العلما

۱۸۹۲ء میں کانپور کے مشہور مدرسے "فیض عام" کا جلسہ ہو رہا تھا اور بہت سے علما جمع تھے۔ اس وقت سب نے اس زبردست کمی کو محسوس کیا کہ ہمارے ملک میں دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی طرح کوئی ایسی بڑی درسگاہ نہیں ہے جسے مذہبی تعلیم و تنظیم کا مرکز قرار دیا جاسکے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ حاملان مذہب و ملت اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلئے کمربستہ ہوگئے اور لکھنؤ شہر سے باہر ایک پر فضا اور پرسکون مقام پر "ندوۃ العلما" کے نام سے ایک درسگاہ کی بنیاد رکھدی اس میں تمام مذہبی موضوعات پر اعلی تعلیم شروع ہوگئی۔ اب اس ادارہ کا انتظام ایک مجلس کے سپرد ہے جو پچھتر ارکان پر مشتمل ہے۔ درسگاہ کے دارالاقامہ میں تقریباً ہر حصۂ ملک کے طلبا رہتے اور فیض علمی حاصل کرتے ہیں۔ مفصل مضمون اسی شمارے کے صفحہ ۱۷ سے ملاحظہ کیجئے۔ صفحہ ۲۰ پر ندوہ سے متعلق ایک نظم بھی شریک اشاعت ہے۔

درسگاہ کی شاندار دومنزلہ عمارت

✡
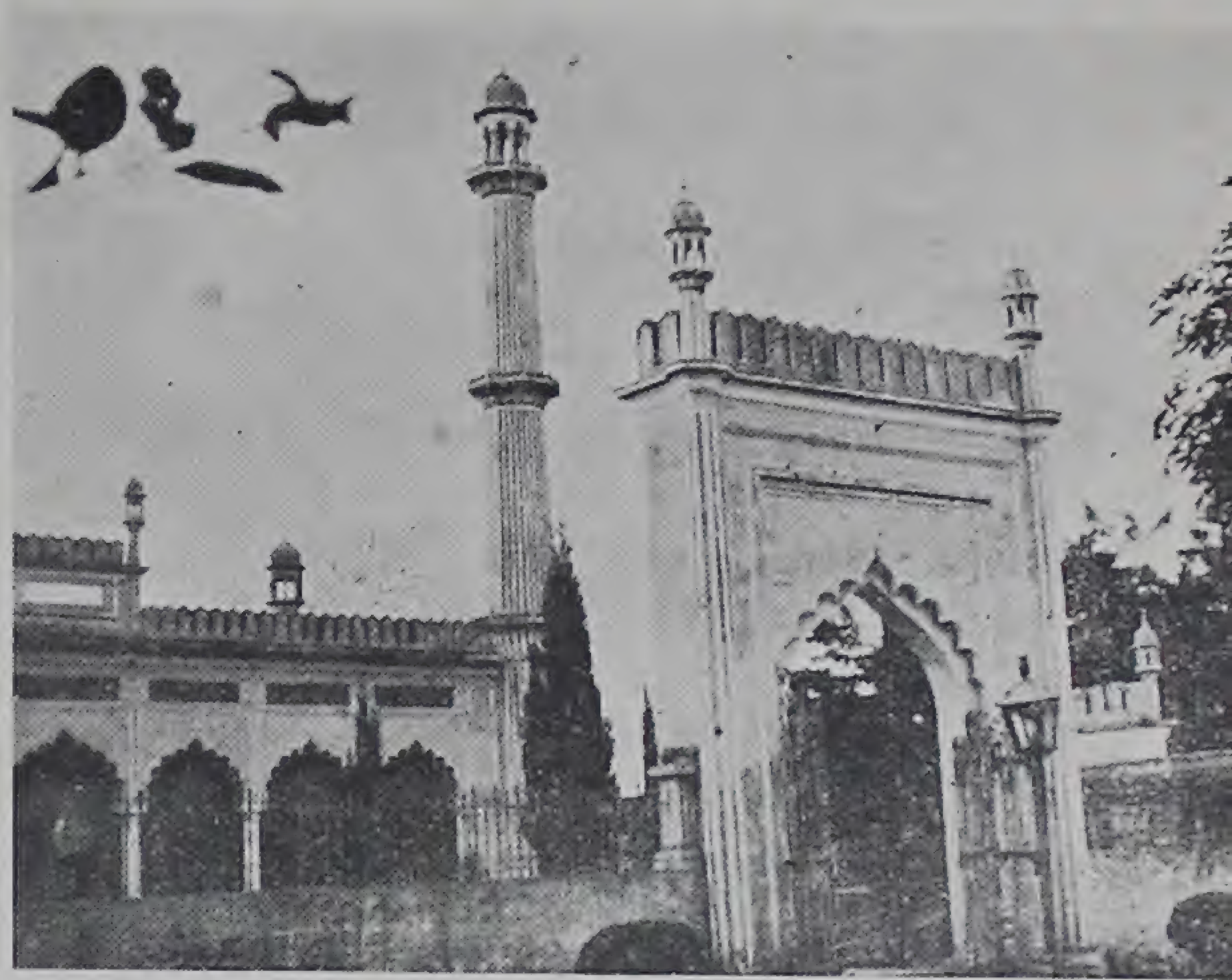
شاہی مسجدوں کے نمونے پر بنی ہوئی مسجد جو دارالعلوم کی عمارتوں کے درمیان واقع ہے۔

✡

✡

عمارتوں کا ایک اور خوشنما منظر ... ہے

میونسپل کمیٹی کی شاندار عمارت۔

سندھ کا صدر مقام - کراچی

ہندوستان کے مغربی ساحل پر کراچی صوبہ سندھ کا صدر مقام اور مشہور تجارتی بندرگاہ ہے۔ تجارت کے سلسلے میں یہاں مختلف قوموں کے لوگ حتیٰ کہ عرب اور ایرانی بھی کثیر تعداد میں آباد ہیں۔ عہد قدیم میں بھی شرق وسطیٰ کے تمام ممالک کے ساتھ ہندوستان کی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ موتیوں کے تاجروں سے لیکر گھوڑوں کے سوداگر تک ہر قسم کے کاروباری آدمی یہاں نظر آتے ہیں۔ یہاں بہت بڑا فضائی اڈا پہلے سے قائم ہے۔ اب ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی تجویز بھی زیر غور ہے۔ شمالی

—:o:—

ہند کیلئے جتنا بھی غلہ بیرونی ممالک سے آتا ہے اسی بندرگاہ پر اترتا ہے۔ یہاں روئی کی بہت بڑی منڈی ہے۔ اس شہر کی آبادی تقریباً پانچ لاکھ ہے۔

—:o:—

اس عمارت کے اندر روئی کی زبردست

انہلواں ڈوکربوں میں اناج بھٹکتے وقت کسان عورتیں بڑے بڑے ہیٹ اوڑھ لیتی ہیں تاکہ چہرے نیز دھوپ سے بچے رہیں۔

خشک صحرا میں ایک شاداب مرغزار

حضرموت میں نیویورک جیسے اسکائی اسکریپر۔
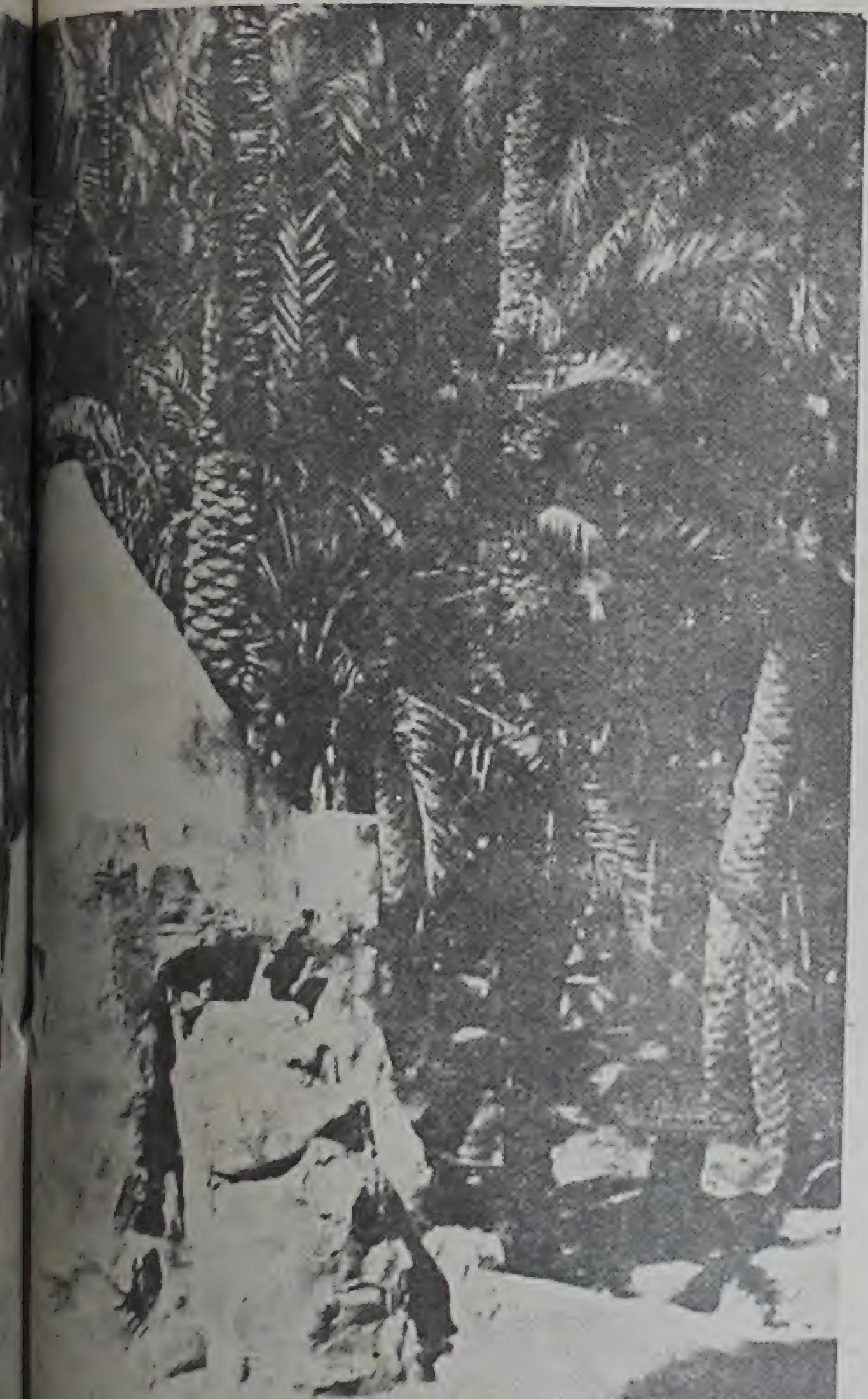
حضرموت

کے جنوب میں حضرموت ایک مشہور مقام ہے۔
نیا کے اس حصے میں بھی اونچے اونچے اسکائی اسکریپر
ں عربی طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس وادی
ے سیاح گذرے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کا انکشاف حال
ک کی تصویروں اور تحریروں سے ہوا ہے۔ اس
نہی کی ایک کتاب سے لی گئی ہیں حضرموت کے
یم زمانے کا ایک شاداب شہر صیبون اب بھی موجود
کھیتوں اور کھجور کے باغوں سے پٹا پڑا ہے۔ اس
من و عافیت کی فضا قائم رہتی ہے۔ لوگ اطمینان سے
ونکہ یہاں کے حکمراں سلطان علی کو پوری طرح
نہ صرف غلام فرمانبردار ہیں بلکہ بدو لوگ بھی
ہیں۔ شاہی محل میں ایک عالیشان ایوان ہے جسکی
ستونوں اور نرم غالیچوں نے دوبالا کر رکھی ہے۔

شاداب کو کھجور کے درختوں نے گھیر رکھا ہے۔

ایک خوبصورت بچی اپنے بہترین لباس میں۔

جوار کے کھیتوں میں کسان عورتیں بڑے بڑے نکیلے ہیٹ سر پر اوڑھے اور ڈھیلے ڈھالے نیلے لباس زیب تن کئے نظر آتی ہیں۔ سرراہ کھجوروں کے زیر سایہ پانی کے ایسے بہت سے حوض نظر آتے ہیں جن پر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گنبد پاس سے گذرنے والے پیاسوں کو فوراً دعوت کام ودہن دینے لگتے ہیں۔ عورتیں چھوٹی چھوٹی صراحیاں سروں پر اٹھائے ڈھیلے ڈھالے نیلے لباس پھڑکاتی ہوئی ایک قطار میں آتی اور پانی بھر بھر کر لے جاتی ہیں۔ دلہنیں اپنی روایتی شان کے مطابق اونٹوں پر بیٹھ کر سسرال جاتی ہیں لیکن دولہا نئی وضع کی موٹرکار کو ترجیح دیتے ہیں۔

لکڑی کے کھلونے

ہندوستان میں کھلونے بنانے کا فن گھریلو صنعت کے طور پر قدیم ترین زمانے سے برابر فروغ پاتا رہا ہے۔ آجکل بھی بنارس، لکھنو اور میسور کے بنے ہوئے کھلونے ہر شہر کے بازاروں میں خوب بکتے اور پسند کئے جاتے ہیں۔ چونکہ بچے مٹی اور ٹین کے مقابلہ میں لکڑی کے کھلونے زیادہ پسند کرتے ہیں اسلئے اس صنعت کو وسیع پیمانے پر اختیار کرنے کیلئے بہت سے کارخانے کھل گئے ہیں جہاں سینکڑوں کاریگر صبح سے شام تک نت نئی وضع کے ایسے کھلونے بناتے رہتے ہیں جو ملک کے لاکھوں بچوں کی خوشی اور دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ عام طور پر لکڑی کے کھلونوں پر لاکھی رنگ چڑھاتے ہیں لیکن بعض کی سطح اتنی چکنی اور دیدہ زیب بنادی جاتی ہے کہ کسی قسم کے رنگ و روغن کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

لکڑی کی ان گھوڑا گاڑیوں پر روغن چڑھایا جارہا ہے۔ سب سے پہلے سفید رنگ کی تہ چڑھائی جاتی ہے۔
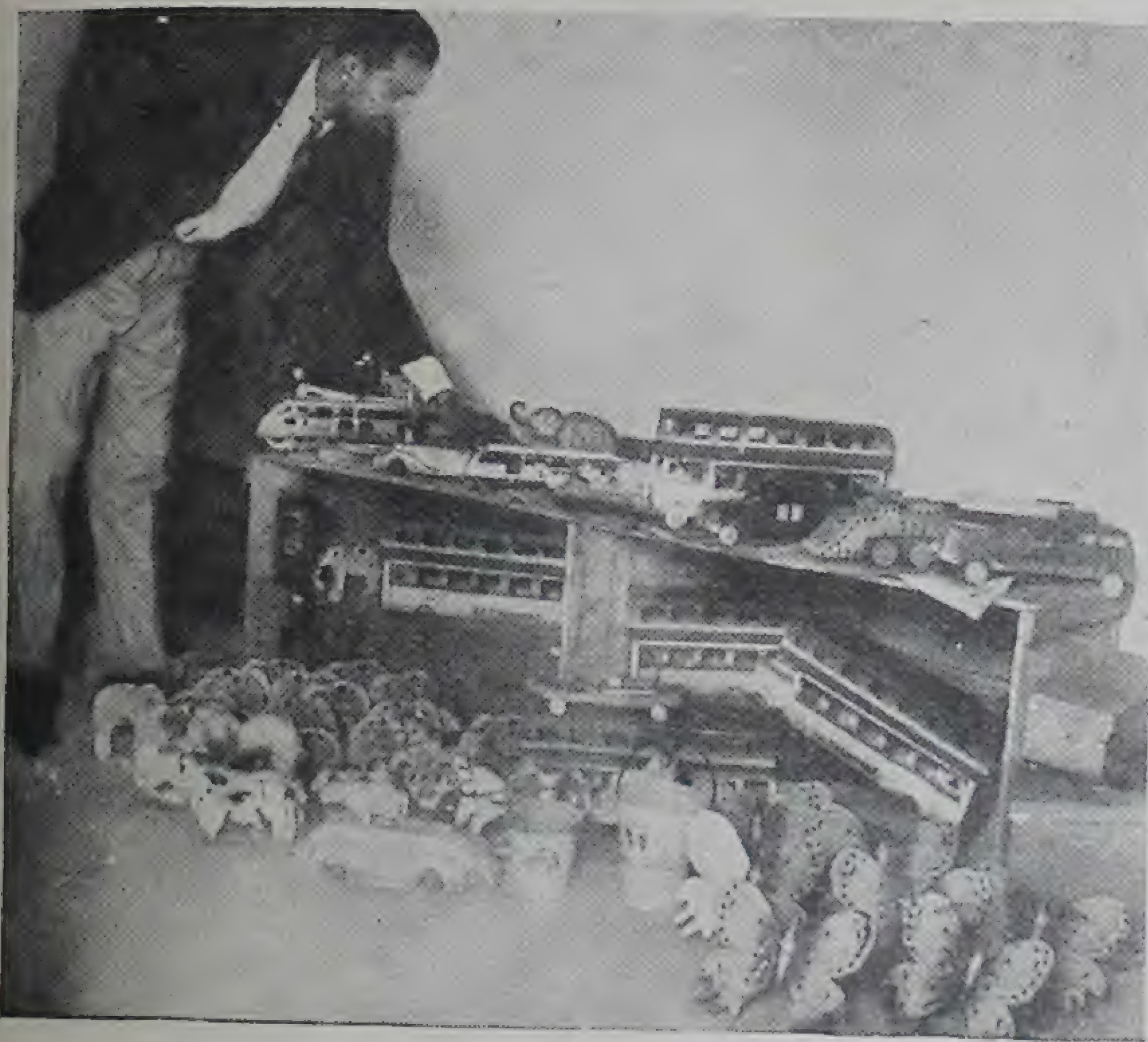
اس تصویر میں ایسے کھلونے دکھائے گئے ہیں جو تک سے سک تیار ہوچکے ہیں۔

رنگ و روغن ختم ہونے کے بعد کیلیں، پیچ اور تار

قفقاز

قفقاز ایشیائے کوچک کا ایک مشہور تاریخی ملک ہے۔ پریوں کی اس سرزمین میں جو سیاح بھی ایک بار پہنچ گیا وہاں ہر چیز پر مائل ہوکر رہ گیا۔ سر سبز و شاداب پہاڑ، تیزی سے بہتے ہوئے صاف و شفاف دریا اور کھلے میدانوں کے قدرتی مناظر ہر شخص کا دل موہ لیتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں کے راستے مشکل اور

پسانور کے مقام پر سڑک کے بالکل قریب چند دیہاتی عورتیں اور لڑکیاں دم لینے کے لئے رک گئی ہیں۔

✡

دشوار گذار تھے لیکن اب وسیع اور ہموار سڑکیں بن گئی ہیں جن کے ذریعہ پڑوسی ملکوں کے ساتھ اسکا سلسلہ قائم ہوگیا ہے باشندے زیادہ تر کاشتکار ہیں لیکن وہ زراعت کی جدید ترین مشینوں سے کام لیتے ہیں، حتی کہ بیج کے طور پر چاول ہوائی جہازوں کے ذریعہ بویا جاتا ہے۔

✡

پہاڑی علاقے کا رہنے والا ایک دیہاتی اپنی بیوی سمیت طفلس آکر سرراہ لگی ہوئی دوکان سے کچھ چیزیں خرید رہا ہے

قفقاز کے پہاڑوں کا ایک دلکش نظارہ۔ ←

لینا - ایک فلمی ستارہ۔

عزائم

حرماں خیرآبادی

مٹا دیں آپ کو گو لاکھ ہم الفت کی راہوں میں
مگر فطرت کو ملتا ہے مزہ کچھ رزم گاہوں میں

پس از خلد بریں انجام آدم اور کیا ہوتا؟
بڑی مشکل سے پائی عافیت، وہ بھی گناہوں میں!

بہت در پردۂ ارض و سما ان کو نہاں پایا،
تجسّس ہے بلا، رہنے لگے آخر نگاہوں میں!

دل عاجز نہ ہو ممنون کیوں کر اس کی قدرت کا
مجھے بخشی گئی، جو تمکنت ہوتی ہے شاہوں میں!

ہمیں ناقص سمجھنے والے رضواں پر یہ واضح ہو
کہ وہ انسان گم ہے فکر کی دشوار راہوں میں

پہونچتی تو نظر کیوں کر پہونچی حسن بستاں تک
یہاں تو ذوق کامل ٹھہرا خزاں کی خیر خواہوں میں

زمانے کو بہ لطف یک نظر جنت بنا دیتا
بشر ہی تھا، الجھ کر رہ گیا کلفت کی راہوں میں

مسرت کے تمنا دار! یوں تو غم بری شے ہے
چھلک جاتے ہیں اکثر شکر کے جذبات آہوں میں

گذر آہستہ اے تاراج گر! آثار ہستی سے
یہ کشتے سو رہے ہیں دامن دل کی پناہوں میں!

عروس زندگی عالم میں ہوئی بے پردہ گی ایسی
کہ آخر میکدے کھلنے لگے پھر خانقاہوں میں

یہ نجم و مہر و مہ سب صدقۂ نوع بشر ہوں گے
ابھی تو چند ہیرے جگمگاتے ہیں کلاہوں میں

عزائم بھی گذر جائیںگے برسے کی طرح حرماں
موانع گو پہاڑوں کی طرح حائل ہیں راہوں میں

غزل

اقبال عظیم

مجھے خبر نہ تھی، احساس زندگی کی قسم
کہ روٹھ جاؤگے تم اپنی بے بسی کی قسم

میں اپنے غم سے بھی ہوں مطمئن، خدا شاہد
جو مجھ سے روٹھ چکی ہے اسی خوشی کی قسم

جو تیری یاد میں ٹپکا وہ اشک حاصل غم
جواب نہ آئے گی ہونٹوں پہ اس ہنسی کی قسم

فریب دیدہ و دانستہ کھا رہا ہوں میں
تری نگاہ کی معصوم سادگی کی قسم

تری تلاش میں کھو کر، میں پا گیا سب کچھ
جو مجھ کو راس نہ آئی اس آگہی کی قسم

مری نگاہ کو اب بھی ہے تاب نظارہ
نقاب اٹھا تجھے دل کی شکستگی کی قسم

یہ تو نے کیوں مجھے بیٹھے بٹھائے چھیڑ دیا
میں اپنے حال میں خوش تھا تری خوشی کی قسم

کسی کے کام نہ آئے کسی کے ہو نہ سکے
کچھ ایسے کھو گئے اقبال بے خودی کی قسم

غزل

تسکین قریشی

ابھی تک ہے یہ راز سینہ بہ سینہ
محبت میں مرنا ہے مشکل کہ جینا

نہ ہو جب تک آہوں سے آباد سینہ
محبت کی ہر آرزو بے قرینہ!

وہی عظمت زندگی سے ہیں واقف
کہ طوفاں سے گذرا ہے جن کا سفینہ

غم عشق سے زندگی، زندگی ہے
جو مرنا نہ جانے وہ کیا جانے جینا

نہ احساس طوفاں، نہ امید ساحل
نجانے کہاں جا رہا ہے سفینہ

تری آرزوئے محبت کے صدقے
مجھے آگیا زندگی کا قرینہ

کچھ ایسے بھی ساحل ہیں اپنی نظر میں
کہ آکر جہاں ڈوبتا ہے سفینہ

بڑے لطف سے دن گذرتے ہیں تسکیں
کہ اب دل کا ہر زخم ہے تا بہ سینہ

آخری دیدار

فضل نقوی لکھنوی

ستارے دھیرے دھیرے چھٹک رہے ہیں. چاند چپکے چپکے نکل رہا ہے. اُداسیاں جنگل کی گود میں پھیل رہی ہیں، فوجوں کے خیموں میں جلتے ہوئے چراغوں کا عکس دریا میں تیر رہا ہے. سورج کی گرمی جذب کئے ہوئے ذرّات دہک رہے ہیں، زبانیں چپ ہیں لیکن رن بول رہا ہے. بارہ گھنٹے کا سیاہ پردہ اٹھ جانے کے بعد وہ خونی سین پیش ہونے والا ہے جس کے لئے "تاریخ کے سادے اوراق کروٹیں بدل رہے ہیں. اگر لڑائی ملک گیری اور جاہ طلبی کے لئے ہوتی تو شاید اتنی جاذبیت اور روحانیت پیدا نہیں ہوسکتی تھی کہ بیویاں اپنے شوہروں کے. بہنیں اپنے بھائیوں کے. اور مائیں اپنے بیٹوں کے دلوں میں جنگ کرنے اور بات پر مر جانے کا طوفان پیدا کرتیں جینے کی نہیں بلکہ مر جانے کی تمنائیں کرتیں۔

جوان بیٹا! - اٹھارواں سال، ستارے سے زیادہ پیارا۔ چاند سے زیادہ خوبصورت، بڑی آنکھیں، اونچی پیشانی، چوڑا سینہ، بھرے بازو، سرخ و سفید رنگ۔ جب انگڑائی لیتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ :-

"کہکشاں ٹوٹ کے ہاتھوں پہ اتر آئی ہے"

جب سفید رنگ کے عربی گھوڑے پر بیٹھ کر نیزے کو ہوا میں گردش دیتا ہوا ماں کی نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتا ہے تو یہ نظر آتا ہے کہ چاند کے چہرے پر ہالا گھوم رہا ہے.

تیرہ سو سال پہلے آپ کے تصورات ایسے میدانِ جنگ کو دیکھ رہے ہیں جو اپنے بعض خصوصیات کے لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک جانب دولت ثروت، سلطنت، اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار فوج کا موجیں مارتا ہوا سمندر، میلوں تک آلاتِ حرب کی جگمگاہٹ، زرق برق لباسوں پہ چمکتی ہوئی سنہری روپہلی زرہوں اور دور تک پھیلے ہوئے خیموں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دوسری طرف، بہتّر انسان۔ جن میں چھ ماہ سے لے کر بارہ سال تک کے بچے اور اسّی نوّے برس کے بوڑھے بھی شامل ہیں۔ اور جنگ صرف حق و صداقت پر ہونے والی ہے !۔

اگر کسی سلطنت کا بادشاہ ذاتی عیش و عشرت میں پڑ جائے، غریبوں کی زندگی کو کڑوا بنا کر روحانیت کو مادیت سے دبا دے، مندروں مسجدوں، اور گرجاؤں کو مسمار کر دے۔ ساقیوں کی نگاہوں میں عقیدت گھوم رہی ہو اور شراب کے جام میں مذہب جھلک رہا ہو جھوٹ بولنا ہنر، زناکاریاں عام اور ظلم و تشدد واجب ہو۔ اس کے خلاف اگر چند آوازیں بھی بلند ہو جائیں تو بہت ہوتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آوازوں کو کسی مذہب کے کانوں سے سنا یا کسی قوم کی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ کیونکہ جو جنگ انسانیت کے تحفظ۔ اور حق کی بقا کے لئے ہوتی ہے اس کی حمایت ہر انسان پر لازم ہوتی ہے، خواہ اس کا تعلق کسی ملت، کسی جماعت اور کسی مذہب سے کیوں نہ ہو.

"مادرِ گرامی مجھے کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے" جوان بیٹے نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا.

"کیوں نہیں بیٹا۔ دن بھر تو گھوڑے کی زین پر کٹ گیا۔ آ میرے اندھیرے گھر کے چراغ میری آنکھوں میں سو جا" ماں نے جواب دیا۔ بیٹے نے کمر کھولی، خود، زرہ اور موزے اتارے۔ نیزے کو خیمے کے ایک کونے پر رکھ کر اس پر ڈھال رکھی اور چاہنے والی ماں کے زانو پر سر رکھ لیٹ گیا۔

تھوڑا پانی تو نہ ہوگا ؟ — بیٹے نے ماں کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا

ماں - نہیں بیٹا — بھلا، پانی کہاں۔ آج تیسری رات ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی اور تمہاری چھوٹی بہن پیاس سے تڑپ رہی ہے۔

بیٹا۔ (تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد) نیند نہیں آتی ماں۔ جب سوتا ہوں حلق کی خشکی میں سانس الجھتی ہے اور پھر آنکھ کھل جاتی ہے۔

ماں۔ کیا کروں بیٹا۔ تین دن سے مشکیزوں نے پانی کی صورت نہیں دیکھی۔ ورنہ سوچتی تھی کہ اگر کوئی گیلی مشک ہوتی تو وہی تیرے پھنکتے ہوئے سینے پر رکھ دیتی۔

بیٹا۔ ایک تو گرمی دوسرے پانی کی نایابی۔ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ میرا سینہ میدانِ جنگ کی طرح دہک رہا ہے۔

ماں۔ سو جا بیٹا۔ ممکن ہے نیند آنے سے پیاس میں کمی ہو جائے۔

بیٹا سویا تو کیا۔ بیٹھتے ہوئے دل نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر دیں۔ یا دوسرے الفاظ میں غش آ گیا۔

رات کے لمحے بڑھ رہے ہیں، ماں کی امیدیں گھٹ رہی ہیں، نوجوان بیٹا آرام کر رہا ہے، خیمے کی فضا میں سکون ہے، ماں آنکھوں میں آنسو بھرے، ٹکٹکی باندھے، نگاہیں جھکائے، ہاتھ میں شمع لئے اس چراغ کی ضو پر نظر جمائے ہے جس کو دنیا کی دوسری شام دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔ بیٹے کی زلفیں سلجھ رہی ہیں اور ماں کی قسمت الجھ رہی ہے۔ دل دھڑک رہا ہے، آنسو برس رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ماں اپنے وارث سے اپنی محبت کا واسطہ دے کر کہے کہ "جس طرح ممکن ہو میرے بچے کو چمکتی ہوئی تلواروں، اور لو دیتی ہوئی برچھیوں کی زد پر نہ بھیجو" کیونکہ ماں کی فطرت صرف یہی چاہتی ہے۔

مگر نہیں، بیٹے کی محبت جہاں نہیں دیکھی جاتی وہ "فرضِ انسانی" کی منزل ہوتی ہے۔ یعنی اگر "انسان کامل" یہ دیکھ لے گا کہ کسی جابر حکومت کے ہاتھوں میں "انسانیت" کا گلا گھٹ رہا ہے تو اس وقت !۔ نہ وہ اپنی اولاد کی فکر کرے گا، نہ گھر کو بچانے کا خیال۔ نہ اپنی جان کی پروا۔ اس کا پہلا اور آخری فرض یہ ہوگا کہ تشدّد کی مٹھی سے انسانیت کا گلا چھڑا کر اپنی گردن پیش کر دے۔

ستاروں کی آڑ۔ اور چاند کی اوٹ ہیں ناامید ماں کا چراغ کب تک جلے گا؟۔ صبح کا ستارا قضا کا پیام نے کر جگمگا رہا ہے۔ موت کی ہوا سنک رہی ہے۔ تصورات خون کی چادر میں لپٹ رہے ہیں۔ تلواروں کی ہلکی جھنکاریں فضاؤں میں پھیل رہی ہیں، ماں کی سانسیں رک رہی ہیں، دم الجھ رہا ہے۔ "اب دیکھیے کیا ہو۔ ؟۔ میرے پیدا کرنے والے میرے نوجوان بیٹے کی خیر" !۔۔۔ دل کہتا ہے شاید بچ جائے ۔ دماغ کہتا ہے کہیں لاکھوں پر بہتّر بھی فتح پاتے ہیں۔ ؟۔ دل کہتا ہے ہو سکتا ہے ۷۲ کی بات رہ جائے۔ دماغ جواب دیتا ہے ہاں بہتّر کی بات تو رہ سکتی ہے لیکن بہتّر کی جانیں نہیں رہ سکتیں اور انھیں ۷۲ میں میرا نوجوان بھی ہے۔

صبح کا آفتاب، سنہری نہیں بلکہ خونیں شعاعیں پھینکتا ہوا نکلا۔ لاکھوں کے مقابلہ میں بہتّر انسان، چھوٹی سی صف میں بڑے حوصلوں اور اونچے ارادوں کے ساتھ ایستادہ ہو گئے۔ دوپہر سے لڑائی چھڑ گئی، تیروں کی سنسناہٹ نے فضاؤں کو چونکا دیا۔ نیزوں کی چمک سے نگاہیں تلملا گئیں، تلواروں کی چھائیوں نے میدان جنگ کو آئینہ خانہ بنا دیا۔ لاکھوں اور بہتّر ؟۔ ایک ایک کو ہزاروں نے گھیر لیا۔ نیزوں کی نوکوں پر پشت ٹیک کر پیچھے نہ ہٹنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ ہزاروں لاشیں تتر بتر ہو گئیں مگر زوال آفتاب کے ساتھ ۷۲ کا چھوٹا سا لشکر بھی پراگندہ ہو گیا۔ اب تو صرف اتنے باقی رہ گئے جتنی ہاتھوں کی انگلیاں ہیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور ماں کا نوجوان بیٹا بھی۔

خیمے کا پردا لہرایا۔ ماں کے دل پر جھٹکا لگا۔ نگاہوں کے ساتھ خود بھی اٹھ بیٹھی

ماں۔ کون۔ میرا بچہ علی اکبر؟

علی اکبر۔ جی ہاں مادر گرامی۔

ماں۔ اتنی دیر میں کیوں پلٹے؟

علی اکبر۔ لڑائی چھڑ گئی تھی ماں۔ میرے بہت سے عزیز، بہت سے دوست، اور بہت سے اصحاب قتل ہو گئے۔

ماں۔ (گھبرا کر) اور تمہارے چچا عباس علمدار۔

علی اکبر۔ دریا کے کنارے آرام کر رہے ہیں۔

ماں۔ کیا وہ بھی شہید ہو گئے؟

علی اکبر۔ جی ہاں۔ اب تو میں ہوں اور یا پدر بزرگوار۔ اچھا مجھے بھی اجازت دیجیے۔

ماں۔ اجازت کیسی بیٹا؟۔

علی اکبر۔ نصرت کی اجازت، جنگ کرنے کی اجازت اور آخر میں جان دینے کی اجازت!

ماں۔ نہیں، نہیں۔ میرے بچے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی تمناؤں، آرزوؤں، اور امیدوں کو ہمیشہ کے لئے کربلا کی جلتی ہوئی خاک میں دفن کر دوں۔

علی اکبر۔ مادر گرامی غور تو کیجیے۔ جب حق پر آنچ آ رہی ہو۔ جب صداقت پامال ہو رہی ہو۔ جب انسانیت حیوانیت کے پنجوں میں دم توڑ رہی ہو۔ اس وقت صرف یہی ہو سکتا ہے کہ حقیقت کی قربانی پیش کر کے حقیقت کو بچا لیا جائے۔

ماں۔ مگر میرے بچے میں نے تجھے کبھی دھوپ میں نہیں نکالا، تیری کوئی ضد نہیں ٹالی، اٹھارہ سال آنکھوں میں رکھا۔ بھلا کس دل سے مرنے کی اجازت دوں؟

علی اکبر۔ مادر گرامی میں خوب جانتا ہوں کہ میرے سوا آپ کے دل کو سنبھالنے والا کوئی نہیں ہے۔ مگر انسانیت اور صداقت کو بچانے والا بھی میرے سوا دوسرا نظر نہیں آتا۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟۔ مجھ کو یا مخلوقِ خدا کے آرام اور زندگی کو؟

ماں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تیری جان بھی بچ جائے اور مخلوق خدا بھی ظلم و استبداد سے نجات پا جائے؟۔

علی اکبر۔ نہیں مادر گرامی۔ یہ متضاد خیالات ہیں۔ جب تک خون درخت کے تھالے میں نہیں ڈالا جاتا۔ پتوں، ڈالیوں اور پھلوں پر تازگی نہیں آتی۔

ماں۔ (گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے)۔ مگر نہیں میرے بچے دل سے مجبور ہوں۔ فطرت سے معذور ہوں۔ دنیا کی کوئی ماں اپنے بچے کو خوشی سے مرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔

علی اکبر۔ آپ بالکل سچ فرماتی ہیں۔ مگر خدا اپنی مخلوق کا بچاؤ صرف اپنے برگزیدہ بندوں ہی کے ذریعے کرتا ہے۔ آج میری نوجوانی کو خاک میں مل جانے دیجیے۔ پھر دیکھیے گا دنیا کے کروڑوں نوجوان بوڑھے ہوں گے اور مر جائیں گے۔ لیکن آپ کے بیٹے کی جوانی قیامت تک نکھرتی رہے گی۔ میں ہمیشہ جوان رہوں گا۔

ماں۔ مگر میں تیرے بعد کیونکر زندہ رہوں گی؟۔

علی اکبر۔ دیر ہو رہی ہے ماں۔ دیکھیے دیکھیے میرا باپ ہزاروں میں اکیلا ہے، سنئے سنئے میرا فرض مجھے پکار رہا ہے۔ خدا حافظ۔

ماں۔ میرے بچے۔ آخری دیدار تو دیکھ لوں؟۔

خیمہ کا پردا اٹھا کر علی اکبر نکلے۔ یا ماں کا سینہ شق ہو کر کلیجا نکلا۔ ادھر بیٹے نے کھنچی ہوئی انگڑائی لے کر گھوڑے کی باگیں سنبھالیں۔ ادھر ماں کی دل کی رگیں کھنچ کر ٹوٹ گئیں۔ خیمے کا پردا ماں کے دل کی طرح ہلتا رہا۔ اور چودھویں کا چاند فوجوں کی گھٹا میں غروب ہو گیا۔

محرم اور واقعہ کربلا کو دنیا کا ہر شخص جانتا ہے، حضرت امام حسینؑ نے تیرہ سو چار سال قبل روز عاشور حق و صداقت کا یزیدی فوجوں سے مقابلہ کر کے بچاؤ کیا تھا۔ اس دفاعی جنگ میں حضرت امام حسین نے اپنا گھر بار لٹا دیا تھا۔

حضرت علی اکبر، حضرت امام حسین کے نوجوان صاحبزادے تھے اور حضرت ام لیلاؑ ان کی والدہ معظمہ تھیں جنھوں نے حق کی بھلائی اور مخلوقِ خدا کی اچھائی کے لئے اپنی ممتا کا خیال نہیں فرمایا اور حضرت علی اکبر شہید ہو گئے۔

گرگسوں کا سماج

افسانہ

اصغر علی

یہ تو اچھی طرح یاد نہیں کہ میں پہلی مرتبہ اس سے کہاں ملا مگر یہ واقعہ ہے کہ میری اور اس کی واقفیت کوئی اتفاقیہ یا ہنگامی واقفیت نہیں تھی، کم ازکم میں اسے چار سال سے جانتا تھا، اور ان چار سالوں میں تقریباً ہر روز ہی وہ مجھ سے ملتی رہی کیونکہ جب سے میں تبادل ہو کر اس قصبے کے اسکول میں آیا تھا، اور اس محلے میں رہائش اختیار کی تھی، ہفتہ میں تین چار مرتبہ میں ضرور سبزی پکاتا تھا، اور اس سے زیادہ تازہ اور سستی سبزی اور کوئی فروخت نہیں کرتا تھا۔

یہ ایک معمولی قسم کا قصبہ تھا، بہت قلیل سی آبادی تھی جو زیادہ تر کاشتکاروں پر مشتمل تھی، کچے مکانات، گندی اور اداس گلیاں، چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع کھیت، کہیں کہیں ریت کے ابھرتے ہوئے ٹیلے اور ان ٹیلوں پر اگی ہوئی ببول اور بیر کی جھاڑیاں، جوہڑوں کے کناروں پر تناور پیپل اور نیم کے درخت اور درختوں پر بیٹھے ہوئے اونگھتے ہوئے گرگس، یہ تھا اس قصبے کا غیر شاعرانہ اور افسردہ ماحول اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس جگہ مڈل اسکول، تھانہ اور ایک چھوٹا سا شفا خانہ نہ ہوتا تو یہ قصبہ بالکل ایک گاؤں تھا،

جس محلہ میں میں رہتا تھا وہ کاشتکاروں کا محلہ تھا، یوں تو اس محلہ میں کوئی ایسی دلکشی نہ تھی، جس سے متاثر ہو کر میں اس جگہ رہائش اختیار کرتا، لیکن چونکہ اسکول یہاں سے صرف چند قدم کے فاصلے پر تھا، اتنا قریب کہ میں اسکول سے غیر حاضر ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود تصور کیا جاتا تھا، میں نے یہاں رہنا پسند کیا، اس کے علاوہ جاہل گنوار کاشتکاروں کی اس بستی میں مجھ ایسے معمولی پڑھے لکھے انسان کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل تھی، میں ان کی نظر میں نہ صرف اسکول کا منشی تھا بلکہ ضرورت کے وقت وکیل، پٹواری اور پنچ کے فرائض بھی ادا کرنے کا اہل سمجھا جاتا تھا، اس محلے کی کوئی تقریب ایسی نہ تھی جس میں مجھے خاص طور پر مدعو نہ کیا جاتا ہو، اور ان تمام باتوں نے ایک شدید احساس برتری مجھ میں پیدا کر دیا تھا،

محلے والے مجھے ایک نیک اور برگزیدہ انسان سمجھتے تھے، کیونکہ پٹواری کے لڑکے کی طرح انھوں نے کبھی مجھے کوئیں پر پانی بھرنے والیوں کے گرد گھومتے یا کسی نوجوان لڑکی کو دیکھ کر خواہ مخواہ گنگناتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، میں عام معنوں میں ایک شریف اور نیک آدمی تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام شرافت بالارادہ یا بلا ارادہ میں نے اپنے وقار کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر لی تھی،

وہ سبزی کا ٹوکرا سر پر رکھے بے جھجک میرے مکان میں داخل ہو جاتی تھی، حالانکہ وہ جانتی تھی کہ میں اس مکان میں تنہا رہتا ہوں، اس کی عمر زیادہ نہ تھی، مگر پھر بھی وہ جوان نظر نہ آتی تھی اس کے رخساروں میں تازگی ضرور تھی، مگر اس تازگی میں دوشیزگی کی رعنائی نہ تھی۔ اس کا جسم کچھ زیادہ موزوں نہ تھا، اعضا بھرے بھرے تھے، لیکن شباب کی جذبات انگیز کیفیت پیدا نہ کر سکتے تھے، اسے دیکھ کر شاید ہی کسی دل میں ہیجانی تاثر پیدا ہوتا ہو، اس کی آنکھوں میں زندگی کی ایک مبہم سی چمک تھی، جیسے ایک نمایاں افسردگی نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا تھا، ممکن ہے جنسی بھوک کسی نوجوان کی نظروں میں کچھ دیر کے لئے اسے حسین بنا دیتی ہو، لیکن اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی ہلکی ہلکی پژمردگی نے اس کے خد و خال کی عام ملاحت کو پس منظر میں ڈال دیا تھا، جب وہ گلی میں آ کر آواز لگاتی تو میں فیصلہ کر لیتا کہ آج کونسی سبزی پکانی ہے، وہ اندر آ جاتی، اور میں سبزی کا نام بتاتا، مقدار وہ خود ہی جانتی تھی، وہ سبزی تولتی، چارپائی پر ڈالتی اور چلی جاتی قیمت میں اکثر تنخواہ ملنے پر ادا کیا کرتا تھا، یہ تمام معاملہ صرف چند منٹ میں ختم ہو جاتا، اور ابتدا میں اسے میری زندگی میں صرف اتنا ہی دخل تھا،

لیکن اس کا پژمردہ چہرہ اور افسردہ آنکھیں رفتہ رفتہ میرے خیالات پر چھانے لگے، اور میرے تحت الشعور میں چند الجھنیں ابھر آئیں، جب وہ سبزی دے کر چلی جاتی، تو میں بعض اوقات اس کے متعلق سوچنے لگتا، بالکل غیر ارادی طور پر، یہ سوچ اکثر خواب کی غنودگی کی طرح ہوتی تھی، غیر مسلسل اور مبہم خیالات کی چند بے ربط لہریں ذہن میں الجھتیں، اور مٹ جاتیں، اور جیسے خواب کے بے نظام تصورات سے کوئی خاص مفہوم مرتب نہیں کیا جا سکتا، میری سوچ بھی اکثر بے معنیٰ ہوتی تھی، بعض اوقات سوچتے سوچتے میرے جسم میں ایک جھرجھری سی آتی اور ایک جنسی خواہش دل کے کسی کونے سے اپنا سر ابھارتی مگر فوراً ہی مٹ جاتی، اور کوئی دوسرا تخیلی سلسلہ شروع ہو جاتا، اور ذہن میں چند بھاری بھاری خیالات رینگنے لگتے۔

سوچ بڑھتی رہی اور اس کی ملاقاتیں طویل ہوتی گئیں اب وہ سبزی رکھ کر چلی جاتی، بلکہ بیٹھ کر قصبے کے مختلف معاملات پر تبصرہ شروع کر دیتی، "اس سال بارش نہیں ہوئی، سبزی کم پیدا ہوگی، جیت رام کا بیل مر گیا، ہماری بھینس کا دودھ سوکھتا جا رہا ہے"، اور اسی قسم کی دوسری

باتیں اس کی گفتگو کا موضوع بن جاتیں، مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی، کیونکہ فتح سنگھ نمبردار سے لے کر جھوٹو چپراسی تک مجھے سب صبح و شام اسی قسم کی باتیں سنایا کرتے تھے، مجھے اس کے چہرے کے مایوس خد و خال اور اس کے یاس میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں دلکشی محسوس ہوتی تھی، وہ ایک مشین کی طرح اپنی بے ربط و بے معنی باتیں کرتی چلی جاتی، اور میں اس کے چہرے کو گھورتا رہتا۔

اور پھر رفتہ رفتہ یگانگت بڑھتی گئی، وہ بغیر سبزی کے بھی میرے پاس آکر بیٹھ جاتی اور گھنٹوں بیٹھی رہتی، اس کی باتوں میں گہرائی پیدا ہونے لگی، اور میں اس کی روح کے قریب تر ہوتا گیا، اس کے دل کے چھپے ہوئے چور باہر نکلنے لگے تھے، وہ غیر محسوس طور سے مجھے اپنی زندگی میں داخل کرتی جارہی تھی، میں اس کی روح کو ٹٹولتا رہا، اور اس کی عمر کی گزری ہوئی کہانیاں میرے حافظے میں بیٹھنے لگیں، وہ دور کسی گاؤں کی رہنے والی تھی، اس نے مجھے بتایا تھا، اس کا باپ ایک بڑا زمیندار تھا، ان باتوں کو برسوں بیت گئے تھے، اور وہ چاندنی رات اسے اب تک یاد تھی جب وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ایک بیل گاڑی میں بیٹھ کر ہردوار چلی تھی، تمام رات میٹھے رسیلے گیت گاتے گزر گئی تھی، اور جب وہ کئی دن کے سفر کے بعد میلے میں پہنچے تھے، تو وہ بھونچکا ہو کر رہ گئی تھی، کیونکہ اتنی رونق، اتنی دھوم دھام اور اتنی گھما گھمی اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھی تھی، اور اسے وہ المناک حادثہ بھی یاد تھا جب وہ اس گھما گھمی میں یکایک اپنے رشتہ داروں سے بچھڑ گئی تھی، اور پھر کئی دن رونے دھونے کے باوجود بھی وہ اپنے رشتہ داروں کو نہ ڈھونڈ سکی تھی، جگلال اسے ان رشتہ داروں سے ملا دینے کا وعدہ دے کر اس قصبے میں لے آیا تھا، اور اسے وہ خوفناک رات بھی یاد تھی جب مایوس ہو کر اس نے جگلال کے پاس سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، اور جگلال نے قتل کی دھمکی دے کے اسے اپنی بیوی بنے پر مجبور کر دیا تھا، اور وہ اپنے ماں باپ سے کوسوں دور اپنی خواہشات کے خلاف ایک اجنبی کی گھرستن بن کر رہ گئی تھی، اور پھر اس کو جوانی کے وہ رس بھرے سپنے بھی یاد تھے، جو جگلال کی گرم گرم آغوش میں اس نے دیکھے تھے، اور جن کے سحر انگیز اثر سے وہ ایک خوابناک رومان میں گھل مل گئی تھی، یہ تمام کہانیاں اسے یاد تھیں، اور اب وہ انہیں میرے حافظے میں سموتی جارہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوتا گویا میں ان کہانیوں میں جذب ہوتا جارہا ہوں،

دو روحوں کا تعلق شدید ہوتا گیا، اور میں اب اس کے بغیر کچھ اداس اور بے چین سا رہنے لگا، جس روز وہ نہ آتی، مجھے اپنے مشاغل میں ایک خلا سا محسوس ہوتا، اس لئے نہیں کہ اس کی متواتر قرابت نے میری جسمانی ضرورتوں کو بیدار کر دیا تھا اور میرے جنسی جذبات میں تندی پیدا ہو گئی تھی، بلکہ واقعہ یہ تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کی المناک داستان سے متاثر ہو کر میرے ذہن نے ایک عجیب جذباتی تار و پود اس کی شخصیت کے گرد بن لیا تھا، رحم کے وہ احساسات جو اس کی کہانیوں نے میرے دل میں تخلیق کر دئے تھے، مجھے اس کے بہت قریب لے آئے تھے، میں اس کے لئے کڑھتا تھا معلوم نہیں کیوں!

پھر یکایک ایک روز مجھے محسوس ہوا کہ محلہ کی فضا میں کچھ تناؤ سا پیدا ہو گیا ہے، کاشتکاروں کی آمد و رفت میرے پاس رفتہ رفتہ کم ہونے لگی، میرا وقار اور میری اہمیت روز بروز گھٹتی جارہی تھی، اور میں وکیل اور پٹواری تو کیا، شاید منشی بھی نہیں رہا تھا، محلے والوں کی پیشانی کے بل گہرے ہوتے جارہے تھے، اور وہ لوگ جو ملتے ہی مجھے اس طرح آداب عرض کہا کرتے تھے، گویا کوئی قرض ادا کر رہے ہوں، اب نظریں بچا کر نکلنے لگے، اور جگلال تو جب مجھے دیکھتا، ناک بھوں چڑھا لیتا تھا، آخر یہ نفسیاتی جنگ کب تک جاری رہتی، ایک دن فتح سنگھ نے مجھ سے آکر کہہ ہی دیا، کہ رام دئی ایک بدچلن عورت ہے، وہ جگلال کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی، تمام قصبہ میں بدنام ہے، اس کا بار بار میرے پاس آنا ٹھیک نہیں محلے والے اسے اچھا نہیں سمجھتے، اور ان تمام باتوں کا یقین دلانے کے لئے فتح سنگھ نے رام دئی کے متعلق کئی گھناؤنی کہانیاں مجھے سنائی تھیں،

اس روز میں تمام رات جاگتا رہا، رام دئی کی زندگی کا یہ پہلو اس کے بالوں سے بھی زیادہ سیاہ تھا، اس کی بے بسی اور بے چارگی نے ہمدردی کے جو بت میرے دل میں تراش کر رکھ دئے تھے، منہدم ہونے لگے، اور میرے ذہن پر نفرت اور پچھتاوے کے تاریک سائے چھا گئے، آج مجھے یکایک محسوس ہوا، کہ کسی نے ستاروں کی معصوم بستی سے گھسیٹ کر مجھے تلخ حقیقتوں سے بھری دنیا میں پٹک دیا ہے، مجھے رام دئی کے وجود سے ڈر لگنے لگا، کتنی خوفناک تھی وہ، میرے کئی سال کے قائم کئے ہوئے وقار کے تار و پود کو توڑنے کے لئے کتنی خطرناک سازش کی تھی اس نے، میرا دل غصہ سے ابل رہا تھا،

دوسرے دن صبح کو جب وہ سبزی لے کر آئی، تو میں نے اسے اپنے مکان میں داخل ہونے سے روک دیا، وہ کافی دیر تک بت بنی کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں کی افسردہ لکیریں بہت گہری ہو گئی تھیں، اور ان سے رحم کی التجا ٹپک رہی تھی، دو گرم گرم آنسو ڈھلک کر اس کے رخساروں پر آ گئے، یکایک میری نفرت کا ابال کچھ دھیما پڑ گیا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا، گویا وہ آنسو

کہہ رہے ہوں، "بابوجی! یہ بالکل بے گناہ ہے، محلے والوں نے تمہیں بہکا دیا ہے"، مگر اشکوں کا یہ تریاق میرے دل کے ابلتے ہوئے زہر کو دور نہیں کرسکتا تھا، ہمدردی کے ٹوٹے ہوئے بت اب میرے دل میں زندہ نہیں ہوسکتے تھے، وہ ایک بدچلن عورت تھی، فتح سنگھ نے نفرت کا جو انجکشن میرے ذہن میں لگایا تھا، اس کا اثر میرے ریشے ریشے میں پھیل چکا تھا، میں نے دھکا دے کر اسے اپنے دروازے سے ہٹا دیا، اور وہ گردن جھکا کر چلی گئی، اور محلے والے جو اس حادثے کو دیکھ کر جمع ہوگئے تھے، دیر تک کھڑے دانت نکالتے رہے،

میں پھر منشی، وکیل، پٹواری اور پنچ بن گیا تھا، اور محلے والے میرے گرد جمع ہونے لگے تھے، مگر جگلال کی پیشانی کے بل بدستور گہری تھے،

رام دئی اب کبھی کبھی ملتی تھی، اس کی آنکھوں کی افسردہ لکیریں اب بہت زیادہ گہری اور تاریک ہوگئی تھیں، محلے والوں کے طعنوں کے نشتر تیز تر ہوتے جارہے تھے، اور جگلال کی بربریت اور غصے کی شدت خوفناک حد تک بڑھ گئی تھی، اور ایک روز اس نے رام دئی کو اتنا مارا تھا، کہ بیچاری کا دایاں بازو ٹوٹ گیا تھا، وہ کئی دن سے سبزی بیچنے باہر نہیں آئی تھی، مگر محلے والوں نے پھر بھی اس کی بدچلنی کے متعلق دو چار اور نئی کہانیاں تراش لی تھیں، اور جگلال کی بربریت اور زیادہ تند و تیز ہوگئی تھی،

اگرچہ اب رام دئی کو میری زندگی میں کوئی دخل نہ تھا، اور میں اس کے وجود کو اپنے وقار کے لئے اب بھی ایک خطرہ تصور کرتا تھا، مگر فتح سنگھ کے انجکشن کا اثر کچھ کم ہوگیا تھا، اور رام دئی کی زندگی کی گزشتہ کہانیاں پھر میرے ذہن کے پس منظر میں تلملانے لگی تھیں،

ایک دن صبح جب مکان سے اسکول جانے کے لئے باہر نکلا، تو کچھ لوگ ایک چارپائی کندھوں پر اٹھائے آرہے تھے، جگلال گردن جھکائے ان کے ساتھ تھا، اس کی پیشانی کے بل گہرے ہوتے ہوتے ایک دوسرے سے الجھ گئے تھے، اور آج ان سے رنج و غصہ کی بجائے تفکر اور حسرت کے آثار نمایاں تھے، "رام دئی کوئیں میں ڈوب کر مرگئی" - کوئی میرے قریب سے بولا، اور میرے دل کو ایک دھکا سا لگا، رام دئی کی سنائی ہوئی تمام کہانیاں یکایک میرے ذہن کی سطح پر ابھر آئیں، میں سوچ رہا تھا، وہ ایک دور دیس کی رہنے والی جگلال کے جھوٹے وعدوں میں پھنس کر اس قصبے میں آگئی تھی، جگلال نے قتل کی دھمکی دے کر اس کو اپنی بیوی بننے پر مجبور کردیا تھا، اور اس نے اپنے دور دیس کے سپنوں کو بھلا کر اس محلہ میں گھل مل جانے کی کوشش کی تھی، اور پھر فتح سنگھ نے جیسے میرے کان میں کہہ دیا ہو، وہ بدچلن ہے، محلے والے اسے بدچلن سمجھنے لگے تھے، بدچلن، بدچلن، بدچلن، اور ان نشتروں نے جگلال کے رگ و پے میں بربریت اور غصے کے شرارے بکھیر دئے تھے، اور خون کے اس خوفناک ابال سے تنگ آکر اس نے ایک روز رام دئی کا ایک ہاتھ توڑ دیا تھا، اور وہ اس غیر فطری زندگی سے جنگ کرتے کرتے تھک گئی تھی، اور آج بالآخر وہ تنگ آکر اس قصبے سے کہیں دور بھاگ گئی تھی، دور بہت دور ایک ایسے دیس میں جہاں وہ محلے والے نہیں تھے، جہاں جگلال نہیں تھا،

لوگ چارپائی اٹھائے جگلال کے مکان کی طرف بڑھ گئے، سامنے نیم کے درخت پر چند گرگس بیٹھے اونگھ رہے تھے، اور نیچے کسی جانور کی ہڈیوں کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔

حقیقت و مجاز

زندگی موت سے بدتر ہی سہی، ہے تو سہی
یہ فضا آہ مکدّر ہی سہی، ہے تو سہی

عیش رفتہ کے نشاں دیکھ کے خوش ہوتا ہوں
دل مرا اجڑا ہوا گھر ہی سہی، ہے تو سہی

شورش عشق بھی کیا چیز ہے اللہ اللہ!
اُن کی نظروں میں یہ کمتر ہی سہی، ہے تو سہی

تم شب ماہ میں آؤ تو چھپانے کے لئے
چاندنی رات کی۔ چادر ہی سہی، ہے تو سہی

شیخ پیاسا ہے اسے پینے دو اک جام کہ یہ
تشنۂ بادۂ کوثر ہی سہی، ہے تو سہی

بیر ہے مجھ سے زمانے کو مگر ساتھ مرے
ایک برگشتہ مقدر ہی سہی، ہے تو سہی

کہئے کافر نہ برہمن کو کہ اس کا بھی خدا
بُت ہے، بُت اصل میں پتھر ہی سہی، ہے تو سہی

ہم بھی نازاں ہیں کہ ہے دوست ہمارا کوئی
اس کا غم کیا وہ ستمگر ہی سہی، ہے تو سہی

سنئے سائل کے بھی اشعار سر بزم کہ وہ
ایک گمنام سخنور ہی سہی، ہے تو سہی

سائل انبہٹوی

یورپ نے اسلامی تمدن سے کیا استفادہ کیا؟

حفیظ سیّد

اس عہد میں بھی جبکہ یورپ ابھی اسلام کی طرف معاندانہ طور پر رجوع نہیں ہوا تھا اس کی نظریں اسلامی کمالات اور عجائبات سے خیرہ ہو چکی تھیں اور اس نے زیادہ تر عرب ہی کی آرائشی اور تعمیری فطانت سے اپنا چراغ روشن کیا۔ گہری تحقیقی نظر ڈالنے پر یہ بات جلد ہی ثابت ہو جاتی ہے کہ روم و یونان کی قدیم صنعتوں سے زیادہ وہ اس باب میں اسلام کا رہین منت ہے۔ لیکن اس بحث کا چھیڑنا یہاں مناسب نہیں ہے۔ ہم اپنے موضوع سے دور ہٹ جائیں گے۔ تاہم اس عجیب حقیقت کی طرف اشارہ کر دینا خالی از لطف نہ ہوگا کہ پیرسی کلیسا ناتردام .Parisian Cathedral of Notre Dame. کی تعمیر کے لئے عرب معمار مقرر کئے گئے تھے۔

سائنس اور علوم کے میدان میں مسلمانوں کا اثر کس حد تک وسیع ہے۔ اس کا اندازہ مندرجۂ ذیل واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔

"سب سے پہلے یہ اعتراف ضروری ہے کہ تجربات اور مشاہدات جو علوم اور سائنس کی بنیاد ہیں ہم نے تمام تر عربوں سے سیکھے"۔ عام طور سے یہ امر بیکن (.Bacon) سے منسوب کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

مشہور و معروف سائنسدان ہمبولٹ .Humboldt اس بات کا تعین پہلے کرتے ہوئے کہ سائنس کا سب سے اہم منصب یہ ہے کہ وہ طبعی مظاہرات کو ارادی طور پر بلند کرتی رہے لکھتے ہیں کہ عرب اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جس سے سائنسدان ناواقف تھے۔

ریاضی سے عربوں کو بڑا شغف تھا۔ جبر و مقابل ALGEBRA میں تو یہاں تک تکمیلی ترقی دکھائی کہ اس کی کایا ہی پلٹ دی۔ چنانچہ اس کی ایجاد انھیں سے منسوب کر دی گئی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے جبر و مقابل کو اقلیدس پر چسپاں کیا اور مماس Tangent کو علم مثلث میں شامل کیا۔

بغداد، شام، سمرقند، قاہرہ، فز، ٹولڈو، کاردیو وغیرہ میں علم ہیئت کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے ہوتا رہا۔ ان کی تحقیقات اور انکشافات حسب ذیل ہیں:۔

علم ہیئت کے حساب میں علم مثلث کا شمول۔

ستاروں کی حرکت کے جدول بنانا۔

ان خطوط کی کجی کا تعین جس سے سورج گذرتا ہے Obliquity of the eclimptic.' اور پھر اس کی بتدریج تقلیل۔

اعتدالین (Equinoxes.) سے سورج کے گذرنے کا قطعی انداز اور امتدادِ سال کا پہلا صحیح تعین۔

عرض البلد ماہتاب کی بے ضابطگی کی تحقیق اور محوری حرکت سے قمر کا ایک تیسرا انحراف جس کو آج کل .Variation کہتے ہیں انھیں کی منت کش ہے۔

جغرافیہ کے ضمن میں ان بہادر سیاحوں کے کارنامے سائنس کے نقطۂ نظر سے بے انتہا اہم ہیں انھوں نے ان قطعی ہیئتی تعینات Astromomical Determinations.) کی تشکیل کر دی جو اولین نقشہ کشی کی بنیاد ہیں اور ان کثیر التعداد غلطیوں کی تصحیح بھی کر دی جو مقامات کے تعین کے سلسلے میں یونانیوں سے سرزد ہوئی تھیں۔

سیاحت کے نقطۂ نظر سے انھوں نے بہت سے سفرنامے شائع کئے جن کی وجہ سے دنیا کے وہ مختلف حصے جن کا وہم و گمان بھی نہیں تھا اور جہاں کسی یورپین نے قدم بھی نہیں رکھا تھا نظر کے سامنے آ گئے۔

اَلْ اِدریسی (.Alidrisi نے ۱۱۶۰ء میں دریائے نیل کے منبع جو بڑی بڑی خط استوائی جھیلوں سے پھوٹتے ہیں اسی طرح اپنے نقشے میں صحت کے ساتھ دکھائے ہیں جو اہل مغرب نے اب انیسویں صدی کے نصف میں دریافت کئے۔

علم طبیعیات میں ان کی جستجو اور انکشافات اور بھی زیادہ قابل غور اور قابل قدر ہیں۔ ذیل کے بیانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

تجرباتی اور نظریاتی طبیعیات Practical and Theoretical میں وسیع معلومات بالخصوص بصریات Physics میں بے مثل قیمتی آلات کا وضع کرنا۔

علم کیمیا کے سب سے بنیادی اجزاء اور مقدار کی دریافت مثلاً الکحل Alcohol، شورہ کا تیزاب Nitric Acid گندھک کا تیزاب Sulphuric Acid. اور تقطیر کا اہم ترین عمل۔

علم کیمیا کا دواسازی اور تجارت میں شامل کرنا۔ خاص طور سے دھاتوں کا علیحدہ کرنا، چیتھڑوں سے کاغذ بنانا جو چرمی کاغذ پیپرس Papyrus

اور چینی کے ریشمی کاغذوں کی جگہ کام میں لائے جاتے تھے۔

جہازرانی میں غالباً سب سے پہلے پرکار (Compass.) کا استعمال انھیں نے کیا اور اتنا تو یقینی ہے کہ یوروپ کو اس ضروری ایجاد سے روشناس انھیں نے کرایا۔

اختتام پر ہم اتنا اور کہہ دینا چاہتے ہیں کہ توپ و بندوق کی ایجاد بھی مسلمان سائنسدانوں نے کی ہے۔ یعقوب نے محاصرہ مہدیہ میں توپ خانہ کا استعمال کیا تھا۔

۱۲۷۳ء میں سلطان ابو یوسف نے محاصرہ سجلماسہ (Sijilmasa میں توپوں سے کام لیا تھا۔ ۱۳۴۲ء میں لارڈ ڈربی (Lordderby) اور لارڈ سیلسبری (Salisbury) نامی دو انگریز الجیسیرس (Algeciras.) کے محاصرہ میں موجود تھے جس میں عربوں نے اسی طرح حفاظت کی تھی۔ ان سیاحوں نے بارود کے اثرات دیکھے اور اس ایجاد کو اپنے ملک میں پھیلایا۔ یہ انھیں کا ذریعہ تھا جس کی وجہ سے چار سال کے بعد کریسی (Cressy) میں انگریزوں نے بارود کا استعمال کیا تھا۔

علوم طبی کے سلسلے میں مسلمانوں نے یونانی مصنفوں کی پیروی کی اور بعد میں کامیاب ترقی کی۔ طب کی تقریباً جتنی بھی معلومات ہیں یوروپ نے نشاۃ ثانیہ کے دور میں انھیں سے حاصل کیں طب کے جن مشہور شعبوں میں انھوں نے ترقی کی ان میں سے چند یہ ہیں۔ جراحی، بیماریوں کی تفصیل اور علامات، مخزن الادویات اور دوا سازی۔

انھوں نے معالجہ کے مختلف طریقے نکالے تھے، مثلاً میعادی بخار میں ٹھنڈے پانی کا استعمال، جن میں سے بعض صدیوں کے بھلائے جانے کے بعد آج دور جدید میں پھر نمایاں ہوئے ہیں۔

دواؤں کے اجزا میں سے بہت سی چیزیں انھیں لوگوں کی دی ہوئی ہیں۔ جیسے تیزپات (Cassia.)، ریوند چینی (Rhubark.) تمر ہندی (Tamarind.)، کافور، الکحل، امونیا Ammonia.) وغیرہ وغیرہ۔ صحیح معنوں میں دوا سازی کے خالق وہی تھے۔

بہت سے مرکبات جو آج مستعمل ہیں انھیں کی بدولت ہم تک پہنچے ہیں مثلاً شربت، عرقیات، روغنیات، مرہم اور کشید کیا ہوا پانی۔

جراحی کی بھی اساسی ترقی کی بنیاد عربوں کے ہاتھ پڑی ہے۔ ان کی تصنیفات ابھی تھوڑے دنوں پہلے شعبۂ طب کے درس میں مبادیات کے طور پر شامل تھیں۔

گیارھویں صدی میں وہ موتیابند کا علاج جانتے تھے۔

سیلان خون کا علاج بذریعہ آب سرد کرنا جانتے تھے۔

سوزش ناک دواؤں (Caustics.) اور زخم کشا (Setons.) کا استعمال اور آگ سے داغنے کے طریقوں سے واقف تھے۔

بے ہوشی اور بے حسی کی دوا جو موجودہ دور کی ایجاد سمجھی جاتی ہے حقیقتاً انھیں کی دریافت کی ہوئی تھی۔ عمل جراحی سے قبل وہ بے ہوش اور بے حس کرنے کی دوا سے واقف تھے تاکہ مریض اعصابی اذیت سے محفوظ رہے۔

اسی طرح انھیں حفظانِ صحت، طبی معالجہ اور نقاہت کے ذرائع پر بڑا اعتبار اور بھروسہ تھا موجودہ طب جو اس زمانہ کی سائنس میں صرف آخر کا حکم رکھتی ہے بالکل اسی راستہ پر گامزن ہے۔

خیالات اور فکر کے میدان میں بھی مسلمان بہت سے اہم علمی اور عملی نظریوں کے حامل ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے مساوات اور اخوت کی تعلیم دی تھی۔ مگر حضرت محمدؐ کی خوش قسمتی تھی کہ انھیں کے زمانہ میں ان کے ماننے والوں نے دونوں کے نمونے پیش کر دیئے۔ یہ ماننا البتہ حماقت ہے کہ انقلاب فرانس کی ذمہ داری ان کی ذات ہے جس پر ان کے معتدل اور ہموار عمل کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا تاہم یہ ماننا پڑے گا، اور اس کے کافی ثبوت ہیں، کہ خیالات اور جدید ہیئت اجتماعی کے حق رائے دہی کا نیا معیار حضرت محمدؐ ہی کی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔ یوروپ کو اس آزاد خیالی سے جس کو دہریت سے کوئی سروکار نہیں روشناس کرنے کا سہرا ابن رشد (Averroes. کے سر ہے جو ۱۱۲۰ء سے لے کر ۱۱۹۸ء تک اسپین میں موجود تھا۔

ابن رشد نے اسلام کی خالص واحدانیت کو عیسائیت کے صنمیاتی وحدت الوجود اور تشبیہی مذہب کے مقابل پیش کیا۔ ارسطو پر اس کی تنقیدوں نے، گو ان میں اسلامی خیالات کی صاف طور پر رنگ آمیزی تھی، قرون وسطیٰ کے یوروپ میں تمام آزاد دماغوں کو بے انتہا متاثر کیا۔ رشدیت (Averroism. جو اسی ذوق و شوق کے ماتحت پیدا ہوئی تھی صحیح معنوں میں نہ صرف تحریک اصلاح (Reformation.) کی پیشرو بلکہ جدید عقلیت کی خالق سمجھی جا سکتی ہے۔

اسلامی طرز معاشرت کا اثر صالح بھی یوروپ پر کافی پڑا ہے عربوں نے بڑی فراخدلی اور حوصلہ مندی کے ساتھ انتہائی مذہبی رواداری برتی تھی یہ ہسپانیہ کے عرب تھے جن میں مجاہدانہ جذبہ موجزن تھا جس کے مالک بعد میں مشرقی جنگجو بن بیٹھے۔ مشہور ہسپانوی مصنف بلاسکو ابینز (Biascoibanez.) اپنے ناول "کلیسا کے سایہ میں" (In the Shadowof. The Cathedral-Dans L dubre de la cathedal.

میں لکھتا ہے۔ "گویا یہ وصف ایسا تھا جو عیسائی قوم میں پہلے ہی سے موجود تھا اس سلسلے میں ہم ڈاکٹر لیبان کا اقتباس پیش کر سکتے ہیں۔" عیسائی

شجاعت کی طرح جو بعد میں نمودار ہوئی عربی شجاعت اپنا مخصوص تیور اور اصول رکھتی تھی۔ اس وقت تک کوئی آدمی شجاع نہیں کہلایا جا سکتا تھا جب تک ان اوصاف کا حامل نہ ہو۔ رحم، قوت، اولوالعزمی، سخن سنجی، فصاحت، شہسواری، نیزہ بازی، سیف زنی، تیر اندازی۔

۱۱۳۹ء میں قرطبہ (Cardova.) کے والی نے طلیطلہ (Taledo.) کا محاصرہ کیا جو عیسائیوں کے قبضہ میں تھا اور جس کی ملکہ (Berengaria) نے شہر پناہ میں اپنے کو بند کر لیا تھا۔ اس نے ایک سفیر سے اس کے پاس کہلوایا کہ یہ جوانمردی، اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے خلاف ہے کہ ایک عورت پر حملہ کیا جائے۔ عربی سپہ سالار اس مہم سے دست کش ہو گیا اور اس نے ملکہ سے اس بات کی اجازت بھی چاہی کہ اپنا ہدیہ تبریک بھی اس کے حضور میں پیش کر سکے۔

ہسپانیہ کے عربی روزنامچے اس قسم کے ہزاروں واقعات سے بھرے ہوئے ہیں جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ یہ مردانہ اوصاف کس قدر پھیلے ہوئے تھے۔

ایک بہت مذہبی آدمی (St. Hilaire.) اس بات کا پوری وفاداری کے ساتھ اعتراف کرتا ہے کہ مغربی رسم و رواج عربوں سے کس قدر اثر پذیر ہوئے ہیں۔ قرآن پر جو کتاب اس نے لکھی ہے اس میں رقمطراز ہے "عربوں کے ربط و ضبط، گفتگو، اور ان کی تقلید سے قرون وسطیٰ کے اجڈ امراء کے ناشائستہ حرکات سدھر گئے۔ اور بہادروں (Knights.) میں بغیر اپنی شجاعت کو کم ہوئے نرمی، لطافت، انسانیت اور شرافت کے اوصاف پیدا ہو گئے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ عیسائیت اپنے حلم اور بردباری کے باوجود یہ جذبات پیدا کر سکتی تھی یا نہیں۔

ممکن ہے قارئین یہ پوچھ بیٹھیں کہ پھر کیا وجہ ہے کہ ایسی صورت میں ہمارے زمانے کے اہل علم حضرات جو اپنے فضل و کمال کی بنا پر مذہبی تعصبات سے بلند معلوم ہوتے ہیں عربی تمدن کے اثرات سے روگرداں ہیں؟۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد خیالی ظاہری زیادہ ہے اور حقیقی کم اور ہم نے اسلام اور اس کے پیرووں کے بارے میں جو رائے صدیوں سے قائم کر رکھی ہے اور اس کا اظہار کرتے رہے ہیں وہ ہماری ذہنیت میں رس بس گئی ہے۔

اگر ہم تمام تعصبات کے ساتھ ساتھ نسلی اور موروثی تعصبات کو بھی ملا لیں جو ہماری ہر نسل میں قابل نفرت کلاسکی تعلیمات کے ساتھ افزوں ہوتے گئے۔ یعنی یہ کہ زمانہ گذشتہ کے تمام علوم و ادب محض یونانیوں اور رومیوں نے پیدا کئے ہیں تو ہماری سمجھ میں بآسانی آ جائے گا کہ کس طرح مغربی تمدن کی تاریخ میں عربی تمدن کے یہ عظیم اثرات نظر انداز کر دئیے جاتے ہیں بعض حضرات کو یہ بات ہمیشہ مضحکہ خیز معلوم ہو گی کہ یہ مسلمانوں ہی کا فیض ہے جو مسیحی یورپ جہالت سے دور نظر آتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ اسلام اس قدر جلد گر گیا؟ جس نے آٹھ صدیوں تک ہسپانیہ پر حکمرانی کر کے ایسے نہ صرف مغربی تمدن و تہذیب سے برتر کر دیا بلکہ اپنی چمک دمک سے کیا دلی، کیا بخارا، کیا قسطنطنیہ، کیا فز (   ) تمام میں روشنی پہنچا دی۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ یہ لوگ ان اصول دین سے غفلت برتتے جاتے ہیں جن کی پابندی لازم ہے اور جن کے قائم کرنے کے لئے رسول مقبولؐ نے عمر بھر جانفشانی کی اور جوان کی اور خلفائے راشدین کی کامیابی کے ضامن رہے۔

ایک مثال پیش کر دینی کافی ہے کہ کس سختی سے ان اصول پر شروع میں عمل کیا جاتا تھا۔ ایک امیر اور طاقتور جبالہ نامی بادشاہ نے جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا ایک غریب بدوی کے منہ پر جس سے خانۂ کعبہ کے طواف کے وقت ذرا سا دھکا لگ گیا تھا، کئی طمانچے زور سے رسید کر دئیے۔ بغیر اس کے جاہ و حشم اور ایک مشہور ہستی کی ناراضگی کا خیال کئے ہوئے خلیفہ عمرؓ نے اس غریب بدوی کے ہاتھ سے بادشاہ جبالہ کو وہی سزا دلوائی جو اس نے غریب کو دی تھی۔ کیونکہ اسلام کی آئندہ عزت کے لئے قانون اور انصاف کی نظروں میں ہر ایک کا برابر ہونا جملہ پس و پیش پر فوقیت رکھتا تھا۔

بغیر اتنے سخت اصولوں کے کوئی شخص سوائے ذاتی خوبیوں کے اور کسی چیز پر فخر نہیں کر سکتا۔ کسی شخص کا انتخاب سرداری کے لئے اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک وہ اس کا اہل نہ ہو اور ایک مرتبہ منتخب ہو جانے کے بعد اس کا فیصلہ آنکھ بند کر کے مانا جاتا تھا کیونکہ دراصل مخلصانہ طور پر اس کی عزت و توقیر کی جاتی تھی۔

رسول مقبولؐ نے جو اپنی پیاری بیٹی فاطمہ زہراؓ سے کہا تھا کہ کام سے غافل نہ رہنا اور اس پر نہ بھولنا کہ تم رسولؐ کی بیٹی ہو وہ دوسرے لوگوں پر بے کار ثابت ہوا۔ بہت سے غیر معروف اشخاص کے بیٹوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو بڑی چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنا پر حقارت سے دیکھنا شروع کیا اور یہ خیال کیا کہ ان کی سماجی حیثیت ان کی ترقی کی کوششوں میں مانع ہے۔ علاوہ اس کے ان اشخاص کی وجہ سے جو اپنے ذاتی کارناموں سے زیادہ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کیا کرتے تھے ایسی ہی شدید اور بے رحم جنگیں چھڑ گئیں جیسے پہلے ہوا کرتی تھیں۔

چنانچہ پھر وہی بدمزاجی اور بدانتظامی پھیل گئی جس نے قبل اسلام عربوں کو مفلوج کر دیا تھا۔

سارا علمی مذاق کھو کر، خانہ جنگی سے منتشر ہو کر اور تھک کر مسلمان عیسائیوں کی تاب نہ لاسکے جو انتقام کا خواب دیکھ رہے تھے اور ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اپنے کو منظم کر کے حملہ آور ہوئے تھے۔

عہد ماضی (اور آج بھی) اسلام اپنی بہت سی بدنصیبیوں سے بچ سکتا تھا بشرطیکہ مسلمانوں نے رسول ؐ کی آخری سماجت اور قسم کو یاد رکھا ہوتا جو انھوں نے اپنے خطبہ کے موقع پر دی تھی۔ "کبھی مت بھولنا کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا سچا بھائی ہونا چاہیئے"

اسلام کے تنزل کا دوسرا سبب خود اس کی ایک اساسی خصوصیت سے نکلتا ہے۔ اسلامی عقائد جو مافوق الفطری عنصر سے تقریباً مبرا تھے باآسانی عقلی دلائل پر پورے اترتے تھے۔ شروع میں یہ بہت مفید ثابت ہوا کیونکہ علوم توہمات کی رکاوٹوں سے آزاد رہے۔ یہی اسلام کے فوری عروج کا کافی سبب ہے۔ مگر رفتہ رفتہ مسلم دماغوں پر نیند طاری ہو گئی۔ وہ ان عظیم الشان نتائج سے جو پہلی صدی ہجری کے جوش و خروش میں نمودار ہوئے تھے کافی سے زیادہ مطمئن ہو کر غافل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نئے مفتوح ممالک میں اسلام بہیمانہ جذبات اور اشیاء پرستی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ فقراء اور شافعین (Intercessors.) اولیا اور مرابطون نے جو عیسائیت کے ذریعہ پیدا ہو گئے تھے اور جن کی قرآن میں سخت مخالفت ہے، علم اور عقل کی جگہ لی اور اپنے صریح توہمات سے تمام ترقیوں کو مسدود کر دیا۔ حکماء مثلاً ابن رشد نے اس کے خلاف جہاد کیا مگر بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ معصیت عوام میں اچھی طرح جڑ پکڑ چکی تھی۔ وہ ان روشن دماغ حضرات کو ملحد کہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ مردود قرار دے دئے جائیں۔

امجد حیدر آبادی کی نثرنگاری

نصیر الدین ہاشمی

ایک گزشتہ مضمون[1] میں حضرت امجد حیدرآبادی کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آج ہم آپ کی نثرنگاری اور انشاپردازی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تاریخ نثر اردو پر نظر ڈالی جائے تو یہ امر بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ جس طرح اردو شاعری کے ارتقا میں دکن کا نمایاں حصہ ہے اسی طرح اردو نثر کو فروغ اور ترقی دینے میں دکن نے بڑا کام کیا ہے۔ یہاں زمانہ دراز سے نہ صرف ادبی اور مذہبی کتابیں اردو نثر میں مرتب ہوتی رہیں بلکہ سائینٹفک کتابوں کی تدوین اور اشاعت کا کام بھی انجام پاتا رہا۔ اگر کلکتہ میں کمپنی کی جانب سے ڈاکٹر گلکرائسٹ کی زیر نگرانی قصے اور کہانیوں کی کتابوں کا ترجمہ ہوتا تھا تو یہاں علوم سائنس، ریاضی، کیمیا، اور طبیعیات کے ترجمے ہوتے تھے۔ جس زمانہ میں شمالی ہند میں مقفیٰ اور مسجع تحریرات کا دستور تھا تو دکن میں صاف اور سادہ اسلوب بیان کو اہمیت دی جاتی رہی۔ بہرحال جس طرح زمانہ گزشتہ میں دکن نے اردو زبان کی خدمت گزاری کی ہے اسی طرح اب بھی اردو کی ترقی میں نمایاں حصہ لے رہا ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں نہ صرف اردو زبان میں علوم سائنس کی تعلیم ہوتی ہے بلکہ سائینٹفک اردو کتابوں کی اشاعت میں بھی جامعہ کا خاص حصہ ہے۔ دوسری طرف شعرا، ادیب، نثار اور سائنسداں اردو کی خدمت گزاری میں مصروف اور منہمک ہیں۔ حیدرآباد کے شعرا میں حضرت امجد کو جس طرح خاص اہمیت حاصل ہے اسی طرح آپ ایک نثار کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ یہاں ہم کسی قدر صراحت کے ساتھ آپ نثر کا تعارف کراتے ہیں۔

حضرت امجد کی نثر کی پانچ کتابیں اب تک شائع ہوئی ہیں۔ یعنی جمال امجد، حج امجد، حکایات امجد، گلستان امجد اور میاں بی بی کی کہانی۔

"جمال امجد" کے آٹھ نوشتے یا آٹھ باب ہیں۔ ابتدائی ابواب میں اپنی زندگی کے حالات درج کئے ہیں اور آخری نوشتہ جو کتاب کے بڑے حصہ پر مشتمل ہے، تصوف کے اسرار اور سلوک کی باتیں عام فہم اور سادہ الفاظ میں درج ہیں۔ دراصل یہ آپ کی اہلیہ خانہ مرحومہ جمال النسا بیگم کے ملفوظات ہیں جو سلوک اور باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر یہ تصوف کی ایسی باتیں نہیں ہیں جو خاص صوفیا اور اہل باطن کی کارآمد ہوں بلکہ وہ زندگی کی سدھار اور اخلاق حمیدہ کے لئے ایک بہترین دستور العمل ہو گئے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نوشتہ اپنی طرز میں دلکش اور دل آویز ہے۔ اس کی عبارت عبرت انگیز اور معنی خیز ہے۔ اس سے ایمان کی تازگی اور روح کو مسرت ہوتی اور سکون ملتا ہے۔

"حج امجد" آپ کا سفرنامہ حج ہے جو دلچسپ حالات کا حامل اور ایک طالب صادق اور عاشق حبیب کی زیارت کا حال نہایت سوز و گداز کے انداز میں قلمبند کیا ہے۔ یہ ایک تجلی ہے جو کوندتی نظر آتی ہے۔ عام سفرناموں سے اس کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ حج کے حالات حجاز کی کیفیت وہاں کے رہنے والوں کی معاشرت وہاں کے مناظر وغیرہ کے حالات اس خوبی سے بیان کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والوں کو خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔

"حکایات امجد" مختلف مضامین کا مجموعہ ہے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خود امجد صاحب کی زندگی سے متعلق ہیں اخلاق اور تصوف کی بیش بہا معلومات کے ساتھ ہی ساتھ دلچسپ مکالمے پر لطف محفلوں کی تصویر جس انداز میں پیش کی گئی ہے وہ دیدہ بصیرت کے لئے سبق آموز اور نتیجہ خیز ہے۔

"گلستان امجد" دراصل سعدی شیرازی کی گلستان کا ایک بہترین ترجمہ ہے۔ سعدی کی نظم و نثر دونوں کا ترجمہ امجد صاحب نے اپنی دلچسپ نثر میں کیا ہے۔ اور جا بجا اپنی رباعیات اور قطعات پیش کرتے گئے ہیں اس طرح گویا یہ گلستان سعدی گلستان امجد بن گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے۔ مولانا کے خیالات کا مختصر اقتباس ملاحظہ کے قابل ہے۔

"دونوں (سعدی شیرازی اور امجد حیدرآبادی) میں عجیب مماثلت ہے۔ وہ بھی صوفی یہ بھی صوفی۔ وہ شاعر یہ بھی شاعر۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے فقروں والی نثر کی پیالیوں میں قند و نبات گھولنے والے اور یہ بھی۔ اخلاق اور نصیحت کی تلخی کو شہد و شکر میں ملا کر وہ بھی پلاتے تھے اور یہ بھی پلاتے ہیں۔ مجاز و حقیقت کا پردہ وہ بنتے تھے اور یہ بھی بناتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے، مختصر جملے، ٹھیٹ محاورے، دلکش ترکیبیں، موٹے موٹے لفظوں سے پرہیز اس کتاب کی خاص خصوصیتیں ہیں۔"

"میاں بی بی کی کہانی" میں بصورت افسانہ میاں بی بی کے تعلقات کا تذکرہ ہے۔ عورت کی مظلومی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مگر اس کو بھی اخلاق اور

[1] ملاحظہ ہو آجکل بابت ۱۵ جولائی ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۰۔

تصوف کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ امجد صاحب کی نثر کے بعض خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

آپ کی نظم کی طرح نثر بھی بالکل صاف۔ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے۔ اس میں فارسی اور عربی کے لغات اور ثقیل الفاظ نہیں ہوتے۔ اس کے سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہیں ہوتی۔

آپ کی نثر چھوٹے چھوٹے جملوں سے مرکب ہوتی ہے۔ اس کے جملوں میں مبتدا اور خبر میں زیادہ فصل نہیں ہوتا۔

آپ کی نثر میں کبھی کبھی شوخی اور ظرافت کے گرم گرم فقرے آجاتے ہیں جن سے ہر پڑھنے والے کو ایک خاص لطف ملتا ہے۔ اور کبھی ہندی کے الفاظ اور جملے آپ کی نثر میں آجاتے ہیں جس سے ایک شیرینی پیدا ہو جاتی ہے۔

اخلاق اور نصیحت کی کڑوی کسیلی باتوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اس کی تلخی شیرینی سے بدل جاتی ہے اور پڑھنے والوں کو گراں نہیں گزرتا بلکہ دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔

نظم کی طرح نثر میں بھی حکمت، معرفت، سلوک اور باطن کے بیش بہا مضامین اس طرح صاف اور واضح طور پر ادا ہوتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو گراں نہیں گزرتے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وعظ اور نصیحت کے بڑے بڑے مضمون یا طولانی تقریر سے وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی جو آپ کی ایک مختصر حکایت یا فقرے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

آپ نظم ہو یا نثر دونوں میں کسی شخص خاص کے اسلوب بیان کی پیروی نہیں کرتے بلکہ آپ کا طرز بیان سب سے بالکل جداگانہ اور نرالا ہے۔ اس کے آپ ہی موجد ہیں۔

ادبی حیثیت سے آپ کی نثر بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے لطف زبان اسلوب بیان کی جدت طرز ادا کی دلکشی قابل داد ہوتی ہے۔

یہاں مختصر طور پر آپ کی نثر کے بعض اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

"ایک دفعہ نیند سے اٹھ کر کہنے لگیں۔ رات میں نے عجیب تماشا دیکھا وہ یہ کہ لیلیٰ محمل میں سوار ہے اس کے ناقے کی مہار قیس کے ہاتھ میں ہے کیونکہ ناقہ لیلیٰ کا حمال قیس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے قیس انتہائے مسرت میں کودتا پھاندتا ناچتا اچھلتا مہار تھامے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ قیس کی طرح ناقہ تو مجنوں نہیں تھا وہ اپنی معمولی رفتار سے ریتیلے میدان میں ایک ایک قدم رکھتا ہوا چل رہا ہے۔ مہار ہے۔ کہ خود بخود لمبی ہوتی چلی جا رہی ہے"۔ (جمال امجد)

"بڑھاپے میں جوانی کا رنگ کس طرح آسکتا ہے بہا ہوا پانی پھر ندی میں واپس نہیں ہو سکتا۔ سوکھا ہوا کھیت سبزۂ نو کی طرح کہاں لہلہا سکتا ہے۔ افسوس جوانی جاتی رہی۔ ہائے جوانی، جوانی کے ساتھ ہی اصل زندگی رخصت ہو گئی۔ اب تو مردوں کی طرح ایک جگہ پڑا ہوا ہوں۔ ایک بڑھیا نے خضاب لگا کر اپنے سپید بال کالے کر لئے تھے۔ میں نے کہا نانی اماں بالوں کو تو تم نے خضاب سے کالا کر لیا۔ مگر اس کبڑی پیٹھ کا کیا علاج کرو گی"۔ (گلستان امجد)

عائشہ شادی کے پہلے کس قدر ہنس مکھ۔ ملنسار۔ بامروت لڑکی تھی عزیز تو عزیز اڑوس پڑوس والیاں بھی اس پر جان دیا کرتی تھیں۔ اس سے ایک دفعہ مل لینا ہمیشہ کے لئے طوق بندگی گردن میں ڈال لینا تھا۔ نوکر اس کے شیدا سہیلیاں اس کی دیوانی۔ گھر میں ہر آنے والا پہلا قدم رکھتے ہی پوچھتا عائشہ ماں کہاں ہیں۔ صورت میں ماہتاب۔ سیرت میں لاجواب۔ گھر بھر کی جان تھی۔ آخر بدر کامل بغیر ہالے اور پیکر ناز بغیر آغوش محبت کے کب تک رہ سکتا ہے۔ عائشہ کی شادی ہو گئی"۔ (حکایات امجد)

امجد صاحب ناول یا افسانہ نگار نہیں ہیں اور نہ آپ نے کوئی ڈرامہ لکھا ہے بلکہ تصوف اور اخلاق ہی آپ کا موضوع ہے۔ مگر اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ تصوف اور اخلاق کو ایسے پیرایہ میں اور ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ان سے ناول اور افسانہ کا مزہ ملتا ہے۔ اور ایسے مکالمے لکھتے ہیں جس سے ڈرامہ کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ یہ آپ کی وہ خصوصیت ہے جو کسی اور نثار یا ادیب میں نہیں پائی جاتی۔

افسانہ نویس کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے سدھار کے لئے افسانہ کی صورت میں سبق آموز واقعات پیش کئے جائیں۔ پڑھنے والوں کو یہ نہ معلوم ہو کہ افسانہ کا مقصد عبرت انگیزی یا آموزی ہے بلکہ بظاہر تفریح طبع اور دلچسپی ہوتی ہے لیکن ان کا حاصل مقصد سبق آموزی ہوتا ہے۔ امجد صاحب افسانہ نویس نہیں ہیں۔ مگر ان کا مقصد یا پیام انسانی زندگی کا سدھار ہے۔ وہ "محبت" "نیک زندگی" اچھی عادت برائی سے پرہیز کے لئے اپنے کلام نظم و نثر سے سامان ضیافت کرتے ہیں۔ نصیحت کی کڑوی کسیلی باتوں کو شیرینی لپیٹ کر پیش کرتے ہیں غرض آپ کا انداز بالکل فارسی کے ادیب سعدی کا سا ہے۔ اسی لئے مولانا سید سلیمان ندوی نے آپ کو حیدرآباد کے سعدی کا لقب دیا ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ فقط۔

آپ کیا چاہتے ہیں

افسانہ

بلدیپ کور

آج طبیعت کچھ عجیب الجھی ہوئی سی تھی دل بہلانے کے خیال سے بازار کی طرف نکل گیا۔ چلتے چلتے سینما تک پہنچ گیا۔ فلمی ریکارڈ بج رہے تھے۔ لوگ انہیں سننے کے لیے اکٹھا ہو گئے تھے اور خوب غور سے سن رہے تھے۔ بھلا وہ لوگ جنہیں کچھ کام نہ ہو اور جائیں بھی کہاں؟ —— میٹھے میٹھے ترانے فضا میں گونج رہے تھے۔ ان کی مٹھاس کانوں کی راہ سے میرے احساس میں گھلتی چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ آج سینما ہی کیوں نہ دیکھا جائے؟ طبیعت بھی بہل جائے گی اور وقت بھی آسانی سے کٹ جائے گا۔

سینما گھر کے بکنگ آفس کے پاس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ٹکٹ بابو کی کرسی پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے اور وہ ہر ٹکٹ لینے والے کو دیکھ کر مسکرا دیتی ہے اب سمجھ میں آیا کہ یہاں اتنی زیادہ بھیڑ کیوں ہوتی ہے!

اس دوشیزہ کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عیسائی ہے، عمر بیس کے لگ بھگ سمجھئے —— فلم شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ میں نے کئی بار کھڑکی کے اندر سے اسے جھانک کر دیکھا اور اس کی مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوا۔ اس نے مجھے اپنا منہ تکتے دیکھ کر اس طرح مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں اس سوال کا جواب نہ دے سکا اور کھڑکی سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

اب فلم شروع ہونے والی تھی۔ بھیڑ دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ کھڑکی خالی دیکھ کر میں پھر کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اب وہ بالکل سنجیدہ سی بیٹھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ مسکراتے مسکراتے اس کے ہونٹ تھک گئے ہیں یا پھر کسی کی یاد اسے ستا رہی ہے اور اس میں وہ کھو گئی ہے۔ جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی پھر اسی انداز سے مسکراتے ہوئے اس نے سوال کیا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے کچھ کہے بغیر ٹکٹ کے پیسے بڑھا دیئے وہ مجھے جونہی ٹکٹ دینے لگی میں نے جان بوجھ کر اس کی انگلیوں کو پکڑ لیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ میرا دل دھڑکنے لگا —— اور اس نے مسکراتے ہوئے پھر وہی سوال کیا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"میں ..... میں" الفاظ میرے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

"اچھا آپ سینما دیکھ آیئے۔ میں آپ کا انتظار کروں گی!" وہ مجھ سے بہت نرم لہجہ میں بولی۔

میں ٹکٹ لیکر بغیر کچھ کہے ہال کی طرف بڑھا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ فلم شروع ہوئی اور ختم ہو گئی مگر مجھے خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں ختم ہو گئی۔ میرے حواس میں عجیب قسم کا جمود پیدا ہو گیا تھا۔ بس وہی الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ "آپ کیا چاہتے ہیں!"

ساڑھے بارہ ہو چکے تھے۔ سینما سے لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے سینما کی دوکانیں بند ہو گئیں اور آخر کار سینما کے سامنے والی بڑی بتی بھی بجھا دی گئی۔ میں ایک کونے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں کہ اتنے میں وہی عورت میرے پاس آ کر بولی۔ "کیا آپ میرے ساتھ چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

پہلے تو میں نے سوچا نہ جانے یہ مجھے کہاں لے جائے؟ اس وقت جانا ٹھیک نہیں! مگر پھر آپ ہی آپ میرے منہ سے نکل گیا۔ "چلئے چلتا ہوں" اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ اس نے اپنی چھتری کھول لی اور مجھے بھی چھتری میں لے لیا۔

ہم دونوں خاموش چلے جا رہے تھے —— میری سانس کی تیزی وہ ضرور محسوس کر رہی ہوگی —— میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ آخر چلتے چلتے وہ ایک گلی میں مڑ گئی۔ یہ گلی بہت تنگ تھی —— چلتے چلتے وہ ایک مکان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور چابی نکال کر دروازہ کا تالا کھولا —— میں دل میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اسی مکان میں رہتی ہے؟ گھر دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی بہت ہی غریب آدمی کا مکان ہو جو بمشکل تمام اپنا پیٹ پالتا ہو اور بری طرح اپنے زندگی کے دن پورے کر رہا ہو۔ ایک معمولی سی چارپائی، کچھ کام چلاؤ برتن۔ کچھ ٹوٹے ہوئے صندوق ایک مٹی کا چراغ —— اور ایک طرف وہ مسکراتا ہوا چہرہ جو سینما کے منچلوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ مجھے اس کے رہنے سہنے کا یہ سادہ انداز دیکھ کر اس پر ترس آ رہا تھا —— کتنی معمولی زندگی گذار رہی تھی وہ! دکھ سے بھری ہوئی زندگی، مجھے وہ لوگ یاد آ گئے جو اسے سینما میں غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یہ کیا خبر تھی کہ اس کی مری ہوئی مسکراہٹ کے نیچے دکھ اور درد کی کتنی موٹی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ تبسم کے ان شعلوں میں غم کا کتنا دھواں ہے؟ کاش وہ دیکھ سکتے کہ اس مسکراہٹ کے پردہ میں کتنی تلخیاں اور اداسیاں ہیں، اس کے دل میں کتنے زخم ہیں جنہیں چھپانے کے لئے وہ ہنس رہی ہے، مسکرا رہی ہے، مگر عورت کو صرف عورت سمجھ کر دیکھنے والوں میں اتنی حس کہاں کہ ذرا سی دیر کے لئے وہ جذبات کی آگ کو بجھا کر، انسانی سطح پر آ کر دیکھیں کہ ایک مسکراتی ہوئی عورت کی چھاتی میں کتنی چنگاریاں بھری ہوئی ہیں ——!

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ وہ چراغ اٹھا لائی اور اسی طرح مسکرا کر بولی۔

"آئیے میری جھونپڑی تو دیکھ لیجئے"۔ میں سوچنے لگا کہ اب کونسی اچھی یا بری چیز رہ گئی ہے جو یہ مجھے دکھانا چاہتی ہے؟ پھر بھی میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا پہلے وہ مجھے رسوئی گھر میں لے گئی پھر صحن سے گذر کر ایک کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس میں ایک الماری تھی جس میں دواؤں کی چند شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پلنگ پر سفید چادر اوڑھے کوئی لیٹا تھا، چادر سانس کی حرکت سے نیچے اوپر ہو رہی تھی پاس ہی ایک صراحی رکھی تھی، اس سے لگا ہوا ایک گلاس رکھا تھا ——— ایک چراغ پہلے سے وہاں ٹمٹما رہا تھا دوسرا آ جانے سے روشنی میں کچھ اضافہ ہوا۔ وہ بڑی ہوشیاری اور نرمی سے چادر کو سرہانے سے اٹھا کر بولی۔ "یہ میرے پتی ہیں"۔ تین سال پہلے ریلوے میں ٹرافک انسپکٹر تھے، ہماری زندگی آرام سے گذر رہی تھی مگر قسمت نے پلٹا کھایا اور یہ بیمار پڑ گئے اور پھر ان کی حالت روز بروز بگڑتی ہی چلی گئی" ——— اس کے گال پچکے ہوتے تھے، آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں، ہونٹ جیسے زندگی کے رس سے خالی ہوتے جا رہے تھے ——— میرے سینہ میں ایک گھونسا سا لگا، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے حیرت اور تعجب سے دیکھ رہا تھا اور وہ کہتی چلی جا رہی تھی "جو کچھ پونجی تھی دھیرے دھیرے کر کے ختم ہونے لگی اور آخر ایک دن سب کچھ ختم ہو گیا مگر یہ اچھے نہ ہوئے پھر بھی جب تک سانس تب تک آس، میں ان کا علاج کیے جا رہی ہوں اور ان کی صحت کی آس پر جی رہی ہوں ——— نوکری کرنے کے بعد اپنے فرائض کا احساس بھی کرنا پڑتا ہے یہی احساس ہے جو سینما کی کھڑکی پر بیٹھنے کے بعد مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر دوڑنے لگتا ہے۔ دل روتا رہتا ہے۔ آتما سسکتی رہتی ہے مگر میں مسکرائے جاتی ہوں، اس لئے کہ مسکرانا میرے فرائض میں داخل ہے، رونا دھونا تنہائی کی باتیں ہیں نوکری پر تو مسکرانا ہی پڑتا ہے، اسی کی مجھے تنخواہ ملتی ہے، میں مسکراتی رہتی ہوں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ میری اس مسکراہٹ میں مٹھاس ہے" ——— اتنے میں مریض کراہتے ہوئے اپنی بیوی سے بولا۔

"آج اتنی دیر کہاں لگا دی؟"

"تم نے دوا پی لی؟" عورت بات کاٹ کر بولی

"نہیں!" اس نے کہا "آج اٹھنے کی سکت ہی نہ تھی مجھ میں، دوا تک میرا ہاتھ نہ پہنچ سکا لیٹے لیٹے!"

عورت نے جلدی سے گلاس میں بھر کر دوا پلائی۔ اس کے بعد ہم لوگ وہاں سے ہٹ کر ذرا دور کھڑے ہو گئے ——— کچھ دیر چپ رہ کر وہ پھر بولی۔

"اس طرح میں مسکراہٹ کے پردہ میں اپنے دکھوں کو چھپا کر روزینہ کما لاتی ہوں جو ان کی دوا پر خرچ ہو جاتے ہیں انہیں پیسوں سے اپنے دوزخ کو کسی نہ کسی طرح ——— ورنہ؟"

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ مجھے مسکرانے کی مہلت کہاں؟ ——— جب میں مسکراتی ہوں میرے دل کی آگ اور بھڑک جاتی ہے، ہونٹوں کی وہ مصنوعی حرکت جسے آپ تبسم کہتے ہیں میرے زخموں کو اور کھرچ ڈالتی ہے پھر بھی میں مسکراتی ہوں ——— زندگی اسی کا نام ہے! آگ اور پانی کے اسی ملاپ کو زندگی کہتے ہیں"۔

میرا سر چکرانے لگا، میں اپنے کئے پر پچھتا رہا تھا، مجھ میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سے نگاہیں ملا سکوں ——— بغیر کچھ کہے میں دروازہ کی طرف بڑھا ——— نہ جانے وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہو گی۔

آہ عورت! ——— مجبور اور وفادار عورت!! میرے سینہ میں انگارے دہکنے لگے، احساس میں ایک دم بہت سی چنگاریاں سلگ اٹھیں، مجھے دنیا اور دنیا والوں سے ایک شدید نفرت محسوس ہونے لگی ——— اب میں ایک چوڑی سڑک پر چل رہا تھا جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر بجلی کے کھمبے کھڑے تھے، روشنی سڑک پر پھیل رہی تھی، ایک کھمبے کے نیچے سے گذرتے وقت بہت سے پتنگے میرے منہ سے چمٹ گئے ——— وہ روشنی کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے ——— میں نے سوچا روشنی میں بڑی کشش ہے، وہ ہزاروں لاکھوں پروانوں کو گھسیٹ لاتی ہے اور پروانے یہ دیکھے بغیر کہ اس روشنی کے پیچھے کیا ہے؟ اس کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں ——— مجھے سینما کی وہ بھیڑ یاد آ گئی جو محض ایک تلخ مسکراہٹ کے لئے وہاں اکٹھی ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا وہ لوگ بھی ——— جو ایک ستائی ہوئی عورت کے گرد تبسم کے لئے سینما کی کھڑکی پر جمع ہو جاتے ہیں ان پروانوں ——— بے حس اور بے شعور پروانوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی وقت گھبرا کر میں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار دیا اور دو تین کیڑے میرے ہاتھ کے نیچے کچل کر رہ گئے!

ساجن سے

آؤ ساجن آؤ نا!

دیکھو چاند گگن میں سویا ۔۔۔ جگ ہے اپنی نیند میں کھویا

میں دکھیاری تم بن تڑپوں

آؤ دھیر بندھاؤ نا! ۔۔۔ آؤ ساجن آؤ نا!

پل پل آئے یاد تمہاری! ۔۔۔ ساجن تم جیتے میں ہاری

درشن کو اکھیاں ترستی ہیں

آؤ۔ اب نہ ترساؤ نا! ۔۔۔ آؤ ساجن آؤ نا!

کون تمہیں جا کر سمجھاوے ۔۔۔ برہ کی اگنی کون بجھاوے

ڈول رہی ہے من کی نیا

آؤ پار لگاؤ نا! ۔۔۔ آؤ ساجن آؤ نا!

قاسم علی

حسینؑ اور انسانیت

آج دنیا کے ہر گوشہ میں ایک غمناک واقعہ کی یاد لوگوں کو آرہی ہے، جسے ہوئے ۱۳۰۰ برس سے اوپر گذر گئے۔ کیا یہ کسی خاص عصبیت کو قائم رکھنے کی خواہ مخواہ کوشش ہے؟

انسانی تاریخ کا دامن کیا المناک حوادث سے اتنا خالی ہے۔ اور رنج والم اور درد و کرب کیا انسانی زندگی میں ایسے نادر تجربے ہیں کہ بس بعض المناک حوادث کو چن چن کر یاد رکھا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ بات اس سے زیادہ گہری اور انسانیت کے لئے زیادہ اہم ہے۔ مجھے تو اس واقعہ میں انسانی ارتقار کے اصل اصول کا راز چھپا نظر آتا ہے۔ اسے یاد کرکے، اسے یاد رکھ کر یا انسانیت جو بھولتی بھی ہے بھٹکتی بھی ہے سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر بگ ڈنڈیوں پر پڑی پھرا بھی کرتی ہے۔ اور آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ وہ انسانیت اس واقعہ کو یاد کرکے، سچ یہ ہے کہ اپنی صحیح راہ کو یاد کرتی ہے۔ اور ایک دفعہ پھر منازل ارتقائی کو طے کرنیکا قصد کرتی ہی جاہے یہ یاد دھندلی سی یاد ہو۔ چاہے یہ قصد بہت ہی کمزور سا ارادہ ہو۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی خاص سیاسی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے۔ اور بہت سے دوسرے واقعات سے مربوط ہوتا ہے۔ ربط کا یہ حلقہ اکثر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اور تاریخ انسانی کی وسعت میں یہ مربوط وحدت زیادہ عرصہ تک موثر وحدت کی حیثیت نہیں رکھ سکتی۔ اور تاریخ اسے ہوتے ہوتے بھلا دیتی ہے۔ لیکن بعض واقعات باوجود اپنی تاریخی، مکانی و زمانی پابندیوں کے حیاتِ انسانی کسی ایسے اہم اصول کے ترجمان ہوتے ہیں۔ کہ جب تک وہ اصول کار فرما ہے۔ ان کا بھلانا ذہن انسانی کے لئے دشوار ہوتا ہے۔ وہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہوتا۔ سارے واقعات کی روح ہوتا ہے۔ ان واقعات کا فہم حوادث تاریخی کے بے ربط و بے ترتیب سے انبار میں ربط و ترتیب پیدا کر دیتا ہے۔ ان سے تاریخ کی تاریکیوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے۔ اور اس کا بظاہر بے معنی سا سلسلہ واقعات بامعنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ شہادت حسینؑ کا واقعہ اسی قسم کے واقعات میں سے ہے۔ یہ ایک مخصوص تاریخی چوکھٹے میں دراصل زندگی کے عالمگیر اصل اصول کو انسانیت کو سامنے پیش کر دیتا ہے۔

ذاکر حسین خاں

قدرت نے انسان کے علاوہ ہر بے جان اور جاندار مخلوق کو اپنے وجود کا توازن پانے کے لئے اندرونی کشاکش سے بچایا ہے۔ کہیں مادی خواص کو۔ کہیں فطری جبلتوں کو اس توازن کا ضامن بنا دیا ہے۔ داخلی تضاد کی کٹھن منزل جو انسان کے لئے انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں مقدر رہی۔ اس سے اور ساری مخلوق محفوظ ہے۔ پتھر بھی اس سے مامون ہیں، جانور بھی فرشتے بھی۔ ایک انسان ہی ہے۔ جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشاکش سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے یہ اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے پا بھی سکتا ہے ایسا لگتا ہے کہ انسان شاید ایک درمیانی عبوری مخلوق ہے۔ اس کے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقہ سے ملتی ہیں۔ ایک طرف الٰہی سے۔ اس کے سینے کو متضاد قوتوں اور میلانوں کا جولانگاہ بنا کر۔ کفر و شرک کی کشاکش میں اسے ڈال کر، روحِ انسانی کو یہ سعادت ارزانی کی گئی ہے۔ کہ وہ اسی مشکل میں ایک ہم آہنگ و متوازن حیات طیبہ کی تعمیر کر سکتی ہے۔ مادی اشیا کی دل فریب کشش سے بھی اسے واسطہ ہے۔ اور مادیت سے دامن چھڑا لینے کا شدید ولولہ بھی اس میں کارفرما ہے۔ یہ خود غرضی خود بینی کا مرکز بھی ہے۔ اور محبت کی بے غرضی و بے نفسی سے بھی اسی کا سینہ معمور ہے، یہ سفاکانہ تاخت و تاراج کے بے خیال اور برخود غلط جنون کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور بے تھکن کٹھن سے کٹھن جماعتی تعمیر کے لئے اپنی قوت کا ایک ایک شمہ بھی وقف کر سکتا ہے، یہ تمرد اور رعونت و غرور کے نشہ میں معصوم گردنوں سے خون کے دریا بہانے سے نہیں جھجکتا، اور خنجر تسلیم و رضا کا کشتہ بننا بھی اسی کو آتا ہے۔ یہی حریصوں کی طرح بٹورتا ہے یہی بہار کی طرح لٹاتا ہے۔ یہی اوروں سے چھینتا ہے۔ اور یہی اپنا سب کچھ اوروں پر نثار کر دیتا ہے۔ یہی پلی پلی جوڑتا ہے، یہی گپے ڈھلکاتا ہے۔ یہی ہر تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیر اسی کے شرمندۂ احسان ہیں۔ یہی احتیاط کے مارے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے اور پھر یہی سرفروشانہ دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے، یہی زمین سے نگہ نہیں ہٹا سکتا۔ یہی ستاروں سے باتیں کرتا ہے۔ یہی غفلت میں اعلیٰ سے منہ موڑ کر ادنیٰ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یہی ہوشیار ہو کر ادنیٰ کی آلودگیوں سے دامن جھٹک کر اعلیٰ کی طرف بے تابانہ بڑھتا ہے، یہی زندگی پر جان دیتا ہے اور حیات بے شرف تک پر راضی ہو جاتا ہے، یہی جان دے کر زندگی کا چراغ روشن کرنا بھی جانتا ہے اور مرگِ باشرف کو اصل حیات اور ضامنِ حیات مانتا ہے یہی سرکشی کرتا ہے، یہی سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یہی کافر ہے یہی مومن، یہی فرعون ہے یہی موسیٰؑ یہی شرار بولہبی ہے یہی چراغ مصطفویؐ، یہی یزید یہی شبیرؑ:۔

اور اس کے ارتقا کا سارا راز، بہائم پر اس کی فضیلت کی اصل، اس کی انسانیت کا سرا شرف اس میں ہے کہ یہ ادنیٰ پر اعلیٰ کو ترجیح دینے کے لئے اپنے ضمیر کی پکار، اپنے قلب کے حقیقی میلان، اپنی عقلِ سلیم کے سچے رجحان کی وجہ سے مجبور ہے۔ یہ اس پکار کو ٹالتا ہے۔ اس میلان کو دباتا ہے۔ اس رجحان کو توڑتا مروڑتا ہے لیکن ان سے خالی نہیں ہو سکتا یہ برائیاں کرتا ہے مگر اچھائی سے ہمیشہ کے لئے روگردانی نہیں کر سکتا، ظلم کرتا ہے مگر عدل کے مطالبے

اسے بے چین رکھتے ہیں۔ باطل کی حمایت کرتا ہے مگر حق سے دامن نہیں چھڑا سکتا۔ بدنمائیوں پر فاتح نظر آتا ہے مگر حسن کے جادو سے پوری طرح محفوظ کبھی نہیں ہوتا۔ اسفل کی گھاٹیوں میں رہتے ہوئے بھی ایک گوشۂ چشم سے اعلیٰ کی چوٹیوں کو تکتا رہتا ہے جب برائیوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ جماعتی زندگی مفاسد سے پُر ہوتی ہے اور ضمیر کی انفرادی زندگی اس مسموم ہوا میں دم توڑتی ہوتی ہے اس وقت کا اس کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے حقیقی ضمیر کا ترجمان، اس کی اعلیٰ قدروں کا محافظ اور معلم بن کر اسے جھنجھوڑتا ہے، بیدار کرتا ہے، اور اپنے کو خطرہ میں ڈال کر اسے اپنی حقیقی تقدیر کے لئے فراموش کرنے یعنی روحانی خودکشی سے باز رکھتا ہے۔ کربلا میں شہادتِ حسینؑ کا واقعہ ارتقاءِ انسانی کے اس عمل کا ایک مہتم بالشان غیر فانی، تاریخی مظاہرہ تھا۔ یہ باطل کے مقابلہ میں حق کا۔ جماعتی مفاسد کے مقابلہ میں افرادِ صالحہ کے فریضہ انقلاب کا، حکومت کے ظلم کے مقابلہ میں شہری کے مطالبۂ عدل کا، بے دینی کے مقابلہ میں دین کا سینہ سپر ہونا تھا کہ کہیں مصلحت اندیشی، خوف، تن آسانی انسان کو اقدارِ مطلقہ کے مطالبوں سے بیگانہ نہ کر دیں۔

وہ قوتِ ارتقائی ہی جس کے حاملِ حسینؑ اس تاریخی واقعہ میں تھے۔ انسان کی حیاتِ طیبہ کی ضامن ہے۔ یہی اسے بہیمیت کے اسفل السافلین میں لوٹ جانے سے روکتی ہے اور اس کا طریق کار بس یہی ہے کہ اس کے حامل اسکے تقاضوں کو اپنی زندگی میں پورا کریں کہ اس کے تقاضے، اس کے مطالبے، دلیلوں سے منوائے نہیں جا سکتے نہ خالص عقلی مقولوں میں ثابت کئے جا سکتے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں برت کر دکھانا ہوتا ہے ان کے لئے آرام و آسائش کو تجنا ہوتا ہے۔ اپنے پرائے کا برا بننا ہوتا ہے۔ محبت کے پھول برسا کر سنگِ تکفیر کھانے ہوتے ہیں۔ دعاؤں کے جواب میں گالیاں کھانی ہوتی ہیں۔ مخلصانہ خدمتوں کے عوض میں بدگمانیاں اور بے اعتمادیاں ملتی ہیں۔ اور ان سب کو مسکرا کر سہنا ہوتا ہے۔ اور ان کی خاطر جیئے جانا ہوتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ وضاحت سے اور اپنی غیر مشروط مطلق شکل میں اسوقت سامنے آتے ہیں جب ان کے لئے ناکامیابیوں کو کامیابیوں پر اور محرومیوں کو کامرانیوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور اپنی پوری شان اور رنگینی میں اسوقت جب ان کے لئے جان کی بازی لگانی ہوتی ہے۔ کربلا کے میدان میں اقدارِ مطلقہ کی یہ حمایت اپنی اسی صاف اور واضح اور بے میل شکل میں دنیا کے سامنے آئی اور ایک "داستانِ سادہ رنگین" سے تاریخ انسانی کو ہمیشہ کے لئے مالا مال کر گئی۔

کس سادگی سے فرمایا اس شہیدِ انسانیت نے حق پر اپنی آخری شہادت سے ایک شب پہلے "لوگو! دنیا نے رنگ کیسا بدل لیا ہے؟ نیکی سے خالی ہو گئی ہے! افسوس دیکھتے نہیں کہ حق کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اور باطل پر اعلانیہ عمل کیا جا رہا ہے، اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے۔ اسے سہارا دے! بس اب وقت ہے کہ مومن حق کی راہ میں بقاءِ الٰہی کی خواہش کرے۔ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے۔" یہ شہیدِ حق "تاج و تخت لینے نہیں نکلا ہے۔ تاج و تخت لینے والے بقائے الٰہی کی خواہش نہیں کیا کرتے! تاج و تخت چاہنے والے یکسوئی سے شہادت کا قصد کر کے نہیں نکلا کرتے۔ تاج و تخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکرِ جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہیدِ حق اس "سستی کامیابی" کے لئے نہ نکلا تھا۔ جو انسان کو اکثر سچائی اور اچھائی سے بے تعلق و بیگانہ کر دیتی ہے۔ "کامیابی" چاہنے والے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو معرکہ سے پہلے ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے۔ وہ مقابلے کی پہلی کی شب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ "کل میرا ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ میری رائے ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہید اپنی شہادت کو انسانیت کے لئے اتنا صاف اور واضح بنانا چاہتا ہے۔ کہ کسی کو سمجھنے میں ذرا دشواری نہ ہو۔ پھر جب وفادار ساتھی ساتھ نہیں چھوڑتے تو قربانگاہ تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے سب کی قربانی پیش فرماتے ہیں۔ ایک ایک کر کے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے۔ جوان بیٹے کو اپنے آگے راہئ ملکِ بقا کیا جاتا ہے۔ شیر خوار پیاسے بلکتے بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنی جان کا ہدیہ جان آفریں کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا حق کے لئے قربانی کا سبق دینے والا قربانی کی ہر دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال بیک وقت پیش کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی قربانی بھی ایسی ہے جو نہ کی جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور ہے ادھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب عادتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان پر ظاہر نا کام مخالفوں کے سر کاٹے جاتے ہیں۔ ان کی لاشیں روندی جاتی ہیں۔ انکی عورتوں کے سروں سے چادریں اتاری جاتی ہیں۔ ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں۔ رسیوں سے باندھا جاتا ہے۔ طوق پہنائے جاتے ہیں۔ ناکامی کی ہر ممکن شکل کا ظہور ہوتا ہے۔ تاکہ حق پرستی کا سب سے مؤثر سبق انسانیت کے ذہن نشین ہو جائے۔ حق کا ساتھ دینا جب کامیابی سستی وقتی کامیابی، اس کے جلوؤں ہو کچھ بہت دشوار نہیں۔ اس کی راہ میں ناکامیوں کو سینہ سے لگانا اور اس کی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرتا ہے۔ یہی ارتقاءِ انسانیت کی ضمانت ہے یہی شہادتِ حسینؑ کا ماحصل، اسی کے حسینؑ انسانیت کے محسنینِ اعظم میں ہیں۔ اور ان کی شہادت کی داستان تاریخ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی رنگین ورق۔

(آواز سے منقول)

ترکی ادب کے بنیادی عنصر

ایس کے چودھری

ترکی انقلاب پر ترکی ادب کا اثر بے حد نمایاں ہے۔ اس بات کو جرمی طاہر نے ایک جگہ یوں بیان کیا ہے "ترکی کے موجودہ حیرت انگیز انقلاب کے پیچھے جن قوتوں کا اثر نظر آتا ہے ان میں سے ایک قوت اس کے ادیبوں کی ہے۔ کسی قوم کے بہت بڑے حصہ میں اگر اس حد تک بنیادی تبدیلیاں پیدا ہو جائیں جتنی پچھلے چند برسوں میں ترکی میں ہوئی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خیالات بہت بڑی حد تک اس کے ادب میں کافی عرصہ سے موجود ہیں۔ سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ ترکی انقلاب بغیر کسی تیاری کے جیسے یکایک کہیں سے پیدا ہو گیا۔ حالانکہ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ترکی عوام میں خیالات کی جو نئی رو دوڑ چکی ہے اس کی جڑیں کئی طرف کو پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم شاید ترکی ادیبوں کی قیادت ہے"۔

پہلا شخص جس نے مغرب کی طرف اپنا منہ موڑا اور انقلاب فرانس کے عجیب و غریب نئے تصورات ترکوں تک پہنچائے شناسی آفندی (۱۸۲۶ء۔ ۱۸۷۱ء) تھا۔ اس کام میں اس کے دوسرے شریک ضیا پاشا (۱۸۲۹ء۔ ۱۸۸۰ء) اور ناسق کمال (۱۸۴۰ء۔ ۱۸۸۸ء) تھے۔ شناسی آفندی کے اخبار "تصویر افکار" اس نئی تحریک کو لوگوں تک پہنچانے میں سب سے بڑا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ ناسق کمال کے اخبار "حریت" نے بھی یہ خدمت انجام دی۔

عبدالحمید کے عہد میں ناسق کمال کو بڑی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ یہاں تک کہ اس کی موت بھی جلاوطنی میں ہوئی۔ اس عہد میں قومیت کی تحریک کے سلسلہ میں سب سے نمایاں نام ضیا گیوک آلپ (وفات ۱۹۲۵ء) کا ہے۔ اس نے نہ صرف قومیت کے تصور کو اپنا مسلک بنایا بلکہ ایک اہم خدمت یہ بھی کی کہ فرانس کے مشہور ماہر عمرانیات درخیم کو ترکی میں روشناس کیا اور اس کا مادی عمرانی نظریہ ترکی معلموں میں عام ہوا۔ ضیا گیوک آلپ نے "ترکی قومیت" کی بنیادی کتاب "ترکچولق اساسلری" (ترکیت کا اساس) کا مصنف بھی ہے۔ یعقوب نادری بھی ترکی کے انقلابی دور کا بڑا جوشیلا اور تلخ مصنف ہے اس نے بھی ترکی کے انقلابی جذبہ اور عمل پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کی کتاب سوڈوم وگموڈے (جس کا ترجمہ فرانسیسی میں بھی ہوا) ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد قسطنطنیہ پر برطانیہ، فرانس اور امریکا کے فوجی مشنوں کے قبضہ کی بھیانک تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ان متوسط طبقہ کے ترکوں کا تذکرہ کیا ہے جو بیودرے اور سقوطری کے عیش کوش علاقوں میں آباد تھے۔ ان سارے مصنفوں نے کمالی انقلاب اور کمالی نشاۃ ثانیہ میں نمایاں عملی حصہ لیا۔ اس بات کو جرمی طاہر نے ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے "ترکی میں ادیبوں کی حیثیت بے حد موثر علمی جماعت کی سی ہے جس کسی نے کمالی انقلاب سے پہلے کے واقعات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ یہ ادیب حقیقت میں انقلابی تھے اور یہی شاعر اور ناولسٹ تھے جن کے پیش کئے ہوئے آدرشوں کو سیاسی لیڈروں نے عملی جامہ پہنایا"۔

ضیا گیوک آلپ کے ناول "قزل المہ" (سرخ سیب) کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں ترکی قومی نشاۃ ثانیہ کی خواہش کس درجہ تیز تھی۔ کہانی بالکل ایک پیمبرانہ شان میں لکھی گئی ہے اور مصنف کے سارے تصورات اتاترک کی قیادت میں عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کہانی کا ہیرو ترغوت نامی ایک شخص ہے۔ وہ ترکی کے زوال سے مایوس ہو کر کسی "پاک سرزمین" کی جستجو میں نکلتا ہے۔ آذربائیجان کے قریب آئی خانم نامی ایک پری سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ دونوں میں بات چیت ہوتی ہے اور آخری ترغوت سے کہتی ہے "صدیوں تک ترکوں نے اپنی دلیرانہ فتوحات سے اپنی عظمت و شان کو بڑھایا ہے۔ انھوں نے زمین کے دور افتادہ حصوں میں اپنے خیمے نصب کئے ہیں، لیکن انھیں "موعودہ سرزمین" کبھی نہ مل سکی۔ انھوں نے اپنے آپ ہندوستان، چین، عرب، فارس، روم اور یورپ ہر ایک کے رنگ میں رنگا۔ لیکن جب وہ اپنی فتوحات سے دوسروں کی عظمت و بزرگی کو بڑھانے کا خیال چھوڑ کر وہ اپنے وطن لوٹ آئیں گے، صرف جب ہی وہ "موعودہ سرزمین" انھیں مل سکے گی۔ ترکوں کی صرف ایک "تاریخ نہیں بلکہ "تاریخیں" ہیں۔ یعنی اس کی تاریخوں میں دوسروں کے لئے ادب اور تاریخ کے بڑے بڑے دفتر پوشیدہ ہیں۔ اس لئے انھیں چاہیئے کہ وہ پھر اپنی تاریخ کی طرف لوٹیں۔ اپنا تاریخ کی طرف، اپنی زبان کی طرف اور اس کے ابجد کی طرف۔ اور اس طرح وہ موعودہ سرزمین کے بالکل قریب پہنچ جائیں گے"! اسی کے لفظوں میں "ترک قوم دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ جب کبھی اسے کسی ہیرو کی سرداری مل جاتی ہے تو وہ شعلہ کی طرح چمک جاتی ہے۔ سیاست میں بھی، جنگ میں بھی اور کلچر میں بھی۔ یہ ہیرو، یہ لیڈر نہ ہو تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی قیادت کے لئے ہمیشہ کسی نہ کسی ہیرو کی موجودگی ضروری ہے"!

یہ پرجوش تمنا آگے چل کر اتاترک کی شکل میں پوری ہوئی۔

دورِ تنظیمات (۱۸۳۹ء۔ ۱۸۷۶ء) کے دوسرے مصنفوں میں سے ایک کا نام عبدالحق حمید ہے۔ عبدالحق حمید ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک مشہور سیاست داں بھی تھے اور پچھلی صدی کے آخری حصہ میں بمبئی میں قونسل جنرل کی حیثیت سے رہ بھی چکے تھے۔ اور انھوں نے ہندوستانی زندگی کے متعلق ایک ناول بھی لکھا ہے۔ اسی دور کا ایک دوسرا مصنف احمد وافق پاشا (۱۸۲۹ء۔ ۱۸۹۱ء) ہے۔ ترکی زبان میں اس کی نظمیں اپنے قومی اور وطنی

جذبات کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اسی دور میں وامیری، رادلو، تھامسن اور بنیلی جیسے مشہور یورپین ماہروں نے قدیم ترکی تاریخ کے متعلق اپنی تحقیقات کیں اور رادلو اور تھامسن نے خاص کر آٹھویں صدی کی ان ترکی یادگاروں پر بہت کام کیا اور ترکوں نے سائبیریا میں قائم کی تھیں۔ ان یورپین محققوں کی تحقیقات اور ان کے انکشافات سے ضیا گوک الپ (جس کا ذکر پہلے آچکا ہے) بہت متاثر ہوا۔

کمالی انقلاب سے ذرا پہلے عمر سیف الدین (وفات سنہ ۱۹۲۰ء) اور احمد حکمت (وفات سنہ ۱۹۲۷ء) نے ایسے ناول لکھے تھے جنھیں ترکی ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے لیکن وہ حقیقت میں صحیح قومی جذبات سے بہت دور ہیں۔ ترکی ادب میں وطنیت اور قومیت کو ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے داخل کرنے کا کام خالدہ ادیب خانم (پیدائش قسطنطنیہ سنہ ۱۸۸۳ء) اور یعقوب قادری قراعثمان اوغلو نے انجام دیا۔ ان دونوں لکھنے والوں نے ترکی قومی آزادی کی جنگ کا پرشورش زمانہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور عظیم المرتبت اتاترک کے آہنی پنجوں کو ترکی کی نئی تشکیل کرتے بھی دیکھا تھا۔

تاریخی کتابیں لکھنے والوں میں محمد فواد کوبرلو نے اپنی مشہور کتاب اناطولی اسلامیت (اناطولیہ میں اسلام) لکھ کر تنقیدی تحقیق کو ایک نئی راہ دکھائی۔ حکومتِ عثمانیہ کے آغاز کے متعلق اس کی کتاب تاریخی تحقیق کا ایک بے بہا سرمایہ ہے، جس میں قدیم اور جدید، مغربی اور مشرقی ہر طرح کے ممکن ماخذوں سے مدد لی گئی ہے۔ محمد فواد کوبرلو نے تاریخ اور زبان کی تحقیقات سے ترکی میں سائنٹفک تحقیقات کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پہلا ترک محقق ہے جس نے بین الاقوامی شہرت پائی۔

کمالی عہد کے مصنفوں میں ہم اونائیدن (جو ایک زمانہ میں لندن میں سفیر تھا) احمد ہاشم، محمد عاکف، احمد رفیق اور جلال نوری کا نام لے سکتے ہیں۔ یہ سارے مصنف، احمد رفیق اور جلال نوری کو چھوڑ کر شاعر بھی ہیں اور ناول نگار بھی۔ احمد رفیق مورخ تھا اور جلال نوری ماہر عمرانیات۔ ترکی کے یہ سب عظیم المرتبہ مصنف سنہ ۱۹۲۳ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۸ء تک ایک ایک کرکے موت کی نذر ہو گئے۔

موجودہ نسبتاً نوجوان لکھنے والوں میں صدری اتم (پیدائش سنہ ۱۹۰۰ء) ناولسٹ اور یاشار نبی (پیدائش سنہ ۱۹۰۸ء) مدحت جمال، نجیب فاضل، کمال عبدحمی اور آکاگوندوز زیادہ مشہور ہیں۔

ترکی کے موجودہ ادب کے عام جذبات گہرے قسم کی وطنیت اور قومیت سے مملو ہیں۔ اور ان کے علاوہ شخص، مقام اور واقعہ کی تحلیلی تاویل اور انسانی ذہن پر وقت اور مقام کے اثرات جیسی چیزوں کو بھی ادب میں اہمیت حاصل ہے۔ ترکی ادب تاریخ میں اور موجودہ سماج میں انسان کی شخصیت کا مطالعہ منفرد حیثیت سے نہیں کرتا بلکہ اسے پیچیدہ نظام کا ایک جزو سمجھ کر۔ اس سے بھی زیادہ اس کا موضوع یہ ہے کہ تاریخ میں اور ہمارے موجودہ پیچیدہ اور نہ سمجھنے میں آنے والے ماحول میں شخصیت کا مقام کیا ہے۔

چین میں شادی کی رسمیں

فضل حق قریشی دہلوی

چین میں شادی کی رسمیں دلچسپ اور توجہ کی مستحق ہیں۔ زندگی کی منزل ثانی میں داخل کرنے سے پہلے والدین اپنی لڑکیوں کی اعلیٰ تربیت کا خاص اہتمام کرتے ہیں وہ انہیں سلیقہ مند اور گھر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اس تمام سعی و کاوش کی تہ میں عورت کی اپنی ذات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ والدین کے پیش نظر یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ان کی بیٹی اپنی ذہانت و لیاقت سے پرائے گھر جا کر راج کرے بلکہ اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کی لڑکی کی وجہ سے سسرال والوں کے نظام حیات پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔ چنانچہ زیادہ توجہ اس امر پر مرکوز کی جاتی ہے کہ وہ اپنے ساس سسر اور جیٹھ دیور کی اطاعت و فرمانبرداری اور خدمت گذاری کے ڈھنگ سیکھ لے۔ خاوند کی خدمت گذاری کا مسئلہ زیادہ قابل غور نہیں ہوتا کیونکہ بیوی براہِ راست اس کے آرام کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔ خود اس کے گھر والے اس کی آسائشوں کا لحاظ رکھتے ہیں بیوی کو تو اتنی اجازت بھی نہیں ہوتی کہ وہ سب کے سامنے اپنے خاوند سے بات چیت کرے یا کسی بھی حالت میں اس کے ساتھ ایک ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھالے۔

جہاں تک گھریلو معاملات کا تعلق ہے شادی انفرادی کی بجائے اجتماعی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی فرد واحد کی بجائے پورے گھرانے کے احترام کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہاں کسی مرد کے پیش نظر شادی کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس رسم کی ادائیگی صرف ذاتی فائدے کی غرض سے کر رہا ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ بیوی اس کے گھر والوں کی خدمت کرے، بچے جن کر افراد خاندان میں اضافہ کرے جس سے خاندان کا نام روشن ہو اور اس طرح آبائی پرستش کا سلسلہ ابد تک قائم رہے۔ یہ بات اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ کوئی شخص اپنی بیٹی کی شادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ نہیں کہتا کہ میں نے اپنی لڑکی فلاں مرد سے منسوب کر دی بلکہ اسے خاندان کا نام ظاہر کرنا پڑتا ہے۔ نسبت قرار پا جانے کے بعد اگر شادی کی رسم ادا ہونے سے پہلے مرد کا انتقال ہو جائے تو عورت اپنے کنبے والوں کو خیرباد کہہ کر اس منگیتر کے گھر رہنا شروع کر دیتی ہے جس کی صورت سے بھی وہ ناآشنا ہوتی ہے اور اس طرح اپنی ساری عمر سسرال والوں کی خدمت میں بسر کر دیتی ہے۔

شوہر کا انتخاب کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کی طرح چین میں بھی لڑکے اور لڑکی کی مرضی یا ان کی پسند کا مطلق لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ وہ شب عروسی سے قبل ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔ بعض دفعہ ان کی تخلیق کی ساعتوں سے قبل ہی ان کے دامنوں میں شادی کی گرہ لگ جاتی ہے۔ یعنی دو گھرانوں کے شادی شدہ مردوں میں یہ بات طے پا جاتی ہے کہ اگر ان میں سے ایک کے ہاں لڑکا اور دوسرے کے ہاں لڑکی پیدا ہو تو ان کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا جائیگا۔ کوئی شادی آپس کے رشتہ داروں میں کبھی طے نہیں پاتی۔ خواہ وہ رشتہ قریب کا ہو یا دور کا۔ ہمیشہ کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ناواقف لوگوں میں یہ سلسلہ چلے تاکہ اس طرح نئے نئے میل جول پیدا ہوں اور بے گانگی شناسائی میں بدلتی چلی جائے۔ چنانچہ ہر مشاطہ کا فرض ہے کہ وہ اپنا قدم درمیان لاتے ہی سب سے پہلے یہ معلوم کرے کہ دونوں فریق پہلے سے ایک دوسرے کے رشتہ دار یا دیرینہ واقف کار تو نہیں ہیں۔

ضلعوں اور صوبوں کے لحاظ سے شادی کی ضمنی رسمیں مختلف ہیں۔ لیکن جہاں تک بنیادی اصولوں کا تعلق ہے وہ سارے ملک میں یکساں ہیں۔ کوئی منگنی کسی مشاطہ کے بغیر دائرہ عمل میں نہیں آتی۔ مشاطائیں عموماً زیادہ عمر کی عورتیں ہوتی ہیں اور وہ اس کام کو پیشے کے طور پر اختیار کرتی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں گھر کی مامائیں بھی یہ خدمت انجام دینے لگتی ہیں۔ ہر مشاطہ کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ ایسے گھرانے میں جہاں شادی کے قابل لڑکا یا لڑکی موجود ہو بے روک ٹوک جائیں اور بیاہ شادی کے مسئلہ پر گفتگو کرنے لگیں۔

بعض دفعہ لڑکے یا لڑکی کے والدین کی مرضی اور ایما پر یہ کام شروع کیا جاتا ہے لیکن عموماً مشاطہ اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے یہ سوال اٹھا بیٹھتی ہے۔ اس طرح شروع سے آخر تک اس کا قدم درمیان رہتا ہے اور وہ ہر معاملہ کی اونچ نیچ کا خیال رکھتی ہے۔

سب سے پہلی رسم یہ ہے کہ لڑکے کے والدین کسی مشاطہ کو لڑکی والوں میں بھیجتے ہیں تاکہ وہ لڑکی کا نام اور اس کا وقت پیدائش دریافت کر آئے۔ یہ دونوں باتیں کسی نجومی یا پنڈت کو بتا کر معلوم کرایا جاتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی جنم پتریوں کے مطابق ستاروں کا میل ممکن ہے یا نہیں۔ اگر نجومی کا فیصلہ خاطر خواہ ہو اور وہ یقین دلائے کہ دونوں میں نباہ ہو سکتا ہے تو دوسری رسم ادا کی جاتی ہے ورنہ نہیں۔ دوسری رسم یہ ہے کہ پھر مشاطہ کو شادی کا پیغام دے کر لڑکی والوں میں بھیجا جاتا ہے۔ اگر لڑکی والے اس رشتہ کو قبول کر لیں تو ان سے تحریری وعدہ لیا جاتا ہے اور یہ شادی کی تیسری رسم ہے پھر چوتھی رسم کے طور پر لڑکی کے والدین کو چند تحفے بھیجے جاتے ہیں۔ منگنی کے تحفے "چاء لی" کہلاتے ہیں۔ ان میں چائے[1] کے بنڈل، مٹھائیاں، سپاری اور کچھ نقد روپے شامل ہوتے ہیں۔ مشاطہ ان تحفوں کو لکڑی کے چپٹے بکسوں میں سجا کر لے جاتی یا زیادہ ہونے کی صورت میں مزدوروں کے ساتھ لڑکی کے مکان تک جاتی ہے۔ لڑکی والے جواب میں ایک جملہ لکھ بھیجتے ہیں یعنی "شیرین چاء لی" (ہم نے رسمی تحفے قبول کئے اور کھالئے) اس طرح منگنی کی رسم

[1] چائے ابتدائی طور پر چینی زبان کا لفظ ہے اور اردو کی طرح یورپ کی بھی بہت سی زبانوں میں رائج ہے۔

پکّی ہو جاتی ہے۔ اگر تحفے نہ بھیجے جائیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ منگنی کی رسم ادا نہیں کرنی اور جو سلسلہ اب تک چلا تھا وہ کالعدم ہو گیا۔ منگنی ایک بار طے ہو جانے کے بعد لڑکی والوں کی طرف سے توڑی نہیں جا سکتی۔ البتہ لڑکے والے نقدی کی صورت میں کفارہ ادا کر کے اپنا دامن بچا سکتے ہیں۔ تحفے قبول ہونے کے بعد مشاطہ لڑکی والوں سے جا کر کہتی ہے کہ شادی کے لئے کوئی مبارک گھڑی مقرر کر لی جائے۔ یہ پانچویں رسم ہے۔

لڑکی کی زندگی یوں بھی کچھ زیادہ پرلطف نہیں ہوتی لیکن نسبت قرار پانے کے بعد ساری دلچسپیاں ختم ہو جاتی ہیں جس طرح یہاں شادی سے پہلے لڑکی کو "مایوں" بٹھا دیا جاتا ہے، وہاں بھی نسبت قرار پاتے ہی لڑکی گوشہ نشین ہو جاتی ہے لیکن اتنی شدید پابندی کے ساتھ کہ وہ اس حالت میں نظر اٹھا کر اپنے سگے بھائیوں کو دیکھ بھی نہیں سکتی۔ ان سے گفتگو کرنی تو بڑی بات ہے۔ البتہ اس دوران میں مامائیں یا مشاطائیں اور گھریلو سودا بیچنے والیاں اسے گھیرے رکھتی ہیں اور وہ اس دوران میں شادی کے بعد کی زندگی سے متعلق بہت سی باتیں سیکھ لیتی ہے۔ کیونکہ اس سے قبل اسے ایسا موقعہ کبھی نہیں ملتا۔

ان ابتدائی رسموں کے علاوہ جو ہر صوبہ اور ضلعے میں مختلف ہو سکتی ہیں، شادی کے لئے تین اہم بنیادی رسمیں لازمی ہیں جن کے بغیر شادی مکمل ہونے نہیں پاتی۔ ان کی ادائیگی مذہبی اعتبار سے بھی ضروری ہے۔ وہ شرطیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) شادی کا تحریری اقرار نامہ جس پر دولھا دلہن کے والدین یا سرپرستوں کے دستخط ہوتے ہیں۔

(۲) شادی کی رقم کی وصولی۔

(۳) دلہن کی رسید یعنی لڑکے والوں کی طرف سے اقرار نامہ کہ دلہن ان کے خاندان میں پہنچ گئی۔

شادی کی رقم دلہن کے والدین یا سرپرستوں کو پیشگی دیدی جاتی ہے۔ اس کا تعین حسب حیثیت ہوا کرتا ہے۔ مشاطاؤں کے وسیلے سے جب پہلی دو شرطیں پوری ہو جاتی ہیں تو آخری شرط کی تکمیل ذرا تفصیل کے ساتھ عمل میں آتی ہے۔

دلہن کو بہترین قسم کا لباس پہنا کر سرخ رنگ کی ایک شاندار پالکی یا کرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے جو وضع قطع کے لحاظ سے صرف شادیوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ دلہن کے علاوہ کوئی اور اس میں سوار نہیں ہوتا۔ ہر چینی عورت زندگی بھر میں صرف ایک ہی بار اس پر بیٹھ سکتی ہے۔ کیونکہ پھر یہ موقع نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ کرسی لکڑی کی بنی ہوئی نہایت وزنی ہوتی ہے۔ باہر کے رخ چاروں طرف بہت ہی دیدہ زیب نقش و نگار ہوتے ہیں جن میں مراسم شادی کے مختلف مناظر دکھائے جاتے ہیں۔ اس کے کناروں وغیرہ پر ہدہد کے پر لگا کر زینت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ہدہد کو بہت بھاگوان سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر اس پرندے کا سایہ کسی پر پڑ جائے تو ازدواجی زندگی لازمی طور پر عیش و آرام میں بسر ہوتی ہے۔

اس پالکی میں داخل ہونے کا راستہ کسی قدر تنگ ہوتا ہے اور اسے بھی بند کر کے اس کے سامنے دبیز پردے لٹکا دئے جاتے ہیں، تاکہ جلوس کے آدمیوں یا راہگیروں میں سے کسی کی نظر دلہن پر نہ پڑ سکے۔ روشنی اور ہوا کا گذر نہ ہونے کے باعث یہ خلوت عموماً وبال جان ہونے لگتی ہے خصوصاً گرمی کے موسم میں دم گھٹنے سے بعض عورتیں بے ہوش اور کبھی کبھی فوت بھی ہو جاتی ہیں۔ اسے چار کہاروں سے اور زیادہ شان دکھانی ہو تو آٹھ کہاروں سے اٹھوایا جاتا ہے۔ بعض گھرانوں میں پالکی کی بجائے موٹر کار کا رواج ترقی پا گیا ہے لیکن دبیز پردے اس پر بھی ڈالے جاتے ہیں۔ تاہم اس میں دم نہیں گھٹتا۔

دریا کے پار جانے کی صورت میں پالکی کشتی کے اوپر رکھ دی جاتی ہے لیکن ہمیشہ یہ خطرہ دامنگیر رہتا ہے کہ اس کے زیادہ وزن سے کشتی بیٹھ نہ جائے۔ تاہم کشتی کے ہچکولے دلہن کو ادھ موا ضرور کر دیتے ہیں۔ اگر ابتدائی دو شرطیں پوری ہو چکنے کے بعد دلہن اتفاقاً مر جائے تو دولھا اس کے جنازے کو ساتھ لے کر آخری شرط پوری کرتا ہے تاکہ شادی کی رسم ہر لحاظ سے مکمل ہو جائے۔ مرد ایسی صورت میں دوسری شادی کر لیتا ہے لیکن صورت اگر متضاد ہو تو دلہن باقی عمر کے لئے بیوہ سمجھی جاتی ہے۔

سرخ لباس پہنے ہوئے مزدور اور مزدورنیاں جہیز کی مختلف چیزیں اپنے سروں پر اٹھائے پالکی کے آگے چلتی ہیں۔ امیر لڑکیوں کی شادی کے موقعوں پر یہ جلوس غیر معمولی طور پر کافی طویل ہو جاتے ہیں۔ پالکی سب سے آخر میں روانہ ہوتی ہے۔ مٹھائیوں کے خوان، رنگ برنگ کی کاغذی قندیلیں اور دوسری تماشی چیزیں پالکی کے ساتھ رہتی ہیں۔ باجہ بھی بجتا جاتا ہے۔ جلوس کے منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے دولھا کے دوست دولھا کا خط لا کر دلہن کے حوالہ کرتے ہیں جو سرخ کاغذ پر سنہرے حروف میں لکھا ہوتا ہے۔ اس میں دولھا کی طرف سے تاکید ہوتی ہے کہ بہت جلد میرے گھر پہنچنے کی کوشش کرو۔ خط کا مضمون ہمیشہ نپا تلا اور ہر صورت میں یکساں ہوتا ہے اس لئے دلہن اگر پڑھنا جانتی بھی ہو تو پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتی۔ وہ جانتی ہے کہ اس میں کیا لکھا ہوگا۔ تاہم وہ اسے مرتے دم تک اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے۔

دولھا کے گھر میں پالکی کاندھوں سے اتار کر صحن میں رکھ دی جاتی ہے اور اگر مکان وسیع اور نئی وضع کا ہو تو اسے ملاقات کے کمرے میں لے جا کر رکھتے ہیں۔ دولھا ہاتھ میں پنکھا لئے کر پالکی کے قریب آتا اور اس کی ڈنڈی سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ دلہن چہرے پر بدستور سرخ ریشمی نقاب ڈالے باہر نکل آتی ہے۔ فوراً گھر کی ایک ملازمہ آگے بڑھ کر

اسے اپنی پیٹھ پر بٹھا لیتی اور کوئلوں کی آگ پر سے لے کر گزرتی ہے۔ عین اس وقت ایک دوسری ملازمہ دلہن کے سر پہ ایک سینی اٹھائے رکھتی ہے جس میں چاول، چاول کھانے کی تیلیاں اور سپاری کی چند ڈلیاں رکھی ہوتی ہیں۔ اس رسم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی بلا دلہن کے سر پہ سوار ہو تو فوراً دور ہو جائے۔

اس اثنا میں دولھا ایک اونچی تپائی پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور وہیں سے اپنی دلہن کا استقبال کرتا ہے جو قریب پہنچکر سربسجود ہو جاتی ہے اور اس وقت تک پڑی رہتی ہے جب تک کہ دولھا تپائی سے اتر کر اسے اٹھا نہ لے۔ ساتھ ہی وہ اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دیتا ہے اور پہلی بار اس کی جھلک دیکھتا ہے۔ حالانکہ منہ اب بھی موتیوں کی جھالر سے جو نقاب کے نیچے ہوتی ہے، قریب قریب ڈھکا رہتا ہے۔

اس کے بعد وہ دونوں اس بڑے کمرے میں جاتے ہیں جہاں دولھا کے آبا و اجداد کے ناموں کی تختیاں، زمین و آسمان اور مکان کے صدر دروازے کی نگرانی کرنے والے دیوتاؤں کی مورتوں کے ساتھ قربان گاہ والے بڑے طاق پر رکھی ہوتی ہیں۔ دونوں مل کر ان کی پوجا کرتے ہیں۔ اس پوجا کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس کے بعد ہی دلہن صحیح معنوں میں اپنے دولھا کی بیوی کہلائے جانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ پوجا کے بعد دلہن چند مشروبات بھی بھینٹ چڑھاتی ہے۔

اس سے فارغ ہو کر وہ دونوں حجلۂ عروسی میں قدم رکھتے ہیں۔ وہاں نارنگی کا ایک چھوٹا سا پودا گملے میں رکھا ہوتا ہے۔ یہ خاص قسم کی نارنگی کا پودا محض نمائشی ہوتا ہے۔ اس کا پھل انتہائی ترشی کے باعث کھایا نہیں جاتا لیکن سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بہت چھوٹا پودا ہی بری طرح پھلوں سے لدا رہتا ہے۔ اس کی ڈالیوں میں چند سکے بھی بندھے ہوتے ہیں۔ یہ گویا افراطِ اولاد اور فراوانیٔ دولت کی علامات ہیں۔

دلہن کی سیج پر چھتری سے بندھی ہوئی سرخ کاغذ کی تین لمبی پٹیاں لٹکتی ہوتی ہیں جن پر کچھ دعائیں لکھی ہوتی ہیں۔ مثلاً "بھگوان کرے تمہیں سو بیٹے اور ہزار پوتے نصیب ہوں"۔

دولھا اپنی دلہن کو سلام کر کے اس کے قریب چائے پینے بیٹھ جاتا ہے۔

چائے کے ساتھ مٹھائیاں اور پھل بھی ہوتے ہیں۔ بیٹھتے وقت دلہن چاہتی ہے کہ دولھا کے لباس کا ایک دامن اپنے زانو کے نیچے دبا لے۔ دولھا بھی یہی کوشش کرتا ہے اور عموماً کامیاب رہتا ہے کیونکہ دلہن جان بوجھ کر اسے موقع دیدیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آئندہ کون کس پر حاوی رہے گا۔ چونکہ ہمیشہ سے مرد کا سکہ عورت پر چلتا رہا ہے، اس لئے دلہن پرانے دستور کو نہ توڑنے کے خیال سے خود ہی اعتراف کمتری کر لیتی ہے۔ لیکن اس زمانہ کی بعض روشن خیال لڑکیاں برابری اور ہمسری کی دعویدار ہوتے ہوئے بالاجیت لینے کی کوشش کرتی ہیں۔

چائے نوشی کے وقت دولھا کی بہنیں دلہن کے چہرے پر سے موتیوں کی جھالر ہٹا دیتی ہیں تاکہ اس کا منہ صاف طور پر نظر آ سکے۔ دلہن کے لئے لازمی ہوتا ہے کہ وہ عروسی لباس پہنے اور بناؤ سنگھار کرتے وقت تزئین جمال کے لئے چہرے پر غازہ یا پوڈر بالکل نہ لگائے تاکہ رونمائی کے وقت خد و خال کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے۔ اگر کوئی لڑکی اس اصول کا خیال نہ رکھتے ہوئے مصنوعات استعمال کرے تو اس پر نام دھرے جاتے ہیں۔

غزل

زبیر افضل

تمہیں خوف مآل آتا تو ہوگا — جوانی کا خیال آتا تو ہوگا
کبھی منزل کے دو بچھڑے ہوؤں میں — مقام اتصال آتا تو ہوگا
تمہیں معلوم ہے دل کی حقیقت — کہ اس شیشے میں بال آتا تو ہوگا
نقاب رخ کبھی اٹھتی تو ہوگی — حیا میں اعتدال آتا تو ہوگا
یہ میرا اور تمہارا ربط باہم — کہیں اس کا سوال آتا تو ہوگا
فسانے میں تمہارے ذکر میرا — تمہیں اکثر جلال آتا تو ہوگا
کبھی معراج دل ہوتی تو ہوگی — کبھی وہ ماہ و سال آتا تو ہوگا

تصور میں کسی کے اب بھی افضلؔ
کوئی افسردہ حال آتا تو ہوگا

دولھا دلہن چائے پینے میں مشغول ہو جاتے ہیں لیکن پاس کھڑی ہوئی عورتیں دلہن کے نقش و نگار اور حسن و جمال کی بابت اپنے خیالات طنزیہ انداز میں ظاہر کرتی ہیں۔ بعض دفعہ ان کی رائے زنی اتنی سخت اور دلسوز ہو جاتی ہے کہ غریب دلہن دل ہی دل میں کڑھتی اور کبھی رو پڑتی ہے۔

شام کو تقریباً سات بجے دولھا کے والدین کے اعزاز میں ایک پرتکلف ضیافت کا انتظام کیا جاتا ہے جس میں اصولاً دلہن پیش پیش رہ کر ہر کام میں حصہ لیتی ہے حتیٰ کہ کھانا کھانے کے وقت وہ دسترخوان پر اپنے ہاتھ سے سب چیزیں چنتی اور بالکل "بیرے" کی طرح ہر فرمائش پوری کرتی ہے۔ خسر کا پیالہ شراب سے لبریز کر کے وہ خود گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے ہاتھوں سے پیش کرتی اور اسی طرح جھکی رہتی ہے جب تک کہ وہ تمام شراب ختم نہ کر لے۔ پیالہ واپس لینے سے پہلے وہ دو سجدے کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد عام دعوت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں دولھا دلہن بھی حصہ لیتے ہیں۔

حجلۂ عروسی میں دوبارہ پہنچانے سے پہلے دولہا کی رشتہ دار عورتیں دلہن سے

بہت سی پہیلیاں پوچھتی اور کوشش کرتی ہیں کہ ساری رات اسی طرح گنوا دیں لیکن دولھا جو عموماً اس وقت تک نشۂ شراب سے چور ہو چکتا ہے آ کر مزاحم ہوتا اور دلہن کو زبردستی اپنی سیج پر لے جاتا ہے۔

تیسرے دن دوبارہ دولھا کے آبا و اجداد کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس سے فارغ ہو کر دلہن اپنے میکے جاتی ہے۔ دولھا بھی ساتھ جاتا ہے۔ ان کے پہنچنے کے دوسرے دن دلہن والے بڑے پیمانے پر دعوت دیتے ہیں جس میں تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب شامل ہوتے ہیں۔

دو سال تک دلہن کو دلہن سمجھا جاتا ہے اور گھر کے کام کاج میں اس سے کوئی مدد نہیں لی جاتی۔

یہ ہے مختصر سا خاکہ ان رسموں کا جو صوبہ کینٹن میں عام طور پر قدیم کنفیوشی مت کے پیروؤں میں رائج ہیں۔ بعض صوبوں میں ان کی ادائیگی میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز بودھیوں اور مسلمانوں کے طریقے بھی جدا جدا ہیں۔

صوبہ سواتو میں پالکی کرسی کے لئے لازمی نہیں ہے کہ وہ سرخ رنگ کی ہو اور لکڑی ہی کی بنائی جائے۔ اس کے دروازے کو دبیز پردوں سے بند بھی نہیں کیا جاتا۔ اس میں کافی گنجائش ہوتی ہے تاکہ اگر دلہن چاہے تو ٹانگیں پھیلا کر آرام سے بیٹھ جائے۔ دولھا کے مکان میں صدر دروازے کی چوکھٹ پر سؤر کے کچے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا لٹکایا جاتا ہے۔ دلہن کو اس کے نیچے سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ کوئلوں کی آگ کی بجائے جلتی ہوئی سوکھی گھاس پر اسے خود پاؤں رکھ کر چلنا ہوتا ہے۔ وہ ملازمہ کی پیٹھ پر سوار نہیں ہوتی۔ تیسرے دن میکے واپس جانے کی بجائے وہ مسلسل چار ماہ تک سسرال میں رہتی ہے۔ البتہ اس دوران میں اس کے چھوٹے بھائی بہن اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ تین سال تک ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو اسے دولھا کے آبا و اجداد کی پوجا کرنی پڑتی ہے۔ اسے تین سال تک دلہن سمجھا جاتا ہے۔

صوبہ ین نان میں "گھر داماد" رکھنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی رسمیں شادی کی عام رسموں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس صورت میں ابتدائی بات چیت طے ہونے کے بعد دولھا بذات خود دلہن کے گھر جاتا ہے جہاں تمام رشتہ دار اور دوست احباب پہلے سے جمع ہوتے ہیں۔ اسے مکان کا صدر دروازہ بند ملتا ہے۔ کواڑوں پر دو بار دستک سن کر دلہن اس کا نام، پتہ، حسب و نسب اور وہاں آنے کا مقصد پوچھتی ہے۔ وہ سب حالات بتا کر اپنا مقصد بیان کرتے ہوئے اقرار کرتا ہے کہ میں اس گھر میں تمہارا شریک حیات بن کر ہمیشہ رہنا چاہتا ہوں۔ تب وہ دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیتی ہے اور باقی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ اس صورت میں لڑکی کے آبا و اجداد کی پوجا دولھا کو کرنی پڑتی ہے۔ زندگی بھر یا جب تک وہ اس بیوی کے ساتھ رہے دولھا کو کوئی کام کاج کرنا نہیں پڑتا۔ اس کے تمام اخراجات دلہن والے برداشت کرتے ہیں۔ یہ طریقہ زیادہ تر ان گھرانوں میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں لڑکی اکلوتی ہو اور والدین بہت امیر ہوں۔ ایسی صورت میں پیدا ہونے والے بچوں کے ناموں کے ساتھ لڑکی ہی کے نام کا جزو ملایا جاتا ہے اور وہ اسی کی ملکیت تصور کئے جاتے ہیں۔

اگر کوئی شخص بہ سلسلۂ ملازمت یا کسی اور ضروری کام کے باعث اپنے گھر سے دور دراز مقام پر ہو اور اس کی واپسی جلدی ممکن نہ ہو سکتی ہو لیکن شادی کرنی ضروری ہو تو اس کی بجائے ایک سرخ مرغ کو دولھا بنا کر تمام رسمیں ادا کر دی جاتی ہیں اور جب وہ شخص واپس آتا ہے تو دوبارہ کسی رسم کی ادائیگی کے بغیر دلہن کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا جوان ہونے اور شادی کرنے سے پہلے ہی مر جائے تو اس کے والدین فوراً مشاطہ کو بلا کر اس کا رشتہ ڈھونڈنے کے لئے ہدایت کرتے ہیں۔ وہ کسی قدر تلاش و تجسس کے بعد ایسا گھر معلوم کر لیتی ہے جہاں کوئی کنواری لڑکی تقریباً انہی دنوں میں فوت ہوئی ہو۔ پتہ چلتے ہی رشتہ فوراً قائم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ لڑکی والے بھی منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی مشاطہ کہیں سے ایسا پیغام لے آئے اور ان کی لڑکی دوسری دنیا میں شوہر کے بغیر نہ رہے۔ ایسی صورت میں دولھا دلہن کی بجائے ان کے ناموں کی تختیاں تیار کر کے شادی کی تمام رسمیں ادا کر دی جاتی ہیں اور اس طرح دو مختلف خاندان ایک دوسرے کے سمدھیانے بن جاتے ہیں۔

نقد و نظر

افادی ادب

مصنفہ اختر انصاری، ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی ــ ضخامت ۱۰۳، قیمت ۱۲/

اسی کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا اور اب پانچ برس بعد دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ اب سے پانچ برس پہلے بھی اس کی افادی اہمیت اتنی ہی تھی جتنی آج ہے۔ بلکہ آج خاصے آگے بڑھ جانے کے بعد بھی ہم ادبی زندگی کے ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جب اس کتاب کا موضوع اور اس کا انداز، بھٹکے ہوئے تخیل اور تھکے ہارے قلم کو سیدھی راہ پہ چلنے کی طرف مائل کر سکتا ہے۔

کتاب میں مصنف نے چند ایسے مسائل پر بحث کی ہے جو یوں تو ہر زمانہ کے ادب کیلئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ایک ایسے زمانہ میں جب زندگی کی قدریں ایک نئی شکل اختیار کر رہی ہوں اور اس لئے ادب بھی اپنے لئے نئے سانچوں کی جستجو کر رہا ہو یہ بنیادی مسائل اور بھی اہم بن جاتے ہیں۔ انہیں زیادہ وضاحت اور صفائی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ کتاب اردو میں یہ خدمت بوجوہ احسن انجام دیتی ہے اس میں ادب کے اہم بنیادی مسئلوں کو اختصار کے ساتھ اعتماد کے لہجہ میں اور ادبی جوش اور توانائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور اسلئے بہت کم موقعے ایسے آتے ہیں جہاں کتاب پڑھنے والا اپنے آپ کو لکھنے والے کا ہم خیال نہ محسوس کرتا ہو۔ یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی عذر نہیں ہوتا کہ "ادب حیات انسانی کی تفسیر ہی نہیں بلکہ تنقید بھی ہے۔ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی"۔ اور ادب میں دو خصوصیتیں لازمی ہیں۔ پہلی یہ کہ اسے اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے گہرا تعلق ہو اور دوسری یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت ہو۔ اور اس لئے کسی ادبی کارنامے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے یہی دو چیزیں سامنے رکھنی چاہئیں۔ اس نتیجہ تک پہنچنے کے لئے مصنف نے شروع سے استدلال کا ایک منطقی طریقہ اختیار کیا ہے اور اس منطق کے مختلف مقدموں میں کہیں الجھن نہیں۔ اور اس لئے اگر کہیں کسی کو مصنف کی رائے سے اختلاف بھی ہو تو وہ کم از کم اس کے منطقی قیاس سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

"افادی ادب" کی کتابت اور طباعت اچھی ہے۔ سرورق بھی رنگین اور دیدہ زیب ہے۔ لیکن کتابت میں شروع سے آخر تک جو حد سے زیادہ خوش مذاقی برتنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے کتاب کا حجم بلا ضرورت بڑھ گیا۔ کتاب اصل میں اسی صفحہ کی ہونی چاہئے تھی۔ اس طرح اس کی قیمت بھی ذرا اور کم ہو جاتی۔

و ـ ع

(۱) آنسو اور پسینہ ـ (۲) جھگڑے

(۱) آنسو اور پسینہ ـ ۲۲۸ صفحے، قیمت ۲/
(۲) جھگڑے ـ ۲۸۵ صفحے، قیمت ۲/۸

مصنف اور ناشر ڈاکٹر رام پرتاب بہادر
ملنے کا پتہ:- ہریش چندر ۲۳، کچہری روڈ الہ آباد۔

آنسو اور پسینہ، ڈاکٹر بہادر کی دس چیزوں کا مجموعہ ہے۔ چیزوں اس لئے کہ اس میں پانچ افسانے ہیں تین ریڈیو کی تقریریں، ایک اور چیز جو نشر ہو جاتی تو تقریر ہوتی، ایک مضمون جس کے متعلق مضمون نگار صاحب بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ وہ مزاحیہ ہے یا سنجیدہ اور پڑھنے والے کیلئے بھی کسی نتیجہ پر پہنچنا دشوار ہے۔ افسانوں اور مضمونوں کے شروع میں مصنف نے کتاب کے بارے میں، (اور خود اپنے بارے میں) بہت سی باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کی جگہ وہ ادب برائے پیسہ، کے قائل ہیں۔ آجکل کے اکثر لکھنے والوں کی ذہنی کیفیت یہی ہے لیکن ادب اور فلسفہ کی بلندیوں سے اتر کر سچائی کی اس سطح پر آنے کی ہمت کسی میں بھی نہیں۔ یہ ہمت میں نے ڈاکٹر رام پرتاب بہادر میں دیکھی۔ ایک طرف یہ ہمت کہ مصلحت اور مروت کے پردے ڈالے بغیر اور ادبی اور شاعرانہ اشاروں کا سہارا لئے بغیر، بات کو جس طرح محسوس کیا جائے اسی طرح بیان بھی کر دیا جائے۔ اور دوسری طرف اس صفائی، سچائی اور اس سے تلخی کو مزاح اور طنز کی ملی جلی چاشنی میں ڈبو کر سامنے لانے کی عادت۔ یہ ہمت اور یہ عادت ڈاکٹر بہادر کے طرز کی دو اہم خصوصیتیں ہیں۔ نہ ہی ان کے افسانوں میں بھی ہیں، وہی ان کی ریڈیو کی تقریروں میں بھی اور وہی ان سنجیدہ مضامین میں بھی جن کا مجموعہ "جھگڑے" ہے۔

جھگڑے، کوئی جھگڑے کی چیز نہیں بلکہ بدنصیب ہندوستان کے نت نئے جھگڑوں کا کوئی حل تلاش کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے۔ ہندو مسلمانوں کے جھگڑے جنہوں نے زندوں اور وحشیوں سے بازی لگائی ہے، ہندی، اردو، ہندوستانی کے جھگڑے جنہوں نے اس معصوم اور بے ضرر چیز کو اکھاڑا بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر رام پرتاب نے ان جھگڑوں کے ہر پہلو کو ایک عامی کے نقطۂ نظر سے سوچا ہے اور جس جگہ جس کا قصور دکھائی دیا ہے اسے جی کھول کر، کھری کھری سنائی ہیں۔ ان کھری کھری لیکن حد سے زیادہ تند، تیز اور تلخ باتوں کا نشانہ ایک طرف جوش اور سمترا نندن پنت ہیں اور دوسری طرف جناح اور گاندھی۔ اور ان کے علاوہ اور ہزاروں اس طرح کے آدمی جو مصنف کے نزدیک ان جھگڑوں کی آگ کو ہوا دیتے ہیں۔ ان ساری باتوں میں ہر جگہ ایمانداری ہے، ہر جگہ انہیں دور کرنے کی ایک بے چین خواہش ہے، ہر جگہ ایک بہتر زندگی کا ایک سہانا سپنا ہے۔ لیکن اس ساری ایمانداری، اور بے چین خواہش کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ان مضمونوں کو پڑھکر نہ ہندو خوش ہو سکتے ہیں نہ مسلمان، نہ کانگریسی، نہ لیگی اور نہ اردو والے نہ ہندی والے ـــ پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں سب کی خوشنودی کا سامان ہے۔ مصنف کے ترکش کے تیر جب کسی پر برستے ہیں تو ایک کا کلیجہ چھلنی ہوتا ہے اور دوسرے کو یہی منظر جاں فزا معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ یہ مشورہ طلب کیا ہے کہ وہ افسانے لکھیں یا مضامین ـــ اس لئے شاید مشورہ بے محل نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ وہ افسانے بھی لکھیں اور مضامین بھی۔ لیکن ایک بات کو ذہن میں رکھ کر اور وہ یہ کہ "ادب برائے پیسہ" بھی اگر ادب کی روایتوں کی پاسبانی سے محروم ہو جائے تو وہ ادب نہیں رہتا۔ زبان و بیان میں نئی ادبی روایتوں کی مستحکم عمارت بھی صرف پرانی روایتوں کی بنیاد پر بنائی جا سکتی ہے۔ یہ مجموعہ اظہار خیال کی ہمت اور فکر کے خلوص کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جس کی ہمارے ادب میں انتہائی کمی ہے۔

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

دیس سے ماہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت دو روپے علر

ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کرکے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔ تیسرا ایڈیشن قیمت دو روپے آٹھ آنے عـہ

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی۔ اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آڈر دیجیے نام سے ہی اندازہ کیجیے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا قیمت تین روپے

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کیلئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو نقلیاً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بینظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے۔ کامل ۱۷ حصے بلا جلد پچیس روپے مجلد اکیس روپے۔

معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب مزید رش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف قیمت مجلد آٹھ روپے۔

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی۔ حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کرچکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیے۔ آج ہی طلب فرماکر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے۔

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شبیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شبیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کرکے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سیپارے شائع ہوتے ہیں۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

اوراق پارینہ

از شبیر جنگ ایک انقلابی تہذیبی وہ بھی ادیب جس کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنوں کیلئے ایک پروگرام اور راہ باکیلئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے عـہ

اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ہاروی اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے عہ

قرآنی اخلاقی دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانیکا حق دار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ۔

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شبیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شبیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ سینکڑوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے تعلیمات کیساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔ قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب۔ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

اردو کے چند ابتدائی اخبار

حامد اللہ افسر

اس میں شبہ نہیں کہ اخبار[1] اپنی موجودہ صورت میں ہمارے یہاں انگریزوں کے وسیلے سے نمودار ہوا، لیکن انگریزوں سے پہلے بھی ہمارے ملک میں قلمی اخباروں کا رواج تھا، شاہان مغلیہ کے زمانے میں "وقائع" کے نام سے اخبار شائع ہوتے تھے یہ قلمی اخبار تھے اور حکومت ان کو شائع کرتی تھی۔ "وقائع نویس" اس مقصد کے لئے ایک مستقل عہدیدار ہوتا تھا جس کی نگرانی میں بہت سے "وقائع نگار" ملک کے مختلف حصوں میں متعین رہتے تھے جن کا فرض تھا کہ بادشاہ کی حضوری میں پیش کرنے کے لئے اہم واقعات کی اطلاع دارالسلطنت کو بھیجتے رہیں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ "وقائع" کسی خاص مقام پر کھڑے ہوکر کوئی رکن حکومت پبلک کو بھی سنا دیتا تھا۔ چنانچہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر "وقائع" کے سنانے کا ذکر بعض تاریخوں میں موجود ہے۔

ان قلمی اخباروں کا سلسلہ انگریزوں کے تسلط کے بعد تک قائم رہا، سرکاری "وقائع" کے علاوہ بعض اور لوگ بھی قلمی اخبار نکالتے تھے، یہ لوگ اخبار نویس کہلاتے تھے، حنفی خاں نے اپنی کتاب منتخب اللغات میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب کی فوجوں میں اخبار تقسیم کئے جاتے تھے، کرنل جیمس ٹاڈ نے ۱۸۲۸ء میں کئی سو قلمی اخبار رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی نذر کئے تھے۔ یہ سب اخبار سلاطین مغلیہ کے زمانے کے تھے، مرکافے نے ۱۸۳۶ء میں لکھا تھا کہ دیسی لوگوں میں قلمی اخباروں کا بہت رواج ہے، صرف دہلی سے ایک سو بیس قلمی اخبار مختلف مقامات کو بھیجے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں مطبوعہ اخباروں کا سلسلہ ۱۷۸۰ء سے شروع ہوا، سب سے پہلا ہندوستانی اخبار انگریزی زبان میں "بنگال گزٹ" کلکتہ سے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو جیمس اگسٹس ہکی نے شائع کیا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب حل وعقد ابتدا ہی سے اخباروں سے گھبرا اٹھے، لارڈ ولسلی نے ۱۷۹۹ء میں ایک حکم جاری کیا کہ ہر اخبار اشاعت سے پہلے گورنمنٹ کے سکریٹری کو دکھالینا ضروری ہے، سکریٹری کو اختیار حاصل تھا کہ جس عبارت کو وہ قابل اعتراض سمجھے قلم زد کردے، سنسر کا یہ سلسلہ لارڈ میٹکاف کے زمانے تک جاری رہا جنھوں نے ۱۸۳۶ء میں اخباروں کے اوپر سے پابندیاں ہٹالیں اور ایک حد تک ان کو اظہار رائے کے لئے آزاد کردیا۔

بنگال گزٹ کے بعد نومبر ۱۷۸۰ء میں "انڈین گزٹ" شائع ہوا، پھر ۱۷۸۴ء میں "کلکتہ گزٹ" نکلا اور ۱۷۸۵ء میں "بنگال جرنل" شائع ہوا۔

ملکی زبانوں میں سب سے پہلا اخبار بنگالی زبان میں جاری ہوا، یہ اخبار سیرام پور کے عیسائی مشنریوں نے نکالا تھا، اس کا نام "ڈگ درسن" تھا یہ ایک ماہوار رسالہ تھا جو اپریل ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا، دو نمبر نکلنے کے بعد جب اس کے منتظمین کو اطمینان ہوگیا کہ باوجود سیاسی خبروں کے حکومت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تو انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار "سماچار درپن" بنگالی زبان میں شائع کیا۔ یہ اخبار جب لارڈ ہیسٹنگس کی نظر سے گزرا تو انھوں نے سیرام پور کے مشنریوں کی بہت ہمت افزائی کی اور ان سے درخواست کی کہ اس اخبار کا ایک فارسی اڈیشن بھی شائع کیا جائے۔

۲۸ مارچ ۱۸۲۲ء کو "جام جہاں نما" کا پہلا نمبر شائع ہوا، یہی گویا سماچار درپن کا فارسی اڈیشن تھا، اس کے اڈیٹر منشی سدا سکھ تھے اور پرنٹر مسٹر ولیم ہاپکنس پیرسن، اس اخبار کا آدھا حصہ فارسی میں تھا اور آدھا اردو میں۔ یہی اردو کا سب سے پہلا اخبار تھا، اس سے ظاہر ہے کہ "اردو خبار" جو مولوی محمد باقر صاحب نے ۱۸۳۶ء میں دہلی سے شائع کیا اردو کا پہلا اخبار نہ تھا جیسا کہ ان کے لائق فرزند مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں بیان کیا ہے، بلکہ "جام جہاں نما" اردو کا پہلا اخبار تھا جو اردو اخبار سے چودہ برس پہلے نکلنا شروع ہوا تھا، جام جہاں نما کے بہت سے پرچے امپیریل رکارڈ ڈپارٹمنٹ میں اب تک موجود ہیں۔

اس کے بعد ۶ مئی ۱۸۲۳ء کو ماتھر موہن متر نے "شمس الاخبار" جاری کیا، یہ اخبار بھی فارسی اور ہندوستانی (اردو) میں تھا، یہ اردو کا دوسرا اخبار تھا۔

اس تحقیق سے ایک دلچسپ بات یہ معلوم ہوئی کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار ایک ہندو بزرگ کی ادارت میں شائع ہوا اور اس کے بعد دوسرا اخبار بھی ایک ہندو بزرگ ہی نے نکالا، گویا اردو اخبار کی بنا اصل میں ہندو اصحاب نے ڈالی۔

۱۸۲۱ء میں راجہ رام موہن رائے نے فارسی زبان کا ایک اخبار "مرآۃ الاخبار" کے نام سے جاری کیا، راجہ صاحب نے بھی اعلان کیا تھا کہ ہم "مرآۃ الاخبار" کا ایک حصہ ہندوستانی کے لئے مخصوص کرنے کا انتظام کررہے ہیں لیکن یہ تحقیق نہ ہوسکا کہ انھوں نے یہ انتظام کیا یا نہیں،

۹ فروری ۱۸۲۶ء کو "ہندی" کا سب سے پہلا اخبار "اودنت مارتند" جاری ہوا یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور اس کے پبلشر جگل کشور صاحب تھے اور منوٹھا کر پرنٹر تھے۔ یہ اخبار دیوناگری رسم خط میں تھا لیکن چل نہ سکا ایک سال جاری رہ کر بند ہوگیا۔

۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر صاحب نے "اردو اخبار" جاری کیا، اس اخبار میں زیادہ تر قلعہ معلیٰ کی خبریں شائع ہوتی تھیں، مولوی محمد باقر اپنے علم وفضل کے لئے دہلی میں بہت ممتاز تھے اور دہلی اور مضافات دہلی میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انکا اخبار بہت مقبول تھا۔ اس اخبار میں واقعات حاضرہ پر بے لاگ رائے کا اظہار کیا جاتا تھا، مثلاً سڑک کی مرمت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:-

"دل شکستوں کی عمارت دل کی تعمیر نہیں ہوتی اور شکستہ راستوں کی تدبیر ہوتی ہے۔"

(اردو اخبار مورخہ ۹ جون ۱۸۳۷ء)

تعزیرات ہند کی ترتیب کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا۔

---

[1] لفظ اخبار گو خبر کی جمع ہے لیکن اردو میں بطور اصطلاح کے واحد ہے اور ان مطبوعات کیلئے مستعمل ہے جو روزانہ یا ہفتہ وار یا ہفتہ میں دو بار شائع ہوں اور جن میں واقعات و سانحات حاضرہ شائع کئے جائیں اور ان پر اظہار رائے ہو۔

(میکالے صاحب نے) ۶ر جون ۱۸۳۴ء سے ۳۰ر نومبر ۱۸۳۸ء تک یعنی تین برس پانچ مہینے چودہ دن کے واسطے بطور تنخواہ کے تین لاکھ پینتالیس ہزار پانسو پچیس روپیہ پائے اور کل ۹۲ قانون بنائے جو قانون چھاپے جاویں تو قریب ۶۶ کالم اس اخبار (اردو اخبار) کے ہوں، علاوہ ان صاحب کے کہ یہ بھی ممبر محفل قوانین کے تھے اور کئی صاحب اور عملہ فعلہ تنخواہ پاتے تھے۔"

(منقول از اردو اخبار ۲۸ جنوری ۱۸۳۸ء)

اس کے بعد تو گویا اردو اخباروں کا باقاعدہ دور شروع ہوگیا۔ ۱۸۳۶ء میں "خیر خواہ ہند" مرزاپور سے نکلا، ۱۸۴۵ء میں "دار الاسلام" دہلی سے ۱۸۴۹ء میں "گلزار ہمیشہ بہار" بنارس سے اور "مالوہ اخبار" اندور سے شائع ہوا۔ یہ سب اخبار ہفتہ وار تھے اور ان کا چندہ پندرہ روپیہ سے پچیس روپیہ سالانہ تک تھا۔

۱۸۵۰ء میں منشی رائے ہرسکھ رائے صاحب نے "کوہ نور" کے نام سے ایک اخبار لاہور سے جاری کیا۔ یہ اخبار ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران میں یہ اخبار روزانہ کر دیا گیا، میری تحقیق کے مطابق یہ اردو کا سب سے پہلا روزنامہ تھا۔ "کوہ نور" ۱۹۰۴ء تک جاری رہا۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ نول کشور پریس لکھنؤ کے بانی اور مالک منشی نول کشور صاحب کوہ نور پریس لاہور میں اس وقت کلرک تھے:۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (نظم) ... جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری ...
۲۔ خطبۂ صدارت ... اعلیٰحضرت فرمانروائے بھوپال ...
۳۔ جامعہ کے پچیس سال ... ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ...
۴۔ ہندی (نیچیرہ) ... جناب سلام مچھلی شہری ...
۵۔ اردو غزل کے بارے میں (۲) ... حضرت مخمور اکبرآبادی ...
۶۔ ڈھلتے کا رومان (افسانہ) ... محترمہ رشیدہ لطیف ...
۷۔ لوازے (مع تصویر) ... پروفیسر پی۔ این پنڈت ...
۸۔ مرد (مصری افسانہ) ... جناب صلاح الدین قریشی دہلوی ...
۹۔ گجراتی میں نئے ادبی رجحانات ... جناب اکرام حسین خاں ...
۱۰۔ بجوسائیں (افسانہ) ... جناب دیاشنکر نسیم ...
۱۱۔ دیوار چین ... فضل حق قریشی دہلوی ...
۱۲۔ ادلتی کی نئے بندیوں میں ... محترمہ شاہدہ خاتون ملک چکوی ...
۱۳۔ حضرت اصغر کے ساتھ چند گھنٹے ... ڈاکٹر ایچ۔ ایچ۔ بلگرامی ...

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۶۶ سے شائع کیا
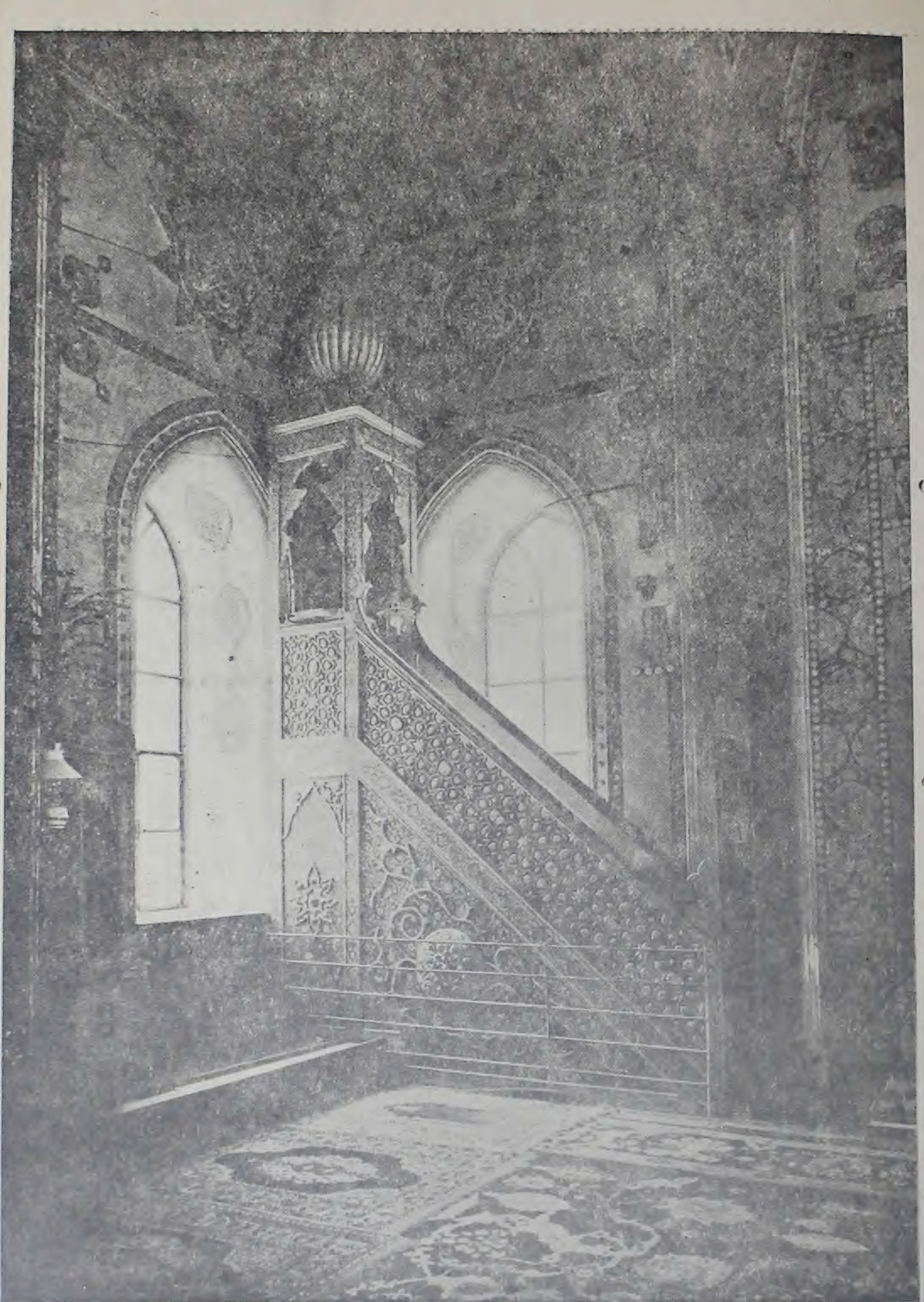
ترکی کے شہر کوتاھیہ میں ایک مسجد کا اندرونی حصہ اور اسکی دیدہ زیب آرائش ہیں۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورلڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	-	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں ـ ایک سو اسی صفحات ـ دو نقشے ـ کپڑے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) ـ

‹ میزان نیوز لیٹر › (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) ـ

خاص رعایت ‹ عربی - انگریزی جملے › نوے صفحات ـ گتے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ـ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ـ

‹ فارسی انگریزی جملے › کپڑے کی جلد ـ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) ـ

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ ـ دہلی

آجکل

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
ہندوستان
برما
عربستان

کیمیا داں لوازئے

لوازئے اور اسکی شریک حیات۔

جدید کیمیا کی دنیا میں لوازئے کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ یہ ۲٦۔ اگست ۱۷۴۳ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اسنے کاربن ڈائی آکسائڈ کی کیمیاوی ترکیب' نامیانی کیمیا کی تحقیقات اور کیمیاوی اصطلاحات و مساوات کے نئے نظام کے سلسلے میں ایسی دریافتیں کیں جن سے کیمیاوی تحقیقات کی نئی راہیں کھل گئیں۔ ان تمام کوششوں میں اسکی شریک حیات جینیے لوازئے عملی طور پر اسکے ساتھ رہی۔ مفصل مضمون صفحہ ۲٦ پر ملاحظہ کیجئے۔

لوازئے تجربہ گاہ میں۔

ڈانٹے کا رومان

اطالیہ کا مشہور شاعر ڈانٹے ۱۲٦۵ ع میں پیدا ہوا تھا — عین عالم شباب میں اسے ایک حسین عورت بیاتریچے پورتیناری سے شدید محبت ہوگئی جو محبت کا جواب محبت سے نہ دے سکی۔ ڈانٹے نے خود کو تسکین دینے کیلئے یہ بات دل میں ٹھالی کہ میں اپنی محبوبہ سے جنت میں ملونگا اور اسی جذبے کے ماتحت اسنے « ڈیوائن کومیڈی » لکھ ڈالی جو دنیا کی ایک مشہور عشقیہ داستان ہے۔ اس تصویر میں جو ھنری ھولی ڈے کا شاہکار ہے ڈانٹے اپنی محبوبہ کو ایک سہیلی کے ساتھ بازار سے گذرتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ افسانہ صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ کیجئے۔

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

تربیت

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۵ | فہرست | یکم جنوری سنہ ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیرِ اعلیٰ — سیّد وقار عظیم ایم - اے

نائب مدیران — فضلِ حق قریشی دھلوی — بھگت سروپ کھلر ایم اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دھلی

رفتارِ زمانہ

آئین ساز اسمبلی

ملک معظم کی حکومت نے لندن سے ایک بیان جاری کیا جو ذیل میں درج ہے:-

"ملک معظم کی حکومت نے پنڈت نہرو، مسٹر جناح، مسٹر لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ سے جو مذاکرات شروع کئے تھے، وہ آج شام اس لئے ختم ہو گئے کہ پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ کل صبح ہندوستان واپس جا رہے ہیں۔

ان مذاکرات کی غرض یہ تھی کہ آئین ساز اسمبلی میں تمام پارٹیوں کی شمولیت اور ان سب کا تعاون حاصل کیا جائے۔ یہ توقع نہیں تھی کہ کوئی آخری تصفیہ کیا جا سکتا کیونکہ آخری فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے ہندوستانی نمائندوں کو اپنے رفقاء سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔

سب سے بڑی دقت وزارتی وفد کے ۱۶ مئی کے بیان کے پیراگراف نمبر ۱۹ (۵) اور (۸) کے مفہوم کے بارے میں پیدا ہوئی جسکا تعلق سکشنوں کے اجلاسوں سے ہے۔

وزارتی وفد برابر اس نظریہ پر قائم رہا ہے کہ اگر کوئی مفاہمت نہ ہو سکے تو سکشنوں کے فیصلے سکشنوں کے نمائندوں کے ووٹ کی محض اکثریت سے ہونے چاہئیں۔ اس نقطہ نظر کو مسلم لیگ نے قبول کر لیا لیکن کانگریس نے ایک مختلف نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اگر بیان کو مجموعی طور پر پڑھا جائے تو اسکا اصل مطلب یہ ہے کہ صوبوں کو گروپ بندی اور آئین سازی دونوں کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

ملک معظم کی حکومت نے قانونی مشورہ لیا ہے جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ۱۶ مئی کے بیان کا وہی مطلب ہے جسے وزارتی وفد نے ہمیشہ بیان کیا ہے کہ انکی یہی نیت تھی۔ لہٰذا بیان کے اس حصے کو جسکا یہ مفہوم لیا گیا ہے۔ ۱۶ مئی کی اس اسکیم کا ایک ضروری حصہ سمجھنا چاہیئے جسکا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اس قابل ہو جائیں کہ ایک ایسا دستور اساسی مرتب کریں جسے ملک معظم کی حکومت پارلیمنٹ کے روبرو پیش کرنے کے لئے تیار ہو گی۔ اسے آئین ساز اسمبلی کی تمام پارٹیوں (فریقوں) کو قبول کر لینا چاہیئے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ ۱۶ مئی کے بیان کے مفہوم کے متعلق دوسرے سوال پیدا ہو سکتے ہیں اور ملک معظم کی حکومت کو امید ہے کہ اگر مسلم لیگ کی کونسل آئین ساز اسمبلی میں شرکت پر تیار ہو جائے تو وہ بھی کانگریس کی طرح اس بات پر رضامند ہو جائے گی کہ فیڈرل کورٹ سے مفہوم سے متعلق معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے کہا جائے جنھیں کوئی ایک فریق فیڈرل کورٹ کے سامنے لائے اور مسلم لیگ کی کونسل ایسا فیصلہ منظور کرے گی تاکہ یونین کی آئین ساز اسمبلی نیز سکشنوں میں جو طریق کار اختیار کیا جائے وہ وزارتی وفد کی اسکیم کے مطابق ہو۔ جو معاملہ اسوقت متنازعہ فیہ ہے اس کے متعلق ملک معظم کی حکومت کانگریس پر زور دیتی ہے کہ وہ وزارتی وفد کے نقطۂ نظر کو مان لے تاکہ مسلم لیگ کے لئے اپنے رویہ پر نظر ثانی کرنے کا راستہ صاف ہو جائے۔ اگر وزارتی وفد کی نیت کی اس تصدیق کے باوجود آئین ساز اسمبلی یہ چاہتی ہے کہ اس بنیادی مسئلہ کو فیڈرل کورٹ کے سامنے فیصلہ کی غرض سے پیش کیا جائے تو ایسا بہت جلد کرنا چاہیئے۔ اس صورت میں مناسب یہ ہو گا کہ آئین ساز اسمبلی کے سکشنوں کے اجلاس فیڈرل کورٹ کا فیصلہ معلوم ہونے تک ملتوی کر دیئے جائیں۔

متفقہ طریق کار کو اساس بنائے بغیر آئین ساز اسمبلی کی کامیابی کا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ اگر ایسی آئین ساز اسمبلی جس میں ہندوستان کی آبادی کے ایک بڑے حصہ کو نمائندگی حاصل نہ ہو کوئی آئین وضع کرے تو ملک معظم کی حکومت قطعاً یہ ارادہ نہیں کر سکتی ——— جیسا کہ کانگریس نے کہا ہے کہ وہ یہ ارادہ نہیں کرے گی ——— کہ وہ ملک کے نارضامند علاقوں پر ایسا آئین زبردستی ٹھونس دے۔"

سمندر کی تہ میں

سوئٹزرلینڈ کے مشہور سائنسداں پروفیسر آگسٹ پکارڈ نے جن کی عمر اسوقت باسٹھ سال ہے، ۱۹۳۲ء میں غبارے کے ذریعہ فضائے آسمان میں دس میل بلند پرواز کی تھی۔ اب وہ سمندر کی تہ میں تیرہ ہزار فٹ کی گہرائی تک جانے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے ایسی آبدوز کشتی تیار کرائی ہے جو نہ صرف پانی کے بے پناہ دباؤ کا مقابلہ کر سکیگی بلکہ اسکے اندر رہتے ہوئے تحت البحری کائنات کا دقیق مطالعہ بہتر طریقہ پر ممکن ہو سکیگا۔ انکی یہ مہم آئندہ تحقیقات کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو گی۔

سندھ میں نئے انتخابات

پچھلے سال جولائی کے مہینے میں سندھ کے گورنر نے سندھ اسمبلی کو معطل کر دیا تھا کیونکہ دونوں مخالف جماعتوں کے درمیان اتنی منافرت و کشیدگی پیدا ہو چلی تھی کہ دامنِ امن و عافیت چاک ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ عبوری دور میں مسلم لیگی وزارت کے چند اراکین اہم ذمہ داریوں کو انجام دیتے رہے اور ساتھ ہی نئے انتخابات کی تیاریاں ہوتی رہیں جنکو عملی جامہ گذشتہ ماہ کے دوسرے ہفتہ میں پہنایا گیا۔ چونکہ فرقہ وارانہ تصادم کے امکانات بہت زیادہ تھے اس لئے پولیس کا معقول انتظام کیا گیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ کوئی ناگوار صورت پیدا نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ کی تیس نشستوں کے لئے ستر امیدواروں اور ہندوؤں کی سات نشستوں کے لئے بیس امیدواروں کی درخواستیں منظور ہوئیں۔ باقی امیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ مسلم نشستوں کے لئے انتخابات کی سرگرمیاں زیادہ جاذبِ نظر رہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے ہی روز چار ہزار مسلم خواتین نے مسلم لیگی امیدواروں کو رائے دی۔ تین روز تک یہ دلچسپ ہنگامہ برپا رہا۔

مسٹر جی۔ ایم سید جو معطل شدہ اسمبلی میں مخالف جماعت کے قائد تھے ۱۲۰۰ ووٹ سے ہار گئے اور ان کی جگہ قاضی محمد اکبر منتخب ہوئے۔ انتخابات کے نتائج حسبِ ذیل ہیں :-

مسلم لیگی اراکین	۳۵
کانگریس	۲۰
یوروپین	۳
قوم پرست مسلم	۲
کل تعداد	۶۰

مسلم لیگ کو ایک نشست کے سلسلے میں سولہ ووٹ سے شکست ہوئی۔

دس ہزار ایٹم بم

امریکہ نے صرف دو ایٹم بموں کے ذریعہ ہیروشیما اور ناگاساکی کو تباہ و برباد کر دیا۔ سقوطِ جاپان کا اصل سبب بھی یہی دو حادثے تھے۔ اس وقت سے آج تک اس منحوس ایجاد کا چرچہ کسی نہ کسی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ ہر ملک اس کوشش میں ہے کہ اس رازِ عظیم کو معلوم کر کے اپنی حفاظت مدافعت کا سامان پیدا کرے۔ تاہم امریکہ میں اس کی تیاری بہت تیزی کے ساتھ عمل میں آ رہی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر سی۔ اے۔ ایچ یوُرے نے ایک تقریر میں فرمایا کہ امریکہ بیس لاکھ ڈالر صرف کر کے دس ہزار بم خود تیار کر سکتی ہے۔ کیونکہ اسکے پاس بم بنانے والے کارخانوں کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لئے اتنا سرمایہ موجود ہے۔ یہ خبر امریکہ کے لئے کتنی ہی دل خوش کن ہو، ان غریب ملکوں کے لئے جن کے پاس اپنے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، بہت ہوشربا اور پریشان کن ہے۔ دنیا جاپان کی تباہی کی داستان کو ابھی بھولی نہیں ہے۔

ہندوستان کیلئے اناج

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں نے جن اناجوں سے ہندوستان کی مدد کی، ان کے اعداد و شمار حسبِ ذیل ہیں :-

اقسام اناج۔	۲۸۔ نومبر کو ختم ہونے والے ہفتہ میں	یکم جنوری سے ۲۸ نومبر تک کل مقدار
گیہوں اور آٹا۔	۴۱،۷۰۰ ٹن	۱۲،۴۹،۶۰۰ ٹن
چاول	۱۸،۵۰۰ "	۲،۷۳،۲۰۰۰ "
مکئی	۲،۱۰۰ "	۲،۷۲،۲۰۰ "
جوار باجرہ وغیرہ	۱،۴۰۰ "	۵۳،۸۰۰ "
جَو	۱۹،۷۰۰ "	۷۷،۰۰۰ "

امریکہ میں ہندوستانی سفیر

بادشاہ سلامت کی حکومت نے مسٹر آصف علی کو ہندوستان کی طرف سے امریکہ کا سفیر مقرر کرنا بخوشی منظور فرما لیا ہے۔ یہ نیک خبر اہلِ دہلی کے لئے بہت ہی زیادہ باعثِ مسرت ہے۔ اس وقت مسٹر آصف علی کی عمر اٹھاون سال ہے۔ انھوں نے دہلی کے اینگلو عربک ہائی اسکول اور سینٹ اسٹیفنز مشن کالج میں تعلیم پائی اور لندن "لنکنز ان" نامی ادارے سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں وہ بارایٹ لا ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے مس ارونا گنگولی سے شادی کی جن کے چچا ڈاکٹر این گنگولی سی آئی ای، ان دنوں رائل ایگریکلچرل کمیشن کے رکن تھے۔ نئی مرکزی حکومت نے یہ پہلا سفارتی تقرر کیا ہے جس کو بڑی اہمیت دی جا سکتی ہے۔ گمان غالب ہے کہ جنوری کے شروع میں مسٹر آصف علی امریکہ تشریف لے جائیں گے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بیگم آصف علی جو ان دنوں ضرورت سے زیادہ مصروف ہیں، اپنے شوہر کے ساتھ واشنگٹن جا سکیں گی یا نہیں۔ مسٹر آصف علی کی روانگی سے قبل سر گرجا شنکر باجپائی امریکہ سے واپس ہندوستان آ جائیں گے۔

پیرس کے بھوکے چوہے

جنگ اور متعلقات جنگ میں مصروف ہو کر دنیا بھر کے لوگ کھیتی باڑی کے کاموں کو چھوڑ بیٹھے۔ نیز فوجی دستوں اور مسلح گاڑیوں نے مزروعہ زمینوں اور کھیتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر جگہ اناج کی زبردست کمی محسوس کی جانے لگی اور قحط نے اپنا رنگ جما لیا۔ بہت سے لوگ بھوک کے مارے مر گئے اور کچھ ناقص غذا کے باعث کمزور ہو کر اپنی صحت و تندرستی کو کھو بیٹھے۔ لیکن پیرس سے آنے والی اس عجیب خبر نے ہر شخص کو حیران کر دیا ہے کہ وہاں کے بھوکے چوہے موقع پا کر انسان کے چھوٹے بچوں پر حملہ کرتے اور ان کے جسم کا کوئی حصہ کتر کر کھا جاتے ہیں۔ پہلے طاعون اور موسمی امراض کی روک تھام کے لئے چوہوں کو مارنے کی مہمیں سر کی جاتی تھیں لیکن اب اس نئی مصیبت سے بچنے کے لئے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جو ایک مقررہ وقت پر شہر کے گرد گشت

سے چوہوں کے بلوں پر حملہ ہوئے گا اور ہر ممکن طریقے سے ان کی نسل کو نیست و نابود کردینے کی کوشش کرے گا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مہم کس حد تک کامیاب ہوگی۔ پیرس کی مجلس بلدیہ نے عوام سے استدعا کی ہے کہ وہ اس سلسلے میں سرکاری اہلکاروں کی پوری پوری مدد کریں۔ چوہے دان لگاکر زہریلی گولیاں پھیلاکر یا کسی اور طریقے سے چوہوں کو فنا کریں تاکہ خود ان کے معصوم بچے امن و عافیت کی فضا میں سانس لے سکیں۔

کالی مرچوں کی برآمد

حکومت ہند نے شروع جنوری سے آخر ستمبر ۱۹۴۶ء تک کالی مرچیں ہندوستان سے باہر بھیجنے کے سلسلے میں حسب ذیل ملکوں کیلئے اجازت دی ہے۔ مقدار کا تعین بھی کردیا گیا ہے جو ہر ملک کے سامنے درج ہے:۔
امریکہ - ۲۵۰۰ ٹن - برطانیہ - ۱۹۰۰ ٹن - آئرلینڈ ۵۰ ٹن - آسٹریلیا ۳۰۰ ٹن - نیوزی لینڈ - ۵۵ ٹن - لنکا ۷۵ ٹن - افریقہ کی برطانوی نوآبادیات ۱۰۰ ٹن - بلجیم - ۱۲۵ ٹن - لٹیبی ممالک - ۱۲۵ ٹن - ناروے - ۵۰ ٹن - ڈنمارک ۱۰۰ ٹن - سوئٹسٹان - ۲۰۰ ٹن - ہسپانیہ اور ہسپانوی مراقش - ۱۰۰ ٹن - ترکی - ۱۰۰ ٹن - روس - ۵۰۰ ٹن - کینیڈا - ۳۰۰ ٹن - پرتگال - ۱۰۰ ٹن - اٹلی - ۱۰۰ ٹن - زیکوسلویکیہ ۱۰۰ ٹن - برطانوی جزائر غرب الہند - ۱۰۰ ٹن - مغربی طبقات کے دوسرے ممالک ۵۰ ٹن - مشرق وسطی، افریقہ اور خلیج فارس کے ملک - ۱۵۰۰ ٹن +

بین الاقوامی ادارۂ حفظانِ صحت

پچھلے سال جولائی کے مہینے میں جب ادارہ اقوام متحدہ کی اقتصادی اور سماجی مجلس کے زیر اہتمام بین الاقوامی مجلس حفظانِ صحت کا اجلاس ہوا تو اکسٹھ ملکوں کے نمائندوں نے جن میں ہندوستان کے نمائندے بھی شامل تھے، اس ضرورت کو محسوس کیا کہ ساری دنیا میں صحت و تندرستی کا عام معیار بلند کرنے کے لئے ایک عالمگیر ادارے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اب یہ تجویز عملی شکل اختیار کررہی ہے۔ ہر ملک اپنی حکومت کی منظوری سے اس ادارے میں شامل ہوسکیگا۔ یہ ادارہ طب اور ادویات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہوگا۔ تشخیص امراض، طریقہ، علاج اور پرہیز وغیرہ کے سلسلے میں مشورہ و امداد کی سہولتیں پیدا کی جائیں گی۔ یہ لازمی نہیں ہوگا کہ اس کی ہر ہدایت کو دائرہ عمل میں لایا جائے لیکن ہر ملک کے لئے بہتری اسی میں ہوگی کہ وہ اس پر عمل کرے۔ یہ ادارہ بہتر غذا، رہائش، صحت و صفائی، وضع حمل، پرورشِ اطفال، تیاری و ترکیب ادویات اور طبی تعلیم کے ضمن میں بھی مفید خدمات انجام دیگا۔

چین کی خانہ جنگی

دنیا میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے پہلے بھی چین کی سرزمین، لڑائی اور قتل و غارت کا مرکز بنی ہوئی تھی کیونکہ جاپان نے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے لئے اس غریب ملک کو تختۂ مشق بنا رکھا تھا لیکن اب بھی جبکہ ساری دنیا میں فضائے امن و عافیت طاری ہوگئی ہے اور امریکہ کے ایٹم بموں نے جاپان کے عزم و ارادے کچل کر رکھدیئے ہیں، چین میں بدستور آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے لیکن یہ ہولی کسی بیرونی اثرات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خانہ جنگی کی فضائے مسموم اہل ملک کے لئے عرصۂ حیات کو تنگ سے تنگ تر کئے جارہی ہے۔ چین کی سرکاری حکومت اور اشتراکیوں میں کسی عنوان سمجھوتے کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔ خبر آتی ہے کہ مفاہمت کے آثار رونما ہورہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مختلف حصوں میں قتل و غارت کا بازار بدستور گرم ہے۔ دونوں مخالف جماعتیں ایک ہی ملک کی رہنے والی، ایک ہی مذہب کی حامی اور یکساں سماجی پابندیوں میں گھری ہوئی ہیں، پھر بھی وہ ایک مرکز پر نہیں آتیں۔ امریکہ نے ایک مصالحتی وفد بھیجکر انتہائی کوشش کی کہ ان دونوں کے مابین صلح و صفائی کی صورت نکل آئے لیکن اب تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا ہے۔ اس خانہ جنگی سے ان کے تمام نظام حیات پر اتنا برا اثر پڑرہا ہے کہ امن و عافیت کی فضا قائم ہوجانے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اس ملک کے لئے پنپنا اور ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ممکن نہیں ہوسکیگا۔

سانحاتِ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ سر جوگندر سنگھ جو وائسرائے ہند کی پچھلی مجلس عاملہ میں تعلیم، حفظانِ صحت اور اراضیات کے رکن تھے ۳ دسمبر کی شام کو اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔ موصوف مئی ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے اور نجی طور پر اعلیٰ تعلیم پاکر ایک لائق سیاستدان اور بلند پایہ ادیب ہوگئے تھے۔ ملک کے انتظامی معاملات میں مفید مشورے دینے کے علاوہ صحافت کے میدان میں انکی بڑھی ہوئی دلچسپیاں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھیں۔ سکھ مذہب پر عمدہ اور مفید کتابیں لکھنے کے علاوہ انہوں نے کئی تذکرے اور ناول بھی قلمبند کئے۔ وائسرائے کی مجلس عاملہ میں آنے سے پہلے وہ ریاست پٹیالہ کے وزیر اعظم تھے۔

اسی ہفتے یہ افسوسناک خبر بھی سننے میں آئی کہ ریاست کپورتھلہ کی مہارانی تارا دیوی دہلی کی قطب مینار سے گرکر موت کے آغوش میں پہنچ گئیں۔ ان کا اصلی نام یوسپ تھا اور وہ زیکوسلویکیہ کی رہنے والی تھیں۔ وہ لڑائی سے پہلے ہندوستان آئیں اور اب سے چند سال پہلے مہاراجہ سے انکی شادی ہوگئی تھی۔ بعد کی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ مہاراجہ سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے اور اسی لئے وہ ان سے الگ رہتی تھیں۔ نیز اب وہ امریکہ جانے کے لئے پوری طرح عزم سفر بھی کرچکی تھیں۔ اسوقت ان کی عمر صرف ۲۷ سال تھی۔ اس بے وقت موت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے +

غزل

اثر لکھنوی

اک فقط میں ہی نہیں وہ بھی پشیماں ہوگا
بیکسی میں جو مرے حال کا پرساں ہوگا

کچھ ترے جور ہی سے جور کا درماں ہوگا
کہ پشیماں جو نہ ہوگا تو پشیماں ہوگا

گرمیٔ شوق یہی ہے جو دمِ جلوہ گری
خود نظارہ صفتِ شعلہ پرافشاں ہوگا

اک ذرا اور جو چالاک ہوا دستِ جنوں
تو پھر اک سلسلۂ چاکِ گریباں ہوگا

بزم کی بزم سلگ اُٹھے گی یہ یاد رہے
بے گناہوں کے لہو سے جو چراغاں ہوگا

ایک مرکز پہ سمٹ آئے نظامِ عالم
بے محبت کے ہوا ہے نہ یہ ساماں ہوگا

زندگی سے جسے تعبیر کیا جاتا ہے
ایسے جینے سے تو مرنا کہیں آساں ہوگا

جو ترے حسن کے جوہر بھی نمایاں کردے
آئینہ تو وہ نہ ہوگا دلِ حیراں ہوگا

رنگ چہرے کا ذرا دیکھئے آئینے میں
جائیے آپ سے کیا درد کا درماں ہوگا

جو تری یاد کو سینے سے لگا کر سویا
شورِ محشر اُسے اک خوابِ پریشاں ہوگا

پھیر لے پھیر لے دم بھر کو نگاہیں ورنہ
نالہ بھی میری طرح بسملِ مژگاں ہوگا

دیکھیں کیا کہتے ہیں اب تک جو کہا کرتے تھے
طرزِ مومن میں اثرؔ خاک غزلخواں ہوگا

جامعہ ملیہ اسلامیہ

حفیظ جالندھری

اَدِرْ کاساً وَّ نَاوِلْہا اَلا یا اَیُّہا السّاقی
رسالت کے بقیہ معجزوں میں جامعہ بھی ہے
قیامِ جامعہ ان ظلمتوں میں ان فضاؤں میں
مقابل ساحرانِ مغربی کے اک یدِ بیضا
یہ مِلّت جب کبھی اپنی زیاں کاری کو جانے گی
ابھی اک اور زندہ معجزے کا ذکر ہے باقی
مدینے ہی سے وابستہ یہ نُورِ لامعہ بھی ہے
چراغِ راہ ایسی تند زہریلی ہواؤں میں
خدائی اتنے فرعونوں کی ۔ تنہا جرأتِ موسیٰ
وجود اس جامعہ کا مُعجزے سے کم نہ مانے گی

سُنا ہے میں نے یہ قصہ بزرگوں کی زبانوں سے
زمینِ ہند پہ طاری تھا خوابِ خود فراموشی
مسلماں سو چکے تھے دامنِ ادبار و ذلّت میں
یہ عبرت ایک غیرت مند مومن کی بصیرت تھی
یہ بندہ تک رہا تھا دور سے گردش ستاروں کی
سکوتِ مرگ کی اس وادئ خاموش میں گویا
یہی آباد گھر دیکھا ۔ یہی اک در کھُلا پایا
یہ شیخ الہند محمود الحسن کا باصفا سینہ
یہ خورشیدِ رسالت کی طرف سے اک امانت تھی
یہ اک تازہ بشارت تھی یہ اک پیغامِ نوری تھا
اندھیری رات میں اک نور اترا آسمانوں سے
مُسلسل ایک سنّاٹا ۔ مُسلسل ایک خاموشی
بجز عبرت کوئی پرسانِ مِلّت تھا نہ مِلّت میں
اسیرِ مالٹا کی حرّیت آموز سیرت تھی
نگہبانی اسے مطلوب تھی قسمت کے ماروں کی
اسی کے چشم و دل تھے آسمانی نور کے جویا
مِلا آنکھوں کا زینہ، نور سینے میں اُتر آیا
وہ نور اک چاند تھا انوارِ اسلامی کا آئینہ
اسے امت کی آنکھوں میں بسا دینا دیانت تھی
اسے سینہ بسینہ منتقل ہونا ضروری تھا

جنابِ شیخ نے اس کام کا آغاز فرمایا
امینِ راز تھے بحرِ وفا کے بے بہا گوہر
سفارش سوزِ کامل کی تقاضا دردِ بے حد کا
اسی دل نے انھیں آنکھوں نے مل کر طرح نو ڈالی
جگایا اہلِ دل کو محرمانِ راز فرمایا
یہ دو آنکھیں تھیں اک دل ۔ اجمل و انصاری و جوہر
انھیں عہدہ مِلا تبلیغِ ارشادِ محمدؐ کا
یہی تینوں تھے کشتِ جامعہ کے اوّلیں مالی

تمنّا تھی کہ چمکے اس طرح کچھ جوہرِ خاکی
کہ جس کی دید کا مشتاق ہو خود نورِ افلاکی

وہ گرمی جس سے داغِ عشق کا شعلہ ہویدا ہو
مسلمانانِ ہند کی نگاہوں سے بھی پیدا ہو

تھی خدمت جنکے ذمے ظلمتِ شب کو مٹانے کی
انھیں ترکیب سوجھی چاند سے سورج اگانے کی

نگاہِ ظلمتِ مغرب نے بھی یہ ماجرا دیکھا
طلسمِ غفلتِ مشرق کا جادو ٹوٹتے دیکھا

اٹھی اندھیر گردی ہر طرف سے کے تعزیریں
سزائیں۔ ابتلائیں۔ تازیانے اور زنجیریں

تجلّی طورِ سینا کی بسی ہو جن نگاہوں میں
غضب کے امتحاں رکھے گئے ہیں انکی راہوں میں

نہ سمجھو تربتوں میں اب وہ زیرِ خاک سوتے ہیں
کبھی سوتے نہیں جو بیج بیداری کا بوتے ہیں

شہیدانِ مقاصد کو کہاں آرام ملتا ہے
بحالِ قید و آزادی، برابر کام ملتا ہے

ابھی جاری ہے اُن روحوں کا فیض کارفرمائی
طلوعِ جامعہ سے ہے عیاں اُن کی مسیحائی

پسِ مردن ملا ہوگا انھیں اتنا ہی چین اب تک
کہ وقفِ جامعہ ہے خدمتِ ذاکر حُسین اب تک

جوانمردوں نے جھیلی تھی جفا پیرانہ سالی میں
وفا کے بیج آخر بو گئے افکارِ عالی میں

وہ عالی فکر جن کو جامعہ کا باغباں کہئے
دمِ جاری و ساری بانئ روحِ رواں کہئے

یہی سادہ سے ذاکر یارِ رفیقِ کار ہیں اُن کے
انہی سے پوچھئے پوشیدہ کیا اسرار ہیں ان کے

کبھی انکی نظر پڑتی نہیں اسبابِ زینت پر
خدا رحمت کرے ان عاشقانِ پاک طینت پر

اسی اک دائرے میں کاٹ کر مدّت اسیری کی
بساتے جا رہے ہیں بستیاں روشن ضمیری کی

زمینِ شور پہ ہل چل رہا ہے خشک سالی میں
کمی کرتا نہیں خونِ جگر دریا نوالی میں

یہی ذاکر جو پیکر تھا کبھی حُسن و جوانی کا
ذرا پوچھو تو باعث کیا ہے اس کی ناتوانی کا

لہو کا قطرہ قطرہ وقفِ گلشن کر دیا اس نے
جمالِ ذات سے پھولوں کا دامن بھر دیا اس نے

یہ چہرے نونہالوں کے یہ بازو نوجوانوں کے
جنھیں اک روز ہونا ہے مقابل قہرمانوں کے

انہی چہروں سے دنیا میں اجالا ہونے والا ہے
یہی بازو ہیں جن کا بول بالا ہونے والا ہے

ظہورِ معجزہ سے کم نہ پاؤ گے ظہور ان کا
جگر کے خون سے سینچا گیا ہے باغِ نور ان کا

خطبۂ صدارت — اعلیحضرت فرمانروائے بھوپال

امیرِ جامعہ، خواتین اور حضرات!

میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے کارکنوں، اس کے طلبا اور اس کے ہمدردوں کو جن میں کل ہندوستان کے شائقین علم و تعلیم شامل ہیں تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں کہ جامعہ نے اپنی عمر کے پچیس سال پورے کرلئے اور اس چوتھائی صدی میں قومی زندگی کا ایک جزو صالح بن کر صدیوں تک زندہ رہنے کا سامان کرلیا۔ کاش آج جامعہ کے نامور بانی حضرت شیخ الہند، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری مرحومین بقیدِ حیات ہوتے اور اس باغ کو جو انھوں نے بڑے شوق سے لگایا تھا سرسبز و شاداب دیکھ کر خوش ہوتے: تاہم ہمارے دل انکی خدمت میں بعالم ارواح خراج تہنیت پیش کرتے ہیں۔

جامعہ ملیہ کی رُبع صدی کی کارگذاری کا جائزہ لینے سے پہلے ہمیں اُس فریضہ ملی کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھ لینا چاہیئے جو جامعہ نے اپنے ذمے لیا ہے۔ خدمت عامہ کے کام جو قومی زندگی کی تعمیر کے لئے انجام دیئے جاتے ہیں دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اصلاح و تہذیب یعنی افراد قوم میں سچی اور پاکیزہ اخلاقی روح پھونکنا ان کے دلوں میں اقدار اعلیٰ کی محبت پیدا کرنا، اور ان کی سیرت اور عمل کو ان اقدار کے سانچے میں ڈھالنا۔ دوسرے تنظیم و تربیت یعنی افراد کی بکھری ہوئی قوتوں سے ایک منظم اور منضبط اجتماعی قوت پیدا کرنا جس کے ذریعہ سے قومی مقاصد حاصل کئے جاسکیں۔ پہلا کام عالم اور مصلح کا اور ان سے بھی زیادہ معلّم کا ہے جو ان دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ دوسرا کام سیاست داں اور مُدبّر کا ہے جو علم کے تیار کئے ہوئے مسالے سے قوم اور ریاست کی پائدار عمارت بناتا ہے۔ یہ دونوں کام اپنی اپنی جگہ نہایت اہم ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے پہلا کام مقدم اور بنیادی ہے۔ اور دوسرا تمام تر اسی پر منحصر ہے۔ اگر معلّم اپنا وظیفہ اصلاح و تہذیب بوجہ احسن ادا نہ کرے تو مدبر ترتیب و تنظیم سے یکسر قاصر رہیگا۔ اس لئے کہ بحس، بے روح اور بے اصول افراد سے تو کوئی قوم یا ریاست وجود میں ہی نہیں آسکتی۔ اسی طرح اگر معلّم اپنا کام غلط طریقے پر کرے تو مدبر کے لئے اپنا فرض صحیح طریقے پر انجام دینا دشوار بلکہ محال ہو۔ ناقص مسالے کو کتنی ہی کاریگری اور چابکدستی سے استعمال کیا جائے اس سے جو عمارت بنے گی وہ کمزور اور ناپائیدار ہوگی، پست ہمت اور دُنی الطبع افراد کو منظم کرنے میں کتنی ہی دانشمندی اور تدبر سے کام لیا جائے ایک صالح، تندرست اور قومی جماعت کا وجود میں آنا قطعاً ناممکن ہے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ معلّم کا کام قومی زندگی میں کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ معلّم عالم اور مصلح کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر اس کے اور ان دونوں کے مابین ایک بڑا فرق ہے معلم اپنے جذبۂ تخلیق اور اپنے جذبۂ اصلاح و تہذیب کو نہایت ضبط اور احتیاط سے اسطرح کام میں لاتا ہے کہ دوسروں پر کوئی چیز اپنی طرف سے عائد نہ کرے۔ بلکہ اُس جوہر کو جو خود ان کے اندر موجود ہے اُبھرنے اور نشو و نما پانے کا موقع دے۔ ایک شخص کا اپنی ذات میں عالمانہ فضل و کمال اور مصلحانہ جوش و خروش کی صفات کا جمع کرنا اور پھر نمود ذات سے باز رہنا اتنی بڑی ریاضت اور اتنا بڑا ایثار ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس اہم اور مشکل کام کا بوجھ جامعہ ملیّہ کے باہمت کارکنوں نے اٹھایا اور سخت دقتوں اور مصیبتوں کے باوجود اسے بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ انھوں نے سب سے پہلا اصول یہ رکھا کہ جامعہ کی تعلیم حکومت یا دوسری بیرونی قوتوں کی مداخلت سے آزاد رہے گی اور کوئی ایسی امداد قبول نہیں کی جائے گی جس سے جامعہ کی آزادی میں خلل پڑے۔ یہ اصول اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ناگزیر تھا جس نے شیخ الہند مرحوم اور دوسرے بزرگان قوم کو اس ادارے کی تاسیس پر آمادہ کیا تھا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تعلیم عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی روایات کے مطابق اور قومی ضروریات کے مناسب ہو۔ ایسی تعلیم جو حقیقی معنی میں تخلیقی ہو جس سے ذہن میں بیداری، روح میں بالیدگی اور سیرت میں پختگی پیدا ہو کسی بیرونی قوت کے عاید کئے ہوئے نظام کے اندر نہیں پنپ سکتی، بلکہ آزادی کی کھلی ہوا چاہتی ہے۔ لہٰذا اپنی آزادی کو قائم رکھنے کے لئے جامعہ کو حکومت کی امداد سے محروم رہنا پڑا جس کے بغیر ہمارے ملک میں کوئی تعلیمی ادارہ اچھی طرح نہیں چل سکتا۔ اس کے کارکنوں کو انتہائی عسرت کی زندگی بسر کرنی پڑی اور اس کے طلبا پر معاش کے اکثر دروازے بند ہوگئے۔ مگر اس نے اس راہ کو جسے وہ سیدھی راہ سمجھتی تھی قدم نہیں ہٹایا اور آہستہ آہستہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتی رہی۔ اس بے سرو سامانی کی حالت میں اس نے نئے تعلیمی تجربے کئے اور تعلیم و تربیت کے ایسے طریقے نکالے جن سے بچوں میں سچی دینداری اور حقیقی انسانیت جسمانی اور ذہنی قابلیت، خود شناسی، خودداری اور خود اعتمادی، آزادانہ ذمہ داری اور رضاکارانہ ضبط کی صفات پیدا ہوں۔ اس نے جامعہ عثمانیہ کی طرح اردو زبان کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ قرار دیکر اس ذہنی بےحسی اور بےبسی کو دور کرنے کی راہ نکالی جو غیر زبان میں تعلیم پانے سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں پیدا ہوگئی ہے۔ اس نے معلموں کی تیاری کے لئے نئے طرز کی تربیت گاہ قائم کی علم و تعلیم کی روشنی کو مدرسے کی حدود سے باہر پہنچانے کی غرض سے حلقۂ تعلیم و ترقی تصنیف و تالیف کے لئے اردو اکاڈمی اور بیت الحکمت کی بنیاد ڈالی اور نشر و اشاعت علوم کے لئے

مکتبہ جامعہ قائم کیا اسکی تعلیمی و علمی خدمات کو نہ صرف ہندوستان کے بلکہ دوسرے ملکوں کے ارباب دانش بھی قدر و عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور آئندہ کے لئے اس سے بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں۔

ارباب جامعہ نے اپنے محدود وسائل کے باوجود موجودہ اداروں کی تکمیل و استحکام اور نئے نئے اداروں کے قیام کی جو تجویزیں مرتب کی ہیں ان سے نہ صرف ان کی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کا بلکہ ان کی مصلحت بینی اور قوت تنامی کا بھی ثبوت ملتا ہے۔ ضروری عمارتوں کی تعمیر اور اردو اکاڈمی اور بیت الحکمت کی توسیع کے علاوہ وہ ایک جدید ترین طرز کا صنعتی ادارہ، لڑکیوں کی تعلیم کا اقامتی مدرسہ، چھوٹے بچوں کی تربیت کے لئے کنڈر گارٹن اور انکی صحت کی درستی کے لئے ایک ایسا شفاخانہ کھولنا چاہتے ہیں جس میں مدرسوں کی حفظان صحت اور علاج اطفال کے مخصوص ماہرین موجود ہوں۔ یہ سب تجویزیں ملک کے حامیان تعلیم کی دلی ہمدردی اور توجہ کی مستحق ہیں۔ اور مجھے امید ہے یہ سب علم دوست اور مخیر حضرات ان منصوبوں کے پورا کرنے میں جامعہ ملیہ کو مدد دینگے۔

اس علمی و تعلیمی خدمت کے علاوہ جو جامعہ ملیہ نے انجام دی ہے اس کی خاموش ملکی خدمت ایسی ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جشن سیمیں کے معزز مہمانوں کے سامنے جامعہ ملیہ کے موجودہ اور آئندہ کاموں کا ایک سرسری خاکہ پیش کرنے کے بعد اب میں جامعہ کے ارکان سے چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں :-

حاضرین جامعہ! آپ نے ایثار و خدمت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ بڑی دشوار گذار اور سنگلاخ ہے اور کامیابی کی جس منزل تک آپ پہنچنا چاہتے ہیں وہ دور دراز اور دیر طلب ہے۔ مگر اہل ہمت کے لئے یہی راہ چلنے کے لائق اور یہی منزل پہنچنے کے قابل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ ماحول آپ کی جدوجہد کے لئے ناساز گار ہے۔ ذہنی تبدیلیوں کے دور میں قدرتی طور پر ہمارے دل و دماغ پر سیاست چھائی ہوئی ہے اور یوں بھی ان حالات کی وجہ سے جو جنگ عظیم کے بعد رونما ہوئے ہیں دیگر ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی سیاسی اور معاشی مسائل نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی۔ ایسے زمانہ میں لوگ آپ کے تعمیری اور تخلیقی کام کی طرف اتنی توجہ نہیں کرینگے جسکا وہ مستحق ہے لیکن آپکو اس سے بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ وقت کے دھارے کیخلاف تیرنے والوں کو خصوصاً طوفان کے زمانہ میں موجوں کے تھپیڑے کھانے ہی پڑتے ہیں لیکن اگر انکے دلوں میں عزم، سینوں میں زور اور بازوؤں میں قوت ہے تو وہ دریا کو چیرتے ہوئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ طوفان گذر جاتا ہے، ہوا بدل جاتی ہے، دھارا پلٹ جاتا ہے۔ اور عناصر تیرنے والے کے سد راہ نہیں ہوتے بلکہ اسکے رفیق راہ بنجاتے ہیں۔ خدا کے فضل سے آپ اپنے مقاصد میں ضرور کامیاب ہونگے۔

مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر ہمارے مفکرین ایک مدت سے غور کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اسکے حل میں ان کو قابل اطمینان کامیابی نہیں ہوئی ہے ان کا نصب العین یہ ہے کہ ہمارے طلباء کے واسطے کوئی ایسا نظام تعلیم تجویز کیا جائے کہ جسمیں علاوہ علوم جدیدہ کے انکی خصوصیات ملی پر بھی پوری توجہ کی جائے۔ تاریخ اسلام میں بغداد، قرطبہ، غرناطہ میں جو علمی ترقی ہوئی اور جسکی روشنی ابتک یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اس کی بنیاد تعلیم قرآن اور ارکان اسلام پر تھی اور یہی سبب ہے کہ وہ تباہ کاری جو اس وقت مغربی دنیا میں مجرد سائنس کی تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ اسلامی دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوئی۔ ہندوستان میں مغربی اثرات کے تحت جو نظام تعلیم جاری ہوا اس میں تہذیب اخلاق کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا اسلئے اسکے مضر نتائج اظہر من الشمس ہیں۔

جامعہ ملیہ میں ان نقائص کے دور کرنے کیلئے قدم اٹھایا گیا ہے اور اگر یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا تو یہ درسگاہ ہمارے کل تعلیمی اداروں کے واسطے مشعل راہ ثابت ہوگی۔

جامعہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسکے مدرسین نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں نہایت ایثار سے کام لیا ہے اور اپنی زندگی قومی خدمت کے واسطے قربان کی ہے۔ یہ مثال اخلاق کی کتابوں سے کہیں زیادہ موثر ہے۔ اور جو طلباء یہاں سے انگریزی پڑھکر نکلیں گے وہ ہمیشہ قوم کی خدمت کو اپنے ذاتی اغراض پر مقدم رکھیں گے۔

ایک بڑی خدمت اس ادارے کی یہ بھی ہے کہ اس نے قوم میں علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنیکا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور طلبا کو یونیورسٹی کی ڈگریوں سے جو کہ صرف ایک کسب معاش کے واسطے حاصل کی جاتی ہیں مستغنی کر دیا ہے۔

جامعہ ملیہ کی امتیازی کامرانی کا سہرا میرے دوست اور زمانہ طالبعلمی کے رفیق ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ کے سر ہے اور یہ ایک ایسی فروگذاشت ہوگی جسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس قابل قدر اور مایۂ ناز ہستی کے متعلق میں اپنے دلی جذبات تشکر کا اظہار نہ کروں جنکی بے مثل قربانیوں اور پیہم کوششوں سے اس عظیم الشان ادارہ کی عملی تعمیر وجود میں آئی ہے۔ اس درسگاہ کے اساتذہ اور متعلمین کیلئے اس محترم ہستی کی شاندار نظیر سے بہتر کوئی چیز قابل تقلید نہیں ہو سکتی جسکا نام ناحق ہمت، استقلال اور ایثار کا مترادف ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فی زمانہ ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ہیں اور جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ میرے خیال میں کسی محب وطن اور محبوب ملت کی مساعی جمیلہ کی قدر و قیمت کا تعین کرنا ایک قسم کی جسارت ہے تاہم میرے لئے اس امر واقعہ کا اظہار موجب فخر ہے کہ جملہ ابنائے وطن و قوم ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے مخلص اور بے نفس رفقاء کار کی عظیم القدر خدمات کیلئے ہمیشہ تہ دل سے سپاس گذار رہیں گے۔

خداوند کریم ان سب کی متفقہ کوششوں میں برکت دے اور جامعہ ملیہ کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین!*

جامعہ کے پچیس سال

اعلیٰحضرت، محترم امیر جامعہ، خواتین اور حضرات۔

آج مجھے آپ کی خدمت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پچیس سالہ روئداد کا خلاصہ پیش کرنا ہے، پچیس سال اور کیسے پچیس سال! یہ کام جب شروع ہوا تھا تو کتنے تھے جن کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ اس پر پچیس سال بھی گذر جائیں گے۔ خاصی طویل مدت ہوتی ہے، پچیس سال کی، اور پھر قوموں کی زندگی میں یہی پچیس سال ایک لمحے سے بھی کم ہوتے ہیں، لیکن باوجود اپنی طوالت کے یہ زمانہ بے رنگ مرور کا مرادف ہوتا ہے، اور حیات قومی کا یہی ایک لمحہ ایک تخلیقی لمحہ ہونے کی وجہ سے صدیوں پر بھاری ہو سکتا ہے۔ ان گذرے ہوئے پچیس سال کی روئداد کس اسلوب سے پیش کروں۔ اس مدت میں عزائم اور فسخ عزائم، ولولوں اور پژمردگیوں، مشقتوں، اور سہل انگاریوں دستگیریوں اور شکستگوں، شبہوں اور اعتمادوں، امیدوں مایوسیوں، تجیکیوں اور گھرکیوں، حوصلہ مندیوں اور درماندگیوں کی کیسی کیسی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ اور یہ سب لفظ جو میں نے بولے یہ صرف برائے گفتن نہیں۔ ان میں سے سب کی مثالیں اس وقت میرے ذہن میں موجود ہیں۔ اس روئداد میں ان کا ذکر کروں تو داستان بہت طویل ہو جائے گی۔ خلاصہ سب کا یہ ہے کہ اگر خدمت قومی کا کوئی کام نیک نیتی سے خدا کا کام سمجھ کر کیا جائے تو ہر چند کہ دشواریوں اور آزمائشوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن جس کا کام ہوتا ہے وہ دستگیری فرماتا ہے۔ متزلزل قدموں کو ثبات عطا ہوتا ہے، دل توڑا بھی جاتا ہے مگر پھر جوڑا بھی جاتا ہے

دلِ شکستہ درآں کوئے می کنند درست
چناں کہ خود نہ شناسی کہ از کجا بشکست

ان مع العسر یسرا فان مع العسر یسرا، شرط یہ ہے کہ عسر کو اس کی رضاجوئی میں جھیلا جائے اور یسر کو اس کی راہ میں پیشقدمی کے لئے سہولت اور رحمت جانا جائے۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کردوں۔ آپ سب کو یاد ہوگا اس لئے کہ باوجود حافظہ کی معروف ناپائیداری کے وہ آسانی سے بھلا سکنے کی بات نہیں کہ کوئی دس سال کی انتہائی ہیجانی تلاطم بے چینی کے بعد ۱۹۲۰ء میں مسلمانان ہند کی ایک عمومی حرکت نے تحریک خلافت کی شکل اختیار کی۔ ساری دنیا میں ملت اسلامیہ پر جو گذر رہی تھی اس سے ہندوستان کے مسلمان بے خبر اور غیر متاثر نہ تھے۔ اپنی جماعتی حالت کی زبونی سے باوجود صد غفلت یہ آنکھیں بند نہ کر سکتے تھے۔ مایوسی بھی تھی، غصہ بھی تھا، اور بے ہاتھ پاؤں مارے اپنے خاتمہ کا خیرمقدم کرنے کو بھی یہ تیار نہ تھے کہ جسم جماعتی میں کہیں زندگی کی رمق باقی تھی اور جس طرح کسی شدید مرض کے حملے میں جسم اپنی ساری قوتوں کو سمیٹ کر ایک بار دفع مرض کی جان توڑ کوشش کرتا ہے اسی طرح ملت اسلامیہ ہندیہ نے اپنی ساری ناتوان توانائیوں کو مجتمع کر کے صورت حال کے مقابلہ کا تہیہ کیا تھا۔ جس طرح جسم کے سارے نظام ہائے اعضا اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق، اس کی اس مصیبت میں آخری معرکہ کے لئے کمر بستہ ہو کر کتابوں اور حکیموں کے اندازوں سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اپنا عمل کرتے ہیں اسی طرح جسم اجتماعی کا حال ہوتا ہے، اس تلاطم کے زمانے میں مسلمانان ہند نے اسی قسم کی ایک کوشش کی تھی۔ تعلیمی نظام عضاء کے فعل کا نتیجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ تعلیم کے کام کا پرسکون دھیماپن اور ایک انقلاب انگیز سعیٔ ملی کی ہنگامہ آرائی کا یہ تعلق بادی النظر میں کچھ انوکھا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس دور انقلاب میں جامعہ کے نام سے ان تمام نیم شعوری اور تحت شعور تعلیمی منصوبوں نے ایک شکل اختیار کی، جو ایک عرصہ سے مسلمانوں کے اہل فکر و عمل کو ایک صحیح قومی تعلیمی نظم کے ترتیب دینے پر اکسا رہے تھے۔ اس میں محمد قاسم کی تمناؤں، سید احمد خاں کی آرزوؤں، سید محمود کی تجویزوں، وقار الملک کے ارادوں، اعلیٰحضرت کی سلطانیہ کالج جیسی اسکیموں، غرض خدمت اور احیائے ملت کی بہت سی چھوٹی بڑی کوششوں کا پرتو ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قوم اپنے وجود کے وظیفۂ بنیادی سے غافل نہیں ہے اور جب بھی اپنی زندگی کے باقی رکھنے اور ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اسے تعلیم صحیح تعلیم ہی کی راہ پر گامزن ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ہماری قومی زندگی کا شیرازہ، جو خود ہمارے ہاتھوں بہت بوسیدہ ہو چکا تھا، بکھرا تو ہم نے دیوبند اور علی گڑھ میں اسے پھر سے جوڑنے کی سعی شروع کی۔ اس صدی کے ربع اول میں مسلمان جس عالمگیر ابتلا میں رہے اور اس میں انہوں نے جامعہ ملیہ قائم کی۔ یہ قوم میں صحیح زندگی کے ہونے کا ثبوت ہے۔ لیکن بس رمق زندگی کا۔ یہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ جب صحت کا کچھ شائبہ بھی جسم جماعتی میں ہو تو وہ اپنے ہیجانات کا اظہار ہسٹریا جیسے تشنجی ہنگاموں ہی میں نہیں کرتی بلکہ اس بحرانی قوت کو دھیمے دھیمے مگر منزل مقصود کی طرف یقینی طور پر چلنے والے ارادوں کا خزینۂ توانائی بنا دیتی ہے۔ یہ سبق ہے ہماری قوم کو کہ وہ اپنے جوش و خروش کو گھنٹوں اور دنوں کے اندر خالی نعروں اور جلوسوں میں منتشر نہ کر دے بلکہ صبر طلب و صبر آزما تعمیری مساعی میں اسے برسوں قرنوں بلکہ صدیوں پر پھیلا سکے۔ میں نے کہا کہ یہ جامعہ ثبوت ہے اور سبق۔ البتہ بہت ہی کمزور سا ثبوت اور بہت ہی روکھا پھیکا سبق۔ کیا عجب ہے کہ تائید ایزدی ہو تو کام کرنے والوں کی استقامت اور قوم کی پذیرائی اس ثبوت کو بہت قوی اور اس سبق کو بہت دلنشین بنا دے۔

ہاں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اس جامعہ میں احیاء ملی کی بہت سی تعلیمی تجویزوں کا سنگم ہے۔ اس حقیقت کا اظہار تھا ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو دیوبند کے سردار شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم و مغفور کے ہاتھوں سید احمد خاں کے دارالعلوم کی مسجد جامع میں اس کام کا افتتاح۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

عجب زمانہ تھا وہ صاحبو! انشر جوانی کے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی
کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے۔
یہ جوانوں کے دڑے نمازیں پڑھنے والے، راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی
دیتے تھے۔ خودغرضیوں کی ہر وقت جکڑے رہنے والی زنجیریں ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں۔ ملازمتوں کے متلاشی سفارشوں کے
لئے سرگرداں اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان
بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کر دیں اور اپنی ساری قوتوں کو اسکی
خدمت کے لئے وقف کر دیں۔ لیکن عمر بھر خودغرضی کی تکرار سے باغرض کاموں
کی مشق تو نہیں ہوتی۔ اس سے بے غرضی کا رخ بھی جاذب توجہ ہنگاموں کی
طرف، گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف، تقریروں کی
طرف نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں
کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت اس جوش اور اس
خلوص کو ایک پائدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے
اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس
قید و جلاوطنی، علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں، جسکے
چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ
خشک کر دیا ہے لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں
کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے
تو بمدد خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے، یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا
لئے بیٹھا ہے۔ ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اسکا پیام
اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو! یاد
رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ
تھی۔ وہ اس ایوان محکم اور اس ایمان کا نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی
دیوار تھی اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو ان کے سامنے
تھے۔ ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت
کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا۔ کسی عمارت کا افتتاح نہ
ہو سکتا تھا، چندوں کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان کو چھوڑ کر
بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا، یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا
سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ محنت اور مشقت
کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری
سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا، یوں اور اس فضا میں
جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو شروع ہوا تھا۔

اس کام کے ساتھ مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ رکھنے والے وابستہ
رہے۔ حکیم اجمل خاں مرحوم اس کے پہلے امیر جامعہ مقرر ہوئے، اور مولانا محمد علی
مرحوم پہلے شیخ الجامعہ۔ حکیم صاحب مرحوم نے ہم نوجوانوں کو متانت، رواداری
خاموش خدمت کا سبق دیا۔ حکیم صاحب کی ذہنی جڑیں مسلمانوں کے علمی اور فنی
ماضی میں بہت گہری پیوست تھیں۔ اور ان کی نظر حال کی ترقیوں اور مستقبل کے
امکانات کو اس طرح صاف دیکھتی تھی جیسے شاید ہی کوئی نام نہاد جدید تعلیم یافتہ
دیکھ سکتا ہو، ہم نے ان سے قدیم اور جدید کے ہم آہنگ بنانے اور سمونے کا سبق
سیکھا۔ حکیم صاحب اپنے دلی کرب کو اپنے دلفریب تبسم کے پردے میں یوں چھپانا
جانتے تھے جیسے صرف ایک ہم آہنگ شخصیت جانتی ہے۔ تکلیف میں مسکراتے
رہنے کی عادت ہم نے ان سے سیکھی۔

پھر مولانا محمد علی اس عہد کی اُن غیر معمولی شخصیتوں میں تھے جنھیں قدرت نے
ذہنی قوتوں کے ساتھ قلب و روح کی بیتابی بھی ارزانی فرمائی ہے، ان کا ذہن
انھیں فرزانوں کا فرزانہ اور ان کا دل انھیں دیوانوں کا دیوانہ بنا دیتا ہے۔ جامعہ
کے ابتدائی کام کرنے والوں کو اس دیوانے فرزانے کی شاگردی اور ہمرکابی کا شرف
بھی حاصل ہوا جس نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے اور بہت
سے شیشہ گروں کی دکانیں درہم و برہم کر دیں۔ جامعہ والوں کو ان سے وہ گرمی قلب
ملی جو مایوسیوں میں امیدوار، اور تہی دستی میں غنی رکھ سکتی ہے، اور اگرچہ
بے وسیلگی میں ہمارے منصوبوں کی آہٹ پاکر بسا اوقات نیک دل ہمدردوں نے
ہم پر ترس کھایا اور زبان حال سے فرمایا کہ ؎

به سادگی تو رحم آمدم دریں بازار
که تنگ دستی و امیدوار می گذری

لیکن محمد علی کی تربیت نے ہمیں دل شکستہ و ویران کی قدر کرنا سکھا دیا تھا، اور
ہم بھی عرفی ہی کے الفاظ میں اپنے نیک دل ہمدردوں سے کہہ دیتے تھے کہ ؎

عرفی دل آباد به یک جو نه خرد عشق
من هم دل ویران به دو عالم نه فروشم

لیکن مولانا محمد علی زیادہ دن جامعہ میں نہ رہ سکے تھے کہ سیاست نے انھیں پھر طلب
کیا، اور ہمارے ملک میں تو سیاست کا انعام اکثر قید و بند اور دار و رسن کی
شکل میں ملتا رہا ہے۔ کراچی کے مشہور مقدمہ کے بعد مولانا قید کر دئیے گئے اور
ہمارے کام کی باگ عبدالمجید خواجہ صاحب نے سنبھالی۔ ہماری خوش قسمتی ہے
کہ خواجہ صاحب امیر جامعہ کی حیثیت سے آج ہم میں موجود ہیں، اور میں جامعہ
کے تمام کارکنوں کی طرف سے ان کی خدمت میں مبارکباد کے ساتھ ساتھ ہدیہ شکر
پیش کرتا ہوں کہ ان کی رہنمائی نے جامعہ کو اس ڈھنگ پر جما دیا جس پر وہ آج تک
چلتی رہی ہے۔ خواجہ صاحب نے جامعہ کے خالص تعلیمی مشن کو سب سیاسی کام
کرنے والوں سے منوایا اور جامعہ نے تہیہ کیا کہ وہ تعلیمی کام کو تعلیمی کام کی حیثیت
سے کرے گی اور اس میں تعلیمی آزادی کو بطور اصول بنیادی کے ہمیشہ پیش نظر
رکھے گی۔ اس دور کی سب سے اہم بات یہی ہے کہ جامعہ نے جو پہلے دن سے
سرکاری اثر سے آزاد رہنے کا اعلان کر چکی تھی یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ کسی سیاسی جماعت
کی تابع بھی نہیں ہے۔ مذہبی کام کی آزادی اور خودمختاری کا اصول سیاست کی

دھوپ چھاؤں سے بے تعلق آنی اور وقتی منصوبوں اور پائدار اور دیر طلب کاموں میں موخرالذکر کی اہمیت کا اقرار یہ ہمیشہ کے لئے جامعہ کی زندگی میں راسخ ہوگئے۔ اور اگرچہ لبا اوقات اس سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں لیکن یکسوئی سے اسپر قائم رہ کر ہم نے نکتہ چینوں کو بھی ان کی نکتہ چینی کا قیمتی حق چھینے بغیر مطمئن کر دیا کہ سیاست سے ہماری یہ دامن کشی نہ بزدلی ہے نہ بے ایمانی بلکہ ایک صبر طلب تعمیری کام کے تقریباً منطقی تقاضوں میں سے ہے۔ سیاست، خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے، آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اتر جاتا ہے۔ تعلیمی کام ایک دھیرے دھیرے بہنے والا میدانی دریا ہے، جو برسات ہی میں نہیں بہتا گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو گھلا کر اپنی روانی کا سامان کرتا ہے۔ سیاست سخت کام وجود قومی کی تمنا ہے، فطرتاً بیتاب ہے۔ تعلیم اقدار مطلقہ کی عاشق ہے، لازماً صبر طلب۔ تعلیم ان اعلیٰ اقدار کو تازہ اور شاداب رکھتی اور پیدا کرتی ہے۔ سیاست ان کی تنظیم کرتی ہے اور حفاظت، اس لئے وہ مخدوم ہے اور یہ خادم سیاست شدت چاہتی ہے تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے ہیں۔ تعلیم کا پہلا منصوبہ ہی اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے۔ راہرو کا رخ متعین کرتی ہے ؎

ملال عالمیان دم بہ دم دگرگون است
منم کہ مدت عمرم بیک ملال گذشت

بہرحال جامعہ نے اپنی اب تک کی زندگی میں تعلیم کو تمام غیر تعلیمی خارجی اثرات سے جو تعلیمی آزادی میں حائل ہوں محفوظ رکھنے کو اپنا اصول جانا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دور میں کہ شاید تنگدستی کی جگہ وسائل کی فراوانی کا دور ہو۔ اور رک رک کر آگے بڑھنے کی جگہ جلد جلد قدم اٹھانے کا موقع ملے، جامعہ کے کارکن اس اصول کو ہاتھ سے نہ دینگے۔

غرض قومی زندگی میں تعلیم کی مرکزی حیثیت اور اس اہم وظیفہ کو کما حقہ ادا کرنے کے لئے آزادی کی ضرورت ہم پر آغاز کار ہی میں روشن ہوگئی تھی۔ اس وظیفہ کو ادا کرنے اور اس آزادی کو خالی منفی آزادی نہیں بلکہ عمل کی مثبت آزادی میں منتقل کرنے کا کام بڑا دشوار تھا۔ اس دشواری میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ جب بعض مجبوریوں کے باعث خواجہ صاحب شیخ الجامعہ کے عہدہ سے سبکدوش ہوگئے اور پھر کچھ عرصہ بعد حکیم اجمل خاں صاحب کا سایہ ہمارے سر سے ہٹ گیا۔ اس جگہ جامعہ کی زندگی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر مناسب ہوگا۔ اس سے جامعہ کے کام کی روح اور اس کے اصول کار پر روشنی پڑتی ہے۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری ہمارے امیر مقرر ہوئے۔ ان کی محبت اور شفقت، انکی فراخدلی اور انسانی ہمدردی، ان کی برائی سے بیزاری اور نیکی کی ہر رنگ اعانت کا جذبہ ہم کارکنوں کی تربیت میں اپنا اثر چھوڑ گیا ہے اور ہم شکر گذاری کے ساتھ ہمیشہ اسے یاد رکھیں گے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے امارت جامعہ کا کام جب سنبھالا تو ہماری مالی حالت بہت سقیم تھی۔ شروع شروع میں جامعہ کے تمام مصارف کا بار جمعیتہ خلافت اُٹھاتی تھی لیکن سیاسی دریا کے اتار نے اس صورت کو ممکن نہ رکھا۔ حکیم صاحب تنہا اپنی ذاتی کوشش سے جامعہ کے کام کے لئے وسائل فراہم کرتے تھے۔ آخری زمانہ میں مسلسل علالت اور غیر معمولی مصروفیت کے باعث ماہ بماہ فراہمی زر کے کام میں خلل پڑتا رہا، اور جب حکیم صاحب سدھارے تو جامعہ پر خاصا قرض تھا۔ ہم کارکنوں کو حتیٰ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم تک کو یہ علم نہ تھا کہ حکیم صاحب کہاں سے ہمارے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ جب وہ رخصت ہوگئے تو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں نے خود ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورے سے ان کی خدمت میں ایک مراسلہ بھیجا کہ جامعہ کے کام کو جاری رکھنے کا فیصلہ ہو تو فراہمی زر کی طرف امنائے جامعہ توجہ فرمائیں یا اسکے بند کرنے کا فیصلہ کریں۔ نیز مجھے اس فیصلے کے اعلان سے کچھ پہلے آگاہ فرمادیں تاکہ اگر اپنے ساتھ کام کرنے والوں کی مدد سے میں اس ادارے کا کوئی چھوٹا سا حصہ بھی قائم رکھ سکوں تو اس کی کوشش کروں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا یہ مراسلہ امناء کی خدمت میں بھیجا اور انھیں فیصلے کی فوری ضرورت کی طرف متوجہ فرمایا۔ زمانہ بہت برا تھا، سیاسی ردِ عمل نے ساری امنگیں دبادی تھیں، ایک عام انتشاری حالت تھی۔ تعلیم کے ایک ایسے کام کے لئے جسے حکومت تک بھی تسلیم نہ کرتی ہو، جو اپنی بے سروسامانی کے باعث خود بھی ظاہر بیں نظروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکے، کون روپیہ بربادکرتا نظر آتا۔ چنانچہ ہمارے امناء کی بہت بڑی اکثریت نے بلکہ پانچ چھ کو چھوڑ کر سب نے جواب دیا کہ جامعہ کو بند کر دینا چاہیئے۔ روپیہ فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ اور بہت سوں نے کہ شخصی طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کے ہمدرد اور خیر خواہ تھے یہ مشورہ دیا کہ اس کے کسی حصہ کو زندہ رکھنے کا سوال قابل تعریف تو ہے لیکن قابل عمل نہیں۔ اس خیال کو چھوڑ دو اور کوئی مفید کام کرو۔ اس فیصلے اور اس مشورے میں تجربہ، زمانہ شناسی، مصلحت اور احتیاط کتنی بھی ہو یقین اور جرات کی کمی ضرور تھی۔ لیکن یہ چیزیں الحمدللہ کہ قوم کے نوجوانوں میں موجود تھیں۔ میں نے اس خط کے ساتھ جسکا ذکر کیا، ایک خط اپنے ساتھیوں کو بھی لکھا تھا جو جامعہ میں کام کرتے تھے۔ انھیں بتایا تھا کہ غالباً امناء کا فیصلہ یہی ہوگا کہ جامعہ کو بند کردو، کیا آپ ہم مل کر اس کے کسی حصے کو بچائیں؟ روپیہ نہیں ہے۔ قرض ہے، جلد روپیہ ملنے کی بظاہر کوئی توقع نہیں ہے، مکان کرائے کے ہیں، بچوں کو بلا کر کم سے کم سال تعلیمی کے ختم سے پہلے واپس کرنا بہت برا ہوگا، کہئیے کیا رائے ہے؟ ان کا جواب آیا ـــــ سب کا بلا استثنا سب کا۔ کہ کام کو جاری رکھنا چاہتے ہیں، روپیہ نہ ہوگا، بلا معاوضہ کام کرینگے، ایک دوسرے کو سہارا دیں گے، لیکن ایک بار کوشش کرکے ضرور دیکھیں گے۔ اس باہمت جواب کے بعد بے یقینی کا جو درجہ کام کو بند کرنے کے لئے ضروری تھا وہ میں نے اپنے اندر نہیں پایا۔ لہذا کام جاری رہا۔ ان ساتھیوں کی ہمت کا امتحان خوب ہوا مہینوں کسی کو ایک پیسہ معاوضہ کا نہ دیا جاسکا، لیکن ہم نے جامعہ کے انتظام میں

ایک بنیادی تبدیلی کرلی، سب وہ جن کا تعلق رسمی تھا اس سے الگ ہوگئے۔ سب وہ جن کے دل کو لگی تھی اس کام کے ذمہ دار بن گئے۔ ایک انجمن، انجمن تعلیم ملی کے نام سے قائم کی گئی جس میں چند بنیادی اعضاء کے علاوہ جو ہمارے شریک رہنے پر آمادہ تھے گیارہ ساتھیوں نے حیاتی رکن بننا قبول کیا اس شرط پر کہ وہ ۲۰ سال تک یا تاحیات اگر زندگی ۲۰ سال سے پہلے ختم ہو جائے جامعہ کی خدمت کرینگے اور اپنی خدمت کا صلہ کبھی ۱۵۰ روپے ماہوار سے زائد طلب نہ کرینگے۔ حالات لے آج تک کسی حیاتی رکن کو یہ معاوضہ بھی نہیں لینے دیا ہے۔ اب اس انجمن میں ۲۴ ارکین ہیں اور ہمارے دوسرے ساتھی جو ابھی رکن نہیں ہیں وہ بھی ارکین ہی کی پابندیوں کے ساتھ جامعہ کے کام کو ایک اچھا عبادت کا کام سمجھ کر انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے محترم مولانا ابوالکلام آزاد نے ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہمراہ مدراس کا دورہ فرمایا اور ان کے اثر اور سیٹھ جمال محمد کی فیاضی سے وہ سخت وقت گذر گیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس انجمن کا قیام ہماری تعلیمی تاریخ میں ایک قابل توجہ واقعہ ہے۔ اس نے اس زرپرستی کے زمانے میں تعلیمی، تہذیبی، دینی کام کو نیک کام کی حیثیت سے کرنے کی طرح ڈالی ہے اور اسے ایسا کام بنانا چاہا ہے جسکا اصلی انعام خود کام میں ہوتا ہے۔ ہمارے ماضی کی ساری شاندار روایات اسی طرز عمل کی رہین منت ہیں، ہمارے مستقبل کے لئے اس نئے طرز خدمت کا رواج ایک فال نیک ہے۔

دوسرے اس انجمن کے قیام سے غیر سرکاری تعلیمی کام کے لئے ایک نئی راہ نکلی ہے۔ تعلیمی آزادی کا وہ خیال جو پہلے دن سے جامعہ کی جان ہے اس انجمن کے قیام سے اور واضح ہو گیا ہے یعنی یہی نہیں کہ وہ تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہو، سیاسی جماعتوں کے اثر سے آزاد ہو بلکہ ناواقف شخصیتوں اور غیر تعلیمی رجحانات رکھنے والی ٹولیوں کے اثر سے بھی پاک ہو۔ غیر سرکاری مدارس کی انتظامی جماعتوں اور اس کے ملازموں یعنی واقعی تعلیمی کام کرنے والوں کی روز کی کشاکش، وکیلوں اور تاجروں اور عہدہ داروں کے اعمل، بے جوڑ منتظموں کو جو استادوں کو خریدتے ہیں اور زرخرید چیز کی طرح برتتے ہیں اور ان استادوں کو جو اپنے کو جنس بازاری کی طرح بیچتے ہیں، تعلیم گاہوں میں یکجا کر کے صحیح تہذیبی تعلیمی مرکز کیسے بن سکتے ہیں۔ تعلیم کا کام صرف انھیں کرنا چاہیئے جو اسے اپنا حقیقی کام سمجھتے ہوں، جو اسکے بغیر بے چین رہیں، جو اس کی انجام دہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھیں اور جو اسکام کی اہمیت اور اپنی اس کے ساتھ وابستگی کے باعث خود اپنا احترام کرتے ہوں، اور آزاد ہوں کہ اپنے کام کو اپنی بصیرت کے مطابق بہترین طریق پر انجام دیں۔ میرا خیال ہے کہ انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ مسلمانوں میں اس قسم کی پہلی انجمن ہے، اور میری دعا ہے کہ ایسی متعدد انجمنیں جلد وجود میں آئیں اور ہماری تعلیم کا کام کرائے کے کام کی جگہ عبادت کی ایک شکل بن جائے۔

آزادی اور خودمختاری کی یہ تدریجی نشوونما بے حقیقت ہوتی اگر مالی وسائل کی فراہمی میں جامعہ اس کے مناسب حال طریقہ نہ اختیار کرتی۔

چنانچہ جامعہ نے یہ کیا۔ ہماری جدید تعلیم گاہیں عموماً سرکاری گرانٹ اور امراء کی امداد سے چلتی ہیں اور اس طرح کہ ان کا وجود انھیں پر منحصر ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی تعلیمی جماعت اپنے کام کے شرف کا احساس رکھکر آزادی کی خواہش بھی رکھتی ہو تو وہ آزادی خالی دکھاوے کی آزادی ہو سکتی ہے۔ جامعہ کا کام جب سے اس کے واقعی کام کرنے والوں نے، انجمن جامعہ ملیہ کی شکل میں اپنے ہاتھ میں لیا تو انھوں نے مالی وسائل کی فراہمی کا بھی ایک نیا ڈھنگ ڈالا سرکاری امداد کا تو سوال ہی نہ تھا، متمول طبقہ کی مدد کمیاب تھی، اہل ثروت سرکار کی بے اعتنائی، بلکہ مخالفت کی صورت میں ایک تعلیم گاہ کو جس کے کام نے بھی ابھی اپنی ساکھ پیدا نہیں کی تھی کیسے اپناتے؟ اور ہم کہ اپنی آزادی کی قدر شروع سے کرنا چاہ رہے تھے اپنے وجود اور اپنے طرز کار کو کیسے اس قسم کی مدد پر منحصر کرنے پر راضی ہو جاتے۔ ہم نے چند خواص کی جگہ جمہور ملت کو اپنا مددگار بنانا چاہا۔ اور ۱۹۳۲ء میں ہمدردانِ جامعہ کے نام سے ایک حلقے کی تنظیم شروع کی، جس میں ہوتے ہوتے دس ہزار ہمدرد ہو گئے ہیں، جو ہمیں ماہانہ یا سالانہ چھوٹی چھوٹی رقمیں مرحمت فرماتے ہیں، لیکن ایک بار نہیں بلکہ برابر مرحمت فرماتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے کام سے ناخوش ہوتے ہیں تو اپنی مدد بند کر دیتے ہیں، خوش ہوتے ہیں تو اور دوستوں کو بھی اس حلقہ میں شامل کرتے ہیں، ہمارا تعلق دو چار صاحبانِ ثروت سے نہیں، بلکہ ہزاروں ہمدردوں سے بندھا رہتا ہے اور ہمیں یہ ڈر نہیں ہوتا کہ کسی ایک آدمی کے ناخوش ہونے سے ہمارا کام رک جائیگا بلکہ ہماری مدد صرف اسوقت بند ہو گی جب ہم اتنے برے ہوں کہ جمہور امت ہم سے متفقہ طور پر ناخوش ہو جائیں، اسوقت بے شک یہ مدد بند ہو بھی جانی چاہیئے اور ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم کیوں اپنے ہمدردوں کی ہمدردی قائم نہ رکھ سکے۔

۱۹۳۲ء میں اس حلقے سے پانچ ہزار روپے جمع ہوئے تھے، ۱۹۳۷ء میں اس نے ۲۴ ہزار فراہم کئے۔ ۱۹۴۲ء میں ۳۲ ہزار، ۱۹۴۴-۴۵ء میں ۴۱ ہزار اور ۱۹۴۵-۴۶ء میں جوبلی کے خاص چندے کے علاوہ جو اسی حلقے کی معرفت جمع کیا گیا ہے، اور جس میں اس نے دو لاکھ ۳۸ ہزار روپیہ فراہم کیا ہے، اپنے معمول کے طور پر ۴۸ ہزار روپے جمع کئے، اس عمومی امداد سے ہمیں پتہ چلتا رہتا ہے کہ ہماری قوم ہمارے کام کے متعلق کیا سمجھتی ہے؟ پچھلے تیرہ سال کا اندازہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس حلقے نے ۵ ہزار سے بڑھا کر ہماری گرانٹ ۴۸ ہزار کر دی ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ زمانہ کیسے ہیجان کا زمانہ رہا ہے۔ اس میں لوگ ہم سے ناخوش بھی ہوئے ہیں، ہم پر نکتہ چینی بھی ہوتی ہے، ہم نے صحیح تنقید سے سبق لیا ہے، غلط کو صبر سے سنا اور سہا ہے، اور قوم نے ہمیں اس سال میں ۴۸ ہزار روپے چھوٹے چھوٹے چندوں کی شکل میں عطا فرمائے ہیں۔

پھر قوم کے عوام کے ساتھ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمیں اہل ثروت کا اعتماد بھی حاصل ہوا۔ اعلیحضرت حضور نظام نے، اعلیحضرت فرمانروائے بھوپال نے، اعلیحضرت نواب صاحب رامپور نے، ریاست کشمیر نے، پھر دہلی میونسپلٹی نے، ہمارے

کام کے لئے مستقل امدادیں عطا فرمائیں، اور وہ کام جو رک رک کر ہوتا، اگر ہوتا، ذرا آسانی سے انجام پاسکا۔

قوم کی مدد سے، اس کے متوسطین اور امرا، دونوں کی مدد سے یہ کام رفتہ رفتہ بڑھا۔ جامعہ کے پاس جس نے پچیس سال پہلے بغیر ایک چپہ زمین کے، اور بغیر عمارت کی ایک اینٹ کے، اور بغیر سرمایہ کے ایک پیسے کے، کام شروع کیا تھا۔ آج اوسط قیمتوں کے لحاظ سے ۱۵ لاکھ سے اوپر کا اثاثہ ہے۔ موجودہ قیمتوں میں تقریباً ۳۰-۳۵ لاکھ کا، اس کے کام کو تعلیمی حلقوں میں، اس ملک میں اور اس ملک کے باہر بھی کچھ نہ کچھ پسند کیا گیا ہے۔ اس کی مثال نے اور اس کے کام کرنے والوں کے اثر نے قوم میں تعلیمی کام کے اصولوں کو کم سے کم فکری طور پر ضرور متاثر کیا ہے اس کی مقبولیت بڑھی ہے۔ اس سال اس کے مدرسہ ابتدائی میں ایک ہزار سے اوپر داخلے کی درخواستوں میں سے صرف چالیس بچوں کی درخواستیں منظور کی جاسکی ہیں۔

جو ہم پر شبہ کرتے تھے، اور ہمارے تعلیمی کام کو اور کاموں کے لئے بس ایک آڑ سمجھتے تھے وہ بھی مطمئن ہوگئے۔ حکومت ہند نے دو سال ہوئے ایک بڑی مستند کمیٹی سے ہمارا کام دکھوایا اور اس کمیٹی نے ہمارے تمام امتحانوں کے سرکاری طور پر تسلیم کئے جانے کی سفارش کی، چنانچہ ہمارا جامعہ جونیئر کا امتحان سرکاری طور پر مسلمہ میٹرک یا اسکول فائنل کے مساوی تسلیم کرلیا گیا۔ اور ہمارے استادوں کے مدرسے کے صداقت نامہ کو بنیادی مدرسوں کی معلمی کے لئے مستند مانا گیا۔ حکومت ہند نے اپنے ساٹھ منتخبہ اساتذہ کو ہمارے استادوں کے مدرسے میں تربیت کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

آج جامعہ ایک چھوٹا سا اقامتی کالج چلا رہی ہے، جس کے متعدد فارغ جامعہ کے کام میں اپنی ساری قوتیں وقف کررہے ہیں، اور ملک کے مختلف گوشوں میں علمی، تعلیمی، صحافتی، تجارتی، سیاسی کاموں میں نیک نامی کے ساتھ مصروف ہیں۔ اس نے ایک چھوٹا سا کوئی پچیس ہزار مجلدات پر مشتمل کتب خانہ جمع کرلیا ہے۔ ایک اقامتی مدرسہ ثانوی، ایک اقامتی مدرسہ ابتدائی چلا رہی ہے، جن میں جدید طریق ہائے تعلیم پر تجربے کئے جارہے ہیں اور انھیں اپنی قومی ضرورتوں کے لئے مفید بنانے کی کوشش جاری ہے۔ ایک ادارہ تعلیمی مرکز کے نام سے شہر دہلی میں چل رہا ہے۔ جو ایک مڈل اسکول، ایک عمومی دارالمطالعہ، عام اجتماعیات کے لئے ایک ہال، پڑوس کے شہریوں کے لئے ایک کلب پر مشتمل ہے، اور اپنا کام بڑی خوبی سے انجام دے رہا ہے تعلیم بالغان کے طریقوں پر تجربہ حاصل کرنے کے لئے ادارہ تعلیم و ترقی کے زیر اہتمام ایک تجربی مرکز قائم ہے، اور دوسرے کام کرنے والوں کے لئے طریقہ کار سے متعلق لٹریچر شائع کرنے کے علاوہ اس نے بالغ مبتدیوں کے لئے ڈیڑھ سو سے اوپر رسالے شائع کئے ہیں۔ ایک استادوں کا مدرسہ ہے جس میں بنیادی مدرسوں کے استادوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہے، اردو میں اشاعت کا کام وسیع پیمانہ پر مکتبہ جامعہ انجام دے رہا ہے اور آج اردو کے خادموں کی صف اول میں اپنے لئے ایک اچھی جگہ پیدا کرچکا ہے۔ ایک چھوٹا سا شعبہ مصنوعات جامعہ کے مدرسہ ثانوی کے معمل سائنس سے متعلق ہے، اور روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں تیار کراتا ہے۔ ان مختلف اداروں کے کام کا کچھ اندازہ آپ کو جوبلی کی نمائش کے ملاحظہ سے ہوسکیگا۔

غرض خاصا پھیلا ہوا کام ہے اور اس پر ہم خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں، لیکن سب چھوٹا چھوٹا کام ہے۔ ابتدائی حالت میں ہے، ہر پہلو سے اصلاح و ترقی کا پیاسا ہے۔ اور بلا کسی بے جا انکسار کے نہایت خلوص کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کاموں کی تفصیل بیان کرنے میں فخر کا شائبہ بھی نہیں کہ شرم سے آنکھیں اٹھانے کا یارا بھی نہیں پچیس سال کی قومی سعی اور اتنا حقیر سا نتیجہ، پچیس سال کی کوہ کنی اور یہ جوئے کم آب۔ جانتا ہوں کہ تعلیمی، تربیتی، کام میں ہتیلی پر سرسوں نہیں جمتی، جانتا ہوں کہ یہ کام آگ نہیں کہ پل مارنے میں پھیل جائے اور سارے ماحول کو خاکستر بنادے۔ چمن بندی ہے، مادی وسائل کی لہروں سے مدت تک اسے سینچنا ہوتا ہے۔ دہقان کو اپنی پیشانی کا پسینہ ایک بار نہیں روز اس میں ملانا ہوتا ہے، اور یہاں خون جگر کی کچھ چھینٹیں بھی دینی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر یہ آرزو بے چین کرے کہ وسائل کی نہر کچھ کشادہ ہوتی، پسینہ بہانے کی آمادگی بھی ذرا زیادہ لوگوں میں پائی جاتی اور خون جگر کا بھی کال نہ ہوتا تو کیا یہ بے صبری اور ناشکری ہے؟ اگر یہ تمنا ستاتی ہے کہ قومی سعی کے تعمیری نتائج قومی شان کے شایان ہوتے تو کیا یہ جلد بازی ہے؟ اگر عمر کے اس تھوڑے سے دنوں میں جو شاید ابھی حصے میں ہوں اس چھوٹے سے ادارے کو ایک ایسی تعلیمی بستی کی حیثیت دینے کا ارادہ بار بار دل میں اٹھے، جہاں لوگ سچی اسلامی زندگی دیکھ سکیں، دیکھ کر سیکھ سکیں اور برت کر اپنا سکیں، اور سنوار سکیں، جہاں ان کے بے شمار تعلیمی اور تمدنی مسئلوں پر فکر و عمل کی روشنی پڑ سکے، جس کے تجربے قوم کے ذہنی سوالوں کا جواب دے سکیں، جہاں شخصیت کی نشوونما کا سامان ہو، جہاں مل جل کر کام کرنا معمول ہو، جہاں قوم کی نئی نسل دین اور زندگی کی ہم آہنگ فضا میں پرورش پائے اور رحمۃ اللعالمین کے چمن کے نونہال بار آور اور سایہ دار درخت نہیں، یوں پھلیں پھولیں کہ ان کے فیض سے ان کا سارا ماحول مستفیض ہو وہ ہر جگہ سے حکمت کو لیں کہ ان کا کھویا ہوا مال ہے اور ہر طرف اپنی تحقیق اور اپنی اچھی زندگی کے موتی بکھیر دیں کہ یہ دولت لٹانے ہی سے بڑھتی ہے۔ اعلیحضرت، اکابر قوم اور بلند ہمت دوستو! اور عزیزو! اگر یہ ارادہ ہم ناچیز کارکنان جامعہ کے دل میں پیدا ہو تو کیا وہ ایک خواب ہوگا جس کی تعبیر نہ ہوسکے گی؟ اس سوال کا ایک جواب ہم کارکن دیں گے اور وہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو یہ ارادہ پورا ہوکر رہے گا۔ لیکن اس کا ایک جواب آپ سب کے ذمہ بھی ہے۔

جیسا کہ آپ صاحبان اعلیحضرت کی زبان مبارک سے ابھی سن چکے ہیں،

اس منصوبہ کو ایک قدم اور آگے بڑھانے کے لئے ہم نے اگلے چند سال میں بعض کام شروع کرنے کا قصد تو کر ہی لیا ہے - طالب علموں اور استادوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ہوسٹل اور مکان فوراً بنوانے ہیں، چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک اچھا کنڈر گارٹن بنانا ہے، ثانوی تعلیم میں ضروری تنوع پیدا کرنے کے لئے ایک صنعتی اور تجارتی مدرسہ قائم کرنا ہے، لڑکیوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے اقامتی درسگاہ قائم کرنی ہے، علمی تحقیق کے ادارے قائم کرنے ہیں جن میں سب سے پہلے اسلامی علوم کے تحقیقاتی ادارہ بیت الحکمتہ کو صحیح اور مضبوط بنیادوں میں قائم کرنا ہے۔ اپنے مرحوم امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی یادگار کے طور پر ایک شفاخانہ بنانا ہے، کتب خانہ کے لئے عمارت بنانی ہے اور اس میں خصوصاً اسلام اور ہندوستان سے متعلق کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ فراہم کرنا ہے اور اس نو آبادی کے مرکز میں اس کے قلب کی حیثیت سے ایک مسجد تعمیر کرانی ہے - ان کاموں کے لئے میں نے اپنی ناتجربہ کاری میں دس لاکھ کا اندازہ کیا تھا، اس امید پر کہ جنگ کے بعد قیمتیں کچھ تو اپنی سابقہ حالت کے قریب آئیں گی۔ لیکن یہ خیال غلط نکلا اور اب اس کام کے لئے تقریباً ۳۰ لاکھ کا اندازہ کیا جا رہا ہے - ہم نے قوم سے جوبلی کے موقع پر دس لاکھ روپیہ مانگا۔ دس لاکھ سے زیادہ تقریباً بارہ لاکھ روپیہ فراہم کرنے کا انتظام قوم نے کر دیا ہے - لیکن اب ان اٹھارہ لاکھ کا انتظام بھی تو اسی کو کرنا ہوگا - میں جانتا ہوں کہ یہ انتظام بھی ہو ہی جائے گا - لیکن جلد ہو یا دیر میں، ہم نے کام شروع کرتے وقت کب پہلے روپیہ جمع ہونے کا انتظار کیا تھا کہ اب اس کے منتظر رہیں گے - یہ کام خدا نے چاہا تو ہو گا ہی، اگر یہ اچھا کام ہے تو خدا آپ سب کو اس کی تکمیل کی سعادت میں شرکت کی توفیق عطا فرمائے -

میں نے جامعہ کی پچھلی روئداد اور اس کے اگلے منصوبوں کا ایک مختصر سا ذرا منتشر سا خاکہ پیش کر دیا ہے - اپنے سچے جذبات تشکر کا اظہار باقی ہے - سب سے پہلے اعلیٰحضرت کا، اس عزت افزائی اور ہمت افزائی پر شکریہ جو حضور نے یہاں تشریف فرما ہو کر، اور اس جلسہ کی صدارت فرما کر ہم کارکنان جامعہ کی کی ہے - حضور یہ عزت افزائی اس لئے بھی ہے کہ خدا نے آپ کو اپنی زمین کے ایک حصہ اور اپنی مخلوق کی ایک معتد بہ آبادی کی پاسبانی سپرد فرمائی ہے - آپ کو دولت واقتدار عطا فرمایا ہے - آپ نے، کہ بادشاہوں کی محفل کے لئے زینت ہیں، ہم فقیروں کی مجلس میں تشریف لانا قبول فرمایا لیکن اعلیٰحضرت سے زیادہ کس پر روشن ہوگا، اس لئے کہ آپ دونوں کے محرم ہیں، کہ اچھی دنیا میں مادی اقتدار کو ذہنی اقتدار کے سامنے، اور دولت کو فقر کے سامنے جھکنا چاہیئے - مادی اقتدار اور دولت کے لئے یہ بڑی سعادت ہے کہ ذہنی اقتدار اور فقر اسے اپنی خدمت میں قبول فرمالیں - حضور کی تشریف آوری سے ہماری حقیقی عزت افزائی اور ہمت افزائی، آپ کے دولت واقتدار ہی کے باعث نہیں ہے بلکہ اس فقر کی وجہ سے ہے جس کا اس لباس خسروی میں نباہ لے جانا ظاہری فقیروں کے فقر سے کہیں مشکل تر اور اسلئے بہت زیادہ واجب الاحترام ہے - ہم فقیروں کی عزت افزائی اس درویش خسروی، اس شاہ فقر شعار اس امانت دار دولت واقتدار کی تشریف آوری سے ہے، جس کے لئے سروری خدمت گری ہے، اور بادشاہت ابدیت کی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ انجام دینے کا موقع - اعلیٰحضرت ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں -

پھر قائد اعظم محمد علی جناح اور حضرت محترم مولانا ابوالکلام آزاد کا دل سے شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس جشن میں شرکت فرما کر ہمیں مفتخر فرمایا - آپ کی قوم کے چند بوڑھوں اور نوجوانوں نے خاموش تعلیمی کام کا ایک نمونہ اس جامعہ میں پیش کرنا چاہا ہے - آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ قومی وجود اور قومی تہذیب کا تحفظ صرف بگڑنے سے بچا کر نہیں ہو سکتا بلکہ اسے بناتے رہنے کا طالب ہوتا ہے - آزادی ہو، نمو پذیر حیات تمدنی، یا اقتدار عالی مطلقہ، یہ بس ایک بار حاصل کرنے اور رسونپ کر رکھ دینے کی چیزیں نہیں ہیں - یہ انہیں کو ملتی ہیں، اور انہیں کے پاس رہ سکتی ہیں جو ہر دم اتلے از سر نو حصول اور ہر دم از سر نو تخلیق کی دشواریاں انگیز نے پر آمادہ ہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن ہم ہندوستانی مسلمانوں میں اسی تخلیقی عمل کے نمائندے بننا چاہتے ہیں، ہمیں امید ہے کہ آپ ہمارے کام کو پسند فرمائینگے - آپ کی پسند ہماری محنتوں کا بڑا انعام ہوگی - پھر پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر وزرائے حکومت ہند کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے ہماری اس تقریب میں شرکت کے لئے وقت نکالا - آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں - لاکھوں نہیں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں آپ کے لئے جگہ ہے - آپ کی یہاں کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں - آج ملک میں باہمی منافرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، اس میں ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے - یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے، اس میں نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوار سکیں گے؟ بربریت کے دور دورہ میں تہذیب کو کیسے بچا سکیں گے؟ اس کے نئے خدمت گذار کیسے پیدا کر سکیں گے؟ جانوروں کی دنیا میں انسانیت کو کیسے سنبھال سکیں گے؟ یہ لفظ کچھ شاید سخت معلوم ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی بہت نرم ہوتے - ہم جو اپنے کام کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گذرتی ہے

جب ہم سنتے ہیں کہ مصیبت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ شاعر ہندی نے کہا تھا، کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ یہ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو گیا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے؟ خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور اس آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں ہے کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی۔ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھائیے، یہ مسئلہ اس قوم اور اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ درندگی میں انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے اس ملک میں مہذب زندگی کی بنیادوں کو یوں کھودنے نہ دیجئے۔

پھر ان سب بزرگوں اور دوستوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہمارے جشن میں شرکت فرما کر اس کی رونق بڑھائی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمارا دل بڑھایا۔ اس بدامنی کے زمانے میں سفر کی صعوبتیں برداشت فرمائیں، ہم شرمندہ ہیں کہ ان کے آرام و آسائش کا پورا انتظام نہ کر سکے، لیکن ہمیں امید ہے کہ وہ ہماری ان فروگذاشتوں کو معاف فرما دیں گے۔ ان کارکنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں، خصوصاً عہدہ داران ریاست رام پور کا جن کی مدد کے بغیر ہم اپنے مہمانوں کو آدھا آرام بھی نہ پہنچا سکتے۔ ان دوستوں نے ہمارے ساتھ اس طرح کام کیا کہ گویا ان کا ہی کام تھا، اور سچ یہ ہے کہ ان کا کام اسی قدر تھا جتنا کہ ہمارا، ہم ان کی اس عنایت کو کبھی نہ بھولیں گے۔

اعلیٰحضرت، میں چند لمحوں کیلئے اپنے کو جامعہ کے کارکنوں کی صف سے الگ کر کے اپنی قوم کی طرف سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جامعہ کے اساتذہ اور کارکنوں کا حضور والا نے اپنے ارشادات صدارت میں مجھ ناچیز کے متعلق جو فرمایا ہے اس کا شکریہ کیسے ادا کروں کاش میں ان کا مستحق ہوتا۔ حضور جامعہ میں اگر کوئی تعریف کا مستحق ہے تو وہ میں بالکل نہیں ہوں، میرے وہ ساتھی ہیں جو اپنا نام کسی کو نہیں بتاتے اور دن رات اس ادارہ کی خدمت میں اپنی جان کھپاتے ہیں، میں شہادت دیتا ہوں کہ ان جیسے کارکن مشکل سے کسی اور ادارے کو نصیب ہوں گے۔ انہوں نے اس ۲۵ سال میں بہت کچھ سختیاں اٹھائیں ہیں، اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ یہ قوم کے بچوں کیلئے اپنی جانیں کھپاتے رہے ہیں اور خود انکے بچے اچھی غذا اور اچھے لباس کیلئے ترسے ہیں، یہ قوم کی ذہنی زندگی کیلئے اپنا سب کچھ تج چکے ہیں اور خود ان کی ذہنی غذا کی فراہمی کا ٹھیک انتظام نہیں ہو سکتا، یہ کتابوں کو ترستے ہیں، تحقیقی رسائل کو ترستے ہیں، انہیں مہینوں ان کے حقیر معاوضے نہیں ملتے اور پھر کہیں سے روپیہ آجاتا ہے تو یہ پہلے جامعہ کیلئے زمین خرید وا دیتے ہیں، اور اپنے مطالبے کو مؤخر کر دیتے ہیں یہ ہماری قوم کے مستقبل کیلئے ایک فال نیک ہیں، انہوں نے بہت تکلیفیں اٹھا کر قومی ترقی کے راستے کو صاف کر دیا ہے،

آغشتہ ایم بر سر خارے بخون دل ۔۔۔ قانون باغبانی صحرا نوشتہ ایم

میں قوم کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دو غزلیں

نقش مٹتی ہوئی کرنوں کا ابھارا کس نے؟
بامِ انجم سے کیا مجھ کو اشارا کس نے؟

جانے بھٹکے ہوئے راہی پہ کسے رحم آیا
رات کے اونگھتے سایوں میں پکارا کس نے؟

تیری بھیگی ہوئی پلکوں پہ، محبت کے سوا
ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو اتارا کس نے؟

کشتیٔ زیست کنارے سے لگی ہے شاید
عین طوفاں میں دیا ورنہ سہارا کس نے؟

کلیاں روتی ہیں کہ بھونروں نے انہیں کیوں تاکا
بھونرے حیران ہیں، کلیوں کو نکھارا کس نے؟

یہ دھنک ہے تو عناصر کے قرینوں پہ نثار
ورنہ تھاما ترے آنچل کا کنارا کس نے؟

کوندے لپکے ہیں امیدوں کی خلاؤں میں ندیم
پھر بھرا قوسِ قزح کی وسعت میں طرارا کس نے؟

مجھے اگرچہ ترے حسن میں کلام نہیں
مگر یہ خواب ہے اور خواب کو دوام نہیں

بھلا یہ کونسی منزل ہے بے نیازی کی
کہ آجکل مرے ہونٹوں پہ تیرا نام نہیں

تری خوشی ہے تو لے پوچھتا ہوں تیرا پتا
کہ اس سے اور کوئی پست تر مقام نہیں

نہ چلمنوں کی نقابیں، نہ خلوتوں کے سرور
تری بہشت سے ہم دل جلوں کو کام نہیں

چمن میں کس نے گرہ کھول دی مرے دل کی
اگر کلی کی چٹک میں ترا پیام نہیں

قدم قدم پہ نیا رنگ ہے زمانے کا
یہ گردشیں ہیں فلک کی، ترا خرام نہیں

ندیم خاک کا ذرہ ہے دو جہاں بکنار
مری نگاہ میں اب جلوہ ہائے بام نہیں

احمد ندیم قاسمی

بندی

افسانہ

سلمہ ستارے کی ٹکلی ہو یا سونے کی چمکتی ہوئی بندی یا سیندور کا ایک چھوٹا سا ٹیکہ ——— سہاگنیں بڑے پیار سے اسے اپنے ماتھے پر لگاتی ہیں۔
بندی لگانا۔ بندی دیکھ دیکھ کر خوش ہونا۔ بندی چھوٹ جانا۔ ان باتوں کے گرد ہماری صدیوں کی دیومالائیں اور رومانی ادائیں ناچتی ہیں۔ چنری، مہندی اور سرخ چوڑیوں کیساتھ بندی کو بھی بھارتی سنگار میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔

گاؤں کی اس نئی نویلی دُلھن کو دیکھئے۔ سہاگ کے گیت، ڈھولکوں کے شور میں کھوئے جا رہے ہیں سکھیوں کی چھیڑ چھاڑ ہنسنا، بلکہ قہقہے لگا دینا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کی یہ عورتیں دُکھ کا نام ہی نہیں جانتیں اور پھر ایسے میں جب ہماری گرام سندری دُلہن بنائی جا رہی ہو۔

رواج کے مطابق گاؤں کی دھوبن آئی اور دُلہن کے ماتھے پر سیندور کی ایک چھوٹی سی بندی لگا کر جانے لگی ——— منہ بولی سہیلیوں کے گیت پھر نا چنے لگے:—

دُلہن ماتھے سیندور کی بندیا لاگے ∴ دُلہن ماتھے سیندور کی بندیا لاگے
باج رہی پائل۔ جھنک رہے کنگنا ∴ ڈول رہے آنچل چمک رہے نینا
نینوں میں پھولوں کی سیجیا لاگے ∴ دُلہن ماتھے سیندور کی بندیا لاگے
چندر گگن سوہے۔ چمکے ستارا ∴ ماتھے سے پھوٹ رہا جیون اجیارا
چمکے ہے بندیا ——— بولے پائلیا ——— سوچے دُلہنیا
چندن دوارے ڈولیا لاگے
دُلہن ماتھے سیندور کی بندیا لاگے ———!!!

شام سے رات ہوئی اور سہاگ کے گیت گونجتے ہی رہے۔ سہاگ کی رات ڈھلنے لگی اور اوشا جھلملانے لگی۔ سندری آئینے میں اپنے آپ کچھ باتیں کر رہی ہے۔ شاید اس نے ابھی ابھی اپنے ماتھے پر بندی لگائی ہے!!

آج موری سونے کی بندیا چمکے ∴ آج موری سونے کی بندیا ———!
ٹھنڈی ہوائیں ہیں، اوشا سہانی ∴ سوئے رہے راجہ، جاگے مہارانی
جھوم لہرائے ——— بالی اترائے
ماتھے پہ چھوٹا سا تارا دمکے ∴ آج موری سونے کی بندیا چمکے ——!
جوہی کی ایک کلی سمٹی سمٹائی ∴ بگیا سے بھولی مالن توڑ لائی
سونروا نے ڈھال دیا بندی بنا کر ∴ ماتھے پر بندی ہے۔ کانوں میں بالی
بالی میں جوہی چمیلی گمکے ∴ آج موری سونے کی بندیا چمکے —!!

دُلہن آئینے میں بار بار اپنی سونے کی بندی دیکھ رہی ہے پیار بھرے بھاؤ ناؤں میں اتنا ڈوب جاتی ہے کہ اسے بندی ایک کومل سی جوہی کی کلی نظر آنے لگتی ہے پھر وہ اپنی بالیوں سے کھیلنے لگتی ہے۔ اتنے میں پیروں کی چاپ سنائی پڑتی ہے۔ اسکا دل ہولنے لگتا ہے سمجھتی ہے ساجن آ گئے مگر نکلتی ہے نند ——— کتنی چنچل ہے دلہن کی یہ ننھی سہیلی مگر اسوقت تو وہ اپنی بھابھی کو چھیڑنے پر تلی ہوئی ہے:۔

نند۔ بھابھی کی بندیا جگمگ جگمگ۔
دُلہن۔ جانے کاہے ہوئے جیا ڈگمگ ڈگمگ۔
نند۔ بالکا بلم دروجوا ٹھاڑے
دُلہن چنچل نندیا جھوٹ موٹ تاڑے
نند۔ سونے کی بندیا چمکی کھائے۔
دُلہن۔ چھیڑ چھیڑ کا ہے نند شرمائے
نند۔ بھابھی کی بندیا جگمگ جگمگ
دُلہن۔ جانے کاہے ہوئے جیا ڈگمگ

"بالکا بلم دروجوا ٹھاڑے ———" دلہن نے تو پہلے ہی تاڑ لیا تھا مگر نند چھیڑنے پر جو تلی تھی تو جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ چپکے سے ہنستی ہوئی بھاگ گئی ورنہ نہ جانے کتنی دیر یہ جاری، انتظار کی ماری دلہن کو پریشان ہونا پڑتا۔ اس گھبراہٹ میں شاید ماتھے کی بندی کہیں کھو گئی۔

کہاں گری رے مورے ماتھے کی بندیا

بندی گر جانے کا شگون کچھ اور ہی تھا شاید۔ کسے معلوم تھا کہ ساجن اتنی جلد پردیس چلے جائیں گے۔ ابھی کل کی تو بات ہے، یہی سونے کی بندی دیکھکر وہ پھولے نہیں سماتے تھے۔ دُلہن ہاتھوں میں، پھولوں کی تھالی لئے دیوی کے مندر کی طرف جا رہی ہے۔

مندر پہنچکر مورتی کے ماتھے پر ٹیکہ لگایا۔ پھول چڑھائے اور اب چاول چھڑک رہی ہے۔ سنئے وہ کچھ گا بھی رہی ہے ——— سہاگن کی پوجا!!

گوری میا بندیا کی رکھیو لاج ——— گوری میا
موری بندیا کی رکھیو لاج ———!!
جیون تمہرے ماتھے پہ ٹیکہ چمکے
ویسے ہی موری بھی بندیا دمکے
لائی ہوں پھولوں کا ہار
بار دیوی! آ جائے من کی بہار
چاند اور تاروں کی تھالی جو دھوئے

سلام مچھلی شہری

بندیا کی رکھیو لاج ——— گوری میتا

گوری بندیا کی رکھیو لاج ———!

گوری میتا ! پھولوں کی ڈالی چڑھوئے ———!!

سہاگن پوجا سے واپس آئی۔ رات گئے تک مسکراتے ہوئے دیئے سے باتیں کرتی رہی۔ کچھ ایسی اداس تھی کہ چنچل نند بھی اسے خوش نہ کر سکی ——— گلابی جاڑوں کی رات اور ساجن پردیس۔ سوچتے سوچتے آخر آنکھ لگ ہی گئی صبح ہوئی آئینے کے پاس گئی۔ جی دھڑ سے ہو کے رہ گیا۔ ماتھے کی بندیا سونے میں چھوٹ گئی تھی جلدی سے بستر تک گئی "ارے یہ تو یہاں چمک رہی ہے" ہولے سے اٹھایا اور ماتھے پر لگا لیا ——— پھر بھی نازک سے دل کو کیا کرے۔ دھڑکنے سے باز ہی نہیں آتا تھا۔

مل گئی رے موری ماتھے کی بندیا

بندی اسی طرح چمک رہی ہے۔ کتنا کومل ہوتا ہے سہاگنوں کا من۔ ذرا ذرا سی بات پر بدگمانی! ساجن اب آتے ہی ہوں گے اور پھر یہ بندی اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ چمکے گی ——— چاند ستاروں کو ماند کرے گی۔

(دور سے ساجن کے گانے کی آواز قریب آ کر دوگانہ سے بدل جاتی ہے)

مرد (ذرا دور سے)

میں آئے گیو ہو رانی! کھیتوا کنارے ———

مرد من میں جھنک رہی توری پائلیا
نینوں میں چمک رہی سونے کی بندیا

کا ہے کھڑی راہ تکو گھیو نگھٹ لٹکائے
میں آئے گیو ہو رانی! کھیتوا کنارے

عورت۔ (دور سے) آئے گیو بالم ہمارے
مرد۔ کوئل سمان موسے کون لپکارے
عورت:۔ آئے گیو۔ آئے گیو بالم ہمارے

پھولوں میں جان آئی
آج مورے آنگن میں ایک نئی شان آئی

دیکھو اتر آئے ہیں چاند تارے
آئے گیو! آئے گیو بالم ہمارے

مرد:۔ پریم بھکاری کھڑا ہے دوارے

پائل سے کہہ دو "چھم چھم" بولے
بندیا سے کہہ دو جگ مگ چمکے

کہہ دو سہیلی سے تم کا سنوارے
پریم بھکاری کھڑا ہے دوارے

عورت۔ سجن مورے آئے۔

غزل

عزیز متھراوی

جب بیخودی میں کچھ نہ رہی آگہی مجھے
لہجہ بدل کے عشق نے آواز دی مجھے

جب کھو کے زندگی نہ مری پا سکی مجھے
پھر ان کی جستجو بھی کہاں ڈھونڈتی مجھے

مہلت بقدرِ ذوقِ نظر کب ملی مجھے
بجلی سی ایک چیز دکھا دی گئی مجھے

ہنس ہنس کے تیرے ساتھ گزاری ہے زندگی
اے یاس! تو بھی یاد کرے گی کبھی مجھے

پہونچا ہوا ہوں سرحدِ کون و مکاں سے دور
دل کی تڑپ کہاں سے کہاں لے گئی مجھے

تیرے بغیر عشق تھا بیگانۂ طلب
محسوس ہو رہی تھی وہاں بھی کمی مجھے

پہلے تو بے سبب غمِ دنیا سے کھو دیا
اب ڈھونڈنے چلا ہے غمِ زندگی مجھے

بربادیوں میں بھی مرے دل کو سکوں رہا
یوں بھی تو کم نہیں ترے غم کی خوشی مجھے

اپنی تلاش میں بھی تری جستجو کہاں
میری نگاہ ڈھونڈ رہی ہے ابھی مجھے

بے ہوش تھا تو ان کی طرف دیکھتا رہا
جب ہوش آ گیا تو ہوئی بیخودی مجھے

اب تک میں رو رہا ہوں جو اے گردشِ فلک
آئی تھی اپنے حال پہ کس دن ہنسی مجھے

"اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی"
آئی عزیز راس مری شاعری مجھے

سونے کی بندیا ہلکی نہ پڑ جائے
آ جا گگن کے سندر تارے ——— آئے گیو! ....

مرد۔ پریم بھکاری کھڑا ہے دوارے
عورت۔ آئے گیو! آئے گیو بالم ہمارے
مرد۔ پریم بھکاری ——— !!!

کچھ غزل کے بارے میں

۲

مخمور اکبرآبادی

غزل کا ارتقا، وسیع موضوع ہے اور ایک مکمل تصنیف کا محتاج ہے۔ میری نظر میں اردو غزل چند منزلوں سے گزر چکی ہے۔ منزل سے مراد یہ ہے کہ ایک دور میں ایک موضوع کا عام رواج رہا ہے۔ استاد سے لے کر نوآموز تک، اسی پر خیال آرائی اور خامہ فرسائی کرتا رہا ہے۔ غزل کی تاریخ میں اس نوع کے بہت سے دور ہیں۔ ولی نے تصوف کی بنا ڈالی اور میر درد نے اس پر جلا کی۔ میر نے قنوطیت کی بنیاد ڈالی اور زندگی کو یاس و نومیدی کے تیر و نشتر سے فگار پایا۔ جرأت، انشا، رنگین نے جنسی محبت کی لگاوٹ، چوچلے، نکل بیٹھ سے واسطہ رکھا اور معاملہ بندی کو سراہا، نظیر نے حیات و معاشرت کے جلوے بے نقاب کئے، مومن نے جذبات کو ابھارا، غالب نے حقائق و معارف کا جائزہ لیا، داغ نے امیروں اور دولتمندوں کے لئے ذہنی عیاشی کا سامان بہم کیا، حالی نے وطنیت کا راگ گایا، اقبال نے احیائے اسلام و اسلامیان کے امکانات کی تلقین کی اور فانی نے لفظوں کی روح سے موسیقی پیدا کی۔ جوش، فراق اور دوسرے اشتراکیین، موقت زندگی، معاشرت اور سیاست کے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالتے اور بحث کرتے ہیں۔ ان دوروں کے استادوں نے اپنے اپنے رنگ اور اپنی اپنی فطنت کی قوت کے مطابق جو کچھ خلق کیا، وہ سب زندہ رہنے والا ہے۔

ردیف و قافیے کی پابندی کے ذکر سے، بہ ظاہر غزل کا رسمی پیکر مراد ہے اور اس سوال سے یہ پوچھنا مقصود ہے کہ مروجہ پیکر کی پابندی، تغزل پر کس طرح موثر ہوئی۔ غزل کا انحطاط مسلم ہے لیکن سوال کی نوعیت سے مجھے بنیادی اختلاف ہے۔ کسی صنفِ سخن کی ترقی یا تنزل کا انحصار، اس واسطے پر نہیں، جو اس کے موضوع کو اس کے پیکر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر کوئی صنفِ سخن، مائل بہ تنزل ہے تو ہرگز اس کے پیکر کا قصور نہیں۔ غزل کا تنزل بھی پیکر کا آوردہ نہیں ہے۔ انسان کا پیکر پرانا پڑتا جاتا ہے مگر فنونِ لطیفہ کا پیکر اس لعنت سے مبرا ہے۔ پیکر کی کہنگی کی شکایت فنونِ لطیفہ کی فطرت سے ناآگہی کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ یونان کی مشہور شاعرہ سیفو نے مسیح کی ولادت سے مدت قبل، (Lyrical) شاعری کی بنیاد ڈالی اور (Ode) کا پیکر اختیار کیا۔ اس کی شاعری میں جذبات کی تازگی، محسوسات کی شدت اور بیان کا وقار، سادگی، ان سارے شعری محاسن کے تمثیلی نمونے ہیں۔ سیفو کے کم و بیش دو ہزار سال بعد، شیلی اور کیٹس نے (Ode) ہی کے پیکر کی روح سے ایسے (Lyrical) نغمے، ایسا حقیقی تغزل خلق کیا جو آج تک انگریزی دانوں کے کان میں رس ٹپکا رہا ہے۔

آرٹ میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ کیا پیش کیا ہے، یہ پوچھا جاتا ہے کہ کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ لفظی تصویر، خواہ تماکہ دلہوتی کی ہو یا گل بکاؤلی کی، اگر مکمل ہے تو آرٹ کا شہپارہ ہے۔ جس نقص کو پیکر کی فرسودگی بتایا جاتا ہے وہ اصل میں نام نہاد شاعروں کی فطنت کا نقص ہے۔ ان خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہونے والوں کا قصور ہے۔ جو پیکر کے صحیح استعمال کی قوت سے محروم ہیں۔ اس بے بہرگی، اس صناعت کوری، اس سست نظمی کا قصور ہے جو ملاءِ اعلیٰ کی فضا میں اڑان نہیں بھر سکتی۔ اس ناشناسی کا قصور ہے جو صلاحیت اور غیبتِ صلاحیت میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ اس کھوکلے پن، اس رسم پرستی، اس ضد، اس غفلت، اس جلد بازی کا قصور ہے، جو تغزل کی روح سے نقاب نہیں اٹھا سکتی۔

ساتھ ہی ساتھ غزل کے موضوع کے بہت سے اجزا، مقدار میں اتنے زیادہ، نوعیت میں اتنے یکساں اور بیان میں اتنے یک لہجہ ہو گئے ہیں کہ اب طبائع پر بار ہونے لگے ہیں۔ سماج کی سست رفتاری اور طبائع کی رسم پرستی نے جدت اور تنوع کی راہیں بند کر دی ہیں۔ عورت، جنسی محبت، مفروضہ ہجر و فراق، رسمی کرب و الم کا ذکر، غزل میں اس کثرت و بہتات سے ہے کہ اجیرن ہو کر رہ گیا ہے۔ تصورات کا سرقہ اس زیادتی سے ہے کہ موجد و نقال کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ اندازِ بیان کا اعادہ اس کثرت سے کہ ابتدا کا یقین محال ہے۔ پسندیدہ الفاظ، چلتے ہوئے جملوں اور بندھی ٹکی ترکیبوں کا لوٹ پھیر عام طور پر رواج ہے اور اس کے احتساب کا سماج کی طرف سے کوئی اہتمام نہیں۔ تغزل لفظی شعبدہ بازی، رسمی جملہ طرازی اور بے دھڑک چوری کا دوسرا نام ہو گیا ہے لیکن تغزل، رسم و روایت کی خانہ پوری، بلاغت کی موشگافی یا معنی و بیان کے میدان میں تگ و دو کا نام نہیں۔ جس طرح ہماری کلاسیکل موسیقی، آواز کے حسین و نغمہ ریز زیر و بم کی بجائے، ایک قسم کا غوغا بن کر رہ گیا ہے، اسی طرح ہماری غزلیہ شاعری مقصد کو ذریعے سے مخلوط کر بیٹھی ہے۔ اس بدنظمی نے غزل کی پسندیدگی کو نفرت یا کم سے کم بے اعتنائی سے بدل دیا ہے۔ داغ، مضطر، حسرت، سرور کی زمینوں میں اس کثرت سے مشق و طبع آزمائی کی گئی ہے کہ اصل شہپاروں کی قدر و قیمت، پوشیدہ ہو کر، اور لذت و اہمیت گھٹ کر رہ گئی ہے۔ لیکن یہ انحطاط و ابتذال، پیکر کا آوردہ نہیں، پیکر کا منہ چڑانے والوں کا آوردہ ہے۔ یہ موضوع کی خامی نہیں، موضوع کی اہمیت سے بے اعتنائی اور سہل انگاری کا قصور ہے۔

غزل کے ادبی و نفسیاتی مفاد سے، بہرہ اندوز ہونے کے لئے شرح و وضاحت کے آرٹ سے واقفیت لازمی ہے۔ غزل سمجھنا، غزل کہنے سے بمراتب دشوار اور امر شناس ذہن کا کام ہے۔ فانی نے، اسی نکتے کی طرف اشارہ کیا :۔

کیوں، اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل   لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

تغزل، قلبی واردات، ذاتی تجربے، عینی مشاہدے، انفرادی فکر،

الفاظ کی موسیقی کے لوچ، بیان کے حسن و وقار اور جزئیات کی لطافت و نزاکت سے جنم لیتا ہے۔ یہ اجزا بعض وقت الگ الگ اور بعض وقت متحدہ طور پر کارفرما ہوتے ہیں۔ تغزل کے کیف و اثر کے بھی دو پہلو ہیں۔ تغزل جس کا نام ہے، کہنے والے اور سننے والے دونوں کے لطیف نفس کے مشترک واسطے کا نام ہے۔ یعنی یہ کہ غزل سے لذت اندوز ہونے کے بعد شاعر کی آپ بیتی سننے والے تک بالراست اور تمام و کمال پہنچ جانی چاہئے۔ اس لئے شاعر میں قوت اور سمجھنے والے میں صلاحیت، دونوں چیزیں درکار ہیں۔ اس لئے شرح و وضاحت کے فن کی آبیاری کی بھی ضرورت ہے۔ شعر کے مفاہیم سمجھ کر، تصور و تخیل کی مدد سے ہم شاعر کے اسی نفسیاتی ماحول میں پہنچ سکتے ہیں، جس کی گہرائی میں ڈوب کر اس نے اپنا کمال پارہ خلق کیا ہے۔ میں غالب کا ایک شعر، آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

آپ اگر اس شعر کے لفظوں کا مطلب سمجھ کر، غالب کے تفسیاتی ماحول میں در آنا چاہیں تو مشکل نہیں ہے۔ اولاً، انیسویں صدی کے ہندوستان کا مذہبی پس منظر آپ کے سامنے آئے گا۔ اس کے بعد غالب کی فکر آپ کو کشمکش میں گرفتار نظر آئے گی، اس کے بعد اس کی سلجھی ہوئی طبیعت کی فلسفیت و بلند نظری، آپ کو انگلی پکڑ کر، ایسی وسعت و بے پایانی تک پہنچا دے گی جہاں حدود و تعینات اصنام و معابد، صرف اشارے اور کنائے نظر آنے لگیں گے۔ اس کے بعد وحدت الوجود کے حامی کو اس شعر میں وحدت کا جلوہ، اور صنم پرست کو مورتی پوجن کا جواز نظر آنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح، آپ کو، اس شعر میں:-

جب وہ جمال دلفروز، صورت مہر نیم روز ۔ آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

بے نقابی، بے پردگی، اور جمال کو نظارہ سوز بنانے کی حمایت نظر آئے گی۔ یہ سارے اجزا عصر حاضر کے تمدن کے ہم رنگ اور ضمیر کے ہم آہنگ ہیں۔ غالب کو آپ مستقبل طراز نہ مانیں، پھر بھی اس شعر میں، انفرادی تجربے اور شخصی مشاہدے کے اجزا موجود ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ غزل میں، بیکی شارپ، میدام بووری یا اینا کرنینان جیسے شوخ و شنگ، ذی ہوش، جلوہ فروش اور حیات نما، (Life-like) کردار سامنے آتے ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ ان میں فاؤسٹ، یا ہملٹ کی سی تحلیل نفس یا جزئیات نگاری ملتی ہے، میں نہیں کہتا کہ ان میں حیات کے پیچیدہ مسائل پر اسی تفصیل سے روشنی ڈالی جاتی ہے، جس طرح، لیڈی چیٹرلیز لور میں لورنس یا یولیسیس میں جوئس نے ڈالی ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ غزل کے اشعار میں وسیع پیمانے پر حیات کے مسائل کا حل نظر آتا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ حیات پیکر مرقع کے مقابل، ننھے منے مرقعے (Miniature) کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ آرٹ کا نقاد، دونوں کو حرز جان اور سعادت ایمان سمجھتا ہے۔ شاہجہاں اگر تخت طاؤس پر مباہات کر سکتا تھا تو میں بھی اپنی انگوٹھی کے پکھراج پر ناز کر سکتا ہوں، بشرطیکہ میرا پکھراج الماس تراش ہو، اور اس کی پہل سازی میں بھی آرٹ نے اپنی نازک خیالی اور ژرف نگاہی صرف کی ہو۔ داغ کا یہ مطلع:-

دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں، دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں ۔ مجھ کو خدا جو صبر دے، تجھ سا حسین بنائے کیوں

وہ جذباتی (Miniature) ہے جو، سینکڑوں حیات پیکر مجسموں، ہزاروں حیات پیکر مرقعوں پر بھاری ہے۔

بیکی شارپ، میدم بووری، اینا کرنینان، ہم نئے پڑھنے والوں کے لئے نئی ہوں مگر دنیا کے لئے نئی نہیں ہیں۔ ان کا وجود کسی نہ کسی عنوان سے ہر سماج میں پایا گیا ہے اور پایا جائے گا۔ یہ کردار، ہندوستان کے سماج میں آج بھی موجود ہیں۔ ان سے غزل کے (Miniature) کے لئے بہت سا مواد حاصل ہو سکتا ہے۔ ہمارے انیسویں صدی کے استاد، ان کو ٹھیکرے، فلوبیر اور ٹالسٹائے کی نگاہ سے نہ دیکھ سکے۔ ان کے پاس ہمارا سا شعور، ہمارا سا نقطۂ نگاہ، ہمارا سا ماحول نہ تھا۔ وہ دوسرے تماشوں، دوسرے مناظر کے گرویدہ تھے۔ لیکن ہمارا عہد حاضر کا نوجوان شاعر، اتنا کامل، اتنا ذہن آوارہ، اتنا بے جان کیوں ہے کہ بیکی شارپ، میدم بووری اور اینا کرنینان سے ملاقات کی ہمت و جرأت نہیں رکھتا۔

میں یہاں پھر، یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ غزل کا موضوع راز بہ گفتن بہ معشوق ہے اور عہد حاضر کا غزل گو، پہلے غزل گویوں کے مقابلے میں، اپنی محبوبہ سے بیش از بیش مسائل پر گفتگو کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عہد، دنیا کے ذراتی عہد کی ابتدا ہے اور اس میں حیات کے لاتعداد مسائل پیش نظر ہیں۔ چنانچہ فرسودہ مباحث کی جگہ، فکر بیدار اور تصور خلق کرنے والے موضوعات پر جی کھول کر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ہاتھوں میں مہندی لگانے اور ہونٹوں پر لاکھا جمانے والی محبوبہ، بات کا جواب دیتے بیحد شرماتی تھی، لیکن عہد حاضر کی جان لیوا محبوبہ ترکی بہ ترکی جواب دینے کو تیار ہے۔ اس طرح غزل کے عاشقانہ رخ کے ساتھ معشوقانہ پہلو میں بھی جان پڑ سکتی ہے، جذبۂ بیان کی رہنمائی کے لئے، برج بھاشا شاعری کا وہ عنصر جو پریم رس اور نائکہ بھید کے نام سے موسوم ہے، سامنے موجود ہے۔ غزل گو اگر استادانہ اہلیت کا مالک اور امتیازی فطنت کا حامل ہے تو جنسی مسائل و عوائد کی گتھیاں بھی سلجھا سکتا ہے۔ تحلیل نفسی (۲) کا موضوع، دریائے ناپیدا کنار ہے اور اس کے اجزا رفتہ رفتہ غزل کے پیکر میں سموئے جا سکتے ہیں۔ بہر عنوان راز کہنے والا اپنے رموز کے بیان میں جتنی صناعت پیدا کر سکے گا، اسی اعتبار سے، اس کے کلام کی قدریں بالی تولی جائیں گی اور بس۔

میں رجعت پسند یا آرٹ برائے آرٹ کے نظریے کا حامی نہیں ہوں۔ پرانی شعری قدروں کا اندھا پرستار بھی نہیں ہوں۔ مجھے ادب برائے زندگی کا نظریہ بھی تسلیم ہے اور اس سے بھی تمام و کمال اتفاق ہے کہ آرٹ زندگی کے مفاد کے لئے پھولنا پھلنا چاہئے۔ لیکن اپنی زبان کے تمدنی ورثے کا پرستار ہوں اور شعر کو عام فہم اور عام پسند بنانے سے پہلے شعری قدروں سے لبریز دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں شعر کی قدروں کو ارزاں بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں غزل ایک ترقی یافتہ،

آرٹ ہے جس کے رموز و حکم کا مذاق، ہر ظرف میں نہیں سما سکتا۔ غزل کہنا اور سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ نومشق اس سے شروع ضرور کر سکتا ہے لیکن نومشقی اور محض عاشقانہ صاحبزادگی، اس کو انجام تک نہیں پہنچا سکتی۔ اس آرٹ کا صحیح استعمال صرف استادی ہی سے ممکن ہے۔ شعر کے فن نے، سرقے کو عیب قرار دے کر، جس اصول کا اثباتی پہلو ابھارنا چاہا ہے، وہی اصول مغربی نقادی نے "انفرادی تجربے" کے نام سے پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دوسرے کا چبایا ہوا نوالہ نہ چبایا جائے۔ دوسرے کا تجربہ، اپنا بنا کر، دوسرے لفظوں میں ڈھالنے کی کوشش نہ کی جائے۔

سماج کے مذاق میں اصابت اور معیاریت اور کہنے والوں کے مدارج میں بھی فرق پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ غزل، مراتب کی نوعیت کے لحاظ سے دو ہی قسم کی ہو سکتی ہے اور تیسری کی گنجایش نہیں۔ ایک وہ جو موضوع، زبان اور بیان کے اعتبار سے اتنی سہل ہو کہ اس سے سہل تر نا ممکن ہو۔ دوسری ایسی جس کے موضوعی عناصر، پردۂ خفا میں مستور ہوں۔ جس کے حجابات، ذاتی مطالعے، ذاتی غور و فکر کے بغیر نہ اٹھ سکیں۔ جو محض سن کر، پہلی کوشش اور نظر میں سمجھ میں نہ آئے۔ سہل ممتنع تک رسائی، اب بھی دشوار ہے، دوسری نوع بھی، اتنی دشوار ہونی چاہئے کہ خالص صناع کے علاوہ، دوسرے کی دست رس سے باہر رہے۔

غزل محض گرمیٔ محفل کا آلہ یا یاران طریقت کی باہمی ملاعبت کا کھلونا نہیں ہے۔ غزل ایک مکمل اور ذی وقار آرٹ ہے، جس کے مقاصد، خالص تفریح سے بلند تر ہیں۔ غزل اور غنائیہ میں فرق ہے اور مشاعرہ اور اوپیرا، اظہار کے دو مختلف ذرائع ہیں۔ اوپیرا، عامۃ الناس کی تفریح گاہ اور مشاعرہ، سنجیدہ قسم کی ادبی صحبت ہے جو مخصوصین اور اہل ذوق کے لئے برپا کی جاتی ہے۔ بہر عنوان، غزل، غنا، کی پیش خدمت یا لونڈی باندی نہیں ہے۔ غزل، اگر سچی غزل ہے تو اس کو کسی اعانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بر سر مشاعرہ، موسیقی کی مدد سے، غزل کے محاسن کو ابھارنا اور معائب کو دبانا، ذاتی فطنت کی کمزوری کا احساس اور غزل کے محاسن پر اعتماد کی کمی کی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ، اس نوع کی خارجی اعانت کا شوق، اعتدال و دیانت کے بھی خلاف ہے۔ لحن، تال، سر کے ساتھ پڑھے جانے سے، سننے والے کو جو مزہ آتا ہے وہ شعر کا مزہ نہیں ہوتا، موسیقی کا مزہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ، پردہ پوشی اور سامعین کی قوت فیصلہ کو مجروح و مرعوب کر دینے کی کوشش وقتی و آنی ہے اور مستقل اثر نہیں چھوڑتی۔ موسیقی کا کیف دور ہونے کے بعد، جب مفاہیم کا صحیح تصور پیدا ہوتا ہے تو ردّ عمل شدید تر ہو جاتا ہے۔

میرے خیال میں مشاعروں کی لحن طرازی نے غزل کی شاعرانہ قدروں اور غزل کے آرٹ کی شرافت کو معتدبہ صدمہ پہنچایا ہے۔ غزل وہ ہے جو کسی خارجی اعانت کی آڑ نہ پکڑے۔ غزل وہ ہے، صفحۂ کاغذ پر جس کا منہ فق نہ ہو جائے۔ غزل وہ ہے جو ہر نوع کی تنقید کا ہمت و جرأت سے مقابلہ کر سکے۔

عامۃ الناس کی تفریح کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ تصویر سازی کی کمپنیوں نے، گیتوں کا نہایت معقول ذخیرہ ہماری زبان میں جمع کرایا ہے اور یہ سعی روز بار ور ہو رہی ہے۔ اس لئے اب وہ وقت آگیا ہے کہ غزل اور گیت کے فرق و امتیاز پر زور دیا جائے۔ انگریزی ادب میں بھی (Ode, Elegy, Sonnet) وغیرہ وغیرہ (Song) سے علیحدہ اصناف ہیں اور ایک کو دوسرے کے محل پر استعمال نہیں کیا جاتا۔

غزل اور اس کا پیکر تباہ کرنے کی کوشش نہ صرف بیدردانہ تباہ کاری ہے، بلکہ ارتقا کی قہری قوت کا بھی ابطال ہے۔ وجود میں آنے سے پیشتر، مستقبل کے منازل و مراحل پر رائے زنی کیونکر ممکن ہے۔ مائیکل اینجلو نے، مسیح کا نقش، اپنے ذہن سے خلق کیا اور دنیائے عیسائیت سے پجوا دیا۔ بمبئی آرٹ اسکول کے مصور کے لئے آج اگر یہ کمال محال ہو تو ہو، لیکن کسے معلوم ہے کہ ایک ایسا مصور زمانے کے بطون سے پیدا ہونے والا نہیں ہے جو خدا یا صداقت مجردہ کا پیکر بنا کر ساری دنیا سے نہ پجوا دے گا۔

غزل کا پیکر، بے شک آج صلاحیت کھو کے نظر آتا ہے لیکن میں پھر عرض کرتا ہوں کہ صلاحیت پیکر کے وجود میں نہیں ہوتی، صناع کے بطون میں پنہاں ہوتی ہے، فطنت کا لازمہ ہے۔ وہ وقت پھر آسکتا ہے کہ غزل کے اشعار، رسفا کلیز کے حزنیہ سے برابر کا مقابلہ کرتے نظر آئیں، تغزل، فطرت پرستی کے ازلی و ابدی دین کا نام ہے، جب تک انسان کے قلب میں دھڑکن موجود ہے، غزل کا موضوع زندہ ہے اور اس اچھوتے دین کی پرستش بھی زندہ ہے۔

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں (اقبال)

ڈانٹے کا رومان

افسانہ

رشیدہ لطیف

شہر فلورنس جو آج حسن و خوبصورتی کا گہوارہ اور فیشن و جدت کا مرکز ہے، آج سے سات آٹھ سو سال پیشتر بھی شعر و نغمہ اور موسیقی و نقاشی کا گھر تھا۔ یہ رومان اسی عہد سے وابستہ ہے۔

فلورنس میں موسم بہار کا آغاز ہے۔ آج سے ڈے یعنی مئی کا نوروز ہے۔ بہار کی دیوی اپنی پوری لطافتوں، نزاکتوں اور رنگینیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہے۔ مسکراتی ہوئی صبح اپنا سلام ساری دنیا کو پہنچا چکی ہے۔ سورج کی شفاف کرنیں مسکرا مسکرا کر دنیا والوں کو عام طور پر اور اہل فلورنس کو خاص طور پر ہنسنے اور ہنسانے پر آمادہ کر رہی ہیں۔ باغوں میں نسیم سحر اپنی متوالی چال اور اٹھلاتی اداؤں کے ساتھ کلیوں کو چھیڑ چھیڑ کر ہنس پڑنے اور خوشی سے کھل جانے پر مجبور کر رہی ہے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو مسرتناک فرحت و تازگی پہنچاتی ہے۔ اور مرغان چمن اپنی خوش الحانیوں سے وہ محفل شعر و نغمہ بپا کر رہے ہیں، جس کا لطف کچھ سننے والے ہی خوب اٹھا سکتے ہیں۔

شہر کے وسط میں ارونو ندی اس سہانی صبح کی تمام دلچسپیوں اور رونقوں اور موسم بہار کی ساری لطافتوں اور نزاکتوں کو گود میں لئے اٹھلاتی، اتراتی اور ناز و انداز دکھلاتی ہوئی بہہ رہی ہے۔ ایسے سہانے وقت اور دلرُبا موسم میں اس خدائے بزرگ و برتر کا شکر بھی واجب ہے۔ جس نے ہمیں یہ سب نعمتیں عطا فرمائیں۔ لہٰذا وہ دیکھئے پادریوں کا ایک جلوس حمد کے گیت گاتا اور خوشی کے نغمے الاپتا نوروزی شکرانہ ادا کرنے کے لئے گرجے میں داخل ہوا۔ اور ویکیو کے پل پر سناٹا سا چھا گیا۔

ایسا دلربا اور دلکش سماں ہو تو اداس اور غمگین رہنا بھی کفران نعمت ہے۔ کون غمگین رہ سکتا ہے! میرا خیال تھا اس وقت شہر کا بچہ بچہ خوشی و مسرت کے گہوارے میں جھول رہا ہوگا۔ آج رنج و الم کے مہیب دیو نے کہیں اپنا ٹھکانا نہ دیکھ کر شاید پردۂ ہستی سے اپنا منہ چھپا لیا ہوگا۔ لیکن نہیں، یہ کیا! وہ دیکھئے پل پر کوئی نوجوان یکہ و تنہا چلا آ رہا ہے۔ چہرے سے اداسی اور غمگینی ظاہر ہے۔ کچھ کھویا ہوا سا نظر آتا ہے۔ نوجوان چلتے چلتے پل کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور پانی کے بہاؤ اور مچھلیوں کو دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔

جلوس عبادت سے فارغ ہو کر گرجے سے باہر نکلا۔ ایک پادری نے پل پر بیٹھے ہوئے نوجوان کو بغور دیکھا اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔

"جیاتو! وہ دیکھو پل پر کوئی بیچارا تنہا بیٹھا ہے۔ آج کے دن کسی کو اداس رہنا اور تنہا و بے کس نظر آنا بھی حرام ہے۔ چلو دیکھیں، یہ بلند قامت نوجوان کون ہے؟ تنہا اور اداس کیوں بیٹھا ہے؟" دوسرے ساتھی سے "چلو جان تکا، تم بھی ہمارے ساتھ چلو!"

تینوں ساتھی جب ذرا قریب پہنچے۔ تو جان تکا حیرت اور تعجب سے چلائی۔ "ارے جیاتو یہ تو ہمارا مقبول و معروف شاعر ڈانٹے ہے!..... مگر نوروز کا دن ..... اور ڈانٹے غمگین نظر آئے!! کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا ماجرا ہے!"

جیاتو:۔ "ہاں ہے تو وہی! مجھے خود تعجب ہو رہا ہے۔ اچھا آؤ پیچھے کی طرف سے چپ چاپ چلیں۔ اور قریب پہنچ کر دیکھیں ماجرا کیا ہے ایسے پرکیف وقت میں یہ اتنا غمگین کیوں ہے؟"

تینوں دوست آہستہ آہستہ ڈانٹے کے قریب پہنچے۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ اسے پاؤں کی آہٹ تک محسوس نہ ہوئی۔ وہ بدستور اپنے تصورات میں غرق ندی کی لہروں کے چکر میں کھویا رہا۔ تینوں ساتھی حیرت و تعجب سے اس کو تک رہے تھے۔ لیکن اسے ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا۔ بالآخر جان تکا نے ایک بے ہنگم سی آواز سے اسے چونکا دیا۔ ڈانٹے نے ہوش کی دنیا میں آتے ہوئے مڑ کر دیکھا تو جان تکا، جیاتو اور کیولکانتی تینوں کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ڈانٹے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا آپ لوگ ہیں۔ دوست آج تو تم نے مجھے ندی میں دھکیل ہی دیا تھا۔ نوروز مبارک! اور سینیورینا جان تکا کو خاص طور پر اور بہت زیادہ مبارک؟"

جان تکا:۔ "اور آپ کو بھی یوم بہار مبارک! مگر یہ تو بتلایئے۔ ایسے مبارک دن، آپ کا یہاں بیٹھنا اور موجوں کی گنتی گننا کیا معنے رکھتا ہے؟ اٹھئے ہمارے ساتھ چلئے۔"

جیاتو:۔ "ہاں ڈانٹے، اٹھو! آج تو کسی شخص کو بھی اور خصوصاً شاعر کو تو اداس رہنے کا حق نہیں۔"

ڈانٹے:۔ "نہیں جیاتو، آج میری طبیعت بہت اداس ہے۔ میں کہیں نہیں جا سکتا۔ تم لوگ جاؤ۔"

جان تکا:۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے! سینیور ڈانٹے آپ کو ضرور چلنا پڑے گا۔"

کیولکانتی:۔ "اٹھو ڈانٹے، ایسے حسین اصرار کو تم رد نہیں کر سکتے۔"

ڈانٹے:۔ "کیولکانتی، میں جانتا ہوں کہ حسن کا فرمان اٹل ہے۔ لیکن تم جانتے ہو کہ ایک افسردہ دل پوری محفل کو افسردہ کر دیتا ہے۔ اور مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں۔"

جان تکا:۔ "میں سمجھ گئی جیاتو، میں سینیور ڈانٹے کی افسردہ نگاہوں اور اترے ہوئے چہرے سے اندازہ لگا کر وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ سینیور کو کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ کیوں، شاعر ہے نا پتہ کی بات!؟"

ڈانٹے:۔ (کچھ ہچکچاتے ہوئے) "کیسے کہوں کہ سینیورینا کا قیاس غلط ہے!"

جان تکا:۔ "سچ مچ! تو پھر میری دلی مبارکباد قبول کیجئے! لیکن یہ تو بتایئے، وہ پری جمال، خوش خصال اور خوش نصیب ہے کون؟"

ڈانٹے:۔ "جان تکا، کہیں راز کی بات بتائی جا سکتی ہے!"

کیولکانتی:۔ "نہیں ڈانٹے، نام تو بتلانا ہی پڑے گا۔"

ڈانٹے:۔ "کیولکانتی، مجھے مجبور نہ کرو، میں نام ظاہر نہیں کر سکتا!"

جیا تو:۔ ڈانٹے، یہ تم بھی جانتے ہو کہ محبت کرنا کوئی جرم نہیں، کوئی گناہ نہیں، محبت کرنا عیب نہیں، پھر اس کا چھپانا کیا معنی!"

جان تکا:۔ (ڈانٹے کو بہلانے کے انداز میں) "جیا تو، تم مشہور نقاش اور مانے ہوئے آرٹسٹ سہی، لیکن تمہارا اور ڈانٹے کا مطمحٔ نظر ایک ہونا بھی ضروری نہیں۔ اچھا سینور ڈانٹے آپ میرے کان میں کہدیجئے!

ڈانٹے:۔ سینور ینا! مجھے مجبور نہ کرو۔ یہ میرا راز ہے۔ اس کا راز رہنا ہی بہتر ہے"

جان تکا:۔ "لیکن ڈانٹے۔ اگر آپ شاعر ہیں تو میں عورت، اور آپ عورت کی متجسس فطرت سے بخوبی واقف ہیں جسے ہمیشہ راز پا لینے ہی کی جستجو رہتی ہے۔ جب تک آپ نہ بتائیں گے۔ مجھے الجھن رہے گی۔"

ڈانٹے:۔ (جان تکا کے اصرار سے مجبور ہو کر) "اچھا اگر تم نہیں جانتیں تو سنو۔ نام تو میں نہیں بتاتا۔ بس اتنا سن لو کہ تم سے بہت مشابہ ہے۔"

جیا تو:۔ "آہا۔ میں سمجھ گیا، جان گیا، پہچان گیا! جان تکا، مبارک ہو انہیں تم ہی سے الفت ہوئی ہے۔ لاؤ، کھلاؤ مٹھائی۔"

کیولکانتی:۔ اچھا ڈانٹے، بھئی اب چلو بہت دیر ہو گئی۔"

ڈانٹے:۔ "نہیں دوست، زیادہ بہتر ہو گا کہ مجھے اس وقت تنہا ہی چھوڑ دو۔"

جیا تو:۔ "نہیں مانتے تو مجبوری، اچھا خدا حافظ۔"

تینوں دوست چلے جاتے ہیں۔ ڈانٹے پھر اپنے خیالات میں غرق ہو جاتا ہے۔ تصورات کی دنیا میں ابہج کردہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ندی کی شوخ و شریر لہروں میں کھو جاتا ہے۔ دلدادگانِ بہار اور وارفتگانِ نوروز کی ٹولیاں کی ٹولیاں گاتی بجاتی آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ لیکن ڈانٹے کو عام محویت میں ذرا احساس نہیں ہوتا۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی دلکش راگ گاتی ہوئی قریب سے گذرتی ہے۔

"پھر بہار آئی ہوا سے بوئے یار آنے لگی۔
سامنے پھر لیلیٰ نقش و نگار آنے لگی۔"

افسردہ دل اور دنیا سے بے تعلق ڈانٹے گیت کے ان بولوں کو خود بھی آہستہ آہستہ گنگنانے لگتا ہے۔ جلوس آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ پل پر پھر سناٹا چھا جاتا ہے۔ لیکن گیت کے بول ڈانٹے کے احساسات میں ہل چل مچا دیتے ہیں۔ اس کے سوئے ہوئے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ جلوس کے محشر انگیز گیت نے ڈانٹے کی رگ جان کو چھیڑ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ وہ خود بخود پھر وہی گیت دوہرانے لگتا ہے۔

پھر بہار آئی، ہوا سے بوئے یار آنے لگی

اسی حالت میں ڈانٹے دور سے دو لڑکیوں کو آتے دیکھتا ہے محبت کی چھٹی حس اسے بے چین و بے آرام کر جاتی ہے۔ اسے اختلاج سا ہونے لگتا ہے۔ جوں جوں لڑکیاں قریب پہنچتی جاتی ہیں۔ ڈانٹے کا خیال یا آرزو یقین میں تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ دونوں اس کے پاس سے گذر جاتی ہیں تو ڈانٹے پھر کسی خیال میں غرق ہو کر ندی کے بہاؤ کو دیکھنے لگتا ہے۔ لڑکیاں کچھ دور آگے بڑھ جاتی ہیں۔ تو ان میں سے ایک جس کا نام بیٹرس ہے، پیچھے مڑ کر دیکھتی ہے۔

بیٹرس:۔ "اوہو، سینور ڈانٹے ہیں، تسلیم!"

ڈانٹے:۔ "جی، جی (گھبرا کر) تسلیم سینور ینا بیٹرس!"

بیٹرس:۔ نصیب دشمنان، مزاج کیسے ہیں؟"

ڈانٹے:۔ (پریشانی کے عالم میں) ایں ں، ہاں، بہت اچھا ہوں" سینور ینا۔ شکریہ!"

بیٹرس:۔ "سینور ڈانٹے! کیا آپ کو ندی کے شفاف آئینے میں دیکھنے کے بعد کبھی اپنی حالت کا اندازہ نہیں ہوا؟ آپ کا چہرہ بالکل سفید پڑ رہا ہے۔ ہائیں، اور کیا آپ رو بھی رہے تھے؟"

ڈانٹے:۔ (اور زیادہ گھبرا کر) "نہیں، سینور ینا — نہیں تو!"

بیٹرس:۔ "تو کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتی ہوں کہ شاعر ڈانٹے اتنا بدحواس کیوں ہے۔ جو مجھے مبارکباد دینا بھی بھول گیا۔"

ڈانٹے:۔ (بدحواسی کے لہجہ میں) اوہو، معاف کیجئے گا۔ میں بھول گیا تھا۔ نوروز مبارک ہو! سینور ینا بیٹرس کو۔"

ساتھ والی:۔ اور شاعر ڈانٹے، مجھے کچھ بھی نہیں!"

ڈانٹے:۔ "اوہ میں بھول گیا تھا۔ آپ کو بھی نوروز مبارک ہو!"

دونوں ڈانٹے کی بدحواسی پر ہنستی ہیں۔

بیٹرس:۔ سینور، آج شام کو میری سالگرہ کی پارٹی میں آنا نہ بھولئے گا۔ میں منتظر رہوں گی۔

ڈانٹے:۔ "آہا، میں بھول ہی گیا تھا۔ سینور ینا، میں ضرور شریک ہوں گا شکریہ!"

ساتھ والی:۔ "لیکن سینور بیٹرس کے تحفہ کے ساتھ میرا تحفہ نہ بھول جائیے گا۔"

بیٹرس:۔ "سینور، اس کی باتوں پر نہ جائیے یہ تو مذاق کر رہی ہے۔ تحفے وحفے کی ضرورت۔"

ڈانٹے:۔ "جی، جی۔"

ساتھ والی:۔ "سینور، آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں! کہئے تحفہ، نہیں توبہ، تحفے ضرور لاؤں گا۔"

ڈانٹے:۔ "جی، درست، ہاں، کیوں نہیں!"

بیٹرس:۔ "سینور، درحقیقت آپ تو بہت ہی گھبرائے ہوئے ہیں۔ شاید آپ اس اتفاقی ملاقات سے خوش نہیں ہوئے۔"

ڈانٹے:۔ (گھبرا کر)۔ جی، نہیں،

ساتھ والی:۔ "یا وحشت، یعنی آپ واقعی خوش نہیں ہوئے؟"

ڈانٹے کوئی جواب نہیں دیتا۔ دونوں لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔ اور ڈانٹے پھر اپنے خیالات میں غرق ہو کر ندی کے بہتے ہوئے پانی کو بغور تکنے لگتا ہے۔

حقائق و معارف

افقر موہانی وارثی

وہ نہیں ہیں پھر بھی تازہ دل میں انکی یاد ہے
یہ وہ دنیا ہے جو ویراں ہو کے بھی آباد ہے

حاصلِ نازِ ستم جب حُسن کی اُفتاد ہے
تم کو اس سے کیا کوئی ناشاد ہے یا شاد ہے

رُوح فرسا کوہکن کی کس قدر رُوداد ہے
گردنِ فرہاد پر خونِ سرِ فرہاد ہے

حسنِ باطل نام کی دُنیا جہاں آباد ہے
ذرّہ ذرّہ اس زمیں کا جنتِ شداد ہے

میری وحشت سُرخرو، میرا جنوں ہو کامیاب
وہ بھی مجھکو کہہ رہے ہیں خانماں برباد ہے

ایسے بھی جلوے ہیں کچھ حسنِ کرشمہ ساز کے
گم جہاں پر ارتقائے مانی و بہزاد ہے

چاہتی ہے ہر جفا خود انتقامِ معصیت
حشر میں در پیش کس مظلوم کی روداد ہے

کیا کریں صیاد ہم جا کر قفس سے آشیاں
سب کہیں گے دیکھکر یہ آشیاں برباد ہے

قید کر سکتا نہیں صیاد اسیروں کا خیال
یہ وہ طائر ہے اسیری میں بھی جو آزاد ہے

لاکھ آزادی کے دکھلاتا رہے سبزہ باغ
اے اسیرانِ قفس صیاد پھر صیاد ہے

لذتِ نازِ ستم اے پوچھنے والے نہ پوچھ
دل سراپا آرزو لب پر مُبارکباد ہے

قصہ گو سے سُن کے قصہ قیس کا کہتے ہیں وہ
یہ تو جیسے داستانِ افقر ناشاد ہے

واردات

عارف ملتانی

آغازِ محبت میں ہمدم، کیا جانئے یہ کیا ہوتا ہے؟
نس نس میں آگ سلگتی ہے، رگ رگ میں سوز سموتا ہے!
یہ ہلکی ہلکی سی ٹیسیں، سینے سے کون اٹھاتا ہے؟
یہ میٹھے میٹھے سے نشتر، پہلو میں کون چبھوتا ہے؟
جب پھانس نہ چبھے، اور درد اُٹھے، تر آنکھ نہ ہو تو کیا حاصل؟
وہ عشق تلے موتی رولتا ہے، جو اشک کے دانے بوتا ہے
کچھ حسن میں قوت باقی ہے یا عشق میں لذت ہے ورنہ!
یوں زیست کی سُندر نیا کو منجدھار میں کون ڈبوتا ہے؟
تاروں کی سہانی جگمگ سے، اک چوٹ سی دل پر لگتی ہے
میں پہروں اُٹھ اُٹھ روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے!
شبنم میں بھیگی راتوں میں فرقت کے ترانے گاتا ہوں
لب دھیرے دھیرے ہلتے ہیں، دل چپکے چپکے روتا ہے!!

غزل

سحاب قزلباش

ہزار باتیں ہیں دل میں ابھی سنانے کو
مگر زباں نہیں ملتی ہمیں بتانے کو

ہم اہلِ ظرف ابھی تک ہیں ایک جنسِ لطیف
جنھیں تحمل دیا دنیا نے آزمانے کو

وہ آنکھیں آج ستاروں تراشتی دیکھیں
جنھوں نے رنگِ تبسم دیا زمانے کو

ہمارے پھول، ہمارا چمن، ہماری بہار
ہمیں کو جا نہیں ملتی ہے آشیانے کو

لرز کے رکھدیا جس بار کو فرشتوں نے
وہ ہم کو بخشدیا تم نے آزمانے کو

سحاب اتنے تغیر نواز ہیں ہم بھی
کہ اپنے نغموں نے چونکا دیا زمانے کو

عراقی فوج کے افسر چاند ماری کرنے والوں کے کمالات دیکھ رہے ہیں۔

عراقی فوج کے افسر ہندوستان میں

کچھ عرصہ ہوا عراقی فوج کے چند افسر بریگیڈیر حسین مکی کی قیادت میں ہندوستان تشریف لائے۔ انہوں نے سارے ملک میں گھوم پھر کر یہاں کے فوجی نظم و نسق کا مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ "آرمڈ فورسز ہیڈکوارٹر" پر بھی تشریف لیگئے جہاں محکمۂ دفاع کے سکریٹری مسٹر جی۔ ایس۔ بھالجہ نے انکا استقبال کیا اور ہندوستان کے ایڈ جوٹنٹ جنرل لفٹننٹ جنرل آر۔اے سیووری سے ملاقات کرائی۔ یہ فوجی وفد دہلی چھاؤنی کے راجپوتانہ رائفلز سنٹر کا معائنہ

مشہور مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساء کے ساتھ بہت سے تاریخی اور غیر تاریخی واقعات منسوب کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر واقعات ایسے ہیں جن کے متعلق اب تک مستند شہادتیں نہیں مل سکیں۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ زیب النساء سکندرہ میں دفن ہے۔ لیکن بہر حال ایک بات ایسی ہے کہ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور وہ یہ کہ زیب النساء ایک خوش گو شاعرہ تھی۔
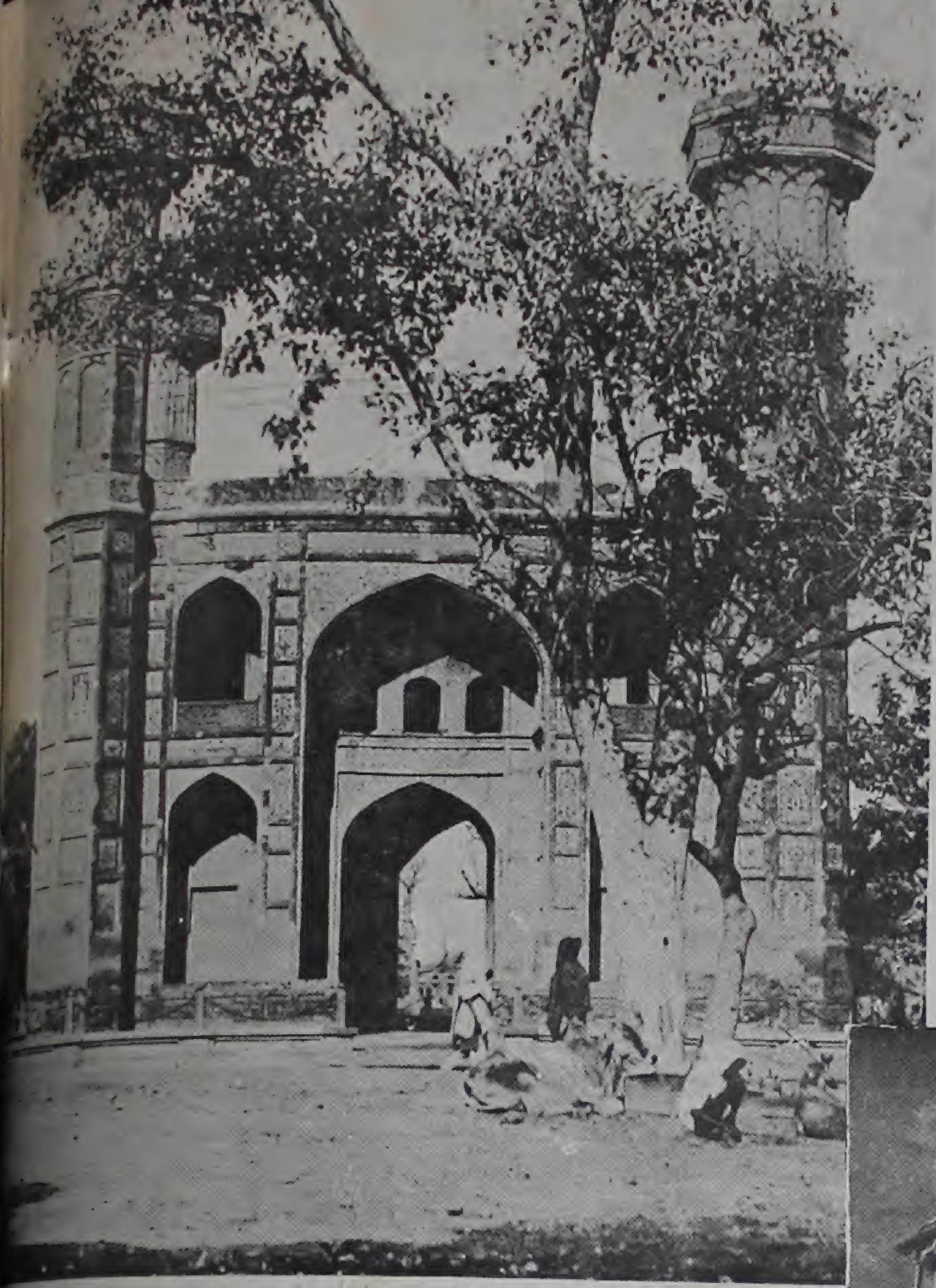
جہاں ملتان سے لاہور جانے والی خاک آلود سڑک شروع ہوتی ہے۔ اسی کے قریب ایک چار مینار کی عمارت ہے جسے 'چوبرجی' کہتے ہیں۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء نے ایک باغ اپنے ایک وفادار خادم کو بخش دیا تھا۔ یہ اسی باغ کا دروازہ تھا۔ باغ تو اجڑ گیا۔ اب صرف اس کا دروازہ باقی ہے۔

✡

یہ سکندرہ میں آگرے کے قریب اکبر کے مقبرے کا دروازہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زیب النساء کو بھی اس کے جد اعلے کے پاس دفن کیا گیا تھا۔

→

زرتشتی درسگاہ کا سالانہ جشن

۲۶- مہر ماہ ۱۳۲۵ کی صبح ذرتشتی درسگاہ کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ انجمن زرتشیان کی دعوت پر بہت سے اہل علم حضرات جن میں انگریز بھی شامل تھے جلسہ میں شریک ہوئے۔ انجمن زرتشیان کے صدر آقائ ارباب رستم گیونے اس موقعہ پر ایک تقریر

پروفیسر پور داؤد ایک خانون کو سند عطا کر رہے ہیں۔

جلسۂ تقسیم اسناد کا ایک منظر

آقائی ارباب رستم گیو جلسے میں اپنی سالانہ رپورٹ کر سنا رہے ہیں۔

✡

کی اور طلبا نے ترانے گائے جن سے سارا جلسہ اٹھا آقائے ارباب رستم گیونے اس جلسہ کی اہم ذکر کرتے ہوئے اس میں شریک ہونے وال شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ کسطرح اور کن حالا اب سے دس سال پہلے انجمن قائم کی گئی تھی۔

✡

اترشیروان دادگر اسکول کی ایک اڑکی

جامعہ کا جشن سیمیں

اس موقعہ پر اسکاؤٹ ریلی کا ایک منظر۔

اسکاؤٹ جامعہ کی عما

جشن سیمیں کے پنڈال اور اسکے مہمانوں کا ایک منظر

جشن سیمین مین داخ

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں شیخ الجامعہ

حصے کے سامنے سے گذر رہے ہیں۔

روازہ۔

، اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان میں ایک نئے تعلیمی تجربہ کی بنیاد پڑی۔ اس تجربہ
شروع کرنے اور چلانے والوں نے ۱۹۲۰ء سے آج تک سخت سے سخت آزمائشوں سے گذر
اسے اس منزل تک پہنچایا ہے کہ اب وہ دنیا کے بڑے بڑے تعلیمی مفکروں سے خر
تحسین وصول کر رہا ہے۔ اس تعلیمی تجربہ کی عملی شکل جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ ۱۵۔ نو
سے ۱۸۔ نومبر تک جامعہ نے اپنا جشن سیمیں منایا۔ جس میں ہندوستان کے اکثر بڑے بڑ
ماہرین تعلیم، علماء، ادبا اور سیاسی مفکر شریک ہوئے۔ ۱۸ نومبر کو جشن سیمیں کے خ
جلسہ میں اعلی حضرت فرماں روائے بھوپال کا خطبۂ صدارت ہوا اور اسکے بعد جامعہ
شیخ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ یہ رپورٹ ہمارے ادبی اور تعلیمی
میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس شمارہ میں آپ نواب صاحب بھوپال کے خط
اور ذاکر صاحب کی رپورٹ کے علاوہ حضرت حفیظ جالندھری کی نظم بھی ملا

نگہبان فوجی دستے کا ایک سپاہی گرمائی محل کی حفاظت کیلئے ڈٹا کھڑا ہے۔

جنرل پوسٹ آفس کی سیڑھیاں۔ لڑائی کے دنوں میں یہاں فوجیوں اور انکے ملنے والوں کا جھمگھٹ رہتا تھا۔ اب صرف شہری چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

الجدیریا

رومیوں کے عہد حکومت میں الجبریا ایک معمولی شہر تھا لیکن اب ترقی کرکے یورپ کے مشہور شہروں کے ہم پلہ ہوگیا ہے۔ یہ شہر صنعت و حرفت کا مرکز ہونے کے علاوہ ظاہری آرائش و زیبائش کے لحاظ سے بھی قابل دید ہے۔

۱۹۴۲ء میں جب فرانس نے جرمنوں کی تباہ کاریوں سے تنگ آکر ہتیار ڈالدئیے تو اسکی عارضی حکومت اسی جگہ قائم ہوئی تھی۔ حکومت نے ایک زنانہ مدرسہ لے لیا جو شہر سے باہر ایک
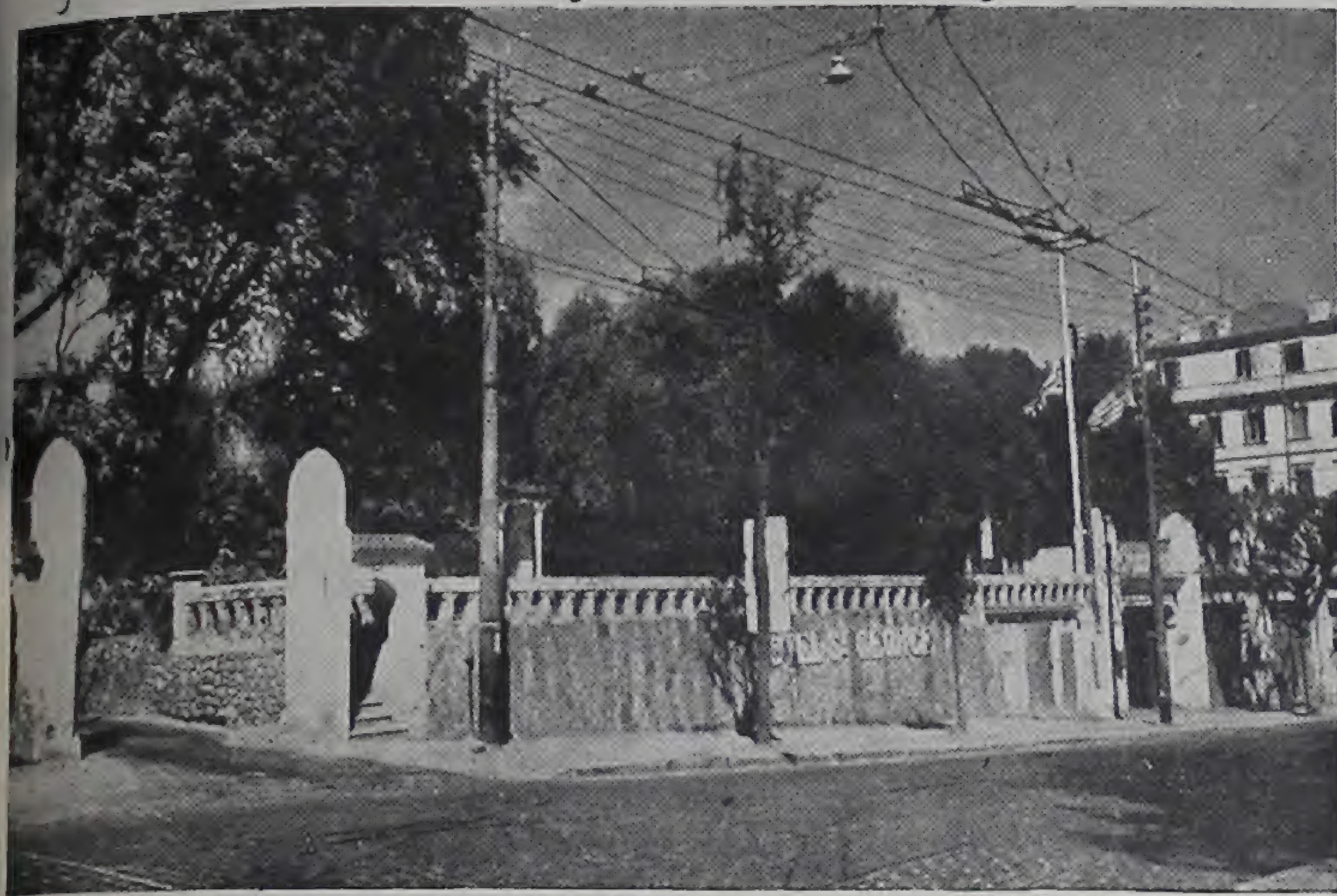
سینٹ جارج ہوٹل میں جانے کا دروازہ۔ لڑائی کے دنوں میں ہوائی فوج کے چیف مارشل جنرل ایزن ہور اور امیر البحر کننگھم کے صدر مقام اسکے اندر تھے۔

---

*پہاڑی پر واقع تھا۔ اسکے مختلف کمروں میں حکومت کے مختلف محکمے قائم ہوگئے اور فرانس سے دور رہ کر اس امر پر غور کیا جانے لگا کہ اپنے ملک کو دشمنوں سے کسطرح واپس لیا جائے۔ جب افسران کی تعداد بڑھ جانے سے مدرسے کی عمارت میں گنجائش نہ رہی تو گورنر کا گرمائی محل بھی جلسوں وغیرہ کیلئے حاصل کرلیا گیا۔

ایک زنانہ مدرسے کا کمرہ جسے ۱۹۴۲ء میں سقوط

دیوار چین

چین کی دیوار اعظم ولادت مسیح سے ۲۱۴ سال پہلے شیہ هوانگ تی نے بنوانی شروع کی جو اسکے مرنے کے بہت عرصے بعد تک بنتی رہی وہ ڈیڑھ هزار میل لمبی ہے۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ شمال اور شمال مغرب کی طرف سے منگول اور تاتار ارض چین پر حملہ نہ کر سکیں۔ دو هزار سال سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود اب بھی اسکا بہت حصہ برقرار ہے۔ مفصل مضمون صفحہ نمبر ۵۰ پر ملاحظہ کیجئے۔

بہت زیادہ ڈھلوان ہونے کے باعث دیوار کی بالائی سطح ہموار کے بجائے سیڑھیوں کی صورت میں تعمیر کی گئی ہے۔

چین کی دیوار اعظم کا ایک دلفریب منظر۔ یہ حصہ پہاڑی علاقے کے صوبۂ جیہول کی سرحد کے سامنے ہے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنی ہوئی کئی پناہ گاہیں نظر آرہی ہیں

دیوار رینگتے ہوئے سانپ کی طرح پہاڑ پر چڑھتی

رتن مالا ـ ایک فلمی ستارہ

نارسائی — وشوامتر عادل

کس نے آغاز کبھی دیکھا ہے ؟
کس نے انجام کبھی پایا ہے ؟
حسن کا کوئی بھی آغاز نہیں
حسن کا کوئی بھی انجام نہیں

چند بے جان طیور
چند سوکھے ہوئے پھل
چند مسلے ہوئے پھول
وقت کے ہانپتے خاموش کناروں کے ساتھ
دم بدم پیچھے پھسلتے ہی چلے جاتے ہیں
حسن چپ چاپ بہے جاتا ہے
حسن چپ چاپ گذر جائے گا

دُور فردا کے اُفق پر بھی ہیں کتنے سپنے
چند اڑتے ہوئے بگلوں کی قطار
چند دھندلے سے درخت
چند سرسبز پہاڑوں کا سکوت
یہ مگر پاس تو آتے ہی نہیں
حسن چپ چاپ بہے جاتا ہے
حسن چپ چاپ گذر جائے گا

ہاں مگر چند چٹانیں بھی ہیں
کہر میں لپٹی ہوئی
جن پہ لہروں کا اثر کوئی نہیں
جن کے سینے میں سحر کوئی نہیں
جن پہ تاریکیِ شب ہار کے سو جاتی ہے

آج پھر تیرا خیال آیا ہے
اور چپ چاپ گذر جائے گا

ظلم — مضطر اکبرآبادی

تکلیفِ ضبطِ آہ نہ کرتے تو ظلم تھا
غم سے اگر نباہ نہ کرتے تو ظلم تھا

یہ موسمِ حسیں یہ جوانی یہ چاند رات
اب بھی اگر گناہ نہ کرتے تو ظلم تھا

تیری رضا پہ تیرے اشارے پہ لے ندیم
ہم زندگی تباہ نہ کرتے تو ظلم تھا

دنیا سے رسم و راہ پہ آمادہ یوں ہوئے
دنیا سے رسم و راہ نہ کرتے تو ظلم تھا

اے رحمتِ تمام ترے اعتماد پر
جی بھر کے ہم گناہ نہ کرتے تو ظلم تھا

تھی دل کو احتیاج تمہاری نگاہ کی
تم زحمتِ نگاہ نہ کرتے تو ظلم تھا

مضطر خلوص و صدق و وفا کے جواب میں
وہ ظلمِ بے پناہ نہ کرتے تو ظلم تھا

کیفِ نظر — آباد لکھنوی

ہر شام کے پردے میں سحر دیکھ رہا ہوں
جو کچھ بھی دکھاتی ہے نظر دیکھ رہا ہوں

ظاہر ہے کہ تو دیکھ رہا ہے مرا عالم
میں بھی تجھے اے شعبدہ گر دیکھ رہا ہوں

مستی سے بہت دور ہوں اے بیخودیٔ شوق
میخانہ میں ساقی کی نظر دیکھ رہا ہوں

بخشا ہے عجب کیف مجھے میری نظر نے
تم ہی نظر آتے ہو جدھر دیکھ رہا ہوں

اک وہ کہ دکھاتے ہیں تجلی پہ تجلی
اک میں ہوں کہ گھبرا کے اُدھر دیکھ رہا ہوں

اب وہ نظر آتے نہیں بے پردہ کہیں بھی
اب ان کو بہ اندازِ دگر دیکھ رہا ہوں

آباد عجب حال میں پاتا ہوں جہاں کو
ہر شخص کو بیتابِ نظر دیکھ رہا ہوں

کیمیاداں لوازئے

پی این ہرٹ

انقلاب فرانس کے اس خبط وجنون کے دور دورے میں جبکہ فرانس کا بادشاہ اور ملکہ آزادی قوم کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں سولی کی نظر ہو چکے ہیں۔ اور شاہی محل میں قطار در قطار زن و مرد موت کا حکم سننے کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک کیمیاں داں بڑی خاموشی اور اطمینان سے اپنی پیرس کی تجربہ گاہ میں مشغول کار نظر آتا ہے۔ یہ سائنس داں ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ جو اپنی طاقت ثروت اور وقت کا بہت سا حصہ فرانس کی خدمت میں صرف کر چکا ہے۔ لیکن زمانہ انقلاب میں نفرت اور حقارت کا جذبہ روزافزوں تھا۔ اور اس سائنس داں کے ان گنت دشمن تھے۔ عین اسوقت جبکہ شہر پیرس کے کوچہ و بازار بے چینی سے کھول رہے تھے۔ اور اس کے دشمن اسکی تباہی اور بربادی کے منصوبے پکے کر رہے تھے۔ یہ کیمیاداں اپنے رفیق سیگوین کے پاس کھڑا اپنی نوجوان بیوی کو تجربوں کی یادداشتیں لکھوا رہا تھا۔ جو غذائیات کے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے کئے جا رہے تھے۔ لیکن قسمت کو ابھی ان تجربوں کی تکمیل منظور نہیں تھی۔ تجربہ گاہ کا دروازہ تیزی سے کھلا سپاہی اندر آئے اور اس سائنس داں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس سائنس داں کا نام لوازئے تھا۔

۱

جین انتاطنے اور جینے لوازئے کا اکلوتا بیٹا انتائنے لارنٹ لوازئے ۲۶ اگست ۱۷۴۳ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے وقت سیموئل جانسن مشہور انگریز ادیب ۳۴ برس کا تھا۔ والٹیر کی عمر پچاس سال تھی اور انقلاب فرانس کا پیغامبر روسو اپنی عمر کے تیس سال پورے کر چکا تھا۔

لوازئے ابھی دو ہی سال کا تھا کہ اس کی ماں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کے باپ نے مکان بیچ کر اپنی ساس کے گھر رہائش اختیار کر لی۔ خوبی قسمت سے اس کی ناکتخدا خالہ کانسٹن بھی وہیں رہتی تھی۔ اسے شیرخوار یتیم بچے سے محبت ہوگئی اور بھانجے کی پرورش اور دیکھ بھال اس نے ایسے اچھے طریق سے کی۔ گویا انتائنے کو پالنا ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں انتائنے کو کارڈینل مزارن کی درسگاہ میں داخل کر دیا گیا۔ اس درسگاہ میں سائنس کی تعلیم کا بہترین انتظام تھا۔ بڑے بڑے مانے ہوئے سائنس داں اس کے سٹاف پر تھے۔ ان میں ایک ایبے لا سیلے (Abbela Caille) جس نے نصف النہار کی ایک قوس کی ٹھیک ٹھیک پیمائش کی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس نے دس ہزار نئے ستارے دریافت کئے اور چودہ نئے تنا ذا منڈلوں (Constellation) کا پتہ لگا کر ان کے نام رکھے۔ مزارن سکول کی ایک رصدگاہ ایبے کے سپرد تھی۔ لوازئے بھی اپنا بہت سا وقت وہیں گذارا کرتا تھا۔ ایک اور استاد جس کا لوازئے کی آنے والی زندگی پر بڑا اثر پڑا کیمیاداں روئے (Rouelle) کچھ تیز مزاج بھی تھا اور سنکی سا بھی لیکن اپنی دھن کا پکا اور بہت اچھا استاد تھا۔ کہتے ہیں لیکچر دیتے وقت اس کے جسم میں اتنی حرارت پیدا ہو جاتی کہ وہ پہلے اپنی بال دار ٹوپی اتار دیتا۔ پھر گلوبند اور واسکٹ یہاں تک کہ کوٹ تک بدن سے اتار دیتا۔ غرض ایسے ایسے فنافی الفن استادوں کی صحبت میں رہ کر نوخیز لوازئے بچپن ہی میں شہرت اور کامیابی کے مسرت آمیز خواب دیکھنے لگا تھا۔ لوازئے نے ایک ڈرامہ بھی لکھا لیکن اس کی طبیعت کا فطری جھکاؤ سائنس کی طرف تھا۔ اسے تو صرف ایک ہی لگن تھی اور وہ تھی سائنسی تحقیق اور تفتیش۔

لوازئے کی سائنسی تحقیق کی ابتدا بیس برس کی عمر سے ہوتی ہے جب اس نے ہر روز باقاعدگی سے تین چار بار بادپیما پڑھنا شروع کیا۔ اس کا یہ مشغلہ خبط کی حد کو پہنچا ہوا تھا۔ کاروبار پر جاتا ہوتا تو ایک بادپیما ساتھ رہتا اور گھر میں خالہ کو تاکید رہتی کہ کسی وقت اسکا دیکھنا ناغہ نہ ہو۔ لوازئے کی غرض یہ تھی کہ ایسے قابل اعتنا قانون دریافت ہو جائیں جن کی مدد سے موسم کے متعلق پیشین گوئی کی جاسکے۔ لیکن بڑی محنت سے جمع کی ہوئی یادداشتوں سے نتیجہ نکالنے سے پہلے ہی موت نے اسے آدبایا۔ اور یہ کوششیں تکمیل تک نہ پہنچ سکیں۔

براعظم یورپ کی سیاحت کو اس زمانہ میں ہر طالب علم کی تکمیل تعلیم کا ضروری جزو سمجھا جاتا تھا۔ ۱۷۶۷ء میں لوازئے بھی مشہور ماہر علم الارض گوٹار (Guettard) کے ساتھ براعظم کی سیاحت کو روانہ ہوگیا۔

اس زمانہ میں پیرس کے رہنے والوں کے دماغ میں سمایا ہوا تھا کہ تہذیب کی حد پیرس کی چاردیواری کے ساتھ ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن لوازئے اس سفر پر گیا اور وہاں سے گھر والوں کو اس نے جو خط لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ذہین اور چھان بین کے متوالے نوجوان کے لئے یہ سفری زندگی از حد مسرت ہے اور سائنس کا پرستان اسپر نت نئے دل پذیر منظر کھول رہا ہے۔

لوازئے اور اس کے ساتھی جس جس شہر میں جاتے وہاں کی دلچسپ چیزوں کا مطالعہ کرتے۔ زراعتی زمین کی ماہیت اور مقامی نباتات اور صنعتوں کی یادداشتیں لیتے۔ ہر مقام کا درجہ حرارت ناپتے۔ جھیلوں اور دریاؤں کے پانی کا وزن مخصوص نکالتے۔ اس نوجوان سائنس داں کے لئے یہ شب و روز دلچسپیوں سے لبریز تھے۔ آخرکار اکتوبر کے مہینے میں آدھی رات کے وقت دو تھکے ماندے مسافر سفر کے میلے کچیلے کپڑے پہنے گھر آن پہنچے۔ گھر پہنچتے ہی خالہ سے گرمجوشی سے ملکر نوجوان لوازئے اچھلتا کودتا بادپیما کی پڑھائی کے لئے بھاگ کر چلا گیا۔

سفر سے واپسی پر لوازئے تیل جلانے والوں لیمپ اور موم بتیوں کی تحقیقات میں مصروف ہوگیا۔ مصنوعی روشنی سے اسے بہت دلچسپی تھی۔ پندرہ برس بعد اس نے سوانگ گھر اور بہتر روشن کرنے پر ایک تفصیلی مضمون لکھا اور ایک بیضوی شکل کا عاکسہ (Reflector)

ایجاد کیا۔ جو عام استعمال کی چیز بن گئی۔ اگلے دو برس میں "پانی" پر ایک مقالہ لکھا گیا اس میں پانی کے ۱۲۸ نمونوں کی تشریح پر جو دوران سیاحت میں جمع ہوئے بحث کی گئی۔ اس سائنسی خدمات کے بدلے اسے ۱۷۶۶ء میں اکیڈمی کی ابتدائی رکنیت مل گئی۔ اسوقت لوازئے مشکل سے ۲۳ سال کا تھا۔ اس نوعمری میں جبکہ اسکے ساتھی ابھی کھیل کود میں مشغول ہوں گے ایسا مرتبہ حاصل کر لینا جو پچاس سال کی عمر میں بھی مشکل سے ملتا ہے۔ بڑی تعریف کی بات ہے۔ اس کے چندہی ہفتے بعد لوازئے نے فارمرز جنرل کی دولت مند اور بارسوخ کمپنی میں ایک عہدہ قبول کر لیا۔ یہ کمپنی شاہ فرانس کے لئے ٹیکس وصول کیا کرتی تھی۔ کمپنی کے ہر عہدہ دار کی ذاتی آمدنی کا اندازہ دو لاکھ لورے (LIVRE) یعنی قریب ۲ لاکھ روپیہ سالانہ لگایا جاتا ہے — اس طرح لوازئے کیلئے معقول آمدنی کی صورت پیدا ہوگئی۔

اس نیم سرکاری کمپنی کے کارندوں کو بڑے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اور یہ لوگ اپنی دراز دستیوں اور ظالمانہ کاروائیوں کے لئے بھی مشہور تھے۔ اور فرانس بھر میں حقارت سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ کاروباری کمپنی اپنے کارکنوں کی بدعنوانیوں اور بعض ظالمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت ناکام تھی۔ اس بدنام اور مشتبہ کمپنی کے تعلق نے اس پر جو بعض برے اثرات ڈالے ان سے قطع نظر ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کا تعارف اپنی آئندہ بیوی سے ہوگیا۔ فارمرز جنرل کے کارکنوں میں ایک شخص جیکس پالزے (Jacques Paulze) بھی تھا پالزے بڑا ذہین۔ پڑھا لکھا۔ صاحب مذاق۔ کروڑپتی امیر تھا۔ فرانس کی کئی بڑی بڑی کمپنیوں سے اس کا تعلق تھا۔ ماری، پالزے کی صاحب جمال لڑکی تھی۔ جب لوازئے فارمرز کا ممبر بنا ماری ایک کانونٹ (Convent) میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ امیر طبقے کے کئی نوجوان ماری سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ لیکن ماری کو تو دنیائے سائنس میں شہرت حاصل کرنا تھی شاید اسی لئے پالزے کی نظر انتخاب لوازئے پر ہی پڑی۔ ماری کی عمر اسوقت ۱۶ برس تھی۔ اور لوازئے ۲۸ برس کا تھا۔ ماری کی نیلی آنکھیں۔ اس کے بھورے بال اسکے نکھرے ہوئے رنگ میں ایک کشش تھی۔ لوازئے بھی خوش شکل جوان تھا۔ یہ شادی عشق و محبت کی ابتدا کے بغیر ہوئی لیکن ایسے جوڑ قسمت سے ملتے ہیں۔ مصور ڈیوڈ نے (David) ان دونوں کی جو تصویر بنائی ہے اور جو اب راک فیلر انسٹی ٹیوٹ نیویارک کی لائبریری میں آویزاں ہے۔ ایک قابل دید چیز ہے۔ لے وازئے کی شادی دسمبر ۱۷۷۱ء میں ہوئی۔ فرانس کے امراء وزرا اور دنیائے دولت اور سائنس کے بڑے بڑے رکن اس میں شریک ہوئے۔ لوازئے کی دلہن حسن، قابلیت اور دولت سبھی کچھ جہیز میں لائی۔ شادی کے وقت ماری بہت نوعمر تھی۔ اس کی تعلیم کی ابھی ابتداہی ہوئی تھی۔ لیکن اس نے اپنی تعلیمی قابلیت کا رخ ایسا پلٹ دیا کہ اپنے خاوند کی سائنسی تحقیقات میں مدد کے قابل ہوگئی۔ اس نے لاطینی اور انگریزی جلد جلد سیکھ لی کہ ان زبانوں کے سائنسی رسالوں کا ترجمہ کر سکے۔ وہ ڈرائنگ اور نقاشی جانتی تھی۔ اور ضروری نقشے اور خاکے وہی بنایا کرتی تھی۔ علم کیمیا میں بھی شدبد حاصل کر لی۔ جب تجربہ گاہ میں تجربے جاری رہتے تو میاں بیوی باری باری شمار خوانی کرتے۔ اور جب مسلسل تجربے ہوتے تو ماری رت جگے کرتی۔ غرض ماری ہر لحاظ سے ایک قابل تعریف بیوی ثابت ہوئی وہ زندگی بھر خاوند کے پاس سے الگ نہیں ہوئی اس کی کامیابی کی حصہ دار اور اس کے دشمنوں کی دشمن تھی۔ سائنس بھی ماری کا گرویدہ احسان ہے کیونکہ ایسی وفا شعار بیوی کے بغیر لوازئے کو بھی وہ کامیابیاں نصیب نہ ہوتیں جن کی وجہ سے اس کے نام کو شہرت حاصل ہے۔

۱۷۷۵ء میں لوازئے بارود خانے کا افسر مقرر ہوگیا۔ یہ بڑا معزز عہدہ تھا۔ اس حیثیت سے اسے اپنی رہائش اسلح خانے کے احاطے میں رکھنی پڑی۔ جہاں اس لئے بیش قیمت آلات سے آراستہ تجربہ خانہ بنا دیا گیا تھا۔ فارم کی ممبری سے پہلے دو سال زیادہ تر کاروباری سفر میں گذرے۔ لیکن اس کے بعد لوازئے پیرس میں مستقل طور پر رہنے لگا۔ وہ بے حد مشقت پسند تھا۔ ہر روز صبح چھ بجے سے ایک بجے تک اور شام کو سات سے دس تک تجربہ گاہ میں مصروف تحقیقات رہتا۔ اس کے علاوہ وہ ہفتہ میں پورا ایک دن تجربہ خانہ میں گذارتا۔ دوست اور شاگرد وہیں جمع رہتے بلکہ اکثر کھانا بھی وہیں کھاتے۔ اور ہر وقت سائنسی نظریوں پر بحث رہتی۔ اسی ماحول میں وہ نظریے قائم ہوئے اور وہ دریافتیں ہوئیں جن پر لوازئے کی شہرت کا دارومدار ہے۔ شادی سے بعد کے بیس برس لوازئے کے لئے بڑا مبارک زمانہ تھا۔ فرانس کی اکیڈمی کی سرکاری حیثیت لندن کی رائل سوسائٹی سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ نئے ممبروں کو شاہ فرانس کے حضور شرف باریابی حاصل ہوتا تھا۔ پرانے ممبر تنخواہ دار تھے اور کم و بیش سرکاری ملازمت کا درجہ رکھتے تھے۔ اکیڈمی کا رکن ہونے کی حیثیت سے لوازئے کو کئی معمے حل کرنے ہوتے تھے اور کئی الجھنیں سلجھانی پڑتی تھیں۔ مثلاً پیرس کی آب رسانی کو بہتر بنانے کی تجویزیں۔ کمزوروں اور بخیفوں کے لئے آرام کرسیوں کے ڈھانچے، ہسپتالوں اور بیمار خانوں کی عمارتوں کا سدھار۔ بیماروں کے لئے سریش کا شوربہ بنانے کا طریقہ وغیرہ۔ میسمرزم یعنی مقناطیس حیوانی پر سائنسی نگاہ سے تحقیقات بھی کرنی ہوتی تھی بعض اوقات فضول اور بے تکی نوایجادیں منظوری اور تصدیق کیلئے اکیڈمی کو بھیج دی جاتیں۔ ساز مان مشین۔ جہازوں کے مرمت کرنے کی گودیاں آگ بجھانے کے آلے۔ دائمی حرکت کی مشین۔ لوازے کو ان پر رائے زنی کرنی ہوتی۔ ان

الجھنوں اور پراگندگیوں کے باوجود لوازیے کو دماغ کی یکسوئی میں خلل نہیں آیا اور تحقیقات کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔

ان مصروفیتوں کے باوجود اس نے بعض بہت اہم تجربے کئے۔ مثلاً کاربن ڈائی آکسائڈ کی کیمیائی ترکیب۔ نامیاتی کیمیا کی تحقیقات اور کیمیائی اصطلاحات اور کیمیائی مساوات کا نیا نظام ایسی دریافتیں ہیں جنہوں نے کیمیائی ریسرچ کی نئی راہیں کھول دیں۔ ۱۷۸۷ء میں ڈی مارڈو (de Morveau) در فارکرائے (Fourcroy) کی مدد سے کیمیائی اصطلاحات کا نیا نظام مرتب ہوا۔ اس سے پہلے کیمیائی ناموں اور اصطلاحات میں بڑی گڑبڑ تھی یہاں تک کہ کیمیا دانوں کے لئے ایک دوسرے کی زبان سمجھنا بھی مشکل تھا۔ آجکل درسی کتابوں اور ریسرچ کے رسالوں جو سائنسی زبان استعمال ہوتی ہیں۔ اسی نئے نظام کو اس کا منبع سمجھنا چاہیئے۔ لوازیے کا کہنا ہے کہ "سائنس اور اس کی زبان ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک کی بہتری میں دوسرے کی بہتری ہے۔ اگر اصطلاحیں قائم نہوں تو سائنسی حقیقتیں ایک سائنس داں دوسرے سائنس داں پر یا عوام پر واضح نہیں کر سکتا۔ نئی اصطلاحیں شروع شروع میں غیر مانوس۔ انوکھی اور بے ہنگم سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن الفاظ اگر کسی عقلی نظام میں پروئے ہوئے ہوں تو کان جلد ہی ان الفاظ سے خوگر ہوجاتے ہیں اور فہم ان کا مطلب سمجھنے لگ جاتا ہے"۔

اس وقت جب کہ سائنسی رسالوں اور کتابوں کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں ہو رہا ہے۔ اور ایک نئی سائنسی زبان زیر تعمیر ہے۔ لوازیے کے یہ الفاظ بہت معنی خیز معلوم ہوتے ہیں۔

اس نئے نظام کو فروغ دینے کی غرض سے ۱۷۸۹ء میں لوازیے نے کیمیا پر ایک ابتدائی کتاب (Traite Elementaire de Chimic) تصنیف کی جس میں اصطلاحات کو اس نئے نظام پر بحث کی گئی اور نئی اصطلاحات کا استعمال ہوا۔

اس کتاب میں مفرد اشیا کے احتراق پر بحث کی گئی ہے۔ گیسوں کے بنانے کے طریقے اور ان کی کیمیائی تشریح کا بیان ہے۔ ترشوں (Acids) اور قلیوں (Alkalis) اور ان کے کیمیائی عمل سے بننے والے نمکوں کا تذکرہ ہے۔ کیمیائی آلات کی تفصیل ہے اور پہلی بار ۳۳ کیمیائی عناصر کی فہرست دی گئی ہے۔ سلفائڈ۔ سلفٹ۔ فاسفیٹ۔ نائٹریٹ۔ ایسی ٹیٹ (Acetate) وغیرہ اصطلاحیں پہلی بار اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں۔ خالص کوئلہ کا نام کاربن ہے۔ کیمیائی عمل کے قاعدے صاف صاف لفظوں میں بیان ہوئے ہیں۔ پوٹاش اور سوڈا کا بھی پہلی بار نام لیا گیا ہے۔ غرض کہ ان تمام عملوں اور حالتوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کا تعلق لوازیے کے نئے نظام سے ہے۔ لوازیے کے نظام اصطلاحات پر کچھ لفظ صیغے ضرور ہوئی لیکن کیمیائی ٹکسال میں اس کا سکہ چل گیا۔ اور اس تصنیف نے اس کو کیمیا دانوں کی پہلی صف میں لا بٹھایا۔ اسی لحاظ سے اسے کیمیائے جدید کا بنانے والا کہتے ہیں۔

اس چھوٹے سے مضمون میں لوازیے کے کارناموں کا ذرا بھی تفصیل سے ذکر کرنا ممکن نہیں۔ لیکن کیمیائی تحقیقات کی ایک خاص شاخ ہمارے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اس نے تنفس (Respiration) حیوانی حرارت اور غذا میں رشتہ دریافت کرنے کی ابتدا کی۔ اور علم غذائیات کی بنیاد رکھی۔ ہمارا جسم ایک کل کی حیثیت رکھتا ہے جو غذاؤں کے ملنے سے توانائی حاصل کرتا ہے۔ آجکل یہ کوئی نیا خیال نہیں سمجھا جائے گا لیکن ۱۷۸۰ء میں یہ اتنا صریحی امر نہیں تھا۔ غذا ہمارے جسم کو تقویت دیتی ہے اور تر و تازہ کرتی ہے۔ لیکن کیسے؟ تنفس حیات کے لئے لازمی ہے۔ مگر کیوں؟ ۱۷۸۶ء سے پہلے سائنس دانوں کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس سے پیشتر ارسطو۔ رابرٹ ہک (R. Hook) سٹاہل (Stahl) اور اس کے شاگردوں بلکہ لوازیے کے ہم عصر پریسٹلے (Priestely) نے ان سوالوں کو حل کرنے کی ناکام کوششیں کی۔ لیکن لوازیے نے اپنے تاریخی تجربات سے بلا خوف تردید ثابت کر دیا کہ احتراق اور تنفس کے عملوں میں حیاتینی ہوا (Vital Air) یعنی آکسیجن جذب ہو کر ثابت ہوا (Fixed Air) یعنی کاربن ڈائی آکسائڈ بنتی ہے۔ ثابت ہوا پہلے پہل سکاٹ لینڈ کے باشندہ کیمیا داں بلیک (Blake) نے دریافت کی۔ لیکن لوازیے نے اس کی کیمیائی تشریح سے ثابت کر دیا کہ یہ گیس کاربن اور آکسیجن سے مرکب ہے۔ اس دریافت نے کیمیا اور فزیالوجی (عضویات) میں گہرا رشتہ پیدا کر دیا۔

لاپلیس (Laplace) مشہور فرانسیسی ریاضی داں ان تجربوں میں لوازیے کے ساتھ ساتھ کام کرتا رہا۔ غالباً کیمیائی مساوات کے حل اور حساب کی پیچیدگیوں میں اس سے بہت مدد ملی ہوگی۔ ایک خاص قسم کا حرارہ پیما (Calorimeter) بھی جو ان تجربوں میں استعمال ہوا۔ لاپلیس کی ایجاد ہے۔ تجربات پہلے پہل امریکی چوہوں (Guinea Pigs) پر کئے گئے۔ بعد ازاں جب انسانوں پر تجربہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو خطرہ جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک سائنس داں سگیوں (Siguin) نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس تحقیقات کا مفصل حال ۱۷۸۹ء کے پیرس اکیڈمی کے تذکروں (Memoirs) میں چھاپ دیا گیا۔ میڈم لوازیے کے بنائے ہوئے دو زور دار مرقعے ابھی تک موجود ہیں۔ جن میں تجربہ خانہ کی وہ تصویریں بنائی گئی ہیں جب یہ تجربات جاری تھے۔ پنسل کا

کا ایک نقاب بھی جو ان تجربات میں استعمال ہوا - ابھی تک میڈم لوازیے کے خاندان کے لوگوں کے قبضے میں ہے - یہ تحقیقات سائنس کو لوازیے کا آخری ہدیہ تھی - آنے والے سال بڑی کشمکش میں صرف ہوئے - تجربہ گاہ کی پر امن خاموشی اور سکون قلب اسے پھر نصیب نہیں ہوا - انقلاب فرانس کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا جس کے لیڈروں کا بقول کافن ہال (Coffinhal) سائنس والوں کی ضرورت ہی نہیں تھی -

۱۷۹۱ء کے درمیانی مہینوں میں اپنے طبقے کے دوسرے فرانسیسی شہریوں کی طرح اسے اپنا راستہ مشکلوں اور خطروں سے بھرا ہوا نظر آنے لگا - اس نے تمام سرکاری تنخواہ والی ملازمتوں سے پیچھا چھڑا لیا - دارالخلافہ کی گڑبڑ اور ریشہ دوانیوں سے دور امن کی زندگی بسر کرنیکی غرض سے وہ اپنی زمینداری پر چلا گیا - ۱۷۹۲ء کا موسم سرما اور خزاں میاں بیوی نے وہیں بسر کئے - ۲۷ جولائی ۱۷۹۲ء کے دن انقلابی گیت گاتے ہوئے پیرس میں داخل ہو گئے - بادشاہ اور اس کے خاندان کے لوگ گرفتار کر لئے گئے - بندوبست کے لئے ایک منتخب مجلس قائم کر دی گئی - لوازیے کا پرانا رقیب کیمیا داں مرات (Marat) تھی جو اسپر کئی الزام لگا چکا تھا - اور اس کی سائنسی تحقیقات کا سخت نکتہ چیں تھا - اس انقلابی حکومت کا ایک سرکردہ رکن تھا - ملک میں جمہوری حکومت کا اعلان کر دیا گیا - تمام سرکاری ادارے اور ایسے ادارے جن کا تعلق امرا سے تھا توڑ دے گئے، یہاں تک کہ اکیڈمی آف سائنس بھی اس طوفان سے نہ بچ سکی - اور اس کی جگہ "ترقی سائنس کی آزاد مجلس" قائم کر دی گئی - پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ لوازیے فارمر زجنرل کا ایک سرکردہ رکن تھا ٹیکس دینے والی عام پبلک کی نظر میں یہ کمپنی کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی - کمپنی کے حساب کی جانچ پڑتال کے لئے ایک کمیشن بنا دیا گیا - اور ممبروں کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا گیا - لوازیے کو جلد ہی ان واقعات کی خبر مل گئی - دو روز تک وہ بڑے اضطراب کی حالت میں لووَرے (Louvre) کے گرد سے اٹے ہوئے کمروں میں اس حکم کی تنسیخ کے لئے ہاتھ پیر مارتا رہا - اور اپنی قسمت کے فیصلہ کا بیقراری سے انتظار کرتا رہا - ان کمروں میں مدت سے اسکے متروک اور گرد آلود آلات پڑے ہوئے تھے - اور یہی وہ کمرے تھے جہاں ملک کے مانے ہوئے سائنس والوں کے سرگروہ کی حیثیت سے اسے اپنی پے در پے کامیابیوں پر خوش ہونے کا موقعہ ملا تھا - یقیناً یہ اس کی زندگی کے تلخ ترین لمحات ہونگے - تنسیخ حکم کی تمام درخواستیں نامنظور ہو گئیں اور ۲۸ نومبر کو اسے گرفتار کر کے پورٹ لبرے کے جیل خانے میں بند کر دیا گیا - میڈم لوازیے کے باپ جیکیس پالزے اور ۲۷ دوسرے فارمرز کو بھی اسی وقت حراست میں لے لیا گیا تھا - میڈم لوازیے اپنے خاوند کی رہائی کے لئے دوڑ دھوپ کرتی رہی - کبھی سرکاری افسروں سے ملتی کبھی جیل میں ملاقات کیلئے پہنچتی - اور کبھی اپنے غم زدہ اور گرفتار بلا خاوند کو دلاسے کے خط لکھ کر اس کا حوصلہ بڑھاتی - گرفتاری کے چند ہی روز بعد یہ پریشان کرنے والی خبر مشہور ہو گئی کہ فارمرز کے حساب میں کروڑوں روپے کا غبن نکلا ہے - اس خبر سے قیدیوں کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی - ۸ مئی کے دن ملزموں کو انقلابی عدالت کے سامنے پیش کر دیا گیا - لوازیے نے اس بنا پر مہلت پندرہ دن کی مانگی کہ وہ تنفس پر ایسے تجربات میں مشغول ہے جن سے بنی نوع انسان کو بہت فائدہ پہنچنے کی امید ہو سکتی ہے - کہا جاتا ہے اس کے جواب میں کافن ہال نے جو انقلابی عدالت کا صدر تھا ارشاد کیا کہ جمہوری فرانس کو عالموں کی کوئی ضرورت نہیں اور محض رسمی کارروائی کے بعد لوازیے اور اسکے ساتھیوں کو ملک کے خلاف سازش کے الزام میں سزائے موت دیدی گئی - اور گلوٹین سے ان سر کاٹ دیا گیا - اس وقت لوازیے صرف اکیاون برس آٹھ مہینے کا تھا - اگلے ہی دن لے گرانج نے کہا - لوازیے کا سر کاٹنے میں تو شاید ایک منٹ بھی نہ لگا ہو گا - لیکن سینکڑوں سال میں بھی اسکے برابر انسان پیدا ہونا مشکل ہے -

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بیجو سائیں

افسانہ

دیا شنکر نسیم

وہ تونبی بجاتا نکلتا تھا۔ اس کے کندھے پر بہنگی رکھی ہوتی جس کے دونوں سروں سے گیروئے رنگ کی رسّی سے بندھی بانس کی دو پرانی پٹاریاں لٹکتی رہتیں، پٹاریاں پرانی ہوگئی تھیں اور اس بات کا صاف پتہ دیتی تھیں کہ ان کے اندر کی زیادہ چیزیں عمر میں ان پٹاریوں سے کم نہ ہوں گی۔ تھی بھی یہی بات: جب کچہری کے چوراہے کے قریب موٹے تنے والے نیم کے پیڑ کے نیچے وہ کندھے سے بہنگی اتار کر رکھتا اور آگے والی پٹاری کے اندر سے مٹی کی بھدّی بھدّی دو ہنڈیاں باہر نکالتا اور ان کے اوپر کا بندھا ہوا کپڑا تونبی بجا بجا کر کھولتا، تو ان میں سے نکلتے پھن پھیلائے ہوئے کالے بھیانک پرانے سانپ۔ تونبی کی آواز تیز ہونے لگتی اور کالے اپنا اپنا پھن اتنا پھیلا دیتے کہ ان پر جو کنجی کا نشان بنا ہوتا صاف دکھائی دینے لگتا۔ اتنا ہی نہیں، کبھی وہ ان کو گلے میں ڈال لیتا، کبھی باہوں سے لپیٹ لیتا اور ان سے نہ جانے کیسے کیسے اشارے کرتا۔ تماشہ ختم کرتے کرتے سب سے پرانے کالے ناگ کو چمکار کر کہتا "کچھت راج، بھیا، جاؤ، مالک لوگ، مائی لوگ، بابا لوگ سے انعام لے لو"۔ اپنی مزدوری کے حقوق پیش کرنے کا یہ بظاہر بہت ہی سیدھا سادا اور رائج طریقہ تھا، مگر اصلی مطلب یہ تھا کہ کچھت راج تم نے اور تمہارے چند قیدی بھائیوں نے محنت کی ہے۔ ناچے ہو، اور اپنی عریانی کی نمائش کرکے اہل تماشہ کے لئے تفریح کا ذریعہ بنے ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ تم اس کی اُجرت و محنت نہ وصول کرو، اور اگر یہ بات ہے کہ تم تو ایک کیڑے ہو، تمہاری کیا اجرت، تو میری تو ہے۔ میرے دامن سے خالی تمہیں نہیں بلکہ ایک اور ہستی بھی وابستہ ہے۔ اور اس وقت وہ خیال کرتا کہ کیا وہ ناگن جو اس کے پیچھے کی پٹاری کے اندر کی رنگین والی ہنڈیا میں بھربھری مٹی کی تہ پر سوئی ہے جو راہ کے اس پار کھنڈی سڑک کے کنارے رہنے والی حسین کنواریوں سے کسی حالت میں کم خوبصورت ہے۔ ناگن کا ملگجا رنگ، پھن کے پاس نیلی نیلی بوٹے دار دھاریاں۔ جیسے ندی کے کنارے بنفشہ پھولا ہو۔ وہ یہ سوچ کر فخر سے گردن بلند کر لیتا اور تڑپ کر کہتا "دیر ہو رہی ہے۔ مالک لوگ، مائی لوگ، بابا لوگ، جو دینا ہو جلدی دو، دودھ لینا ہے، پلانا ہے، ناگن بھوک سے تلملا رہی ہے"۔

اور تب جلدی جلدی اس کے گرد انگوچھے پر گرنے لگتے، پائیاں، پیسے، ادھنے۔ اس طرح کچھ نہ کچھ ہر ایک دے ہی گذرتا۔ کوئی اس کی تونبی کا خیال کرکے، کوئی اس کے غضبناک سنجیدہ چہرہ کا، کوئی اس کی گھنی سیاہ ڈاڑھی کا، جو کہ اس کی صحیح عمر کا تخمینہ نہیں لگانے دیتی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا، پیسہ دیتے وقت چند یار باش موقع تاڑتے رہتے اور یار لوگ کہہ بیٹھتے "بھائی، بیجو سائیں! اکھڑے اکھڑے تو گھٹنے درد کرنے لگے، محنت وصول ہو جائے اور پیسہ بھی"۔ ان کے نزدیک گویا بیجو سائیں نے ابھی پورا حق نہیں ادا کیا۔ بیجو تھا کہ اتنا سنتے ہی جیسے تلملا سا اٹھتا۔ آنکھیں پھاڑ کر تونبی پٹاری کے پاس سے اٹھاتا اور ایسی پھونک پھونکتا —— خدا کی پناہ!! قہر ہو جاتا۔ چہرہ پر خون دوڑ جاتا، مگر تونبی کی دھن تھی کہ سامعین کی رگ رگ میں پیوست ہوتی جاتی تھی، لوگ مبہوت، ساکت، بادلوں کی طرح کھڑے نظر آتے۔ بیجو دو چار ٹھمر میٹھے میٹھے بجا کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر کیا کہنا، یہ عالم عجیب ہوتا۔ تونبی کی آواز ہمہ درد ہوتی، سامعین کی پلکیں نم آلود ہو جاتیں۔ شاید ہر ایک کو اپنے بیتے ہوئے دنوں کے تلخ تجربے یاد آجاتے!

یہ تھے بیجو سائیں۔ کوئی بھی سائیں قرب و جوار میں اتنی محبت سے تماشہ نہ کرتا تھا۔ ظاہر ہے اس انداز سے بیجو سائیں کا دن بھر میں صرف ایک تماشہ، صرف ایک بیٹھک ہوتی اور پھر وہ اپنی کمائی بٹور کر سیاہ رنگ کے ایک بٹوہ میں رکھ کر بہنگی اٹھا کر چلتا۔ کچھ ہمدرد لوگ اس کے چلتے چلتے کہہ اٹھتے، "ارے بیجو سائیں، کافی تو پا گئے ہو، دو چار پیسے کا کچھ لے کر پانی پی لو۔ ٹھیک دوپہریا میں آئے ہو، گھر پر تو کچھ پکا نہ رہا ہوگا، انتڑیاں سوکھ گئی ہوں گی"۔ بیجو یہ سن کر نہایت سخت بننے کی کوشش کرتا اور بظاہر ایسی تکلیف کا اظہار کرتا جیسے کوئی اس کے ذاتی معاملہ میں دخل دے رہا ہو، اور منہ بنا کر کہتا، "اوہو، یہ نہ ہوئی بابا۔ جس کی رقم ہے، اس کے ہاتھ میں جائے گی۔ ستر بتیا ایک ایک کچا پیسہ گنتی ہے"!۔

ستر بتیا بیجو سائیں کی بیوی تھی، اس کے کوئی اولاد نہیں تھی، ستر بتیا کا نام لیتے ہی بیجو کے تھکے ہوئے بدن میں پھریری سی آجاتی اور وہ مصمم ارادہ سے قدم اٹھا کر آگے بڑھتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ لڑکے کھیل دیکھ لیتے، پیسہ پاس نہ ہوتا، گھر جاتے، ماؤں، بہنوں سے ضد کرتے۔ حجت کرتے، پیسہ ملنے میں دیر ہو جاتی۔ جلدی جلدی دوڑ کر راستہ میں بیجو کے پاس سے گذر کر کہتے، "بیجو بابا یہ لو"۔ بیجو اپنا قدم نہ روکتا اور چلتے چلتے کہہ دیتا، "راجہ لوگ، یہ مجھ سے نہ ہوئی۔ میں خیرات نہیں لیتا، جب تماشہ تمہارا ہوتا تھا، اس وقت جو دے دیتے لے لیتا۔ اب پھر کبھی تماشہ دیکھ لینا دے دینا۔ لے لوں گا"!

اس وقت بیجو کے منہ سے ایمانداری کا سبق سن کر لڑکے سوچ میں پڑ جاتے۔

(۲)

شہر سے ہٹ کر جہاں آبادی ختم ہوتی تھی، ڈھاک، ببول اور روس کا جنگل شروع ہوتا تھا۔ سڑک پر سے نگاہ ڈالنے سے چند سرکی کے نربال تنے ہوئے پیڑوں کے بیچ میں سے دکھائی دیتے تھے۔ یہ تھی نقیروں، سائیوں، خانہ بدوشوں کی چلتی پھرتی بستی۔ ان لوگوں میں سے کوئی سل

کوٹتا، چکی کا پاٹ بناتا، کوئی ریچھ اور بندر کا ناچ دکھاتا، کوئی جڑی بوٹیاں کھود کر نکالتا اور بیچتا، کوئی پرانے مینڈکوں کے گلے سے زہر مہرہ نکالتا، کوئی کان کی بیماریاں اچھی کرتا، کوئی سینگی لگاتا۔ غرضیکہ ان خانہ بدوشوں کے ہر فرد کا ایک الگ پیشہ تھا۔ دن بھر یہ بستیاں اجاڑ رہتیں اور شام کو یکایک ان میں زندگی پھوٹ پڑتی۔ چولہے جل جاتے اور جنگلی لکڑیوں کے کوئلے کی آنچ میں موٹی موٹی روٹیاں سینکی جانے لگتیں۔ خاص خاص تیوہاروں کے دن بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو بھی ان عارضی آبادیوں سے اٹھ کر ہوا میں پھیل جاتی۔ یہاں دس بارہ ایسے خانہ بدوش لوگوں کا خاندان آباد تھا جس میں سے بیجو سائیں کہنے کے لئے ان سب میں پرانے تھے۔ سب سے پہلے بیجو یہاں آکر مقیم ہوا تھا کیونکہ شربتیا، بیجو کی بیوی کو یہ مقام کچھ پسند آگیا تھا اور بیجو جب کبھی دوسرے خطے، نگر، بستی کی طرف نکل چلنے کے لئے کہتا تو شربتیا جھنجھلا کر کہتی "جنم بھر اِدھر اُدھر گھومو گے کہ کہیں ٹھہر کر دم بھی لو گے"۔ بیجو یہ سن کر چپ ہو جاتا اور اس جنگل کو اپنی میراث سمجھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ بیجو نے یہاں کے پانچ چھ مہینے کے متواتر قیام میں جنگل کی ایک ایک بیل دیکھ ڈالی تھی اور یہاں کی اگنے والی ایک ایک جڑی بوٹی سے اپنے کو واقف کر لیا تھا۔ بیجو کے پاس سانپ کے کاٹے کی متعدد جڑی بوٹیاں تھیں۔ اور شربتیا کا کیا کہنا، وہ اپنے کو اس بن کی رانی سمجھتی تھی، اس جنگل کے تنومند ساکھو کے پیڑوں کی چھاؤں میں اس کے شانے دن بدن سڈول ہو رہے تھے جنگل کی مدماتی ہوائیں اس کے روپ اور جوانی میں نشہ بھر رہی تھیں۔ اس کا افلاس خانہ بدوشی اور غربت کی منزلوں کو طے کر کے فارغ البالی کی سنہری وادیوں میں قدم رکھ رہا تھا۔ اب اس کا مزاج آرام طلب ہونے لگا تھا۔

(۳)

اب بیجو کو قصے کہانیاں بھی سوجھنے لگی تھیں۔ دن بھر کا تھکا ماندہ جب کھانے پر بیٹھتا تو شربتیا کو راستے کی سنی ہوئی خبریں سناتا۔ جوئے میں کون کون لوگ پکڑے گئے، شہر کے کوتوال کمشنر بہادر کے یہاں کھانا کھانے گئے تھے۔ ناکہ کے سامنے خون۔ بھرے بازار میں ایک گوالن عورت پتھر والی حویلی کے کنوئیں میں گر پڑی۔ شربتیا اس پر تعجب کے ساتھ پوچھتی، کیا وہ اندھی تھی؟ اٹھایا ہوا نوالہ بیجو کے ہاتھ میں رہ جاتا اور کہتا، "وہ تو نہیں اندھی تھی، پریم اندھا تھا" یہ کہہ کر بیجو نوالہ حلق کے نیچے اتار کر شربتیا کی شربتی آنکھیں دیکھنے لگتا، کچھ سوچتا اور من ہی من میں دہراتا "پریم اندھا ہوتا ہے"۔ اسی درمیان میں اس کی انگلیاں سینی میں جنگلی آموں کی چٹنی پر پڑ جاتیں۔ چٹنی زبان سے لگتی اور بیجو شربتیا کی شخصیت کا دل ہی دل میں جائزہ لیتا کہ یہ عورت اتنی تیز چٹنی بنا سکتی ہے جو تھکے تھکائے جسم میں دوا والی سوئی کا کام کرتی ہے۔ بیجو چٹنی چاٹتے ہی جلدی جلدی کھانے لگتا۔ اتنے میں شربتیا الھڑ طریقہ سے بھوں سکوڑ کر کہتی "پریم اندھا ہوتا ہے، ہاں، مجھ سے کوئی کہے کہ ہیں کنوئیں میں کود پڑوں۔ ایسی تیسی۔

کہنے والے کے سینہ پر ایسا پتھر رکھ دوں کہ سانس نہ آئے۔ بڑے چلے ہیں"۔ بیجو اتنی دیر میں کھا چکتا اور شربتیا کی باتیں سن کر پانی سے بھرا پورا تسلا پی جاتا۔ شربتیا یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگتی اور موضوع بدلنے کے لئے پھر آواز سنبھال کر کہتی، کتنے دن سے رٹ رہی ہوں کہ وہ کنول کا پھول بنی ہوئی ٹکلی لیتے آنا، مگر تم ہو کہ تماشہ دکھا کے بازار سے بھوت کی طرح بھاگتے ہو۔ دیکھتے ہو پڑوس میں شمشیر بندریا والے کو، اپنی دلہن رجیا کے لئے وہ سہرے لایا ہے، نہ تو نہ بھی تو جاتی رہی، اب آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے گی۔ نہ بھی بڑھی تو رجیا کی آنکھوں میں سرمہ مزا نہ دے جائے گا۔ بیجو کو اس وقت برما سے آئی ہوئی اس بنگالی جوان لڑکی کا چہرہ یاد آجاتا، جو اس کے تماشہ کو کل بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی، کیسی اچھی لڑکی تھی وہ۔ اس نے بیجو کو ایک دونی نکال کر دی تھی۔ بیجو دعا مانگتا۔ اس کو اچھا بر ملے۔

(۴)

شربتیا کبھی کبھی دل بہلانے کے لئے جنگلی بیروں کے جھرمٹ سے نکل کر پاس والی سڑک پر جو کہ فوجی لاریوں کے چلنے کے لئے نئی نئی نکالی گئی تھی، آجاتی۔ موٹروں کی قطاریں کی قطاریں اس سڑک سے گزرتیں۔ وطن سے انجان جگہ بھٹکے ہوئے، تنہائی زدہ فوجیوں کی نظریں دور سے شربتیا کے گداز جسم پر پڑتیں اور دھواں دھار غبار میں سب سے پیچھے والی لاری کی رفتار کم ہو جاتی۔ چندن سنگھ ڈرائیور کہتا، "گوری کو یہیں آکر کھڑا ہونا تھا"۔ دانی سنگھ کہتا، "یہ جنگل کی ہرنی معلوم ہوتی ہے، دیکھو نہ اس کی زنہار آنکھیں!" فقیر سنگھ کہتا "ارے مجھے بہت تجربہ ہے، انہیں رقم دو تو کچھ نہیں، ورنہ ان کی کمر میں تیز چاقو چھپا رہتا ہے۔ کسی نے چھیڑا نہیں کہ انھوں نے وار کیا، اور یہ فوراً ہی شور مچاتی بھاگتی ہیں، مار ڈالا، مار ڈالا۔ جان کی جان لیتی ہیں اور ایک زحمت الگ کھڑی کر دیتی ہیں، آج تک مجھے سیالکوٹ کا واقعہ بھولا نہیں"۔ کومل سنگھ ان کا غنچہ کہتا "بہت دیکھا ہے میں نے، روکو۔ ذرا دو دو بات تو کر لیں۔ پیاس بھی تو لگی ہے"۔ موٹر رک جاتی، کومل سنگھ اترتے اور ایسا منہ بناتے کہ گویا کئی دنوں کے پیاسے ہیں۔ شربتیا کے قریب گذر کر پوچھتے "اری، کہیں کوئی کنواں بھی ہے، چلتے چلتے تو یہ حال ہو گیا ہے!" شربتیا جیسے سنی ان سنی کر دیتی۔ کومل سنگھ تب آواز بھاری بنا کر پوچھتے، کہاں ہے کنواں، پیاس کے مارے دم نکل رہا ہے، چھاگل کا پانی تو ابل رہا ہے"۔ شربتیا مسکرا کر کہتی "سڑک تو بنوا دیتی ہے تمہاری سرکار، کنوئیں کا انتظام نہیں کرتی! آئے ہیں ٹھنڈا پانی پینے۔ جس کے لئے جان دیتے ہو مانگو نہ اس سے ٹھنڈا پانی"۔ یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ فقیرے سنگھ کی بندوق پر پڑتی اور وہ سنبھل سی جاتی "سپاہی ہو۔ آؤ۔ آؤ۔ پانی پی لو۔ بڑی گرمی ہے سچ مچ!" اور وہ جنگل کی پگڈنڈیوں کی طرف اشارہ کر کے بڑھتی۔ کومل سنگھ ساتھیوں سے درخواست کرتے، "بھائی جان، واقعی بہت پیاس لگی ہے ورنہ کیا اس کے پیچھے دوڑتے۔ لاؤ چھاگل، تمہارے لئے بھی ٹھنڈا پانی بھر کر لیتا آؤں۔ فقیرے سنگھ کہتا "جلدی" کومل سنگھ پیچھے مڑ کر جواب دیتا "ارے، ابھی ابھی"۔

(۵)

ایک دن بیجو کو شہر سے آنے میں دیر ہوئی۔ اس دن کچہری میں کسانوں کی بھیڑ لگی تھی۔ پانی بہت برس گیا تھا، ان کی دھان کی فصل سڑ گئی تھی۔ کسان دھان کی پیڑیاں لے کر ڈپٹی کمشنر صاحب کو دکھلانے آئے تھے کہ شاید اس سے لگان میں کچھ معافی ہو جائے۔ کسان لوگ کچہری سے لوٹ رہے تھے کہ بیجو کی نوبنی کی دلکش آواز کانوں میں آئی، مجمع کا مجمع ادھر رجوع ہو گیا۔ منسکھ چودھری نے کہا "بھیا، کھیتی تو ناس ہو گئی، جو ہونا تھا ہو چکا۔ گھڑے گھڑے سائیں کا بھی تماشہ دیکھ لیں" اور اس طرح آج بیجو کو پانچ چھ روپے کے پیسے مل گئے، دل مالا مال تھا، سوچ رہے تھے کہ شربتیا کی تقدیر سے ملے۔ چلو، بازار ہوتے چلیں۔ بازار میں جا کر شربتیا کے لئے کنول کی پھول والی ٹکلی لی۔ پھر تھوڑا سا ٹونی رنگ کا سیندور۔ شربتیا کی کالی کالی لٹوں کا خیال کر کے ایک چوٹی بھی لی۔ چوٹی لیتے وقت جنگل کے سبزہ زاروں کی فضا دماغ کے سامنے ناچ گئی، چوٹی سبز رنگ کی لی۔ یہ لے کر گذر رہے تھے کہ بکر قصاب کی دوکان سامنے ملی، تازہ گوشت ہوا تھا ایک کلیجی لی اور پھر دو تین سیاہ رنگ کی ہنڈیاں۔ آج بیجو واقعی بہت خوش تھا۔ حلوائی کی دوکان سے گذرے تو پاؤ بھر دودھ خریدا۔ آج ناگن کو دودھ ضرور دینا ہوگا۔ پٹاری میں وہی لکشمی تو ساتھ تھی جس کی بدولت آج بیجو اتنے دھن کے مالک ہوئے، ورنہ ہیں تو اور بھی سائیں گلی گلی بھیک مانگتے ہیں۔ بیجو آج اپنے کو ایک بھاری وکیل سمجھ رہا تھا۔ اس نے بچپن میں سنا تھا کہ بھاری وکیل دن بھر میں صرف ایک مقدمہ کرتا ہے اور اسی میں اپنا سارا ہنر خرچ کر کے جیبیں بھر لیتا ہے۔ چراغ جل گئے تھے بیجو تیزی سے قدم رکھتا ہوا سوچتا چلا جاتا تھا کہ آج شربتیا کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ کچھ پوچھے گی تو بولوں گا نہیں۔ بہت طعنہ دیتی تھی کہ شمشیر بندریا والے اپنی دلہن کے لئے سرمہ لائے۔ سرمہ لگائے رجیا بڑھیا۔ شربتیا باندھے گی چوٹی۔ چوٹی دھانی رنگ کی، برما والی بنگالی لڑکی کی طرح۔ اب بیجو شہر کے اونچے اونچے دو طرفہ مکانوں کو چھوڑ کر صاف سڑک پر آ گیا تھا۔ چاندپوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا۔ بیجو کو سڑک دور پر دودھ کی نہر کی طرح بہتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اب وہ بہنگی رکھے ہوئے متوازن قدم رکھتا جا رہا تھا جنگل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اس کو لگ رہی تھی اور پگڈنڈی قریب آ گئی تھی۔ راستہ کا ہر موڑ دور سے چمک رہا تھا دوسرے موڑ پر کنوئیں کی جگت کے پاس دو پرچھائیاں بیجو کو نظر آئیں۔ یہ بیجو کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس جنگل کے ہر منظر سے وہ روشناس ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا ضرور بالضرور ان دو پرچھائیوں میں سے ایک رجیا کی ہے۔ آنکھوں میں سرمہ تو انہیں راتوں کے لئے لگاتی ہے! اب بیجو کنوئیں کی جگت کے پاس سے گذر رہا تھا، پرچھائیاں ہٹ کر قریب جھاڑی کے جھرمٹ میں جا چکی تھیں۔ بیجو سوچ رہا تھا کہ جھاڑیوں کے پاس سے کترا کے گذر جائے گا مگر دماغ نے کہا نہیں، آج رجیا کی آنکھوں میں سرمہ کی بہار دیکھ لے۔ بیجو سے رہا نہ گیا، یکبارگی نگاہ سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ شربتیا کی بانہیں کومل سنگھ کے گلے میں تھیں اور کومل سنگھ کہہ رہا تھا۔ "تیری ہستی اس جنگل میں بند ہے"! بیجو کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ گویا اس نے ٹکلی اور سیندور کے دام تو دے دئے ہیں مگر وہ ان چیزوں کو دوکان ہی پر بھول آیا ہے۔ اب وہ الٹے پاؤں جا رہا تھا۔ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔ چلتے چلتے یکایک خیال آیا، ناگن بہت دیر سے بھوکی ہے۔ بہنگی زمین پر اتار کر بیجو بیٹھ گیا۔ ہنڈیا میں سے دودھ نکال کر پیالہ میں ڈالا۔ پھر پیچھے کی پٹاری سے ناگن والی ہنڈیا کھولی۔ ہنڈیا کھولتے ہی بیجو کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہے۔ ناگن غائب تھی اور اس ہنڈیا میں صرف ایک کیچلی پڑی تھی۔ دودھ کا پیالہ بیجو کے ہاتھ میں ویسا کا ویسا ہی رہ گیا۔

"بیوہ" —— رعنا اکبرآبادی

ادھ کھلا اک پھول مرجھایا ہوا
چودھویں کا چاند گہنایا ہوا

آرزوؤں پر بلا آئی ہوئی
زندگی پر مردنی چھائی ہوئی

منہ چھپائے غم کے دامن میں شباب
چہرۂ روشن پہ حسرت کا نقاب

ضبط کی صورت گری کردار میں
درد کی واماندگی رفتار میں

سرنگوں بیدردیٔ تقدیر سے
رنگ سا اڑتا ہوا تصویر سے

شوق کے تیور پہ بل آئے ہوئے
ولولے دنیا سے شرمائے ہوئے

قوتیں نازو ادا کی راز ہیں
دل کی دھڑکن ماتمی انداز میں

ہر لطافت زیست کی سوئی ہوئی
فتنہ پرور آنکھ پر روئی ہوئی

ہر قدم پہ اک سماجی اشتباہ
آہ سے ملتی ہوئی اک اک نگاہ

عشرت آسودہ حالی کی حریف
بارِ غم سے مضمحل صنف لطیف

"چلتی پھرتی لاش اک انسان کی"
"یعنی بیوہ ارض ہندوستان کی"

نوٹ: رسالہ "آجکل" میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔
ریویو کے لئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے ورنہ ان پر کسی قسم کی رائے قلم بند نہیں کی جائے گی۔ —————— (ادارہ)

گجراتی میں نئے ادبی رجحانات

اکرام حسین خاں

شکست خوردگی، روحانیت، قنوطیت، واقعیت رجائیت، ان سب مراحل سے ادب اور آرٹ گذرا ہے اور اس وقت بھی گذر رہا ہے۔ ان کانٹوں سے، صرف اردو ادب اور آرٹ کا ہی شکار نہیں کھیلا گیا ہے۔ بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی انھیں کانٹوں سے ادبی مچھلیوں کا شکار کھیلا جا رہا ہے اور کھیلا جا چکا ہے۔ آجکل ملک کے ہر گوشہ اور ہندوستانی زبان کے ہر شعبہ میں ترقی پسندی اور رجعت پسندی کی نئی آویزش، اور نیا تصور کارفرما ہے۔ گجراتی میں بھی یہ نیا تصور اپنا رنگ لا رہا ہے۔

ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور چونکہ زندگی کا ہر لحظہ گریزپا، ہر لحہ انقلاب انگیز ہے۔ اس لئے کوئی ادب کو منجمد، ساکن یا کھڑا ہوا نہیں مان سکتا۔ ادب زندگی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اور اس بھاگتی ہوئی زندگی کا ہر وہ نقش جو ابھر کر نمایاں ہوتا ہے۔ ادب کا وسیع دامن اسے اپنا کر اور بھی واضح کر دیتا ہے۔ اور یہی وہ "ربطِ خاص" ہے جو ادب اور زندگی دونوں میں نت نئی تازگی و توانائی سمو دیتا ہے۔ انھیں وجوہات کی بنا پر میتھو آرنلڈ کے نزدیک ادب "تنقید حیات" ہے۔ اور جدید گجراتی ادب میں اس کی کارفرمائیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن ادب کا یہ تصور گجراتی شاعری اور افسانوی ادب پر زیادہ اثر انداز ہوا ہے۔ ناول اور ادبی تنقیدات نے بھی اس ضمن میں ترقی کی، لیکن نئی زندگی کے نئے تقاضوں کو جس خوش اسلوبی سے شاعری اور افسانوی ادب نے انجام دیا، ناول اور تنقید اس کی متحمل نہ ہو سکی۔

جدید گجراتی ادب نے ستائے ہوئے عوام، سلگتے شوق، پگھلتے دلولوں، جلتی امنگوں، رستے اور دکھتے ہوئے سرمایہ دارانہ ماحول کی پیدا کردہ "برکتوں" سے جنم لیا ہے۔ اس انقلاب کی دبی دبی سی چنگاریاں ۱۹۲۱ء کے گجراتی شاعر آکھا کے یہاں بھی معمولی سی کوشش سے کرید کرید کر نکالی جا سکتی ہیں۔

لیکن اب ۱۹۲۱ء کے فلسفی شاعر کی روحانی دنیا، "تصور" سرحدِ ادراک سے پرے ہو کر دھندلا اور مبہم ہو چکا ہے۔ اور اس کی جگہ مادی "مسجود" اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہے، دیارام کی دین دارانہ موسیقی بھی سرد پڑ چکی۔ اب تو انیسویں صدی کے شاعر نرماد کی ترنم ریزیوں سے عوام کے دلوں کے تار نئی زندگی، نئے کشف اور نئی فکر سے بھرپور جھنجھنا رہے ہیں۔

اس نئے سیلاب کو روکنے کے لئے گجرات میں ایک نیا ادبی گروہ پیدا ہوا۔ اس گروہ نے مغربی تہذیب و تمدن کے زیر اثر بڑھتے ہوئے خیالات و تصورات کی شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ لیکن جیسا اردو اور ہندی میں ہوا ہے بالکل ویسا ہی گجراتی ادب اور آرٹ میں ہوا۔ نئے گجرات کے نئے ادیبوں نے ان کے "پرانے بتوں" کو ذرا بھی عقیدت کی نظر سے نہ دیکھا، یہی نہیں، بلکہ ان پرانے بتوں کو توڑ پھوڑ کر نئے "دیوتا" تراشے۔ جن کے خد و خال مغربی بے راہ روی کے تراشے ترشائے مظہر ثابت ہوئے۔ نئی قدروں اور نئے زاویوں کی تلاش میں انھوں نے پرانی قدروں میں "جھلکتے ہوئے حسین و دلاویز خطوط" کو بھی مٹا دیا۔ انگریزی تعلیم اس قدر قوت اور زور کے ساتھ آگے بڑھی کہ اس نے گجرات کی تمام قدیم اور مقامی روایات کو ادب اور زندگی کے دائرے نکال دیا۔ سماجی رسم و رواج کا مضحکہ اڑایا گیا۔ اور گجرات کو "مغرب کا پیرایہ پوش" بنانے کی بلیغ کوشش کی گئی۔ بہرکیف یہ ادبی زندگی کا بحرانی دور تھا۔ اور ہر جگہ بحرانی دور میں اسی قسم کی کمزور اور ناپائیدار تحریکیں ظہور میں آئیں اور فنا ہو گئیں۔ گجرات میں بھی کم و بیش ایسا ہی ہوا۔

اس تحریک کا گجراتی ادب اور آرٹ پر صرف اتنا اثر ہوا کہ انگریزی کے اتصال نے گجراتی شاعری، ڈراما اور افسانوں کو فطری اور نیچرل مضامین سے روشناس کرا دیا۔ جس نے آئندہ چل کر کافی ترقی کی اور گجراتی کے فطری شاعروں میں ورڈز ورتھ کا فطری تعمق اور شیلی اور کیٹس کی نظر پیدا کی۔ گجراتی ادب کا یہ دور حالی، آزاد اور سر سید کے دور، سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ اور جس طرح ان کی ادبی کاوشیں اور کاہشیں سطحی، کمزور اور سرسری ہیں۔ اسی طرح، اس دور کے گجراتی ادیب بھی زیادہ تر کمزور اور سطحی ثابت ہوئے۔ اور ان ادیبوں کا گجراتی ادب اور آرٹ پر صرف اتنا ہی اثر ہوا کہ انھوں نے گجراتی ادب اور آنے والے گجراتی ادیب کے فکری وجدان کو بدل دیا۔ اور بہت جلد اس نام نہاد انقلابی دور کی جگہ اعتدال پسندوں نے لے لی۔ ان ادیبوں نے گجرات کی بے پناہ وسعتوں سے ملکی اور مقامی عناصر کو سمیٹ سمیٹ کر مغربی نظریات کے ساتھ اس طرح سمویا کہ ان کے ادبی کارناموں میں ہندوستانی جگنوؤں کی چمک پیدا ہو گئی۔ ان ادیبوں کے مسائل خالص ہندوستانی مسائل تھے۔ مثلاً "بیوہ کی زبوں حالی"۔ "عقد بکر"۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان ادیبوں نے ان ہندوستانی مسائل کو نئے زاویوں اور نئی کسوٹی پر پرکھا۔ اور ایک نئے اور انوکھے انداز میں پیش کیا۔ ان کے ادب اور شاعری نے گجرات کے "حسین کھیت"۔ حسین کھیتوں کو حسین و جوان کنواریوں سے سجا دیا۔ یہی نہیں، بلکہ ان کنواریوں کی مخصوص نفسیات کو اپنے مخصوص نفسیاتی رنگ میں تحلیل بھی کیا۔ اور ان کے جوان سینوں میں سوئے ہوئے مگر بیدار جذبات محبت کو افلاطونی رنگ میں پیش کیا۔ (بالکل یہی، ہندی میں پنتھ اور بچن نے بھی اپنی ابتدائی شاعری میں کیا۔) مگر بہت جلد اس کی جگہ محبت کے جنسی نظریات نے لے لی۔ اور محبت کو فرائڈ ہوے لوگ ایس

موپاسان، فلابیر، ڈی۔ اچ۔ لارنس جیمس جوئس کے فکر کی روشنی میں دیکھا جانے لگا۔

ماضی کے اس احساس لطیف نے ان اعتدال پسندوں سے "کھانڈ کاوُیہ" بیانیہ اور گیتوں کے رنگ میں عہد عتیق کی عظمتوں پر نظمیں لکھوائیں۔ ان نظموں میں رامائن، مہابھارت، کرشن اور رادھا، رام اور سیتا کے علاوہ ہندوستانی اولوالعزم حکمرانوں کی سطوت و شوکت، دلیری اور بہادری، حب الوطنی اور رعایا پروری کی داستانیں بھی موجود ہیں۔ "سرسوتی چندر" اسی زمانے کی کتاب، قابل قدر ادبی کارنامہ ہے۔ اس میں قدیم آریائی اور جدید مغربی تمدن کو اس طرح سمویا ہے کہ یہ پرانی حکایت، نئے دور اور نئی روشنی کے پڑھنے والوں کے لئے ایک نئی سی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ اور نئے دور کے پڑھنے والے کو اس کی موضوعاتی ثقالت کا مطلق احساس نہیں ہوتا۔

اس زمانے کی ادبی تحریرات میں مذہبی عقیدت کیشی کا رچاؤ مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ اور نرباد کا دور، اسی لئے بھگتی دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ "گووردھا نوم" کا دور گجرات کی قدیم تہذیب و تمدن کو محفوظ و برقرار رکھنے کے لئے مشہور اور نیک نام ہے۔ ان خیالات و احساسات کی روشنی میں، ہم گجراتی ادب کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(۱) ۱۸۰۶ء سے ۱۸۷۲ء تک۔
(۲) ۱۸۷۳ء سے ۱۹۱۵ء تک۔
(۳) ۱۹۱۵ء سے موجودہ زمانے تک۔

اس سی سالہ زندگی میں گجراتی ادب اور آرٹ نے جو اہم منزلیں طے کی ہیں۔ ان کا پس منظر یا عقبی فضا سمجھنے کے لئے، گجرات کی سی سالہ چلتی پھرتی زندگی نت نئے بدلتے ہوئے سیاسی، شعوری، فکری، معاشی، سماجی اور اقتصادی تحریکات کا سمجھنا ازبسکہ ضروری ہے۔ گاندھی واد کی ابتدا اور بورژوا جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ۔ پھر اجتماعیت، اشتراکیت، طبقاتی شعور، گرے ہوئے فلاکت زدہ، بے چارہ و مجبور عوام کے ساتھ خلوص اور ہمدردی کا اظہار، اس زمانے کی ادبیات کے خاص عنصر ہیں۔ "گووردھانوم" دور کے ادیب اپنی سنسکرت اور انگریزی استطاعت کی اپنی ادبیات میں نمائش کرتے تھے۔ برخلاف اس کے، اس دور کے ادیب بلند خیالات اور وقیع جذبات کو بھی سادگی اور صفائی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اس زمانے کے ادیب سادگی و پرکاری کے قائل ہیں۔ وہ سادگی و پرکاری جو ہمیں انگریزی میں سیسل ڈی لیوس ڈبلیو ڈبلیو گبسن، اردو میں اختر انصاری، عسکری اور عصمت، ہندی میں نرینر شرما، اور نرنکار دیو سیوک، بنگالی میں بدھ دیو کے یہاں ملتی ہے۔

ہر شاعر، فلسفی اور ادیب اپنے ماحول سے جنم لیتا ہے۔ باکلوتیش بھی اپنے ماحول کا زائیدہ تھا۔ اس نے اپنے ذہن و فہم کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اپنے ماحول کی تلخی کا جائزہ لیا۔ اور بہت جلد اس نے دیکھ لیا کہ وہ جس زندگی اور جس زمانہ میں سانس لے رہا ہے وہ یاس و ناامیدی، قنوطیت اور شکست خوردگی کے گہرے دھندلکوں سے گدلی ہو رہی ہے، اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس نے ان دھندلکوں کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنی مسلسل تلخ نوائی سے قنوطیت، یاس اور شکست خوردگی کے اس گہرے دھندلکے کے دامن کو چاک کر کے ایک نئے دور بیداری کے آغاز کا اعلان کیا۔ اس نے بورژوا نظام کی چیرہ دستیوں سے الجھ کر اس نئے ذہنی انقلاب کو اور زیادہ قوی بنا دیا۔

واقعیت پسند باکلوتیش کے بعد کنہیا لال مانک لال منشی کو ناول اور ڈرامے کے میدان میں ایک ادبی فن کار کی حیثیت سے بہت وقیع درجہ حاصل ہے۔ شاعری کے میدان میں نانالال دلپت رام کا کوئی مدمقابل نہیں۔ نانا نے حتی المقدور، اس دور کے نوجوان ادیبوں کے برخلاف، اس زمانے کی کسی نئی چیز کو قبول نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی اسلوب کے نئے پن کی وجہ سے ہم اسے جدید شاعری کا علمبردار مانتے ہیں۔ حالانکہ وہ نئی زندگی اور اس کی بدلتی ہوئی قدروں میں بحران و ہیجان سے مطلق آگاہ نہیں۔ اسی وجہ اس میں رجائیت اور فرار کی کیفیات زیادہ موجود ہیں۔

نوجوان ادیب موجودہ ہندوستان، خصوصاً گجرات، اس کے تمدن، اس کی بے چینی، اس کی تبدیلیوں سے بخوبی آگاہ ہے۔ بھوک سے بلکتے ہوئے بچے، پھٹے اور پرانے ملبوس میں لپٹی ہوئی زندہ لاشیں، فٹ پاتھ پر سسکتے ہوئے نادار، سرمایہ و محنت کی کشمکش، امتیاز رنگ و خون، تمیز بندہ و آقا، جگمگاتی ہوئی سڑکوں پر مصروف خرام دیویاں، ان کے مہین و باریک جھلکتے ہوئے ملبوس، دیکھ کر اس میں جمالیاتی اور انقلابی احساس کا ایک نیا تصور پیدا ہو گیا ہے۔ اور یہی جمالیاتی اور انقلابی احساس اور نیا تصور انہیں فرار اور رجائیت سے بچائے ہوئے ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو نئے رنگ میں دیکھتے ہیں۔ بحران کے نزدیک تھکے ہوئے دل کے لئے سامان نشاط ہی نہیں۔ اس میں تباہ کن اور مہلک اثرات بھی پوشیدہ ہیں۔ وہ ایسے خدا کے خلاف نہیں جو عوام کی تکالیف کا کوئی اثر نہیں لیتا۔ اس کا وہ یوں اظہار کرتے ہیں:۔

"مندر کی حسین چہار دیواری میں، پتھر کے سجے سجائے دیوتا پر
نغموں کی بارش ہو رہی ہے۔
اسی مندر کی چہار دیواری کے پیچھے ایک بڑھیا دم توڑ رہی ہے!
کیا یہ مرمر کا دیوتا،
اس بکھرتی ہوئی نغموں کی شہر ینی میں،
اس کی درد بھری آواز سن رہا ہے۔؟
نہیں —"

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

مرد

افسانہ

مصنفہ
محمود کامل

مترجمہ
صلاح الدین قریشی

آپ کیا بھوت پریت کے قائل ہیں؟
عباس بک ادھم جب حسب معمول اپنے پرانے دوست مصطفیٰ پاشا عبداللہ سے ملنے گئے تو پہلی بات ان کے منہ سے یہی نکلی۔

مصطفیٰ پاشا اس عجیب غیر متوقع سوال سے بوکھلا اٹھے اور کہنے لگے:

آخر آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہیں؟

بات یہ ہے کہ مجھے آج راستے میں ایک ایسے شخص کی روح نظر آئی ہو جسے میں خوب جانتا ہوں اور آپ مجھ سے بھی زیادہ اس سے واقف ہیں۔ اس شخص کو مرے ہوئے پورا ایک سال گزر چکا ہے۔ جب میں موٹر میں شارع عماد الدین سے چلا آرہا تھا اس کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ٹریفک کے سپاہی نے مجھے چوراہے پر روک رکھا تھا اچانک میرے سامنے سے سبز رنگ کی ایک بڑی سی موٹر گزری۔ یہ اسی انگریزی کمپنی کی بس تھی جس نے حال میں نئی گاڑیاں جاری کی ہیں۔ اسے وہی شخص چلا رہا تھا جسے ہم ایک سال سے مرا ہوا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ گہرے زرد رنگ کی وردی پہنے ہوئے تھا لیکن پھر بھی مجھے پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ میری چیخ نکلنے والی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اتر کر اس سے ملوں، لیکن وہ بس بجلی کی سی سرعت سے مع تمام مسافروں کے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ آپ سمجھے یہ شخص کون تھا؟

نہیں! میری سمجھ میں نہیں آیا۔

یہ آپ کا لڑکا منیب تھا!

اپنے دوست کا جواب سنتے ہی مصطفیٰ پاشا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ تعجب سے وہ بڑبڑانے لگے:

میرا لڑکا؟ .... منیب، میرا بیٹا؟

عباس بک اور قریب آ گئے اور ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سر ہلاتے ہوئے ذرا طعنہ آمیز لہجے میں کہنے لگے:

جی ہاں! آپ کا لڑکا منیب، مصطفیٰ پاشا! ۔ وہی لڑکا جس کے متعلق سوڈان سے کوئی اطلاع نہ ملنے کے بعد آپ سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ مر چکا ہے۔ وہی لڑکا جس کی آپ نے بڑی چھان بین کر کے مجھے یقین دلایا تھا کہ واقعی وہ مر چکا ہے اور مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں اپنی لڑکی قاسمہ کی شادی جہاں چاہوں کر دوں اس لئے کہ اب اس کا منگیتر اس دنیا میں نہیں ہے!

لیکن آپ کو یہ یقین کیسے ہوا کہ وہ منیب ہی تھا؟

میں اسی وقت کمپنی کے دفتر گیا اور وہاں دریافت کیا کہ ان کے ہاں کوئی منیب مصطفیٰ نامی شخص ملازم ہے؟ رجسٹر وغیرہ دیکھ کر مجھے بتایا گیا کہ اس نام کا ایک شخص ابھی حال میں ڈرائیور کی پوسٹ پر رکھا گیا ہے اور اسے پندرہ گنی ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ انھوں نے مجھے اس کا پتہ بھی دیا ہے ......"

یہ سن کر مصطفیٰ پاشا نے سر اٹھایا، ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دوست کے قریب آئے اور پوچھنے لگے:

آپ نے آخر پتہ کیوں حاصل کیا؟

آپ کو دینے کے لئے۔

میں اس کا کیا بناؤں گا؟

آپ اس سے ملنے کے لئے جائیں گے .... اپنے لڑکے سے ملاقات کرنے کیلئے۔

وہ میرا لڑکا نہیں ہے اور نہ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ گزشتہ سال مر چکا اور میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ مجھے اس لعنت سے نجات مل گئی۔ اب میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ وہ دوبارہ زندہ ہو کر میری زندگی حرام کر دے .... جو تکلیفیں اب تک مجھے اس سے پہنچ چکی ہیں بہت کافی ہیں"

آخر اس نے کیا بگاڑا ہے آپ کا جو آپ ایسا خوفناک انتقام لے رہے ہیں، جس میں باپ کی محبت کا شائبہ تک نہیں ہے؟

آپ خوب جانتے ہیں اس کے کرتوتوں کو ....! آپ کو خوب معلوم ہے میں نے اس کی تعلیم و تربیت پہ پانی کی طرح روپیہ بہایا، لیکن اس نے کبھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ اس کے لئے میں نے گھر پر استاد کا انتظام کیا اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ وہ برابر ہر امتحان میں فیل ہوتا رہا۔ آخر ایک دن مجھے اس کا راز معلوم ہوا۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ اواہی تواہی زندگی گذارتا ہے۔ راتیں شہر کے گندے اور ذلیل ترین بازاروں میں کالی کرتا ہے۔ شراب کا رسیا ہے اور اس کا نشہ کبھی نہیں اترتا۔ میں نے مایوس ہو کر تعلیم کا سلسلہ ختم کیا اور اسے گاؤں روانہ کر دیا تاکہ زمینداری کا کام سنبھال لے۔ خیال تھا کہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں وہ میرا ہاتھ بٹائے گا اور میری جگہ کام کرے گا۔ میں نے جو اس پر بھروسہ کیا تھا اس نے اس کی بھی کچھ پروا نہیں کی اور کاشتکاروں سے جو رقم ملتی رہی اسے اڑاتا رہا۔ یہی نہیں وہ ہمیشہ قاہرہ سے پیشہ ور عورتوں کو وہیں گاؤں میں بلا لیتا تھا اور خوب گلچھرے اڑاتا تھا۔ یہاں اسی طرح شرابیں پیکر اور عیاشی کر کے ساری ساری رات گذار دیتا تھا۔ آخر ایک دن وہ حادثہ رونما ہوا جس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا اور میری عزت دو کوڑی کی کر دی۔

ہاں! ہاں! وہ گولی چلنے کا حادثہ؟

جی ہاں! ... کیا آپ اسے معمولی حادثہ سمجھتے ہیں عباس بک! کیا آپ کو یہ نہیں معلوم کہ میں نے اس نالائق لڑکے کو بچانے کے خیال سے اپنی عزت تک بیچ دی؟ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ وہ دن کو تین بجے گاؤں سے موٹر میں روانہ ہوا۔ اس وقت اس نے شراب پی رکھی تھی۔ دو گھنٹے بعد وہ قاہرہ پہنچا۔ راستے میں بھی وہ شراب پیتا رہا، چونکہ شراب کی خالی بوتلیں موٹر میں موجود تھیں۔ اس کے بعد وہ نشے میں جھومتا اڈے کی طرف چلا۔ اپنی محبوبہ کو بعض دوسرے لوگوں کے ساتھ دیکھ کر اس نے پستول سے

فائر کیا اور گولی اس کی کلائی پر لگی ۔ ۔ ۔ یہ تمام باتیں رپورٹ میں میرے نام کے ساتھ درج کی گئیں ۔ آخر میں نے اپنی جان پر کھیل کر اسے جیل خانے سے بچایا، اور اس نے بڑی موٹی موٹی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلایا کہ آئندہ کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا ۔ ۔ ۔ لیکن یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے پھر شراب شروع کر دی ۔ ۔ ۔ ۔ اُف ! مجھے اب بھی جب اس رات کا خیال آتا ہے کانپ اٹھتا ہوں۔"

عباس بک کے دوست کے سینے میں جو طوفان امنڈ رہا تھا وہ خود بھی اسے محسوس کر رہا تھا ۔ اس نے مصطفیٰ پاشا کی کمر کو تھپکتے ہوئے کہا :

"ہاں ! ہاں !! مجھے بھی خوب یاد ہے ۔ اس دن میں قاسمہ کے ساتھ یہاں موجود تھا ۔ میرے سامنے ہی وہ لڑکھڑاتا ہوا گھر میں آیا تھا اور اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی ۔ مجھے اس کا شرمناک جواب بھی یاد ہے جو اس نے آپ کو دیا تھا اس نے کہا تھا : "آپ کون ہیں ؟ مجھے اختیار ہے جو میرا جی چاہے کروں !" لیکن آپ نے بھی اسے نہیں بخشا ۔ اسے دھکے دے کر نکال دیا اور پورے طور پر اسے عاق کر دی کہ آئندہ وہ ہرگز گھر میں نہ آئے اور نہ کبھی آپ کو اپنی صورت دکھائے ۔ ۔ اس کے بعد اس نے بارہا ملنے کی کوشش کی، لیکن آپ نے اسے ہمیشہ دھتکار دیا ۔ آخر وہ بیچارہ کچھ کام کرنے کے خیال سے سوڈان چل دیا ۔"

تو کیا آپ کے خیال میں مجھے اس کے علاوہ اور کچھ کرنا چاہیے تھا ؟

"۔ ۔ ۔ ۔ نہیں، بالکل نہیں ۔ ۔ ۔ لیکن کیا خبر اب اس کی وہ حالت نہ رہی ہو ۔

یعنی ؟

میرا مطلب یہ ہے کہ اب آپ کو اس کے پاس جانا چاہیے ملنے کے لئے !

مصطفیٰ پاشا نے بات کاٹی :

"پیارے دوست ! یہ ناممکن ہے ۔ ۔ ۔ میں تو اب یہی سمجھتا ہوں کہ وہ مر چکا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اب میرا کوئی لڑکا نہیں ہے ۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے ۔ وہ زندہ سلامت موجود ہے اور یہ آپ کو بھی معلوم ہے ۔ اصل میں یہ آپ کی خود پسندی اور فوجی سنگدلی ہے جو آپ کو ایسی بے رحمی کے ساتھ اسے مردہ تصور کرنے پر مجبور کر رہی ہے ۔"

نہیں، نہیں، اس میں بے رحمی کی کوئی بات نہیں ہے عباس بک ! میرا دل کبھی اس نافرمان لڑکے کی طرف سے صاف نہیں ہو سکتا جس نے میری زندگی حرام کر دی اور اس بڑھاپے میں میری عزت دو کوڑی کی کر دی ۔"

پہلے میں آپ کی یہ بات مان سکتا تھا، لیکن اب اس کے حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں ! ۔ ۔ ۔ ۔ اب وہ ایک اور ہی انسان ہے ۔ وہ اب صحیح معنوں میں مرد ہے، جو اپنی ذات پر بھروسہ کرتا ہے اور خون پسینہ ایک کر کے اپنی روزی کماتا ہے ۔ کون سمجھ سکتا تھا کہ ایسے لاڈ چونچلوں میں پلا ہوا منیب ایک دن مجبور ہو گا کہ قاہرہ کی سڑکوں پر کرایہ کی موٹریں چلاتا پھرے گا ۔ یقیناً اب اس کی حالت بدل چکی ہے ۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟

مصطفیٰ پاشا کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور انھوں نے عجیب دکھ کے ساتھ کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا ۔ پھر کہنے لگے :

ہاں ! ہاں، ہو سکتا ہے !

اگر آپ کو کچھ شک ہے تو اس کی خود تحقیق کرنی چاہیے ۔ یہ لیجئے ! یہ اس کا پتہ ہے جو مجھے کمپنی سے ملا ہے ۔

انھوں نے عباس بک کے ہاتھ سے پرچہ لے لیا اور پڑھنے لگے ۔ اچانک ان کے چہرے پر محبت کے جذبات جھلک اٹھے اور پوچھنے لگے :

منیب ! کیا سچ مچ وہ یہیں رہتا ہے ؟

عباس بک نے بھانپ لیا کہ بوڑھا باپ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ کہنے لگے :

مصطفیٰ پاشا ! میں بھی آپ کی طرح اولاد رکھتا ہوں ۔ اس طرح سنگدل بن کر جذبات کو گھونٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے ۔ آپ نے فوج میں پورے تیس سال گذارے اور آج اس درجے پر پہنچ چکے ہیں ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اس حد تک سخت اور بے رحم بن جائیں ۔ اب آپ کو کسی نہ کسی طرح اس سے ضرور ملنے جانا چاہئے ۔

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے ۔ اس نے اپنی کمزوری چھپانے کے خیال سے پہلے تو پرچے کو انگلیوں میں مسلنا شروع کیا اور پھر اپنے دوست کی طرف سے پیٹھ موڑ کر کھڑکی کی طرف چلا ۔ اس وقت وہ بڑبڑا رہا تھا :

میرا بیٹا ۔ ۔ ۔ ۔ کون ہے میرا بیٹا ؟

عباس بک نے کمرے سے نکلتے ہوئے جواب دیا :

آپ کا لڑکا منیب ! اگر اس کے لئے نہیں تو کم از کم اس قاسمہ کے خیال سے ملنے کی کوشش کیجئے جس سے آپ اپنی لڑکی کی طرح محبت کرتے ہیں کسی طرح اس کے ہونے والے شوہر کو لوٹا لائیے جس کو وہ آج بھی یاد کرتی ہے اور ہمیشہ کے لئے جس کے پاس زندگی گذارنی چاہتی ہے !

دوسرے دن شام کو مصطفیٰ پاشا عبداللہ شارع بولاق پر اپنے لڑکے کا مکان تلاش کر رہے تھے ۔ آخر مکان مل گیا ۔ یہ انہی پرانی تنگ و تاریک گلیوں کا ایک مکان تھا جن کی کوئی اصلاح نہیں ہوئی تھی ۔ اب تک ان گلیوں میں بڑے بڑے بے ہنگم پتھروں کا فرش تھا ۔ برابر برابر بھنچے بھنچے مکانوں کے دروازے تھے اور ان دروازوں کے آگے عورتیں بیٹھی باتیں کرتی جا رہی تھیں اور آس پاس پھرتی ہوئی مرغیوں اور بطخوں کو دیکھتی جا رہی تھیں ۔ ان کا آپس میں کسی لڑکے لڑکی کی لڑائی کے بارے میں جھگڑا ہو رہا تھا ۔

مصطفیٰ پاشا دور تک چلے گئے ۔ آگے جا کر وہ ایک گلی میں مڑے ۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس گلی میں صرف ایک مکان ہے ۔ یہ دو منزلہ مکان تھا لیکن بہت چھوٹا سا تھا ایک موٹی سی عورت سامنے ہی زمین پر بیٹھی تھی ۔ انھوں نے اپنے لڑکے کا نام لے کر اس سے پتہ دریافت کیا ۔ عورت نے بتایا کہ مکان اسی کا ہے اور اس نام کا شخص دوسری منزل پر اس کے کرائے میں رہتا ہے ۔

مصطفیٰ پاشا سیدھے اوپر گئے اور دروازہ کھٹکھٹانے لگے ۔ اندر سے

بیس پچیس سال کی ایک جوان لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس لڑکی کا رنگ گندمی اور قد لمبا تھا۔ وہ کالے کپڑے پہنے ہوئے تھی اور عام عورتوں کی طرح کسی قسم کا بناؤ سنگھار نہیں کر رکھا تھا۔ انھوں نے پوچھا:

منیب مصطفیٰ کا مکان یہی ہے کیا؟

لڑکی نے آگے کو جھک کر مسکراتے ہوئے جواب دیا:

جی ہاں! جی ہاں! تشریف لائیے، چچا جان!

مصطفیٰ پاشا نے جو اس طرح مخاطب کرتے ہوئے دیکھا تو ذرا ٹھٹک گئے۔ لیکن ان کی یہ حیرت کچھ زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ لڑکی نے انہیں کھانے کے کمرے میں لا بٹھایا جو بیک وقت ملاقات کیلئے بھی استعمال ہوتا تھا اور اٹھنے بیٹھنے کے لئے بھی۔ وہ کہنے لگی:

"میں آپ کو پہچان گئی۔ آپ ان کے والد معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی صورت ان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ میں ان کی بیوی ہوں!"

یہ سنتے ہی مصطفیٰ پاشا کو سناٹا آگیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان پر بجلی گر پڑی ہے۔ انھوں نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے خوفزدہ آواز میں کہا:

بیوی؟

"ہاں، ہاں، میں ان کی بیوی ہوں۔ ہماری شادی کو آٹھ مہینے گذر چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔ اپنے خاندان کے متعلق اور آپ کے متعلق۔ جی ہاں! وہ مجھے سب حالات بتا چکے ہیں۔"

مصطفیٰ پاشا نے طعنہ آمیز انداز میں زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا:

"اور شاید اس نے یہ سب کچھ شادی کرنے سے پہلے ہی بتادیا ہوگا، ورنہ تم اس سے ہرگز شادی نہ کرتیں۔۔۔ شاید تم نے سوچا ہوگا کہ اس طرح میری بہو بن کر تمہیں میری دولت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملے گا، لیکن۔۔۔۔"

وہ ابھی اپنی بات پوری بھی کرنے نہ پائے تھے کہ لڑکی کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہوکر رہ گیا اور اس نے نفرت بھرے انداز میں بات کاٹتے ہوئے کہا:

ہرگز نہیں جناب! جس دن سے میں نے ان سے شادی کی ہے کبھی بھول کر بھی مجھے اس بات کا خیال نہیں آیا۔۔۔ شادی سے پہلے میں لڑکیوں کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی اور مجھے پچاس گنی ماہوار تنخواہ ملتی تھی جو میرے لئے بہت کافی تھی۔ ایک دن منیب نے آکر برابر والا مکان کرائے پر لیا۔ اس کے کپڑے تار تار تھے، ٹوٹی ہوئی جوتی میں سے انگلیاں جھانک رہی تھیں اور صورت شکل سے دکھ اور پریشانی ٹپکے پڑتی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اس پر بھی مجھے یقین تھا کہ اس میں ضرور کوئی راز ہے۔ مجھے شروع ہی سے ان کے ساتھ ہمدردی ہوگئی تھی۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ راتوں کو بہت دیر سے شراب کے نشے میں جھومتے جھامتے آتے ہیں۔ بعض اوقات گھنٹہ گھنٹہ بھر تک دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا تھا جب کہیں دروازہ کھلتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ بیکار ہیں اور کہیں ملازمت نہیں ملتی۔ ایک دن میں نے سوچا اگر اس شخص کو دیکھ بھال کرنے اور اپنا بنانے والی کوئی بیوی مل جائے تو اس کی حالت بدل سکتی ہے اور دوسروں کی طرح یہ بھی انسان بن سکتا ہے۔ اصل میں یوں میرے دل میں شادی کا خیال پیدا ہوا۔

مصطفیٰ پاشا ذرا قریب آگئے اور اس کو گھورنے لگے پھر وہ اسی زہریلے انداز میں بولے:

لیکن جب تمہیں اس کے خاندان کا حال اور میرا نام معلوم ہوا تو اس سے شادی کرنے پر کیسے تیار ہوئیں؟

لڑکی نے سر اٹھایا اور کہنے لگی:

میں نے اس بارے میں خوب سوچ لیا تھا۔ شادی کے بارے میں جو ہماری باتیں ہوئیں اگر آپ کو معلوم ہوجائیں تو یقیناً آپ تسلیم کرلیں کہ میں نے ان کو بچانے کے خیال سے شادی کی ہے، نہ کہ اور جال میں پھنسانے کی غرض سے۔ یہ ایک رات کا واقعہ ہے اس دن وہ خلاف عادت ذرا جلدی آگئے تھے۔ انھوں نے کمرے کا کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ گھر کی مالکہ نے بڑا سخت تقاضہ کیا اور ان کو بہت کچھ برا بھلا کہا۔ اس پر وہ کمرے میں چلے گئے اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ اتفاق سے میں اس وقت باہر ہی تھی۔ کمرے میں سے ان کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز آرہی تھی۔۔۔ تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے نکلے اور میرے قریب سے گذرے۔ اس وقت ان کے چہرے پر کسی خوفناک ارادے کے آثار جھلک رہے تھے۔ خواہ مخواہ کسی نامعلوم جذبے نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کا پیچھا کروں۔ میں نے ان کو دیکھا کہ دریائے نیل کی طرف چلے جارہے ہیں۔ شاید یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ دریائے نیل یہاں بالکل قریب ہی بہتا ہے۔ یہاں پل کے قریب وہ کھڑے ہوگئے اور پانی کو تکنے لگے۔ رات کے اندھیرے میں دریا عجیب خوفناک انداز میں بہہ رہا تھا۔۔۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ خودکشی کا ارادہ ہے۔ وہ شاید دریا میں چھلانگ مارنے ہی والے تھے کہ میں آگے بڑھی، سلام کیا اور کچھ باتیں پوچھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد میں ان کو لے کر گھر واپس آئی اور ان کی طرف جو کرایہ باقی تھا ادا کردیا۔ اسی رات ہم نے شادی کے متعلق باتیں کیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت نہ آپ کی دولت ان کو بچا سکتی تھی اور نہ عزت! میں نے ہی اس دن انھیں موت کے منہ سے بچایا۔۔۔ میں نے تن تنہا!

وہ ہانپتی جارہی تھی اور باتیں کرتی جارہی تھی۔ پسینے کے قطرے پیشانی سے برابر ٹپک رہے تھے مصطفیٰ پاشا اس کی رام کہانی سن کر ذرا نرم پڑ گئے۔ محبت سے اس کے ذرا اور قریب آگئے اور کہنے لگے:

لیکن بیٹی! شادی کے بغیر بھی تم اس کی بہت کچھ مدد کرسکتی تھیں۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ تمہیں معلوم تھا کہ اس کا کس خاندان سے تعلق ہے۔

یہ میں مانتی ہوں کہ ہر اعتبار سے میں آپ سے کم حیثیت رکھتی ہوں۔۔۔ لیکن منیب نے جب مجھ سے شادی کو کہا اور بار بار اصرار کیا تو مجھے اچھی طرح یقین دلادیا تھا کہ ان کا اب آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ وہ اب کبھی آپ سے ملیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ اس زندگی کو وہ اس دولت پر ہر طرح ترجیح دیں گے جو انہیں آپ کی وجہ سے مل سکتی ہے۔

مصطفےٰ پاشا نے لڑکی کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور کہنے لگی:
کیا تم نے ان کی باتوں کا یقین کر لیا تھا؟ کیا تم سمجھ سکتی ہو کہ منیب جیسا نوجوان اس دکھ بھری بیکسی کی زندگی کو دنیا سے دور اس گندے حقیر گھر میں گذارنا پسند کرے گا؟ - اور وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ جو اگرچہ اپنی جگہ شریف ہے لیکن کسی طرح بھی خاندانی اعتبار سے اس کے لائق نہیں ہے - اور ہاں! اس نے قاسمہ کے متعلق بھی تمہیں کچھ بتایا جس سے بچپن میں ہی اس کی نسبت ہو چکی ہے. میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کے باپ عباس بک کی موٹر بھی اس محلے سے کبھی نہیں گذرے گی جس میں یہ اندھیری گلی واقع ہے!

لڑکی نے یہ ڈسنے والے فقرے سنے اور گردن جھکالی - وہ تھوڑی دیر کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی، آخر دبی آواز میں کہنے لگی:

جو کچھ آپ نے فرمایا بالکل ٹھیک ہے ... لیکن اب جو زندگی وہ گذار رہے ہیں وہ اس مصیبت کی زندگی کے مقابلے پر جنت سے کم نہیں! آپ نے انھیں دھتکار دیا تھا، ہمیشہ کے لئے اپنا دروازہ بند کر لیا تھا اور اپنی محبت سے محروم کر دیا تھا... اس پر وہ بری طرح شراب پینے لگے اور کبھی ہوش میں نہیں آتے تھے۔ جب سوڈان سے آئے تھے تو بہت کچھ نوکری کی تلاش کرتے رہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ زندگی ان کے لئے مصیبت بن گئی اور وہ موت کو ترجیح دینے لگے... لیکن میں... ہاں! مجھ غریب اور کمزور لڑکی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کوشش کرکے اس کمپنی میں نوکری دلائی... ایک معمولی ڈرائیوری کی جگہ! یہ کونسی اتنی بڑی بات تھی؟ پھر یہ ہوا کہ انھوں نے شراب ترک کر دی اور روپے کی قدر کرنے لگے - اب انھیں سوائے اپنے کام اور گھر کے کسی چیز کا خیال نہیں تھا۔

یہ ٹھیک ہے اور میں... میں اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں -
لیکن میں اگر اسے اپنے ساتھ لے جاؤں تو تمہارا کیا خیال ہے؟

آپ کو اختیار ہے، میں روکنے والی کون ہوں؟

ہاں! بیٹی میں چاہتا ہوں کہ اب تم اس سے زیادہ میرے راستے میں حائل نہ ہو۔ میرے لڑکے کے ساتھ تمہارا تعلق بس اسی درجہ پر ختم ہو جانا چاہئے تاکہ وہ اپنی اور خاندان کی شان کے مطابق آئندہ زندگی گذار سکے - میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ تمہارا جو کچھ خرچ ہوا ہے پیسہ پیسہ ادا کر دوں -

ہرگز نہیں! میں نے کبھی اس قسم کے معاوضے کی توقع نہیں کی - میں اب بھی پہلے کی طرح زندگی گذار سکتی ہوں اور کسی کی محتاج نہیں ہوں -

لیکن ایسی صورت میں جبکہ تم اسے دل سے چاہتی ہو تو تمہیں اس کی بھلائی کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہئے . یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ میں موجودہ حالت میں اس سے ملنا پسند کروں - شاید تمہیں بھی میری اس رائے سے اتفاق ہوگا کہ اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ میرے پاس واپس آجائے اور میری دولت سے آرام اٹھائے اور اس طرح اس ملازمت کی مصیبت سے نجات حاصل کرلے جو کسی اعتبار سے اس کے لائق نہیں ہے... کسی نہ کسی طرح اس شرمناک زندگی سے جان چھڑائے جو اب تک اس نے گذاری ہے۔

لڑکی نے کمرے میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں - چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا - اچانک اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہوئی اور بے اختیار ہو کر اس نے اپنی دونوں کلائیوں سے آنکھیں چھپا کر رونا شروع کر دیا - بوڑھا اس کے اور قریب آگیا رونے کی آواز سن کر اس کا دل پگھلنے لگا تھا - اس نے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور چیختی ہوئی وہاں سے چل دی -

آپ کو اختیار ہے! اگر وہ مجھے چھوڑ کر آپ کے پاس چلے آنے میں اپنی بہتری سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے -

یہ کہتی ہوئی وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی -

مصطفےٰ پاشا عبداللہ اس تنگ و تاریک کمرے میں اکیلے رہ گئے.

کمرے کا سامان اندھیرے میں لاشوں کی طرح بکھرا پڑا تھا، جسے دیکھ دیکھ کر ان کا دل لرز رہا تھا - وہ اپنے لڑکے کے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے اور ساتھ ہی اس لڑکی کے متعلق سوچتے جا رہے تھے جس نے خود اپنی زندگی بنائی، اپنے حالات پر قابو پایا اور پھر ان کے لڑکے منیب کو اپنے بس میں کرکے موت کے منہ سے بچایا!

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور اندھیرے میں کوئی دیا سلائی کی روشنی میں راستہ ٹٹولتا ہوا اندر آیا. مصطفےٰ پاشا زور سے کھانسے! ان کا لڑکا منیب سامنے سے آرہا تھا - لڑکا اس وقت سب کچھ بھول چکا تھا - محبت کے جذبات سے متاثر ہو کر وہ اپنے باپ سے لپٹ گیا . . دیر تک باپ بیٹے کی باتیں ہوتی رہیں -

انھوں نے ایک دوسرے کو نئے پرانے سارے قصے سنا ڈالے. آخر مصطفےٰ پاشا نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا جس کے ساتھ وہ زندگی گذار رہا تھا، وہ بولا:

آپ نے اسے دیکھا؟

ہاں! بلکہ اس سے کچھ باتیں بھی کی ہیں -

میں نے اس سے شادی کر لی ہے -

یہ کیسے ممکن ہے؟

یہی نہیں بلکہ وہ میرے لئے بیوی سے بھی بڑھ کر ہے - وہ میرے لئے ماں، بہن، باپ اور بھائی سب کچھ ہے!

میرا خیال ہے پہلے جب تمہیں معمولی سے معمولی آدمی کی محبت اور ہمدردی کی ضرورت تھی اور تم گھر والوں کی محبت کے بھوکے تھے اس وقت شاید تمہارا یہ کہنا درست تھا - لیکن اب تمہیں بہت جلد اپنے شاندار گھرانے میں واپس جانا ہوگا -

ہاں! منیب! اب تم ہمارے ساتھ پہلے کی طرح زندگی گذارو گے .

جو کچھ بھی ہو ابا جان! لیکن اس کے بغیر میرے لئے سب کچھ ہیچ ہے - اگر وہ مجھے نہ بچاتی، اپنے بس میں نہ کرتی، سہارا نہ دیتی، رستہ نہ دکھاتی تو شاید آپ مجھے کبھی اپنے گھر میں گھسنے نہ دیتے - میں شرابی تھا، بدکار تھا، آرام پسند ناکارہ اور بدمعاش تھا - اسی وجہ سے آپ نے مجھے اپنے دروازے سے دھکا دے دیا تھا - جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو میری حالت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا -

لیکن کیا تم یہ بھول گئے کہ وہ... وہ خاندانی اعتبار سے بہت کم حیثیت ہے
لیکن جب ہماری ملاقات ہوئی ہے میں اس سے بھی زیادہ ذلیل تھا...
میری حالت یہ تھی کہ خود میرے گھر والوں اور خاندان کے لوگوں نے مجھے دھتکار دیا تھا۔
شاید تم یہ بھول گئے ہو منیب! تم کون ہو!... تمہیں شاید یہ بھی یاد نہیں رہا کہ بچپن میں تمہاری ایک لڑکی سے نسبت ہو چکی ہے۔ وہ تمہارے انتظار میں گھل رہی ہے اور تمہاری تمام غلطیوں سے درگزر کرنے کو تیار ہے...
کیا سچ مچ تم اپنی چچازاد بہن فاطمہ کو بھلا چکے ہو؟

منیب نے گردن جھکا دی۔ تھوڑی دیر کے لئے سیاہ بادل کا ٹکڑا چاند کے چہرے سے ہٹ گیا اور کمرہ روشنی سے چمک اٹھا۔ منیب نے جو ڈرائیور کی وردی پہن رکھی تھی بوڑھے باپ کی نگاہوں کے سامنے ابھر آئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور ذرا سخت لہجے میں کہنے لگا:

جی ہاں! میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے!

بوڑھے نے سر ملایا اور ایک لمبا سانس لیکر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگا:

اچھا! تم کو یہ بھی خیال نہیں کہ میری تمام دولت صرف تمہارے حصے میں آنے والی تھی اور اب وہ میرے چچیرے بھائیوں میں تقسیم ہو جائے گی..... وہ بھائی بہن جن سے میں ہمیشہ نفرت کرتا رہا۔ خیر! ہونے دو..... تمہارا جو جی چاہے کرو۔ انہی تنگ و تاریک گلیوں میں پڑے سڑتے رہو۔ اسی قبر میں ایڑیاں رگڑتے رہو جہاں تم کیڑوں کی طرح رینگ رہے ہو...... تمہیں اختیار ہے....
لو میں اب جاتا ہوں۔

یہ کہہ کر بوڑھا آگے بڑھا اور سیڑھیوں کا رخ کر کے چند قدم چلا منیب کھڑا ہوا اپنے باپ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ مصطفےٰ پاشا اچانک مڑے اور اپنے اکلوتے لڑکے کو روتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر کے لئے یہ پرتاثیر منظر یونہی قائم رہا۔ آخر بوڑھا باپ اپنے لڑکے کی طرف بڑھا، کندھے پر ہاتھ رکھا اور لڑکھڑاتی ہوئی سی آواز میں کہنے لگا:

سنو، منیب! اس وقت جو میں تمہیں خواہ مخواہ اپنی بیوی سے بے وفائی کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح تم اس بے خطا لڑکی کو چھوڑ دو، اس کشمکش میں خود مجھے اپنی طبیعت پر بہت جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ میرے پیارے بچے! میں اتنا کمینہ نہیں ہوں!.... تمہیں اس کا احسان ماننا چاہئے..... اگر تم میری بات مان لیتے اور اس غریب کو چھوڑ دیتے تو میرے نزدیک تم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلیل نہ ہوتا... واقعی تم اب "مرد" ہو!

آخر دونوں باپ بیٹوں نے فیصلہ کر لیا کہ منیب اپنی بیوی کو لے کر شارع عباسیہ پر اپنے باپ کے شاندار مکان میں چلا آئے۔ آج کل اسے اس لئے دھتکارا گیا تھا کہ وہ ایک بھٹکا ہوا لڑکا تھا ـــــ لیکن آج وہ اپنی بیوی کے طفیل "مرد" بن چکا تھا واقعی سچا مرد!

گجراتی میں نئے ادبی رجحانات ـــــ بقیہ صفحہ ۴۴

کیونکہ وہ پتھر سے تراش کر بنایا گیا ہے!!"

وہ ایسی عبادت اور ایسے خدا کا ساتھ نہیں دیتے۔ آزادی، خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ میں ہو، ان کے نغموں کی جان ہے۔ ایسے نغمے جو "قلب کو تڑپا دیں" اور "روح کو گرما دیں"۔

اردو کی طرح گجراتی میں بھی بحر، وزن اور اسلوب کے نئے قالب کے معاملے میں مختلف تجربات کئے گئے ہیں۔ اور آزاد نظم انہیں تجربات کا نتیجہ ہے۔ موضوع شاعری کے اعتبار سے بھی یہ دور خصوصیت رکھتا ہے پرانے شاعروں کے برخلاف اس دور کے شعرا معمولی سے معمولی چیز کو بھی موضوع شاعری تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کو ہے کی کیل "پر بھی ایک خوبصورت نظم لکھی جا سکتی ہے۔

ان نئے نظریات کی بعض لوگوں نے بڑی شدت سے مخالفت کی۔ وہ کہتے ہیں کہ اس بے راہ روی میں ادب اور آرٹ کی حقیقی اور صحیح قدریں نظر انداز ہو رہی ہیں۔ بہر کیف اردو کی طرح، گجراتی میں بھی "یہ چھیڑ چلی جا رہی ہے"۔

جہاں تک گجراتی افسانوی ادب کا تعلق ہے وہ ہر اعتبار اور ہر نوعیت سے موجودہ زندگی کی عکاسی کر رہا ہے۔ فرضی اور محض بیکار رومان آپ کو نام کو نہ ملے گا۔ نہ ہر کہانی (FREUDAL COMPLES) کے کسی خاص جذبہ کا نشانہ بنتی نظر آئے گی۔ زبان و بیان کہیں بھی مغلق یا کتاب پرستانہ نہیں ہوتا۔ بلکہ موجودہ ادیب واقعات کو اس پیرایہ میں ادا کرتا ہے۔ جس کے وہ متحمل ہو سکتے ہیں خطیبانہ انداز سے گریز کرتے۔ وہ واقعات کو حقیقت، خلوص، اور سچائی کے ساتھ من و عن اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ پڑھنے والا افسانے کے پس منظر میں محفوظ ماحول کو از خود سمجھ جاتا ہے۔ یہ اشاریت اور ابہام ڈی، ایچ لارنس کی ذاتی اور شخصی خصوصیت ہے۔ اس زمانے کے افسانہ نگاروں میں ادب کا افادی پہلو کافی نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کے افسانوں کا موضوع صرف وہی زندگی نہیں جو فلک بوس محلوں میں سانس لیتی ہے۔ بلکہ وہ کسانوں، مزدوروں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے قلیوں کی انتڑیوں کی مسوس کو بھی چھو سکتے ہیں۔ وہ نشے میں چور شرابی اور سماج کی دھتکاری ہوئی طوائف یا ایک معمولی سی کسبی کی روز مرہ، تھکی تھکی کراہتی ہوئی زندگی کو بھی ادب اور آرٹ کی لطیف قدروں کو اثر انداز کرتا دیکھتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی نفسیاتی تحلیل ان کے ادبیات میں زندہ و تابندہ موجود ہے۔ گجراتی ادیب دھوم کیتو کہتا ہے، "کوئی فن کار ابھی اپنے ماحول کی پستی یا بلندی سے دور رہ کر کسی ایسی چیز کا خالق نہیں جو ادبیات میں وقیع درجہ حاصل کر سکے"۔

اعلان

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے اشحات قلم روانہ نہ فرمائیں ـــــ (ادارہ)

دیوارِ چین

فضل حق قریشی

مشرقی دنیا میں حضرت انسان نے اپنی محنت و جانفشانی اور عزم و ارادے کی پختگی کے جو عظیم الشان کارنامے صفحۂ روزگار پر چھوڑے ہیں، وہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک طرف مصر کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں آسمان سے باتیں کرنے والے ہیبتناک اہرام تعمیر کر ڈالے تو دوسری طرف چین میں سردی سے ٹھٹھرے ہوئے میدانوں اور پہاڑی علاقوں میں غصے سے بل کھاتے ہوئے اژدہے کی طرح ملک کی حفاظت و مدافعت کے لئے ایسی لمبی لہکاری دیوار کھڑی کر دی کہ اُسے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عبور کرتے وقت انسان کا تخیل بھی تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔

آج سے دو ہزار ایک سو ساٹھ سال پہلے یعنی اس وقت جبکہ حضرت مسیح کی ولادت میں بھی دو سو چودہ سال کا عرصہ باقی تھا، منگولوں اور تاتاریوں کے مسلسل اور بے پناہ حملوں سے تنگ آ کر چین کے بادشاہ شیہ ہوانگ تی نے جو چن خاندان کا ایک اولوالعزم حکمران تھا، فیصلہ کیا کہ ملک کے بچاؤ کے لئے کوئی ایسی مستقل صورت نکالنی چاہیئے جس کے بعد کسی منگول یا تاتاری کو اس سرزمین پر قدم رکھنے کا موقع کبھی نہ مل سکے۔ بہت سی تجاویز پر غور و خوض کیا گیا اور انجام کار یہ طے پایا کہ چین کی شمالی اور شمال مغربی سرحدوں پر ساحل سمندر سے تبت تک مسلسل ایک مستحکم اور دبیز دیوار تعمیر کر دی جائے۔ نیز اس رکاوٹ کے علاوہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پہریدار سپاہیوں کی چوکیاں بٹھائی جائیں تاکہ وہ تیر و سناں کی بوچھاڑ سے حملہ آوروں کو دور بھگاتے رہا کریں۔

اس بادشاہ کو حکومت کرتے صرف سات سال گذرے تھے مگر اس کا رعب و داب اتنا زبردست تھا کہ رعیت کا ہر فرد تعمیل حکم کے لئے فوراً جھک جاتا تھا۔ چنانچہ فرمان صادر ہوتے ہی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

یہ کوئی ایسا معمولی کام نہیں تھا کہ سو ڈیڑھ سو معمار اور مزدور لگا کر اسے ماہ دو ماہ میں ختم کر لیا جاتا۔ سب جانتے تھے کہ اسے پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے لاکھوں آدمیوں کو برسوں بڑی محنت و جانفشانی سے کام کرنا ہوگا۔ چنانچہ ملک بھر میں اعلان کرایا گیا کہ ساری آبادی میں سے بھلے چنگے اور تندرست و توانا آدمیوں کی تہائی تعداد درکار ہے۔ لوگ برضا و رغبت آمادگی ظاہر کرتے ہوئے شریک عمل ہو جائیں ورنہ یہ کام ان سے زبردستی لیا جائے گا۔

کچھ تو افلاس کے مارے تلاش روزگار میں سرگرداں تھے اور کچھ خوف و دہشت سے مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ہر شہر قصبے اور دیہات کے باشندے مقررہ اوسط کے مطابق ترک وطن کر کے اس کارِ عظیم میں شامل ہونے لگے۔ اس تہائی آبادی کے علاوہ تمام اسیرانِ جنگ اور مجرمین ملک بھی جیلوں اور قید خانوں سے نکال کر اس کام پر لگا دئے گئے اور اس طرح دو سو چودہ قبل مسیح میں یہ سلسلۂ تعمیر شروع ہو گیا۔

فوراً پہاڑوں کی بلندیاں کٹ کٹ کر وادی کی بستیوں میں گرنے لگیں۔

مزدور تمام دن اینٹیں تھاپتے، پتھر تراشتے اور چنائی کا کام جاری رکھتے اور رات آنے پر جب اندھیرا چھا جاتا تو وہیں جنگل بیابان میں پڑ رہتے۔ اس قید و بند کی حالت میں ان کی مجبور زندگی گذرتی اور دیوار آگے بڑھتی رہی۔

کہا جاتا ہے کہ تعمیر کے کام کو سلسلہ وار قائم رکھنے کی بجائے مختلف مقامات پر شروع کیا گیا تاکہ سرے آپس میں مل مل کر خود بخود ربط و تسلسل پیدا ہوتا رہے۔ حد سے زیادہ تیزی اور عجلت دکھانے کے باوجود اس کی تکمیل شیہ ہوانگ تی کی زندگی ہی میں نہیں اُس کے خاندان کے عہد حکومت میں بھی ممکن نہ ہو سکی۔ کیونکہ پانچ سال کے بعد (۲۰۹ - ق - م) اس کا انتقال ہو گیا اور دوسرے بادشاہ کام جاری رکھنے کے باوجود اس جیسی سرگرمی نہ دکھا سکے حالانکہ وہ اس اہم ضرورت کے حامی تھے۔

بارہ سو پچاس میل کے بعد یہ سلسلہ بالکل رک گیا اور اس لئے آخری ڈھائی سو میل کا ٹکڑا منگ خاندان کے ایک بادشاہ کو تعمیر کرانا پڑا جس کی حکومت حضرت مسیح سے پہلے نہیں بلکہ ان کی ولادت کے پندرہ سو ستر سال بعد شروع ہوئی تھی۔ اس طرح اس دیوار کی کل لمبائی ڈیڑھ ہزار میل ہو گئی۔ یہ مشرقی ساحل سمندر پر آباد ہونے والے شہرستان مائی کوائی سے ضلع کانسو کے ایک قصبے منچو تک پھیلی ہوئی ہے۔ مختلف مقامات پر اس کی بلندی پندرہ سے تیس فٹ تک ہے اور بنیاد کے قریب عرض پچیس فٹ ہے جو بتدریج گھٹتے گھٹتے چوٹی کے قریب پندرہ فٹ رہ جاتا ہے۔ تقریباً ہر دو سو گز کے فاصلے پر اور بعض خطرناک مقامات پر ہر ایک سو گز کے فاصلے پر مضبوط پناہ گاہیں ہیں جن کی بلندی چالیس سے پچاس فٹ تک ہے۔ ایسی پناہ گاہوں کی کل تعداد چالیس ہزار سے زیادہ ہے۔

دوران تعمیر ہی میں ان پر سپاہیوں کی چوکیاں بٹھا دی گئیں تاکہ اندیشے کے موقعہ پر وہ برابر کی چوکیوں یا ملحقہ شہر کے دستوں سے مدد لے کر حملہ آوروں کو پسپا کر دیں لیکن تاتار اور منگول پھر بھی باز نہ آئے۔ ان کا جنگ جویانہ جوش و خروش اس سدِ عظیم سے ٹھنڈا نہ پڑ سکا کیونکہ پندرہ بیس فٹ کی بلندی پر چڑھ جانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ان کی غارتگری اور لوٹ مار بدستور جاری رہی اور یہی نہیں بلکہ ۱۲۷۷ء سے ۱۳۶۷ء تک یعنی نوے سال چین کے ایک بہت بڑے حصے پر منگولوں کا خاندان حکمران رہا۔

بعض مقامات پر جہاں حملہ آوروں کا زیادہ خوف ہوتا یا جہاں خاک کے مسلسل طوفانوں کے باعث یہ قیاس قائم کیا جاتا کہ قدرتی طور پر دیوار کے ساتھ ریت کے انبار لگ لگ کر اس پر چڑھنے اور اترنے کی صورت ممکن کر دیں گے، اصل دیوار کے آگے کئی کئی فالتو دیواریں تعمیر کر دی جاتیں چنانچہ وادی نان کو کے قریب ایک نہ دو ایسی پانچ دیواریں آگے پیچھے بنانی پڑیں کیونکہ وہ حصہ ریگستانی ہونے کے علاوہ رہزنوں کی خاص گذرگاہ تھا۔

یہ قیاس لگانا بہت مشکل ہے کہ اس دیوار کبیر کی تعمیر میں پتھر کی کتنی سلیں اور دھوپ میں خشک کی ہوئی کتنی اینٹیں کام آئیں۔ تاہم یہ اندازہ ضرور لگایا گیا ہے کہ برطانیہ عظمےٰ کی تمام عمارتوں سے زیادہ مسالۂ تعمیر اس میں صرف ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جبکہ اس زمانے کے نقشہ نویسوں کی طرح وہ لوگ سمت اور حدود کا صحیح لحاظ رکھنا نہیں جانتے تھے۔ اگر انھیں جغرافیائی اعتبار سے پوری واقفیت حاصل ہوتی تو شاید دیوار کا طول اتنا زیادہ نہ ہوتا۔ کیونکہ جب درمیان میں فلک بوس پہاڑوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس کی بلند چوٹیوں سے ہراساں نہیں ہوئے بلکہ دیوار کو مسلسل اس پر چڑھاتے اور اتارتے لے گئے۔ چنانچہ بعض جگہ وہ کئی ہزار فٹ بلند ہوگئی اور اسی وجہ سے ایسے مقامات پر ہموار سطح کی بجائے مسلسل سیڑھیاں تعمیر کرنی پڑیں۔ اگر وہ لوگ کوہ پیمائی کے صحیح اصولوں سے واقف ہوتے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے اترنے کی بجائے اس کے دامنوں ہی میں قریب کا راستہ معلوم کرتے اور جان لیوا دشواریوں سے بچ جاتے۔ کیونکہ بعض مقامات پر ڈھلان اتنی پھسلواں اور عمودی حالت میں ہے کہ سیڑھیوں سے بھی کام نہیں چلتا اور انسان کو پتھروں کے کنارے پکڑ کر یا رسی کے سرے ہاتھ میں لے کر انھیں طے کرنا پڑتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان حصوں کو بالکل نظرانداز کیوں نہیں کر دیا گیا جبکہ یہ اندازہ لگا لینا آسان تھا کہ کوئی بھی حملہ آور وہاں سے آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ان حصوں کی تعمیر میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا جبکہ اس کا تصور ہی ہولناک ہے۔

اس سدِ عظیم کو دنیا سب سے بڑی دیوار کے علاوہ دنیا کا سب سے طویل قبرستان بھی سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تعمیر کے دوران میں مزدوروں اور کارکنوں پر بڑی سختیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ جہاں کسی نے غفلت برتی اور منتظمین نے اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دئے۔ اس طرح مرجانے والوں کو اور انھیں جو کام سے انحراف یا سرکشی کرتے زندہ حالت میں دیوار کے ساتھ چن دیا جاتا تھا۔ صحیح اندازہ لگانا دشوار ہے۔ تاہم ایسے مظلوموں کی تعداد ایک ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ اس دیوار کی تعمیر ہوانگ تی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کے علاوہ اس نے عظیم الشان محلات، عوام کے لئے وسیع آرام گاہیں، نہریں اور سڑکیں بھی بنوائیں جو اس کا نام روشن رکھنے کے لئے کافی تھیں۔ اس نے ایک محل اتنا طویل و عریض تعمیر کیا کہ صرف اس کے صحن میں دس ہزار آدمی بیک وقت بیٹھ سکتے تھے۔ اس نے بڑے بڑے شہروں کے درمیان طویل سڑکوں کا جال اس لئے بچھوایا کہ اگر ضرورت ہو تو بیرونی حملے کے وقت دوسری جگہ سے مدد لینے یا فرار ہونے میں آسانی رہے۔ چنانچہ اس کی بنائی ہوئی بعض سڑکیں مقامی اعتبار سے اب تک قائم ہیں۔

ان قابل تعریف کارناموں کے ساتھ ساتھ ہوانگ تی نے ایک ایسی بیہودہ حرکت بھی کی کہ آج تک چین کے علم دوست حضرات اس کا ذکر نفرت و حقارت سے کرتے ہیں۔ چونکہ اسے ذاتی طور پر علم و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ ایسی تحریروں کو خصوصًا تاریخی کتابوں کو دفتر بے معنی سمجھتا تھا، اس لئے اس نے تخت پر بیٹھتے ہی چین کے تمام کتب خانوں کو نذر آتش کرا دیا۔ اس زمانے میں تمام تحریریں بانس کے تختوں یا اسی کے ریشوں سے بنی ہوئی پٹیوں پر محفوظ کی جاتی تھیں۔ ان کتابوں اور نوشتوں کی تعداد کئی لاکھ تھی۔ اس نے ایک حکم عام نافذ کر کے ان سب کو راکھ کی صورت میں بدل دیا اور وہ راکھ بھی اسی دیوار کے درمیانی حصوں میں بھر دی گئی۔ صرف علاج معالجے، کھیتی باڑی اور مویشیوں کی پرورش سے متعلق تحریروں کو مستثنےٰ رکھا گیا۔ اس تباہی کے ساتھ ساتھ اس نے ہزاروں عالموں کو بھی ہلاک کرا دیا تاکہ وہ اپنی دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر ان نوشتوں کو دوبارہ زندگی نہ بخش سکیں۔ دراصل اس کی آرزو یہ تھی کہ اس کے عہد حکومت سے پہلے کی تمام تاریخ اس طرح تلف ہو جائے کہ ساری دنیا صرف اسی کو چین کا اولین شہنشاہ سمجھنے لگے۔ لیکن اس قتل و غارت کے باوجود چند عالم بچ رہے اور بعض علم دوست لوگوں نے کچھ کتابیں زمین میں دفن کر کے محفوظ کر لیں اور جب دو سو قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا ہو گیا تو چھپے ہوئے خزانے زمین کی تہوں اور انسان کے سینوں سے دوبارہ باہر آنے لگے اور اس طرح چین کی پرانی تاریخ مرتب ہو گئی۔

اولتی کی لَے بندیوں میں

افسانہ

شاہدہ خاتون

نہ جانے کیوں وہ آج تمام دن یادِ ماضی میں گم رہی؟ "ماضی" — آج وہ تمام دن ماضی ہی کے تصورات میں ڈوبتی ابھرتی رہی — تمام دن —

اُف تمام دن — ! اور اس کا ذہن ہر طرف سے گھوم پھر کر ایک ہی مرکز پہ آجاتا — ماضی — ماضی — اور ماضی ! اسے خود تعجب ہو رہا تھا، دن کی ہنگامہ آرائیاں اور خیالات کا سکوت ! اور یکایک وہ اپنی روح کو بہت ہی مضطرب، محسوس کرتی، واقعی بے چین ! وجہ ؟ اور وجہ کو سوچتے ہوئے اس کے پردۂ ذہن پر ایک بڑا سا سوالیہ نشان بن جاتا، سوالیہ نشان — ؟"۔

پورا دن گذر گیا — اور جب افق پر گلابی گل بوٹے کھلنے لگے تو آسمان کی بیکراں وسعتوں میں۔ ہوا کے دوش پر بہت سے بادلوں کے ٹکڑے پھیل گئے، ہواؤں میں خنکی آگئی — بادل گہرے ہوتے گئے — تاریکی کا غیر مرئی پرندہ اپنے پر پھیلا کر اپنے وجود کا اعلان کرنے لگا — تاریکی، سیاہی — اس نے سوچا — کتنی تاریکی ہے — سرمایہ دار کے قلب جیسی تاریکی اور پھر آسمان سے پانی کی لڑیوں کے تار بندھ گئے — مسلسل — متواتر — مگر اس کے تصورات اب بھی ایک ہی مرکز پہ تھے، وہی ایک مرکز — "ماضی" — ! اور وہ جھنجھلا گئی۔ کمرہ سے نکل کر دالان میں پڑے ہوئے پلنگ پر تکیوں کے سہارے بیٹھ گئی۔ اب بارش دھیمی ہو گئی تھی اور اولتی سے پانی کے قطرات ٹپک رہے تھے — جن سے زمین میں چھوٹے چھوٹے ایک سیدھ میں بہت سے گڑھے ہو گئے تھے .... اور اب وہ اولتی سے ٹپکتے ہوئے قطرات کو بغور دیکھ رہی تھی — ٹپ — ٹپ — ٹپ — بیشمار قطرات ٹپک رہے تھے — ٹپ — ٹپ — ٹاپ — اور اسے معلوم ہوا قطرات کے ٹپکنے کی لے ہم آہنگ ہو کر ایک عجیب موسیقی بکھیر رہی ہے — جیسے اولتی کی لَے بندیاں کچھ کہہ رہی ہیں — ایک بڑا سا قطرہ اولتی کے جمع شدہ پانی میں گرا — بلبلہ اٹھا — ابھی اس کی نگاہیں بلبلے پر جمی ہی ہوئی تھیں کہ دوسرا قطرہ — بلبلہ پر گرا — بلبلہ ٹوٹ گیا — اس نے سوچا — بلبلا ؟ پانی سے بنا اور پانی ہی کے قطرہ نے اسے فنا کر دیا — اس نے آہستہ سے زیرِ لب، گنگنایا سہ

ٹوٹ گئے شبنم کے موتی — بکھر گئے فطرت کے راز

اور وہ پھر اولتی کی لَے بندیوں میں کھو گئی — جیسے وہ اس کی زبان سمجھتی ہو — اس کا جی چاہا یہ اولتی یوں ہی ٹپکتی رہے ...... برابر ... اور وہ سنتی رہے —

.... اولتی کی لے بندیوں میں کھوئی کھوئی ——— ماضی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی ———

اسے کتنی مسرت ہوئی تھی یہ سنکر کہ نئے انسپکٹر صاحب کی لڑکی اس کی ہم عمر ہے — وہ اپنی امی کی ہزار خوشامدیں کر کے انسپکٹر صاحب کے ہاں گئی — واپسی پر اس نے محسوس کیا، انسپکٹر صاحب کے گھر والے بڑے ملنسار ہیں اور خصوصیت سے اس کی ہم عمر سہیلی کے نام کو زیر لب دہرایا — "شہناز" کتنا پیارا نام ہے؟

...... پھر اس کے تعلقات انسپکٹر صاحب کے یہاں سے بہت زیادہ بڑھے۔ وہ انسپکٹر صاحب کو چچا اور اپنی سہیلی کی امی کو چچی کہا کرتی اور واقعی اسے وہ لوگ پیار بھی بہت کرتے — اس نے اپنی سہیلی سے پھول۱؎ لگا لیا — یوں تو دونوں ملنے کیلئے ہر وقت بے قرار رہتیں مگر راچی ضلع ؟ سال کے آٹھ ماہ تو بارش ہی ہوتی ہے اور وہ بھی مسلسل — ! ایک رات آسمان صاف تھا تو وہ اپنی پھول سے ملنے گئی — ان کا کوارٹر کوئی زیادہ دور تو تھا نہیں اس لئے وہ کبھی تنہا بھی جاتی۔ وہ کوارٹر میں داخل ہوئی .... اور ایک نوجوان کو دیکھکر ٹھٹک گئی ..

...... عمر بھر میں اس نے غیر شعوری طور پر اس کا مختصر سا جائزہ لیا .... کھلتا رنگ، چوڑی پیشانی، گھونگھر والے بال، کشادہ سینہ اور ...... اور ...

...... اب اس نوجوان کی نگاہیں اوپر اٹھ چکی تھیں — تصادم — نگاہوں کا تصادم — اس کی آنکھیں جھک گئیں اور نوجوان ؟ وہ بھی شرم سے باہر بھاگ گیا — مگر وہ ٹھٹک کر وہیں کی وہیں رہی .... بالکل سنگ مرمر کی مورت بنی ہوئی — کسی ماہر فن آرٹسٹ کا شاہکار — جس میں اس نے نہایت ہی فنکارانہ مشاقی سے زندگی سے لہراتے ہوئے آئینوں کو سمو دیا تھا، گویا وہ معصومیت کے آسمان پر جگمگ جگمگ کرتا ہوا ایک درخشاں ستارہ تھی ...... جس کی بڑی بڑی آنکھوں میں تھرکتا ہوا — تیرتا ہوا احساس شباب کا شرمایا ہوا خمار — اور اس خمار کے آس پاس کناروں پر جمی ہوئی مندی مندی سی سیاہی —

"تم وہاں پر کھڑی کیا سوچ رہی ہو پھول ؟ ارے — آؤ نا —" اس کی پھول کمرہ سے نکلتے ہوئے بولی —

وہ پھول کی آواز سے چونک پڑی اور اس کی پھول نے بڑھکر اسے کمرے میں مسہری پر بٹھا دیا۔

"کیا سوچ رہی تھیں تم ؟" اس کی پھول نے پھر استفسار کیا۔

"کچھ نہیں !" اور وہ سوچنے لگی کیا بتائے بھلا ؟ وہ کیا دیکھ رہی تھی — ؟

۱؎ بہار میں یہ ایک رسم ہے — جب دوستی بہت زیادہ پرخلوص ہو جاتی ہے تو سہیلی کا نام لینا آئینِ دوستی کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور سہیلی کا ایک خاص نام رکھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً — پھول، دوگانہ، سکھی، اپنا سکھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ رشتہ محبت قائم کرنے کے لئے طرفین کی طرف سے حسب حیثیت دعوتیں ہوتی ہیں —

آسمان کی لامحدود وسعتوں میں تاروں کی چنچل پریاں رقص کرتی ہوئی — ہر طرف رنگ ...... موسیقی ...... مسلسل ...... متواتر ...... اس دن وہ اپنی پھوپھی سے زیادہ گفتگو نہ کر سکی۔ اس کی پھوپھی نے بتایا کہ اس کے بھائی جان کلکتہ سے آئے ہوئے ہیں۔

پھر اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ — حیدری — ہیں، وہی جن کے افسانے وہ بڑے شوق سے پڑھتی ہے — اس کا تخیل تھا۔ کچھ عجیب سا تخیل تھا اس کے متعلق —! افسانوں کے سہارے اس نے حیدری کی تصویر کچھ عجیب سی بنائی تھی — پچپن سن وسال — اپنے افسانوں کی طرح خشک — مگر — وہ کتنے افسانے ان کے پڑھ چکی تھی — وہی ایک محور — نہایت ہی تلخ — سماج کے پھوڑوں کی نشتر زنی۔ اور کچھ عجیب سے نظریات! وہ اکثر اس کے افسانہ کی عجیب سطریں — جو بار بار پڑھنے سے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ دل ہی دل میں دہرانے لگتی —

"آپ کا اشارہ یقیناً عورت کے رقص کی طرف ہے اس لئے کہ آپ رقص کو نفس عورت سے متعلق سمجھتے ہیں: اور میں رقص کو محض اس لئے ناپسند کرتا ہوں کہ میں رقص کو عورت سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا بلکہ میں عورت کو "حالتِ رقص" میں دیکھنے لگوں گا — اس کے نمود شباب کو۔ کمر کی نزاکت ناز آفریں کو"

اور وہ سوچتی واقعی انسان ایک ہی شے کی دو صفتوں کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا، اس کی نگاہیں اتنی دقیق نہیں کہ وہ فن اور فنکار کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھ سکیں۔

وہ اپنے افسانے اسی عجیب افسانہ نگار کو دکھانے لگی — اس نے دیکھا کہ وہ رومانی افسانے پسند نہیں کرتا۔ اس کے افسانوں میں تلخی پیدا ہونے لگی۔ اور حیدری نہایت تندہی سے اصلاح و ترمیم کا کٹھن فرض انجام دیتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے افسانے ملک میں حد درجہ مقبول و مشہور ہونے لگے — ایڈیٹروں کے تقاضے روز بڑھتے ہی جاتے اور اس کی افسانہ نگاری کی رفتار بھی — ! اس کا فن اب ایک منفرد راہ پر گامزن ہو گیا اور اس کی شخصیت ایک انفرادی حیثیت سے مقبول ہو گئی

آخر کار اس کے استاد نے لکھ بھیجا کہ اب اصلاح کی ضرورت نہیں۔ مگر وہ اپنے افسانے اسے دکھلائے بغیر کہیں بھی نہ بھیجتی۔ اس کا دل ہی نہ بھرتا جب تک وہ افسانہ دیکھ نہ لیتا۔ اسے تسکین ہی نہ ہوتی جب تک وہ افسانے کو بہتر نہ لکھ دیتا — وہ محسوس کرتی جیسے افسانے میں کوئی کمی رہ گئی ہے اور وہ کمی اس کے دیکھ لینے کے بعد دور ہو جاتی۔

پھر ...... اور پھر ...... وہ جانے کلکتہ سے کہاں چلا گیا بغیر اطلاع — ! وہ روز اس کے خط کا انتظار دیکھتی مگر فضول! نتیجہ انتظار! مایوسی، محرومی — ! اس دوران میں انسپکٹر صاحب کا تبادلہ ہو چکا تھا، اس نے اپنی پھوپھی سے اس کا پتہ دریافت کیا مگر اس کی پھوپھی نے بھی لاعلمی ظاہر کی —

یکایک اسے محسوس ہوا — اس کی رومانی تعمیر — منہدم ہو گئی۔ رعنائیوں رنگینیوں اور نکہتوں کے رنگ برنگے بلبلے ٹوٹ کر خلا میں غائب ہو گئے۔ اس کے افسانوں کی روح مر گئی —

ایڈیٹروں کے بیسیوں خطوط آئے — تقاضے کہ اپنا افسانہ بھیجئے۔ خطوط میں روزانہ اضافہ ہوتا جاتا — حتیٰ کہ اس کی چھوٹی اٹیچی خطوط سے بھر گئی۔ مگر جیسے اب اس کے قلم میں طاقت نہ رہی ہو۔ قوت تحریر مفلوج ہو گئی ہو، اس کا بلند پرواز طائر خیال آسمان سے زمین پر آ رہا — اس کا دماغ اپنی ساری جدت طرازیاں زائل کر چکا —

پھر ...... ؟ اور اس نے زیادہ سوچنے سے انکار کر دیا۔ اپنے سر کو زور سے کئی بار جھٹکا — جیسے ماضی کے تصورات کی کڑیوں کو توڑ دینا چاہتی ہو اور بھیرا وتی کی لے بندیوں میں کھو گئی اسے ایسا معلوم ہوا کہ اوتی کی لے بندیاں ایک المیہ راگ میں تبدیل ہو گئی ہیں جیسے اس راگ میں سینکڑوں یتیموں کی حرماں نصیبی، ہزاروں بیواؤں کی ٹھنڈی آہیں، لاکھوں مصیبت زدوں کی کراہیں اور کروڑوں ناکام زندگیوں کی سسکیاں شامل ہیں —!

غزل — آغا علی خاں

رنگیں نوا ہیوں میں بھی وارفتگی نہیں
اب تک کلی کی آنکھ چمن میں کھلی نہیں

آنکھوں سے گرنے لگتی ہے دل کے لہو کی بوند
ان کے حریم ناز میں جانا ہنسی نہیں

اللہ رے ان کے جادوؤں کی معجز نمائیاں
دل دیکھتا ہے آنکھ مگر دیکھتی نہیں

کر بند اب تو نالۂ شبگیر غم نصیب
پھیلا پہر ہے۔ آنکھ کسی کی لگی نہیں

طے کر رہے ہیں جادۂ الفت کی منزلیں
لیکن کسی میں پہلی سی دیوانگی نہیں

آنکھوں کے سرخ ڈوروں نے مخمور کر دیا
اے شیخ تیرے سر کی قسم میں نے پی نہیں

کیا پوچھتے ہو حال مری زندگی کا تم
کہنے کو زندگی ہے مگر زندگی نہیں

محمود درد عشق ہوا جزوِ زندگی
غم خانۂ حیات میں میرے خوشی نہیں

حضرت اصغر کے ساتھ چند گھنٹے

حامد بلگرامی

میرے نزدیک جس طرح شاعر بعض وقت کسی خاص جذبے کے تحت شعر کہنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے، کچھ اسی طرح کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی کا کلام پڑھ کر اس کے متعلق اظہار خیال کے لئے ، اپنے کو مجبور پاتا ہے ، جسے عرف عام میں تنقید و تبصرے کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ ان چند سطور کو ایک ایسے ہی جذبۂ بے اختیار کا نتیجہ سمجھئے

اصغر مرحوم کو میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں دیکھا تھا اور اکثر فرصت کے لمحے ان کی صحبت میں گذارے تھے ، سرودِ زندگی اسی زمانے میں شائع ہوئی تھی ، میں حضرت اصغر سے ملنے گیا ۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز سے پوچھا "کہو یہ مجموعہ پہلے دونوں مجموعوں کے مقابلہ میں کیسا پایا؟"

ان کے اندازِ تکلم میں سنجیدگی کے ساتھ ایک مخصوص بشاشت ہمیشہ نمایاں رہتی ، جس کو تبسم سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا لیکن سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ بشاشت تبسم ہی کا ایک لطیف پہلو ضرور تھی ۔ ظاہر ہے کہ میرا جواب سوائے کلماتِ تحسین کے اور کیا ہو سکتا تھا ، میں اس زمانہ میں ایم ۔ اے کا طالب علم تھا اور حضرت اصغر ہندوستانی اکیڈمی میں کام کرتے تھے مجھے یقین ہے کہ میں نے اس وقت بھی اس مجموعہ کے متعلق اپنی رائے دیانت داری ہی سے دی ہوگی لیکن آج اس اعتراف میں مجھے ہرگز تامل نہیں کہ آج قریب تیرہ چودہ سال بعد جب سرودِ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو ان اشعار میں ایک اور ہی نغمہ پاتا ہوں مجھے ان لطیف اور مبہم اشارات ، سکون بخش کیفیات اور جگنو کی طرح رہ رہ کر چمک رکھنے والی تجلیات کا احساس شائد اس وقت نہ ہوا تھا ۔ زمانے کی رفتار نظروں کے سامنے سے خود بھی کچھ نہ کچھ حجابات اٹھاتی رہتی ہے ہوتا کچھ یوں ہے کہ وابستۂ حیات امیدوں کے ٹوٹنے پر شیرازۂ ہستی ایک بار منتشر ہونے لگتا ہے ۔ اس وقت انسان کے سامنے بالعموم دو ہی راستے رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ واقعات اور حوادث عالم کو اسباب کا لازمی نتیجہ سمجھ کر کامیابی حیات کے لئے ازسرِ نو بہتر سے بہتر اسباب کی جستجو میں لگ جائے یا پھر اس ذات کی مشیت کا قائل ہو کر جو کل اسباب کا سببِ اول ہے راضی بہ رضا ہو کر بیٹھ رہے ۔ ایک کا نتیجہ دنیاداری یا عروجِ دنیوی ہوتا ہے اور دوسرے کا قدیم تصورِ قناعت ، ترکِ دنیا اور ترکِ ترک ۔ لیکن ان سمجھدار ہستیوں کے سامنے جنہیں انسان کی یک گونہ فطری آزادی پر بھروسہ رہا ہے اور ساتھ ساتھ ایک قادرِ مطلق کی شانِ جمالی سے ان کے قلوب سنور رہے ہیں ان کے سامنے زندگی کی ایک راہ یہ رہی ہے کہ وہ اپنے حصولِ مقصد کے لئے ہر ممکن کوشش تو کرتے رہتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں لیکن نتائج کو مشیت کی رضا پر چھوڑ کر ناامیدی اور مایوسی کے ہمت شکن ہچکولوں سے بچ جاتے ہیں ۔ ایک بار اس راہ پر آجانے کے بعد زندگی کا نہ صرف نصب العین ہی بدل جاتا ہے بلکہ مسرت کے مفہوم میں کچھ عجیب وسعتوں کا اضافہ ہو جاتا ہے ۔ عمل پیہم کی لذت خود اپنا حاصل بن جاتی ہے اور نتائج کی کامیابی ایک ایسی ذات کا اذن اور رضا ساتھ لئے ہوئے آتی ہے کہ حال اور مستقبل دونوں جگمگا اٹھتے ہیں سرودِ زندگی کے نغمے بھی کچھ یہی ترنم لئے ہوئے ہیں ۔

ہر چند اصغر نے اس زمانے میں آنکھیں کھولی تھیں کہ دنیا مادیت کے شاید آخری منازل کی طرف تیزی سے گامزن تھی ، جوں جوں زمانہ بڑھ رہا تھا زندگی کے گوشہ گوشہ میں انقلابات کی لہر دوڑتی جاتی تھی ۔ پرانے تصورات خواہ وہ مذہبی ہوں یا تمدنی ایک تقویم پارینہ سمجھ کر پس پشت ڈالے جا رہے تھے ۔ اشتراکیت کے شعلوں نے بہت سے کرم خوردہ روایات کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا ۔ جمہوریت کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے ۔ آزاد خیالی اور آزاد روی ادب کی روح بن چکی تھی ۔ دنیائے شاعری میں غزل باوجود اپنی داخلی لذتوں اور دوامی تازگیوں کے ترک کی جا رہی تھی ۔ نظم اور نظم آزاد اس کی جگہ لے رہی تھی ۔ اس وقت جس شخص نے غزل کی رفعتوں کو پاکیزگی کے ساتھ بلند کیا اور لوگوں کو پھر اس کی لذتوں سے آشنا کرنے کے لئے قدیم روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں زندگی اور بیداری کی روح پھونک دی وہ ذات اصغر ہی کی تھی ۔ جن نغموں کی انہیں تمنا تھی وہ نغمے خود انہیں کی رنگین نوائیوں نے فضا میں منتشر کر دیئے ؎

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

باوجود غزل کی محدود دنیا میں ادبی زندگی بسر کرنے کے اصغر نے کبھی ذوقِ نظر اور بلندیٔ نظر کو محدود نہ ہونے دیا ۔ شاعری کی دراصل مجموعی حیثیت سے دو ہی قسمیں ہیں ایک بلند شاعری اور ایک اچھی شاعری یا دلچسپ شاعری ۔ اصغر کا منتہائے نظر ہمیشہ بلند شاعری رہا اور اس کے لئے انہوں نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا جہاں اندازِ بیان لطیف اشاروں اور تصور آفریں کنایوں میں کچھ ایسا سمویا ہوتا ہے کہ ان کے شاعرانہ تخیر سے محظوظ تو ہوا جا سکتا ہے اور ان کے ملکوتی مبہم اشاروں سے لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کو بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ ان کی نظریں اکثر زمان و مکان کی قید سے آزاد ہو جاتی ہیں ، وہ نہ صرف اس عالمِ رنگ و بو کی کیفیات دلپذیر انداز میں بیان کر جاتے ہیں بلکہ ان تجلیات کو جنہوں نے کائنات کی ہر شے کو بے خود و وارفتہ کر دیا ہے حسن و عشق ہی کی زبان میں ادا کرتے ہیں اور اس طرح ادا کرتے

ہیں کہ بھولی ہوئی حقیقتیں پھر یاد آجاتی ہیں۔ یہ تجلیات ہماری نظروں سے اوجھل سہی لیکن اصغر کی نظروں سے پنہاں نہیں۔

ازل میں اک تجلی سی ہوئی تھی بیخودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا، کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

ہماری شاعری میں تصوف نے کچھ ایسا روایتی انداز اختیار کرلیا ہے کہ غزل کو تصوف کے سچے اور پاکیزہ جذبات سے بھر روشناس کرنا کوئی آسان کام نہیں رہا۔ اردو کا ہر شاعر جہاں بادہ وساغر کی مجازی کیفیات پیش کرنے سے نہیں جھجکتا، خواہ اس کی لذتوں سے ہمیشہ ناآشنا ہی رہا ہو بلکہ جس قدر ناآشنا ہوتا ہے اسی قدر مزے لے کر اس کے ذکر سے لذت کام ودہن کی سیری کرتا ہے کچھ اس طرح شاعری کے لوازمات میں کچھ یہ بھی داخل ہو گیا ہے کہ شاعر کبھی طور پر بجلیاں گرائے موسےٰ کو بیہوش کرے، خود جلوہ دیکھے، کبھی ذروں میں آفتاب کی چمک پیدا کرکے نگاہوں کو خیرہ کرے اور کبھی قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل کے مناظر دکھاکر عرفان نگاری کا دعویدار بن بیٹھے۔ ہماری شاعری میں بیشتر تصوف نگار شعرا کے ہاتھوں صرف ایک روایتی شاعری باقی رہ گئی۔ خداوند کریم اقبال مرحوم کی روح کو مدارج اعلیٰ عطا فرمائے کہ امام غزالی کے بعد اس امام العصر نے تصوف کے صحیح مقام سے بھٹکوں کو راہ دکھائی۔ یا جہاں حقیقت کے رخ سے حضرت اصغر نے نقاب ہٹانے کی کوشش کی ہے۔

جہاں شعرائے نے صرف روایتی طور پر تصوف کو شاعری میں جگہ دی ہے وہاں شعر میں دلکشی تو پیدا ہو گئی ہے لیکن اس سے نہ تو رنگِ تصوف کی بلندیاں ظاہر ہوتی ہیں اور نہ ان کے حقائق کی گرہ کشائی ہوتی ہے جو ایک صاحبِ دل شاعر کرجاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں شاعر کی روح عالمِ وجدان سے گذر کر ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہے جہاں صبح وشام کے تصورات باقی نہیں رہتے جہاں صرف ایک نورانی فضا نظروں کے سامنے رہ جاتی ہے۔ یہاں اگر صفائے قلبی کی نظر قبول ہو گئی تو فیضانِ الٰہی کبھی درِ مقصود عطا کردیتا ہے جن کے لئے نہ راتوں کا جاگنا کافی ہے اور نہ صرف غور وفکر سے وہاں تک رسائی ہوسکتی ہے اس راز کو علامہ مرحوم حضرت اقبال سے بہتر کون جانتا تھا۔ ایک بار حضرت اصغر اور علامہ مرحوم کا ساتھ ہوا۔ حضرت اقبال نے فرمائش کی کہ "کچھ کہا ہو تو سناؤ" اصغر نے اپنی اس غزل کے چند شعر سنائے جس کا مصرع تھا کہ:

کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب وگریباں کو

علامہ مرحوم پر ایک کیفیت طاری ہوتی جارہی تھی۔ جب حضرت اصغر اس شعر پر پہونچے:-

سنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینے سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو

تو علامہ مرحوم آبدیدہ ہوگئے۔ شعر کو بار بار پڑھواتے اور ان پر عجیب اضطراب کی کیفیت طاری ہوتی جاتی، بے ساختہ بولے "اصغر یہ شعر تمہارا نہیں ادھر کا فیض ہے" کچھ اس شانِ کریمی کے موتیوں کو اقبال نے بھی منتشر دیکھا تھا۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے (اقبالؒ)

لیکن یہاں ایک اور ہی کیف تھا جس کا احساس علامہ مرحوم کا قلب کر رہا تھا دنیائے تصوف میں شاعر کی رسائی اس عالمِ فیض تک کم ہوتی ہے۔ یہاں پہونچنے کے لئے خود ایک پاکیزگیٔ فطرت کی ضرورت ہے۔ علامہ اس بارگاہ تک اکثر پہونچے اور یہی وجہ ہے کہ آخر عمر میں ان کا قلب اس درجہ نرم ہوگیا تھا کہ رحمتِ الٰہی کا ہر تصور ان کی آنکھوں کو شبنم آلود کردیتا تھا۔

زندگی بلا کسی مقصد کے بسر نہیں کی جاسکتی اور اس مقصد کی بلندی پر زندگی کی ذہنی اور روحانی رفعتوں کا دار ومدار ہے۔ آنکھیں بند کرکے "اللہ" کا نعرہ لگا دینا اور عالمِ جذب میں آنکھوں کے سرخ ڈورے دکھا کر لوگوں کو متاثر کرلینا کوئی مشکل کام نہیں اس کے لئے نہ کسی کسبِ کمال کی ضرورت ہے نہ صدق وصفا کی۔ لیکن جہاں کسی کے حریمِ ناز تک پہونچ کر تجلیاتِ نورانی سے قلب کو اس درجہ معمور کرنا منظور ہو کہ حسن وعشق ہی مٹ جائے اس کے لئے بیشتر غور وفکر کے لمحات میں زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ تفکر کی رسائی رفتہ رفتہ عالمِ وجدان تک ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبال کے وجدان درحقیقت خود ذہنی وسعتوں کی ایک دوسری منزل کا نام ہے جہاں کچھ دیر کے لئے ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اگر غور وفکر نے ذہن میں کسی سرمایہ کی فراہمی کردی ہے تو وہ منظم صورت میں تشکیل پاکر شاعری میں جلوہ گر ہوتا ہے ورنہ اس عالمِ بیخودی میں پہونچنے کے بعد بھی شاعر کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

غزل کی دنیا میں بارگاہِ حسن تک رسائی مقصدِ حیات ہے اس حسن کی معیاری بلندی یا پستی پر تغزل کے عروج وزوال کی داستان مضمر ہے۔ خواہ ایک مطرب ہوشربا کو مقصدِ زیست بنا کر ہوس کاریوں کے لئے ذہنی تسلی کا سرمایہ بہم پہونچایا ہو یا ایک نورِ مجسم کے ساتھ سوز وگداز کے وہ تصورات وابستہ کرا جن میں رنگینی ہے لیکن پاکیزگی کے ساتھ۔ حسن ہے لیکن صداقت کے پہلو لئے ہوئے — عشق کو بھی اُسی بارگاہِ حسن میں پاک دامن ہو کر آنا پڑتا ہے اور لطفِ نظارہ کے لئے یہاں حسن وحسنِ نظر کا فرق بھی مٹ جاتا ہے۔ اصغر کے سامنے کسی ایسے ہی حسن کا تصور تھا۔

لیکن یہ یاد رہے کہ جب تغزل مذہبیت کے ظاہری رنگ میں رنگا جاتا ہے تو اس کا اثر جاتا رہتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر کلیات میں حمد ونعت کے رسمی ابتدائی اوراق جذب واثر سے خالی ہیں۔ شاعری کو جہاں زہدِ خشک سے نفرت ہے وہیں رسمی تبلیغ سے بھی۔ شاعری میں جہاں اس قسم کی رسمی مذہبیت جلوہ گر ہوئی وہیں شاعری کی رنگینیاں دامن بچا کر الگ جا کھڑی ہوئیں۔ پیکرِ حسن وصداقت کو پیکرِ فطرت کی رنگینیوں میں ظاہر کرنا اور اس کی صداؤں سے

قلوب پر دائمی سرور کے اثرات مرتب کرنا وہ کڑی منزل ہے جس سے شاعر کے لئے کامیابی سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہوتا۔ اسی لئے بلند مقاصد کی پیش نظر رکھ کر شعر کہنے والے کامیاب نہیں ہوتے بلکہ کامیابی اور کامرانی انہیں نصیب نہیں ہوتی ہے جو تلاش حسن میں رفتہ رفتہ خود آستانہ حسن تک پہونچتے ہیں۔ فطرت اپنا آغوش ان کے لئے کھول دیتی ہے۔ اور ان کی نظریں جی بھر کے سرشار ہوتی ہیں ایک بار اس بارگاہ حسن تک پہونچنے کے بعد جو کیفیت طاری ہوتی ہے تغزل کی زبان میں اسے بیخودی کہتے ہیں۔ شاعر کی خواہش اس عالم بیخودی سے واپس ہونے کی ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ اسی راز کو اصغر نے کچھ یوں ظاہر کیا ہے۔ ؎

پہلے ہستی کی جستجو ہے ضرور ۔:۔ پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کر

آئیے اصغر کے ساتھ ساتھ ہم بھی ان کے بارگاہ حسن تک چلیں لیکن اپنے رہبر کی نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئے شاید ہماری نظریں بھی کچھ وہ تجلّیات دیکھ لیں جنہوں نے اصغر کو بیخود و وارفتہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کا مبہم سا تصور کچھ یوں پیش کرتے ہیں:۔ ؎

یوں مسکرا کے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیئے

شعر کے معنی نہیں کہنا چاہتا لیکن یہ ضرور عرض کردوں کہ انداز بیان کی اس بلاغت پر غور کرتے چلیئے جس کی طرف اشارتاً بھی کچھ کہنے کی جرأت کرنا اس کے لطف کو پامال کرنا ہے، یہ وہ نازک مقام ہے کہ ذرا سا بھی قدم ڈگمگا جائے تو شاعری کی حیثیت سے انسان کو باہر پھینک دیا جاتا ہے

اسی حقیقت حسن کی پردہ کشائی ایک مقام پر یوں بھی کی ہے:۔

تکلّم ہے ترا یا شعلۂ وادی ایمن ہے
تبسم زیر لب ہے یا کلی کھلتی ہے جنت کی

شاعر نے ایک اشارہ سے ہم کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ پاکیزگی خیال کا ساتھ ہے اور ایک والہانہ انداز۔

اصغر سے اگر پوچھیئے کہ کیا عشق کی آخری منزل یہی ہے۔ ان کا جواب ہوگا کہ جس کو تم کہتے ہو وہ تو ہوس کا پہلو لئے ہوئے ہے، خواہشات کا نہ جھنے والا دیا اپنے دامن میں چھپائے ہے جہاں آئے ہوئے عشق کو خاک کرنے کے بعد ایک دوسری منزل ہے۔ جسے منزل عرفان کہتے ہیں۔ تم کو اگر اس منزل عرفان کی سیر کرنا ہے اور حسن کے پرتو سے تجلیات کا حاصل کرنا ہے تو آؤ نیاز و سجدہ کو اور شائستہ اور مکمل کرلو۔ یہ عالم تحیر ہے جسے علم کی پہلی منزل کہتے ہیں۔ یہی تحیر حاصل نظارہ ہے دیکھو خیرگیٔ نظر سے ہوشیار رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کہتے واپس آؤ:۔ ؎

خیرگیٔ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اور بھی دور ہو گئے آ کے ترے حضور میں

یاد رکھو بارگاہِ حسن میں چلتے تو ہو لیکن کہیں تقاضائے دید نہ کر دینا۔

وہ بارگاہِ حسن ادب کا مقام ہے ۔:۔ جرأت و دد اشتیاق تقاضا نہ چاہیئے

ان کے ساتھ ساتھ ہم ایسے مقام پر پہونچ جاتے ہیں جہاں ذوقِ دید جلوۂ حسن میں خود محو ہو کر رہ جاتا ہے اور نظر نور شعاع نور بن جاتی ہے ؎

محو ہے ذوقِ دید بھی جلوۂ حسن یار میں
ایک شعاعِ نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

یہاں دنیا کی صبح و شام نہیں ہوتی عروج و زوال کی داستانیں ختم ہو جاتی ہیں ابتدا اور انتہا کا فرق مٹ جاتا ہے اور دلِ حیرت آشنا پر اس عجیب راز کا انکشاف ہوتا ہے ؎

خبر دلِ حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں
ایک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

اس بارگاہ حسن تک پہونچ کر شاعر کا یہ حال ہو جاتا ہے ؎

اب نہ کہیں نگاہ ہے اور نہ کوئی نگاہ میں
محو کھڑا ہوا ہوں میں حسن کی جلوہ گاہ میں
ترا جمال ہے، تیرا خیال ہے، تو ہے۔
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں "کہ کیا ہوں میں"

یہیں اصغر کو اس متاعِ عشق کی قدر ہوتی ہے جس کو زندگی میں بارہا دار و رسن کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ "داغِ عشق" نہیں "گلِ تر" تھا جس نے روح میں بیداری پیدا کر دی تھی اور حیات کو بامعنی بنا دیا تھا۔ یہاں پہونچکر نہ چمن کے لٹنے کا افسوس رہ جاتا ہے۔ نہ ماضی کی دلخراش تکلیفیں تکلیفیں رہ جاتی ہیں ؎

دل پہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہار زندگی
اک گلِ تر کے واسطے میں نے چمن لٹا دیا۔

کاش اس گلِ تر کو وہ ہستیاں سمجھ سکتیں جن کی نظریں اب تک خاروں سے الجھی ہوئی ہیں۔ تو پھر کوئی غم غم نہ رہتا۔ ہائے کیا خوب کہا تھا ؎

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

نامناسب نہ ہوگا اگر اصغر کے تصور عشق پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ یہاں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اصغر بھی کچھ اسی نظریے تک پہونچے ہیں جہاں مولانا رومؒ اور علامہ اقبال مرحوم پہونچے تھے۔ ان کے نزدیک بھی دنیا کا نظام، ذروں کا رقص، شورشِ کائنات، ہنگامہ ارض و سما، غوغائے عشق کے سوا کچھ نہیں۔ ؎

نظام دہر کیا ہے؟ بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں
گدازِ عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی
نشہ عشق میں ہر چیز اڑی جاتی ہے
کون ذرہ ہے جو سرشار محبت میں نہیں

---

[1] کچھ آگ دی ہوس کو تو تعمیر عشق کی ۔:۔ جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

(اصغر)

علامہ اقبال نے فلسفی کا دماغ اور شاعر کا دل پایا تھا۔ انہوں نے عقل وعشق کی ان کیفیات کو جو بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں ایک ہی زنجیر ارتقا میں منسلک کر دیا تھا۔ اقبال کے نزدیک عقل اگر رازِ ہستی سمجھتی ہے تو عشق آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ علم اگر خدا جو ہے تو عشق خدا نما۔ عقل اگر "کشمکش کا دور سے تماشا دیکھتی ہے تو عشق بے تامل کارزارِ عمل میں کود پڑتا ہے"۔ لیکن بقول ڈاکٹر عابد حسین صاحب کے ان دونوں میں بھی اقبال نے حقیقی فرق باقی نہیں رکھا۔ "بلکہ دونوں میں صرف مدارج ارتقا کا فرق ہے ان میں مابہ الامتیاز آرزوئے معرفت کی وہ خاص کیفیت ہے جسے شاعر نے سوز کہا ہے اگر عقل میں یہ سوز پیدا ہو جائے تو وہ عشق بن جاتی ہے"۔

اصغر کے نزدیک عشق ہی تمام کائنات پر حاوی ہے۔ انہوں نے عقل وعشق کی بحث سے اپنے کو الگ رکھا ہے۔ وہ فلسفی نہ تھے صرف شاعر تھے اور داغِ عشق اٹھائے ہوئے اس لئے ان کی نظریں عشق کی اس بلندی پر بلا ارتقا کی منزلیں طے کئے ہوئے خود بخود پہونچ گئیں۔ ان کی خرد بے چارگیوں کا احساس ایک نرگس خمار آلود ہی نے کرا دیا ؎

کہاں خرد ہے، کہاں ہے نظامِ کار اس کا
یہ پوچھتی ہے تری نرگسِ خمار آلود

اصغر نے اپنے ابتدائی دور میں اسی عشق کو حاصلِ منزل سمجھا تھا۔ ؎

عشق ہی سعی مری عشق ہی حاصل میرا
یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا (نشاطِ روح)

لیکن بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ حسن آفتاب کی درخشانی سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں وہ جادۂ بقا کے لئے راہِ ہدایت تو ہو سکتا ہے لیکن شانِ معبودیت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ یہاں پہونچ کر انہیں حسن وعشق کے تعلق کا احساس ہوتا ہے۔ انہیں ان دونوں میں سے ایک ایسا تعلق نظر آتا ہے جسے ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ تکمیل عشق دراصل خود بخود حسن کا رہینِ منت نظر آتا ہے ؎

شعاعِ مہر خود پیتا ہے جذبِ محبت سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

لیکن یاد رہے کہ جہاں ان دونوں حقیقتوں میں ناگزیر تعلق ہے وہاں یہ دونوں اس عالمِ رنگ و بو میں ایک ہو کر نظر نہیں آسکتیں اس راز کا انکشاف اصغر نے یوں کیا ہے ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

اصغر جادۂ ہستی میں اسی عشق کو اپنا رہبر بنا کر کبھی رسوم وقیود سے دست وگریباں نظر آتے ہیں اور کبھی منازل کے راہ ورسم کے عمومی تصور کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ؎

نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں
ہزاروں بن گئے سجدے جبیں ہم نے جہاں رکھدی

بہت سمجھے ہوئے ہے شیخ راہ ورسمِ منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

کوئی سرگشتۂ راہ طریقت اس کو کیا جانے
یہاں افتادگی کو حاصلِ منزل سمجھتے ہیں

اسی عشق نے سود وزیاں کے تصور کو ننگ عاشقی قرار دیا، اور حقائق کی جستجو میں فطرت کی رنگینیوں میں الجھ کر رہ جانا ناکامیابی ؎

یہ ننگِ عاشقی ہے سود وحاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے
جنونِ عشق میں ہستی عالم پر نظر کیسی
رخِ لیلیٰ کو کیا دیکھینگے محمل دیکھنے والے

غرض اسی عشق نے زندگی میں ان کی کچھ اس طرح رہبری کی کہ

شہود غیب ہوا اور غیب ہو گیا ہے شہود

حسن وعشق کے اس تصور کے بعد جب کائناتِ عالم پر نظر پڑتی ہے اور اور ہی عالم نظر آتا ہے ؎ ؎

ترا جلوہ، ترا انداز، ترا ذوقِ نمود ۔۔۔ اب یہ دنیا نظر آتی نہیں دنیا مجھ کو
کائناتِ دہر ہے سرشارِ اسرارِ حیات ۔۔۔ ایک بستِ آگہی کو بیخبر سمجھا تھا میں

اب اس دنیا کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور اسکا صحیح مصرف سمجھ میں آتا ہے۔ ؎

دہر ہی نے مجھ پہ کھولی راہِ بے پایانِ عشق
راہبر کو اک فریبِ رہگزر سمجھا تھا میں
مست و بیخود ہیں، مہ و انجم، زمین و آسماں
یہ تری محفل تھی جس کو رہگزر سمجھا تھا میں

وہی عشق ہے جو ابھی کعبہ وبتخانہ ڈھانے پر تیار تھا بیخود ومدہوش ہو جاتا ہے جسے مخالفت کی تاب نہ تھی۔ ہمدردی کا پہلو لئے نظر آتا ہے اک سکوت وخاموشی کا عالم چھا جاتا ہے، آلامِ روزگار آسان ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت ہستی کھل جانے کے بعد لطفِ خواب احساسِ خواب سے فنا ہو جاتا ہے۔ ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہی وہ بیخودی ہے جہاں خودی کی تکمیل ہوتی ہے اور لطفِ آگہی کا صحیح احساس اس عالم میں کیا جاتا ہے ؎

پھر ڈھونڈھ رہا ہوں بیخودی میں ۔ ؛ ۔ کھویا ہوا لطف آگہی کا

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی ۔ شاعر کے ساتھ ہم بھی اس کے عالم لاہوتی میں جا پہونچے ۔ لیکن یہ ضرور محسوس ہو رہا ہے کہ یہ کسی زاہد خشک کی شاعری نہیں بلکہ کسی دلکش عالم کی دلکش ترجمانی ہے ۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اصغر نے غزل کی محدود دنیا میں زندگی بسر کی لیکن اپنے ذوقِ نظر کو محدود نہ ہونے دیا رنگ تغزل کو ایک انوکھے انداز سے سنوارا ، اس طرح نہیں کہ غزل نفسیاتی ہیجان کا مرکز بن جائے انگڑائیاں توبہ شکن ہو جائیں بلکہ اس طرح کہ اس کے حسنِ دل آویز کے سامنے دل کو ہوس کاریوں کا ہوش ہی نہ رہے ۔ جہاں تمکنتِ حسن میں جواب عشق تو موجود ہو لیکن خاموشیوں کا وقار لئے ہوئے ۔ اصغر نے سب کچھ کہا، فنا و بقا ، حیات و ممات ، حسن و عشق ، صبر و رضا ، جبر و اختیار ، لیکن غزل کے حدود میں رہ کر اس کی شوخی اور حیا دونوں قائم رکھتے ہوئے ایک بار سرودِ زندگی کی اس نظر سے بھی ورق گردانی کر لیجئے ۔

ؔ

کیا گذرتی ہے شبِ غم تم اسی سے پوچھ لو ؛ ایک بیمار ہی شکل میری محرم و ہمراز ہے

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو ؛ مگر موجِ صبا کی پاکدامانی نہیں جاتی

الٰہی خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے ؛ ذرا بتوں کو بھی بندہ نواز رہنے دے
حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں ؛ ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے

یہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری ؛ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے ؛ یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

وہ نغمہ بلبلِ رنگیں نوا اک بار ہو جائے ؛ کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے
سحر لائی گئی کیا پیغام بیداری شبستاں میں ؛ نقابِ رخ الٹ دو خود سحر بیدار ہو جائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے ؛ اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

ہاں اصغر نے سچ کہا تھا ؎

غبار از دامنِ خود بارہا افشاندہ ام اصغر
بہ ہنگامِ جنوں صد مہر و ماہ کردہ ام پیدا

نقد و نظر

سیاسی نظریئے

مترجمہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
ناشر، حالی پبلشنگ ہاؤس

صفحات ۹۳، قیمت ایک روپیہ عہ/

یہ چھوٹی سی کتاب ہیرنشا کی مشہور کتاب کا ترجمہ ہے ۔

اصل کتاب میں سات باب ہیں (۱) خطۂ یونان دروما (۲) عیسائیت (۳) ازمنۂ وسطیٰ (۴) نشاۃ الثانیہ (۵) زمانۂ عقلیہ (۶) انیسویں صدی اور (۷) بیسویں صدی، ایک باب مترجم صاحب نے موجودہ زمانہ کے نام سے خود بڑھایا ہے ۔ کتاب کے سات باب ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے سیاسی عالم کے لکھے ہوئے ہیں اور اسلئے ان میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو کسی ایسے اہلِ قلم کی لکھی ہوئی چیزوں میں ہونی چاہئیں، جو اس مخصوص موضوع کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کا تبصرہ کرتا ہے ۔ بظاہر یہ کتاب ایک بہت طویل مدت کے سیاسی افکار کا سرسری جائزہ ہے لیکن حقیقت میں مصنف کی قدرت اور مہارت نے اس مختصر سی کتاب میں اتنا مواد جمع کر دیا ہے کہ یورپ کے سیاسی افکار کی ایک صاف شفاف تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے اور ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہم نے مدتوں کے مطالعہ اور فکر کے بعد جمع کیا ہے ۔ ترجمہ بھی نورالحسن صاحب نے اچھا کیا ہے ۔ لیکن ان سات بابوں کے بعد اگر آٹھواں باب نہ ہوتا تو بہتر تھا اس لئے کہ اس کا انداز مفکرانہ ہونے کے بجائے محض صحافتی سا ہے، اور اصل کتاب کے پس منظر میں یہ بات اور بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے ۔ ایسی کتابیں ہر اردو جاننے والے کو پڑھنی چاہئیں اس لئے کہ تھوڑے سے وقت میں بہت سی مفید مستند اور اہم باتوں کا ایسا بیش بہا ذخیرہ صرف بہت اچھی کتابوں کے ترجمے ہی پڑھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے ۔

کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے ۔ سرورق بھی دیدہ زیب ہے ۔

و ۔ ع

شخصیت اور کردار

مصنفہ، جناب شبیر محمد اختر ۔
ناشر، ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن ۔

صفحات ۱۸۵، قیمت دو روپے عالر

پچھلے چند سال سے اردو ادب کی ہر صنف میں لکھنے والوں کا رجحان رفتہ رفتہ نفسیاتی ہوتا رہا ہے ۔ افسانہ اور نظم کے علاوہ خود تنقید بھی اس نفسیاتی رجحان سے متاثر ہوئی ہے ۔ اور ہماری مختلف طرح کی تحریروں میں اس کا عکس نمایاں طور پر نظر آتا ہے ۔ یہ اثر کچھ تو مغرب کے نئے ادبی اور فکری رجحانات کا پیدا کیا ہوا ہے اور کچھ خود ہمارے اپنے حالات کا ۔ ہمارے حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم اب چیزوں کی ظاہری ماہیت کے مطالعہ سے آگے بڑھ کر ان کی اندرونی کیفیتوں کے ہمراز بنیں اور اس طرح اپنی ان ذہنی بیماریوں کا مداوا کر سکیں جو خارجی حالات کی پیداوار ہونے کے باوجود اپنی الگ حیثیت بنا لیتی ہیں اور ان سے انسانی شخصیت اور اس کے کردار کے گرد طرح طرح کے جال بنتے چلے جاتے ہیں ۔

نفسیات اور تحلیل نفسی میں انسانی شخصیت اور اس کے کردار کا مطالعہ ہی سب سے اہم چیز ہے ۔ اردو والے برابر اپنی بساط کے مطابق ان چیزوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں ۔ لیکن یہ موضوع ایسا ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی الجھن رہ جائے یا وضاحت کی کمی ہو تو سمجھنے والا بالکل غلط نتیجوں پر پہنچ جاتا ہے ۔ شبیر محمد اختر صاحب کی یہ کتاب اسی الجھن کو دور کرنے کی ایک کوشش ہے ۔

مصنف نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا حصہ شخصیت سے متعلق ہے ۔ دوسرا کردار سے ۔ پہلے حصہ کو مصنف نے ۹ بابوں میں تقسیم کیا ہے ۔ (۱) شخصیت کیا ہے (۲) شخصیت کی خصوصیات (۳) بالغ نظری (۴) جدت پسندی (۵) شخصیت کے منفی پہلو (۶) شخصیت کی خامیاں (۷) موقع شناسی (۸) چند رکاوٹیں (۹) حرف آخر ۔ حرف آخر، ہیں گویا کتاب کے پہلے حصہ کا نچوڑ ہے لیکن مجھے یہ محسوس ہوا کہ اس باب میں مصنف کا ناصحانہ تخاطب اس حد سے ذرا زیادہ بڑھ گیا ہے جس پر آکر خالص علمی کتابیں لکھنے والوں کو ٹھہرنا پڑتا ہے ۔ اگر ایسا نہ ہو تو علمی موضوع کی متانت اور عظمت میں کمی محسوس ہونے لگتی ہے ۔ یہی چیز یہاں بھی کھٹکتی ہے پھر ایک بات اور بھی ہے ۔ کتاب کے طرز بیان میں میں نے جا بجا یہ محسوس کیا کہ مصنف صاحب اپنی بات کو آسان سے آسان زبان میں، ایک دلنشین بے تکلفی کے انداز میں کہنا چاہتے ہیں ۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں اس میں کہانی کی لذت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور کہانی کی لذت جہاں تک میرا تجربہ ہے ٹھوس علمی مباحث میں لذت نہیں رہتی ۔

کتاب کے دوسرے حصہ کردار کے ۱۰ حصے ہیں (۱) مختلف اجزا (۲) سکون (۳) دکھ (۴) تقدیر (۵) کمزور جذبات (۶) خوف (۷) غصہ اور جوش (۸) خوشی (۹) کاروبار اور (۱۰) روزمرہ زندگی ۔ اس حصہ میں بھی اختر صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی روانی اور بے تکلفی سے کیا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ موضوع پر غور و فکر کر کے سب کچھ لکھا ہے ۔

اس کتاب کی جو علمی اور تعلیمی حیثیت اور افادیت ہے، وہ میرے خیال میں اور بڑھ جاتی اگر شبیر محمد اختر صاحب زبان و بیان کے معاملہ میں اتنی سادگی (اور کہیں کہیں رنگینی) کو اپنے اوپر لازم نہ کر لیتے ۔

کتاب دیدہ زیب ہے ۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی ہے اور سرورق بھی ۔

سیتا رام

مصنفہ طالب الہ آبادی، ناشر جعفری برادرس الہ آباد ۔
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے عہ/ ۔ سرورق رنگین اور مصور ۔

رامائن، مہابھارت اور بھگوت گیتا، تین ایسی کتابیں ہیں جو ہندوستان کی ادبی، معاشرتی، تمدنی اور فکری روایات کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں ۔ ان تینوں کتابوں کے ترجمے دنیا کی اکثر مشہور زبانوں میں ہو چکے ہیں ۔ اردو میں بھی ترجمے ہوئے اور ان میں سے کئی ترجمے منظوم ہیں ۔ سیتا رام جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سیتا اور رام کی منظوم کہانی ہے ۔ طالب

طالب صاحب نے رامچندر جی کی پیدائش سے لیکر ان کے راج تلک تک کے سارے اہم واقعات کو نظم کا لباس پہنایا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر دور یا زندگی کے ہر اہم واقعہ پر ایک نظم لکھی ہے لیکن یہ نظمیں سب کی سب الگ الگ بحروں میں ہیں۔ اور اس لئے پوری کتاب میں وہ لطف نہیں جو تسلسل سے پیدا ہوتا ہے۔ ہاں یہ فائدہ ضرور ہے کہ ہر نظم بجائے خود مکمل ہے اور اسے دوسری نظموں سے الگ کر کے پڑھا جا سکتا ہے۔ کتاب بچوں کے لئے بے حد دلچسپ ہے۔

ہندوستانی جنتری ۱۹۴۷ء

مرتبہ حکیم محمد فرقان علی صاحب مدنی

ناشر سنٹرل بک ڈپو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت چھ آنے ۶/

جنتری ہماری زندگی کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ انسان کا ہر کام زمان و مکان کا پابند ہے۔ اگر انسانی زندگی سے پابندی کسی طرح اٹھ جائے تو اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں کیا افراتفری، کیا ہیجان پیدا ہو جائے۔ اسی اہم ضرورت کے پیش نظر ہر نئے سال سے پہلے طرح طرح کی جنتریاں شائع ہوتی ہیں۔ یہ جنتری بھی ایسی ہی بہت سی جنتریوں میں سے ایک ہے۔ کتاب میں ۱۹۴۷ء کی جنتری کے علاوہ، اسلامی اور ہندی مہینے اور تاریخیں بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ ایک صفحہ پر پچھلے تین سال اور اگلے ایک سال کی جنتری بھی درج ہے۔ پھر رمل کی بے شمار مفید معلومات ہیں۔ ڈاک اور تار وغیرہ کے قاعدے لکھے ہوئے ہیں۔ جا بجا مذہبی اور تاریخی موضوع پر دلچسپ مضمون بھی ہیں۔ اور اس طرح یہ جنتری خاصی مفید معلومات کا مجموعہ ہے۔ اشتہار بھی کتاب میں کثرت سے ہیں۔ لیکن اگر دواؤں کے بعض اشتہار نہیں نہ ہوتے تو یہ جنتری ہر چھوٹے بڑے کے ہاتھ میں جا سکتی تھی۔

مقاصد قرآن

مصنفہ مولانا صبغتہ اللہ بختیاری۔

ناشر، مکتبہ نشاۃِ ثانیہ چنچل گوڑہ، حیدرآباد دکن قیمت ۱۲/

رسالہ ترجمان القرآن میں ایک مسلسل مضمون کوئی دس سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ اسی مسلسل مضمون کو اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

اس رسالہ کی بنیاد اس خیال پر رکھی گئی ہے کہ 'ایمان بالرسالت' کا عقیدہ صحیح ہے یا نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب مختلف علما نے مختلف طریقوں سے دیا ہے۔ اس رسالہ کے مولف نے قرآنی آیات اور احادیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "واسطۂ رسالت" توحید کے مرتبۂ اعتقادی اور اس کی صحت کے لئے اور عمل صالح، عملی زندگی کے لئے بطور نمونہ کے کس قدر ضروری ہے"

بحث ہر جگہ منطقی اور مدلل ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ مولف کا لہجہ ذرا تیز اور سخت ہو گیا ہے۔ یہ انداز اس طرح کے رسالوں میں کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس طرح مختلف الخیال لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا بھی ممکن نہیں۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ غزل .... لسان القوم مولانا صفی لکھنوی

۲۔ سر عبدالقادر .... ڈاکٹر محمد باقر ....

۳۔ تعلیم اور تہذیب نفس .... سر عبدالقادر ....

۴۔ فرانسیسی افسانے اور فطرت نگاری .. جناب اختر لکھنوی ....

۵۔ چین کا موجودہ مرض .... ڈاکٹر حفیظ سید ....

۶۔ کلوپیٹرا (افسانہ) .... جناب شریف عنایت اللہ .....

۷۔ نغمۂ تب تاب .... جناب فراق گورکھپوری ....

۸۔ اقبال کا شاہین .... جناب مغیث الدین فریدی .....

۹۔ طوفان نوح .... جناب عبدالرشید ....

۱۰۔ تصنیف مقدس (افسانہ) ...... محترمہ رضیہ لغمان ....

۱۱۔ غزل .... جناب صدق جائسی ......

۱۲۔ فیجی میں ہندوستانی ...... جناب جے پرکاش ....

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا

ٹرکی میں نئی عمارتیں

فن تعمیر ہر قوم کے ثقافتی رحجانات کا آئینہ
ہوتا ہے۔ صرف انقرہ کی موجودہ عمارتیں دیکھ
ں اس مثل کی صداقت کا احساس ہو سکتا ہے۔
ع خیابان، دلکش چمن زار اور نت نئی عمارات
جل کر سارے شہر کو ایک گوشۂ فردوس بنائے
ے ہیں۔ ان سے ترکی قوم کے ذوق لطیف کا پتہ
اور ان ترقی پسند خیالات کا احساس ہوتا ہے
ی داغ بیل اتاترک مصطفے کمال پاشا نے ڈالی
اور جو اب بھی ترکوں میں جوش و خروش
اولوالعزمی کی شان پیدا کئے رہتے ہیں۔
جب انقرہ ترکی کا پایۂ تخت قرار پا گیا تو
ن تعمیرات نے تمام تر توجہ اس امر کی طرف
ل کی کہ اسکی ظاہری شان و شوکت بھی اسکے
ندار کے ہم پلہ ہو جائے۔ دلدلی علاقوں کو
ت و غلاظت سے پاک کرکے نکاسی و فراہمی آب
ے طریقے رائج کئے۔ صنعت و حرفت کے
ں کی ہمت افزائی کی۔ کارخانوں کی تعمیر کے
ورپ کے ماہرفن انجینئر مدعو کئے۔ غرض
ی دفاتر، بنک، سنیما گھر، ہوٹل، کلبین اسپتال
درسے دیکھتے ہی دیکھتے اسطرح سینۂ ارض
ہر آئے جیسے کوئی جادوگر ان واحد میں
شہر آباد کرکے دکھا دیتا ہے۔ روز بروز
ہوتی آبادی کو رہائشی سہولت دینے کیلئے
ی منزل کے دلکش اور آرام دہ فلیٹ تعمیر
۔ اگرچہ یہ سب کاروائی بڑی عجلت اور
کے ساتھ عمل میں آئی تاہم ہر نقش ابتذال و
گی کے بدنما داغ سے یکسر پاک ہے۔ شاندار
ں کے آس پاس گھاس کے سرسبز و شاداب

انقرہ ریلوے اسٹیشن کا ایک غیر معمولی منظر۔

قطعوں اور میدانوں سے ایسا حسن تضاد پیدا کیا ہ
بڑے سے بڑے ناقد کی نظر بھی کوئی اعتراض پیش
کرتی۔ عمارتوں میں سیمنٹ پتھر اور فولاد کا استعم
ہے۔ نیز روشنی اور ہوا کا لحاظ رکھتے ہوئے ان
نقشوں کو تیار کیا گیا ہے۔ مضبوط اور خوشنما اور
دہ ہونے کے باوجود گنجائش اور لاگت میں زیاد
زیادہ کفایت برتی گئی ہے۔

«مرغ ترکیہ» نامی ادارے کا صدر مقام جس
← اہمیت محکمہ اے۔ آر۔ پی۔ کے برابر ہے۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آھنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ھندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ھے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ھندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	-	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں - ایک سو اسی صفحات - دو نقشے - کپڑے کی جلد - قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ھیں) -

« میزان نیوز لیٹر » (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ھے (محصول ڈاک معاف) -

خاص رعایت « عربی - انگریزی جملے » نوے صفحات - گتے کی جلد - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ - کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ -

« فارسی انگریزی جملے » کپڑے کی جلد - قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) -

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ - پوسٹ بکس نمبر ۱۹۶ - دھلی

آجکل

اتحادِ شوروی
چین
تبت
افغانستان
ایران
ترکی
شام
عراق
عربستان
نیپال
ہندوستان
برما

سر عبدالقادر

سر عبدالقادر ہندوستان کی ان محدودے چند ہستیوں میں سے ہیں جنھیں ادب سیاست اور معاشرت میں یکساں محبوبی حاصل ہے۔ اس شمارہ میں موصوف کی شخصیت سے متعلق ڈاکٹر محمد باقر کا مضمون ملاحظہ کیجئے۔ اس شمارہ میں موصوف کا ایک مضمون "تعلیم اور تہذیب نفس" بھی شامل ہے۔ یہ مضمون اس خطبہ کا اقتباس ہے جو سر عبدالقادر نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں میں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر پڑھا تھا۔

علامہ سر عبدالقادر

علامہ سر عبدالقادر اور اراکین ادارہ "آج کل"۔ داھنے سے بائیں کو (ایستادہ) فضل حق قریشی دھلوی، آغا محمد یعقوب دواشی اور سید وقار عظیم۔

آجکل

اُردو کا پندرہ روزہ

سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۶ | فہرست | ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ: سید وقار عظیم ایم-اے

ناشر: فضل حق قریشی دھلوی

مدیران: بھگت سروپ کھلر ایم-اے = سید آفاق حسین آفاق بی-اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۲۶ دھلی

رفتارِ زمانہ

۲۱ اور ۲۵ دسمبر

جمہوریۂ روس کے صدر جنرلیسمو جوزف اسٹالن ۲۱ دسمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ پچھلے مہینے کی اکیس تاریخ کو سوویت روس کے گوشے گوشے میں ان کی سڑسٹھویں سالگرہ کے جشن منائے گئے۔ دنیا کے ہر حصے سے تہنیت و مبارکباد کے پیغام آئے اور ہر جگہ انکی درازیٔ عمر کی دعا مانگی گئی۔ مسلمانانِ ہند کے قائدِ اعظم محمد علی جناح ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ پچھلے مہینے کی پچیس تاریخ کو اس ملک کے گوشے گوشے میں انکی ستّرویں سالگرہ کے جشن منائے گئے۔ دنیا کے ہر حصے سے تہنیت و مبارکباد کے پیغام آئے اور ہر جگہ ان کی درازیٔ عمر کی دعا مانگی گئی۔ صفحاتِ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں دن بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ۲۵ دسمبر کو حضرتِ عیسٰی کی تاریخ پیدائش تصور کر کے تمام نصرانی دنیا خوشیاں مناتی ہے۔ کرسمس کا تہوار اس کی یادگار ہے لیکن ولادتِ مسیح سے بہت پہلے بھی یہ یوم سعید دنیا والوں اور خصوصاً یورپ کے بہت بڑے حصے کے باشندوں کے لئے مسرت و شادمانی کا دن رہا ہے جس طرح چاند ہر قمری مہینے کی آخری تاریخوں میں چند دن کے لئے بالکل غائب ہو جاتا اور پھر پہلی تاریخ کو طلوع ہوتا ہے، اسی طرح سورج بھی یورپ کے بہت سے ملکوں میں ۲۱ اور ۲۵ تاریخوں کے درمیان نظر نہیں آتا۔ قدیم باشندے جو نظامِ شمسی کی حقیقتوں میں سے گردشِ زمین کی نوعیت کو بالکل نہ سمجھتے تھے، ان دونوں دنوں کو بڑی اہمیت دینے لگے۔ انہوں نے قیاس کیا کہ سورج ۲۱ دسمبر کو مر کر ۲۵ دسمبر کو دوبارہ زندہ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ چار دن تک سوگ مناتے اور ۲۵ سے ایک جشنِ عام برپا کرتے تھے۔ کیونکہ اس روز طلوعِ آفتاب کو آفتاب کی حیاتِ نو تصور کرتے تھے۔ چنانچہ صدیاں گذرنے کے بعد آج بھی عیسائیوں کے علاوہ بہت سے دوسرے مذاہب کے پیرو ۲۵ دسمبر کو مقدس اور بھاگوان سمجھتے ہیں۔ اس قدیم عقیدے کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر جناح کے جنم دن پر جو حضرتِ عیسٰی کا بھی جنم دن ہے، سورج کو حیاتِ نو نصیب ہوتی ہے۔

تبتی رسالہ

جدید تہذیب و تمدن سے دور ہمالیہ کے دامن میں بسنے والے ملک تبت کے متعلق یہ پڑھ کر کسیقدر تعجب ہوا کہ وہاں سے ایک اعلیٰ معیاری رسالہ شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کی اشاعت لاماؤں کی پُراسرار سرزمین اور تجارتی شہر کالمپانگ سے عمل میں آتی ہے اسکا نام "یُول چوگ سوسوئی سارگیور میلونگ" ہے جسکا لفظی ترجمہ "آئینۂ تبت" کیا جا سکتا ہے۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اسکا پہلا شمارہ "رونیو" کے ذریعہ شائع ہوا تھا۔ اس کے خریدار صرف چودہ تھے۔ عرصہ تک یہی تعداد رہی حتیٰ کہ اب اکیس سال بعد جبکہ وہ لیتھو پریس کے ذریعہ شائع ہوتا ہے، خریداروں کی تعداد نو سو ہے۔ وہ پانچسو کاپیاں خریدتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر مسٹر جی تھارچن ہیں جو تبت کے ایک اعلیٰ ماہر علم اور ادیب سمجھے جاتے ہیں انہیں بہت سے غیر ملکیوں کو اپنے وطن کی زبان سکھانے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اس رسالے میں صرف مقامی کوائف ہی درج نہیں کئے جاتے بلکہ واقعاتِ عالم سے تمام باشندگانِ ملک کو آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس کے تازہ ترین شماروں میں ایک مسلسل مضمون یعنی مسٹر اے ٹی اسٹیل کا سفرنامۂ تبت شائع ہو رہا ہے۔ نیز انگریزی زبان کے ذریعے سے تبتی صرف و نحو پر سبق دئے جا رہے ہیں تاکہ جو لوگ سیکھنا چاہیں انکی مدد سے تبتی سیکھ لیں۔

فنونِ لطیفہ کی نمائش

نئی دہلی کے ایوانِ نمائش میں جو پارلیمنٹ اسٹریٹ پر واقع ہے ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کو فنونِ لطیفہ کی نمائش کا افتتاح ہوگا جسے آل انڈیا فائن آرٹس اینڈ کرافٹس سوسائٹی کی جانب سے انٹیلیجنس بورڈ کے ایک افسر مسٹر ایل بی نگی ترتیب دے رہے ہیں۔ اس نمائش کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حکومتِ ہند کے صرف سرکاری ملازمین اپنے شاہکارِ فن پیش کر سکیں گے۔ چنانچہ موصوف نے تمام محکموں کو دعوت دی ہے کہ وہ اپنے ماتحت عملے کے ان لوگوں کو جو فنونِ لطیفہ سے شغف اور دلچسپی رکھتے ہیں، اس نمائش کو کامیاب بنانے کے لئے آمادہ کریں۔ اس نمائش کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ سرکاری ملازمین میں، جن میں اعلیٰ افسران سے لے کر ماتحت اہلکار تک سبھی شامل ہونگے۔ اچھے ہنرمند اور فنکار موجود ہیں۔ نمائشی اشیاء میں سب سے بڑا حصہ ان تصاویر کا ہوگا جو امپیریل ایگریکلچرل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے افسر ڈاکٹر بی پی پال اور پوسا آرٹ کلب کے اراکین پیش کرینگے۔

مولانا ابوالکلام آزاد

یہ امر موجبِ مسرت ہوا تھا کہ مسٹر آصف علی کو سفیر بنا کر امریکہ بھیج دیا گیا۔ اب مزید خوشی

اس خبر کے سننے سے حاصل ہوئی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد انکی جگہ عارضی حکومت میں شامل ہو گئے ہیں۔ مولانا کی ابتدائی زندگی یکسر علمی اور ادبی خدمات میں گذری ہے، اور اب بھی اگرچہ پورے انہماک کے ساتھ نہیں، تاہم کبھی کبھی ادبی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا زیادہ وقت سیاسی معاملات کو سمجھنے اور سمجھانے میں بسر ہوتا ہے۔ وہ ۱۹۱۴ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور اُسوقت سے ابتک اس کے ایک سرگرم رکن ہیں۔ تین بار انہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ آخری بار یہ انتخاب ۱۹۴۰ء میں ہوا اور وہ مسلسل پانچ سال تک اس عہدے پر فائز رہ کر اس سیاسی جماعت کی اعلیٰ خدمات انجام دیتے رہے۔

سڑکوں اور ریلوں کی توسیع

امریکہ روانہ ہونے سے قبل مسٹر آصف علی نے ملک کے ذرائع حمل و نقل پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان میں سڑکوں اور ریلوں کو توسیع دینے کی سخت ضرورت ہے۔ ریلیں، ہوائی جہاز اور ساحل کے آبی جہاز براہِ راست مرکزی حکومت کے ماتحت ہیں اور سڑکوں کا نظام صوبائی حکومت کے سپرد ہے لیکن باہمی مفاہمت کے ساتھ انکو بھی کل ہند پیمانے پر بنایا جا سکتا ہے۔ صرف اندرونِ ملک ہی میں سڑکوں اور ریلوں کو توسیع دینے کی ضرورت لاحق نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی سیاست کے ماتحت انکو پڑوسی ملکوں تک طول دینا ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ پشاور ریڈیو اسٹیشن سے تقریر کرتے ہوئے شمال مغربی سرحدی صوبے کے وزیر اعظم ڈاکٹر خان صاحب نے فرمایا کہ کاغان وادی سے گذرنے والی سڑک کو براہِ راست چین اور روس تک بڑھانے کی اسکیم زیرِ غور ہے اور اسے بہت جلد عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا جائیگا۔ اس سلسلے میں اخراجات کا زیادہ حصہ مرکزی حکومت کو برداشت کرنا پڑے گا لیکن کام صوبائی حکومت کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے ذریعہ ہوگا۔ اس شاہراہ کے علاوہ ایک اور اہم تجویز بھی زیرِ غور ہے۔ یعنی شمال مغربی سرحدی صوبے کو ریل کے ذریعہ کابل سے ملا دیا جائے گا۔ حکومتِ افغانستان بھی ایک ایسی ہی اسکیم پر غور کر رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی اور ثقافتی تعلقات تو اب بھی موجود ہیں لیکن اس طرح وہ زیادہ استوار ہو جائیں گے۔

جاپان میں زلزلہ

کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ عذابِ آلہٰی مختلف صورتوں میں نازل ہوا کرتا ہے۔ اربابِ سیاست کے غلط اندازوں اور کوتاہ اندیشیوں سے جاپان میں جان و مال کو جو نقصان عظیم پہنچا، اس کی تلافی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں نے اہلِ ملک کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ ہزاروں مر گئے، ہزاروں زخمی اور لاپتہ ہوئے اور لاکھوں بے خانماں برباد ہو گئے۔ ہیروشیما میں جو کچھ ایٹم بم کی تباہی سے بچا رہ گیا تھا، اس زلزلے کی نذر ہو گیا۔ امدادِ باہمی اور فلاحِ مشترک کی وہ انجمنیں جو برابر مصیبت زدگانِ جنگ کی مدد کر رہی تھیں اب اپنا دستِ تعاون اس ضمن میں بھی بڑھا رہی ہیں۔ اشیائے خورد و نوش کے علاوہ پارچہ جات وادویات کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بعض علاقوں میں جہاں لڑائی کے باعث حمل و نقل کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے یہ امداد ہوائی جہازوں کے ذریعہ ممکن ہوئی ہے۔

سندھ میں تین بجلی گھر

حکومتِ سندھ نے اپنے صوبے کی ترقی اور بہتری کے لئے برق آبی بنانے والے کارخانوں کے تین اہم خاکے مرتب کئے ہیں جن کو بہت جلد عمل میں لانے کے لئے تقریباً پانچ کروڑ روپے صرف کرنے پڑینگے۔ پہلا بجلی گھر دریائے روہڑی کے کنارے سکھر کے قریب تعمیر ہوگا جو دس ہزار کلوواٹ کی بجلی تیار کر سکیگا۔ جب نہر کے پانی میں کمی واقع ہوگی یا کسی اور وجہ سے خاص ضرورت لاحق ہوگی تو یہ کارخانہ بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔ اس اسکیم کے دائرے میں سکھر کے علاوہ روہڑی، شکارپور، جیکب آباد لاڑکانہ، خیرپور، راتو دیرو، کمبر، گڑھی لیسین، شاہ داد کوٹ، سٹو کری، بدھے، نصیر آباد، خان پور، رستم، پیرو گوٹھ، عیدو، لاکھی، آرین روڈ، جاک، باگرجی، جہان خان اور ہمایوں شامل ہیں۔ راستے میں جو دیہات آئیں گے، ان کا خیال بعد میں رکھا جائے گا۔ جب تک یہ اسکیم عمل میں آئے کچے تیل سے چلنے والا انجن اس کی جگہ کام کرے گا۔ دوسرا بجلی گھر سندھی ریلوے اسٹیشن کے پاس بنے گا، اور پانچ ہزار کلوواٹ کی بجلی تیار کرے گا۔ اس سے حیدرآباد کے علاوہ نواب شاہ ٹانڈو محمد خاں، ٹانڈو اللہ یار خاں وغیرہ کو فائدہ پہنچیگا۔ تیسرا بجلی گھر مشرقی نہر نارہ کے کنارے بنے گا اور ساڑھے سات ہزار کلوواٹ کی بجلی تیار کرے گا۔ لیکن اس کی تعمیر اسوقت عمل میں آئے گی جب روہڑی نہر کی اسکیم مکمل ہو جائیگی۔

جرمنی کے جنگی مجرم

جرمنی کے برطانوی علاقے میں ہزاروں جرمن نظر بند ہیں۔ ان میں سے ستائیس ہزار اشخاص پر جنوری کے آخری ہفتے میں مقدمات کی کارروائیاں شروع ہونگی۔ زیادہ لوگ ان سیاسی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو نورمبرگ کی جنگی عدالت عالیہ نے "مجرم" قرار دیا تھا۔ یہ مقدمے جرمنی کی عام عدالتوں میں ہونگے۔ ان اداروں سے تعلق رکھنے والے اور ہزاروں مجرم ابھی نظر بند ہی رہیں گے اور اپنی باری آنے پر اپنی صفائی پیش کر سکیں گے۔ برطانوی علاقے کے علاوہ دوسرے علاقوں میں بھی ایسے قیدیوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ جلدی یا دیر میں بہرصورت ان پر مقدمے چلائے جائیں گے اور ان کو بھی اپنے کئے کی سزائیں بھگتنی پڑینگی۔

چینی اشتراکیوں کی حکومت

پی پنگ کے مرکزی خبر رساں ادارے نے اطلاع دی ہے کہ چینی اشتراکیوں کا ایک جلسہ ان کے صدر مقام ین نان میں ہوا جس میں جماعت کے تمام بڑے اراکین کے علاوہ ماؤ تسی تنگ، چو تہہ اور جنرل چو این لائی بھی شامل ہوئے۔ انہوں نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ نانکنگ کی مرکزی حکومت کے مقابلے پر ہمیں بھی اپنی حکومت قائم کر لینی چاہیئے تاکہ صحیح نظام قائم ہو سکے۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اپنی ہوائی طاقت کو زیادہ استوار اور اقتصادی حالت کو بحال کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ اپنی قومی کارگذاریوں کا ساری دنیا میں پرچار کرنے

کے لئے انہوں نے ایک خاکہ بنایا ہے جس کے مطابق چینی اشتراکیوں کے ادارے برطانیہ، امریکہ اور فرانس میں کھولے جائیں گے۔ صدر مقام سے ایسے احکام بھی صادر ہوئے ہیں جن کی رو سے ان ضلعوں اور دیہاتوں میں جہاں اشتراکیوں کا تسلط ہے، تیاریٔ جنگ کی کمیٹیاں قائم کی جائیں گی "تاکہ بوقت ضرورت وہ فوراً لڑائی میں حصہ لے سکیں۔

ہندوستان اور آبپاشی

حال ہی میں آبپاشی کے مرکزی ادارے نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کے مطالعے سے چند نہایت دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ آبپاشی کے ضمن میں دنیا کا کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس ملک کی تقریباً سات کروڑ ایکڑ اراضی میں ہر سال آبپاشی ہوتی ہے اور یہ رقبہ اتنا زیادہ ہے کہ امریکہ، روس، میکسیکو، جاپان، مصر، ہسپانیہ، اطالیہ، فرانس، چلی اور جاوا کے زیر کاشت علاقے مجموعی طور پر اس کی برابری نہیں کر سکتے۔ اگر ملک کے کل رقبے کو مدنظر رکھتے ہوئے آبپاشی کے علاقے کا تناسب نکالا جائے تب بھی اس ملک کا اوسط دنیا کے دوسرے تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ ہندوستان میں آبپاشی کے کام پر کم و بیش ایک ارب چھپن کروڑ روپے سالانہ صرف ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں سب سے زیادہ نہریں اور اعلیٰ قسم کے بند بھی اس ملک میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستان کی تمام نہروں کو ایک سلسلے میں رکھا جائے تو کرۂ ارض کے گرد تین چکر لگ جائینگے۔ ہندوستان کے ریتیلے علاقوں میں برق آبی کے ایسے کارخانے قائم کئے گئے ہیں کہ ان کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں مل سکتی بلکہ ان کا لحاظ رکھتے ہوئے دوسرے ملکوں نے استفادہ کیا ہے۔ آبپاشی کی نہروں میں ہمیشہ روانی قائم رکھنے کے لئے جو طریقے یہاں قائم کئے گئے ہیں وہ دنیا کے کسی ملک کو ابتک معلوم نہیں تھے۔ ان حقائق کو مدنظر رکھکر کہا جاسکتا ہے کہ آبپاشی کے معاملے میں ہندوستان ساری دنیا کا راہنما ہے۔

کہر بارش کی صورت میں

گلاسگو کے ایک مشہور کیمیاں داں مسٹر میکنزی نے جن کی عمر اس وقت بہتر سال ہے، مسلسل تجربات کرتے رہنے کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ میں ایک ایسا کیمیاوی مرکب تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں جو کہر کو بارش کی صورت میں تبدیل کر دیا کرے گا۔ یہ مرکب "فیڈو" سے بھی زیادہ موثر اور کم خرچ ثابت ہو گا۔ انہوں نے مرکب کے ساتھ ساتھ ایک مشین بھی بنائی ہے جو اس خاص مرکب کو کہر آلود فضا میں پھیلا دیگی۔ اس دوا کے اثر سے کہر کی بیرونی سطح کا دباؤ کم ہو جائیگا اور رطوبت جو گیسوں کی حالت میں ملی جلی ہو گی، سیال ہو کر سطح زمین پر برس پڑے گی۔ اس طرح ایک طرف ان نقصانات سے بچنا ممکن ہو جائیگا جن سے کہر کے زیر اثر سامنا کرنا پڑتا ہے اور دوسری طرف بارش میدانوں اور کھیتوں کے لئے مفید ثابت ہو سکے گی۔

برطانیہ میں فلمی سرگرمیاں

جنگی تخریبات کے باعث ہر قسم کے تعمیری کاموں میں زبردست رخنے پیدا ہو گئے تھے اور ۱۹۳۹ء کے بعد سے ابتک بہت سے ادارے پورے جوش و خروش اور سرگرمیٔ عمل کے ساتھ اپنی کارگذاریاں پیش کرنے سے قاصر رہے تھے۔ تاہم اب برطانیہ میں فلمی پروڈیوسروں کی انجمن نے دو سال کا جو لائحۂ عمل پیش کیا ہے، وہ ایک حد تک حیرت انگیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد وہاں کے اس ادارے نے بڑی ترقی کی کیونکہ ۱۹۴۵ء میں باون اور ۱۹۴۶ء میں ساٹھ فلم بنا ڈالے۔ لیکن اس سال اس نے چوہتر فلم بنانے کا تہیہ کیا ہے جن پر بے قیاس رقم خرچ کی جائے گی۔ اگر اوسطاً ان میں سے ہر ایک فلم پر دو لاکھ پونڈ خرچ ہوئے تو کل فلموں پر ڈیڑھ کروڑ پونڈ صرف کرنے پڑینگے۔ پھر بعض ایسے فلم بھی تیار ہونگے جو دس لاکھ پونڈ سے کم میں نہیں بن سکتے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ صنعتی ادارہ مستقبل قریب میں بہت ترقی کرے گا۔ انجمن کے ڈائرکٹر جنرل سر ہنری فرنچ نے ان امور کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے کہ فلموں میں افادی عنصر کا زیادہ لحاظ رکھا جائے گا۔

محکمۂ ریلوے کے نئے منصوبے

دسمبر کے آخری ہفتے میں ریلوے کی اسٹینڈنگ فائنس کمیٹی کا جلسہ نئی دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت مسٹر آصف علی نے فرمائی۔ اس اجلاس میں لائحۂ عمل منظور ہوا ہے، جس پر پچاس کروڑ لاگت آئے گی۔ کمیٹی مذکور نے طے کیا ہے کہ ساڑھے گیارہ کروڑ روپے کے خرچ سے کنچرا پارہ کے مقام پر ایک عظیم الشان کارخانہ قائم کیا جائے جہاں ہر سال ایک سو بیس انجن اور پچاس بوائلر بنا کریں۔ کام اس طرح شروع کیا جائے گا کہ دسمبر ۱۹۵۰ء تک پہلا انجن تیار ہو سکے گا۔ اس سلسلے میں ۱۹۴۷-۴۸ء کے دوران میں ساڑھے پانچ کروڑ صرف کئے جائینگے۔ بی بی اینڈ سی آئی ریلوے کی لائنوں پر بنے ہوئے بہت سے پلوں کی مکرر تعمیر یا مرمت ہو گی اور بعض پلوں کے صرف پائے درست کئے جائینگے۔ دو ایک ریلوے اسٹیشنوں کو جدید وضع پر دوبارہ تعمیر کیا جائے گا۔

پچھلے سال یکم اپریل سے ۳۰ نومبر تک کل آمدنی ایک ارب بیس کروڑ اٹھانوے لاکھ ہوئی جو اس سے ایک سال پہلے کے اسی عرصے کی آمدنی کے مقابلے بقدر چودہ کروڑ ستاون لاکھ کم ہے۔ یکم اپریل سے ۳۱؍اکتوبر تک کل خرچ اناسی کروڑ چار لاکھ رہا جو ایک سال پہلے کے اسی عرصے کے خرچ کے مقابلے میں بقدر نو کروڑ تین لاکھ زیادہ ہے۔

غزل

صفی لکھنوی

پہونچا کہاں پہ لے کے مرا رہنما مجھے
آیا نظر جہاں نہ کوئی نقشِ پا مجھے

پیغام زندگی نے دیا موت کا مجھے
مرنے کے انتظار میں جینا پڑا مجھے

ہنگامِ دفن دی یہ لبِ گور نے صدا
جو کچھ دیا تھا میں نے وہ سب مل گیا مجھے

گھر سے چلا تھا کوچۂ جاناں کے قصد سے
یادش بخیر بھول گیا راستہ مجھے

اس انقلاب کی بھی کوئی حد ہے دوستو!
ناآشنا سمجھتے ہیں اب آشنا مجھے

انسانیت یہ کہہ کے یہاں سے چلی گئی
راس آئے گی نہ ہند کی آب و ہوا مجھے

کشتی پہنچ سکیگی یہ تا ساحلِ مراد؟
دھوکا نہ دے خدا کیلئے ناخدا مجھے

ایذا رساں وہ شوخ تو ایذا پسند میں
ملتا ہے ہر جفا میں وفا کا مزا مجھے

نافہم پارسا تو سمجھتے ہیں مجھکو رند
فہمیدہ رند جانتے ہیں پارسا مجھے

انصاف کی تلاش میں اس کی خبر نہ تھی
سہنا پڑینگے یوں ستمِ ناروا مجھے

پروردگار تو ہی بڑا کارساز ہے
تیرے سوا کسی کا نہیں آسرا مجھے

وہ طولِ عمر جسمیں نہ ہو لطفِ زندگی
مل جائے مثلِ خضر تو کیا فائدہ مجھے

دوں تیرا ساتھ عمرِ رواں کس طریق سے
آنکھیں دکھا رہے ہیں ترے نقشِ پا مجھے

ہر داغِ دل ہے مشہدِ صد خیلِ آرزو
کعبے میں آ رہی ہے نظر کربلا مجھے

تخلیق کائنات کو سوچا کیا، مگر
کچھ ابتدا ملی، نہ صفیؔ انتہا مجھے

سر عبدالقادر

ڈاکٹر محمد باقر

"سر عبدالقادر سے ملنے چلوگے؟" محمود نے پوچھا۔

"چلینگے" میں نے جواب دیا۔

"تو کل ناشتے کے بعد فوراً میرے پاس پہنچ جانا۔ میں ان سے وقت طے کر رکھوں گا۔ ویسے اس کی خاص ضرورت نہیں"

"خاص ضرورت نہیں! کیوں؟"

"تم دیکھ ہی لوگے" محمود نے اپنی فیلٹ ڈاکو ودن کے انداز میں ترچھی کرکے سر پر رکھ لی اور مسکراتا ہوا "شب بخیر" کہکر چلا گیا۔

دوسرے دن ناشتے سے کچھ ہی دیر بعد ہم ایک نہایت ہی خاموش ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوکر دروازے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ معاً دروازہ کھلا اور فرنگی خادمہ نے لندن کی دسمبر کی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے، کواڑ کھولتے ہوئے ہم سے پوچھا۔

آپ سر عبدل سے ملنے آئے ہونگے؟

میں نے تبسم زیر لب سے خادمہ کی قیافہ شناسی کی داد دیتے ہوئے کہا ہاں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ہماری اطلاع دے دیجئے!

ملازمہ نے دروازہ کھول دیا۔ "اطلاع کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے!"

میں نے سوچا محمود درست کہتا تھا۔ سر عبدالقادر کے دروازے ہر ایک ملاقاتی کے لئے کھلے تھے۔ ہم زینے کے قالین (لندن میں تمام زینوں پر قالین بچھے ہوئے ہوتے ہیں) کی صفائی اور خوبصورتی کی داد دیتے ہوئے خادمہ کے پیچھے پیچھے چلتے گئے اور زینہ ختم ہونے پر جب ایک دروازے کے سامنے رک کر دروازہ پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی "آیئے"۔ خادمہ نے دروازہ کھولا اور کہا۔ "سر عبدل آپ سے دو نوجوان ملنے آئے ہیں"۔ اتنے میں ہم بھی دروازے کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

سر عبدالقادر نے کھڑے ہوکر ہم دونوں سے مصافحہ کیا اور بڑے تپاک سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ محمود نے میرا تعارف کرایا اور میرے لندن آنے کی وجہ بھی بیان کی۔ آپ نے اردو ادب سے میری دلچسپی کا حال سنکر پوچھا۔

"آپ سے لاہور میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی؟"

میں نے عرض کیا "آپ سے غائبانہ عقیدت تو ایک عرصے سے ہے لیکن آپ سے ذاتی ملاقات کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ البتہ آج سے دس سال پہلے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں ۱۹۲۷ء میں آپ کی ایک تقریر سننے کا فخر حاصل ہوا تھا جب آپ حکومت ہند کے نمایندے کی حیثیت سے بین الاقوامی لیگ میں شامل ہوکر جنیوا سے لوٹ کر آئے تھے اور آپ نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ ایک یوروپین نے وہاں دنیا کے تمام مذاہب کے پیروؤں کی کانفرنس بھی کی تھی"۔

کہنے لگے "ہاں خوب یاد آیا۔ میں حال ہی میں اس آدمی سے پیرس میں ملا ہوں" اور اس کے بعد آپ نے اس وقت یعنی ۱۹۳۷ء میں وہ تمام خیالات دہرا دیئے جو آپ نے دس سال قبل ہمارے سامنے ۱۹۲۷ء میں بیان کئے تھے اور جو مجھے دھندلے طور پر بھی یاد نہ تھے لیکن میری ڈائری (جو اس وقت بھی لندن میں میرے ساتھ تھی) ان کی تصدیق کرتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ سر عبدالقادر کا حافظہ غیر معمولی ہونا چاہیے۔ بعد میں اس خیال کی تصدیق بارہا عملی طور پر ہوئی۔ آپ نے کسی آدمی کو سر عبدالقادر سے اگر چند منٹوں کے لئے بھی ملایا اور برسوں کے بعد جب دوسری دفعہ آپ سے ملا تو آپ نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا اور اچھی طرح پہچانا۔ رفتہ رفتہ مجھے یہ یقین ہوگیا ہے کہ اس قدر کثیر مشاغل اور اس قدر لوگوں سے ملنے والے آدمیوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا انسان ہو جس کو اپنے حافظہ پر اس قدر قدرت حاصل ہو بلکہ سچ پوچھئے تو میں نے اپنی عمر میں کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں دیکھا۔

ہم کچھ دیر سر عبدالقادر کے پاس بیٹھے رہے وہ اپنے تازہ سفر کے حالات بیان کرتے رہے۔ آپ ابھی ابھی ہندوستان سے رخصت ختم کرکے واپس آئے تھے گفتگو کے دوران میں آپ نے یہ بھی بتایا کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری بھی ہندوستان سے ان کے ساتھ آئے ہیں۔ کہنے لگے "ہندوستان سبھا یونین" میں آیئے۔ لطف رہے گا۔ حفیظ بھی آئینگے۔ سر عبدالقادر اس مجلس کے صدر اور روحِ رواں تھے اور دیوان شرر سکرٹری۔ اور اس مجلس کے رکن وہی ہو سکتے تھے جو اس مجلس کے جلسوں میں اردو میں گفتگو کریں۔ یونین کے جلسے نہایت باقاعدگی سے ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے کمرے میں ہوتے تھے اور اس میں کثرت سے ہندوستانی اور اردو علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے فرنگی بھی شامل ہوتے تھے۔ گویا لندن میں اردو کا مجلسی ہنگامہ سر عبدالقادر کی وجہ سے اس مجلس کے زیر اہتمام قائم رہتا تھا۔ جب حفیظ وہاں پہنچے تو اس مجلس کی مقبولیت اور بھی بڑھ گئی اور ہر جلسے میں لندن کے علاوہ آکسفرڈ، کیمبرج، گلاسگو اور برسٹل سے لوگ آنے لگے۔ نجانے سر عبدالقادر کے لندن سے چلے آنے کے بعد اس مجلس کا کیا حشر ہوا!

جن آدمیوں کو سر عبدالقادر سے مجلس میں ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کرینگے کہ مجلسی حیثیت سے آپ کا رتبہ بہت بلند ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ آپ ایک ایسے مجلسی فنکار ہیں جن کا ہم پلہ شاید

کوئی دوسرا ہو۔ آپ گھنٹوں ان کی باتیں سنتے رہیں تو سیری نہ ہوگی۔ بلکہ یہی
جی چاہے گا کہ زندگی فرصت دے تو کچھ لمحے اور آپ کے پاس بیٹھے رہیں۔ آپ نے
بہت سیاحت کی ہے اور دنیا کے مختلف ممالک کی اہم شخصیتوں سے مل چکے
ہیں لہٰذا آپ ان سے کسی موضوع پر کسی ملک کا ذکر کریں تو وہ اپنے ذاتی
تجربوں کی مدد سے ایسی لذیذ باتیں سنائیں گے کہ آپ سنتے سنتے کبھی نہیں اکتائینگے۔
طرزِ بیان میں اس قسم کا خلوص اور سادگی ہے کہ آپ فوراً ان سے مانوس ہو
جائینگے۔ اور سننے والے کو بھی یہ محسوس نہیں ہونے دینگے کہ رتبے یا عزت
یا وجاہت میں وہ سامعین سے کس قدر بلند یا ارفع ہیں۔

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے کہ آپ نے اردو سے متعلق میرے ایک لکچر کی صدارت
قبول فرمائی۔ لکچر لندن کی گوور سٹریٹ انڈین سٹوڈنٹس یونین کے ہال میں
ہوا۔ لکچر سے فراغت ہوئی تو کہنے لگے "بھائی۔ یہاں کی کافی بہت مشہور ہے آیئے
آپ کو کافی پلوائیں۔" ہم نے بہترا کہا کہ آپ ہمارے مہمان ہیں۔ لیکن آپ
بضد ہو کر میزبان بن ہی گئے۔ اس وقت ہم چار پانچ آدمی آپ کے ساتھ رہ
گئے تھے۔ ان میں سے ایک دارا بھی تھے جو بیرسٹر ہو جانے کے باوجود لندن
میں صرف دماغی عیاشی کرتے تھے اور ان کی جسمانی نقاہت اور دماغی انحطاط میں
کوئی زیادہ تفاوت نہیں تھا۔ دارا صاحب نے بیٹھتے ہی آپ سے پوچھا "شیخ صاحب
غالب کا وہ شعر سنا دیجئے جو اگلے دن آپ نے مجھے سنایا تھا۔" سر عبدالقادر
نے کہا "پہلے میں آپ کو اس شعر کا استعمال سناتا ہوں اور پھر شعر۔" ہم سب
بیتابی سے ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگے۔ آپ نے کہا "میں جب اس دفعہ لندن
میں وزیر ہند کا مشیر ہو کر آ رہا تھا۔ تو نجی ضرورتوں کے پیشِ نظر میں نے اپنی
زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر دیا۔ لاہور کے سٹیشن پر لندن کو روانگی کے وقت
جب احباب الوداع کہنے آئے تو ہمارے ایک بہت پرانے جاننے والے
مبارک اور سلامت روی کی دعا دینے کی بجائے سرگوشی میں کہنے لگے۔
شیخ صاحب ایک معزز عہدے پر جا رہے ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند
نہیں آئی کہ آپ اپنی زمین کا ایک ٹکڑا فروخت کر کے جا رہے ہیں۔
میں نے عرض کیا آپ نے غالب کا وہ شعر نہیں سنا۔ ؎

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف، بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخ مئے لالہ فام چیست۔

انگلستان کا سفر در پیش ہے تو یہ بھی کرنا ہی ہوگا۔"

لندن میں ایک عید کے موقعے پر ایک دعوتی رقعہ پر یہ بھی لکھا ہوا تھا
کہ ناچ کا انتظام مفت ہوگا۔ جس وقت آپ کو دعوت ملی میں پاس بیٹھا ہوا
تھا۔ آپ نے دعوت دینے والوں سے کہا کہ آپ ناچتے گاتے رہتے لیکن
عید کے موقعہ پر اس کا تذکرہ کیا ضرور تھا۔ یہ گفتگو کرتے کرتے جدید تہذیب
و تمدن پر تبصرہ ہونے لگا۔ اور میں نے شکایت کی کہ مسلمان رفتہ رفتہ اپنے
تمدن سے بہت دور ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں تک اپنی زبان سے بھی نامانوس
ہو رہے ہیں۔ کہنے لگے "ایک بات بتاتا ہوں لیکن خدا کے لئے اسے
ہمایوں میں نہ لکھ دینا (ان دنوں میرے مضامین ہمایوں میں شائع ہو رہے تھے)
میرے اصرار پر آپ نے بتایا کہ آپ .... صاحب سے اگلے دن ملے تھے
(سر عبدالقادر کے ارشادات کا لحاظ رکھتے ہوئے نام عرض نہیں کرونگا)
آپ کو معلوم ہے کہ یہ ہندوستان کے ایک نہایت معزز سید خاندان کے
چشم و چراغ ہیں اور ان کے والد کتنے بلند پایہ عالم تھے۔ میرے ان کے
والد سے بھی تعلقات تھے۔ میں نے ان سے ان کی والدہ کی خیر صحت پوچھی
تو کہنے لگے "چشم بددور، بنتِ شب حرام، ماشاءاللہ اچھی ہیں۔" شاید یہ
لفظ کہیں سے سن رکھے تھے جن کو انہوں نے جمع کر دیا۔

وزیر ہند کے مشیر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر لندن سے لوٹ کر
آئے اور میں لاہور میں ان سے ملنے گیا۔ تو خاموش خاموش سے تھے لیکن
غمگین نہیں تھے۔ میں نے وجہ پوچھی۔ کہنے لگے میں نے اپنی عمر میں اس پاک
مقولے کو اپنی زندگی کے تجربوں سے صحیح پایا ہے کہ عرفت ربی بفسخ العزائم
(میں نے خدا کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے) اور کافی عرصہ تک
اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی داستان سناتے رہے۔ ان واقعات کو لکھوں
تو اس شمارہ کے سب صفحات بھر جائیں۔ آخر میں ایک بات سنائی کہ لندن میں
آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کے بیٹے کیپٹن احسان قادر جنگ شروع ہو جانے کی
وجہ سے عنقریب محاذِ جنگ پر جانے والے ہیں (یہ ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے)
چونکہ آپ اپنے اس بیٹے سے ایک عرصے سے نہیں ملے تھے اس لئے آپ
اپنے عہدہ سے فارغ ہو کر جلدی جلدی ہندوستان پہنچے اور سیدھے
حیدرآباد چلے گئے جہاں کہ ان کا لڑکا مقیم تھا لیکن جس دن آپ حیدرآباد
پہنچے اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے ان کے صاحبزادے وہاں سے چل دیئے
تھے اور آپ کو ان سے ملنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

سر عبدالقادر کو اولاد سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے۔ آپ کے
سب صاحبزادے اس وقت ماشاءاللہ بڑے ہو چکے ہیں اور ایک
کے سوا سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن میں نے آپ کو
بارہا ان کے متعلق متفکر دیکھا ہے۔ اور اکثر ان کی بہتری کے وسائل
سوچتے پایا ہے۔ لیکن اولاد سے اسقدر شفقت کے باوجود آپنے اولاد
(آپ کے زندہ بچے صرف لڑکے ہیں) کے متعلق اس انداز میں کبھی گفتگو
نہیں کی جس سے اولاد کی شکایت یا ان سے کسی قسم کی دنیاوی مدد کی خواہش
کا اظہار ہو۔ بلکہ کہا کرتے ہیں۔ میں خود چلتا پھرتا اور کام کرتا ہی مروں گا۔
غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی طبیعت میں صبر اور تحمل کا مادہ بہت
زیادہ ہے۔ لاہور میں (آپ کا مکان ٹمپل روڈ پر ہے) ایک دفعہ میں
آپ سے ملنے گیا۔ تو دیکھا لیٹے ہوئے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو مسکرا کر
کہنے لگے "بھئی کئی دن سے بغل میں ایک پھوڑا ہے۔ جس میں بے حد درد

اور تکلیف ہے۔ لیکن کیا کروں بہرحال جب تک یہ اچھا نہ ہو اسے برداشت کرنا ہی ہوگا"۔ میں نے دیکھا کہ تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ بستر پر پہلو بھی آسانی سے نہیں بدل سکتے تھے۔ عمر اس وقت ساٹھ سال سے (یہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے) تجاوز کر چکی تھی لیکن استقلال کا یہ حال کہ اس قدر شدید تکلیف کے باوجود مسکرا رہے تھے۔

آپ مرنجاں مرنج انسان ہیں۔ چند سال ہوئے کہ لاہور کے مشہور اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے پنجاب کی اہم شخصیتوں کا ایک جائزہ لیا اور انکے سوانح حیات پر ایک مختصر سا تبصرہ کیا۔ شیخ سر عبدالقادر کے سیاسی عقاید کے متعلق سوانح نگار نے لکھا کہ آپ ملک کی تمام قومی تحریکوں کو اچھا سمجھتے ہیں اور ہر قسم کے لیڈروں کے مفید کاموں کی تعریف کرتے ہیں لیکن آپ کبھی کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں رہے۔ میں نے یہ تبصرہ پڑھا تو آپ سے ملنے گیا اور میں نے عرض کیا کہ بظاہر یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہر قسم کی سیاسی تحریک کو پسند کرتے ہوں۔ لیکن کم از کم اخبار نے تو یہی لکھا ہے۔ کیا آپ اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا 'ہاں'۔ میں نے توجیہ چاہی تو آپ نے کہا "میاں بات یہ ہے کہ میں ہر اس تحریک کو اچھا سمجھتا ہوں جو ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لئے جاری کی جائے۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ ہر ایک تحریک کو جاری کرنے والوں کی نیت یہی ہوتی ہے۔ پھر ہر ایک تحریک میں چند ایسے اچھے آدمی بھی ہوتے ہیں جو نیک نیتی سے ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں ایسے لیڈروں کو بھی اچھا سمجھتا ہوں۔ صرف میرا اختلاف سیاسی لوگوں اور سیاسی تحریکوں سے اسوقت شروع ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں میں سے چند لیڈر خودغرضی کے راستے پر چل رہے ہیں اور تحریک حد اعتدال سے تجاوز کر رہی ہے"۔ اعتدال کا تذکرہ چھڑا تو میں نے کہا، مسلمان تو عام طور پر اتنی دنیاداری نہیں جانتے کہ ہمیشہ اعتدال سے کام لیں۔ اس پر آپ نے زندگی کا ایک واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "میں لائلپور میں وکالت کرتا تھا۔ ایک ہندو موکل تشریف لائے اور میں نے مقدمہ کی فیس دوسو روپے طلب کی۔ مؤکل نے کہا صاحب موت بھی مانگنے سے نہیں ملتی اگر آپ پونے دوسو لے لیں تو پیش کیا جائے۔ میں نے دوسو روپے پر اصرار کیا تو موکل ایک اور معزز وکیل کے پاس چلا گیا۔ جس نے پونے دوسو پر مقدمہ کی وکالت کرنا منظور کر لیا اور موکل نے اس واقعہ کی اطلاع آ کر مجھے دی اور کہا آپ مسلمان ہیں نا، دنیاداری نہیں جانتے پچیس روپے کی بات ہی کیا تھی آپ نے پونے دوسو روپیہ بھی ضائع کر دیا۔ یہ واقعہ سننے کے بعد مجھے لندن کا ایک واقعہ یاد آیا جو میں نے آپ کو بھی یاد دلایا میں لندن یونیورسٹی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کرنے میں مصروف تھا۔ ایک دن اپنے مرحوم پروفیسر ڈاکٹر بیلی سے کچھ اختلاف ہوا تو میں نے اپنے دعوی پر اصرار کیا اور اس کے ثبوت میں کئی مستند حوالے پیش کئے۔ لیکن اس دن ڈاکٹر بیلی کسی طرح قائل نہ ہوئے وہ اس پر مصر تھے کہ میں وہ حصہ مقالہ سے حذف کر دوں۔ میں یونیورسٹی سے بہت آزردہ اور پریشان ہو کر سیدھا سر عبدالقادر کے پاس انڈیا آفس میں پہنچا جہاں آپ کام کیا کرتے تھے۔ میں نے سارا واقعہ سنایا اور بڑے جوش سے اپنے دعوی کی حمایت میں ثبوت پیش کئے۔ آپ نے سارا ماجرا سن کر کہا بھئی مجھے تم سے اتفاق ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ اگر تمہارے اصرار کی وجہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری نہ ملی اور یہاں سے فیل ہو کر گئے تو یہ قصہ کس کس کو سناتے پھرو گے۔ تمہیں آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔ ڈاکٹر بیلی جس طرح کہتے ہیں ویسے ہی کر دو اور ڈگری لے کر گھر کو سدھارو"۔ میں مطمئن ہو کر واپس چلا آیا۔

آپ کی ذاتی شرافت، کسر نفسی اور رواداری کا ذکر میں نے کچھ اس طرح کیا ہے کہ شاید یہ گمان پیدا ہو جائے کہ آپ اصول کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن میں نے ہمیشہ آپ کو شدت سے اپنے اصولوں کی پابندی کرتے دیکھا ہے۔ میرے ایک بزرگ نے ایک دفعہ باصرار مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا کہ میں ذاتی اثر سے کام لے کر اور سفارش کر کے آپ سے ایک ایسا کام کرنے کو کہوں جو اصول کے خلاف تھا۔ آپ اس وقت بہاولپور میں چیف جسٹس تھے۔ میں نے پہنچنے سے پہلے تار دے دیا تھا۔ آپ نے اسٹیشن پر موٹر بھیج دی۔ اپنے پاس ایک نہایت مکلف کمرے میں ٹھہرایا۔ فرصت میں میں نے عرضداشت کی تو نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا بھئی یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے۔ تمہاری دلیلیں درست لیکن مجھ سے ایسا نہ ہوگا۔ میں اپنا سامنہ لے کر چلا آیا۔

سر عبدالقادر کی سیرت نگاری صرف ذاتی تجربات کی بنا پر ہی کرنے لگوں تو اس قلیل فرصت میں کم نہ ہوگی ادھر ایڈیٹر صاحب کا اصرار ہے کہ اختصار سے کام لیا جائے اور سوانح نگاری بھی کی جائے۔ اس لئے آپکے کچھ سوانح حیات بھی عرض کرتا ہوں۔ خان بہادر شیخ عبدالقادر لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں آپ نے فورمن کرسچین کالج لاہور سے بی۔ اے پاس کیا۔ اور پنجاب آبزرور کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ۱۹۰۴ء میں انگلستان بیرسٹری کے لئے گئے اور بلاد اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے واپس آئے۔ دلی، لائلپور اور لاہور وکالت کرتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج ہوئے مختلف اوقات میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن، ڈپٹی پریذیڈنٹ، پریذیڈنٹ، وزیر تعلیمات، وائسرائے کے ایگزیکٹو کونسل، وزیر ہند کے مشیر، بیرون ممالک حکومت ہند کے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

تعلیم اور تہذیبِ نفس

سر عبدالقادر

تقسیم اسناد کی تقریب پر یہ رسم ہے کہ خطیب وقت طلبہ کو کچھ نصیحت آمیز باتیں کہنا ہے۔ میرے ذمے بھی یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ میں ان طلبہ کے سامنے کچھ نصائح پیش کروں جو اس علمی ماحول سے باہر جانے اور عمل کی دنیا میں قدم رکھنے کو ہیں۔ مگر کوئی مشورہ دینے سے قبل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ناصح بننا زیادہ پسند نہیں کرتا ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگراں — ناصح خود یافتم کم در جہاں

میں خود اپنی عمر کے ستر سے زیادہ برس بسر کرنے کے باوجود ابھی محتاج نصیحت ہوں تو میں نوجوانوں کو کیا نصیحت دوں۔ جوانی کا عموماً یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ہر چیز کو آزمانے اور غلطیاں کرنے کے بعد تجربہ کے راستے سے صحیح نظریئے قائم کرنا چاہتی ہے اور دوسروں کے تجربوں پر انحصار کرنا نہیں چاہتی۔ میں چند ایسے اصولی امور کی طرف توجہ دلاتا ہوں جن کو آپ دلیلِ راہ کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔

پہلا اصول جو زندگی میں داخل ہوتے ہی اختیار کرنا چاہیئے، وہ رواداری ہے۔ یعنی کسی دوسرے شخص یا کسی دوسری جماعت کی رائے یا عقیدے کو صرف اس بنا پر غلط یا ناقابل قبول نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ آپ کی رائے یا عقیدے سے مختلف ہے۔ بلکہ ہر رائے کے سننے اور اس پر غور کرنے کے بعد اس کے موافق اور مخالف دلائل سن کر فیصلہ کرنا چاہیئے اس عادت کی کمی اور عدم رواداری ہمارے ملک میں طرح طرح کی تکالیف کا باعث ہے۔ اور بہت سے جھگڑے اور فساد رواداری نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان پڑھ لوگ اور کم پڑھے ہوئے زیادہ تر تنگ خیال ہوتے ہیں اور اختلاف رائے کو برداشت نہیں کر سکتے اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو اصحاب اعلیٰ تعلیم سے مستفید ہو چکے ہیں۔ انھیں روشن خیالی سیکھنی چاہیئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی اپنی رائے نہ ہو۔ یا ہوا کا ہر جھونکا ان کی رائے کو بدلتا رہے۔ اگر دوسروں کی رائیں سننے کے بعد وہ اپنی یا اپنی جماعت کی رائے کو قابل ترجیح سمجھیں تو اس پر ضرور قائم رہیں۔ اور دوسروں کو دلائل کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ نامناسب ہے کہ اختلاف رائے کی وجہ سے دوسروں کو بدظنی کی نگاہ سے دیکھیں۔ یا ان کی نیتوں پر حملے کریں۔ یا ان سے میل جول منقطع کر دیں۔

دوسروں پر بدظنی بڑھتے بڑھتے باہمی نفرت کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور کسی ملک کے باشندوں کے لئے باہمی مخاصمت یا نفرت سے زیادہ کوئی بیماری نہیں ہو سکتی ہم آج کل ہندوستان کی تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ہیں اسمیں بدقسمتی سے یہ بیماری زوروں پر ہے اور ملک کے اطراف و جوانب سے فرقہ وارانہ فساد اور کشت و خون کی خبریں آ رہی ہیں اور کلکتہ اور بمبئی جیسے بڑے شہروں میں اسوقت تک ہزاروں جانیں تلف ہو چکی ہیں اور اس سے بھی زیادہ لوگ زخمی ہو کر ہسپتالوں میں چلے گئے ہیں اور بعض پر اور بھی مذموم قسم کے حملے ہوئے ہیں۔ جا بجا لوگوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگ رہی ہیں۔ کہیں تقریروں اور جلسوں کی ممانعت ہے کہیں پانچ سے زیادہ آدمی مل کر نہیں نکل سکتے۔ کہیں شام کے بعد گھر سے نہیں نکل سکتے۔ ازراہ انصاف کہئے۔ کہ یہ بھی کوئی زیست کا طور ہے۔ ہم چلے تھے مزید آزادی کو بڑھانے اور رہی سہی کو بھی کھو کر بیٹھ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی ایک ضروری شرط کو بھول گئے ہیں اور وہ یہ کہ آزادی جب حاصل ہوتی ہے کہ انسان اپنے ہاتھ سے اس کو محدود رکھنا سیکھ جائے۔ اور کسی معاملے میں حد سے نہ گذرے، نہ دوسروں کو برا بھلا کہہ کر انہیں اشتعال دے اور نہ اشتعال سے دست درازیوں کا حوصلہ بڑھائے۔ اس جلتی آگ پر پانی ڈالنا آپ لوگوں کا کام ہے۔ اگر اس جامعہ سے سند پانے والے نوجوان اور اسی طرح کے اور تعلیم یافتہ نوجوان یہ عزم کر لیں کہ وہ اپنی تقریر اور تحریر سے اور اپنے مجموعی اثر سے باہمی صلح کی کوشش کریں گے اور لڑائی جھگڑے کو مٹانے میں ساعی ہوں گے تو ملک کی زہریلی اور مکدر فضا صاف ہو سکتی ہے۔

اس کوشش میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کا وہ طبقہ جو اخبارات سے تعلق رکھتا ہے یا تعلق پیدا کرنے کو ہے خاص طور پر مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ اخبارات اس زمانہ میں عوام کی رائے پر بے حد اثر ڈال سکتے ہیں اور ڈالتے رہتے ہیں اور اس اعتبار سے ہر اخبار کا ایڈیٹر اور اس کے نائبین اور اس کے خبررساں رپورٹر اور نامہ نگار ذمہ دارانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی ایک رپورٹر کی غلط یا مشتبہ خبر جو کافی چھان بین یا تحقیقات کے بغیر شائع کر دی گئی ہو بعض اوقات ملک بھر میں آگ لگا سکتی ہے اور مختلف جماعتوں کو آپس میں لڑا سکتی ہے جن ناگوار حالات کا ابھی ذکر کیا گیا ہے اور جو آگ ان سے لگی ہوئی ہے۔ وہ اخبارات کے بجھائے سے بجھ سکتی ہے۔ اگر وہ اس کے بجھانے میں کوشاں ہوں۔

اغلب ہے کہ آپ میں سے کئی فن اخبار نویسی کو جو ایک معزز اور آزاد مگر غریبانہ پیشہ ہے، اختیار کریں گے۔ ان سے میں یہی کہوں گا کہ اگر اخبار نویس کی غریبانہ زندگی کو دوسرے زیادہ کمائی والے پیشوں پر اسکی آزادی کے لحاظ سے ترجیح دی ہے تو کسی لالچ یا طمع کو اپنے منصفانہ

اور آزادانہ طرزِ عمل کے راستے میں حائل نہ ہونے دیں۔ اور یہ نہ پروا کریں کہ آپ کے اخبار کے ایڈیٹر کو کس قسم کی رپورٹ پسند ہو گی بلکہ یہ دیکھیں کہ صداقت کا کیا تقاضا ہے۔ آپ اپنے آپ کو صداقت کا مزدور سمجھیں۔ نہ کہ زید عمر کا ملازم۔ اس سلسلہ میں یہ جتا دینا بےجا نہ ہو گا کہ اخباری زندگی میں تاحال مسلمانوں کا حصہ جتنا ہونا چاہیئے۔ اس سے بہت کم ہے۔ اور اس میں زیادہ نوجوانوں کی شمولیت کی ضرورت ہے جتنی مفید تحریکیں ملک یا ملت کی ترقی کے لئے درکار ہوں۔ وہ اخبارات اور ان کے خبررساں کارندوں کے بغیر نپپ نہیں سکتیں۔ اور جو لوگ اخباروں کو صحیح واقعات کی اطلاع دیتے رہتے ہیں وہ ایک بھاری خدمت کر رہے ہیں خواہ اس خدمت کا معاوضہ نسبتاً قلیل ہو۔

اخبارات اور ان کے نامہ نگار اگر رواداری اور صلح پسندی کی راہ اختیار کریں تو وہ اپنے وطن عزیز کے ایک بڑے مسئلے یعنی ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے کے حل میں معتدبہ امداد دے سکتے ہیں یہ مسئلہ ہمیشہ اہمیت رکھتا تھا اور ملک کی قسمت کا فیصلہ اس کے منصفانہ حل پر موقوف ہے۔ مگر اس بیسویں صدی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندوستان میں یوں تو بہت سی قومیں آباد ہیں مگر یہ دو تعداد میں زیادہ ہیں اور اپنی اپنی تاریخی اور تمدنی روایات کی مالک ہیں ان میں اگر اتفاق ہو تو ہندوستان بڑی سے بڑی دول میں شمار ہو سکتا ہے اور ان میں اگر اندرونی مخاصمت اور نفاق رہے تو ہندوستان باوجود اپنی جغرافیائی بڑائی اور اپنی زمین کی خداداد زرخیزی کے کمزور ملک ہو گا۔ اس لئے قوم وملت کے بہی خواہوں کی یہ کوشش ہونی چاہیئے۔ کہ باہمی اتفاق اور محبت کی تلقین کریں۔ تاکہ ہر کہ ومہ یہ سمجھ جائے کہ سیاسی نظریے اگر مختلف بھی ہوں تو بھی باہمی میل جول پر ان کا اثر نہیں پڑنے دینا چاہیئے۔ کیونکہ آخر ہندو مسلمان دونوں اسی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں انہیں ایک دوسرے سے دیوار بہ دیوار رہنا ہے اور یہیں پیوندِ زمین ہو جانا ہے۔ نہ ہندوؤں میں سے وہ لوگ جو پہلے وسط ایشیا یا غرب ایشیا سے یہاں آئے تھے پھر وہاں جا کر آباد ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے وہ حصے جو عرب یا ایران یا افغانستان یا بخارا اور سمرقند سے آئے تھے پھر وہاں جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نسل اور خون کے لحاظ سے بھی یہیں کی پیداوار ہے۔ اس لئے حق ہمسائیگی کا یہ تقاضا ہے کہ ایک دوسرے کے ہمدرد رہیں اور ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک ہوں۔ اور ایک دوسرے کی دل آزاری اور توہین اور تضحیک سے گریز کریں۔

اخباروں کے عارضی مضامین کے سوا پائدار علمی خدمات بھی آپ میں سے اکثر کو مرغوب ہوں گی۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ تصنیف وتالیف کے ذریعہ ملک کی خدمت کریں اور عزت کی روزی کمائیں تو یہ بھی بہت اچھا راستہ ہے۔ بشرطیکہ یہ کام اس عزم کے ساتھ اختیار کیا جائے کہ جو کتابیں تصنیف کی جائیں یا شائع ہوں۔ ان سے ملک کے تمدنی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی حالات بہتر ہو سکیں اور جو میلان بعض حلقوں میں اخلاقی پستی پیدا کرنے والی تحریروں کی طرف ان دنوں ہو رہا ہے' اس کا ساتھ نہ دیا جائے اس میں شک نہیں کہ بازار میں اس دوسرے قسم کے مال کی گاہکی ضرور ہے، مگر اعلیٰ تعلیم والوں کو نہ چاہیئے کہ کسی عارضی نفع کے لئے خود بھی بداخلاقی کے بڑھانے کی ذلت گوارا کریں اور جو ان کی کتابوں کو پڑھیں انھیں بھی رسوائی کا راستہ دکھائیں۔ کتابوں میں تراجم کی طرف جامعہ ملیہ کی مکتبہ نے بھی توجہ کی ہے اور عجب نہیں کہ آپ میں سے کئی نوجوان اس طرف مائل ہوں کہ دوسری زبانوں سے اردو میں کتابوں کے ترجمہ کریں یہ بہت ضروری کام ہے اور کتابوں کے پڑھنے اور خریدنے کا شوق ملک میں بڑھ رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ شغل آمد کے لحاظ سے بھی اچھا ہو گا مگر اس سے ملک کو فائدہ اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ جو کتابیں ترجمے کے لئے چنی جائیں ان کا انتخاب صحیح ہو۔ بعض کتابیں ایسی ترجمے کے ذریعے ملک میں پھیل رہی ہیں۔ کہ ان سے فائدہ کی جگہ نقصان کا احتمال ہے۔ اس ضمن میں مجھے ایک نصیحت یاد آتی ہے۔ جو ایک معمر خاتون نے مجھے دی تھی جب میں پہلے پہل طالب علمانہ حیثیت سے انگلستان گیا تھا۔ میں اس سے پہلے کئی سال مسلمانوں کے ایک انگریزی اخبار موسومہ پنجاب آبزرور کی ایڈیٹری میں صرف کر چکا تھا اور اردو میں رسالہ مخزن بھی شائع کر رہا تھا۔ جب اس لیڈی نے یہ سنا تو مجھ سے دریافت کیا تم انگلستان سے بھی کچھ مضامین لکھ کر اپنے ملک کو بھیجا کرو گے۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ وہ کہنے لگی کہ یہاں اچھی چیزیں بھی ہیں اور بری بھی۔ تم وہ چیزیں یہاں سے بھیجنا جو تمہارے اہل وطن کے لئے مفید ہوں اور ان کا ذکر نہ کرنا جو بری نظر آئیں۔ کیونکہ برائی کا حصہ ہر ملک میں کافی ہوتا ہے۔ باہر سے ادھر لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے دل پر اس خاتون کے اس مشورہ کا بہت اثر ہوا اور میں نے حتی الوسع اس مشورے پر کاربند ہونے کی کوشش کی۔

علمی اور قلمی پیشوں کے سوا بھی بہت سے ذرائع جائز معاش کی تلاش کے ہیں اور اسی لئے اس درسگاہ میں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ دستکاری اور ہنر پر زور دیا گیا ہے۔ آپ میں سے کئی اپنے اپنے سیکھے ہوئے ہنر سے کام لیں گے۔ اس جامعہ نے دستکاری کے درجے کو پہلے سے بلند کر دیا ہے۔ اور اگر اس ارادے کی تکمیل میں کامیابی ہوئی کہ موجودہ دستکاری کی جماعتوں کی توسیع کر کے اپنے صنعتی شعبے کو ایک پالی ٹیکنک بنا دے، جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے تو دستکاری کا رتبہ اور بھی بڑھ جائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جامعہ میں پڑھے ہوئے طالب علم نہ صرف خود اپنے اپنے ہنر کو ذریعہ معاش بنائیں۔ بلکہ اس اصول کی تبلیغ کریں اور وہ جھجک جو اب تک بعض دلوں میں ہے کہ وہ

پیشہ قلم کو نسبتاً بہتر اور ہاتھ سے کام کرنے کو کم معزز سمجھتے ہیں، لوگوں کی طبائع سے نکل جائے۔ کسی ملک کے عوام میں وہ خودداری جو آزادی کی بنیاد ہے پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اہل حرفت وصنعت کو نظر حقارت سے دیکھنے کا رواج ہو۔ انگریزوں نے ڈیڑھ دو سو برس ہمارے ملک میں اتنی دور سے آ کر حکومت کی ہے۔ ان کی کامیابی کا ایک راز یہی تھا کہ وہ حرفت و صنعت اور تجارت کو باعزت کام سمجھتے تھے جس شخص نے دخانی انجن ایجاد کر کے قوموں کی قسمت اور نظام کو دفعتاً پلٹا دے دیا وہ صناع ہی تھا۔ ان کے ملک میں بہت سے گھرانوں کے نام ان کے پیشوں سے متعلق ہیں۔ سمتھ بہت مشہور نام ہے۔ اس کے معنی لوہار کے ہیں۔ مختلف پیشوں کے لوگوں نے انگلستان میں اور دیگر حصص یورپ میں اپنے گلڈ یعنی انجمنیں قائم کیں۔ ان انجمنوں نے اپنی برادری کی مجالس شوریٰ کے لئے بڑے عالی شان ایوان قائم کئے ہیں جن میں بہت سے اب تک موجود ہیں۔ اور ان کے جلسوں میں جب اس ہنر کے پیشہ در شامل ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کا اعزاز اسی طرح کرتے ہیں جیسے سیاسی پارلیمنٹ کے رکن کرتے ہیں۔ ہر رکن دوسرے کو آنریبل کہہ کر خطاب کرتا ہے اور قابل عزت سمجھتا ہے۔ ان میں سے بعض انجمنیں زمانہ بھر کی دولت جمع کر کے ایسی مالا مال ہو گئی ہیں۔ کہ ان کے ہاں دعوتوں کے موقع پر چاندی سونے کے برتنوں کا مجموعہ دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں ہر مزدور اور معمار اور ترکھان کا یہ حال ہے کہ وہ جب کسی کے ہاں مزدوری کرنے آتا ہے تو گھر والوں سے تن کر بات کرتا ہے اور ذرا سی اونچی آواز یا جھڑک برداشت نہیں کرتا۔ گویا وہ مساوات کی بنیاد پر کام کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو کسی سے کم نہیں سمجھتا۔ صرف اس لئے کہ دوسروں کا کام اچھے کپڑے پہن کر کرنے کا ہے اور اس کے کپڑے اس وقت میلے ہیں۔

یہی میلان میں نے اپنے سفر استانبول کے زمانے میں ترکوں میں پایا۔ ان کے ہاں لفظ آفندی معزز لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ میں نے دیکھا کہ دکاندار کو اس کی دوکان کا گاہک آفندم کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور وہ گاہک کو آفندم کہہ کر جواب دیتا ہے مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ دوکانداروں اور اہل صنعت میں سے بیشتر لوگ اس لئے بھی آفندی کہہ کر بلائے جاتے ہیں کہ وہ کچھ عرصہ فوجی تربیت پا چکے ہیں۔ اور وہ ایسے سپاہی ہوتے ہیں کہ جب ضرورت ہو وہ فوجی خدمت میں حصہ لے سکیں۔ استانبول میں مسلمانوں کی بہت سی دکانوں پر چوکھٹوں میں لگے ہوئے قطعات آویزاں تھے جن پر الکاسب حبیب اللہ لکھا ہوتا تھا۔ یعنی کسب حلال کرنے والا خدا کا دوست ہے۔ اس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کی بڑائی ان کی مصنوعات کی بڑائی پر موقوف ہے۔ اور ان کی دولت کا راز ان کی تجارت ہے۔ اپنی مصنوعات باہر بھیجتے ہیں اور دوسرے ممالک سے کھانے پینے کی چیزیں اور کچا مال اپنے ہاں منگواتے ہیں۔

تجارت کو سب ترقی یافتہ قومیں سلطنت سے بڑھ کر سمجھتی ہیں۔ اور موجودہ صدی کی دونوں عالمگیر لڑائیاں در اصل تجارتی اور اقتصادی اسباب سے ہوئی ہیں۔ کیونکہ یہ اصول تو گزشتہ جنگ عظیم کے وقت طے ہو گیا تھا کہ کسی فاتح ملک کو مفتوح ممالک پر مستقل قبضہ رکھنے کی اجازت نہیں ہو گی اور شکست پانے والی قومیں بھی اپنے ملک کی زمینوں سے محروم نہ کی جائیں گی۔ اس لئے ان کا اصلی جھگڑا یہ تھا کہ تجارتی منڈیوں پر کسی ایک قوم کی ٹھیکیداری نہ رہے۔ اس وقت حکومت برطانیہ نے ہمیں کچھ ملکی اور سیاسی اختیارات دینے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنا سیاسی اقتدار اٹھا لینے کے بعد اپنا تجارتی تعلق ہندوستان سے قائم رکھنا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان والوں سے اور خاص کر یہاں کے تجارت پیشہ لوگوں سے ان کے تعلقات دوستانہ رہیں گے۔ تو جو مالی نفع ہندوستان سے انگلستان کو حاصل ہوتا رہا ہے اس کا بیشتر حصہ جاری رہ سکے گا۔ وہ پہلے یہاں تجارت پیشہ بن کر ہی آئے تھے۔ پھر انھوں نے سپاہ گری اور فوجداری اختیار کر لی اور ملک گیر بن گئے۔ ہمارے لوگ اپنی پہلی تجارت کھو بیٹھے اور اکثر مصنوعات میں ان کے دست نگر ہونے پر قانع ہو گئے اب ہندوستان میں صنعت کے از سر نو زندہ کرنے اور تجارت کو فروغ دینے کا خیال پیدا ہوا ہے۔ آپ لوگ بھی علی قدر استطاعت زندگی کی اس دوڑ میں شریک ہوں۔ محنت اور سرمایہ تو ہر میدان میں درکار ہے۔ مگر صنعت اور تجارت کی ترقی کے لئے اور کاموں سے زیادہ انہماک ضروری ہے مسلمانوں کو اپنی حکومت کے زمانے میں اپنی سپاہ گری پر اس قدر ناز تھا کہ وہ تجارت سے بہت حد تک غافل رہے۔ برعکس اس کے ہندوؤں کو تجارت سے گہرا تعلق تھا۔ انھوں نے اس زمانہ میں اس صیغے میں بہت کچھ ترقی کی ہے گو ابھی انہیں بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں دونوں مل کر کام کریں تو بہت زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔ کہیں کہیں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں بعض متحدہ کمپنیوں میں ہندو اور مسلمان مل کر کام کرتے ہیں۔ لیکن عام طور پر میلان یہی ہے کہ ہندو ہندو کمپنیاں اور مسلمان مسلمان کمپنیاں قائم کرتے ہیں۔ اس سے بظاہر تو اشتراک عمل میں سہولت ہوتی ہے۔ مگر انجام کار یہ میلان ایک دوسرے سے علیحدگی کی طرف لے جاتا ہے اور جس مغائرت کی شکایت کی جاتی ہے وہ بڑھتی رہتی ہے۔ حالانکہ یہی وہ میدان ہے جس میں مل کر کام کرنے کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس میں تنگ دلی خواہ ایک جانب سے ہو یا دوسری سے دور ہو جانی چاہئے۔ اور اسے دور کرنے کی کوشش میں اس جامعہ کے طلبہ کو خاص طور پر حصہ لینا چاہئے۔ کیونکہ ان کی تعلیم وتربیت کے ذمہ دار ایسے اشخاص رہے ہیں جو ہندو مسلم اتحاد کے موافق رہے ہیں اور جنھوں نے اپنے ہندو ہم وطنوں کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

تجارتی کاروبار سے جن لوگوں کو واقفیت ہے انھیں معلوم ہے کہ آج کل کی تجارت اپنے سرمایہ کے لئے بنکوں کی محتاج ہے۔ اور جب تجارتی کارخانہ کے پس پشت بہ وقت ضرورت آسان شرائط پر کسی بنک سے روپیہ حاصل کرنے کا سہارا نہ ہو، وہ کارخانہ مشکل سے چلتا ہے۔ جہازوں کے ذریعے جو مال باہر سے آتا ہے اس کی قیمت کی ادائیگی اور اس کے مال کا حصول بنکوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ جو مال اس ملک سے باہر بھیجا جاتا ہے اس کی قیمت کی وصولی وہاں کے بنکوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تجارتی ترقی بنکوں کے نظام اور عمل سے واقفیت اور بنکوں کے وجود کے بغیر نہیں ہوسکتی اور ملت اسلامیہ بنکوں کی اہمیت سے بے پروا ہے اور نہ بیمہ کمپنیوں میں ان کا کوئی متناسب حصہ ہے۔ جامعہ ملیہ نے اپنے طلبہ کو اس مضمون سے آشنا کرنے کے لئے اپنے مدرسوں میں سیونگ بنک اور باہمی تعاون کی سوسائٹیاں قائم کی ہیں اور طلبہ کو خود ان کا انتظام کرنے کا موقع دیا ہے۔ مگر اس مضمون کی وسعت کے لحاظ سے یہ ابجد خوانی اور کنڈر گارٹن کی تعلیم کا درجہ سمجھا جانا چاہئے۔ اب یہ کام فارغ التحصیل طلبہ کا ہوگا کہ وہ اس خشک مضمون کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں اور اس راستہ میں اپنے ہم عمروں اور دوستوں کی رہنمائی کریں۔ بنکوں میں حساب کتاب کی مہارت درکار ہے اور کئی مسلمان طالب علم اس کو روکھا پھیکا کام سمجھتے ہیں لیکن یہی روکھا پھیکا کام جب کسی کو آجاتا ہے اور وہ اس کے ذریعے سے اپنے کاروبار کو بڑھا کر خوشحالی پیدا کرتا ہے تو اس مضمون میں خود بخود دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ ہر مضمون کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کی ابتدائی منزلیں محنت طلب اور دشوار ہوتی ہیں مگر اوپر جاکر دلچسپ ہوجاتی ہیں۔

میں نہیں چاہتا کہ میرا یہ مختصر خطبہ اتنا طویل ہوجائے کہ آپ اکتا جائیں۔ اس لئے ایک اور ضروری مضمون کا ذکر کرکے آپ سے رخصت ہوں گا۔ وہ مضمون سائنس ہے۔ آپ کی جامعہ میں جو پہلا خطبہ تقسیم اسناد پڑھا گیا، وہ ملک کے ایک نامور سائنس داں پی سی۔ رائے کا عالمانہ خطبہ تھا جو انگریزی زبان میں دیا گیا تھا۔ اس میں سائنس کی تعلیم پر زور دیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ سائنس کی ترقی سے دنیا میں کیا کیا نتائج پیدا ہوئے ہیں اور ابھی کتنے بڑے امکانات باقی ہیں۔ انھوں نے آپ کو مسلمانوں کی تاریخ سے بہت سے حوالے دے کر یہ بھی بتایا تھا کہ ایک وقت میں مسلمان علوم فلسفہ اور سائنس کی مشعل لے کر گھر سے نکلے تھے اور انھوں نے اس وقت یورپ کی جہالت اور تاریکی کو علم کی روشنی سے منور کر دیا تھا۔ پھر زمانہ بدلا اور شاگرد عالم فاضل بن گئے اور استادوں کی اولاد جاہل بن گئی۔ اب زمانہ نے پھر کروٹ لی ہے اور آپ لوگوں میں جو طلبہ سائنس پڑھتے رہے ہیں انھیں اس کی قدر و قیمت کا کافی احساس ہوگیا ہے۔ اب ان کا کام ہے جستجو اور تلاش کی لالٹین لے کر اس مضمون کی گہرائیوں تک پہنچیں اور اس میں نئی نئی دریافتیں اور ایجادیں کریں۔ بعض لوگ ان تباہیوں کے مناظر دیکھ کر اور سن کر جو سائنس کی بعض ایجادات کی بدولت گزشتہ ہولناک جنگ کے دوران میں دیکھے گئے ہیں، کہتے ہیں کہ اس سے تو بہتر تھا کہ سائنس اتنی ترقی نہ کرتی اور دنیا اس مہلک خونریزی سے بچی رہتی جس سے لاکھوں جوان ہلاک ہوئے اور ان سے زیادہ زخمی، اور بوڑھے اور بچے اور بیمار بھی آسمان سے برسنے والے گولوں کی زد سے نہ بچ سکے۔ یہ سچ ہے کہ ایسے بُرے نتائج پہلی نظر میں انسان کو سائنس سے بیزار کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے نفس علم میں کوئی بُرائی پیدا نہیں ہوتی۔ علم کے صحیح اور غلط استعمال میں بہت فرق ہے۔ یہ برے نتائج اس کے غلط استعمال کے ہیں۔ ورنہ وہی علم بہتر نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ ہوا میں جہاز اُڑنے لگے تو آپ مہینوں کی مسافت دنوں میں اور دنوں کی مسافت گھڑیوں میں طے کر لیتے ہیں۔ زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور نئی دنیا اور پرانے زمانے کی پاتال اب آپ کے لئے دوسرے ملک نہیں دوسرے محلّے بن گئے ہیں۔ اسی طرح یہ 'ایٹم بم' جس سے آج کل ساری مہذب دنیا گھبرائی ہوئی ہے اور یہ خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ جیسے جاپان کے دو شہروں کو دو بموں نے خاک کا ڈھیر بنا دیا اور کانت الجبال کالعہن المنفوش کا عینی مشاہدہ کرا دیا اگر اسی طرح کے دو چار اور کسی دوسری جنگ میں پھینکے گئے تو دنیا اور اس کے تمدن و تہذیب کا خاتمہ ہوجائے گا۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ ایٹم بم کو محض نگاہ خوف سے نہیں دیکھنا چاہئے۔ بالکل ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنا رعب دوسروں پر جمانے کے لئے یا اپنا عقدہ جلد حل کرنے کے لئے اس قوت کا بے جا استعمال کرے۔ لیکن اس کے ساتھ اس کے دل میں یہ ڈر بھی رہے گا کہ اگر کسی دوسری قوم نے بھی اس کا راز پالیا ہے اور اس کے بنانے کی ترکیب سمجھ لی ہے اور وہ جواب میں بم پھینکے گی تو کیا حشر ہوگا اور اس ڈر کی وجہ سے وہ بم پھینکنے سے رکی رہے گی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت ردوکد کے بعد اقوام عالم اس شرط کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گی کہ 'ایٹم بم' سے جنگ میں ایک قوم دوسری قوم کو ہلاک کرنے کا کام نہ لے بلکہ اس میں جو امکانات انسان کے نفع کے لئے استعمال ہونے کے ہیں ان سے کام لے کر تہذیب کے لئے آسانیاں پیدا کرے۔ اس لحاظ سے شاید وہ دن بہت دور نہیں جب 'ایٹم بم' کا مہیب دیو انسان ضعیف کی عقل مندی اور سائنس دانی کی بدولت اس کے سامنے جکڑا ہوا لایا جائے اور ہاتھ باندھ کر اس کی خدمت کا وعدہ کرے اور جس طرح بجلی سی زبردست قوت انسان کی زر خرید لونڈی بنی ہوئی ہے اور اس کے لئے چکی پیستی ہے اور اسے گرمی میں پنکھا کرتی ہے اور شب تار میں روشنی دیتی ہے۔ اسی طرح میاں 'ایٹم بم' انسان کا خادم بن جائے۔

عزیزو۔ آپ خوش قسمتی سے ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئے ہیں

جس میں انسان کی قوت کے امکانات بے حد وسیع ہو گئے ہیں۔ بہت سے پوشیدہ حقائق آپ کے گرد وپیش موجود ہیں اور ان کے خزانوں کی کلید سائنس کے ہاتھ میں ہے اور سائنس کی کتابیں اور تجربے آپ کے سامنے ہیں۔ قفل کھولئے اور خزائن سے دنیا کو مالا مال کر دیجئے۔

اس طولانی تمہید کا اختصار یہ ہے کہ آپ نے جو علوم یہاں حاصل کئے ہیں اب ان کے استعمال اور صحیح استعمال کا وقت آیا ہے۔ بلند ارادے اور حوصلے لے کر درسگاہ سے باہر قدم رکھئے اور یاد رکھئے کہ آپ کا اصلی فرض یہ ہو کہ جو کام کریں اور جو فن پسند کریں اس میں مصروفیت کے ساتھ یہ مدِ نظر رہے کہ ملک وملت کی خدمت آپ کے ذمے ہے ملک وملت کے لئے سچی محبت آپ کے دل میں ہو اور ان کی فلاح کے لئے ہر قربانی اور ہر ایثار کے لئے آپ تیار ہوں۔ بہت مدت ہوئی ایک سیاح جو انگریزی کے علاوہ فارسی عربی خوب جانتے تھے لاہور میں وارد ہوئے۔ میں شاید اس وقت سکول کے کسی درجے میں پڑھتا تھا۔ میں ان کی تعریف سن کر انھیں دیکھنے گیا اور میں نے ان سے کہا کہ کوئی ہدایت مجھے دیتے جائیں۔ انھوں نے ایک شعر پڑھا۔ جو میں آپکی خدمت میں تحفتاً پیش کرتا ہوں ؎

من نے گویم سمندر باش یا پروانہ باش
گر بہ فکر سوختن باشی برو مردانہ باش

اندازے

زیادہ سے زیادہ فطرتِ آدم کا اندازہ
یہ آئینہ کا اندازہ، یہ جامِ جسم کا اندازہ
یہ گردش ہائے ساغر گردشِ پیہم کا اندازہ!
ستارے بھی نہیں تخئیل کے عالم کا اندازہ
متاعِ زندگی لیکن ہے کم سے کم کا اندازہ!!

جسے سمجھا ہے بے ہوشی وہ بے ہوشی نہیں ساقی!
کسی کی یاد شامل ہو تو خاموشی نہیں ساقی!
فریبِ خودکشی کا نام مے نوشی نہیں ساقی!
شکستِ جام میری خود فراموشی نہیں ساقی!
زفیضِ عیش سرمستی کیا ہے غم کا اندازہ!!

یہ کب چاہا تمنّا کو بہارِ احمریں ملتی —
فروغِ ماہتاب و کہکشاں سے آفریں ملتی؟
وطن ہی جس کو کہہ سکتا، کہیں ایسی زمیں ملتی
کوئی منزل بھی بھولے سے سرِ راہے نہیں ملتی!!
سفر کیا ہے؟ فقط راہوں کے پیچ و خم کا اندازہ!!!

کمال صدیقی

کلوپیٹرا

شریف عنایت اللہ

بہت دن گذر گئے ــ بہت راتیں گذر گئیں۔

میری اس سے پہلی مرتبہ راکسی سینما میں ملاقات ہوئی۔ نام تو بہت سن چکا تھا۔ محلہ کا بچہ بچہ اسے جانتا تھا ہمارے فلیٹ سے وہ قریب ہی رہتی تھی۔ وہ اور گو پال، اس کا بوڑھا نوکر ــ میں اکثر اسے بیلکونی میں مطالعہ کرتے دیکھتا۔ وہ بے حد حسین تھی مجسم شعریت۔ شباب کا جیتا جاگتا مجسمہ۔ یہی کوئی ۲۵، ۲۶ برس کا سن تھا۔ شروع شروع میں تو میں نے اسے کسی شریف گھرانے کی لڑکی سمجھا اور ایک دن میں نے جب اس سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو شمیم مجھ پر برس ہی تو پڑا ــ "ارے میاں ابھی تم بچے ہو تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ جانتے ہو وہ کون ہے؟ ــ اَرونا دیوی!" ــ اب بھی نہیں پہچانا ــ؟ ــ ہندوستان کی سب سے بدنام افسانہ نگار تو وہ ہے ہی لیکن ہم اسے شہر کی سب سے بدنام ہستی کے نام سے بھی جانتے ہیں ــ کلو پیٹرا ہے کلو پیٹرا ــــ اب بھی ملوگے اس سے؟" ــــ میں خاموش بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا اور کر بھی کیا سکتا تھا مجبوراً مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

پھر ایک رات ــ سینما شروع ہو جانے کے کافی دیر بعد میں ہال میں داخل ہوا اندھیرے میں گائیڈ نے ٹارچ سے میری جگہ بتائی اور میں معاف کیجئے گا ــ معاف کیجئے گا" کا وظیفہ پڑھتا لوگوں کے پیروں کو روندتا بڑی مشکل سے اپنی جگہ پہنچا کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد پتہ چلا کہ پاس ہی کی سیٹ پر کوئی محترمہ بیٹھی ہوئی ہیں۔ صنفِ نازک کی نزدیکی نے ہال میں ایک عجیب رومانی کیفیت پیدا کردی۔ پردہ پر اُلہاس گا رہا تھا۔ اس کمبخت اداکار سے مجھے سخت نفرت ہے۔ لیکن آج وہ دنیا کا سب سے حسین نوجوان معلوم ہو رہا تھا۔ پاس ہی ایک بنگالی محترمہ بیٹھیں اپنے شوہر کو فلم کی کہانی کا خلاصہ سنا رہی تھیں۔ آج نہ جانے کیوں انکی سرگوشیوں سے مجھے غصہ کے بجائے خوشی سی حاصل ہونے لگی۔ میرے مقابل ایک سیٹھ جی بیٹھے بیڑی کا دھواں بڑی محبت و عقیدت سے میری طرف بھیج رہے تھے۔ ان کے اس رویہ سے مجھے تسکین سی حاصل ہوئی۔ ارادہ ہوا کہ انھیں مخاطب کر کے کہوں ــــ خدارا اسی طرح پکچر کے نہ ختم ہونے تک بیڑی سے لطف اندوز ہوتے رہو۔ تمہاری بیڑی کی یہ بھینی بھینی خوشبو فضا میں آج ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی ہے ــــ میں نے ٹائی ٹھیک کی۔ کوٹ کی آستین پر سے گرد صاف کیا اور پھر سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد نظریں چرا کر پاس بیٹھی محترمہ کو دیکھا ــ" ارونا!" ــــ دل چیخ اٹھا۔ اس کے بعد اگرچہ میری آنکھیں اسکرین پر تھیں مگر کچھ دکھ نہیں رہی تھیں۔ ذہن کی تمام قوتوں کو محض ایک ہی احساس تھا اور وہ یہ کہ ارونا میری بائیں جانب بیٹھی ہے میں نے اسکا جائزہ لینا شروع کیا۔ کتنی حسین تھی وہ ــــ خیام کا خواب اور دانتے کی زندگی کی تفسیر ــــ اس دھندلی روشنی میں وہ ایک شعلہ معلوم ہو رہی تھی۔

ــــ اور پھر ہم شو کے بعد پہلی مرتبہ ملے۔ اس واقعہ کے بعد ہماری اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لیکن میں نے اپنے محلہ میں اس سے باتیں کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ دنیا اور دنیا والوں کی بے لگام زبان سے ڈرتا تھا۔ رات کی تنہائی میں روشنی گل کر دینے کے بعد جب میں بستر پر لیٹ جاتا تو نگاہیں خود بخود ارونا کے فلیٹ کی طرف اٹھ جاتیں۔ وہاں اکثر میں بارہ، ایک بجے تک روشنی دیکھتا ما ینے خیالوں کے دوران میں شمیم کی تنبیہہ یاد آجاتی اور میں اپنے ضمیر کے ہنگامہ خیز سوالوں سے بچنے کے لئے آنکھیں بند کئے نیند کی آمد کا انتظار کرنے لگتا۔ رات کی خاموشی میں ارونا کے ستار کے تاروں کی جھنکار سنائی دیتی۔ ستار کی سسکیاں چاندنی راتوں کی نشیلی فضا میں تیرتی رہتیں جیسے کوئی دل شکستہ آہیں بھر رہا ہو اور میں اس کی مدھر تانوں پر کان لگائے خوابوں کی دنیا میں کھو جاتا ــــ

ایک دلفریب شام جب شفق کی رنگینیوں میں رومانیت مستیاں لٹا رہی تھیں۔ میری اس سے ایک پارک میں ملاقات ہوئی۔ اور ہم دونوں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگے ــــ "آج چلوگے پکچر؟ ــ" اس نے یکایک پوچھا اور پھر میری کشمکش کو دیکھتے ہوئے اس نے خود ہی کہا ــ "کیوں! میرے ساتھ پکچر جانے کی ہمت نہیں تم میں؟ ــــ دنیا کیا کہے گی ــ ہے نا یہی خیال؟" ــــ اور اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ میں نے پشیمانی سے سر جھکا لیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا ــ "دنیا سے اتنا ڈرتے ہو انور؟ ــــ یہ خوف تمہیں کہیں کا نہ رکھے گا۔ میری طرف دیکھو دنیا والوں کی مجھے رتی بھر بھی پرواہ نہیں۔ تمہارے سماج کو مجھ سے نفرت ہے۔ مجھے لوگ عجیب عجیب ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی سوسائٹی میں میرا گذر ناممکن ہے۔ لوگ میرے سایہ سے بھی گھبراتے ہیں اور تو اور، تم جیسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی میرے ساتھ سیر دلفریب منظور نہیں۔ کیوں ــ؟ صرف اس لئے نا کہ میں نے مروجہ تہذیب اور تمہارے سماج کے ذلیل اصولوں کے خلاف بغاوت کی ٹھانی۔ اس کے قدموں پر جھکنے کے بجائے دنیا کو اپنے پیروں پر لاگرانے کی کوشش کی۔ میں پوچھتی ہوں انور! کیا میں نے برا کیا؟ کیا حق کے لئے جہاد کرنا جرم ہے؟ کیا ایسی تہذیب کو جو انسان کو انسان بنانے کے بجائے خود غرض درندہ بنا دیتی ہے۔ جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی کوشش

اخلاقی گناہ ہے؟ بولو انور! ـــــ بولتے کیوں نہیں؟ ــــ" میں کیا جواب دیتا۔ اس کے تخیلات میرے دل کی گہرائیوں میں گم ہو کر رہ گئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بھی اُسی کی طرح ایک باغی ہوں۔ جیسے یہ پارک باغی ہے۔ جیسے یہ ساری کائنات باغی ہے۔ دل میں ایسے ہی تو خیالات تھے میرے لیکن آج تک میں انکی گہرائیوں تک نہ پہنچ سکا تھا۔ آج میری خوابیدہ روح انگڑائیاں لیتی جاگ اٹھی تھی۔ دل نے چیخنا شروع کیا ــــ جگاؤ اَردنا ــــ مجھے سوتے سے جگاؤ میری غفلت تمہاری نزدیکی سے دور ہو رہی ہے زندگی جہنم نظر آتی ہے جہاں نہ خوشی ہے نہ شانتی ہے نہ اشانتی ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہے یہ لق و دق صحرا ہے۔ ہماری طرح آگ کا ایک بہت بڑا شعلہ ہے جس میں میں جل رہا ہوں تم خود ایک شعلہ ہو مجھے بھی شعلہ بنا دو۔ میں آگ بن کر ساری دنیا کو جلا کر خاک کر دینا چاہتا ہوں ساری کائنات کو میں آگ کی لپیٹ میں تڑپتا دیکھنا چاہتا ہوں ـــ بولو اَردنا! ـــ تم بولتی کیوں نہیں ـــ لیکن دل کی یہ آواز دل کے پردوں ہی میں سمٹ کر رہ گئی۔ مجھے خاموش دیکھکر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میری باتیں بری لگیں انور؟" ـــ میں نے عقیدت مندنگاہوں سے اُسے دیکھا "نہیں اَردنا ـــ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔ میرا دل چاہتا ہے تم یونہی بولے جاؤ اور میں یونہی سنتا رہوں۔ میرے دل میں بھی ایسے ہی خیالات اُبھرتے اور میں انکی تہہ تک نہ پہنچ کر تڑپ جاتا۔ اپنے اس پاس سسکتی انسانیت کو دیکھتا تو اپنی دنیا اپنے تمدن اور خود اپنے سے مجھے نفرت سی ہونے لگتی۔ آج تمہاری باتیں سن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری خوابیدہ روح جاگ اٹھی ہے ــــ تم مسکرا رہی ہو؟" میں رکا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے بجائے مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "برا نہ مانو انور ـــ مجھے ہنسی تو آ رہی تھی لیکن تمہارے تخیلات پر نہیں بلکہ تمہاری باتوں پر ـــ لو اب واپس چلو اندھیرا ہو رہا ہے" اور ہم واپس لوٹے۔

اپنے فلیٹ کے دروازہ پر اس نے بیگ سے چابی نکالی، دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے: "تمہارے قدم ڈگمگائے نہیں انور؟ ـــ آج تم کلوپیٹرا کے کمرے میں ہو" اس نے مسکرا کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــ اور پشیمانی سے میرا سر جھک گیا۔

وہ بھی میرے قریب ہی بیٹھ گئی۔ آسمان پر چاند نکل آیا تھا چاند کی سنہری کرنیں درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھیں۔ اَردنا نے چاند کو دیکھا اور پھر روشنی گل کر دی ـــ "گھبراؤ نہیں انور! میں نے تمہاری بہتری کے لئے روشنی گل کی ہے۔ وہ دیکھو سامنے تمہارے پڑوسی مولانا حسین علی بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ جانتے ہو وہ کس کے منتظر ہیں؟ اُس کرسچین لونڈیا میری ٹامسن کو تو جانتے ہی ہو نا ـــ"

"خدارا چپ رہو اَردنا! تم ایک ولی صفت ہستی کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہی ہو" مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس نے دوبارہ ایک قہقہہ لگایا "میں نے پارک میں کہا تھا نا انور! تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے یقین نہیں آتا تمہیں میری باتوں کا؟ ـــ اچھا پنڈت برجموہن شاستری کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ وہ بھی ولی صفت ہیں نا ـــ اُن سے ملاقات ہو تو پوچھ دیکھنا کہ رام کماری کے بچے کا کیا ہوا۔ رام کماری اُن کے یہاں جھوٹے برتن صاف کیا کرتی تھی۔ اس نے اسی کمرے میں تڑپ تڑپ کر جان دی تھی۔ کیسے بھولوں میں وہ بھیانک رات انور! اب وہ باتیں یاد آتی ہیں تو میں کانپ اٹھتی ہوں۔ میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے ایسے ظالم ـــ اُف بھگوان! ـــ" جوش میں اس کی آواز کانپنے لگی اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنا دل تھام لیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور سانس زور زور سے چلنے لگا اسکی حالت سے گھبرا کر میں نے پانی کے چھینٹے دیئے۔ کچھ دیر بعد اسکی طبیعت سنبھلی اور اس نے آنکھیں کھولیں ـــ "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔ صرف ایک لمحہ کے لئے

قطعات

ارشد صدیقی

جب کسی کا خیال آتا ہے
دل کو اس طرح گدگداتا ہے
جس طرح نیند میں کوئی بچہ
دیکھ کر خواب مسکراتا ہے

×

آپ جب مجھکو یاد آتے ہیں
اشک پلکوں پہ تھرتھراتے ہیں
جیسے شبنم کے نقرئی قطرے
گر کے پھولوں پہ تلملاتے ہیں

×

ابتدا انتہا میں کھو جائے
جلوہ یوں چشم وا میں کھو جائے
جسطرح آسمان سے تارہ
ٹوٹتے ہی فضا میں کھو جائے

میں نے اُن آنکھوں میں حزن و ملال کی جھلک دیکھی اور پھر اس نے کہا —"
شکریہ انور! گھبراؤ نہیں تم۔ یہ بہت پرانی بیماری ہے۔ اکثر مجھ پر ایسے دورے
پڑتے رہتے ہیں۔ اب تو میں انکی عادی سی ہو گئی ہوں۔" اُسے اُٹھتا دیکھ کر
میں نے اپنے بازو کا سہارا دیا۔ سامنے آئینہ تھا۔ اس میں اپنا عکس دیکھا تو
کچھ شرم سی محسوس ہوئی اور میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "کیوں انور! مجھے اپنے
بازو کے سہارے بیٹھے دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے۔ تمہیں؟ — کیا
ماں، بیٹے کے بازوؤں کا سہارا بھی نہیں لے سکتی؟ —" اس نے مسکرانے
کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔
"ماں —!!!" میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔ وہ آسمان پر چمکتے
ہوئے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے آہستہ سے کہا "ہاں انور!
میں تمہاری ماں ہی کی طرح تو ہوں۔ ۳۸ برس کی عورت ایک نوجوان کی
ماں ہی تو ہوتی ہے۔"
"۳۸ برس کی عمر ہے تمہاری؟" مجھے یقین نہ آتا تھا۔
"کیوں یقین نہیں آتا تمہیں؟ —" اس نے مینٹل پیس پر سے فوٹو
البم اُٹھا لیا۔ "یہ دیکھو انور — تم نے اس نوجوان کو دیکھا ہے کبھی؟"
میں نے دیکھا کیبنیٹ سائز کی ایک تصویر تھی۔ چہرہ کچھ پہچانا سا معلوم
ہونے لگا۔ "کون ہیں یہ؟ — شاید میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے۔" وہ
مسکرائیں اور پھر بغیر کچھ جواب دیئے میرے ہاتھ سے البم لے لیا۔ آنکھوں میں
ایک پُراسرار چمک لئے وہ اس فوٹو کو دیکھتی رہیں — "غلط خیال ہے
تمہارا۔ تم نے اسے کبھی نہیں دیکھا، ہاں اس کی ماں کو ضرور دیکھا ہے۔" وہ اب بھی مسکرا رہی
تھیں — "یعنی — تمہارا بیٹا — ؟!" میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔ اس میں
ارونا کے علاوہ میری بھی بہت شباہت تھی —" ہاں انور! یہ رتن ہے میرا بیٹا۔
آجکل بمبئی میں بی اے کی تیاری کر رہا ہے۔ دیکھا نا تم نے اس کی شکل تم سے
کتنی ملتی ہے۔ جس دن میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا میں نے محسوس کیا جیسے میرا رتن
بمبئی سے یہاں آگیا ہے — اپنی ماں کے قریب — ویسے ہی خدوخال — وہی
چال — عادت شکل بھی ویسی ہی۔ تمہیں دیکھ کر مجھے میرا بچہ یاد آجاتا۔ میرے سینے میں
ماں کی ممتا اور باپ کا پیار جاگ اُٹھتا لیکن دوسرے لمحے میں اپنی بے بسی پر تڑپ کر
رہ جاتی" — وہ رکیں — "ایک بات پوچھوں انور! تم اپنی ماں سے دور ہو
کیا تمہارا دل ماں کی محبت بھری گفتگو کے لئے نہیں تڑپا کرتا؟ چوڑیوں کی
جھنکار کے لئے تمہارے کان بیقرار نہیں ہوتے؟ کیا بیٹے ایسے ہی سخت دل
ہوا کرتے ہیں؟ میں تو اپنے بچے کے لئے اکثر تڑپتی رہتی ہوں — وہ تو اپنی ماں کو
مردہ سمجھ بمبئی میں آرام کی زندگی گذار رہا ہے —" میں خاموش بیٹھا انکی
باتیں سن رہا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر انھوں نے خود ہی کہنا شروع کیا —"
"کل تمہارا کالج بند ہو رہا ہے۔ دو مہینے کے لئے تم شہر سے باہر جا رہے ہو۔ نہ جانے
پھر کبھی ملاقات ہو یا نہیں۔ میرے یہ دورے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ بھگوان
جانے کب دل ٹھہر جائے۔ آؤ آج میں تمہیں ایک کہانی سناؤں —" اور انہوں
نے کہنا شروع کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں تخیل کے پروں پر اُڑا جا رہا ہوں
عورت کی بے بسی — دنیا کے مظالم — دس گز لمبی زبان رکھنے والے شریف انسان
— جھوٹی افواہیں پھیلانے والے خود غرض درندے — مولانا حسین علی — پنڈت
برجموہن — ہماری دنیا کے ازلی پنڈت اور ہمارے ازلی مولانا — ہندوستانی
عورت تو دنیا کی ننھی دیوی ہوتی ہے۔ یہاں کی تمام نعمتیں ان کے قدموں پر
رکھ دی جاتی ہیں لیکن جب زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ آتا ہے تو ان کی
بساط ایک بے جان مرمریں بت سے زیادہ نہیں۔ اگر کسی نے یہاں سر اٹھانے کی
کوشش کی تو اس کی امنگوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ شاید یہی یہاں کا انصاف
ہے۔ یہی ازلی قانون۔ یہی رواج۔ شاید یہاں ازل سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے —
لیکن یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ یہاں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہاں کمزور انسان کی
بساط ایک مات کھائے ہوئے مہرے سے زیادہ کیوں نہیں؟ تباہی و بربادی کا
یہ لامتناہی سلسلہ کہاں شروع ہوا تھا۔ کب شروع ہوا تھا کیوں شروع ہوا
تھا۔ کب ختم ہوگا؟ — اُف میرے معبود! میں پاگل ہوا جا رہا ہوں — میرے
خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ حقیقت کے احساس نے مجھے خود فراموشی
کے عالم سے بیدار کر دیا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلک اُٹھے۔
میں نے دیکھا — باغی ماں کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ آنسوؤں کے دو
قطرے اُن کی چمکتی ہوئی چوڑیوں پر گرے اور پھسل کر سفید سفید جلد میں جذب
ہو گئے — بہت دن گذر گئے — بہت راتیں گذر گئیں۔

سورج نکلتا ہے۔ چاند طلوع ہوتا ہے۔ بہار آتی ہے پھر خزاں۔
لیکن فلیٹ نمبر ۱۵ میں ارونا دیوی کا پتہ نہیں۔ ہر رات روشنی گل کر دینے کے
بعد کان ستار کے مدھر تان سننے کے لئے بیقرار ہو اُٹھتے ہیں۔ ستار کے تار
آخری بار جھنجھنا کر ہمیشہ کے لئے بکھر گئے۔ باغی ماں دنیا کے انقلابوں سے
دور ایک درخت کے سایہ تلے آرام کر رہی ہے۔ بیٹا آئی سی ایس ہو گیا ہے۔
اور بیٹے کا ہمشکل فلیٹ نمبر ۱۷ میں بیٹھا دن اور رات باغی ماں کا منتظر ہے۔
رات کا شباب ڈھلنا شروع ہوتا ہے۔ لیلیٰ شب اپنے پریشان گیسوؤں کو
سمیٹنا شروع کرتی ہے۔ سورج کی آمد آمد ہے مگر پھر بھی فلیٹ نمبر ۱۵ کا
اندھیرا دور نہیں ہوتا — نہ جانے کیوں —!!

بہت دن گذر گئے — بہت راتیں گذر گئیں۔

نغمۂ شب تاب

فراق گورکھپوری

رات ہنس پڑتی ہے با دیدۂ پُرنم ساقی بتیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
کچھ چمک جاتی ہے تاریکیٔ عالم ساقی جب پیالوں میں چراغوں کی لویں ڈھلتی ہیں

تھاپ پر تھاپ پڑی سازِ طرب پر ساقی تا بہ نہ گنبدِ افلاک گمک جاتی ہے
چنگ سے اُٹھتی ہے جھنکار برابر ساقی خامشی رات کی رہ رہ کے کھنک جاتی ہے

آتی ہیں مدھ بھرے سنگیت کی لپٹیں ساقی آگ آکاش کے سینے میں وہ دہکاتی ہوئی
اُنگلیاں ساز کے پردوں پہ رواں ہیں ساقی اس جواں رات کے دل کی کسک[1] اُکساتی ہوئی

پھول پڑتے ہیں سرِ فرش برابر ساقی سازِ لرزاں پہ ہے رقصندہ شراروں کا گماں
گرمیٔ رقص سے دہکے ہوئے پیکر ساقی عرق چہرہ میں ہے چھٹکے ہوئے تاروں کا سماں

رقص میں پیکرِ رنگیں کا لچکنا ساقی انگ کے لوچ میں کل راگنیاں جھومتی ہیں
یہ مدھر بول، یہ کوندوں کا لپکنا ساقی لالہ گوں ہونٹوں کو نغموں کی لویں چومتی ہیں

رس میں ڈوبی ہوئی آواز کی سرگم ساقی سات رنگوں کی سجل قوس ہے باہوں کی دھنک
یہ کھنکتی ہوئی پائل کی چھما چھم ساقی رُخِ گلرنگ پہ سنگیت کی یہ تیز دمک

موہنی آنکھوں کی یہ روپ کا جلوا ساقی کنول[2] ان نازنیں ہاتھوں کے لٹاتے ہوئے حسن
جیسے دو چاندوں سے امرت کی ہو برکھا ساقی ناچتے وقت چھلک جاتا ہے یوں جوبن رس

شعلے جب رات کے سنگیت کے لو دیتے ہیں جگمگا اُٹھتی ہے پیشانیٔ دوراں ساقی
نغمے جب زیرِ فلک کانپ کے دم لیتے ہیں جھلملا اُٹھتا ہے تاروں کا چراغاں ساقی

رین سنگیت کے اب بھیگ چلے ہیں شعلے سرنگوں ساز، گلے نور کے خم ہیں ساقی
اُنگلیاں تیرگی چٹکاتی ہے گیسو کھولے[3] برقِ آواز کی پلکیں بھی تو نم ہیں ساقی

رات لیتی ہے جماہی پہ جماہی ساقی ہر نگہ جاگے ہوئے تاروں کی السائی ہوئی
چور کتنی ہے تری نیم نگاہی ساقی پچھلی شب! مدھ بھرے سنگیت کو نیند آئی ہوئی

[1] :۔ پھول برنا محاورہ ہے یعنی چنگاریاں برسنا۔ [2] :۔ سنسکرت شاعری میں ہاتھ، پاؤں، آنکھ اور چہرے کو کنول سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کر کمل، پد کمل، نین کمل، مکھ کمل۔ [3] :۔ اس قافیہ کو میں نے یہاں روا رکھا ہے۔

طوفانِ نوح

عبدالرشید خاں

۱۹۳۷ء میں برطانیہ کے بڑے عجائب خانہ میں بیسویں صدی کی موصلات اثری کی نمائش ہوئی تھی۔ ان اثریات میں علم وفن کے ماہروں اور عالموں کی نظروں میں جو سب سے زیادہ عجیب تھے وہ عراق میں نینوا اور بصرہ کے درمیانی علاقہ کی وادیوں میں کے اثریات تھے اس کے بعد ماہرین ان کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا میں کلدانی قوم شاید سب سے پہلی ترقی یافتہ اور متمدن قوم تھی۔ ان اثریات میں کلدانیہ کے دارالسلطنت ار (Ur) کے شاہی درباروں کی تصویریں۔ ان کے محلوں کے نقشے اور ان کی زینت وآرائشیں دیکھنے میں آئی تھیں۔ تحریری نقوش سے جنگی اور مالگزاری کے قاعدے اور دستور دیکھنے میں آئے۔ نصاب تعلیم اور علوم کی انتہا کا اندازہ ہوا۔ ان کے لباس کی کتر بیونت برتنوں کے نمونے اور مدرسوں کے خاکے سمجھنے میں آئے اور ان تمام چیزوں سے مجموعی طور پر ۴۰۰۰ قبل مسیح کی ایک ایسی شاندار تہذیب کے حالات۔ خیالات اور افعال پر اتنی تفصیل کے ساتھ روشنی پڑی ہے کہ انھوں نے تاریخ میں ایک ناپید باب کو قائم کردیا ہے۔ ان آثار سے ہی یہ دریافت ہوا ہے کہ اگرچہ کلدانیہ کی معاشرت میں بت پرستی یا بادشاہ پرستی داخل تھی مگر عقیدۂ توحید کی تعلیم کا بھی مدرسہ موجود تھا جس سے علمائے حق نمودار ہوکر بت پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہے تھے۔ لیکن شاہ پرستی کو اس زمانہ کے بادشاہوں کا سہارا رہتا تھا اس لئے سرمایہ داری ہمیشہ دینداری اور توحید کی فضا پر غالب آتی رہی۔ اس زمانہ میں اُر دنیا کی طرح دینی تذکروں کا بھی مرکز تھا۔ ان اثریات پر ماہرین کے قیاس نے اس کا بھی فیصلہ کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے زمانہ کی طوفانی بارش اور سیلاب سے نجات پانے کے بعد اس ارض نجات میں بطور شکرانہ ایک مدرسہ الٰہیات قائم کیا تھا اور گزشتہ تجربوں اور مشاہدوں سے فائدہ اٹھا کر یہاں کا تعلیمی نصاب بھی خود ہی مرتب کیا تھا۔

اُر کی اس تعمیر کی پہلی اینٹ رکھنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام یعنی جب ان کے اور بادشاہ وقت کے درمیان مناظرے اور مباحثے ہوئے کم ازکم ایک ہزار سال کی مدت گزری ہوگی یہ وقت دولت کلدانیہ کے عروج کا تھا۔ اس طویل مدت میں زمانہ کی رفتار اور تبدیلیوں نے توحید کے ابتدائی عقیدوں کو ضرور ناقص کردیا ہوگا۔ دین کے پیشواؤں کے خیالوں کو اور دلچسپیوں کو بدل دیا ہوگا۔ دین توحید کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہوگی اور دوسری طرف بادشاہی کے طویل سلسلہ سے سرمایہ داری۔ دولت کی محبت اور ان کے ساتھ آنے والی خرابیوں نے ترقی اتنی کرلی ہوگی کہ لوگوں کے خیال اور سماج ان سے اچھی طرح رنگین ہوگئے ہوں گے۔ نفس پرستیوں کو روا رکھنے کے لئے اوہام پرستی شگونی فال اور بت پرستیاں عام طور سے قائم ہوگئی ہوں گی اور توحید پرستی کی بے رنگی کے مٹانے یا اس سے بے پروائی کی ہوا عام ہوگی۔ بستیوں سے باہر کسانوں کی کثیر تعداد سرمایہ داروں، زمینداروں اور اہل کاروں کے ظلم وستم سے پسنے لگی ہوگی۔ غرضیکہ اصولاً وہ سب کچھ ہورہا ہوگا جو سرمایہ داری کے عروج میں آج تک ہوا اور ہوتا رہے گا۔

کسی فلسفی کا قول ہے کہ "دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے" اس مقولہ کی روشنی میں اثریات مذکور نے حضرت نوح کے زمانہ کی تہذیب ومعاشرت کی تصویر جس حد تک کھینچی ہے اس پر ماہرین نے اصول ودستور کے مطابق قیاس سے کام لے کر اس طوفانِ عظیم کی وسعت اور ہیبت کا بھی بڑی حد تک صحیح اندازہ کرلیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سیلاب عظیم اگرچہ ہیبتناک تھا مگر اس قدر محیط نہ تھا کہ اس کو عالمگیر کہدیں جیسا کہ توریت نویسوں نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان مصنفوں کو ان کی روایت میں اسی شرط پر صحیح سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سمجھ لیں کہ ان کی دنیا کا جغرافیہ اسی قدر تھا۔ ورنہ یہ واقعہ ہے کہ ایسے محیط اور مہیب طوفان تو دنیا کے ملکوں اور گوشوں میں اس حادثہ سے پہلے اور بعد میں بارہا آئے اور شاید اس سے بھی بڑے آئے اور رہتی دنیا تک آتے رہیں گے۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی عالمگیر جنگ میں اس طوفان کے اندازے کی ایک اتفاقی حادثہ سے تصدیق ہوگئی تھی۔ یعنی جب قط العمارہ ترکوں کے قبضہ سے نکل کر انگریزی قبضہ میں آیا تو برسات کے موسم میں بارش اتنی کثرت سے ہوئی کہ بڑا بھاری سیلاب آگیا۔ اس وقت انگریزی لشکر میں آثار قدیمہ کے مشہور انجنیئر سر ولیم ولکاکس (Sir William Wilcoks) بھی موجود تھے۔ انجنیئر موصوف لڑائی سے پہلے دراز عرصہ عراق کے اطراف میں کام کرچکے تھے اور یہاں کے چپہ چپہ سے واقف تھے جب سیلاب انتہا کو پہنچنے لگا تو انجنیئر موصوف نے چند افسروں کو ساتھ لیا اور ایک دخانی کشتی پر سوار ہوکر علاقہ میں سفر کیا پھر بیرحمار کے بیچ میں ٹھیر کر دوربینوں سے صورتِ حال کا مشاہدہ کیا، اس وقت پانی ہی نظر آتا تھا جس میں کہیں کہیں کھجور کے اونچے پیڑوں کی ہری چوٹیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ کئی دن تک یہ حالت رہی۔ خلیج فارس کی وزنی ہوائیں بحر عرب کے گھرے بادلوں سے ٹکرا کر عراق کی طرف ہی لوٹتی تھیں اور اس کی وجہ سے سمندر کی طرف دریاؤں کا رخ یا سیلاب کا بہاؤ رکا کھڑا تھا۔ پھر جب اناطولیہ کی طرف سے ہوا چلی اور بحری موجیں لوٹیں تب پانی کا راستہ کھلا اور پانی اترنا شروع ہوا۔

ان اثریات میں جن تختیوں اور سلوں سے طوفان کے واقعہ کا حال معلوم ہوتا ہے ان کے مطالعہ کے بعد ماہرین فن سب سے پہلے عراق کی سطح ارض کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ توریت نویسوں سے اتفاق رائے نہ کرسکے اور اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہوئے کہ اگرچہ سیلاب اور بارش نے کسی وقت یہاں کی بستیوں کو اجاڑ دیا تھا پھر بھی یہ طوفان مقامی تھا۔ پرانے علما میں جن لوگوں نے

اسے عالمگیر بتایا ہے ان کی معلومات جغرافیہ اور دنیا کی نسبت بہت کم تھی بلکہ اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ اپنے وطن کو ہی دنیا سمجھتے تھے۔ ان اثریات کا مطالعہ توریت کے ساتھ ساتھ کرنے کے بعد طوفان سے پہلے کی بستیوں کی نسبت حالات اس طرح مدون کئے گئے ہیں کہ لوگ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں پھیل کر رہتے تھے۔ بستیوں کے گرد دور دور تک آراضی کاشت پھیلی ہوتی تھی۔ لوگ زراعت پیشہ اور زراعت سے ملحق دستکار تھے۔ دستوری نظام کے لحاظ سے جیسا بھی کچھ وہ تھا یہ آبادیاں خود مختار تھیں دریاؤں میں سال کے سال طغیانیوں کی وجہ سے جو نقصان پہنچ جایا کرتے تھے ان سے بچانے کے لئے کسی اجتماعی کوشش کے ذریعہ جس کو مرکزی طاقت یا حکومت کہنا چاہئے ان دریاؤں کے کناروں پر پختہ بند بھی بنا دیئے گئے تھے۔ پھر جب تک مرکزی انتظام میں طاقت رہی اس وقت تک ان آبادیوں کی حفاظت اور قیام کے اسباب باقی رہے۔ مگر صدیوں کی مدت میں جب یہ مرکزی طاقت کمزور ہوگئی تو بند اور پشتوں کی مرمت اور تعمیر جیسی کہ پہلے ہوتی رہی تھی نہ ہو سکی اور یہ کھنڈر بنتے چلے گئے۔ یہاں کے دستور حکومت میں ڈھیل اور کمزوری کے ساتھ لوگوں کی اخلاقی حالت میں بھی آوارگی اور بدبختی بڑھ رہی تھی اس زمانہ میں بابل سے قریب تین سو میل کے فاصلہ پر بیر حمار (جھیل) کے شمال میں حضرت نوح ایک تعلقدار یا رئیس کی حیثیت میں رہتے تھے۔ چونکہ وہ نبی بھی تھے اس لئے انھیں قدرتی وسائل سے پیش آنے والے حوادث کی خبر ہو گئی ہوگی لہٰذا انھوں نے اپنی بصیرت اور جدت سے بڑی سے بڑی کشتی کسی درخت کے (غالباً گوپھر) کے تختوں سے بنائی تھی تاکہ اس میں اپنے متعلقین۔ گھر کا سامان۔ مویشیوں کو اور ان کے لئے اتنی خوراک لے جا سکیں جو چار چھ مہینوں کے لئے کافی ہو جائے۔ دجلہ اور فرات میں قدیم زمانہ سے جہاز رانی ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ جہاز آجکل کے جہازوں کے مقابلہ میں کشتیاں ہوتی تھیں ان کو پرانے زمانہ سے ہی بلہ کہتے چلے آئے ہیں۔ ان کی وضع اور شکل کچھ ایسی ہوتی ہے جیسے آجکل کے اسپتالی جہازوں کی ہے۔ قیاس بتلاتا ہے کہ عراق کی ان کشتیوں کا نمونہ حضرت نوح کی کشتی کی قسم کا ہے بعید نہیں ہے کہ یہ کشتی اسی طرح کی ہو۔

پھر جب طوفان آیا۔ بارش ہونے لگی۔ دریاؤں میں پانی چڑھنے لگا تو کنار دریا کے کھنڈر ٹوٹنے اور بہنے لگے۔ بارش ہوتی رہی اور سیلاب کا حجم بڑھتا رہا۔ عذاب میں زیادتی کے واسطے اس سیلاب میں یہ ہوا کہ بیر حمار (جھیل) میں تہ آب بھی سوتے پھٹ گئے ان میں سے پانی ابل ابل کر طغیانی میں اضافہ کرتا رہا۔ مگر سب سے زیادہ غضب یہ ہوا کہ بحر عرب کی موسمی ہوائیں (یا بادل) جو شرق رو رہتے ہیں اور ہندوستان کے ساحلوں پر برسا کرتے ہیں رخ بدل کر خلیج فارس کی طرف ہو گئی تھیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیلاب کا بہاؤ خلیج کی طرف ہونے کے بدلے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ عذاب کے پورا کر دینے میں یہ بھی ہوا کہ بحر عرب اور خلیج فارس کی لہروں کا رخ بھی الٹ گیا اور یہ اندرون ملک دور تک پہنچنے لگیں۔ کتاب پیدائش (پرانا عہد نامہ) میں اسی کیفیت کی نسبت لکھا ہے کہ "آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں اور زمین کے سوتے پھٹ گئے"۔ غرضیکہ چالیس دن تک چوبیس گھنٹے متواتر پانی برستا رہا سوتوں سے پانی ابلتا رہا سمندر سے لہریں اٹھتی اور الٹتی رہیں، جس سے سیلاب ٹھیرا رہا اور عذاب سے غضب بنتا رہا۔ عراق کی برسات میں جب بارشیں کثرت سے ہوتی ہیں تو طغیانی کا سا عالم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ایسی ہیبتناک طغیانی شاذ و نادر آتی ہے لیکن جیسی طغیانیاں وہاں آتی رہی ہیں دیکھنے میں آیا ہے کہ خلیج کے بادلوں سے اور موجوں سے سیلاب کا پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ بروایت "کتاب پیدائش" پندرہ ہاتھ اونچا پانی زمین پر تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ بائیس فٹ پانی چڑھ گیا تھا اور پہاڑوں پر بھی پانی چڑھ گیا تھا، عربی میں اگرچہ جبل کے معنی پہاڑ کے ہیں مگر جبل کا اطلاق حدب یا پلیٹو پر بھی ہوتا ہے۔ طوفان کے زمانہ میں یہ حدبی آراضیاں آباد تھیں۔ اس ملک میں جیسی طغیانیاں سال کے سال آتی رہیں وہ اب معمولی سمجھی جانے لگی ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ ان سیلابوں میں پانی بارہ فٹ کی اونچائی تک پہنچتا رہا ہے۔ اس لئے اس ہولناک طوفان میں اتنی ہی زیادتی تھی کہ خشکی پر پانی کا حجم اور دس فٹ زیادہ تھا یعنی مجموعی طور سے بائیس فٹ اونچا پانی تھا جس سے پہاڑ بھی ڈھک گئے تھے۔ بارش چالیس دن تک ہوتی رہی اور پانی اونچی چوٹیوں پر بھی دس بارہ فٹ کے حجم میں ایک ڈیڑھ مہینہ

"اے دوست"

زیست سب جس پہ جان دیتے ہیں
نقش بر موج آب ہے اے دوست

ناز ہم جس خوشی پہ کرتے ہیں
اک فریب سراب ہے اے دوست

مال و زر شادمانی و راحت
اک طلسم حباب ہے اے دوست

حسن اور بے حجاب ناممکن
حسن تو خود حجاب ہے اے دوست

تلخیٔ زیست پر تمنا کا
ایک رنگیں نقاب ہے اے دوست

غم کا احساس غم بڑھاتا ہے
ورنہ غم ایک خواب ہے اے دوست

ہو خزاں بھی بہار جس کے لئے
ہاں وہی کامیاب ہے اے دوست

درد جس داغدار دل میں ہے
روکش آفتاب ہے اے دوست

اک حیات دوام ہے یہ موت
اس سے کیوں اجتناب ہے اے دوست

ایک اک شعر آج لطفی کا
آپ اپنا جواب ہے اے دوست

لطفی رضوانی

تک ٹھیرا رہا اس لئے اگر آجکل کے سے امدادی وسائل ان لوگوں کو میسر آجانے پر بھی کسی انسان یا مویشی کے بچنے کا امکان نہیں تھا۔

ایک خداترس انسان بلکہ نبی اور رئیس کے شایان حضرت نوحؑ نے بھی اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، نوکروں اور مویشیوں کے بچانے کی فکر کی ہوگی۔ وہ مویشیوں کے بچانے میں تو کامیاب ہوئے مگر ان کے بیٹے کنعان کی طرح نوکروں کی نجات میں بھی مشیت الٰہی حائل ہوگئی تھی۔ پیدائش کی کتاب کی یہ روایت کہ حضرت نوحؑ نے چوپایوں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھا تھا صحیح نہیں معلوم ہوتی اور بعد کا پیوند ہے۔ واضح رہے کہ یہ طوفان مقامی تھا چوپایوں کی تخلیق انسان سے پہلے ہوچکی تھی اور اس وقت تک ہر جنس اور قسم کی کثیر تعداد نسلیں مناسب حال آب وہوا اور ملکوں میں پھیل چکی تھیں اور موافق حال آب و ہوا کی کمی کہیں نہیں ہوسکتی تھی اس لئے تمام چوپایوں کی حفاظت کا مسئلہ یہاں نہ تھا۔ عراق میں عام نشیب بصرہ کی طرف ہے۔ اس لئے سمجھنا چاہئے کہ پہلے کشتی سیلاب میں بہہ کر بصرہ کی طرف چلی تھی۔ یہ سفر کوئی سو میل کا ہوگا اس سفر کو ختم کرتے کرتے ملک کی تمام آبادیاں غرق آب ہوچکی ہوں گی۔ بصرہ کے نواح میں بحری بادلوں نے مزاحمت کی ہوگی اور کشتی کا رخ مشرق کی طرف پھیر دیا ہوگا مگر بادلوں سے نیچے پانی میں سمندر کی طاقتور موجیں شمال کی طرف بڑھ رہی تھیں اس لئے یہاں سے کشتی نے شمال کا رخ کیا ہوگا حتیٰ کہ بیرحمار کے شمال مشرق میں منزل کے قریب ہوگئی تو بروایت کتاب پیدائش خدا نے ایک آندھی چلائی جو زمین پر سے ہوتی نکل گئی اور پانی کم ہوا اور تہہ آب چشمے بند ہوگئے۔

آخر برسات میں عراق میں اب بھی مغرب سے ہوائیں چلتی ہیں اور شمال مغربی یا پچھوا کہلاتی ہیں۔ پچھوا اناطولیہ اور شام کی طرف سے آتی ہیں اور خلیج کو ہوتی ہوئی نکل جاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ ہوا تند و تیز آندھی کی شکل میں ہوتی ہے اور خلیج فارس کے بادلوں اور تموج کو دھکیلتی ہوئی دور سمندر تک لے جاتی ہے۔ چنانچہ اسی آندھی نے طوفان نوحؑ میں سیلاب کا راستہ کھولا تھا۔ بارش بند ہوئی زیر زمین سوتے بند ہوئے آندھی نے موجوں اور بادلوں کو دھکیلا تو سیلاب کو بہنے کا راستہ ملا اور پانی کم ہونے لگا۔ بلند چوٹیوں پر سے پانی اترا اور پھر کشتی زمین کو چھونے لگی حتیٰ کہ ایک جگہ ٹھیر گئی کشتی کا یہ لنگرگاہ ہی کلدانیہ کی کا پہلا پایہ تخت بنا جس کا نام اُر تھا بیرحمار کے مضافات سے یہ زیادہ دور نہیں ہے۔ قدیم زمانہ میں دجلہ سے ایک شاخ پھوٹ کر اُر کے قریب نکلتی ہوئی فرات میں گرتی تھی۔ لیکن اب صدیوں سے یہ نہر خشک ہے۔ اسی خشک نہر کا نام شط الحئی ہے۔ ماہرین کا قیاس ہے کہ پرانے زمانے میں ارارت اسی جگہ کا نام ہوسکتا ہے جو بعد میں کوہ جودی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کوہ ارارات کو اناطولیہ کے ارارت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں مغالطہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اناطولیہ میں ارارات کا نام بعد میں اختیار کیا گیا۔

جہاد علمی اب بھی دوسرے گوشوں میں جاری ہے۔ اثریات کی دستیابی سے قدیم معلومات میں جس قدر اضافہ ہورہا ہے وہ اسی قدر ذوق تلاش و تجسس کو تیز کررہا ہے۔ ان تحصیلات سے تاریخ کی گم شدہ کڑیاں جڑتی جارہی ہیں۔ پرانی روایتیں ٹوٹنے لگی ہیں۔ اور یہ توقع بیجا نہیں ہے کہ علم و سائنس کی ترقی اور فروغ سے عقائد اور روحانیات کی دنیا بھی کسی قدر سادہ و دلکش ہوسکے گی۔

فرانسیسی افسانے اور فطرت نگاری

اثر لکھنوی

یوں تو کہا جا سکتا ہے کہ فطرت نگاری کا آغاز اسی دن سے ہوا جب انسان نے اوّل اوّل تحریر کو قلم اٹھایا کیونکہ معًا راستی کی متابعت کا بھی سوال پیدا ہوا، لیکن تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے میں دیگر امور کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا مثلاً قومی خصوصیات، واقعات، انسانی دل و دماغ کا اتار چڑھاؤ جن سے ادب متاثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہی اسباب ادبی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں اور بعض اوقات یہی اسباب ادب کی رفتار تیز کر دیتے ہیں۔ اگر بنی نوع انسان کو ایک فوج تصوّر کیا جائے جو زمانے کے وسیع میدان میں گامزن ہے اور برابر استقلال کے ساتھ راستی پر قابو پانے کو کمربستہ رہتی ہے تو زمانے کی سِیہ بختی اور کسی دور کی خامیاں جو کچھ بھی ہوں یہ ناگزیر ہے کہ ادیبوں اور سائنسدانوں کو اس فوج کا ہراول تسلیم کیا جائے۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں پہلی بار "طرز" معرض وجود میں آیا۔ اس سے پیشتر سائنسداں اور شاعر اپنے رجحان اور اپنی ذہانت و فطانت کی روشنی میں عمل پیرا تھے۔ بعض نے اتفاقیہ چند ذرّے حقیقت کے بھی ڈھونڈ نکالے تھے مگر ایسے ذرّے جو منتشر تھے اور جن میں فاحش اغلاط کا اشتمال تھا۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ سائنسدانوں نے تہیہ کیا کہ قیاس کے بجائے تجربہ کو اپنا رہبر بنائیں گے انھوں نے مفروضہ و مکسوبہ راستیوں کو ٹھکرا دیا اور اولین اسباب کی طرف رجوع کی، ہوشیاری سے مشاہدہ و مطالعہ میں مصروف ہوئے اجماعی اصول کی جگہ تجزیہ پر تحقیق کی بنیاد قائم کی۔ قیاس او پیشین گوئی سے انکشاف حقیقت کی امید ترک کر دی گئی، فطرت کا صبر و استقلال سے مطالعہ شروع ہوا، افراد سے گزر کر اجتماع تک اور اجتماع سے مجموعہ جزو و کل تک رسائی ہوئی۔ یہ سائنس کا طرز کار تھا۔

لیکن ایک مہذب جماعت کے تمام افراد و اشیا ایک دوسرے سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط و مسلسل ہوتے ہیں۔ جب انسانی تفکّر کے ایک شعبے میں جولانیاں اور سرگرمیاں شروع ہوتی ہیں تو دوسرے شعبے بھی قدم بقدم رکھتے ہیں اور پھر سب مل کر منہمک ہوتے ہیں۔ ادب نے سائنس کی مثال سے استفادہ کیا اور وہ طرز مطبوع ہوا جس کی بنیاد تجربہ پر تھی۔ اٹھارویں صدی کی عظیم فلسفیانہ تحریک ایک زبردست سعی تھی، گو بسا اوقات اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کے چلنا ہوتا تھا تاہم اس کا مستقل مقصد مطالعہ اور حیات انسانی کے تمام عقدوں کا حل تھا۔ تاریخ اور تنقید میں قدیم منطقی استدلال کی جگہ واقعات و ماحول کی چھان بین نے لی، خالص ادبی کارناموں میں فطرت نے مداخلت کا اقدام کیا حتیٰ کہ جین جیکیز روسو کی سرکردگی میں عنان حکومت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ کوہ و صحرا و دریا میں گویا جان پڑ گئی اور کارگاہِ عالم میں اپنی اپنی جگہ اپنے فرائض انجام دینے لگے۔ اب انسان ایک ذہنی مخلوق نہیں رہا بلکہ اپنے ماحول کا تابع تھا اور اسی کے تحت اس کی تکمیل ہوتی تھی۔

ڈائڈیرو مخصوص طور پر اٹھارویں صدی کی مہتم بالشان ادبی شخصیت ہے۔ اس نے ہر قسم کی راستی کو دیکھا اور پہچانا، وہ اپنے معاصرین سے بہت آگے نکل گیا، رسم و رواج کی گھن لگی ہوئی بوسیدہ عمارتوں کو ڈھانا چاہا، غیر معقول قواعد کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس عہد میں سرعت کے ساتھ شاندار ترقی ہوئی۔ شدید تھی وہ محنت و ریاضت جس سے کہ موجودہ سوسائٹی رونما ہوئی۔ یہ ایک دورِ جدید تھا جس نے آنے والی صدیوں کے لئے ایک نیا راستہ کھول دیا جس کو انسان طے کر رہا ہے۔ فطرت اس کی بنیاد ہے اور "طرز" اس کا آلۂ کار۔

اسی تدریجی ترقی کا نام "فطرت پرستی" ہے، سائنس اور ادب میں اس کا مطمح نظر فطرت و انسانیت کی طرف مراجعت ہے: ہر بات کو احتیاط و ہوشیاری سے جانچنا صحیح تشریح کرنا اور ہر شے کی سچائی اور دیانتداری سے مصوّری کرنا اس کا فرض ہے۔ مفروضہ شخصیتیں مفقود ہو گئیں، اختراعات کا ذبہ کا قلع قمع ہو گیا، "مطلق اصول" باطل ہو گئے، ان کی جگہ زندہ اور اصلی نفوس کارفرما ہیں اور ان کے سچّے حالات بیان ہوتے ہیں، روزانہ زندگی کے تعلقات من و عن دکھائے جاتے ہیں۔ اس امر کی تکمیل کے لئے ضروری تھا کہ انسان اور اس کی زندگی کے تمام متعلقات کا مطالعہ کیا جائے تاکہ بلا افراط و تفریط اس کی حقیقت آئینہ ہو جائے اور صحیح نتائج نکالے جائیں، ان خیال پرستوں کے علی الرغم جو فرضی انسانوں کے نمونے گڑھتے ہیں مصنّفوں کو ادبی عمارت بنیاد سے از سر نو اٹھانا پڑی اور ہر ایک نے اپنی استعداد کے موافق علی قدر اس کی تعمیر میں حصّہ لیا۔

انسانی تخیّل میں ایسا زبردست ارتقا بغیر کسی تمدنی فشار کے ناممکن تھا۔ یہ انقلابِ فرانس کی شکل میں ظاہر ہوا۔ کسی انقلاب کی تکمیل سنجیدگی اور فہمیدگی سے شاذ ہی ہوتی ہے۔ دماغ کے پیچ ڈھیلے ہو جاتے ہیں، قوت متخیلہ مرعوب و خیرہ ہو کر اوہام کا شکار ہو جاتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے اختتام کے لگ بھگ انقلاب کے اس زبردست دھکّے

کے بعد طبقۂ شعرا روسو کی نیک مگر مضطرب روحانیت سے متاثر ہوکر مبتلائے حزن و اضمحلال ہوگیا اور قسمت پرستی کو اپنا شعار بنالیا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے، بعض نے تلخ نوائی اختیار کی بعض سوچ میں پڑ گئے یا خلاف فطرت افعال کو اپنی تخیل کا جولانگاہ بنایا۔ تاہم انقلاب کی روح ان میں حلول کر چکی تھی اور دوسروں کی طرح انھوں نے بھی علم بغاوت بلند کیا۔ ان کی سرکشی نے دنیائے رنگ و بو و جہانِ تخیلات و جذبات میں ہلچل مچا دی۔ تمام معینہ اصول توڑ ڈالے گئے اور زبان نے بلند، خیرہ کن اور موسیقیت سے لبریز الفاظ کا جامہ پہنا۔ اس حالت میں بھی صداقت کی جھلک نظر آجاتی تھی کیونکہ مردہ صدیوں کے خیالات کو دوبارہ زندگی بخشنے کی کوشش میں بھی مقامی رنگ جھلکنے لگتا تھا۔ اس طرح رومانوی سکول وجود میں آیا جسے فرانسیسی ادبی کلاسک کا حریف کہنا چاہیے۔

کسی میں اس (رومانی) تحریک کی تاب مقاومت نہ تھی اور سبھی نے اس کا اتباع کیا۔ مصوری، بت تراشی حتیٰ کہ موسیقی میں بھی رومانیت کا دور دورہ تھا۔ ایسے قوی اور ہمہ گیر مظاہرہ کی موجودگی میں خیال ہوتا ہے کہ ادب اور فن کے مستقل اصول ہمیشہ کے لئے مترتب ہوجائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ فرانسیسی کلاسک اسکول تو دو صدیوں تک پھولا پھلا لیکن رومانوی اسکول میں صدی کے ایک چوتھائی حصے کے بعد ہی زوال کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس وقت لوگوں کو ہوش آیا اور اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ رومانوی تحریک محض ایک جھڑپ تھی نہ کہ وارے نیارے کی لڑائی، بڑی بڑی قابلیتوں کے شاعروں اور ناول نگاروں کی ایک پوری نسل نے جن کے طبائع میں پرشکوہ جوش ودیعت تھا حقیقت کے چہرے پر نقاب ڈال دی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ ڈانڈیرد کے جائز وارث یعنی فطرت نگار اشخاص اس صدی کے واحد مالک ہیں۔ زنجیر کی گمشدہ کڑی آخر کار مل گئی اور فطرت نگاری بالزک کی سرکردگی میں لڑ بھڑ کر صف اولین میں پہنچ گئی۔

اس میں شک نہیں کہ ایک قلیل عرصے تک دو ادبی ہستیاں ایک دوسرے کے مقابل رہیں، ایک طرف وکٹر ہیوگو تھا جو لکھنا تو چاہتا تھا نثر مگر لکھتا تھا نظم۔ پھر الکزانڈر ڈوما (بزرگ) تھا جس کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ زبردست افسانہ گو تھا، اُدھر جارج سینڈ تھی جو اپنی قوت اختراع کے دیکھے ہوئے خوابوں کو موزوں اور دلکش الفاظ میں دہراتی تھی۔ اس کے باوصف جدید فرانسیسی ناول کے سرچشمے بالزک اور اسٹینڈ ہال ہی میں ملیں گے، یہ دونوں مصنف رومانی جنون سے مصئون رہے، بالزک اپنی طبیعت کے خلاف اور اسٹینڈ ہال بالارادہ (بالزک سے بہتر دماغ رکھنے والے کے لئے یہی شایاں بھی تھا) جب کہ سرشار موسیقی اسکول کے متوالے اس کے فتوحات کا ہر جگہ چرچا کر رہے تھے۔ جب کہ ہیوگو کے سر پر سلطان ادب کا تاج بڑی دھوم دھام اور طمطراق سے رکھا جا رہا تھا یہ دونوں یعنی بالزک اور اسٹینڈ ہال قریب قریب کس مپرسی کے عالم میں کام کر رہے تھے، ان کے مساعی نامشکور تھے اور ان کے ادبی کارناموں کو حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن یہ دونوں اپنی تصنیفات میں نیچرلسٹ اسکول کا دستور العمل منضبط کر گئے، ان کے بعد سینکڑوں کی تعداد میں ان کے جانشین ان کی خاک سے بالیدہ ہوئے، درانحالیکہ رومانوی اسکول خون کی کمی کی وجہ سے قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے تھا۔ اس کی یادگار صرف ایک شخص رہ گیا تھا، کوہ وقار و کہن سال وکٹر ہیوگو، جس کا اس قدر احترام باقی رہ گیا تھا کہ اس کے منہ پر حقیقت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔

شاید ضروری نہیں کہ اس جگہ ان اصول کی صراحت کی جائے جو بالزک اور سٹینڈ ہال کی دین ہیں۔ ناول نگاری میں انھوں نے وہی اصول برتے جو سائنس کی تحقیق میں دوسروں کے رہنما تھے۔ اشیا کے متعلق قیاس سے احتراز کیا، محض قصے کہنا چھوڑ دیا۔ اُن کا فرض یہ تھا کہ انسان کو لیں اور اس کے دل و دماغ پر عمل جراحی کریں۔ اسٹینڈ ہال زیادہ تر نفسیات پر قانع رہا۔ بالزک نے امزجہ کا مطالعہ کیا، ماحول کو از سر نو ترتیب دیا اور شہادت میں انسانی دستاویزیں[۱] "پیٹی کیٹ"، "لا پیری گوریو" یا "دکزان بٹی" کو ان سے پیشتر کے سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کے ناولوں سے مقابلہ کرلے پر واضح ہوجائے گا کہ اس عظیم الشان نیچرلسٹ اسکول نے بالزک کے زمانے میں ہی ارتقا کے کیسے کیسے مدارج طے کر لئے تھے۔

بالزک اور اسٹینڈ ہال کے ادبی فرزندوں میں سب سے ممتاز جگہ گسٹیو فلابیر کو ملنا چاہئے۔ بالزک کو حد درجہ پریشان کرنے والا یہ احساس تھا کہ اس کے طرز انشا میں وکٹر ہیوگو کی سی گونج نہیں ہے۔ نکتہ چینوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ بہت کاواک لکھتا ہے، یہ سن کر بالزک بہت ملول و متاسف ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ موسیقانہ لچک پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا مثلاً جب "لا فیم ڈی ٹرنٹ" اور "لالس ڈانس لا ویلی" لکھے، لیکن اسکے مساعی ناکام رہے۔ یہ تحریریں اتنی بھی تو موثر نہ تھیں جیسی کہ وہ جن میں بالزک اپنا ہی پر زور مگر اکھڑا اکھڑا انداز بیان اختیار کرتا تھا گسٹیو فلابیر کے ساتھ نیچرلسٹ اسکول کے قواعد ایک کامل الفن شخص کے ہاتھ میں پہنچ گئے جس نے ان کو مستحکم کیا اور مرمریں سطح کی طرح چمکا دیا۔

فلابیر نے رومانوی فضا میں تربیت پائی تھی اور اس کی طبیعت کا میلان ۱۸۳۰ء کی تحریک کی طرف تھا۔ ابتداءً اس نے اپنی کتاب "میڈم بوواری" اس وقت کے فطرت نگاروں کے جواب میں لکھی تھی جو "شمپ فلوری" کے متبع تھے اور کاواک نگاری پر کھلے بندوں فخر کرتے تھے۔ فلابیر کا منشا یہ ثابت

---

[۱] کیا رنگین نگاری اسی کا فیض نہ تھا؟ آثر

کرنا تھا کہ دیہات کے حقیر لوگوں کے حالات زندگی لکھنے میں بھی وہی وسعت خیال اور وہی قدرت زبان دبیان دکھائی جا سکتی ہے جو ہومر نے ہیلاس کے سورماؤں کے تذکرہ میں صرف کی۔ خوش قسمتی ہے کہ فلابیر کی تصنیف سے ایک دوسرا نتیجہ بھی ظہور پذیر ہوا، اس کا منشا جو کچھ بھی ہو مگر حقیقت نگاری میں اب تک جو قوت کی کمی تھی اس کتاب نے پوری کردی یعنی وہ بے مثل انداز بیان جو کسی کتاب کو لافانی بنانے میں معین ہوتا ہے۔ پھر کیا تھا، نئے آنے والوں کو صرف سچائی کے کشادہ راستے میں قدم رکھنے کی دیر تھی، لٹریچر فن ان کا ساتھ دے۔

جو تحقیق بالزک نے شروع کی تھی جاری رکھی گئی۔ انسان کا نفسیاتی مطالعہ اور ماحول کا اثر نظر انداز نہیں کیا گیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ ناول نویس ماہر فن بھی ہو گئے، جدت ادا، ترتیب الفاظ و وضع تراکیب کے جویا رہنے لگے اور اپنے اسلوب کی شیرینی اور گھلاوٹ سے راستی کے انکشافات میں تخلیق کی روح پھونک دی۔

فلابیر کی طرح اڈمنڈ اور جولس ڈی گانکور طرز ادا کی انفرادیت اور دلکشی کے متلاشی تھے، یہ لوگ فلابیر کے برخلاف رومانیت کی پیداوار نہیں تھے نہ ان میں کوئی بات لاطینی یا کلاسکل تھی، ان کا فن عطیۂ فطرت تھا، وہ اپنی زبان کے آپ ہی موجد تھے اور انھوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایسا طرز ایجاد کیا جس میں حیرت انگیز عمق، صحت اور موزونیت ہے۔

سب سے پہلے اپنی کتاب "جرمنائی لیکرٹو" میں پیرس کے باشندوں کی زندگی کا مطالعہ کیا، مضافات شہر اور اس کے بے برگ و بار مناظر کی مصوری کی، جو کچھ کہا آزادی سے اور ایسی زبان میں کہا کہ ہر شخص اور ہر چیز اپنی اصلی حالت میں نظر آئی۔

دونوں گانکور کا نیچرلسٹ اسکول پر گہرا اثر ہوا، اگرچہ طریقہ فلابیر ہی کا اختیار کیا گیا جدید اسلوب ادا نے لوگوں کی طبیعت میں ہیجان برپا کر دیا۔ جیسے اچھی موسیقی سے سنسنی پیدا ہوتی ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ محض تحریر نہیں تھی۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ لغت میں خاص رنگ بھر دیا لحن پیدا کر دیا اور عطر میں بسا دیا ہے۔

یہ ہیں جدید نیچرلسٹ اسکول کے بانی: بالزک اور اسٹینڈ ہال اور ان کے بعد فلابرٹ اور برادر گانکور۔ موخر الذکر کے پہلو بہ پہلو اور لوگ بھی ہوئے۔ ان کے سلسلے میں دو نام فوراً سامنے آجاتے ہیں: الفانز ڈاؤڈے اور گائی ڈی موپاسان۔

ڈاؤڈے ان خوش قسمت لوگوں میں تھا جنھیں قدرت اس جگہ لاکر بٹھا دیتی ہے جہاں شاعری اور حقیقت کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ اس نے نیچرلسٹ اسکول کے شاندار ادبیات میں ایسی کتابوں کا اضافہ کیا جو حقیقت سے مطابق ہوتے ہوئے بھی ایسے شعلے سے منور ہیں جس کو خود ڈاؤڈے نے فروزاں کیا جس شے کو اس نے چھوا اس میں نشو و نما کی قوت پیدا کر دی، جان ڈال دی، رنگ بھر دیا، اور گہرائی بخش دی۔ نہ تو اس کا کلام اسٹینڈ ہال کی طرح سپاٹ تھا نہ بالزک کی طرح کھردرا۔ اس کی ذہنیت میں وہ دلکشی و رعنائی تھی جو عورتوں کا دل موہ لیتی تھی، اگرچہ وہ زندگی کے تاریک پہلو کے بجائے روشن پہلو کو اجاگر کرنا پسند کرتا تھا اور اس کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ اس کی تصنیفات پڑھنے والے رونے کے بجائے مسکرائیں تاہم اس نے کبھی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی ادبیانہ راستی کامل تھی۔ ہم اس کو ان چار یا پانچ فرانسیسی ناول نویسوں میں شمار کر سکتے ہیں جن کے طرز تحریر میں ایک صحت مند دل دھڑکتا ہے اور سورج کی کرنیں بکھری ہوئی ہیں۔ وہ بلاشبہ نیچرلسٹ اسکول کا ایک رکن رکین تھا۔ اس کی تخئیل میں چاہے جتنی بلند پروازی ہو لیکن بنیاد راستی اور حقیقت ہے۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کا نقشہ کھینچتا تھا جن سے ذاتی واقفیت تھی، وہ ایسے واقعات قلمبند کرتا تھا جو چشم دید تھے، ان کے ناول اور افسانے مشاہدہ و مطالعہ کے حیرت انگیز کرشمے ہیں۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے قارئین کو رلانے کے بجائے ہنساتا تھا۔ یہ بات اس کے حزنیہ افسانوں مثلاً "جیک" میں بھی پائی جاتی ہے جہاں وہ اپنے ہیرو کی قسمت پر افسوس تو کرتا ہے مگر اس کے تلون کو مضحکہ کے شکنجے میں جکڑ دیتا ہے۔

الفانزے ڈاؤڈے میں دو خصوصیتیں تھیں، ایک تو خنجر کی دھار کی طرح تیز طنز کا مادہ تھا، دوسرے چلبلا مذاق جو اس کے معاصرین میں کسی کو میسر نہ تھا۔ یہ ظرافت نہ تو رابیلے کی تھی نہ سوفٹ کی بلکہ ایک بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی جس پر شاعری کا کوندا لپکتا اور صفحات کو روشن کر دیتا تھا۔

یاد ہوگا کہ الفانزے ڈاؤڈے نے اپنے اکثر معاصرین کی طرح زبان کی باریکیوں اور نزاکتوں کو نظم کے فن کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا اور اول اول پبلک کے سامنے مختصر افسانہ نویس کی حیثیت سے آیا تھا۔ برسوں تذکرہ رہا کہ وہ اصلی نام لکھنے کا اہل نہیں۔ کس طرح اس نے اس خیال کو فاتحانہ طریقہ سے غلط ثابت کر دکھایا یہ بھی سب کو معلوم ہے، مگر گائی ڈی موپاسان مرتے دم تک مختصر افسانے ہی لکھتا رہا اور اس فن کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ اس کی بعض طویل تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اگر صحت اور زندگی وفا کرتی تو کیا عجب ہے وہ کسی وزنی تصنیف کا مالک ہوتا لیکن جنون اور موت نے عین جوانی میں اس کی ادبی تحریکات کا خاتمہ کر دیا۔

کہنا چاہئے کہ موپاسان فلابیر کا پسر متبنیٰ اور حصول کمال میں بڑی حد تک اس کا منت گزار ہے، لیکن اس میں چند ذاتی صفات بھی تھے،

سے خود ایمیل زولا اس برادری کا ایک معزز رکن ہے۔ آئر

اس کے مزاج میں "نارمن" توانائی تھی۔ وہ شہوانیت سے متاثر تو ہوتا تھا مگر اس میں تاثر بہیمیت کا عنصر نہ ہوتا تھا یہ صرف ایک فطری جذبہ تھا۔ ایسے شخص کا جس کو قدرت نے کثرت سے قوتِ تولید عطا کی ہو۔

طرزِ نگارش میں اس نے کمال بہم پہونچایا اور اسقدر مانجا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صفائی میں کاوش یا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس نے دیہاتی زندگی کے جو مرقع طیار کئے ہیں ان میں ایسی صناعت سے کام لیا ہے کہ سادگی میں تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ فلابیر کے واسطے سے موپاسان کا سلسلہ اسٹینڈہال تک پہنچتا ہے۔ موپاسان علم تشریح و نفسیات کا زبردست ماہر تھا۔ اسٹینڈہال کے پیرووں میں پال بورژے بھی تھا جس نے انسان کی غیر فطری شہوانی خواہشات کا مطالعہ کیا تھا اور ایسے امور کے تجزیہ میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔

جن لوگوں کا اوپر ذکر ہوا نیچرلسٹ اسکول میں پیش پیش ہیں۔ دوسرے بھی پیدا ہوئے ہیں اور اپنے پیشرووں کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کر رہے ہیں، ان پر رائے زنی خلاف مصلحت ہے۔ جتنے ہیں اور محنت کرتے ہیں ممکن ہے کہ ان میں سے بعض نام و نمود پیدا کریں یا پیشینوں سے بھی گوئے سبقت لے جائیں لیکن اس کا انحصار ان کی خداداد قابلیت اور زمانے کے پختہ کرنے والے اثرات پر ہے۔ (باقی دارد)

غزل

صدقؔ جائسی

جذبۂ بے اختیاری ناوکِ قاتل میں ہے
تیر چٹکی سے نہیں چھوٹا کہ میرے دل میں ہے

ایک ہی ذکر، ایک ہی چرچا، تری محفل میں ہے
مجھ کو یہ دھوکا، کہ دل کا راز میرے دل میں ہے

مجھ کو سوزِ دل نے بے مصرف جلایا عمر بھر
شمع جلتی ہے تو اک مصرف تری محفل میں ہے

وصل کے بعد اب خلش رہتی ہے یادِ وصل کی
تیر سینے سے نکل آیا ہے، پیکاں دل میں ہے

دردِ دل کہنے کو کہتا ہوں مگر کیا فائدہ
جو زباں سے آپ کہئے گا وہ میرے دل میں ہے

کس خطا پر مجھ کو اٹھواتے ہو بزمِ ناز سے
یہ تو سوچو کس کی رسوائی بھری محفل میں ہے

حُسن بے رونق ہے، جب پردے کے باہر آگیا
شہرۂ آفاق لیلیٰ، آج تک محمل میں ہے

قیدِ بے میعاد کہئے، یا اسے قیدِ حیات
عیش و غم اپنا، اسی زندانِ آب و گل میں ہے

دیکھ لے اے قیس دل میں، عشق کامل ہے اگر
کون کہتا ہے کہ لیلیٰ، پردۂ محمل میں ہے

آپ کے دشمن مری جانکاہیوں کا غم کریں
یہ تو دنیا ہے، کوئی خوش ہے کوئی مشکل میں ہے

آبکاری میں بھی گیا اے صدقؔ جلسہ ہے کہیں
آج قاضی[1] کی جگہ خالی مری محفل میں ہے

[1] قاضی سے اشارہ ایک عزیز دوست کیطرف ہے جو اکسائز کمشنر ہیں اور مشاعرے سے غیر حاضر تھے

دوراہا ـــــ نکہت نسیم

میں کہاں جاؤں ـــــ یہ آواز کدھر سے آئی
جیسے ساغر کوئی کھنکے کوئی شیشہ ٹوٹے
جیسے شرمیلے مغنّی کا ارادہ ٹوٹے
جیسے صحراؤں کی تنہائی میں لے کی آواز
جیسے لہروں پہ ہواؤں کی تھرکتا ہوا ساز
میں کہاں جاؤں ـــــ یہ آواز کدھر سے آئی

میں ہوں مغموم کہ یہ ساز بھی مغموم سے ہیں
یہ مرے اشک حقیقت ہیں کہ موہوم سے ہیں
جیسے تنہائی میں اک ساز بجاتا ہو کوئی
جیسے خاموش ستاروں کو رُلاتا ہو کوئی
میں کہاں جاؤں ـــــ یہ آواز کدھر سے آئی

کون گم نام خلاؤں میں بلاتا ہے مجھے
کون مانوس سا اک راگ سناتا ہے مجھے
جیسے گزرے ہوئے لمحوں کو پکارے کوئی
جیسے ڈوبی ہوئی کشتی کو ابھارے کوئی
اور یہ آواز ـــــ یہ آواز کدھر سے آئی

صرف نغموں کے سہاروں پہ کوئی جی نہ سکا
ساغر اشک بھی تا زیست کوئی پی نہ سکا
زندگی عیش و محبت کے سوا بھی کچھ ہے
زندگی نغمۂ جنت کے سوا بھی کچھ ہے
میں کہاں جاؤں ـــــ یہ آواز کدھر سے آئی

"آ! کہ تلوار اٹھا ساز کے دن بیت گئے
یہ علم ہاتھ میں لے ناز کے دن بیت گئے
تلخئ زیست کو نغموں سے بھلانا کب تک
خوں بہانے کی جگہ اشک بہانا کب تک"
میں کہاں جاؤں ـــــ یہ آواز کدھر سے آئی

"آ! کہ تاروں کی قطاریں ہیں جلو میں تیرے
اُٹھ! کہ جنت کی بہاریں ہیں جلو میں تیرے
چل! کہ ہر گام پہ سجدوں کی ضرورت ہی نہیں
سن! کہ اب تجھ سے غلامی کو محبت ہی نہیں"

اس دوراہے پہ ـــــ یہ آواز کدھر سے آئی

عہدِ وفا ـــــ عبدالمجید بھٹی

گھنٹیاں کانوں میں بجتی ہیں کچھ افسانے لئے
ناچتی ہے زندگی گل رنگ پیمانے لئے
مست و دلغزیدہ فضائیں ہیں ہوائیں مشکبار
آرزوئیں کارواں در کارواں ـــــ
عشق و مستی کے جلو میں خواب لہراتے ہوئے
امتیاز ما و تو سے ماورا ـــــ

دیدۂ و دل کے مقام
یک بیک جن پر بگولے چھا گئے
بجلیاں لہرا گئیں
جن میں کچھ ایوان ہیں گرتے ہوئے جلتے ہوئے
الفت کے پیمانوں کے ساتھ
دل گرفتہ آرزوئیں
ٹوٹتی انگڑائیاں
گھنگھروؤں کی چھن چھنا چھن میں دبی
ڈوبتی جاتی ہیں دیپک راگ میں
جس کی تانیں اُٹھ رہی ہیں دور سے
اور تانوں کی لپک سے جل رہی ہے کائنات
جل بجھا ہے انتظار
پھر دہک اٹھی ہیں کجلائی ہوئی چنگاریاں
پھر چمک اٹھی ہیں پتھرائی ہوئی آنکھیں مری
سرد آہیں گرم سانسوں میں ہوئی جاتی ہیں گم
بھر گیا نس نس میں زہر انتقام
جسم و جاں پر چھا رہا ہے التہاب
کاش جل جائے مرا عہدِ وفا

کاہشِ مرگِ دوام

چیمبر [illegible]
کومرس [illegible]
میں [illegible]

پنڈت جواہر[illegible]
کی تقریر[illegible]

۱۶-دسمبر کو آنریبل پنڈت جواہرلال نہرو نے ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کومرس میں جس میں ہندوستانی اور برطانوی تاجر موجود تھے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ گو کوئی ہندوستانی حکومت کسی خاص شخص یا ذات کیلئے کسی طرح کی حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی پالیسی کو ہرگز پسند نہیں کرے گی لیکن میں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان دوسرے ملکوں کے ساتھ اب زیادہ قریبی تعلق رکھے گا۔

✡

کونسل اوف اسٹیٹ کے صدر

آنریبل سرمانک جی بی دادابھائی' کے سی ایس آئی' کے سی آئی ای' ایل ایل ڈی' بار ایٹ لاء۔

نیویورک کی پبلک لائبریری

ریاست ھائے متحدہ میں چھ ہزار پانچسو کے قریب بڑی پبلک لائبریریاں ھیں جن میں سے ایک نیویارک کے مشہور حصے منہاٹن کے عین بیچوں بیچ واقع ھے۔ ۱۸۹۵ء میں تین اشخاص کی ذاتی کتابوں کے ذخیرے سے اسے قائم کیا گیا تھا۔ اب شہر بھر میں اسکی اکسٹھ شاخیں موجود ھیں۔ اس میں دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں کی پینسٹھ لاکھ کتابیں ھیں۔ صرف ھسپانوی حصہ سات ہزار جلدوں پر مشتمل ھے۔ اگر سب کتابوں کی الماریوں کو ایک قطار میں رکھا جائے تو وہ سرسٹھ میل تک پہنچ سکتی ھیں۔ مطالعہ کیلئے ہر کتاب فوراً مل جاتی ھے۔ کتابوں نقشوں اور تصویروں وغیرہ کو نکالنے اور رکھنے کیلئے سات سو لائبریرین اور محرر ملازم ھیں۔ روزانہ دس ہزار سے زیادہ پڑھنے والے اس سے فائدہ اٹھاتے ھیں۔ عوام سے وصول ہونے والے ٹیکس کی کی ایک خاص رقم اسکا خرچ پورا کرتی ھے۔

ان خانوں میں ہر کتاب کے نام کے چھوٹے چھوٹے کارڈ رکھے ھیں۔ جن سے لائبریری کی تمام کتابوں کا پتہ لگایا جاسکتا ھے۔ انکے بعد فہرست دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۔۔۔نگ روم کا ایک حصہ۔ اس میں آٹھ سو آدمی بیک وقت مطالعہ یا تحقیقات کا کام جاری رکھ سکتے ھیں۔

۔۔۔حصے میں دس لاکھ سے زیادہ تصویریں موجود ھیں۔ ۔۔۔کار اور مدیر ھمیشہ ان سے استفادہ کرتے رہتے ھیں۔

۔۔۔یری میں ایک کمرہ بچوں کیلئے الگ ھے۔ جہاں وہ ۔۔۔ویروں کی دلچسپ کتابوں سے اپنا دل بہلاتے ھیں۔

تبتی فنون لطیفہ کی نمائش

کچھ عرصہ ہوا لندن کی ڈیوبز اسٹریٹ میں تبتی فنون لطیفہ کی ایک نمائش ہوئی جسمیں تبت اور اسکے همسایہ ملکوں کے تین سے زیادہ فن بارے پیش ہوئے۔ یہ زیادہ تر شوقین حضرات نے عاریتاً بھیجے تھے۔ ان میں گلٹ کے بنے ہوئے گوتم بدھ کے دو ایسے مجسمے بھی تھے جو انکی تعلیم کی روح کو سب سے زیادہ مکمل طور پر واضح کرتے ہیں۔ انکو دیکھ کر اس باطنی سکون اور قوت ادراک کا اندازہ ہوتا ہے جو ایک سچے معلم اور عارف کامل کا حصہ ہوتی ہے۔ پہلا مجسمہ ساکیافرقے کے ایک لاما کا ہے۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے پتا لگتا ہے کہ بے خوفی بھی کتنی بڑی برکت ہے۔ دوسرے مجسمے پر تبتی زبان میں یہ الفاظ کندہ ہیں «یہاں لاگ مکھیور کی خدمت میں»۔ یہ مجسمہ کمال فن کا بہترین مرقع ہے۔ تیسرا مجسمہ گیارہ سروں والی «اویلوکٹ» دیوی کا ہے۔ اسکے دوہرے ہاتھوں میں عام طور پر وہ ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ پرستان کی حفاظت کرتی ہے۔ تبت میں مذہبی نقاشی اور صورت گری نے خاص طورپر مہاتما بدھ اور انکے چیلوں کی مورتوں کے سلسلے میں ایک مخصوص انداز اختیار کرلیا تھا اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔ مثلاً بدھ کی وہ تصویر جس میں اسے قبلائی خاں اور اسکی ملکہ کو اپدیش دیتا ہوا دکھایا گیا ہے ہمیشہ ایک ہی قسم کی ہوتی ہے۔ یعنی تصویر کے بیچ میں مہاتما بدھ کو بٹھایا جاتا ہے۔ ان کے بعد قبلائی خاں کو۔ ملکہ کو سب سے کم اہمیت دی جاتی ہے۔ بدھ مت کے بنیادی اصول جو ابتک لامائیت کی اکثر شاخوں میں پائے جاتے ہیں آگے چل کر تبتی آرٹ کے ہاتھوں «کثرت پرستی» کے بوجھ سے دب گئے۔ یہ اصول ساتویں صدی میں تنترائیت کی وجہ سے بھی مسخ ہوگئے۔ (تصویریں «اپالو میگزین» سے لی گئی ہیں۔)

گلٹ اور کانسی کی بنی
لاما کی ایک قدیم مو...

گیارہ سروں والی دیوی اویلوکٹ
مورت جس میں ...

...ساکیا فرقے کا ایک لاما قبلائی خان اور اسکی
ملکہ کو بدھ مت کی تعلیم دے رہا ہے۔

"یونیسکو"

ہندوستانی مصوری ک

"یونیسکو" یونائٹڈ نیشنز ایجو
اینڈ کلچرل اورگنائزیشن" ک
جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ا
تعلیمی سائنسی اور ثقافتی معا
ہے۔ اس ادارہ میں شامل
قوموں نے اس اصول کو تسلیم
کے لئے سب کو پورے پور
موقعے حاصل ہونے چاہئیں۔
ہو تلاش کی جائے اور دنیا ک
ایک دوسرے کے خیالات اور
ڈوک فائدہ اٹھائیں۔ اس ادار
میں پڑی لیکن اسکا پہلا تا
نومبر کے دوسرے ہفتے میں بیر
اس میں تمام اتحادی ملکوں
شرکت کی۔ اس موقعہ پر فنو
اہتمام بھی کیا گیا جس میں
شاہکار پیش ہوئے۔ ہندوستان
تصاویر کی نمائش ہوئی ان
اس صفحہ پر ہدیۂ قارئین کئے ج
پر مفصل مضمون آجکل کی اشا
میں شائع کیا جاچکا
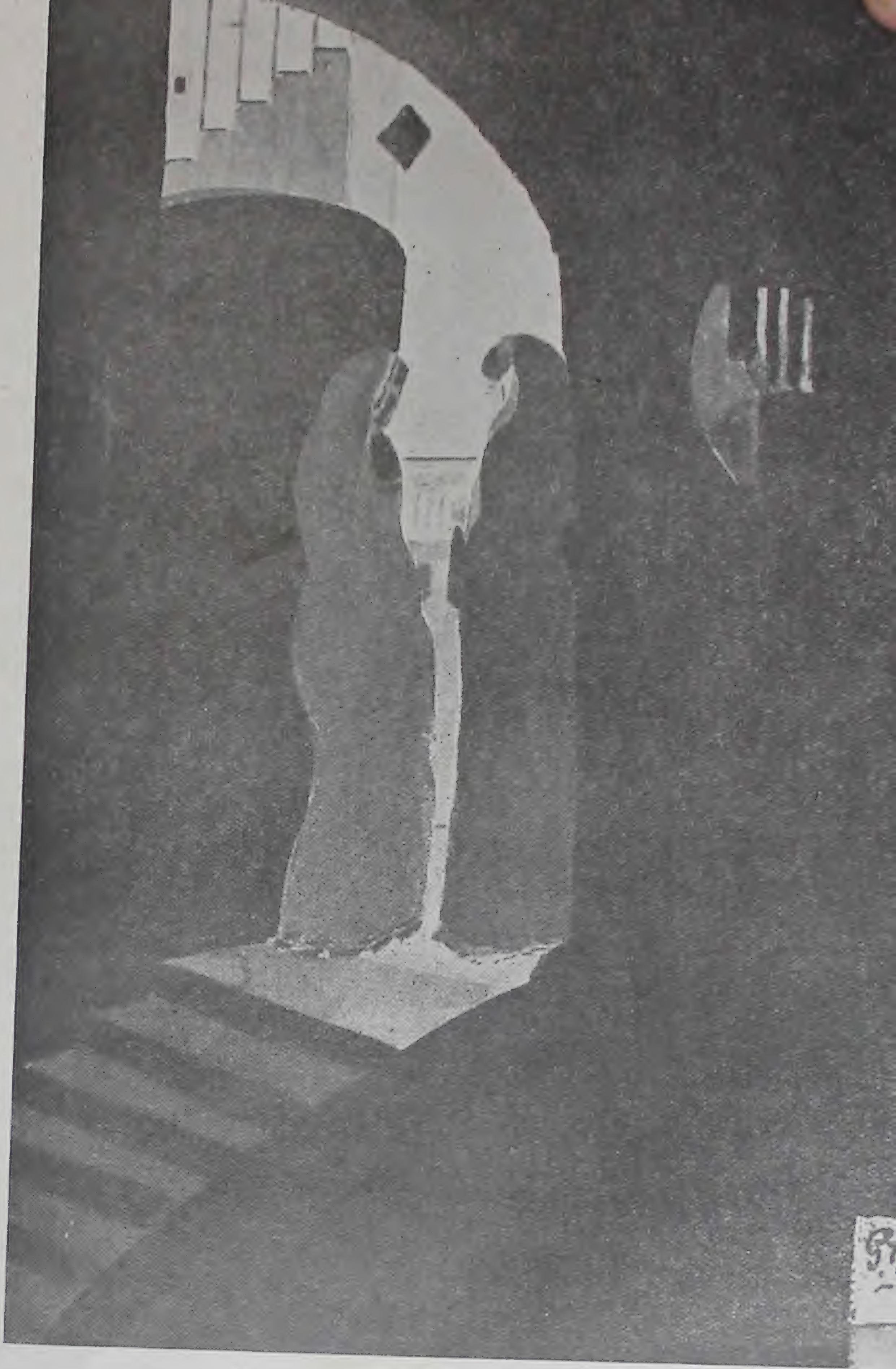
وفات–(عمل گگنندر ناتھ ٹیگور)

☆

حیات شری چیتنیہ–
(عمل مولیا گوپال سین)

بمبئی

زندگی کی یک رنگیوں سے گھبرا کر ہمیشہ بڑے شہروں کو جانے کو دل چاہتا ہے۔ شہر بمبئی اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں سینکڑوں سال سے زندگی گنگناتی، گاتی، ناچتی اور اپنا رنگ جماتی نظر آتی ہے۔ کلکتہ بمبئی سے بڑا ہے لیکن چہل پہل اور شان و شوکت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نیویورک کی طرح بمبئی زیادہ گنجان آباد ہے اور ہر عمارت کی کئی کئی منزلیں

ڈیا لائف انشورانس کمپنی کی بالکل
نی وضع کی عمارت جو ایرکنڈیشنڈ
ر سیمنٹ کنکریٹ سے بنائی گئی ہے۔

ساحل سمندر کے قریب حال ہی میں پاٹی ہوئی زمین پر نئی وضع کے یہ شاندار فلیٹ تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہاں سے شہر کا مشہور حصہ «میرین ڈرائیو» صاف نظر آتا ہے۔

ہیں۔ مشہور تجارتی بندرگاہ ہونے کے علاوہ یہ صنعت اور حرفت کا مرکز بھی ہے۔ فلموں کی صنعت نے خاص طور پر اسکو حد درجہ جاذب توجہ بنا دیا ہے اور اسی لئے وہ بہت سے فنون لطیفہ کا گہوارہ بھی ہے۔ مشرق و مغرب کا امتزاج بھی دکھائی دیتا ہے۔ یورپین آرکسٹرا سے لیکر دیہاتی سازوں تک ہر قسم کی تان فضا میں گونجتی سنائی دیتی ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی

روز سنیما» کی خوشنما

ہونگ کونگ

ہونگ کونگ میں کوچہ و بازار آ
ترچھے اور اونچے نیچے ہوتے
کہیں سطح ہموار ہوتی ہے
کہیں سیڑھیاں۔

کاغذ سے لدی ہوئی ایک کشتی اس جہاز کی طرف جا رہی ہے جو ساحل ہونگ کونگ سے کچھ دور سمندر میں کھڑا ہے۔

✿

ہونگ کونگ جنوب مشرق ایشیا میں ایک دلکش مقام ہے ہوائی جہاز سے وہاں پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ فرانسیسی ہند چینی کے شہر سیگاؤن سے پہاڑی علاقوں کو چار پانچ گھنٹے میں طے کرکے یا سنگاپور سے بحیرہ چین کو آٹھ گھنٹے میں عبور کرکے۔ کوؤلون میں ہوا اور پانی کے جہازوں کے برطانوی مرکز ہیں اور وہاں سے دخانی کشتی میں بیٹھ کر اصل سرزمین پر جایا جاتا ہے۔ جب جہاز نیچے اترنے لگے تو پہاڑوں جزیروں اور سمندر کا ملا جلا منظر بہت نظر فریب معلوم ہوتا ہے۔ نیز چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں جہاز چلانے والے کو مغالطے میں ڈالنے لگتی ہیں۔ دخانی کشتی کے ذریعہ ساحل کے سب سے پہلے شہر وکٹوریہ پہنچتے ہی لڑائی کی ہولناک تباہکاریوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ کاروبار کے بڑے بازار اگرچہ سلامت ہیں لیکن بہت سا حصہ تباہ ہوگیا ہے۔ پہاڑیوں پر چڑھنے کے بعد توجہ اس نہایت بدنما عمارت کی طرف مبذول ہوتی ہے جسے جاپانیوں نے اپنی فتح کی یادگار قائم کرنے کیلئے نہایت بے ڈھنگے پن کے ساتھ تعمیر کیا تھا۔ البتہ سمندر کی جانب کا نظارہ سکون بخش ہے اور مشکل سے یقین آتا ہے کہ اس بظاہر خاموش حصے میں بحری ڈاکو ہمیشہ ہلچل مچائے رکھتے ہیں۔ جنگ کی بربادیوں کے باوجود وہاں کی دکانیں اب بھی ہر قسم کے سامان سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اگرچہ قیمتیں بہت زیادہ ہیں تاہم ضرورت کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ ہوٹلوں میں مغربی اور مشرقی کھانے یکساں اہتمام کے ساتھ مل سکتے ہیں۔

چندر پربھا ـ ایک فلم ایکٹریس۔

غزل

محمود سیتاپوری

مسیح بھی جو مرض کی مرے دوا کرتے
علاج دردِ محبت بتاؤ کیا کرتے ؟

وہ حسن ہے جو نہ ہستی کو پُر فضا کرتے
کب اُن کی دید کا عشاق حوصلہ کرتے

اُنھیں کے ہاتھ نہ کیوں ساحلِ مراد آتا
جو بحرِ عشق میں اپنے کو خود فنا کرتے

خمارِ بادۂ اُلفت اُتر سکا نہ کبھی
تو کیوں تغافلِ ساقی کا ہم گلہ کرتے

وہ جانتے نہ اگر آہِ بے اثر کو مری
تو یہ محال تھا دل کھول کر جفا کرتے

نگاہِ لطف سے دل کی گرہ بھی کھل جاتی
اگر نہ مجھے وہ تلطف سے آشنا کرتے

کبھی نہ گریۂ پیہم نے وہ اثر بخشا
کہ جس پہ دیدۂ پُرنم کچھ اکتفا کرتے

جنھیں کہ دل سے بھروسہ ہے ذات پر اسکی
سوا خدا کے وہ کیوں ذکرِ ماسوا کرتے

پیام موت سے واقف ہے جب حیات اپنی
تو ایسی چیز کا کیا خاک آسرا کرتے

کسے امید تھی اس بات کی قیامت تک
کہ آپ وعدۂ فردا کبھی وفا کرتے

جو حال اپنا نہ تھا التفات کے قابل
تو پھر بتاؤ کہ ہم کہہ کے تم سے کیا کرتے

چھلکتے جام فضائیں بھی مست ہو جاتیں
حریمِ کعبہ کو مےکش جو میکدہ کرتے

بجز ہوائے جنوں خیز کے ترے وحشی
وہ کون تھا جسے صحرا میں ہمنوا کرتے

ڈبویا دل کے سفینے کو عشق نے محمود
یہ جانتے تو نہ ہم اسکو ناخدا کرتے

محسوساتِ تصوّر

تصوّر کرتپوری

میں گرد و پیش اک وارفتگی محسوس کرتا ہوں
مزاجِ حسن میں کچھ برہمی محسوس کرتا ہوں

وہ لذت جو میسر ہے مجھے دردِ محبت میں
کبھی محسوس ہوتی ہے کبھی محسوس کرتا ہوں

فضائے بے نیازی میں بھی دل کھنچتا ہی جاتا ہے
غرورِ حسن میں بھی دلکشی محسوس کرتا ہوں

وہ کشتی خود جسے میں دے چکا طوفاں کے ہاتھوں میں
لبسا اوقات ساحل سے لگی محسوس کرتا ہوں

سحر ہوتے چمن سے کون یہ رخصت ہوا یارب
گلِ رنگیں کے دامن پر نمی محسوس کرتا ہوں

مچل جاتے ہیں جب انکی جبینِ ناز پر تیور
میں اس کو بھی محبت کی ہنسی محسوس کرتا ہوں

شرارے حسن کافر کے ہیں شاید کعبۂ دل میں
تنفس میں تصور آگ سی محسوس کرتا ہوں

عشرتِ ناتمام

احمد ریاض

وہ اس طرح پاس آکے بیٹھے وہ یوں سرِ راہ مسکرائے
بجھے ہوئے دل میں جان آئی دبی اُمنگوں نے سر اٹھائے

محبتوں کے خلاف یاں سازشیں اٹھائی ہیں نفرتوں نے
سیاہ خانے میں رہنے والا تمہارے ایواں میں کیسے آئے

فسردہ آنکھیں فسردہ چہرے ہر اک طرف منہ لبورتے ہیں
میں گم ہوں منزل کے پیچ و خم میں کہ راہ روکے کھڑے ہیں سائے

ابھی تو اُبھرینگے وہ ستارے جو ٹوٹ کر بن چکے ہیں ذرّے
اُفق سے پھوٹیں نئی شعاعیں دیئے امیدوں کے جھلملائے

فراغتوں کی تلاش کی ہے مسرتوں کیلئے پھرا ہوں
مگر یہ محنت گئی اکارت یہاں تو اپنے بھی ہیں پرائے

یہ میں ہی تھا جو کسی تصور کے آسرے پر جیا ہوں ورنہ
ان حادثاتِ جہاں کے ہاتھوں قدم کئی بار ڈگمگائے

ہزاروں ناکامیوں کی تہ میں مری اک امید دب گئی ہے
کہاں وہ لیجائے اپنی کشتی کہ جس کو ساحل نظر نہ آئے

چین کا موجودہ مرض

ڈاکٹر حفیظ سید

چین والوں کو عرصۂ دراز سے خانہ جنگی کے مصائب برداشت کرنے پڑ رہے ہیں، اور تقریباً تیس سال تک غیر ملکیوں اور خود اہل چین کی لائی ہوئی جنگ سے ملک میں اتنے ہی زیادہ آدمی ہلاک ہوئے جتنے کسی بڑے قحط یا وبا سے۔ ابھی حال ہی میں جو اعصابی جنگ اور حملے جنرل چیانگ کائی شیک کی فوجوں اور اشتمالی لیڈر ماؤتشی تنگ کے رفیقوں کے درمیان شروع ہوئے ان کی نسبت امریکی جنرل جارج کیٹلٹ مارشل نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "انتہائی یاس انگیز ہیں"۔ انھوں نے یاس کا لفظ خاص طور سے استعمال کیا۔ ہر مرتبہ جب کسی غیر ملکی نے چین کے معاملات کا تصفیہ کرانا چاہا تو چینی پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ جھگڑنے لگے۔ اور فرانسیسیوں نے ازراہ ہمدردی اسے "چینی فلاکت زدہ ذہنیت" کے نام سے موسوم کیا۔

اگر کوئی غیر ملکی، چیانگ یا اشتمالیوں سے یہ دریافت کرے کہ ان میں اختلاف کیا ہے تو جواب ملے گا "کچھ نہیں" بظاہر یہ سچ ہے کیونکہ دونوں فریق سن یاٹ سین اعظم کے قومی انقلاب کے ورثہ دار ہیں۔ دونوں کا سیاسی صحیفہ سن یاٹ سین کے "سم من چو" اصول یعنی استحکام قومیت، حقوق عوام اور معاش جمہور ہیں اور دونوں فریق اتحاد چین کے لئے کوشاں ہیں۔ گذشتہ جنوری میں تصفیہ کی امید نظر آ رہی تھی کیونکہ جاپان پر فتح حاصل کرنے کے بعد دونوں فریقوں نے فیضانہ اخلاق کے ساتھ فوجی اور سیاسی سمجھوتہ کر لیا تھا اور سرکاری طور پر چیانگ کی یک جماعتی حکومت ختم کر دی گئی تھی۔ ان کی فوجوں کے نوے ڈیویژن اشتمالیوں کے اٹھارہ ڈیویژنوں سے مدغم ہونے والے تھے۔ ایک پارلیامنٹ کا انتخاب ہونے کا بھی فیصلہ ہوا تھا۔ اور چین اتحاد اور جمہوریت کی شاہراہ پر گامزن ہوتا نظر آ رہا تھا۔ لیکن رابطۂ اتحاد استوار ہونے سے قبل ہی خانہ جنگی کی آگ دوبارہ مشتعل ہو گئی۔

پرانے جنگی امیروں کے زمانہ میں جب کہ شخصی فوجیں چین کا گلا گھونٹ رہی تھیں، چیانگ طاقتور ترین شخصیت کی حیثیت سے نمودار ہوا اور دانشمندانہ طور سے ابتر حالات کا مقابلہ کیا۔ اور تفریق کو ذریعہ حکومت بنا کر وہ اپنی سپاہیانہ اہلیت سے چین کو ایک قوم بنانے میں قریب قریب کامیاب ہو گیا۔

جاپانی حملے سے قبل صرف اشتمالی اس کے حلقے سے باہر تھے ان پر قابو پانا بہت مشکل تھا اور ان کے استیصال کے لئے وقت درکار تھا۔ جدید ترین طریقے پر مسلح اور امریکی اسلحوں سے آراستہ فوجوں اور امریکی حکومت کی پشت پناہی کے ساتھ چیانگ ایک زبردست حملے میں اشتمالیوں کو غارت کر سکتا تھا لیکن حالات میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اب اس کی قیادت مسلم تھی اور وہ ریاست کا حاکم اعلیٰ تھا اور اس میں فوجی اہلیت سے زیادہ حکمت عملی کی صبر اور سیاست دانی کی خوبیاں درکار تھیں۔ خواہ وہ اشتمالیوں کے مقابلہ میں کتنا ہی برسر حق ہوتا لیکن رائے عالم اس کو ملامت کرتی اگر وہ اشتمالیوں سے اسی جارحانہ طریقہ پر پیش آتا جس کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ اس لئے اشتمالیوں کی آتش خیز اشتعال دہی کے باوجود چیانگ نے ان کو تیغ و تفنگ کے بجائے نرم و ملائم اور میٹھے الفاظ سے روکے رکھنے کی کوشش کی۔

چیانگ کو اور دوسرے امور کا بھی لحاظ کرنا تھا کیونکہ اگر اسے ریاست ہائے متحدہ کی مدد نہ ملی ہوتی تو چین کب کا دیوالیہ ہو چکا ہوتا۔ مصنوعی ذریعہ سے ملک کی مالیات میں اضافہ کی تعداد کا یہ عالم تھا کہ وہ حد شمار میں نہیں لائی جا سکتی تھیں۔ ۱۹۱۲ء سے جبکہ چین میں جمہوریت قائم ہوئی، اخراجات معاش میں پانچ گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ شنگھائی اس چور بازاری کا بدترین اڈہ تھا جس سے مشرق بعید کی دنیا کبھی واقف نہ تھی۔

حکومت نے چین کی مخصوص غذا چاول کی قیمت کو مزدور طبقہ کی مالی استطاعت کی سطح تک لانے کی کوشش کی۔ لیکن چیانگ کے نئے دار السلطنت نانکنگ میں سرکاری ملازمین ناداری کی وجہ سے شہر کے بازاروں میں خریداری نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے حکومت نے ان کو ان کی اجرت کا ایک حصہ چاول کی شکل میں تقسیم کرنا منظور کیا۔ خود اہل چین اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ رشوت ستانی ملک کا رفتہ رفتہ گلا گھونٹ رہی ہے۔ کم تنخواہ پانے والے سرکاری افسران، قوم کے مہیا کردہ سامانوں پر اقوام متحدہ کی امداد سے قبضہ کر کے چور بازاروں میں پہنچاتے جاتے تھے۔

اہل چین کا خیال تھا کہ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک چین میں دانشمند منتظم کافی تعداد میں پیدا نہ ہو جائیں۔ دوسرے ملکوں کا اصرار تھا کہ اگر نقل و حمل کے ذرائع لوگوں کو غذا پہنچانے، اور جنگ سے برباد شدہ علاقہ جات کی تعمیر کے حسب ضرورت ہو سکیں، تو یہ سب کچھ درست ہو جائے۔ لیکن شمالی صوبہ جات میں جیوں ہی حکومت کے مزدوروں نے ریلوں کی مرمت ختم کی اشتمالی گروہوں نے انھیں برباد کر دیا۔ گو کہ شان تنگ اور جیہول کے صوبوں میں چیانگ کی افواج نے منچوریا جانے والی ریلوے لائنوں کی چوبیس گھنٹہ نگہبانی کی، تاہم وہ اشتمالیوں کو ہمیشہ برباد کرنے سے نہ روک سکیں۔

چیانگ نے صلح کی تجاویز کی ناکامی پر اشتمالیوں کو مورد الزام ٹھہرایا جو پہلے خوشی سے مشترکہ حکومت قائم کرنے پر راضی ہو گئے تھے۔ اور جیسے جیسے روسیوں نے منچوریا کو خالی کرنا شروع کیا اس پر قابض ہونے لگے۔ اور جاپانی اسلحوں کی مدد سے جو سرخ افواج نے انھیں حوالہ کر دئے تھے، جنوب کی جانب پیش قدمی کرنے لگے۔ اور اپنے صوبوں سے جنگ کو آگے بڑھا دیا۔

ماؤتشی تنگ نے چیانگ کی حکومت پر مصالحت کی گفتگو کی شکست کا الزام لگایا کیونکہ مارچ کے مہینہ میں چیانگ کی کومینٹانگ جماعت کی مجلس عاملہ کا اجلاس اشتمالیوں سے مدغم ہونے کی تجویز پر بحث کرنے کے لئے ہو چکا تھا۔ اشتمالی اخباروں نے یہ کہنا شروع کیا کہ تیرہویں صدی کے قدامت پسندوں سے

لے جلتے رجعت پسند چیانگ کی جماعت میں یک جہت ہوکر صلح کی تجویز کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک "صلح کرنا خودکشی کا اقدام" تھا۔ چن برادران کی طاقتور ٹولی کی قیادت میں انھوں نے چیانگ سے خوب بحث کی اور حکومت کو اشتمالیوں کے ہاتھ فروخت کر دینے کا الزام لگایا۔ حکومت ینان کے خیال کے مطابق اس بغاوت کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ سمجھوتے کی تجویز واپس لے لی گئی اور اشتمالی فوج نے دوبارہ نقل وحرکت شروع کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شانشی اور منچوریا میں ینان کے سرخ پوشوں نے بہت کامیابی حاصل کی۔ چین میں ان کی عملداری بہترین نظم ونسق کی جگہ ہے۔ جمہوران کے حامی ہیں اور قحط ورشوت ستانی کا نام تک نہیں ہے۔ انھوں نے لگان کو کافی حد تک گھٹا کر کسانوں کو مصائب سے آزاد کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا قول ہے کہ "چین کی اشتمالیت اور جگہوں کی اشتمالیت کی طرح نہیں ہے"۔

اشتمالی جماعت کی تحریک کا منشا یہ نہیں ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں بلکہ وہ تمام چین پر اپنا حق جتاتی ہے اور اس کے حصول کے لئے پوری سرگرمی سے کوشاں ہے۔ اشتمالی رہنماؤں کا خیال ہے کہ فوجوں کی قلیل تعداد کے باوجود ہم کو چیانگ کے وزنی مگر کمزور سیاسی ڈھانچے کے مقابلہ میں کافی مواقع حاصل ہیں۔

لیکن چیانگ کو سب سے بڑی فوقیت یہ حاصل ہے کہ امریکہ نے جاپان کی ہلاکت کے بعد جو اسلحہ اور جنگی سامان بھیجا وہ سب اسی کے قبضہ میں آیا ہے۔ اشتمالیوں کو صرف دلکش اور حسین الفاظ ہی حاصل ہوئے ہیں۔ گذشتہ ہفتہ تیس ہزار امریکی جہازیوں نے شمالی چین میں گشت کیا اور ذرائع رسل ورسائل کی نگہبانی کی امریکیوں نے چیانگ کی بری وفضائی فوجوں کی تربیت کی ہے اور برطانوی ماہرین چینی بیڑے کی تربیت کر رہے ہیں۔

دولت اور اسلحہ کے ساتھ ساتھ حکومت ریاستہائے متحدہ نے نانکن میں چیانگ اور اشتمالیوں کے مابین صلح کرانے کے لئے درمیانی اشخاص بھی بھیجے ہیں۔ بحرالکاہل میں خاص طور سے ان سواحل پر جہاں آج روسی قابض ہیں، حاوی طاقت بن جانے کے عزم کے ساتھ امریکہ کی نگاہ جنگ کے بعد کی تجارت کی طرف بھی ہے۔ چالیس کروڑ چینیوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش بھی ایک مفید کام ہے۔

چند دن ہوئے چیانگ نے ایک بار پھر ایک ایسی آئینی حکومت کے قیام کے لئے خواہش ظاہر کی ہے جس میں تمام جماعتوں کی نمائندگی ہو۔

ضروری

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر ونظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

(ادارہ)

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا۔ لندن سے آداب عرض انہی نشریات کا مجموعہ ہے۔ بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن قیمت عیر

دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی و جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت عہ۸ر

ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر بنا دیا ہے۔ یہ مجموعہ بارہا شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

تیسرا ایڈیشن۔ قیمت عہ۸ر

وہ بھی دیکھا یہ دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے۔ یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آڈر دیجئے۔ نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے۔

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا حکیم مفتی امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کیلئے بہترین تصنیف۔ تمام مسائل کو تشریحاً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال، نماز، روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی بمفتیان کرام کیلئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے۔ کامل ۷ حصے بلا جلد چھ روپے مجلد اکتیس روپے

معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب فریڈرش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے۔ اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گراں مایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے۔

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ۔ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی ردوبدل کی روح فرسا تاریخ۔ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو انحصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سپارے بھی شائع ہوتے ہیں۔ فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

اوراق پارینہ

از شیر جنگ ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ملکی حالات۔ غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف۔ معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے، محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ہاروی۔ اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔

قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی قیمت ایک روپیہ

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انھیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ سینکڑوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مارکس کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور**

تصنیفِ مقدّر

افسانہ

رضیہ نعمان

گھور کالی رات۔ گہری تاریکی نے زمین و آسمان کا فرق مٹا دیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کاجل کی دھواں دھار برکھا ہو رہی ہو۔ کائنات ظلمت کدہ بنی ہوئی تھی۔ تاریکی ہی تاریکی جیسے نراشا کی دیوی نے ابھی ابھی جنم لیا ہو۔ ایک صرف ایک ننہا سا ستارہ بے بادبان نیا کی طرح عرش کی تاریکیوں سے چھپ چھپ کر جھانکنے کی کوشش کرتا اور پھر گھٹاٹوپ اندھیرے میں سما جاتا جیسے ایک بالی دوشیزہ کسی کی طرف دھیمی دھیمی نگاہوں سے دیکھ کر خود ہی شرما جاتی ہے۔

میں تنگ آگئی یوں اس کے سرہانے بیٹھے بیٹھے۔ اور ہلکی سی روشنی والا ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ شیریں کا چہرہ اس بے معلوم سی روشنی میں اور بھی زرد معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے ننھے منھے سنہری ریشم کے لچھوں سے گھنگھریالے بال اس کے ماتھے سے ہٹا دئے۔ کتنی مشابہ تھی آپا جان سے! ویسی ہی کشادہ پیشانی لمبی لمبی سیاہ پلکیں اور ہونٹ تو تھے ہی بالکل آپا کے پھیکا سا گلابی رنگ اور نظر بھری اہٹ! بوقت مسرت شبنم آلود گل نوبہار کی مانند کھل جاتے اور جب کوئی بات ناگوار گزرتی آپا کو تو لب اتنی زور سے بھینچتے کہ محض ایک مہین سی پیازی لکیر ہو کر رہ جاتے۔ ارغوانی رنگ میں آپا بہت بھلی لگتیں۔ اسی لئے میں نے ضد کرکے ان کے نکاح کے وقت اسی رنگ کا جوڑا پہنایا تھا۔ اور میری پرنم آنکھوں میں اسی دن کا نقشہ پھر گیا۔ آپا سمٹی سمٹائی آدھا سا گھونگٹ نکالے سہیلیوں کے گروہ میں چمک رہی تھیں۔ جانے آج ان پر اتنا نکھار کہاں سے آگیا۔ ویسے تو مجھے آپا کی بنگالی سہیلی مادھوی کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ لیکن آج آپا کی نیم وا جھکی ہوئی سی آنکھوں کے سامنے وہ بھی ماند پڑ گئیں۔ جب کلپنا اور مادھوی کوئی تان چھیڑتیں ― اور اندرا ایک مخصوص انداز میں اپنی صراحی دار گردن ہلا کر ترچھی نظر سے دیکھتیں آپا جان کی طرف تو ان کی آنکھیں عجیب سی شربتی جھلک مارتیں۔ حالانکہ ان کی آنکھیں بادحن بیاہ ماتی گئیں تھیں۔ لبوں پر مسرت آمیز کپکپاہٹ تھی۔ اور جب شاہدہ نے دولھا بھائی جان کے خیالی نقشے کو بیان کرنا شروع کیا۔ اور ان کے بازو میں چٹکی لی تو انھوں نے اپنا گول سا کھلا ہوا چہرہ بلوری حنا آلود ہاتھوں میں چھپا لیا۔ مجھے دولھا بھائی جان کا بے حد انتظار تھا۔ گو دیکھا کبھی نہیں تھا انھیں تاہم میں نے تخیل میں انکی مکمل تصویر بنا رکھی تھی۔ کچھ کچھ کرن دیوان جیسے ہوں گے۔ ہاں آواز تو اس سے بھاری ہوگی ہی۔ چال سے ایک خاص مثوالا پن اور لاپرواہی ٹپکتی ہوگی۔ تیز تیز گہری شربتی آنکھیں اور باتوں میں شوخی و شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی، منجھلے بھائی کی طرح۔ شادیانوں کی آواز بلند ہوئی اور چاروں طرف سے مبارک ہو مبارک ہو کی صدا آنے لگی۔ میں نے جلدی سے عذرا باجی کے ننھے کو بڑی اماں کے پاس بٹھا دیا اور دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی کوٹھے پر چڑھ گئی۔ میری خواہش تھی کہ دولھا بھائی کو میں ہی سب سے پہلے دیکھوں اور یہی خواہش شاید بڑی آپا کی تھی۔ کیونکہ جب میں نیرہ کا پاؤں کچلتی ہوئی آگے بڑھی تو بڑی آپا جھلائیں اور تنک کر بولیں "چل ہٹ پیچھے ہٹا لے میرے غرادے پر سے پیر ورنہ . . ." "ورنہ کیا؟" میں تیز ہو گئی۔ "سر پر چڑھا رکھا ہے ابا جان نے اسے۔ لم ڈھیک کی لم ڈھیک ہو گئی ہے اور کہلاتی ابھی بچی ہی ہے" یہ کہتے کہتے انھوں نے مجھے کہنی سے پرے دھکیلنے کی ناکام کوشش کی۔ اتنے میں بارات دروازے پر لگ گئی۔ آگے آگے سفید پوش بینڈ والے پورے انہماک سے "ساون کے بادلو" کی لے بجا رہے تھے۔ میری بے قرار نگاہیں جھٹ گھوڑے پر پہنچیں۔ اسی وقت بینڈ والوں نے پورے جوش سے "تقدیر میں یہی تھا" کی سر نکالی۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میری دونوں چٹیا کھینچ کر گال پر زور سے طمانچہ مار دیا ہے۔ براؤن سے گھوڑے پر ایک کالی ڈاڑھی والا پست قد کا سانولا سا آدمی چپکا ہوا تھا۔ "تقدیر میں یہی تھا" تنہائی کی آواز آئی!!! جب میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ کہیں سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ شاید بڑی آپا ساتھ والے کمرے میں رو رہی ہوں گی۔ چار و ناچار آنکھیں پونچھ کر نیچے جانا ہی پڑا۔ ممانی جان اماں سے کہہ رہی تھیں "اے بہن! میرے خلیل میں کیا برائی تھی جو تم نے چاند سی بیٹی کا ہاتھ اس ادھیڑ عمر کے بھدے سے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا۔ اماں جی رقت آمیز آواز میں بولیں۔ میری تو اس گھر میں داروغہ کی حیثیت ہے بیٹی کے بارے میں جوں تک نہ کر سکی۔ انھوں نے تو اپنے بڑے بھائی کو خدا کا بھیجا رسول سمجھ رکھا ہے۔ ان کا کہنا چاہے راست ہو یا نہ ہو۔ یہاں تو قرآن شریف کی آیت سمجھا جاتا ہے۔ میری لاڈلی زاہدہ۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں اماں جی سے لپٹ کر خوب روئی۔ منجھلے بھائی تو بالکل ہی اڑ گئے۔ بولے میں زاہدہ کا خون اپنے ہاتھوں نہیں کروں گا۔ اپنی بہن کو زندہ درگور نہیں کر سکتا۔ اپنے جیتے جی اسے اس گھناؤنے غار میں نہیں دھکیل سکتا۔ اور بھی بہت کچھ کہا انھوں نے لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے اور اگر کسی نے دھیان دیا بھی تو کہہ دیا کہ لڑکا جوشیلا ہے۔ چھوٹے چچا اور اشتیاق صاحب نے بھی صلاح کے طور پر کہا کہ آپ ایک دن کی بے عزتی کی خاطر زاہدہ بی بی کی زندگی کیوں تلخ کرتے ہیں۔ لیکن تایا ابا کی ایک ہی رٹ تھی کہ میں "قول دے چکا ہوں" کاش آج آقا بھائی یہاں ہوتے۔ لیکن وہ تو برما کے جنگلوں میں جاپانیوں کے پیچھے پھر رہے ہوں گے۔ اور میرا جی چاہا کہ میں بھی کسی ویسے ہی سنسان سے گھنے جنگل میں چلی جاؤں جہاں کوئی پرسان حال نہ ہو اور خوب چلا چلا کر روؤں۔

ظہر کے وقت میری آپا جان کا نکاح سید صادق علی سے ہو گیا۔ میں نے سمجھا ابھی آپا جان نے اسے دیکھا نہیں اسی لئے لجا رہی ہیں لیکن

منہ دکھائی کے بعد جب میں نے ان کے گھونگھٹ میں جھانکا تو نہ وہ رو رہی تھیں اور نہ وہ عام دیکھنے والوں کو نا امید معلوم ہوتی تھیں۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مسکرا رہی تھیں۔ واہ ری تایا ابا کی زبان پر بھینٹ چڑھنے والی آپا!! ہاں رنگ ذرا پھیکا پڑ گیا تھا اُن کا مگر یہ تو معمولی باتیں ہیں۔ اگر روزمرّہ زندگی میں ایسی چھوٹی چھوٹی غیر اہم باتوں کو وقعت دی جائے تو زندگی میں ملّاح کے ہنڈولے کی طرح ہچکولے کھاتی رہے۔ پھر بھی میرا جی چاہتا تھا کہ رخصتی کے وقت آپا اس ڈارون کے نظریے کو قائم رکھنے والے کے ساتھ جانے سے انکار کر دیں۔ یا کہانیوں کی ہیروئن کی طرح معصوم ہندوستانی لڑکی کی بے بسی، بے کسی اور مظلومیت پر لمبا چوڑا لیکچر دیں۔ لیکن ڈولی اٹھ گئی اور کوئی ایسی بات ظہور پذیر نہ ہوئی۔ ہم سب خوب روئے۔ میں نے آج تک ابّا جان کو روتے نہیں دیکھا تھا۔ اور منجھلے بھائی تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ تایا ابا نے بھی اوورکوٹ کی گہرائیوں سے ننھا سا رومال نکالا اور لگے اسے انگارہ سی آنکھوں کی طرف بڑھانے ”لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں“ انھوں نے بناوٹی افسوس کے لہجے میں کہا۔ میں بھن کر کباب ہی تو ہو گئی۔ اور دل چاہا جتنے طعنے اور کوسنے آتے ہیں سب کی بوچھاڑ تایا ابا پر کر دوں۔ ان کی زنجیر دار گھڑی (جو اُن کو بے حد عزیز تھی) گھسیٹ کر زمین پر دے ماروں اور ان کے کان کے پاس جا کر اتنی زور سے چلّاؤں کہ ان کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ اتنا تو میں نے کہہ ہی دیا تھا۔ کہ ”آجکل کے لوگ لڑکیوں کو پرایا دھن نہیں بلکہ گھر کا کوڑا کرکٹ سمجھتے ہیں“۔ ”خس کم جہاں پاک“۔ میں اور بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن آپا جان کی گھنی بھنووں کے سکڑنے کچھ ایسا رعب ڈالا کہ میرے حلق میں کڑوا کسیلا سا پسیٹ جم کر رہ گیا۔ سارے جمگھٹے میں ایک شخص تھا جو آنسوؤں سے نہیں رویا۔ خلیل بھائی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑے تھے انکے انداز سے بے نیازی ٹپکتی تھی۔ عجیب سی مسکراہٹ تھی ان کے ہونٹوں پر جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”ہمیں کیا؟“ اسی رات جب میں ضرورت سے باہر گئی تو کوئی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ شاید دو بجے تھے رات کے اسوقت۔ تین دن کے بعد جب آپا جان گھر آئیں تو کافی خوش معلوم ہوتی تھیں۔ ویسے ان کی آنکھیں دو بجھے ہوئے کوئلوں جیسی لگ رہی تھیں۔ خیر! پھر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ نہ کبھی آپا جان نے شکایت کی اور نہ کوئی واقعہ پیش آیا۔ جب آفا بھائی واپس آئے تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ صورت تو مٹی کی مورت ہے۔ لڑکی کے مقدر کا انحصار تو اس کے شوہر کی سیرت پر ہوتا ہے۔ مجھے بھی آفا بھائی کی بات پر یقین تو آ گیا۔ لیکن آپا کے لئے اپنے لئے نہیں۔ اور میں دل ہی دل میں سوچتی کہ اگر میری شادی کسی بدصورت سے قرار پائے تو میں کبھی نہ مانوں اور صاف انکار کر دوں۔ اتنا ہی کہہ دیں گے ناکہ منہ پھٹ ہے؟ پڑے کہیں۔ نہ بابا میں آپا جان کی طرح انکی زبان (ہوں زبان) پر قربان تو نہ ہو جاؤں۔ بڑے آئے قول دینے والے۔ میرے بارے میں وے کے دیکھیں قول مزا نہ چکھا دوں ان لوگوں کو تو میرا نام خالدہ نہیں! تایا ابا سوچتے ہوں گے کہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ لیکن جناب اب ہندوستانی لڑکی کو اپنی بے بسی و لاچاری کا احساس پکار پکار کر اپنے حقوق لینے پر آمادہ کر رہا ہے۔ وہ سماں آیا چاہتا ہے۔ جب زن و مرد دوش بدوش قوم و ملت کی بہبودی کے لئے جد و جہد کریں۔ اگر تعلیم کا اتنا بھی فائدہ نہ ہو تو سرے سے تعلیم ہی بے سود ہے۔ بے کار ہے۔ شاید اسی لئے تایا ابا نہیں چاہتے تھے کہ میں کالج میں داخل ہو جاؤں۔ لیکن میں نے بھی اتنی ضد کی۔ اتنی بحث کی۔ اور میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب خاندان بھر کی مخالفت کے باوجود ابا میاں نے مجھے الہ آباد کالج میں داخل کرا دیا۔ اور میں نے پورے انہماک سے فلسفہ، تاریخ، فارسی و انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے مجھ میں نئی روح پھونک دی گئی ہے۔ بلکہ اپنا آپ ہی نیا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ململ کے دوپٹے کو کلف لگا کر رنگ دیا ہو۔

اسی سال آپا جان کو خدا نے ایک ننھی منّی سی جیتی جاگتی گڑیا عطا فرمائی۔ میں پھولی نہ سمائی اور امتحان ختم ہوتے ہی میں اور امّاں پہنچ گئے۔ بچی شکل و صورت میں بالکل میری آپا جان کی طرح تھی۔ ذرا موٹی۔ ہلکے گلابی رنگ کی بے بی ڈول کا گولا معلوم ہوتی اور جب میں اس کے ننھے منّے گول مول سے ہاتھوں کی مٹھیوں کو کھولنے کی کوشش کرتی تو وہ معصومانہ انداز میں کھلکھلانے کی کوشش کرتی۔

آپا کی ساس بہت چڑتیں مجھ سے۔ اور کہتیں ”اے بیٹی خالدہ مت ستاؤ ننھی کو۔ ہاں! تو میں جھلا اٹھتی۔ ایک تو وہ پوپلی تھیں پھر اچھے خاصے نام کو بگاڑنے سے مطلب؟ اگر منہ میں دانت نہیں تو ہم کیا کریں؟ ہم نے تھوڑا ہی نکال دئے ہیں۔ اور صرف خالدہ کہتیں تو شاید میں برداشت بھی کر لیتی۔ لیکن جب ساتھ ان کی بیٹی ہونے کی تہمت لگائی جاتی۔ اور آخری ”ہاں“ میں چھالیہ اور نسوار کی ملی جلی لپٹیں آتیں تو میں ٹھٹک پڑتی۔ ایک دن تو میں آپے سے باہر ہو گئی۔ ننھی کے نام کی بات ہو رہی تھی۔ دولھا بھائی کہنے لگے صنوبر رکھیں گے۔ مجھے یہ نام پسند نہیں۔ کیونکہ میری جماعت کی صنوبر بہت اترانی ہے۔ میں نے یونہی کہہ دیا ”صنوبر گوبر ہمیں نہیں پسند“ اس پر آپا کی ساس نے مس لال کی طرح لیکچر دینا شروع کر دیا ”آئے ہائے بیٹی خالدہ صنوبر گوبر کا ہے کو ہونے لگا؟ وہ تو ایک پودا ہوتا ہے ہاں“ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ خاص کر آخری ”ہاں“ پر میں جل ہی تو اٹھی ”لڑکی میری آپا کی ہے نا کہ آپ کی؟ جو آپ خواہ مخواہ بیچ میں“۔ آپا جان نے میری چٹکی لی اور امّاں نے یوں گھورا کہ ”نہ تیری زبان گدّی سے کھینچ دی تو کہنا“! پھر جو دولھا بھائی اور ان کی امّاں نے آپا پر بوچھاڑ کی توبہ ہی بھلی۔ بعد میں مجھے بہت افسوس ہوا کہ اتنی سی بات کہہ کر میں نے یونہی فساد کی جڑ پیدا کر دی۔ لیکن آپا کہنے لگیں کہ ”فساد کی جڑیں تو اوّل دن سے تھیں۔

اب تو درخت کی شاخیں نکل رہی ہیں۔ اماں نے بہت پوچھا کہ کیا بات ہوئی لیکن انھوں نے چپ ہی سادھ لی۔ نہ بولنا تھا نہ بولیں۔ ان باتوں کے باوجود نیمی کا نام میں نے ہی رکھا۔ اگلی صبح ہم واپس آ رہے تھے۔ شاید اپنے اتنی دور جانے کے خیال سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور میں سوچتی رہی کہ دولھا بھائی جان آپا سے بات کیوں نہیں کرتے۔ اگر دن میں ایک آدھ دفعہ بولے بھی تو ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اور آپا "جی" "جی ہاں" کے علاوہ کچھ نہ کہتیں۔ شاید ان کو اور کچھ کہنا آتا ہی نہ تھا! ساتھ والے کمرے میں نیمی نے رونا شروع کر دیا۔ میں دولھا بھائی کی موجودگی کے خیال سے نہ گئی۔ اس طرف اچانک نیچے کار آ کر رکی۔ میں چونک پڑی۔ یا اللہ رات کے دو بجے کون دولھا بھائی سے ملنے آیا ہے؟ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دولھا بھائی خود اس کار میں سے اترے۔ لیکن یہ لڑکھڑا کیوں رہے ہیں؟ اور مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بوتلوں کے بند پانی میں ڈوب چکے تھے۔ ان کے باقی اعمال تو آپا کی سہمی سہمی نظروں سے ظاہر تھے ہی۔ حیرت۔ ہول!!

الٰہ آباد آ کر مجھے ان باتوں کا کبھی کبھی بڑی شدت سے احساس ہوتا۔ لیکن امتحان کے دنوں میں بوجہ مصروفیت یہ واقعات میرے ذہن سے مفقود ہو گئے۔ پھر نتیجے کا انتظار شروع ہوا۔ میں اور عذرا زیادہ تر اسی فکر میں ڈوبی رہتیں۔ پرچے تو میرے کافی اچھے ہو گئے تھے۔ اور پروفیسر ظہیر ہمدانی کا بھی خیال تھا کہ عذرا اور میں ضرور پاس ہو جائیں گے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے۔ کہ خالدہ اول آئیں گی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں فیل ہونے کا ڈر خوفناک ترین بھوت کی صورت میں تخیل پر سوار رہتا۔ ظہیر صاحب کا کہنا درست نکلا۔ میں اپنے کالج میں اول اور یونیورسٹی میں چوتھی آئی۔ میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ گھر والے خاص کر ابا جان تو بہت ہی خوش ہوئے اور مجھے ایک پیاری سی رلیٹ واچ انعام میں دی۔ مبارک باد کے بہت سے خطوط آئے۔ زیادہ ہم جماعت لڑکیوں کے تھے۔ اور کچھ پروفیسروں کے۔ سب نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے کی تاکید کی تھی۔ اور ان خطوط سے ابا جان کافی متاثر ہوئے۔ پروفیسر ہمدانی پر مجھے رہ رہ کر غصہ آتا۔ اتنا نہیں کہ دو حرف شاباش کے ہی لکھ دیں۔ کالج میں تو تعریفوں کے پل باندھا کرتے ہیں۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ لیکن چھوڑو ہمیں کیا؟ جیسے ان کے خط کے بغیر رہا نہیں جاتا۔ بڑے آئے اترانے والے۔ اور اترائیں کیوں نہ۔ لڑکیاں جوان کی صورت پر دیوانی ہوئی جاتی ہیں۔ عذرا کو بھی تو ان کی آنکھیں بہت پسند ہیں۔ کہتی ہے یہی تو آنکھوں کی خوبصورتی ہے۔ آدھی آدھی بند کچھ کچھ کھلی نشیلی سی۔ اور پھر میچے نیچے سے دیکھنا۔ پلکوں کو جھپکا کے۔ کیا فضول! اور ثریا نے تو حد ہی کر دی۔ ان کے بارے میں ایک طویل نظم لکھ ڈالی۔ جانے کیا شعر تھا وہ؟ کچھ سرو قدی اور رفتار اور

جال کے بارے میں۔ کتنی بے وقوف ہیں یہ لڑکیاں؟ اگر کوئی اچھا ہے تو ہوا کرے۔ ہمیں کسی سے کیا غرض؟

ایک دن ابا جان نے مجھے بلایا۔ ان کے علاوہ کوئی اور کمرے میں ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا۔ میں جھٹ واپس جانے کو ہوئی تو ابا جان بولے "بیٹی ظہیر صاحب خود تمہیں مبارک باد دینے آئے ہیں" اور آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے بڑے پرجوش طریقے سے مبارک باد دی۔ جی میں آیا کہ کہوں "بڑی جلدی یاد آئی"، لیکن آپا کے خیال سے جھجکی ہو رہی۔ ظہیر صاحب چھٹیاں گزارنے کے لئے ملیح آباد کے پاس ایک گاؤں "اجالا" میں مقیم تھے۔ منجھلے بھائی سے ان کی گہری دوستی ہو گئی اور وہ اکثر ہمارے ہاں آنے لگے۔ بعض اوقات بالکل معمولی واقعات انجان طریقے سے ہماری زندگی کے پلاٹ کا اہم ترین جزو بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہی حال ظہیر صاحب کے اتفاقاً اجالا آنے کا ہوا۔ وہ ہمارے ہاں آتے اور اکثر آتے۔ میرا جی چاہتا کہ سارا دن ساری رات ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر منجھلے بھائی سے باتیں کرتے رہیں۔ اور میں سنتی رہوں۔ میں ان سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ اور شام کی چائے ہم یعنی ظہیر صاحب و بھائی اور میں اکٹھے پیتے۔ ایک شام ہم سنیما گئے۔ اس کا ہیرو "ٹائرون پاور" بالکل ظہیر صاحب کی طرح تھا۔ خاصکر جب وہ غرور سے سر کو ہلکی سی جنبش دیتا تو ظہیر صاحب ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے یونہی کہہ دیا "یہ تو بالکل آپ کی طرح ہے" اتنے میں سکرین پر ہیروئن کی تصویر آئی۔ ظہیر صاحب جھٹ بول اٹھے "اور یہ تمہاری طرح"۔ میں جھینپ گئی۔ پکچر المیہ تھی۔ میں خوب روئی۔ گھر گئے تو ظہیر صاحب آہستہ سے بولے "میں جھوٹا کر دیا!" "کیوں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔ "آنکھیں سجا کر بالکل ہیروئن کی طرح نہیں رہیں"۔ میرے کان انگارہ ہو گئے۔ جب وہ آتے تو میں کتنی کتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے لباس کو دیکھا کرتی۔ دوپٹہ لپٹنے کا طریقہ۔ قمیص کی تراش۔ غرارے کی اونچائی نچائی۔ مانگ پٹیا وغیرہ۔ جانے کیوں؟ اور ایک دفعہ جب انھوں نے کہا کہ گول چہرہ ہنستا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے تو میں کتنی دیر سنگار میز کے پاس کھڑی دیکھتی رہی۔ کہ میرا چہرہ کیسے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ پھر خود ہی مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ اور میں خوب خوب روئی۔ جب ظہیر صاحب کے جانے کے دن آئے تو میری طبیعت بڑی چڑچڑی سی ہو گئی۔ نہ کسی سے بات کرتی۔ نہ کوئی کام۔ نیند بھی تو نہیں آتی تھی رات کو۔ اور کبھی غلطی سے آ بھی جاتی تو خوابوں سے بھرپور۔ ظہیر صاحب کے!!

میں نے ایک غزل میں پڑھا تھا کہ اختر شماری و شب خوابی محبت کی علامتیں ہوتی ہیں۔ تو کیا مجھے ظہیر صاحب سے محبت ہے؟ میں اس قسم کی باتیں سوچا کرتی۔ اور دعا کرتی کہ آگ لگے تو دونوں طرف آتش افشانی ہو۔ ان دنوں میری دعائیں اکثر قبول ہو جایا کرتی تھیں۔ ظہیر صاحب کی سفارش

اور اپنے نمبروں کے بل بوتے پر مجھے بی - اے میں کالج میں داخل کر دیا گیا - سامان باندھتے وقت بڑی بھابی کہنے لگیں "ساتھ کون جا رہا ہے؟" میں نے کہا "ظہیر" آنکھیں مٹکا کر بولیں "خالدی پھر سے کہنا ذرا" "کیوں؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا "تمہارے منہ سے بہت بھلا معلوم ہوتا ہے یہ نام - اور پھر - پھر تو تم نام لینا چھوڑ دو گی" "اماں جی بھی کہہ رہی تھیں کہ ظہیر بہت نیک طبیعت ہے" یہ کہہ کر بھابی کھل کھلا کر ہنس پڑیں - شریر بھابی - سارا راستہ مجھے بھابی کی صورت یاد آتی رہی - جی چاہا کہ لپٹ جاؤں ان سے -

الہ آباد آئے مجھے لفر بیًا ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ابا جان کی علالت کی خبر ملی - میں سخت گھبرائی اور آقا بھائی کو لکھا کہ اماں جی کو لے کر فورًا بمبئی چلے جائیں - وہاں تو کوئی بچاری ابا جان کی تیمار داری بھی نہیں کرنا ہوگا - وہ لوگ پہلی گاڑی سے بمبئی روانہ ہوگئے - وہاں سے آقا بھائی کا ایک طویل خط موصول ہوا - لکھا تھا کہ ابا جان بہت سخت کمزور ہوگئی ہیں - بعض ڈاکٹر تپ دق کا شک کرتے ہیں - لیکن ڈاکٹر دلی کی تو مرض کو بڑھا چڑھا کر بتانے کی عادت ہوتی ہے - آگے چل کر لڑکیوں کے نصیب کا رونا رویا تھا - کس طرح والدین نازوں پلی لاڈلیوں کو بخوشی و دانستہ طور پر سونڈ بونڈ حیوان خصلت درندہ سیرت جنوں کے غاروں میں دھکیل دیتے ہیں - اور یہ بے زبان فرض شناس ان پر مرمٹنا اپنا عین فرض سمجھتی ہیں - نہائی بھی خوب ہیں اس فرض کو" دل بھر آیا میرا!

اس دن کالج میں فینسی ڈریس پارٹی تھی - میں نے خاص لکھنوی دلہن بننے کا وعدہ کیا تھا - جی تو قطعی نہ چاہتا تھا - لیکن عذرا وغیرہ کے کہنے پر پہنے ہی پڑے وہ کپڑے اور زیور - ہال کے دروازے پر ظہیر صاحب رنرتوں جیسا لباس زیب تن کئے کھڑے تھے - بولے "دیکھو خیالی (وہ مجھے اکیلے میں اکثر اسی نام سے پکارتے) میں نے تمہاری لب بندیدہ نظم کے ہیرو کا" کہتے کہتے رک گئے - میں کچھ جھینپ سی گئی - وہ جو میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے - اور دیکھتے چلے جا رہے تھے - کچھ لمحوں کے لئے مکمل سکوت طاری رہا - وہ جیسے خواب سے جاگ کر بولے "دیکھو خیالی دلہنیں یوں بے باکانہ انداز سے نہیں دیکھا کرتیں" میں شرما کر نیچے دیکھنے لگی - ہاں یہ ٹرک بہتر ہے - انھوں نے تنقیدانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا میں نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا "بالکل - اسے - بالکل اسی طرح دلہنیں بھی منہ چھپا لیا کرتی ہیں - فرسٹ پرائز ملے گا" میں نمک مسالے لگانے میں کونسی کم تھی جھٹ کہہ اٹھی "آپ کو کتنی ایک دلہنوں کا تجربہ ہے؟" شاید مجھے اتنی بے باکی نہیں استعمال کرنی چاہئے تھی "کہنے لگے "صرف ایک" میں گھبرا گئی ادھر سے لڑکیاں آ رہی تھیں - یکدم ظہیر صاحب نے مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا "خالدہ آج تیسری اور آخری بار کہہ رہا ہوں - اگر آئندہ کام نہ کیا - تو پرنسپل صاحبہ کے پاس رپورٹ ہوگی فینسی ڈریس سب سے پہلے پہن کر آ گئی ہیں لیکن کام کے وقت غائب - میں بھونچکا سی ہوگئی - "بھولی جو آ رہی ہیں تمہاری" دبی آواز میں انھوں نے کہا - اور میں سمجھ گئی - عذرا - رانی - ثروت - وغیرہ آ گئیں اور میں ان کے ساتھ چلی گئی -

جاتے جاتے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا - جب اندھیرے مستقبل میں معصوم ماضی کی یاد آئی تو ظہیر اسی طرح تخیل میں ابھر آئے - سیڑھی پر پاؤں رکھ کر تھوڑا سا جھکے ہوئے کمر پہ ہاتھ کشادہ پیشانی پر فاتحانہ چمک اور سیاہ لمبی پلکوں تلے محبت کا نشہ مستقبل کا تصور اور کامیابی کی امید کامل کے ملے جلے جذبات جھلک رہے تھے - لبوں پر بے معلوم سا خفیف سا تبسم! پورے راہزن معلوم ہوتے تھے۔

پہلا انعام رانی اور ثروت کو ملا - وہ لیلیٰ مجنوں بنی ہوئی تھیں - سانولی سلونی سی تیکھے نقش والی رانی بہت اچھی معلوم ہو رہی تھی - جیسے لیلیٰ نے دوبارہ جنم لیا ہو - دوسرا انعام ظہیر صاحب کا تھا - کس آن سے اٹھے - شان سے چلے - اور انعام لے کر جو سلام کیا میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی - تیسرا انعام میرا تھا - چھوٹا سا فوٹو فریم - میرے ہاتھ سے وہ گر کر الگ الگ ہوگیا - ظہیر صاحب کہنے لگے "لاؤ میں جوڑ دوں!" لڑکیاں چلی گئیں - فریم ابھی نہیں جڑا تھا - اسی لئے میں کھڑی رہی - ظہیر صاحب ابا جان کا حال پوچھنے لگے - اس وقت نہ جانے میری خودداری کہاں غائب ہوگئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - وہ گھبرا گئے - میں نے سب حالات بیان کئے - جب میں ختم کر چکی تو وہ طوفان جذبات میں بہہ رہے تھے "خیالی" وہ زیر لب بولے - اف ان کی زبان سے خیالی کیسا بھلا معلوم ہوتا تھا "خیا" کو کچھ لمبا کر دیتے اور "لی" کہنے کے بعد اس طرح لب نکلتے گویا آگے بہت کچھ کہنا چاہتے ہوں - لیکن کہنے سے قاصر اور پھر ہلکا ہلکا سا دبا دبا سانس لیتے نیم آہ بھرتے اور میری روح بہشت ... میں تا ... سننے لگتی "خیالی" اس دفعہ ان کے لہجہ میں بے قراری تھی - میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھا - وہ میرے ذرا قریب آ گئے اور میرے دوپٹے سے کھیلنے لگے - اور سکوت کو انھوں نے کافی دیر کے بعد توڑا "ایک بیٹی کے تو بہت دکھ دیکھے ہیں سید صاحب نے دوسری بیٹی کی آرام میں زندگی گزرے گی!" آخری الفاظ انھوں نے رقت آمیز لہجہ میں کہے - انشاء اللہ کہتے کہتے وہ اٹک گئے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے وہ فریم میرے ہاتھ میں دے کر چلے گئے - اس دن شاید رانی نے دیکھ لیا - اس شوخ چنچل لڑکی نے عارفہ کو بتایا اور یوں بات کھیلتے کھیلتے سب تک پہونچ گئی - اس دن رات کو لڑکیوں نے مجھے اتنا چھیڑا اتنا تنگ کیا کہ میں رونے والی ہوگئی - عارفہ بولی "بڑے بڑے ہاتھ مارے ہیں خالدی" اور رانی اپنی شرارہ سی آنکھیں مٹکا کر بولی "اب خالدی نہیں اب خالدہ ہمدانی کہو" "کیوں ٹھیک ہے نا بنو؟" اور سب نے اس چھیڑ خانی میں برابر حصہ لیا - ثروت اور موہنی بڑی شریر ہیں - نہ بابا ہمیں یہ رہزن نہیں پسند یوں تو اتنا

بہت ساکام دے دیتا ہے اور پھر ہماری کالج بیوٹی پر باتھ صاف کرتا ہے"۔ اور عذرا تو جب ایسی باتوں پر اتر آئے تو حد ہی کر دیتی ہے۔ آتے ہی بولی "لاؤ خالہ بی مٹھائی کھلاؤ یہ روکھا سوکھا کام ہمیں نہیں پسند" غرض اس دن جو جس کا جی چاہا اس نے کہا اور رجنا کہوان کے خیال میں کم کہا۔ اور میں تیوری چڑھانے کی ناکام کوشش کے بعد ہنسنے لگی۔

دن عید اور رات شب برات کی طرح گزر رہے تھے۔ کہ یکدم آسمان پھٹا بجلی گری اور غم کی گھنگھور گھٹا چھا کر رہ گئی۔ ہائے میری آپا جان۔ انھوں نے آرام سے نجات پانے کی خاطر جسم فانی کو فنا کر دیا۔ اور روح کو ابدی زیست بخشی۔ خونِ جگر بہانے مقدر کو کوسنے اور دنیا والوں کی بے پروائی پر رونے کے علاوہ یہ لاغر و فانی بنی نوع انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ خود بھی مرنے والے کے ساتھ مر جاؤ۔ دفن ہو جاؤ۔ لیکن سحرِ وقت سے یہ اثر آہستہ آہستہ زایل ہوتا چلا جاتا ہے۔ صرف داغ فرقت رہ جاتا ہے باقی۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ ڈیڑھ سال گذر گیا۔ اس دوران میں میں نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ ظہیر صاحب اکثر ہمارے یہاں آیا کرتے لیکن اب میں ان کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ کچھ بھی ہو ہندوستانی لڑکیاں منگیتروں کے سامنے نہیں آتیں۔ میں سارے دن نخی (جو آپا کی رحلت کے بعد ہمارے پاس تھی) کے ساتھ گزار دیتی۔ جب وہ "کالا جان کالا جان" کہتی ہوئی میرے پیچھے پیچھے چلتی کیتنی پیاری لگتی۔ اس وقت شیریں۔ اور کیوں نہ لگتی میری عزیز آپا جان مرحومہ کی اکلوتی نشانی جو تھی۔ یہ پیار مجھے کہاں لے جائے گا؟ میں نہیں جانتی تھی اس وقت!!!

دولھا بھائی کی دوسری شادی ہونے والی تھی۔ میرا خون کھول کر رہ جاتا ایک ہوک سی اٹھتی دل میں اور میں غسل خانے میں جا کر خوب روتی۔ مگر فائدہ؟ ایک دن دولھا بھائی کا خط آیا۔ ابا جان اور آقا بھائی نے مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ جانے کیوں یہ لوگ مجھ سے ہر بات چھپانے کی کوشش کرتے ہیں؟ آخر میں بچہ تو ہوں نہیں۔ لیکن جب پوچھوں "کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" تو فیصلہ کن انداز میں حکم اکبری لگا دیتے ہیں "کچھ نہیں" چاہے میرے دل میں کتنی ہی کھلبلی مچی ہو پوچھنا بے سود ہوتا ہے اور میرا دل اینٹھ کر رہ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر۔ خیر بات کا پتہ تو چل ہی جاتا ہے کسی نہ کسی بہانے سے۔ اسی رات کو جب میں آقا بھائی کے کمرے سے ایک کتاب لینے گئی تو وہ خط پڑا پایا۔ کہتے ہیں کہ اولاد کے لئے فرمانبرداری فرض اولین ہے لیکن آخر میں انسان ہی تو تھی اور وہ بھی کرید رکھنے والی طبیعت کی۔ جانے کس جذبہ کے ماتحت میں نے خط کھول لیا۔ اور پڑھتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دولھا بھائی نے بڑے سخت الفاظ میں لکھا تھا۔ کہ "شیریں میری بیٹی ہے اور میں اس کا واحد حقدار ہوں۔ اگر آپ بھیجنے سے انکار کریں گے تو میں قانون کے ذریعے بآسانی لا سکتا ہوں۔ آپ کا یہ عذر تھا کہ بمبئی میں اس کی تربیت کرنے والا کوئی نہیں۔ سو میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔ اگلے چاند میرا نکاح

الہ آباد کے رئیس سید دلاور خاں صاحب کی بڑی صاحبزادی سے قرار پایا ہے۔ میں آگے کچھ نہ پڑھ سکی۔ میری آنکھوں کے سامنے عارفہ دلاور خاں کی بڑی بہن مشتری کی شکل پھر گئی۔ ننھی کی سوتیلی ماں۔ آہ!!! چھوٹی چھوٹی مکارانہ آنکھوں والی۔ لڑاکا پالاک بدمزاج شیریں کی سوتیلی ماں۔ اُف!!

تمام رات میں نے کروٹیں لیتے لیتے گزار دی۔ درد و کرب نے مجھے بیتاب کر دیا۔ رنج و الم نے بے قرار۔ تقدیر نے بے بس!!! ایک خیال میرے دل میں رہ رہ کر ابھرتا۔ قربانی۔ ایثار۔ ایثار۔ قربانی۔ ظہیر۔ مستقبل محبت یہاں آ کر میں ڈگمگائی۔ میری روح کانپی۔ میرا ارادہ لرزا۔ میرا دل ڈولا۔ لیکن نہیں میں اپنے نفس کی خاطر اپنے معیار سے نہیں گر سکتی۔ "ظہیر" میرے دل کی گہرائیوں سے چیخیں اٹھیں "چپ رہ" ضمیر نے گرجدار آواز سے کہا میرے خیالات میں ہیجان برپا تھا۔ طوفان اٹھ رہا تھا لیکن میں کائنات کو دکھا دینا چاہتی تھی کہ عورت صرف نفسی و جنسی محبت میں گرفتار ہو کر ہی قربانی نہیں کرتی۔ بلکہ اس کی محبت کنول کی پتی کی طرح پاکیزہ۔ حیات خضر کی طرح جاودانی فردوس بریں جیسی لافانی اور حق تعالیٰ کی ذات جیسی لاثانی ہے۔ محبت میں نفسی خواہشات کو اہمیت دینا حماقت ہی نہیں بلکہ محبت کی سراسر توہین ہے۔ محبت کا وجود بے شک دکھائی نہیں دیتا مگر ہر ذی روح کے سینے میں ضرور پنہاں ہوتا ہے ہم۔ صرف ہم ناقدرے بے پرواہ انسان اس کو روندتے ہوئے آگے نکل جاتے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہ ہونے دوں گی۔ ہرگز نہیں۔ عزم وہ طاقت وہ قوت ہے جو گرتوں کو سہارا دیتا ہے۔ جو اپنے تئیں قربان گاہ پر چڑھا دینے کی ہمت بخشتا ہے۔ یہ بلند پایہ شے بشکتی وہ چیز ہے جو مشکل سے مشکل کام کو آسان کر دکھاتی ہے۔ اسی خیال میں غلطاں و پیچاں میں بڑی بھابی کے پاس گئی اور ان کے سامنے پورا ماجرا بیان کیا۔ اور ساتھ ہی اپنا ارادہ بھی ظاہر کر دیا۔ وہ حیران رہ گئیں۔ بات گھر میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ابا جان نے بہت سمجھایا۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل تھا۔ ظہیر نے سنا اور آئے لیکن میں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ دل ہی تو تھا۔ انھوں نے ایک پرچے پر صرف اتنا لکھا تھا۔ کہ "میرا ہی قصور ہے نام ہی "خیالی" رکھا تھا تمہارا۔ پھر میری کوئی امید اصلیت کی صورت کیونکر اختیار کر سکتی تھی۔ آخری۔ ظہیر"۔ میں نے اس کا جواب لکھ بھیجا کہ "امید زندگی کے صحرا کا سراب ہے۔ ہمارے دل ستاروں کی طرح ہیں اور ستارے اکثر ٹوٹا کرتے ہیں۔" اسی دن شام کو وہ چلے گئے۔ میری زندگی سے بہت دور۔ بہت ہی دور۔

بقرعید کے چاند میں اور ننھی بمبئی چلے گئے۔ میرے احساسات بالکل سن ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے میری روح کو کوکین کا انجکشن لگا دیا ہو۔ جیسے مجھے افیم کھلا کر سلا دیا ہو۔ اور یہ زندگی کیا کوکین کے انجکشن سے کم اثر رکھتی تھی؟

آج ان واقعات کو تقریباً چھ برس گزر چکے ہیں (باقی صفحہ ۴۶ پر)

نئی وضع کے ناول

"تا حد نگاہ" ناول — فلمی دنیا کے نامور افسانہ نویس ضیا سرحدی کا حسین و رنگین دلکش ناول۔ رومانوی فلموں کے نظاروں سے بھی زیادہ پرلطف۔ قیمت ...

تلاش و نگار ڈرامے — ضیا سرحدی کے تجربات زندگی کا نچوڑ یہ دو بہترین ڈرامے ہیں قیمت ۲ دو روپے

عروج و زوال ناول — مظفر ہاشمی کا اسلامی گھریلو زندگی کا خاکہ لئے ہوئے۔ اصلاحی و اخلاقی ناول۔ تین روپے

آگ ناول؟ — از عزیز احمد جس میں مصنف نے کشمیر جنت نظیر کی سماجی اور سیاسی زندگی بڑے عجیب انداز میں پیش کی ہے۔ تین روپے

بیسوا ناول — از مظفر حسین شمیم جس میں شریف عورت طوائف کیوں بنتی ہے از حد دلچسپ ڈیڑھ روپیہ۔

باغی ناول — رئیس احمد جعفری کا حیرت انگیز و حیرت آفریں ناول، یہ ناول بہت مقبول ہوا ہے ضرور ملاحظہ فرمایئے قیمت چار روپے ۱۲ ار

کالی گھٹائیں ناول — احمد شجاع پاشا۔ اپنی نوعیت کا انوکھا ناول قیمت صرف پانچ روپے

پھریری؟ — مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بلند پایہ مزاحیہ افسانوں کا آخری مجموعہ جو تیسری بار شائع ہوا ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

حسن و شباب — ماہر القادری کے خاص افسانے۔ قیمت صرف دو روپے

جیتو — ماہنامہ ایشیا کے دس سال منتخب افسانے۔ منتخبہ ساغر نظامی قیمت صرف پانچ روپے

رشید اختر ندوی کے ناول نشیمن، نسیم۔ نشان راہ کانٹوں کی سیج۔ تلخیاں۔ قیمت فی ناول تین روپے آٹھ آنے۔ تشنگی ناول ساڑھے تین روپے

بادوباراں ناول تین روپے

ملنے کا پتہ

شیخ نذیر احمد کتب خانہ تاج آفس

محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

اختر شیرانی کے شاہکار

ہندوستان کے مشہور و معروف رومانوی شاعر حضرت اختر شیرانی کا بینظیر کلام چار حصوں میں شائع ہوگیا ہے جب دنیا سوتی ہے شاعر سوچتا ہے جب مزدور محنت کرتا ہے سرمایہ دار روپیہ کی جھنکار سے غریب کی عصمت لوٹنے پر فخر کرتا ہے کسان خون پسینہ ایک کرکے دنیا کی قوت لایموت کا انتظام کرتا ہے تو شاعر ان مشاہدات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ مندرجہ ذیل تصنیفات انہی جذبات کی منہ بولتی تصویریں ہیں ایک ایک شعر کیف و سرور کا چھلکتا پیمانہ ہے۔

صبح بہار تین روپیہ — **لالہ طور** تین روپیہ — **اختر ستان** تین روپیہ — **طیور آوارہ** تین روپیہ آٹھ آنے

عمدہ کاغذ۔ مضبوط جلد۔ دیدہ زیب گرد پوش

جدید اردو شاعری — مصنفہ پروفیسر عبدالستار صاحب سروری ادب اردو میں ایک لاجواب تصنیف کا اضافہ اردو شاعری کے نئے دور پر سیر حاصل تبصرہ۔ فاضل مصنف ہندوستان کے تنقید نگاروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس تصنیف میں جدید شاعری کے اسباب و علل اور محرکات اور اس کے بانیوں کے کلام و جذبات کا تذکرہ وسیع النظری سے کیا گیا ہے شاعری کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرکے اردو کے عروج کے متمنی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں جدید شاعری کے دلدادہ اور نئے رجحانات کے حامیوں کے زیر مطالعہ دینے والی تصنیف جو غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے تیسری دفعہ طبع ہوئی ہے قیمت تین روپیہ آٹھ آنے۔

ماڈرن اردو ڈکشنری — مرتبہ صاحبزادہ عبدالحلیم خاں نشتر جالندھری۔ اس لغت میں ہر حرف کے تحت تمام ضروری الفاظ درج کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں یہ کتاب انتہائی طور پر مستند اور مفید ہے۔ عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بالعموم اور غریب طلبار کے لئے بالخصوص یہ لغت ایک نعمت غیر مترقبہ ہے ضخامت ۵۵۲ صفحات مجلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنے۔

ہمارا قائد — قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن انکی قومی خدمات کے بعض پوشیدہ پہلو انگریزی کتاب ٹائی نیٹ ... کے فاضل مصنف زیڈ اے سلہری نے نہایت خوبی سے اجاگر کئے ہیں۔ ہمارا قائد اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس کو جہاں گرد صاحب نے نہایت قابلیت سے مزین کیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل تصنیف ہے۔ قیمت مجلد ...

کمال اتاترک — مسیحائے ترکی مصطفیٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں جس کی وجہ سے کمال اتاترک موجودہ تمام سوانح عمریوں سے اکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اسوقت پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے قیمت مجلد ...

بہترین اخلاقی افسانے

نیلوفر: — دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ

قسمت: — دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے

صبر و ضبط: — معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

اقبال کا شاہین

اقبال کی جدت طرازی نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو اسالیب و موضوع کے علاوہ نئی نئی تمثیلات کی دولت بھی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے۔ وہ شخص جو نظام ندرت میں بھی ندرت اور تنوع دیکھنا چاہے اور رات دن کی یکسانیت سے اکتا کر خدا سے کہدے ؎

طرحِ نو افگن کہ ماجدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

وہ اردو فارسی کی پامال تمثیلات بلبل، کبک، طاؤس وغیرہ کا محتاج کیوں رہتا یہ اس کے زبردست جذبۂ تخلیق کا فیض ہے کہ اس نے اپنے پیغام کی وضاحت اور اپنے بلند مقاصد کی تشریح کے لئے شاہین، شاہباز اور عقاب کی تمثیلات سے کام لیا۔ یہ تینوں چیزیں بالکل اچھوتی نہیں ہیں۔ اردو فارسی میں اکثر جگہ ان کا ذکر آیا ہے۔ لیکن اقبال نے ان کے ذریعہ جس مقصد کی وضاحت کی ہے۔ اس مقصد کی اہمیت نے ان تمثیلات کی وقعت بڑھادی ہے۔

اردو کے اساتذۂ قدیم کے کلام میں شاہین کا ذکر جس حیثیت سے کیا گیا ہے وہ کچھ ایسی مضحکہ خیز ہے کہ شاہین کے نام سے نفرت ہونے لگتی ہے ؎

مرغِ عصیاں اڑ کے صیدِ بازِ رحمت ہو گیا
رنگ شاہینِ ترازوئے عدالت ہو گیا

تیرے تیرے کوئی طائر نہ چھوٹا دہر میں
رہ گیا تو ایک شاہینِ ترازو رہ گیا

چھپ رہا ہے قفسِ تن میں جو ہر طائرِ دل
آنکھ کھولے ہوئے شاہینِ نظر کس کا ہے

یا شاہباز کے لئے حضرتِ آتش فرماتے ہیں ؎

تو نے زلفوں کو الجھ پڑنے سے منڈوایا جو یار
شاہبازِ حسن بے بازو نظر آیا مجھے

یہ اور اس قبیل کے متعدد اشعار اردو کے دواوین میں ملتے ہیں۔ فارسی میں خواجہ حافظ فرماتے ہیں ؎

شہپرِ زاغ و زغن شایانِ قید و بند نیست
ایں کرامت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

مگر اقبال کے کلام میں شاہین کا ایک خاص تصور ملتا ہے جو ان کے مخصوص تصورِ خودی کا تابع ہے۔

"شاہین ایک بلند پرواز، تیز نظر، تنومند، جفاکش، غیور اور بلند فطرت پرندہ ہے"۔ اقبال اس کی جملہ خصوصیات میں سے خونریزی کے عنصر کو حذف کرکے پیش کرتے ہیں، اور یہی ان کے نزدیک صحیح مردِ مومن کا کردار ہے۔ بلند نظری اور ذوقِ عمل ——— یہ تصور ان کے ہاں اسقدر تابناک ہے کہ جب وہ شاہین کی زبان سے اس کی سیرت بیان کرتے ہیں تو وہاں بھی خونریزی کا شائبہ تک نہیں آنے دیتے۔ شاہین کہتا ہے ؎

بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھکو
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اقبال کے مسلک میں شباب تن آسانی اور تن پروری کا نام نہیں ہے، بلکہ سخت کوشی اور اپنے لہو کی آگ میں جلنا شباب کی صحیح تعریف ہے ؎

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخوردہ
اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر
وہ مزہ شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

اقبال صوفیائے سلف کی تعلیم نفی خودی سے بیزار ہے۔ وہ قوم کی پستی اور زوال کا سبب اسی غلط تعلیم کو قرار دیتا ہے "مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید" کا سبق دینے والے کو وہ "گوسفند از گوسفندانِ قدیم" کے لقب سے یاد کرتا ہے اور اپنے زبردست جذبۂ تخلیق کی مدد سے خودی کو ایک نہایت ارفع و اعلیٰ درجہ عطا کرتا ہے۔ اس کی حکیمانہ بصیرت، فلسفیانہ استدلال اور شاعرانہ اندازِ بیان خودی کے لفظ سے غرور و خود پسندی کا مفہوم چھین کر اسے احساسِ نفس یا تعینِ ذات کے معنی پہنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک استحکامِ خودی اپنے طبعی ماحول سے جنگ کرنا اور فطرت کو اپنا مطیع بنانے کی کوشش کرنا ہے اور جب وہ قوم کے نوجوانوں میں خودی کا احساس نہیں پاتا تو خدا سے دعا کرتا ہے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

جدید طریقۂ تعلیم سے اقبال سخت متنفر تھے۔ تہذیبِ جدید اور تقلیدِ فرنگ کے فیض سے وہ قوم کے نوجوانوں کو بے عمل، بزدل اور غلام دیکھکر ان اداروں اور تعلیم گاہوں کے ذمہ دار حضرات کو ان کے فرائض کا احساس دلاتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

مغیث الدین فریدی

بعض مغرب زدہ حضرات اقبال کی مقاصد آفرینی کے تصور کو برگسان کے جوشِ حیات اور ارتقائے تخلیق کا عکس بتاتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برگسان نے نفسِ انسانی کی تخلیقی صلاحیت کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے لیکن اقبال کے نزدیک نفسِ انسانی کی تخلیق کا محرک روحانی جذبہ ہوتا ہے۔ اقبال کی مقاصد آفرینی خالص روحانی ہے اور اس تہذیبِ نفس کی مرہونِ منت ہے جو مذہب، اخلاق کی بنیاد ہے۔ یہی تہذیبِ نفس جب اقبال کے سامنے مردِ مومن کا تصور پیش کرتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے ؎

تراجوہر ہے نوری پاک ہے تُو — فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تُو

اقبال نطشے کا شاگرد ہے اس وجہ سے کہ وہاں بھی اُسے اپنے نقطۂ نظر کی تائید ملتی ہے۔ نطشے بھی استحکام خودی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اس کے لئے قلبِ او مومن و ماغش کافر است کہتا ہے وہ رومی کا اس لئے مداح ہے کہ رومی عقل سے زیادہ عشق پر ایمان رکھتا ہے اور یہی اقبال کا مسلک ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق ؛ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ہنوز

مگر اس کا عشق اس سے مختلف ہے۔ وہ ایسا عشق چاہتا ہے جو جذبۂ تسخیر جذبۂ تخلیق اور جذبۂ ارتقا کے کامیاب امتزاج کا نتیجہ ہو۔

ندارد کار با دوں ہمتاں عشق ؛ تذروِ مردہ را شاہیں نہ گیرد
عقاباں را بہائے کم نہد عشق ؛ تذرواں را بباز اں سر دہد عشق
نگہ دارد دلِ ما خویشتن را ؛ ولیکن از نگہش بر جہد عشق

اقبال کے نزدیک عشق زندگی کی اعلیٰ ترین تخلیقی استعداد ہے۔ مگر اس کے لئے بیدار دل کی ضرورت ہے ؎

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے ؛ شکارِ مردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

اقبال کو جمود سے نفرت ہے وہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں حرکت اور عمل کا جذبہ بیدار کرنا چاہتا ہے اور جب ہندوستان کی غلامانہ ذہنیت سے مسلمان کو متاثر دیکھتا ہے تو کس انداز سے نشتر زنی کرتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

خودی کی سعیٔ پیہم روح کو اندرونی اور وجدانی طور پر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے تیار کرتی ہے اور یہ مقاصد کی روشنی مستقبل کی تصویر کو حال کے آئینے میں پیش کر سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے جس ہمتِ بلند کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی تعلیم اقبال یوں دیتا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ؛ نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے ؛ امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر ؛ تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

قرآن پاک میں جگہ جگہ اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ انسان اپنے اعمال و افعال کا ذمہ دار خود ہے (لیس للانسان الا ما سعی یا لھا ما کسبت و علیھا ما اکتسبت) کی تفسیر اقبال بڑے دلچسپ پیرایہ میں یوں کرتا ہے جب ابوالعلا معرّی کو بھنا ہوا تیتر پیش کیا گیا تو اس نے تیتر سے یوں کہا ؎

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو — دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارے
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اسلام نے انسان کے تصور اور ارادہ کو آزاد رکھا ہے تاکہ ہر شخص اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اقبال اسی تعلیم کو اپنے الفاظ میں یوں سناتا ہے ؎

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسلام نے جو مردِ مومن کا معیار پیش کیا ہے اس پر جب مسلمان پورا نہیں اترتا تو اقبال اسے اس طرح غیرت دلاتا ہے ؎

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے — تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری — تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے

اسی بیباکی اور بلند ہمتی کی تعلیم دیتے ہوئے اقبال قوم کے ہر فرد میں خود اعتمادی، غیرت اور بلند آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے ؎

چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ

علم و عقل سے زیادہ اقبال عشق کا پرستار ہے وہ خشک فلسفیانہ مسائل سے ہمیشہ بیزار رہا ہے۔ محض فلسفہ کو وہ زندگی سے دوری کہتا ہے ؎

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سِرِ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

تصنیفِ مقدر :

بقیہ صفحہ ۳۴

میں نے حتی الوسع کوشش کی کہ ان کی شراب نوشی کی عادت چھوٹ جائے لیکن بے سود۔ پھر بھی میں خوش تھی کیونکہ میری ننھی شیریں میری امید کا ستارہ میری زندگی کا سہارا چمک رہا تھا۔ لیکن آج وہ بھی ٹمٹما رہا تھا۔ پندرہ دن سے بخار تھا۔ ڈاکٹر نے حالت نازک بتائی تھی۔ میں نے جھک کر شیریں کی پیشانی کو چھوا۔ سرد۔ برف کی طرح۔ سینے پہ ہاتھ رکھا۔ خاموش، بیابان کی طرح۔ ساکت، مردنی چھائی ہوئی۔ کمرے میں ایک سایہ پلنگ پر پڑے ہوئے بے جان جسم پر جھکا ہوا تھا۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا۔ وہ ننھا ستارہ جو چھپ چھپ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب تنگ آ کر آکاش میں سما گیا تھا۔ دور تک کا جل کا صحرا دکھائی دیتا۔ اور گھور کالی رات !!!۔

چیخ

افسانہ

خاطر غزنوی

پڑاؤ پر آکر بس رک گئی —— فوجی نے اپنا کٹ بیگ اور ایک بکس اتار کر اپنے گاؤں کی سڑک کے کنارے رکھ دیئے۔ بس پھر چل پڑی —— اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر اس نے محسوس کیا کہ چھ سال کے عرصہ میں یہ پڑاؤ کسی قدر بدل چکا ہے —— اب کچی سڑک بھی پختہ ہو چکی تھی۔ مسافروں کے ٹھہرنے کی کچی کوٹھڑی بھی ایک پختہ عمارت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ساتھ کے کنویں پر چھپر لگ چکا تھا۔ صرف چھپر ہی نہیں کنویں کے گرد سیمنٹ کا فرش بھی بن چکا تھا۔ لیکن اتنی تبدیلیوں کے باوجود اسے دور دور تک سبزے کا نام و نشان بھی نظر نہ آیا۔ اس نے سوچا شاید یہ علاقہ بھی قحط کی زد میں آچکا ہے —— سڑک کے کنارے درخت یوں لنڈ منڈ کھڑے تھے —— جیسے پارک شائر کی سن باتھ سوسائٹی کے ممبر دھوپ میں برہنہ ہو کر انگڑائیاں لے رہے ہوں۔

سورج خوب تیزی سے چمک رہا تھا۔

پڑاؤ پر صرف ایک ہی ٹانگہ کھڑا تھا۔ جس کی پچھلی نشست پر ایک نیا شادی شدہ جوڑا براجمان تھا۔ دلہن شادی کے زرین جوڑے میں ملبوس تھی۔ اور اس نے اپنا گھونگھٹ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑھا رکھا تھا۔

اپنی تازہ استری کی ہوئی وردی کو جھاڑتے ہوئے اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اور پالش کئے ہوئے بھاری بھرکم بوٹوں سے دھرتی کو کچلتا ہوا کوچوان کے پاس آیا۔ کالے رنگ کی کشتی نما فوجی ٹوپی کو اس نے سر پر کچھ ٹیڑھا کیا۔ اور ہاتھ میں ایک مختصر سی چھڑی کو گھماتے ہوئے کوچوان سے ٹانگے کا کرایہ پوچھا —— وہ قدرے رعب میں ہو گیا تھا —— شاید کوچوان پر اپنے فوجی ہونے کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا —— "ایک روپیہ" —— ٹانگے والے نے بھی تن کر جواب دیا جیسے اسے اس کے فوجی ہونے کی کوئی پرواہ نہیں —— اور فوجی بھی شاید اپنا رعب برقرار رکھنا چاہتا تھا —— یا شاید کوئی اور وجہ ہو —— کٹ بیگ اور ٹرنک رکھ کر وہ ٹانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اب کسی اور لاری کے آنے کا وقت نہ تھا۔ کوچوان نے گھوڑے کو چابک دکھائی۔ اور فوجی اپنے گاؤں کے سہانے خوابوں میں کھو گیا۔ پورے چھ سال بعد وہ اس راستے سے گذر رہا تھا۔ راستہ وہی تھا۔ لیکن اس کی ہیئت بدل چکی تھی۔ بالکل اس کی اپنی طرح۔ وہ بھی پہلے پہل اس گاؤں سے بھرتی ہونے کے لئے گیا۔ تو کچھ اور ہی تھا —— ایک اجڈ —— اور غیر تعلیم یافتہ دیہاتی —— جس کے دیہاتی کپڑوں سے گنوار پن کی بو آرہی تھی —— اور اب چھ سال کے عرصہ میں وہ ایک سپاہی سے ترقی کرتا ہوا جمعدار بن گیا —— دشمن کی قیدیں بھگت چکا۔ کئی ادھوری سی غیر ملکی زبانیں سیکھ گیا —— یہاں تک کہ اب وہ اپنا دستخط بھی انگریزی میں کر سکتا تھا۔ اور ہر وقت اجلے اور استری کئے ہوئے کپڑے پہنے رہتا تھا۔

پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی دلہن کو کھانسی آئی —— اس نے کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ عورت کا گھونگھٹ بڑھا ہوا تھا —— اسے اپنی بیوی یاد آگئی —— چھ سال کے عرصہ میں جانے وہ کیا سے کیا ہو گئی ہو گی —— ایک سال تک تو وہ گھر والوں سے خط و کتابت کر سکا —— لیکن معاً دشمن کے ہتھے چڑھ جانے پر یہ سلسلہ بند ہو گیا —— اور اسے قید و بند کی مصیبتیں یاد آگئیں —— کتنی صعوبتیں جھیلیں تھیں اس نے —— کتنی بیدردی کا سلوک کیا دشمنوں نے ان کے سپاہیوں سے۔ ان وحشیانہ مظالم کی یاد سے اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی —— گرمی کی جھلسی ہوئی دوپہروں میں ان سے سخت مشقت کرائی جاتی —— اتنی سخت کہ خون پسینہ ایک ہو جاتا —— اور اس کے ماتھے پر پسینے کے چند موٹے موٹے قطرے نمودار ہو گئے۔ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ شدت کی گرمی پڑ رہی ہے —— اور معاً اسے یاد آیا کہ اس کی کلائی پر ایک گھڑی بھی بندھی ہوئی ہے —— جس کا قطر ڈیڑھ انچ کے قریب ہے —— جو فوجیوں کے لئے خاص طور پر مفید ثابت ہوتی ہیں —— ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے وقت دیکھا —— ڈھائی بج رہے تھے —— وہ سوچنے لگا کہ جب اس کی بیوی یہ گھڑی —— یہ دلچسپ وردی —— اپنے زرق برق کپڑے —— اور امریکن سونے کے زیورات دیکھے گی تو کس قدر خوش ہو گی —— کس قدر نازاں ہو گی۔ قسمت پر —— اور اس نے پھر پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت کی طرف نظر کی —— گھونگھٹ بدستور لٹک رہا تھا۔

ڈھائی بجے دوپہر کا وقت —— شدت کی گرمی —— یہ چٹیل میدان —— اور یہ عورت ہے کہ گھونگھٹ ہی کوئے بیٹھی ہے —— ان دیہاتیوں سے تو شہر والے ہی اچھے ہیں گھونگھٹ وونگھٹ تو وہ جانتے ہی نہیں اور پھر اسے غیر ملکی شہر یاد آگئے —— جہاں بالکل آزادی تھی۔ پردے کو کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ اور اس عورت کو اس شدت کی گرمی کا بھی کچھ احساس نہیں —— آخر ان لوگوں کی بد بختی ہی کیا ہے۔ جن کی رگ رگ میں غلامی رچ گئی ہو۔

ٹانگہ اپنی ایک خاص رفتار سے یہ چٹیل میدان عبور کر رہا تھا۔ یہاں درخت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے لندن کے آباد بازاروں سے لے کر ہیروشیما کے کھنڈروں تک سبھی کچھ دیکھا تھا۔ اور یہ چٹیل میدان بھی ہیروشیما کے کھنڈروں سے کوئی کم نہ تھے —— لیکن وہ ان چٹیل میدانوں پر مرا جا رہا تھا۔ ہزار برا سہی یہ علاقہ —— لیکن یہ پھر اس کا وطن تھا۔ سنگ میل پر اس نے پڑھا۔ اس کا گاؤں صرف دو میل رہ گیا تھا۔ اور اس کے دل میں جیسے گدگدیاں سی ہونے لگیں —— اسے پھر اپنی بیوی یاد آگئی۔ اس نے تصور کے پردوں پر کئی بار اپنی بیوی کی تصویر لانے کی کوشش کی۔ لیکن ایک دھندلا سا نقش بن کر مٹ جاتا —— وہ شادی کے بعد صرف ایک مہینہ ہی تو اس کے ساتھ گذار سکا تھا۔ کیونکہ اسے ٹریننگ کے بعد چھٹی ہی ایک مہینہ کی ملی تھی —— اور اس کی ماں نے اس ایک مہینہ کو نعمت غیر مترقبہ جانتے ہوئے اپنے بیٹے

کی شادی کردی اور پھر اس کے بعد چھ سال کا طویل عرصہ —— کچھ جرمنوں کے ساتھ جنگ میں اور کچھ ان کی قید میں۔ کچھ جاپانیوں کے ساتھ جنگ میں اور کچھ ان کی قید میں گذرا —— اور اب وہ آزاد ہو کر اپنے گاؤں آ رہا تھا۔ اب وہ بالکل آزاد تھا۔ اسے فوج کی نوکری سے چھٹی مل چکی تھی —— اور اب وہ اپنے گاؤں واپس آ رہا تھا —— ٹانگہ اپنی مخصوص رفتار سے یہ چٹیل میدان عبور کر رہا تھا۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ گرمی شدت کی پڑ رہی ہے۔ پچھلی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت کا گھونگھٹ بدستور لٹک رہا تھا۔ اور اس کے ماتھے پر پھر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے گھڑی کو بھی دیکھ لیا۔ تین بج چکے تھے۔ ایکا ایکی اسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آیا۔ وہ اپنی ماں کو تو بھول ہی چکا تھا —— اور بیوی رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ وہ اپنی بیوی جو صرف ایک ماہ اس کے ساتھ رہی۔ اور عمر کے بائیس سال ساتھ رہنے والی ماں کو وہ بھول ہی چکا تھا —— لیکن ماں تو چیز ہی بھول لینے کی ہے —— اب تو اس کی جیون ساتھی اس کی بیوی تھی —— اس کے دکھ درد کی شریک —— اس کے راحت و آرام کی نگہبان اس کی ہر آسائش کی ذمہ دار —— اس کی بہترین مونس —— اور —— رفیق —— اور ماں —— وہ اس وقت ماں کے متعلق کچھ زیادہ سوچنا نہ چاہتا تھا۔

ٹانگہ اسی رفتار سے چٹیل میدانوں میں سے گزر رہا تھا۔ گھوڑا تپتی ہوئی پکی سڑک کو روندتا ہوا جا رہا تھا۔ بالکل اس کے دماغ کی رفتار کے ساتھ ساتھ —— اس طویل خاموشی سے وہ اکتا گیا تھا۔ اسے ایسا کوئی موضوع نہ سوجھتا تھا جس پر وہ کوچوان یا پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے نوجوان سے باتیں کرتا۔ اس نے گانا چاہا —— نغمہ اس کے ہونٹوں تک آ کر رک گیا۔ اسے یاد آیا۔ کہ اس کے ملک کے رسم و رواج کے مطابق کسی عورت کی موجودگی میں گانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ وہ خاموش ہی رہا —— اور کچھ سوچنے لگا —— ٹانگے کی رفتار کچھ سست پڑ گئی۔ کوچوان نے گھوڑے کو بے نقط سنانی شروع کر دیں —— شاید جانور ان موٹی موٹی گالیوں کا مطلب سمجھتا تھا —— اس کی رفتار میں تیزی آ گئی —— لیکن وہ چاہتا تھا کہ گھوڑا اور بھی تیزی سے دوڑے۔ لیکن اس شعلہ بار دوپہر میں گھوڑے کی موجودہ رفتار بھی بہت زیادہ تھی۔

صاف میدان میں پیچ و تاب کھاتی ہوئی سڑک یوں دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی سانپ دوڑا جا رہا ہو —— اسے حد نظر کے پاس کچھ آبادی کے نشانات نظر آئے یہ اس کا گاؤں تھا —— دور سے گاؤں کی ایک جھلک دیکھ کر اس کے دل میں پھر گدگدیاں سی ہونے لگیں —— وہ سوچنے لگا۔ کہ جونہی وہ اپنے گھر میں داخل ہوگا —— اس کی بیوی اور ماں اسے اجنبی سمجھ کر ایک لمحے کے لئے گھبرا جائیں گی —— لیکن جونہی اسے پہچانیں گی —— تو وہ گھونگھٹ نکال لے گی —— بالکل اس عورت کی طرح جو پچھلی سیٹ پر سمٹی سکڑی بیٹھی ہے —— اور اس کی ماں فرط مسرت سے اسے گلے لگائے گی —— اسے چومے گی —— اس کی بلائیں لے گی —— اور —— اور —— کوچوان نے پھر گھوڑے کو ایک دو موٹی موٹی گالیاں سنا دیں اور گھوڑا اپنا من بھاتا سن کر تیز ہو گیا —— گاؤں قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ اور فوجی کا دل بیٹھا جا رہا تھا —— خوشی اور جلدی کے ملے جلے جذبات اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے صاف معلوم ہو رہے تھے۔ سڑک کے کنارے اب سرسبز کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لہلہاتے ہوئے کھیت —— اور ان لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے ایک میں سے ایک شخص نکلا —— اور سڑک پر گاؤں ہی کی جانب چلنے لگا —— فوجی کو ٹانگے میں بیٹھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا —— فوجی نے جیسے اسے پہچان لیا —— آخر پہچاننا ہی تو تھا۔ عمر کے بیس سال ایک ساتھ رہنے والے دوست رمضو کو وہ نہ پہچانتا —— یہ دوسری بات ہے کہ اسے پہچاننے میں کچھ دیر لگی —— فوجی نے بے صبری سے ہاتھ پھیلا دیئے —— اور اس کے منہ سے تیر کی طرح یہ لفظ نکل گیا —— "رمضو" —— اور اب رمضو نے بھی فوجی کو پہچان لیا —— "بخشو" کہتے ہوئے وہ ٹانگے کی طرف لپکا —— بخشو ٹانگے سے اتر گیا —— مدت کے بچھڑے ہوئے دوست بغلگیر ہو گئے —— ٹانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کا گھونگھٹ اب اٹھ چکا تھا —— اور وہ حیرانی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی "بخشو کیا تم واقعی زندہ ہو" —— رمضو نے بے تابی سے پوچھا۔ "ہاں ہاں میں زندہ ہوں بالکل زندہ" —— بخشو خوشی سے چلایا اور گھونگھٹ والی عورت کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔

فجی میں ہندوستانی

رام لال

جزائر فجی جنوبی بحرالکاہل میں واقع ہیں جزائر کا رقبہ آراضی (۷۰۵۵) میل ہے اور (۹۵۰۰۰) میل تک یہ جزائر پھیلے ہوئے ہیں۔ بحرالکاہل کے برطانوی جزائر کا ⅓ حصہ اور اس رقبہ کی آبادی کا نصف سے زیادہ حصہ فجی میں شامل ہے اور جنوبی بحرالکاہل کے گروپ میں جزائر فجی برطانیہ کا اہم مقبوضہ ہیں۔ اس کی فوجی اہمیت پانامانہر کے نکلنے سے بہت بڑھ گئی ہے اور اب جبکہ برطانیہ امریکی دفاعی سکیم میں تعاون کرنے والی ہے ان جزائر کو اول درجہ کی فوجی چوکی میں تبدیل کردیا جائے گا اور اس وقت اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جائیگی۔ یہ جزیرے آسٹریلیا اور شمالی امریکہ کو جانے والے سمندری راستہ میں پڑتے ہیں۔ اس لئے بحرالکاہل کو عبور کرنے والی تجارتی شاہراہوں کے نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں بہت اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ مغربی بحرالکاہل میں مقیم برطانوی ہائی کمشنر کا صدر مقام بھی چونکہ فجی ہی میں ہے اس لئے ان جزیروں کو سیاسی پوزیشنیں بھی حاصل ہوگئی ہے۔ جزائر فجی کا دارالحکومت سوا میں ہے۔ یہ بندرگاہ ہے اور جنوب مغربی بحرالکاہل کے سمندری راستوں کا جنکشن ہے۔ برطانیہ۔ کنیڈا اور آسٹریلیا کے درمیان آتے جانے والے جہاز اور امریکہ کی میٹسن لائینز کے جہاز بھی یہاں ٹھہرتے ہیں۔ یہ جہاز چار ہفتہ کے بعد آتے جاتے ہیں اور بحرالکاہل کو شمال سے جنوب تک عبور کرتے ہیں۔ سوا میں ایک اہم لاسلکی سٹیشن اور ریڈیو گھر بھی ہے۔ جنوبی بحرالکاہل میں اس کی پوزیشن ایک اہم سمندری اڈہ کی بھی ہے جسکی وجہ سے اسے نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے دفاع کے لئے قدرتی طور پر موزوں سمجھا جاتا ہے۔

جزائر فجی کے گروپ میں کوئی ڈھائی سو ٹاپو ہیں۔ ان میں سے "ڈیٹی ووا" اور "وانوا لیوو" ہی کے دو جزیروں میں خشکی کا ⅚ حصہ آجاتا ہے۔ اور تمام جزائر کی آبادی کا ¾ حصہ ان دونوں ٹاپوؤں میں آباد ہے۔ ۱۹۴۰ء میں فجی کی کل آبادی (۲۲۰,۷۸۷) تھی جس میں سے خود فجی کے لوگ (۱۰۴,۸۷۲) تھے۔ اور ہندوستانی ۹۸,۱۱۳ تھے۔ (۵,۱۰۷) آدمی یورپین یا وہاں کی دیسی آبادی کی ملی جلی نسل کے تھے خالص یورپین (۴,۲۸۷) تھے اور (۸,۵۰۰) آدمی پولنیشی، چینی اور نمائی وغیرہ تھے۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۴۵ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار یہ تھے۔ ہندوستانی (۱۱۷,۲۵۶) اور فجی کے لوگ (۱۱۵,۷۲۴) کچھ لوگوں کو چھوڑ کر باقی اہل فجی میتھوڈسٹ فرقہ کے عیسائی ہیں۔ ہندوستانی آبادی میں ۱۹۳۶ء کی مردم شماری کے حساب سے (۸۵,۰۰۲) آدمیوں میں سے (۷۰,۹۸۶) ہندو تھے اور (۱۱,۲۹۰) مسلمان۔ باقی میں سے (۱۰۶۸) سکھ اور (۱۶۶۵) عیسائی تھے۔ ان ہندوستانیوں میں بنگالی بھی ہیں اور بہاری بھی۔ نیز اڑیسہ کے لوگ۔ پنجابی۔ ٹامل۔ ملایالی۔ ٹیلگو۔ اور کنٹری بھی۔ اس کے علاوہ یو۔ پی اور سی۔ پی کے لوگ بھی ہیں۔ مذہبی دھڑے بندی یہاں نہیں ہے۔ اور یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کو اپنی تقریبوں اور شادی بیاہ وغیرہ میں بلاتے ہیں۔

۱۹۳۶ء میں (۱۶۰۰۰) ہندوستانی کاشتکاری کررہے تھے اور (۸۵۰۰) لوگ مختلف پیشوں اور تجارتوں میں لگے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں گنجان آبادی ہے وہاں زیادہ تر دوکانیں اور بیوپار ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس سلسلہ میں چینیوں سے مقابلہ ہے اور کامیاب۔ درزی خانے اور جوتے کی مرمت کا کام ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ سڑک پر سواریاں چلانے۔ زیورسازی۔ شکر کے کارخانوں میں چلنے والی ریلوں کی ڈرائیوری بڑی حد تک ہندوستانی ہی کرتے ہیں۔ کچھ ہندوستانی سرکاری دفتروں اور یورپین فرموں میں بطور کلرک بھی ملازم ہیں۔

ہندوستانیوں کی ہجرت کی تاریخ

۱۰۔ اکتوبر ۱۸۷۴ء کو فجی کے پرانے حکمرانوں کے انگریزوں کا ایک معاہدہ ہوا اور اسکی رو سے جزائر فجی حکومت برطانیہ کے قبضہ میں آگئے۔ اور اسے ایک برطانوی نوآبادی بنادیا گیا۔ نوآبادی بنتے ہی روئی کی کاشت کا بڑا غلغلہ ہوا جس کی وجہ سے یورپینوں نے روئی کی کاشت دھڑا دھڑ شروع کردی مگر فجی کے دیسی مزدوروں کی اہلیت بہت معمولی ثابت ہوئی اور اس وجہ سے جزائر لائین اور جزائر نیو ہائی برائیڈز سے (۱۸۶۰ء) اور ۱۸۷۷ء کے درمیانی عرصہ میں کوئی (۸۵۰۰) مزدور منگوائے گئے۔ مگر مزدور منگوانے کا یہ سلسلہ بھی کچھ زیادہ اچھا ثابت نہیں ہوا اور ۱۸۷۷ء میں ایسے مزدوروں کی بڑی تعداد اپنے وطن واپس بھیجدی گئی۔ لیکن اس کے بعد گنے نے روئی کی جگہ لے لی اور اس بیوپار میں لوگوں کے خوب وارے نیارے ہوئے۔ شکر کے کام کو فروغ دینے کے لئے "کولونیل شوگر ریفائینگ کمپنی" (سی۔ ایس۔ آر۔ سی) نے خاص حصہ لیا اور اس کمپنی نے ہندوستان سے ہجرت کئے ہوئے مزدوروں کی مدد سے اس کام کو بہت پختہ بنیادوں پر قائم کردیا۔

۱۸۷۷ء میں حکومت فجی کے "ایجنٹ جنرل مہاجرین" کو ہندوستان اس غرض سے بھیجا گیا کہ وہ یہاں "مزدوروں کی ایک مختصر مگر نہایت باقاعدہ"

رہائی کا انتظام کر سکیں۔

اس افسر کی گفت و شنید نے جو نتیجہ پیدا کیا وہ یہ تھا کہ ہر مزدور سے ایک "سرخط" (Indenture) لکھوایا جاتا تھا جس میں دونوں فریق آپس میں کچھ معاہدہ کرتے تھے۔ اس سرخط کی رو سے جانے والے مزدوروں کو ہندوستان سے جانے کی اجازت دی گئی مگر نہایت سخت نگرانی اور پابندیوں کے ساتھ معاہدہ کی رو سے اس بات کی گارنٹی کی گئی تھی کہ ہر مزدور کو دس سال کے بعد خرچ دیکر واپس ہندوستان بھیجا جائے گا۔ حکومت فجی ایسے مزدور خود بھرتی کرتی تھی اور اپنی ہی نگرانی میں انہیں مختلف کارخانوں اور کھیتوں پر جو سرکاری انتظام میں تھے پہنچا دیتی تھی۔

اس سسٹم کے ماتحت ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۹ء کے درمیان (۷۱۳۵) مہاجرین ہندوستان سے فجی پہنچے اور فجی سے پہلی واپسی ۱۸۸۹ء میں عمل میں آئی۔ مہاجرین کی آمد اور یہاں پیدا ہونے والے بچوں کی پیدائش کے بعد یہاں ہندوستانیوں کی آبادی جو ۱۸۸۱ء میں صرف (۵۸۸) تھی اور ۱۸۸۳ء میں (۲۳۰۰) تک پہنچ گئی۔ یہ تعداد ۱۸۸۸ء میں (۶۳۷۰) ہو گئی۔ ۱۸۹۱ء میں ہندوستان (۷۴۶۸) ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں یہ تعداد (۱۷۱۰۵) تک پہنچ گئی۔ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۱۱ء میں آنے والے مہاجرین کی تعداد اتنی بڑھی کہ (۲۰۸۴) آدمی فی سال کی اوسط ہونے لگی۔

سالانہ واپسی کا اوسط ۱۹۱۱ء میں (۴۸۲) شمار کیا گیا تھا۔ اور مجموعاً اس سال ان کی تعداد (۴۰۲۸۶) تھی۔ ہندوستان سے سستے "تازہ دم" مزدور نہایت آسانی سے اور بے تکلفی سے مل جاتے تھے اس لئے گنا پیدا کرنے والی املاک نے عام طور پر یہ وطیرہ اختیار کیا کہ سرخط کی رو سے جن مزدوروں کی مدت ملازمت ختم ہو گئی انہیں فوراً نکال دیا اور نئے ہندوستانی پکڑ لائے۔ ادھر ہندوستانیوں نے بھی یہ کیا کہ گنے کے کھیتوں کی مزدوری سے علیحدگی اختیار کرنی شروع کر دی اور اپنی زمین لیکر ان پر کھیتی باڑی کا سلسلہ قائم کر دیا۔ چنانچہ آزاد کاشتکاروں کی حیثیت سے انہوں نے چاول گندم اور دوسری چیزیں پیدا کرنی شروع کر دیں۔ ان سب چیزوں کی نکاسی کے لئے وہاں بہت کافی میدان تھا اور روزگار کا نہایت معقول ذریعہ تھا ساتھ ہی ساتھ یہ ہوا کہ برٹش گنی، ماریشش

اور ٹری نڈاڈ کے جزیروں سے کچھ ہندوستانی فجی کی طرف آنے لگے اور یہاں آکر گنے کی بہت سی زمینوں پر قابض و متصرف ہو گئے۔

یورپین زمیندار یہ تو چاہتے تھے کہ ہندوستانی یہاں آئیں مگر صرف زرعی مزدوروں کی حیثیت سے، اس لئے وہ آزاد کاشتکار اور آزاد شہری کی حیثیت سے آباد ہونے والے ہندوستانیوں کو ایک آنکھ پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ آزاد ہندوستانی شہریوں سے ان کی آویزش رہنے لگی۔ علاوہ ازیں سرخطی مزدوروں سے جن حالات میں کام لیا جاتا تھا وہ بہت ناگوار و ناگفتہ بہ حد تک پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان سے جو مزدور ان جزائر میں جاتے تھے ان کے ساتھ عورتیں بہت کم ہوتی تھیں کیونکہ شادی شدہ لوگوں کے لئے "قلی لائینوں" میں رہنے میں بڑی دشواری تھی۔ عورتوں کی کمی کی وجہ سے "قلی لائینوں" کی اخلاقی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی اور مزدور اخلاقی پستی کا شکار بننے پر مجبور ہو گئے۔

چنانچہ یہ "قلی لائنیں" بدکاری اور شرمناک بیماریوں کا گھر بن گئیں۔ خوفناک جرائم خودکشی اور اقتصادی پستی اس کے ساتھ ساتھ آئی۔ نیٹال کے لئے "سرخطی مزدوروں" کی ہجرت کا قاعدہ اڑا دیا گیا۔ اس سے فجی کے زمینداروں کی بھی ذرا آنکھیں کھلیں اور انہوں نے کچھ رعایتیں دینے کا فیصلہ کیا، چنانچہ ۱۹۱۲ء میں کئی نئی تبدیلیاں قواعد میں داخل کی گئیں۔ خاص طور پر یہ بات کہ مزدوروں کو ملازمت کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں فوجداری سپرد نہیں کیا جائیگا اور روزانہ ان سے جو کام لیا جاتا ہے اس میں بھی کمی کر دی جائے گی۔

۱۹۱۴ء میں رامیک نیل۔ چمن لال" وفد مرتب ہوا۔ مگر اس کی رپورٹ سے بھی ہندوستانی پبلک کے مطالبات کی تشفی نہیں ہوئی۔ اور اہل ہند نے آنجہانی سی۔ الیف انڈریو زاور ڈبلیو۔ ڈبلیو، پیرسن کو ۱۹۱۵ء میں اس سلسلہ میں نئی تحقیقات کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ ان لوگوں نے فجی میں مقیم ہندوستانیوں کی حالت کا بہت گہرا مطالعہ کیا اور بڑی چھان بین کے بعد ناقابل تردید ثبوت اس نوعیت کے بہم پہنچائے کہ ہندوستانی مزدوروں کی حالت نہایت افسوسناک ہے۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ لارڈ کے ہارڈنگ کو اس بات پر مجبور ہونا پڑا کہ سرخطی

غزل

حافظ امرتسری

دیکھ لینا کوئی برا تو نہیں — یہ کوئی جرم یا خطا تو نہیں
آپ ناحق بگڑ گئے مجھ سے — میں نے کچھ آپ سے کہا تو نہیں
دل کو ملتی ہے درد سے راحت — درد میں درد کی دوا تو نہیں
میں کہاں ہوں یہ کیا مقام آیا — یہی منزل کی انتہا تو نہیں
دل کے زخموں سے ملتے جلتے ہیں — غم سے نالے بھی آشنا تو نہیں

آپ کہتے رہیں برا لیکن
حافظ امرتسری برا تو نہیں

سسٹم کو بالکل ختم کر دیا جائے چنانچہ ۱۹۱۶ء میں "قانون انفساخ سرخط" پاس کیا گیا۔ اگرچہ سرخط لکھوا کر مزدور حاصل کر لینے کا طریقہ بالکل خلاف قانون قرار دے دیا گیا تھا مگر سینکڑوں مزدور ابھی تک پرانے سرخط کے قواعد کی رو سے پھنسے ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں اس سسٹم کی خرابیاں ۵۰ سال سے چلی آ رہی تھیں اور ان کے برے نتیجے بھی اپنی جگہ موجود تھے اس لئے اس قانون کے بننے کے باوجود ہندوستانیوں کی زندگی میں آشوب بدستور موجود رہا۔ پادری انڈریوز صاحب کو تازہ تحقیقات کے لئے پھر ۱۹۱۷ء میں بھیجا گیا۔ ان کی درخواست پر آسٹریلیا کی مس فلارنس گارنہم نے ۱۹۱۸ء میں اس سلسلہ میں خاص تحقیقات کیں۔ بالخصوص فجی میں آباد ہندوستانی عورتوں کی پس ماندہ حالت کی۔ اس سال کے ختم ہونے پر ان سب مزدوروں کے سرخط جو ۱۹۱۶ء تک آ چکے تھے حتمی طور پر منسوخ کر دیئے گئے اور ۱۹۲۰ء میں سال شروع ہوتے ہی فجی کے ہر ہندوستانی نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ ۱۹۲۱ء میں یہاں کے ہندوستانیوں کی تعداد (۶۰,۱۶۹) شمار کی گئی تھی۔

مزدور سے آزاد کاشتکار

"سی۔ ایس۔ آر۔ سی" کمپنی کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اس کمپنی نے یہ آسانیاں بہم پہنچانی شروع کیں کہ ہندوستانی زمین لے لیں کہ اس میں گنا پیدا کریں یا تو ٹھیکیداری کے طریقہ پر یا خود کاشت مزارعین کی حیثیت سے۔ ان آسانیوں کی وجہ سے جزائر فجی میں ہندوستانیوں کی حالت کچھ بہتر ہو گئی خاص طور پر کمپنی کی اس سکیم سے یہ آسانی پیدا ہو گئی کہ اس نے ۱۹۱۷ء میں بنے بنائے کھیت ان ہندوستانیوں کی تحویل میں دیدیئے جنکے معاہدہ کا آخری سال آ لگا تھا اور جب یہ مدت بھی ختم ہو گئی تو مستقلاً ان کھیتوں پر انہیں آباد کر دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء میں جب سرخط سسٹم منسوخ ہوا تو اس کمپنی کے کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے کے لئے مزدور ملنے کی بڑی دشواری پیش آئی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں کمپنی نے سو سو ایکڑ زمین کے پلاٹ ہندوستانیوں کی مختلف ٹکڑیوں کو پٹہ پر دینے شروع کئے۔ ۱۹۲۰ء میں ہندوستانیوں نے ہڑتال کر دی اور نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار زمینوں کے پٹے سب کے سب ہندوستانیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ جو کھیت جیسی پیداوار دیتا تھا اس کی مقدار و معیار کے مطابق کمپنی دام لگا کر مال اٹھا لیتی تھی۔ اس طرح فجی میں کمپنی شکر کی واحد اجارہ دار بن گئی اور خوب روپیہ رولا۔ اس وقت اس کے بزنس کا اندازہ (۳۲,۰۰۰,۰۰۰) پونڈ لگایا گیا تھا۔

ان کے علاوہ ایسے بھی سینکڑوں ہندوستانی اس وقت موجود ہیں جنہوں نے یہاں کے دیسی مالکوں سے پٹہ پر براہ راست زمینیں لے رکھی ہیں۔ بعض لوگ برائے نام رقم دیتے ہیں مگر زمینوں پر مالکانہ تصرف حاصل ہے۔ مجموعی طور پر یہاں کے ہندوستانیوں کا ۲/۳ حصہ براہ راست یا بلاواسطہ طور پر شکر سازی کے کام سے اپنی روزی حاصل کر رہا ہے یہاں جتنا گنا پیدا ہوتا ہے اس کا ۲/۳ حصہ بھی ہندوستانی پیدا کرتے ہیں اور ۱۹۴۰ء کے حساب کی رو سے یہاں دس لاکھ ٹن گنا پیدا کیا گیا تھا جس کی قیمت (۳,۵۰۰,۰۰۰) پونڈ تھی۔

کمپنی سے جن ہندوستانیوں نے پٹہ پر زمینیں لی ہیں وہ دس دس ایکڑ کے اوسط میں ہیں۔ اور جو زمینیں یہاں کے دیسی لوگوں سے لی گئی ہیں انکا اوسط (۲½) ایکڑ فی کھیت سے (۱۲) ایکڑ فی کھیت تک ہے۔

کمپنی کے پٹہ دار مجبور ہیں کہ زمین کو ڈھائی ڈھائی ایکڑ کے چار ٹکڑوں میں بانٹ دیں اور ہر قطع زمین پر کمپنی کی ہدایت کے مطابق یہ چیزیں بوئیں۔ ایک قطع پر گنا۔ دوسرے پر ایکھ۔ تیسرے پر مارشیس کی مٹر جو کھاد کیلئے کام میں لائی جاتی ہے اور چوتھے ٹکڑے پر گنے کی پود۔ ان کاشتکاروں کو اسکی بھی پابندی کرنی پڑتی ہے کہ کھیت میں کب پودے لگائے جائیں۔ کب ہل جوتا جائے اور گنے کب اکھاڑے جائیں۔ دیسی لوگوں سے جو زمینیں حاصل کی گئی ہیں وہاں یہ سب قیدیں نہیں ہیں۔ فجی کے دیسیوں سے پٹہ پر لی ہوئی زمینیں ان پابندیوں سے آزاد ہیں۔ لیکن کمپنی کی طرف سے اکثر یہ شرط لگائی جاتی تھی کہ ان کے بتائے ہوئے طریقوں کے خلاف جو گنا پیدا کیا جائیگا اس کو لینے سے کمپنی انکار کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایسا بہت دفعہ کیا گیا

۱۹۴۰ء میں جو زمینیں ہندوستانیوں کے پاس زیر کاشت تھیں اس کا اندازہ (۶۴۰۰) ایکڑ لگایا جاتا ہے۔ یہ زمینیں دیسی لوگوں سے پٹہ پر لی گئی تھیں لیکن سرکاری زمینیں (۲۵۰۰) ایکڑ رقبہ کی تھیں اس کے علاوہ (۲۰۰۰) سے (۳۰,۰۰۰) ایکڑ زمینیں ہندوستانیوں کے پاس مالکانہ حیثیت میں تھیں۔ (۳۳,۰۰۰) ایکڑ زمین ایسی بھی تھی جو سرکاری زمینیں تھیں مگر کمپنی کی نگرانی میں ٹھیکہ پر چلتی تھیں۔ (۵۰۰۰) ایکڑ زمین آزاد مالکان آراضی سے کرایہ پر لے کر ہندوستانی کاشت کرتے تھے غرض مجموعی طور پر ہندوستانیوں کی تحویل میں (۱۰۷,۰۰۰) ایکڑ زمین تھی اور اس کا بڑا حصہ زیر کاشت تھا۔

فجی میں جو ہندوستانی آباد ہیں ان کے مستقبل کا مسئلہ زمین کے مسئلہ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان جزیروں کی زمینوں کا (۸۰) فیصدی حصہ فجی کے لوگوں کا اپنا ہے اور اسے یہاں کی قبائلی املاک سمجھنا چاہیئے۔ بقیہ (۲۰) فیصدی حصہ سرکاری زمین ہے یا سرکار کی طرف سے کمپنی کو دی ہوئی زمینیں ہیں۔ آئندہ کافی عرصہ تک (۸۰) فیصدی ہندوستانیوں کی اگر کوئی معاش یہاں ہو سکتی ہے تو وہ زمین کا ذریعہ ہے۔ ۱۹۰۹ء میں ایک قانون ایسا بنایا گیا کہ دیسی لوگ اپنی زمینیں صرف گورنمنٹ کے ہاتھ بیچ سکیں گے۔ ہندوستانیوں نے اس قانون کی وجہ سے مجبور ہو کر پھر جو بھی زمینیں حاصل کیں وہ سرکار سے حاصل کیں اور

وہ بھی زیادہ تر پٹہ پر جسے مُستاجری طریقۂ زراعت کہنا چاہئے اس موقع پر دیسی مالکان آراضی کی مرضی ضرور حاصل کی جاتی تھی لیکن فی الحقیقت زمینوں کی مستاجری اور لگان کا تقرر ۱۹۳۷ء کے آرڈیننس کے لئے نمبر ۷ اور نمبر ۱۴ کے ماتحت عمل میں آتا ہے۔ یہ آرڈیننس جب پاس کئے گئے تو ہندوستانیوں نے بہت سخت مخالفت کی۔ ان آرڈیننسوں کی وجہ سے فجی کے زمینداروں کو یہ شہ مل گئی کہ ہندوستانی آبارکاروں کو جب چاہیں بیدخل کردیں۔ انہیں رہن کی زمین چھڑانے کی سہولتیں نہ دی گئیں اور عمل درآمد آرڈیننس کی تاریخ سے قبل تک حاوی کردیا گیا۔ اور ان ترقیوں کا جو زمینوں پر یا ان کے گردوپیش میں کی گئیں کوئی خیال نہ رکھا گیا۔ شرائط نہایت کڑی کردی گئیں۔ آرڈیننس نمبر ۱۴ کے بننے سے فجی کے لوگوں کو یہ بھی ترغیب ہوئی کہ وہ اگر چاہیں تو ہندوستانیوں کے پٹے کی تجدید سے انکار کردیں۔ "دیسی زمینوں کا آرڈیننس" اور "دیسی زمینوں کے دخل کا آرڈیننس" یہ دو آئین ایسے بنائے گئے جن کا مقصد محض کمپنی کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنا تھا۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل تھا کہ ہندوستانیوں اور فجی کے مالکان کے دعوؤں میں ثالثانہ فیصلہ کردے مگر عملاً ہوتا یہ تھا کہ وہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے فیصلوں کو ہی بحال رکھتا تھا۔ اور اس قاعدہ سے بھی ہندوستانیوں کو کچھ سہولت نہیں پہنچی۔ غرض ان تمام طریقوں سے ہندوستانیوں کو زمینوں کی مالکانہ حیثیت سے محروم کرنا مقصود تھا اور اس کے لئے مجبور کرنا تھا کہ وہ کمپنی کے صرف زرعی اجیر بنکر زندگی گذاریں۔ (۲۱) سال سے زیادہ کا پٹہ منظور نہیں کیا جاتا تھا اور فجی کے لوگوں کو منع کردیا گیا تھا کہ وہ بغیر گورنمنٹ کی مرضی کے کسی ہندوستانی کے ہاتھ زمین فروخت نہ کریں اور عملی طور پر کوشش یہ کی جاتی تھی کہ ہندوستانی زمین حاصل ہی نہ کرپائیں۔

فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں "دیسی زمینوں کے ٹرسٹ کا آرڈیننس" جاری کیا گیا جس کی رو سے کل نوآبادی کی زمینیں گورنمنٹ کے کنٹرول میں آگئیں۔ زمینوں کا کچھ حصہ محض فجی کے لوگوں کے لئے مخصوص کردیا گیا۔ اور باقی حصہ میں ساری دنیا کو اجازت دے دی گئی اور ان میں ہندوستانیوں کو بھی شریک کرلیا گیا۔ آرڈیننس میں پٹہ کے تمام قواعد وضوابط درج کردئے گئے تھے لیکن پٹوں کی تجدید میں ہمیشہ سخت دشواریاں حائل رہتی ہیں۔

جون ۱۹۴۳ء میں گنے کے کاشتکاروں نے جو زیادہ تر ہندوستانی ہیں یہ مطالبہ کیا کہ ہماری پیداوار کی قیمت زیادہ دی جائے کیونکہ لڑائی کی وجہ سے زندگی بہت مہنگی ہوگئی ہے مگر کمپنی نے یہ مطالبہ نامنظور کردیا۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں حکومت برطانیہ کے "دفتر نوآبادیات" نے ڈاکٹر سی۔ وائی۔ شیپرڈ کو کاشتکاران کی شکایات کی تحقیق کے لئے بھیجا اور انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ انہوں نے سفارش کی کہ جو زمینیں "دیسی زمینوں کے ٹرسٹ بورڈ" کی طرف سے لی گئی ہیں ان کے پٹے ۱۲ سال کے لئے دئے جائیں اور ہر گیارہ سال کے بعد ان کی تجدید کی جائے اور کمپنی کو چاہئے کہ وہ بھی اپنے پٹے مزارعین کو اسی طرح دے۔ نفع کی کافی مقدار کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے یہ بھی سفارش کی کہ گنے کے دام لگانے کے وقت کمپنی کو چاہئے کہ وہ شیرہ کی رقم بھی کل مال کے ساتھ لگائے اور پولیس کو چاہئے کہ وہ کمپنی کی تولنے کی مشینوں کی پڑتال کرتی رہا کرے۔ ہر فصل کے گنے کی قیمت اگلی ۳۱ مارچ تک بیباق کردینی چاہئے۔ قیمت کی ادائیگی کے سلسلہ میں کمی یا بیشی کا حساب آنے والے سال میں طرفین کے لئے قابل مجرا سمجھا جائے

کمپنی کی طرف سے اس کے کھیتوں میں سبزیاں یا دوسری خوراک کی چیزیں بونے کی ہمت افزائی نہیں کی جاتی اور اس بات پر اصرار کیا جاتا ہے کہ صرف گنا ہی اگایا جائے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں کمپنی کی املاک آراضی کی صورت میں (۳۶۰۰۰) ایکڑ شمار کی گئی تھی اور فجی کی برآمد کا ⅔ حصہ صرف چینی پر مشتمل تھا۔ شکر کے بعد دوسرا نمبر چاول کا ہے جو ہندوستانی یہاں پیدا کرتے ہیں۔

چاول کی پیداوار کے لئے نکاسی کا میدان خود وہاں کے سارے ہندوستانی ہیں جن کا من بھاتا کھاجا صرف چاول ہے۔ اس کے علاوہ مکئی۔ روئی۔ "ینگونا"۔ کیلہ۔ تمباکو، وغیرہ بھی یہ لوگ پیدا کرتے ہیں۔ مختلف النوع زراعتوں میں چاول۔ گندم۔ مکئی۔ مرچ اور سامان سبزی کے مختلف قسم کے مسالے بھی یہاں پیدا ہوتے ہیں اور یہ سب چیزیں زیادہ تر ایسی ہیں جو ان کی روزمرہ کی غذاؤں کا جزو ہیں۔ فجی میں زراعت کی پیشہ ورانہ تعلیم کی آسانیاں موجود ہیں مگر وہ صرف فجی کے لوگوں کو دی جاتی ہیں، ہندوستانیوں کو نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندوستانی تو نسلاً بعد نسل کاشتکاری کرتے چلے آئے ہیں انہیں سکھانے کی ضرورت ہی کیا ہے! لیکن یہ بہت سخت غلطی ہے۔ کیونکہ ایسا رویہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نوآبادی کی زرعی آبادی کا ایک بڑا حصہ زراعت کی ٹکنیکل تعلیم اور عملی ہنرمندی کے فائدہ سے بالکل محروم رہیگا اور زراعتی ترقی سن ہوکر رہ جائے گی۔

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر ونظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کرلیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کرلیا جائے۔ علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔ (ادارہ)

پودوں میں مقابلہ

اسلم فاروق فریدی

انسانوں کے برعکس پودوں میں اتحاد حیات کا سراغ نہیں ملتا۔ ہر پودا اپنے ماحول اور توریثی خصوصیات سے اپنا جہاں الگ تعمیر کرتا ہے، اپنی بقا کے لئے خود جد وجہد کرتا ہے اور کسی دوسرے کا شرمندہ احسان ہونا اس کی غیور فطرت کے خلاف ہے، نہ وہ کسی سے مدد طلب کرتا ہے نہ کسی کو پہنچاتا ہے۔ اگر کسی کو مدد پہنچ بھی جائے تو وہ ارادتاً نہیں۔ اسلئے نہیں کہ وہ دوسرے کی مدد کرنا چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی بقا کیلئے جد وجہد کر رہا تھا کہ بالواسطہ غیر ارادی طور پر کسی دوسرے کی مدد ہو گئی اور اس کی خودغرضی میں ہی دوسروں کے لئے سامان بقا نکل آیا۔ آپ غالباً پودوں کے اس فعل کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے ہونگے مگر اپنی بنائی ہوئی اخلاقی قدروں پر آپ کائنات کی ہر شے کو نہیں جانچ سکتے۔ انسان اتحادِ حیات کے لئے فطرتاً مجبور ہے۔ قدرت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ باوجود خودغرضی کے دوسروں سے واسطہ رکھے اور اسی میں اس کی بقا کا راز مضمر ہے۔ مگر پودے قوتِ ارادی سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ جہاں انہیں فطرت اگنے کے لئے حکم دیتی ہے وہ وفادار خادم کی طرح اس کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔ ان کی دنیا ہماری دنیا کے مقابلہ میں محدود ہے۔ ہمارے ان کے اعضا اور فعل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ "تقدیر" کے پابند ہیں ہم آزاد۔ بقول اقبالؒ

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

اگر پودے اپنی بقا کے لئے جد وجہد نہ کریں تو خود فنا ہو جائیں۔ یہ مقابلہ ایک ہی نوع کے افراد میں ہوتا ہے۔ پھر بڑھتے بڑھتے انواع میں شروع ہو جاتا ہے۔ یہ جنگ اسقدر ہولناک ہوتی ہے کہ بیشتر پودے ابد کی نیند سو جاتے ہیں۔ پودوں کی بالواسطہ اور غیر ارادی مدد کی ایک مثال یہ ہے کہ جب مسلسل کاشت سے کھیتوں میں غذائیت یعنی نائٹروجن وغیرہ کی کمی ہو جاتی ہے تو کسان مٹر یا دوسرے پھلیوں دار پودے بوتا ہے جن کی جڑوں میں جراثیم ہوتے ہیں۔ جو فضا سے نائٹروجن جذب کرکے زمین کو بخش دیتے ہیں جسکی وجہ سے آئندہ پھر دوسرے پودوں کی کاشت ہو سکے۔

پودے کے لئے غذا، جگہ، پانی، روشنی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقابلہ انہیں چیزوں کے حصول میں ہوگا۔ سب سے پہلے ہم غذا کے لئے مقابلہ کو لیتے ہیں۔

غذا کیلئے مقابلہ

غذا کے مقابلہ کا سب سے زیادہ مظاہرہ گلی سڑی نامیاتی چیزوں پر اگنے والے سماروغ Fungi (وہ پودے جو اپنی غذا خود نہیں بناتے) کھمبی اور جراثیم میں دیکھا جاتا ہے۔ اگر نامیاتی غذا کی کمی ہے تو وہ پودے جو غذا جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں حاصل کر لیتے ہیں فائدہ میں رہتے ہیں۔ اور باقی نقصان میں۔ اگر غذا ان سب پودوں کے لئے کافی ہے تو یہ مقابلہ نشوونما اور تولد کی دوڑ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہر پودا چاہتا ہے کہ جلد سے جلد بڑھ جائے اور جلد سے جلد اپنی نسل کی افزائش کا سامان کرلے۔ زرخیز مٹی میں ایک ایک تولہ کے اندر دس دس لاکھ جراثیم ہو سکتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد کی وجہ سے ایک تضاد اور کیمیائی جنگ کا چھڑ جانا لازمی ہے۔ کوئی جرثومہ کوئی مادہ لیکر دوسرا خارج کرے گا۔ دوسری قسم کا جرثومہ دوسرے مادہ کو۔ غرض اس طرح سے انواع میں بالواسطہ جنگ شروع ہو جاتی ہے اور ان میں سے بیشتر فنا ہو جاتے ہیں۔ جہاں بہت سے پودے پرورش پا رہے ہوں وہاں آہستہ آہستہ پرورش پانے والے پودے کے حصے میں وہی غذا آتی ہے جو جلدی جلدی نشوونما پانے والے پودے بیکار سمجھ کر چھوڑ جاتے ہیں اور اکثر تو فضا حصہ میں آتا ہے۔ اعلیٰ پودوں میں غذا کا مقابلہ اتنا اہم نہیں رہتا جتنا پانی اور روشنی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی جڑیں اسقدر لمبی ہوتی ہیں کہ دور تک کی غذا کھینچ سکیں۔ ہم انسانوں کی طرح اس مقابلہ کا زیادہ شکار ادنیٰ اور غیر ترقی یافتہ پودے ہوتے ہیں۔

جگہ کیلئے مقابلہ

اگر ایک ہی جگہ بہت سے پودے اگ رہے ہوں تو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ کی قلت کی وجہ سے صحیح نشوونما حاصل کرنے میں ناکام ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مصیبت پانی اور روشنی کی بخشی ہوئی ہوتی ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ پودوں کا قرب ان پر اثر انداز ہو۔ یہی حال "ہوا کے مقابلہ" کا ہے۔

پانی کے لئے مقابلہ

یہ مقابلہ پھول والے اور دوسرے ترقی یافتہ پودوں میں بہ مقابلہ ادنیٰ کے زیادہ نمایاں ہے کیونکہ بڑے پودے اپنے حجم اور ضرورت کی وجہ سے پانی زیادہ چاہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوردبینی ادنیٰ اور غیر ترقی یافتہ پودوں کی تو ذرا سے پانی سے آبیاری ہو سکتی ہے اور تھوڑی سے شاعری کے ساتھ شبنم بھی ان کی پیاس بجھا سکتی ہے۔ ایسے پودے کاہی کی شکل میں اکثر آپ نے دیکھے ہونگے۔ پانی کی قلت کی وجہ سے کھیت میں بہت سے پودے سوکھ جاتے ہیں اس کا مشاہدہ عام ہے۔ اگر کسی تناور درخت کے نیچے چھوٹے چھوٹے پودے بڑی تعداد میں اگ آئیں تو کیونکہ تناور درخت جلدی جلدی تمام پانی ہضم کر جائے گا یہ غریب حسرت سے اس کا منہ دیکھتے ہوئے دوسری دنیا کی امید میں اس عالم فانی سے نامراد کوچ کر جائینگے۔ مزید لطف یہ ہے کہ تناور درخت اپنے اندر ایسے اعضا بھی پیدا کر لیتے ہیں جنمیں غذا اور پانی محفوظ رکھ سکیں تاکہ ضرورت پڑنے پر انکا سرمایہ استعمال میں آسکے۔ ایسے اعضا آلو، پیاز، موٹے موٹے تنوں

اور کانٹوں کی شکل میں آپ نے اکثر دیکھے ہونگے۔ خفیر پودے جو اپنی بدقسمتی کا شکار ہوں اپنے بچاؤ کا سامان اکثر یوں کر لیتے ہیں کہ اپنی عمر کو مختصر سمجھکر جلدی سے بیج پیدا کر لیتے ہیں تاکہ اگر وہ فنا ہو جائیں تو ان کی اولاد تو باقی رہے۔ ایسے کم نصیب پودوں کو تین مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو سرمایہ دار بڑے درختوں کا دوسرے پانی کا بھاپ کی شکل میں اڑ جانا اور تیسرے بقیہ پانی کا زمین کے زیریں طبقات میں پہنچ جانا۔ یہ پودے اپنی جڑیں لمبی کر لیتے ہیں تاکہ تھوڑا بہت پانی تو حاصل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے پودوں کی جو خشکی یا درختوں کے نیچے اگتے ہوں جڑیں مقابلتاً بڑے درختوں سے کافی لمبی ہوتی ہیں۔ درختوں کا تنا اور ہوائی حصہ بڑا ہوتا ہے زیریں اکثر چھوٹا۔ مگر چھوٹے پودوں کا زیریں بڑا ہوتا ہے۔

روشنی کے لئے مقابلہ

اصل میں سبز پودوں کی حیات کا انحصار کلیتہً روشنی پر ہے جب پودے فاصلہ پر ہوں تو ہر پودا چاروں طرف شاخیں بڑھا کر اپنی مرضی کے مطابق روشنی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر جب پودے جھمگٹ میں ہوں تو ان کیلئے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ درخت تو اپنا تنا اونچا لمبا کر کے روشنی حاصل کر لیتے ہیں جیسا کہ جنگلات میں دیکھا گیا ہے مگر جھاڑیوں کی عمر فریاد کرتے ہی گزرتی ہے۔ فطرت نے اس چیز کو دیکھتے ہوئے پودوں کے فعلی نظام میں ایک اور اضافہ کیا اور وہ یہ کہ تاریکی میں پودے بہت لمبے ہو جاتے ہیں۔ آپ نے اکثر اس گھاس کو دیکھا ہوگا جو کسی تاریک کونے میں یا تسلے کے نیچے اگ آتی ہے۔ آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ آلام کی ماری ہوئی زرد رو گھاس روشنی کی تلاش میں اپنے تنے کو بہت ہی لمبا کر لیتی ہے۔ اور کم سے کم غذا میں گذارا کرنے کے لئے اپنی پتیوں کو مختصر اور چھوٹا کر دیتی ہے۔ عموماً تاریکی یا سایہ میں اگنے والے پودوں کے زیریں تنے پر شاخیں اور پتیاں نہیں ہوتیں۔ اس طرح سے وہ اقتصادیات سے کام لیکر اپنے تنوں کو لمبا کر لیتے ہیں۔ اگر کسی تاریک کمرے میں ایک طرف سوراخ سے روشنی آ رہی ہو اور آپ اس کمرے میں ایک گملہ رکھدیں تو پودا فوراً روشنی کی طرف مڑ جائے گا۔

اس سے روشنی کے لئے پودوں کی بے تابی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ سائے میں اگنے والے پودے اس قدر اقتصادیات میں کھو جاتے ہیں کہ اگر وہ روشنی میں اگ آئیں تو فطرت کی اس فیاضی کی تاب نہ لا کر خوشی کی موت مر جاتے ہیں یعنی نشوونما حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جس طرح اگر کسی کنگال کو کہیں سے تاروں کا خزانہ ہاتھ آجائے تو وہ لمحہ جب اس کو خزانہ ملا اس کی زندگی کا آخری لمحہ ہوگا۔ غالب نے اس لئے کہا ہے۔

"توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے"

چنانچہ اگر ہم پودوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بہت سی انواع مقابلہ کی تاب نہ لا کر فنا ہو چکی ہیں۔ مقابلہ میں وہی بقا پاتا ہے جو زیادہ طاقتور ہو جس میں زیادہ صلاحیتیں ہوں اور عقلمند ہو۔ بقول اقبال

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

وہ ضعیف پودے جو "عقلمند" بھی ہوتے ہیں اپنی زندگی کا عنوان ہی بدل ڈالتے ہیں۔ اور دوسروں کے مزار کی اینٹوں سے اپنا محل تعمیر کرتے ہیں۔ یعنی وہ خونخوار اور طفیلی Parasite بن جاتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ خود غذا تیار کریں دوسرے پودوں اور حیوانوں پر اگ کر ان کی تیار کردہ خوراک چرا کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ آپ کے کان میں جب درد ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہ ایک غذا چور پودا ہے جو آپ کو تکلیف دے کر خود مزے کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر خدا نخواستہ آپ کو نمونیہ ہو تو فوراً سمجھ لیجئے کہ ایک ڈاکو نے آپ کے پھیپھڑے پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ نے آکاش بیل (امر بیل) کو دیکھا ہوگا کہ کس مزے سے غریب مہمان کا "خون" چوس چوس کر پرورش پاتی ہے اور اس طرح مہمان پر چھا جاتی ہے کہ غریب پنپ ہی نہیں سکتا۔ ایسے طفیلی پودوں کا علاج سوائے عزرائیل کے کسی کے ہاتھ میں نہیں جب تک یہ ختم نہ کر دیئے جائیں باز نہیں آتے۔ یا پھر ان کا مقابلہ ایسے پودوں (مہمانوں) سے پڑے جو اتنے سخت جان اور کڑوے مزاج کے ہوں کہ ان کو اپنی چیرہ دستیوں کا موقع ہی نہ دیں۔ اگر یہ کوشش کریں تو ان کا وجود بھی باقی نہ رہے۔ آپ نے گیہوں کے پودوں پر سرخ

(بقیہ صفحہ ۵۹ پر)

غزل

مکین احسن کلیم

اجل بھی جن پیچ دار راہوں میں بار ہا رہ گئی ہے تھک کر
گذر گئے بے خطر انہیں سے یہ کشتگانِ حیات اکثر

نہ جانے یہ رات خود ہی اتنی بجھی بجھی اور فسردہ کیوں ہے
یہ آج خاموش و دم بخود سے ہیں کیوں شب افروز ماہ و اختر

سمجھ رہا تھا سکون جسکو وہ صرف اک دورِ بے حسی تھا
اب اور کیا رنگ لائے دیکھیں امید و ارماں کا حسن منظر

تری نظر کے بغیر شاید کبھی وہ جاوید بن نہ سکتا
وہ ایک لمحہ چمک رہا ہے جو آج تک وقت کی جبیں پر

پگھل چلے تیرگی کے آنسو فضا بھی اب کچھ نکھر گئی ہے
وہ پھوٹی وہ کرن سی کانپی اداس ظلمت زدہ افق پر

کلیم اکثر یہ سوچتا ہوں کہ آرزو اسکی میں ذکیوں کی
یہ روز و شب تو گذر ہی جاتے سکون سے یا اداس رہ کر

روس میں تیل کی صنعت

گوربچن سنگھ

گزشتہ صدی کے دوسرے نصف حصہ میں تیل کی پیداوار میں روس دنیا کے تمام ملکوں سے آگے تھا بیسویں صدی کے شروع میں بھی دنیا میں تیل کی کل پیداوار میں روس کا حصہ پچاس اکیاون فی صدی سے کم نہ تھا۔ اس زمانہ میں امریکہ کی ریاستہائے متحدہ دنیا کی کل پیداوار کا صرف اکتالیس فیصدی تیل زمین سے نکال رہا تھا۔ اس وقت سے اب تک دنیا میں تیل کی پیداوار تو بہت زیادہ بڑھ گئی ہے لیکن اس معاملہ میں روس کی رفتار ذرا مدھم رہی ہے۔ اسی وجہ سے ۱۹۴۰ء میں روس امریکہ کی ریاستہائے متحدہ کی پیداوار کے صرف چھٹے حصہ کے برابر اور دنیا کی کل پیداوار کا مشکل سے دس فیصدی تیل نکال سکا۔

موجودہ صدی کے شروع میں روس میں ایک کروڑ ٹن سے زیادہ تیل نکالا گیا، اس میں سے زیادہ تر باکو کے ارد گرد کے علاقہ سے اور تھوڑا سا شمالی کاکیشیا میں گروزنی کے علاقہ سے دستیاب ہوا۔ اگلے بیس سال میں یہ پیداوار ذرا گھٹ گئی چنانچہ ۱۹۱۳ء کی پیداوار ۹٬۲۳۴٬۰۰۰ ٹن تھی۔ اسی طرح انقلاب روس کے شروع زمانے میں تو پیداوار بہت تیزی کے ساتھ گھٹی لیکن ۱۹۲۲ء میں آکر پھر بڑھی اور ۱۹۲۷ء تک تو پچھلی ایک کروڑ ٹن والی پیداوار سے بھی بڑھ گئی۔ ملک میں بڑے پیمانے پر صنعتیں جاری کرنے کی جو پالیسی روس نے اختیار کی اس کی وجہ سے تیل کی پیداوار میں نہایت تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی۔ پہلے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۲۸ء۔۱۹۳۲ء) کے ماتحت یہ پیداوار دوگنی ہو گئی۔ چنانچہ قدرتی گیس کی پیداوار شامل کر کے ۱۹۳۲ء میں کل مقدار ۲۲٬۳۰۰٬۰۰۰ تھی۔

اس ترقی کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان علاقوں میں جہاں سے تیل مل سکتا تھا تیل نکالنے کی پوری پوری کوشش کی گئی لیکن دوسرے پانچ سال والے منصوبہ کے زمانہ سے تیل کی صنعت نمایاں طور پر گھٹ گئی۔ دوسرے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۳۳ء۔۱۹۳۷ء) میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ۱۹۳۲ء کی پیداوار ۲۲٬۳۰۰٬۰۰۰ ٹن تھی ۱۹۳۷ء میں ۴۶٬۸۰۰٬۰۰۰ ٹن تک پہنچایا جائے گا۔ گویا ۱۹۳۲ء کی پیداوار پر ایک سو دس فیصدی کا اضافہ مطلوب تھا لیکن ان پانچ سال میں پیداوار ہوئی صرف ۳۰٬۴۰۰٬۰۰۰ یعنی صرف ۳۶ فیصدی ترقی ہوئی۔ اس طرح منصوبہ میں جتنی مقدار کو مقصد قرار دیا گیا تھا اس کا صرف ۶۵ فی صدی ۱۹۳۷ء میں حاصل کیا جا سکا۔

تیسرے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۳۸ء۔۱۹۴۲ء) کے ماتحت جو کوشش ہوئی اس کے نتائج اور بھی مایوس کن نکلے۔ تجویز کیا گیا تھا کہ تیل کی پیداوار ۲۸٬۴۰۰٬۰۰۰ ٹن سے ۵٬۵۰۰٬۰۰۰ پر لائی جائے گی گویا ۷۶ فیصدی ترقی ہوگی اور گیس کی مقدار ۲٬۰۰۰٬۰۰۰ ٹن سے ۵٬۵۰۰٬۰۰۰ پر لائی جائے یعنی ۱۷۸ فی صدی اضافہ ہوگا گویا تیل اور گیس دونوں کی مجموعی مقدار ۵۴٬۰۰۰٬۰۰۰ تجویز کی گئی تھی جس پر ۷۷ فیصدی اضافہ مطلوب تھا لیکن جس مقدار میں تیل حاصل ہوا اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۴۰ء میں یعنی پنج سالہ منصوبہ کے تیسرے سال تیل کی مقدار ۳۱٬۱۴۷٬۰۰۰ ٹن تک پہونچی گویا تین سال میں صرف ۹٫۷ فیصدی ترقی ہوئی اور قدرتی گیس کی پیداوار کو شامل کر کے کل مقدار ۳۴٬۲۰۰٬۰۰۰ ٹن ہوئی گویا ۱۲٫۵ فیصدی اضافہ ہوا۔

چوتھے پانچ سال والے منصوبہ (۱۹۴۶ - ۱۹۵۰) میں جسے U.S.S.R. کی مجلس اعلیٰ نے ابھی حال میں منظور کیا ہے۔ تجویز کیا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں تیل کی پیداوار ۳۵٬۴۰۰٬۰۰۰ ہونی چاہئے اور قدرتی گیس کی مقدار کو اس وقت تک ۸٫۴ بلین کیوبک میٹر یعنی ۴٬۰۰۰٬۰۰۰ ٹن تک پہونچایا جائے اس طرح دونوں چیزوں یعنی تیل اور گیس کی مجموعی مقدار ۴۳٬۰۰۰٬۰۰۰ ہونی چاہئے۔ یہ مقدار نہ صرف ۱۹۴۲ء والے منصوبہ کی مطلوبہ مقدار سے بہت کم ہے بلکہ ۱۹۳۷ء میں جو مطلوبہ مقدار تھی اس سے بھی کم ہے۔ یہ کمی واقعی ایسی ہے جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور قدرتی طور پر ہمارے سامنے یہ سوال آ جاتا ہے کہ کیا یہ چیز روس کے تیل کے فاضل ذخیروں کے قریب ختم ہونے کی دلیل ہے۔

روسی تیل کے فاضل ذخیرے

روس کے ذخیروں کے متعلق رائیوں میں بکثرت اختلاف ہے۔ ماسکو میں ۱۹۳۷ء میں جو بین الاقوامی جیولاجی کل کانگریس ہوئی تھی اس میں روسیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ سوویٹ یونین میں ۳٫۸۷۷ بلین ٹن تیل کے قدرتی ذخیرے زمین میں موجود ہیں اس کے برخلاف دنیا کے تمام دوسرے ملکوں میں تقریباً ۲ ۳ بلین ہیں اس تخمینے کی رو سے دنیا کے تیل کے ذخیروں میں سوویٹ یونین کا حصہ گویا ۵۵ فیصدی ہے لیکن دوسرے ملک کے ماہروں نے جو تخمینے کئے ہیں اور جو ان اعداد و شمار کی بنیاد پر کئے ہیں جو اسی کانگریس میں پیش ہوئے تھے ان کی رو سے سوویٹ یونین کے پاس صرف ۸۷۷٬۰۰۰٬۰۰۰ ٹن تیل ہے گویا دنیا کے ان تمام ذخیروں کا جو اب تک معلوم کئے جا چکے ہیں ۲۲ فیصدی حصہ روس کے پاس ہے۔ ابھی حال میں یعنی ستمبر ۱۹۴۵ء میں رسالہ ورلڈ پٹرولیم میں جو نقشہ چھپا ہے اس نے تو سوویٹ یونین کے تیل کے ذخیروں کو اور بھی کم

کردیا ہے، وہ کہتا ہے کہ دنیا میں کل محفوظ قدرتی ذخیرے ۶۳۰۰،۷۷،۳ بلیں بیرل ہیں اور ان میں سے سویٹ یونین کے پاس صرف ۵۰۰۷۳۵ بلیں بیرل ہیں۔ اس تخمینہ کی رو سے دنیا کے کل محفوظ قدرتی ذخیروں کا صرف ۹ فیصدی تیل روس کے پاس ہے۔ یونائٹڈ اسٹیٹس بیورو آف مائنز United States Bureau of Mines کے مقرر کردہ اور ان کی رو سے ۵۰۰۷۳۵ بلیں بیرل ۸۷،۰۰۰،۰۰۰ ٹن کے برابر ہوتے ہیں اور یہ مقدار ۱۹۳۶ء والی مطلوبہ مقدار سے ۱۱ فیصدی کم ہے۔ پھر اس معمہ کا حل کیا ہے؟

تیل کے بین الاقوامی اعداد و شمار میں قدرتی ذخیروں کی دو قسمیں کی گئی ہیں ایک تو وہ جو معلوم کئے جا چکے اور دوسرے وہ جن کے برآمد ہونے کا قوی امکان ہے۔ سترھویں بین الاقوامی جیولاجیکل کانگریس میں ارضیات اور تیل کے مشہور روسی ماہر پروفیسر آئی وِن ایم گب کِن Ivon M Gubkin نے دنیا کے تیل کے ذخیروں پر جو اپنی رپورٹ پڑھی تھی اس میں اس بات پر زور دیا تھا کہ یہ تقسیم ان روسی ماہرین ارضیات کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہے جو آئندہ تیل کی صنعت کو ترقی دینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی ضروریات کا تقاضہ ہے کہ قدرتی محفوظ ذخیروں کی قسمیں دو سے زیادہ مقرر کی جائیں۔ روسی ماہرین ارضیات سب سے پہلے ذخیروں کو تین قسموں پر بانٹتے ہیں یعنی اوّل وہ ذخیرے جو دریافت ہو چکے، دوئم وہ جو تیار کئے جا رہے ہیں اور سوئم وہ جو نظر آتے ہیں۔ یہ تینوں قسمیں مجموعی طور پر "صنعتی ذخیروں" کے نام سے پکاری جاتی ہیں اور یہ اس قسم کے ذخیروں میں شمار کی جاتی ہیں جو معلوم کئے جا چکے ہیں۔ روسی ماہرین ارضیات ان قسموں پر دو قسموں کا اور اضافہ کرتے ہیں اور ان کے اندر جو تیل موجود ہے اس کو بھی تخمینہ میں شامل کر لیتے ہیں۔ ان زائد قسموں میں ایک تو وہ ذخیرے ہیں جن کے تیل کی مقدار معین کرنے میں تیل کے علاقوں کی ارضیاتی ساخت کو مدِ نظر رکھا گیا ہے اور دوسرے وہ خطے ہیں جہاں مختلف ارضیاتی اسباب کے ماتحت تیل کا پایا جانا ممکن معلوم ہوتا ہے۔ روسیوں کی مقرر کی ہوئی ان قسموں کا تجزیہ کیا جائے تو پانچویں قسم تو کسی لحاظ سے یقینی ذخیروں میں شمار نہیں کی جا سکتی۔ البتہ چوتھی قسم کو دوسری بین الاقوامی قسم کے برابر سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی اس سے وہ علاقے مراد ہیں جہاں تیل کا پایا جانا ممکن ہے۔ کانگریس کے اجلاس میں پروفیسر گب کِن کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کی مقرر کردہ چوتھی قسم وہ ہے جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سے کچا پٹرول تجارتی اغراض کے لئے کافی بڑی مقدار میں حاصل ہوگا۔ اس لئے اسے ان ذخیروں میں شامل کیا جائے جو یقینی قرار دئے گئے ہیں۔ کانگریس اس نظریہ سے متفق نہ ہوئی۔ البتہ گب کِن کی پہلی تین قسموں کو اس نے تسلیم کر لیا اور ان کو یقینی علاقے قرار دے دیا۔

اس بحث سے یہ بات کھل گئی کہ گب کِن کے تخمینے دوسرے ملکوں کے اُن تخمینوں کے مقابلہ میں جو روسی تیل کے متعلق کئے گئے کیوں اس قدر مبالغہ آمیز ہوتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں گب کِن کا یہ تخمینہ کہ روس کے پاس دنیا کا ۵۵ فیصدی تیل ہے اپنی اسی مفروضہ تقسیم پر مبنی تھا، اسی سال دوسرے ملکوں نے جو روس کے تیل کا تخمینہ لگایا وہ صرف ۲۲ فیصدی نکلا جس طرح گب کِن کا تخمینہ صحیح نہیں معلوم ہوتا اسی طرح اس دوسرے تخمینہ کی صحت میں بھی شبہ کی کافی گنجائش ہے سوویٹ یونین کے یقینی ذخیرے ۱۹۳۷ء میں کم سے کم ۲۵ اور ۳۰ فیصدی کے درمیان تھے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ روسیوں کی چوتھی تقسیم کا کچھ حصہ بین الاقوامی پہلی تقسیم کے ماتحت آتا ہے اور یقینی ذخیروں میں شمار کیا جا سکتا ہے تو روس کے قدرتی ذخیروں کی مقدار یقیناً بہت بڑھ جائیگی ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان روسی ماہرین ارضیات نے تیل کے علاقوں کی بہت چھان بین کی اور وہ اپنی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں کاکیشیا کے علاقہ میں ذرا کم اور کاکیشیا سے باہر بہت زیادہ کوشش ہوئی کہ تیل کے ذخیرے برآمد کئے جائیں اور اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی بھی ہوئی۔ ابھی حال میں تیل کی صنعت کے روسی کمشنر نکولائی بائے بے کو Nikolai Baibakov

طالعِ افسردہ! ــ قاضی سلیم

جگنو کی سی لَو دیتے ہیں لمحات گذشتہ
پر طالعِ افسردہ دمکتا ہی نہیں ہے
یوں قبر پہ حسرت کی تو ہوتا ہے چراغاں
پر شعلۂ امید بھڑکتا ہی نہیں ہے

کیا عیشِ شبانہ کی یہ پُر کیف کسک ہے
مدہوش دلِ زار دھڑکتا ہی نہیں ہے
بے خواب نگاہوں میں ستاروں کی جھلک ہے
پر نورِ سحر ان میں دمکتا ہی نہیں ہے

کیوں تیرے تصور کا حسیں آتشی پیکر
اب دیدۂ نمناک سے ہٹتا ہی نہیں ہے
مستقبلِ موہوم پہ چھائے ہیں دھندلے
بادلِ غمِ ہجراں کا یہ چھٹتا ہی نہیں ہے

جگنو کی سی لَو دیتے ہیں لمحات گذشتہ

نے ایک موقع پر کہا کہ تیل کے قدرتی ذخیروں کے لحاظ سے سوویٹ یونین دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ محض جنگ کے چار سال میں روس نے تیل اور گیس کے ۴۲ نئے علاقے دریافت کئے۔ اور جنگ سے پہلے کے بیس سال میں ۸۳ علاقے دریافت کئے گئے تھے۔ جنگ کے زمانہ میں جو نئے ذخیرے دریافت ہوئے وہ مالوٹوف کے صوبہ میں پائے گئے ہیں اور داغستان (شمالی کاکیشیا) وسط ایشیا اور سکھالن وغیرہ میں برآمد ہوئے ہیں۔ ان نئے ذخیروں کی وجہ سے سوویٹ یونین کے محفوظ تیل کی کل مقدار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔"

اس طرح آج روس کے یقینی ذخیرے اُس تعداد سے کافی زیادہ ہیں۔ جو سترھویں بین الاقوامی جیولاجی کل کانگریس کے وقت تھی۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا کے باقی حصے کے ذخیروں میں جو اضافہ ہوا ہے اس کے مقابلہ میں روس کا اضافہ اب بھی کم ہے۔ لیکن یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں کہ ان کی تعداد دنیا کے کل تعداد کا پندرہ یا بیس فی صدی ہے۔

یہاں ہمیں ایک چیز اور بھی سامنے رکھنی چاہئیے۔ کسی ملک کی معدنی دولت محض وہ چیزیں نہیں ہوتی ہیں۔ جو زمین سے برآمد ہوچکیں بلکہ اس میں وہ چیزیں بھی شمار کی جاسکتی ہیں۔ جو زمین کے سینہ کے اندر محفوظ ہیں۔ اور آئندہ برآمد ہونگی۔ اس لحاظ سے سوویٹ یونین کے پاس یقینی طور پر دنیا کے ہر ملک سے زیادہ تیل ہے۔

روس کے تیل والے علاقے

روس کے سامنے تیل کا جو مسئلہ ہے۔ وہ یہ نہیں کہ ملک میں تیل کی کمی ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ قدرتی ذخیروں کو کس طرح صنعتی کام میں لایا جائے۔ اور یہ مسئلہ اصل میں جغرافیہ کا مسئلہ ہے۔ سوویٹ یونین کا خاص تیل والا علاقہ ٹرانس کاکیشیا میں سوویٹ یونین کی جنوبی سرحد کی جانب کیسپین کے کنارے باکو کے نزدیک واقع ہے۔ یہ علاقہ ملک کے خاص صنعتی شہروں سے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ باکو اور خارکوف کے درمیان کا فاصلہ ۲،۰۸۰ کلومیٹر ہے۔ باکو اور ماسکو کا درمیانی فاصلہ ۲،۵۵۰ کلومیٹر باکو اور لینن گراڈ کا ۳،۲۰۱ کلومیٹر ہے۔ حالانکہ تیل کے ایسے علاقے جن میں کافی بڑی مقدار میں تیل محفوظ ہے۔ باکو کے علاقہ سے باہر دریافت کئے جاچکے ہیں۔ پھر بھی سوویٹ روس کو باکو ہی سے تیل کی بنی ہوئی دوسری چیزیں منگانی پڑتی ہیں۔ باکو کا یہ علاقہ اصل میں ملک کے ایک ایسے حصہ کا جز ہے۔ جہاں بے انتہا تیل کے چشمے پائے جاتے ہیں جنوب مشرق کی طرف یہ علاقہ بحر کیسپین کے نیچے ترکمنستان کے صحرا تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام علاقے کے جغرافی حالات حد درجہ ناموافق ہیں۔ اور روسیوں کو تیل نکالنے کے لئے ان حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ترکمنستان سے مشرق کی طرف تاجیکستان اور جنوبی ازبکستان کے پہاڑی علاقہ تک تیل کے چشمے پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر تیل کے اعلیٰ درجہ کے چشمے اس تمام پہاڑی علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جو شمالی کاکیشیا میں باکو کے علاقہ کے شمال اور شمال مغرب میں واقع ہے۔ اور جہاں گروزنی اور میکاپ کے چشمے اور بحر کیسپین کے ساحل پر مکھاچ کلا کے ذخیرے ابھی جنگ کے زمانہ میں برآمد ہوئے ہیں۔

وہ تیل کے چشمے جو یورال کی جانب بحر کیسپین کے شمال اور شمال مشرق میں واقع ہیں۔ ایمبا کے علاقہ کے چشمے کہلاتے ہیں۔ یہ چشمے اور والگا کے نیچے کے حصہ پر جو گیس کے ذخیرے ہیں ارضیاتی نقطۂ نظر سے کاکیشیا کے ذخیروں کا سلسلہ ہیں۔ گذشتہ پندرہ سال میں یورال اور وسطی والگا کے علاقہ اور یورال کے پورے مغربی ڈھال پر نہایت کارآمد تیل کے چشمے برآمد ہوئے ہیں۔ اس نئی دریافت کے پیش نظر یورال اور وسطی والگا کے درمیان کے اس وسیع علاقہ کو جس میں جابجا تیل اور گیس کے چشمے ہیں" دوسرا باکو کہا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس علاقہ کے اندر تین مقامات پر نہایت کارآمد اور بڑے چشمے برآمد ہوئے ہیں۔ یہ چشمے والگا پر کیوبی شیو Kieubyshev کے نزدیک وسط یورال میں یوفا Ufa کے نزدیک اور شمالی یورال میں سیورو کے مسک Sevrokemsk کے نزدیک واقع ہیں۔ کیوبی شیو Kuibyshev اور بالخصوص سارتوف Sarotov کے نزدیک گیس کے جو بڑے بڑے ذخیرے برآمد ہوئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں تیل کے بھی بڑے بڑے ذخیرے ضرور موجود ہوں گے۔ ساروتوف کے گیس کے ذخیرے ۱۹۴۱ء میں دریافت کئے گئے اور ۱۹۴۶ء کے موسم بہار میں ساروتوف سے ماسکو تک ۸۴۳ کلومیٹر لمبی گیس کی پائپ لائن بنائی گئی ہے تخمینہ یہ ہے کہ ساروتوف کا یہ گیس والا ذخیرہ ہر سال ۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰ کیوبک میٹر قدرتی گیس پیدا کرے گا۔

ان ذخیروں کے علاوہ سوویٹ یونین کے تیل کے چشمے پیسفک خطے میں بھی ہیں۔ جو گم چٹکا، سکھالین اور دوسرے مقامات پر واقع ہیں۔ بحر آرکٹک کے کنارے سائبریا کے ساحل پر بھی تیل کے چشمے برآمد ہونے کی امید کی جارہی ہے۔ ملک میں مشینوں کی صنعت جاری کرنے اور بالخصوص زراعت کو مکانکی بنانے کی کوشش نے سوویٹ یونین کے ہر حصہ میں تیل کی مانگ بڑھادی ہے۔ پھر بھی یہی دور دراز علاقہ یعنی کاکیشیا تمام حصوں کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ روس میں تیل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے میں پائپ لائن کو کچھ زیادہ دخل نہیں۔ تیل اور تیل کی مصنوعات ریل کے ذریعہ سے لے جائی جاتی ہیں۔ ریلوں پر ان چیزوں کی کھنچائی کا اوسط خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے ۱۹۱۳ء

سے ۱۹۲۶ء تک یہ اوسط ۶۰۱ کلومیٹر سے ۲۸ ۷ تک تھا۔ لیکن ۱۹۳۶ء تک ترقی کرتے کرتے ۲۲۸ ۷ کلومیٹر تک پہنچا۔

روس کے اقتصادیات کے ماہر مدت سے یہ محسوس کر رہے ہیں۔ کہ جغرافیائی حالات کو سامنے رکھ کر تیل کی صنعت کو ملک پر دوبارہ تقسیم کرنا نہایت ضروری ہے۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کی رو سے جس میں ہر موقع پر اعتدال کو مدِنظر رکھا گیا تھا۔ کاکیشیا سے باہر کے علاقوں میں تیل کی پیداوار کو ۷۰۱ فی صدی سے ۱۱۰۲ تک ترقی دینا تجویز کیا گیا تھا۔ پیشتر پنج سالہ منصوبہ میں اسے ۲۵۰۲ تک پہنچایا گیا۔ لیکن اس سب کے باوجود ۱۹۴۰ء میں جو تیل نکالا گیا اس کا نوے فی صدی کاکیشیا ہی کے علاقوں سے نکالا گیا تھا۔

روسی تیل پر جنگ کا بہت خراب اثر پڑا۔ شمالی کاکیشیا میں میکاپ اور گروزنی والے تیل کے علاقے جہاں سے ملک کی کل پیداوار کا ۱۵ فی صدی تیل حاصل ہوتا تھا۔ یا تو جرمنوں کے قبضہ میں چلے گئے یا بمباری کا نشانہ بنے دونوں علاقوں میں تیل کی صنعت بڑی حد تک برباد ہو گئی۔ اسی جنگ کے دوران میں ایک موقع ایسا بھی آیا کہ خیال تھا دشمن کا باکو پر قبضہ ہو جائے گا اور باکو ملک کے باقی حصّے سے الگ ہو جائیگا۔ چنانچہ کنوئیں کھودنے کی اکثر مشین اور کھودنے والے عملہ کے لوگ ایسے علاقوں کو منتقل کر دئے گئے جہاں نسبتاً خطرہ کم تھا۔ باکو کے ان علاقوں کا جہاں تیل نکالنے کی تیاری ہو رہی تھی۔ بڑا حصّہ جنگ کے زمانہ میں برباد ہو گیا اور باکو کی تیل کی پیداوار بہت گھٹ گئی اگرچہ "دوسرے باکو" اور وسط ایشیا کے علاقوں میں تیل کی پیداوار کو بڑھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس سے اس نقصان کی تلافی نہ ہو سکی۔ جو کاکیشیا کے علاقہ میں ہوا تھا۔ اور گو جنگ کے ختم ہونے سے پہلے گروزنی اور میکاپ کے علاقوں کی صنعت روس کے پاس آ گئی تھی پھر بھی جس وقت جنگ ختم ہوئی ہے تو روس کی تیل کی پیداوار بہت ہی کم تھی۔

۱۹۴۵ء کی پیداوار کی صحیح مقدار تو معلوم نہ ہو سکی۔ البتہ چوتھے پانچ سال والے منصوبے میں ۱۹۵۰ء کے لئے جو مقدار تجویز کی گئی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ۱۹۴۵ء کی مقدار بہت کم ہے۔ اس نئے منصوبے کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوشش کی گئی ہے کہ تیل کی صنعت کا جغرافیائی محل و توع بدلا جائے۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۶ء کو ازدیستیا میں جو اسکیم چھپی ہے۔ اس میں یو ایس ایس آر کے لئے مجموعی اعداد کے ساتھ ساتھ اس کو ہر جمہوریہ کے لئے الگ الگ اعداد دیئے گئے ہیں۔ چونکہ شمالی کاکیشیا کے علاقے روسی جمہوریہ (آر ایس ایف ایس آر) کا حصّہ ہیں۔ اور اس حصّہ کے لئے الگ اعداد نہیں شائع ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ بتانا ناممکن ہے۔ کہ سوویٹ یونین کی کل پیداوار میں کاکیشیا کے تیل والے علاقوں کا کیا حصّہ ہو گا۔ سوویٹ پریس کی خبروں سے اتنا پتہ ضرور لگتا ہے کہ منصوبہ کی تجاویز کی رو سے شمالی کاکیشیا میں نہ صرف یہ کہ پیداوار کو جنگ سے پہلے والی مقدار تک پہنچانے کی کوشش کی جائیگی۔ بلکہ اس میں کچھ اضافہ بھی کیا جائیگا۔ آذربائیجان کی جمہوریہ کے باکو والے علاقے میں ۱۹۵۰ء کے لئے تیل کی جو مطلوبہ مقدار ہے وہ صرف ۱۷۰۰۰۰۰۰ ٹن ہے حالانکہ ۱۹۳۸ء میں اس علاقہ نے ۲۴۰۰۰۰۰۰ ٹن تیل اور گیس پیدا کی جس میں ۲۲۰۰۰۰۰۰ اکیلا تیل تھا۔ سوویٹ یونین کی تیل کی کل پیداوار میں آذربائیجان کے ذخیروں کی پیداوار ۱۹۳۸ء میں ۷۴۰۴ فیصدی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے لئے اسے گھٹا کر ۴۷۰۹ کر دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے روسی (آر ایس ایف ایس آر) تیل کے علاقوں کی جن میں شمالی کاکیشیا بھی شامل ہے۔ مقدار ۴۰۰۹ فی صدی تک بڑھا دی گئی ہے اور ترکمنستان کی جمہوریہ کی مقدار میں ۲۰۱ فی صدی اور ازبکستان کی جمہوریہ میں ۲ فیصدی کا اضافہ کیا گیا ہے۔

نئے کنوئیں کھودنے کی جو اسکیم ہے۔ اس کو دیکھنے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام رجحان اسی طرف ہے کہ سوویٹ کی تیل کی صنعت ان علاقوں میں جاری کی جائے جو ایسے علاقوں سے نزدیک ہوں جہاں تیل کی مانگ ہے ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک جو نئے کنوئیں تیار کئے جائیں گے ان کی مجموعی تعداد ۲۷۰۱۱ ہے اسکیم میں ان کوئیوں کو سات ان جمہوریوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔ جہاں تیل پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یوں ہے ۸۰۵ و ۵ کنوئیں روسی جمہوریہ میں، ۲۴۰۰ و ۲ وسط ایشیا کی تینوں جمہوریوں "ازبکستان، ترکمنستان اور کازاخ میں، ۶۶۰ و ۲ آذربیجان میں، ۲۴۰ جیارجیا میں اور ۲۲۵ یکرین میں (اسکیم میں وسط ایشیا کی ان دو جمہوریوں کے لئے جہاں تیل پیدا ہوتا ہے۔ کوئی اعداد نہیں تجویز کئے گئے)

سر عبدالقادر

بقیہ صفحہ ۵

نمائندے اور ایک دفعہ پھر ہائی کورٹ کے جج اور بھاولپور کے چیف جسٹس ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے رسالہ مخزن جاری کیا جو اردو کی جریدہ نگاری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مخزن میں آپ نے ہندوستان کے ہر مذہب و ملت اور ہر قسم کے عقائد کے لوگوں کے مضامین شائع کئے۔ اردو ادب کے محسنوں میں آپ کا نام ہمیشہ نہایت عزت کے ساتھ لیا جائے گا۔

لیکن یہ سب کچھ میں نے ایڈیٹر صاحب کے اصرار پر لکھ دیا ہے۔ میرے نزدیک اور میرے دل میں سر عبدالقادر کی شخصیت کا درجہ ایک منتقل ادارے کی حیثیت سے قائم ہے اور قائم رہیگا۔ اور یہ وہ ہمہ رنگ ادارہ ہے جس کا تعلق دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل سے ہے۔ اپنے ملک میں اقبال جیسے لاثانی اور لافانی شاعر کو اپنے مقصدِ زندگی کی اہمیت سمجھنے میں مدد دی ہے۔ تفصیل عرض کروں تو بات کہاں کی کہاں پہنچے۔ اس لئے اجازت چاہتا ہوں۔

نقد و نظر

جامعہ (جوبلی نمبر) صفحات ۲۱۶، قیمت ۔۔۔ رسالہ جامعہ اردو کے ان چند رسالوں میں سے ہے جنہوں نے خالص علمی اور ادبی خدمت کو اپنا مسلک بنایا اور شروع ہی سے ہر حال میں اپنے مسلک پر چلنے کو اپنا فریضہ جانا ہے۔ جامعہ کے ابتدائی دور میں اس میں کئی ایسے مضامین شائع ہوئے جنکی حیثیت اردو ادب کی مختلف صنفوں میں تاریخی سی ہے۔ پریم چند کا افسانہ، کفن، سب سے پہلے جامعہ، ہی میں شائع ہوا تھا۔ ملک کے بعض بہت اچھے لکھنے والوں کے بہترین شاہکار پہلے پہل جامعہ ہی میں چھپے۔

لیکن پچھلے چند برسوں میں جامعہ کا برابر معیار گرتا رہا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ اب بھی جامعہ کے اہل قلم کا حلقہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے ہر ادبی حلقہ کے مقابلہ میں زیادہ وجیہہ اور زیادہ بھاری بھرکم ہے، اور اس حلقہ میں رہنے والوں کی آواز علمی، ادبی اور تعلیمی مسائل میں سب سے زیادہ وقیع اور اہم سمجھی جاتی ہے، جامعہ، کا یہ تنزل مایوس کن بھی تھا اور حیرت خیز بھی۔ لیکن جامعہ کے اس جوبلی نمبر نے بڑی حد تک اپنی پچھلی کوتاہیوں کی تلافی کر دی ہے۔ اور اس میں خود جامعہ کے چوٹی کے لکھنے والوں (ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب) کے علاوہ خواجہ غلام السیدین صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب اور سجاد مرزا صاحب جیسے مفکر اصحاب قلم کے مضامین شامل ہیں۔ سیدین صاحب کا مضمون، تعلیم اور ایک نئے معاشرے کی تعمیر، ڈاکٹر عابد حسین کا مضمون، ہندوستان میں انگریزی تہذیب و تعلیم، پروفیسر مجیب کا مضمون تعلیم اور جماعتی کام، ڈاکٹر رضی الدین کا مضمون تعلیم و تربیت کا مقصد اور نصب العین، سجاد مرزا صاحب کا مضمون ہندوستان کی عام زبان کیا ہو؟ کئی حیثیتوں سے بے حد اہم مضامین ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ ہماری موجودہ تعلیمی علمی اور قومی زندگی کی بعض بڑی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں ہماری رہبری کرتے ہیں اور ہمیں فکر اور عمل کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی مضامین یعنی سید انصاری صاحب کا مضمون بنیادی تعلیم، سلامت اللہ صاحب کا مضمون سوویت یونین کا نظام تعلیم اور پروفیسر عبدالغفور صاحب کا مضمون ہندوستان کی تعلیمی تحریکیں، تعلیمی مسائل پر بعض بہت ضروری اور مفید معلومات کا خزانہ ہیں۔ آخر میں ادارہ کی طرف سے شامل کیا ہوا طویل مضمون نئی تعلیم اور نئے مدرسے، بھی نئی تعلیم اور نئے مدرسوں پر ایک جامع تبصرہ ہے۔ اور اس طرح یہ خاص نمبر ہمارے تعلیمی مسائل اور حقائق کا ایک اچھا خاصا انسائیکلوپیڈیا بن گیا ہے ــــ ایک ایسا انسائیکلوپیڈیا جس میں ہر جگہ ادبی روایات کی پاسبانی بھی کی گئی ہے خدا کرے یہ خاص نمبر جامعہ کو اس کی پچھلی روایتوں کی طرف لے جانے کا پیش خیمہ بن سکے۔

جوہر جامعہ جوبلی نمبر۔ ضخامت ۳۱۹ صفحات۔ جامعہ ملیہ کے کالج کے طلبا ہر مہینے اپنا ایک الگ رسالہ نکالتے ہیں۔ جوبلی کے موقع پر اس رسالہ کا خاص نمبر نکلا ہے۔ اس ضخیم خاص نمبر کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں جامعہ سے متعلق مضامین ہیں، دوسرے حصہ میں جامعہ کی خاص خاص شخصیتوں پر مضامین اور نظمیں ہیں تیسرے حصہ میں یادِ رفتگاں، کے نام سے بعض شخصی مضامین ہیں جن میں مرنے والوں، کی یاد ہے۔ یوں تو اس رسالہ کے تینوں حصے ادبی حیثیت سے اہم ہیں لیکن پہلا حصہ ان تینوں حصوں میں زیادہ اہم ہے۔ اس حصہ میں کئی مضامین اس لئے اہم ہیں کہ ان سے جامعہ کے تعلیمی تجربہ کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے اور وہ ہماری پچیس سالہ سیاسی، تمدنی اور قومی زندگی کا آئینہ ہیں۔ جامعہ کا سیاسی پس منظر جامعہ کا تمدنی پس منظر اور جامعہ کے تعلیمی اور سیاسی محرکات اسی طرح کے مضامین ہیں۔ خود جامعہ سے متعلق ڈاکٹر عابد حسین، خواجہ غلام السیدین صاحب، پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر محمد عاقل کے مضامین کا مطالعہ بصیرت افروز ہے۔

جوہر اس سے پہلے بھی اپنے خاص نمبر نکالتا رہا ہے لیکن اہمیت اور افادیت میں اس کا پایہ پچھلے نمبروں سے بھاری ہے۔ اسکی ترتیب و تدوین میں بھی نسبتاً زیادہ توجہ اور محنت سے کام کیا گیا ہے۔ جس رسالہ میں ذاکر صاحب، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب، خواجہ غلام السیدین، پروفیسر آل احمد سرور، قاضی عبدالغفار، اور مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے صاحب طرز لکھنے والوں کے مضامین ہوں اسکی ادبی حیثیت تو یوں بھی مسلم ہے لیکن جب مضمونوں میں لکھنے والوں کی شخصیتوں کا پورا خلوص رچا بسا ہوا ہو تو ان میں شاہکاروں کی سی خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس رسالہ کے کئی مضمون اس خصوصیت کی حد سے بہت قریب ہیں۔

پیامِ تعلیم (جوبلی نمبر) ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ بچوں کا یہ دلفریب رسالہ بھی جامعہ سے متعلق ہے۔ اور اس کا یہ خاص نمبر بھی جامعہ کی جوبلی کی تقریب کے خاص موقع کی یادگار میں نکالا گیا ہے۔ اس ضخیم نمبر میں بچوں کی تفریح، دلچسپی اور معلومات کے بہت سے اچھے اچھے مضامین، نظمیں اور کارٹون ہیں۔ بچوں کے مشہور لکھنے والوں میں سے ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، ابوطاہر داؤد صاحب پروفیسر عبدالغفور صاحب، الیاس حبیبی صاحب، شفیع الدین نیر صاحب جیسے لکھنے والوں کے مضامین اس رسالہ میں ہیں۔ دلچسپ معلوماتی اور سبق آموز۔

نظموں کا حصہ کچھ زیادہ اچھا نہیں اور بعض مضامین بھی ایسے ہیں جنہیں لکھتے وقت شاید پڑھنے والوں کے ذہنی معیار کو سامنے نہیں رکھا گیا۔

پودوں میں مقابلہ ــــــ بقیہ صفحہ ۵۴

سرخ دھبے دیکھے ہوں گے جن میں دیہاتی "رتوا" اور شہری "زنگار" کہتے ہیں یہ دھبے ایک طفیلی پودے کی وجہ سے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہندوستان کا تقریباً دسواں حصہ گیہوں کا بیکار ہو جاتا ہے، اکثر تو کھیت کے کھیت ہی صاف ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ایسے قسم کے گیہوں کی کاشت کی جائے جو سخت مزاج ہو اور جس پر اس کا حملہ ناکام ہو کر رہ جائے۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ شب ہائے رفتہ .... جناب اختر شیرانی ......

۲۔ تبرکات .... حضرت محمود شیرانی مرحوم ....

۳۔ حافظ محمود شیرانی (مع تصویر) .... پروفیسر ادیس احمد ادیب ....

۴۔ چھینک (روسی افسانہ) ...... جناب بشیر الدین ......

۵۔ میر شیر علی افسوس .... پروفیسر ڈاکٹر سید اظہر علی ......

۶۔ فرانسیسی افسانے اور رومانی فطرت نگاری (۲) ..... نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

۷۔ یونسکو کانفرنس .... جناب آغا محمد اشرف (پیرس)

۸۔ سچی کہانی (افسانہ) ...... جناب صادق قریشی ......

۹۔ نواب سعد اللہ خاں .... جناب نور احمد خاں فریدی ......

۱۰۔ جواری (افسانہ) .... جناب غلام عباس ....

۱۱۔ لیبیا کی قومی تحریک .... جناب قاسم حسن ....

۱۲۔ بے بس (افسانہ) .... محترمہ نسیمہ زہرا قزلباش ....

۱۳۔ فجی میں ہندوستانی (۲) ..... پنڈت رام لال ....

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا۔
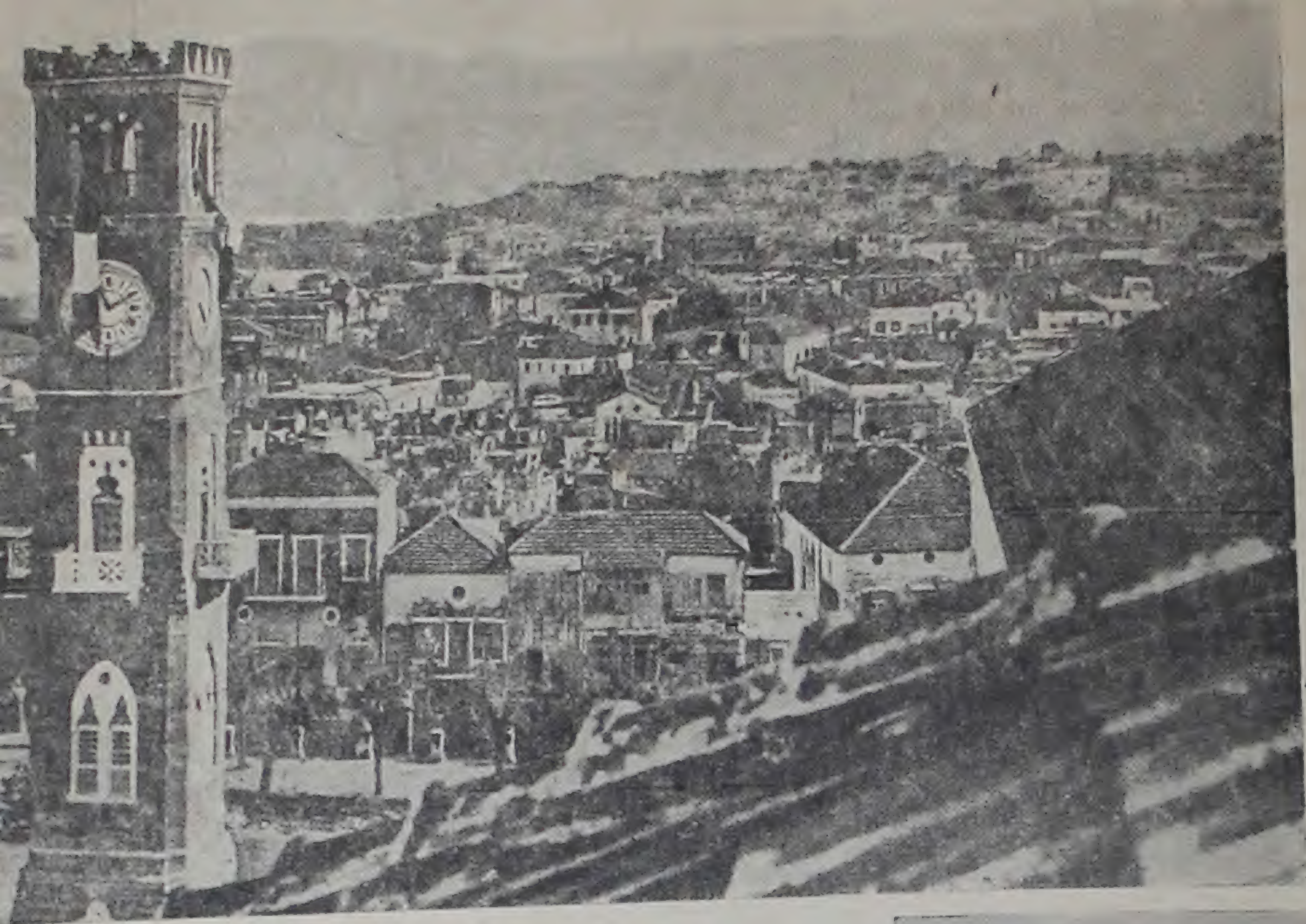
لبنان

بیروت لبنان کی پرشکوہ ثقافت کا مرکز ہے۔ پس منظر
صدیوں پرانے شہر کا ایک حصہ نظر آرہا ہے۔ لیکن
حصے میں بنا ہوا گھنٹہ گھر جدید طرز تعمیر کا ایک
نمونہ ہے۔

→
بیروت کا ایک حسین منظر۔ بندرگاہ کے
قریب کی ہر تعمیر جدید وضع کی ہے۔

بندرگاہ بیروت پر ساحل
کے قریب کا نظارہ۔ ←

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	-	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں - ایک سو اسی صفحات - دو نقشے - کپڑے کی جلد - قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) -

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) -

خاص رعایت «عربی - انگریزی جملے» نوے صفحات - گتے کی جلد - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ - کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ -

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد - قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) -

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ - پوسٹ بکس نمبر ۱٦٦ - دھلی

آجکل

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
نیپال
ہندوستان
عربستان
مصر
برما

پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب محمود شیرانی (مرحوم)

آپ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی کے عالم و فاضل ہونے کے علاوہ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ پچھلے سال موت کے ظالم ہاتھوں نے آپکو ہم سے جدا کردیا۔ آپکا نمونۂ کلام اسی شمارے کے صفحہ ۸ اور مفصل حالات صفحہ ۱۰ ... ملاحظہ کیجئے

نئی ادبی مطبُوعات

شیشہ و سنگ۔ مصنفہ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی۔ بارہ اصلاحی، معاشرتی اور اخلاقی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ لکھنوی زبان میں بہترین تصنیف۔ قیمت مجلد عہ

اتفاقات۔ مرزا فدا علی خنجر لکھنوی۔ یہ مرزا صاحب کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں رومانوی اور معاشرتی زندگی کے اتفاقات کو بہترین پیرایہ اور پاکیزہ زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

اردو زبان اور ہندو۔ مصنفہ ناظم سیوہاروی۔ اردو زبان کی ترقی و سربلندی میں ہندو اہلِ وطن نے جو بے بہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس کتاب میں ان کی خدمات و حالاتِ زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ عہ

تاریخ انقلاب روس۔ مصنفہ شبیر جنگ۔ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی ردوبدل کی روح فرسا تاریخ جو ایک سیاسی مصنف کی طویل جدوجہد اور کدوکاوش کا بہترین مرقع ہے موجودہ تمام تاریخوں سے کامیاب و کامل کتاب ہے قیمت چار روپے آٹھ آنے للعہ

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات۔ مصنفہ شبیر جنگ۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سُنا اور اسے اپنے نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شبیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔ تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت مجلد سے

اوراقِ پارینہ۔ از شبیر جنگ۔ ایک انقلابی قیدی۔ وہ بھی ادیب۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف۔ معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنیت کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ۔ قیمت عہ۔

ادبستان۔ حضرت مولٰینا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ۔ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ تیسرا ایڈیشن قیمت دو روپے آٹھ آنے عہ

دلیس سے باہر:۔ آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی ادبی مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ لندن سے آداب عرض کی مقبولیت اس امر کی ضامن ہے۔ کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ قیمت دو روپے۔ عہ۔

لندن سے آداب عرض۔ آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے . . . . ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو حاذقت میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن عہ

قرآنی اخلاق۔ انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت عہ۔

کمال اتاترک مسیحائے ترکی مصطفٰے کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرزِ بیان سے مزین فرمائے ہیں جس کی وجہ سے "کمال اتاترک" موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اس کا پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے سے ؛

بہترین اخلاقی افسانے

- **سازِ فطرت۔** از حسن عزیز جاوید . . عہ
- **قسمت** دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے عہ
- **نیلوفر۔** دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ عہ
- **صبر و ضبط** معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ عہ

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی، اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سیپارے بھی شائع ہوتے ہیں ؛

ملنے کا پتہ:۔ **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشرانِ کُتب۔ کِتاب منزل کشمیری بازار لاہور**

آج

اردو کا پندرہ روزہ

سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۷ | یکم فروری ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم اے

نائب مدیران
فضل حق قریشی دھلوی = بھگت سروپ کھلر ایم اے = سید آفاق حسین آفاق بی اے

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۲۶ دھلی

رفتارِ زمانہ

سیّاروں میں امکانِ حیات

دہلی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام جو سائنس کانگریس جنوری کے پہلے ہفتے میں منعقد ہوئی، نہایت دلچسپ اور مفید ثابت ہوئی۔ اس میں دنیا کے بہت سے ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ سائنسی تقریروں کے علاوہ ایک نمائش بھی ہوئی جو ہندوستان کے لئے بالکل نئی اور تاریخ میں پہلی مثال تھی۔ اس کی ایک نشست میں برطانیہ کے شاہی منجم سر ہیرلڈ اسپنسر جونز کی تقریر جسکا موضوع "سیاروں میں امکانِ حیات" تھا، سب سے زیادہ جاذبِ توجہ رہی۔ ان کا خیال ہے کہ بہت سے سیّاروں میں زندگی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اگرچہ اسکا ثبوت فی الحال نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تحقیقات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، تاہم یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ بعض سیّاروں میں زندگی کے امکانات پیدا کرنے والے حالات موجود ہیں اور صرف اسی سے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں اسکا وجود ممکن ہے۔ انہوں نے بتایا کہ فضا میں تقریباً دس کروڑ نظام ہائے شمسی قائم ہیں اور ان میں سے ہر نظام کے ماتحت اربوں سیّارے گردش کرتے ہیں۔ دنیا والے زیادہ سے زیادہ اپنے نظامِ شمسی کے تاروں اور سیّاروں کی بابت کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں کیونکہ بڑی سے بڑی دوربین بھی اس حد سے آگے بڑھ کر ان چیزوں کو واضح طور پر نہیں دکھا سکتی جو فی الوقت دھندلی سی نظر آتی ہیں۔ اس اجلاس کی صدارت مسٹر لیاقت علی خاں (وزیر مالیات) فرما رہے تھے۔ انہوں نے سر جونز کی تقریر پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا "اس تقریر سے ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے ہیں کہ زندگی فضائی کیفیات پر منحصر ہے۔ اس لئے ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ وہ تمام بڑے بڑے سائنسداں جو اسوقت حسنِ اتفاق سے یہاں جمع ہو گئے ہیں ساری دنیا میں ایک ایسی خوشگوار فضا قائم کر دینگے جس میں وہ زندگی جو اسوقت کرۂ ارض پر موجود ہے کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہ سکے"۔ سامعین نے اس خیال کو بہت پسند کیا اور سارا ایوان نعرہائے تحسین سے گونج اٹھا۔ اس سائنس کانگریس کا مفصل حال تصویروں سمیت کسی آئندہ اشاعت میں ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔

ہندستانی صنعتوں کا مستقبل

۲ جنوری کی شام کو دہلی میں یونیورسٹی روڈ کے قریب صنعتی تحقیقات کے تجرباتی ادارے کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے حکومتِ ہند کے رکنِ صنعت و فراہمی ڈاکٹر جون متھائی نے فرمایا کہ اگر ایسے پرائیویٹ ادارے ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں قائم ہو جائیں تو ہماری صنعتی کارگذاریوں کا مستقبل نہایت شاندار صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ادارۂ مذکور کے لئے حکومت نے دس ایکڑ قطعۂ زمین برائے نام کرائے پر عطا کیا ہے۔ عمارتوں کی تعمیر اور تجربہ گاہوں کے قیام پر جو رقم خرچ ہوگی، وہ لالہ شری رام جی ادا کرینگے۔ اس ادارے میں ہر قسم کے تحقیقاتی شعبوں کا اہتمام ہوگا۔ لالہ شری رام نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ایسے اداروں کا مقصد یہ ہے کہ صنعتی کارخانوں کے اربابِ حل و عقد لکیر کے فقیر نہ بنے رہیں بلکہ وہ نت نئی تحقیقات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے کاروبار کو ہمیشہ ترقی اور وسعت دیتے رہیں تاکہ آنے والے زمانے میں ہندوستان اس باب میں کسی دوسرے ملک سے پیچھے نہ رہنے پائے۔ اس ادارے کا سنگِ بنیاد حسنِ اتفاق سے ان دنوں رکھا گیا جبکہ دہلی یونیورسٹی میں سائنس کانگریس ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے سائنسی نمائندے جمع تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اس رسم میں شرکت کی، اور اس طرح اسکی دھوم دھام میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ فی الحال اس ادارے کے ماتحت پارچہ بافی اور ادویاتی تحقیقات کی تجربہ گاہیں کھولی جائینگی لیکن باقی شعبے بھی حسبِ ضرورت قائم ہوتے رہیں گے۔

سائنسدانوں کو اعزازی ڈگریاں

دہلی یونیورسٹی کے چانسلر ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند نے سائنس کانگریس کے موقعہ پر تقسیم اسناد کا ایک خاص اجلاس یونیورسٹی ہال میں منعقد کیا اور ان غیر ملکی اشخاص میں سے جنہوں نے اس کانگریس میں شرکت کی تھی، ڈاکٹر اوف سائنس کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ ان کے نام یہ ہیں:-

سر چارلس ڈارون، سر ہیرلڈ اسپنسر جونز، سر ڈارسی تھامسن اور پروفیسر پی ایم ایس بلیکٹ (انگلستان) ڈاکٹر ہارلو شیپلی اور ڈاکٹر اے الف بلیکسلی (امریکہ) پروفیسر جیکس ہدامرد (فرانس)، پروفیسر ڈی پی دوگلن اور پروفیسر ای این پاولوفسکی (روس)۔

اس جشن پر جب وائسرائے ہند نے روسی سائنسدانوں کو روسی زبان میں مخاطب کیا تو وہ اور دوسرے حاضرین حیران رہ گئے کیونکہ اس حقیقت کا بہت کم لوگوں کو علم تھا

کرولے اور روسی زبان بھی جانتے ہیں۔ انہوں نے ہر شخص کو ڈگری دیتے وقت قاعدے کے مطابق کہا: "میں ان اختیاراتِ خاص سے کام لیتے ہوئے جو مجھے اس یونیورسٹی کا چانسلر ہونے کی حیثیت سے حاصل ہیں، آپ کو ڈاکٹر اوف سائنس کی اعزازی ڈگری عطا کرتا ہوں۔"

طوفانِ ژالہ باری

برق و رعد و باد و باراں اور برف باری کے طوفان ہر سال کرۂ ارض کے کسی نہ کسی حصے میں تباہی اور بربادی کے رنگ جماتے نظر آتے ہیں۔ اس سال اسی نوع کا ایک آسمانی نزلہ آسٹریلیا کی مشہور بندرگاہ سڈنی پر گرا مسلسل دس منٹ تک شدید قسم کی ژالہ باری ہوتی رہی۔ کہا جاتا ہے کہ جسامت میں ہر اولہ آدمی کی مٹھی کے برابر تھا، نتیجہ یہ کہ ہزاروں مکان مسمار ہو گئے، ہزاروں انسان، حیوان، جانور اور پرندے مر گئے، زخمی ہونے والوں کی تعداد بے شمار ہے۔ چونکہ اولے بہت بڑے تھے اسلئے قدرتی طور پر زیادہ بلندی سے گر رہے تھے اور زیادہ بلندی سے گرنے کے باعث ان کا اثر بھی زیادہ شدید تھا، اولے موٹروں کی چھتوں کو توڑ کر اندر گھس گئے جیسے وہ کچی مٹی یا کاغذ کی بنی ہوئی تھیں۔ زیادہ پختہ مکانات اس بلائے ناگہانی سے بچے رہے لیکن ان کی کھڑکیاں اور دروازے پھر بھی محفوظ رہنے نہ پائے کیونکہ ہوا کے شدید جھونکوں کے باعث اولوں کی بوچھاڑ کسی قدر ترچھی تھی۔ فضا میں اڑنے والے پرندے مرکر اس طرح زمین پر آگرے گویا ان کو ہوائی بندوق کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ سڈنی کے کھیلوں کے میدان میں ایک بہت بڑی پناہ گاہ زمانہ جنگ میں تعمیر کی گئی تھی، وہ زخمیوں سے بھر گئی کیونکہ باقی ہسپتال بھی کھچا کھچ بھر چکے تھے، صرف عمارتی نقصانات کا اندازہ دو لاکھ پچاس ہزار آسٹریلوی پونڈ کے قریب لگایا گیا ہے۔

جزیرے کی غرقابی

طوفانِ نوح کو ایک زمانہ گذر گیا اور اب اس واقعۂ عظیم کی حیثیت ایک افسانہ پارینہ کا درجہ حاصل کر گئی ہے یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اس کی صداقت میں بھی تامل ہے لیکن وہ نہیں جانتے کہ نوامیسِ قدرت کے زیر اثر یا بلائے ناگہانی کے طور پر یہ صورتیں اب بھی رونما ہوتی رہتی ہیں، چنانچہ حال ہی میں ایک اطلاع ملی ہے کہ جزیرۂ پالمیرا بتدریج غرقاب ہو رہا ہے۔ یہ جزیرہ بحرالکاہل کے عین وسط میں جزیرۂ ہوائی کے جنوبی ساحل سے گیارہ سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور نہایت مختصر ہے یعنی اسکا طول صرف چھ میل اور عرض ڈھائی میل ہے۔ وسعت کے لحاظ سے آبادی بھی کم ہے یعنی صرف ۱۰۸ نفوس آباد ہیں۔ جب سمندر کے سیلابِ عظیم نے جزیرے کو بتدریج پانی میں ڈبونا شروع کیا تو وہاں کے محکمۂ بحریہ کے چھوٹے سے ریڈیو اسٹیشن نے ایک پیغام نشر کیا جو سان فرانسسکو میں سُنا جاسکا۔ اس پیغام میں اپنی مصیبت کا حال بیان کرنے کے بعد امداد و تعاون کی استدعا کی گئی تھی۔ فوری محافظت کے لئے کہا گیا کہ کسی نہ کسی طرح کوئی جہاز بھیجکر ہم ۱۰۸ آدمیوں کو بچالیا جائے، ورنہ ہم اس جزیرے میں تنہا رہ کر سیلاب کے

ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ طوفانِ نوح اسلئے آیا تھا کہ اس زمانہ کے لوگوں کا کفر و الحاد حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا تھا۔ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سیلاب کا سبب صرف سمندر کا مدّوجزر ہے یا کچھ اور۔ بعد کی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ جزیرۂ مذکور کے تمام باشندوں کو ایک قریبی جزیرے "کوپر" میں منتقل کر دیا گیا۔ ان میں پانچ عورتیں اور تین بچے بھی شامل ہیں۔

ہندوستان کیلئے اناج

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد سمندر پار ملکوں نے جن اناجوں سے ہندوستان کی مدد کی، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:۔

اقسامِ اناج	۲۶ دسمبر کو ختم ہونیوالے ہفتے میں	یکم جنوری سے ۲۶ دسمبر تک کل مقدار
گیہوں اور آٹا	۹,۷۰۰ ٹن	۱۳,۱۸,۷۰۰ ٹن
چاول	۱۲,۵۰۰ "	۳,۱۳,۲۰۰ "
مکئی	۶,۳۰۰ "	۲,۸۸,۱۰۰ "
جوار یا جرد وغیرہ	۴,۱۰۰ "	۵۹,۲۰۰ "
میلو	۹,۴۰۰ "	۳۸,۹۰۰ "
جو	———	۱,۳۱,۷۰۰ "
جئی	———	۲۴,۶۰۰ "

چاول کے حصے بخرے

بین الاقوامی ہنگامی مجلس اغذیہ نے اعلان کیا ہے کہ نئی تقسیم کے مطابق ہندوستان کو چار لاکھ دس ہزار ٹن چاول ملے گا۔ دوسرے ملکوں کا حصۂ رسد حسب ذیل ہے:۔

لنکا ۲۰۰,۰۰۰ ٹن۔ ملایا ۲۲۵,۰۰۰ ٹن۔ ہانگ کانگ ۳۰,۰۰۰ ٹن، دوسرے برطانوی علاقے جن میں بحرالکاہل کے جزیرے شامل ہیں، مشرق وسطیٰ اور جزائر غرب الہند ۵۸,۷۰۰ ٹن، چین ۲۴۵,۰۰۰ ٹن ولندیزی جزائر شرق الہند ۱۰۰,۰۰۰ ٹن، فلپائن ۹۵,۰۰۰ ٹن، کوریا ۵۰,۰۰۰ ٹن اور جنوبی افریقہ ۷,۰۰۰ ٹن۔ اس طرح ان تمام حصوں کا کل وزن ۱,۶۸۲,۷۰۰ ٹن ہے۔ گویا اسکا چوتھائی حصہ صرف ہندوستان کے لئے ہے۔

انتالیس سال کا بچہ

مانچسٹر کے قریب شہر بالفورڈ میں ۷۹ سال کی ایک بوڑھی بیوہ کا انتقال ہو گیا تو شہری فلاح و بہبود کے ایک افسر نے حفظانِ صحت کی مناسب تدابیر اختیار کرنے کے لئے اس کے گھر میں قدم رکھا اور یہ دیکھکر اسکی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس عورت کا ایک لڑکا جسکی عمر کا اندازہ ۳۹ سال لگایا گیا، ڈرا سہما باورچی خانے کے ایک کونے میں دبکا ہوا ہے۔ یہ شخص جسمانی اعتبار سے تندرست و توانا تھا لیکن اسکی ظاہری ہیئت اور بول چال بچوں جیسی تھی۔ اسکا نام ہنری کوپر تھا۔ حالات کی چھان بین کرنے پر معلوم ہوا کہ بڑھیا کو اپنے بچے سے اتنی شدید محبت تھی کہ

اس نے باہر کی فضا میں نکلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اسطرح وہ اپنے گھر کے سوا دنیا کی ہر چیز سے لاعلم رہا حتیٰ کہ اس نے اپنی ماں کے سوا کسی متنفس کو نہیں دیکھا۔ اس کی ماں کو ڈر تھا کہ وہ دوسروں سے مل جل کر مجھے بھول جائے گا۔ اس میں بچپن کی عادتیں اس درجہ موجود تھیں کہ وہ خود کپڑے بدلنا یا اپنے ہاتھ سے کھانا کھانا بھی نہیں جانتا تھا۔ اس کی تمام عمر چمچے سے کھانا کھاتے گذر گئی تھی۔ ضروری کام کاج کے لئے گھر سے باہر جاتے وقت ماں اُسے کمرے میں بند کردیتی تھی۔ اس زمانے میں اسکا راشن کارڈ بھی نہیں بنا، اسلئے بوڑھی ماں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اب حال ہی میں جب وہ خود بیمار ہوئی اور اپنا راشن بھی نہ لاسکی تو علالت کے علاوہ بھوک سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ غالباً اُنتالیس سال کے عرصے میں اسکا لڑکا کبھی بیمار نہیں ہوا، یا بصورت دیگر اُسنے زبانی حال بیان کرکے اس کی دوا حاصل کی ہوگی۔ بھنورے میں پرورش پانا صرف سنا ہی تھا، لیکن یہ اس کی صحیح مثال کہی جاسکتی ہے۔ اپنی جیتی ماں سے جدا ہو جانے اور بالکل ہی غیر مانوس لوگوں میں رہنے کا ناگوار اثر اس شخص کے دل و دماغ پر اتنا شدید پڑا کہ وہ بھی نو ہفتے سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا اور کچھ عرصے علیل ہوکر اسپتال میں مرگیا۔

ہندوستان کے شیرخوار بچے

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ دوران جنگ میں زچگی اور پرورش اطفال کا کام کس نوعیت کا رہا، نیشنل بے بی ویلفیئر کونسل کے زیر اہتمام شیرخوار بچوں کی ایک نمائش منعقد کی گئی جس میں برطانیہ کے علاوہ برطانوی دولتِ مشترک اور دیگر مقبوضات کے بہت سے بچے شامل ہوئے۔ صحت و تندرستی اور عام نشوونما کا لحاظ رکھتے ہوئے جو فیصلہ کیا گیا وہ نہ صرف تعجب خیز بلکہ ہندوستان کے لئے ہمت افزا بھی ہے۔ اس مقابلہ میں دو اول انعامات ہندوستانی بچوں کو ملے۔ باقی میں سے ایک نیوزیلینڈ نے حاصل کیا اور ایک مالٹا نے۔ اس نتیجے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب ہندوستان میں بھی بچوں کی دیکھ بھال پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔

بم کا نیا تجربہ

سوئٹزرلینڈ اور اطالیہ کی درمیانی سرحد کے قریب برقِ آبی تیار کرنے کے بہت سے کارخانے قائم ہیں لیکن جاڑے کے موسم میں جب کوہِ آلپس پر برف جم جاتی ہے اور دریاؤں میں پانی کا زور گھٹ جاتا ہے تو یہ کارخانے کچھ عرصے کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں اور اسطرح صنعت و حرفت کو کافی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے سائنسدانوں نے فیصلہ کیا ہے کہ پہاڑ کے برفانی ٹیلوں کو بموں کے ذریعہ توڑ کر پانی کی صورت میں منتقل کردینے کا تجربہ کیا جائے۔ اگر یہ کوشش کامیاب رہی تو ظاہر ہے کہ ان دریاؤں میں بارہ مہینے برابر پانی کی افراط رہا کرے گی اور اسطرح کارخانے بدستور جاری رہا کریں گے۔ بم جو اب تک تباہی کا آلہ سمجھا جاتا ہے، اس تجربے کی کامیابی کے بعد دنیا کے لئے مفید ثابت ہو سکیگا۔

"گم شدہ دنیا" پر پہلی چڑھائی

آسٹریلیا کے جنوبی ساحل کے ٹھیک اس مقام سے جسے راس ولسن کہتے ہیں، چھ میل دور سمندر میں "رونڈونڈو" نامی ایک جزیرہ ہے جو عرفِ عام میں "گم شدہ دنیا" کہلاتا ہے۔ شاید اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس دنیا والوں کے لئے اب تک اسکا وجود نہیں کے برابر تھا کیونکہ کوئی انسان اسپر قدم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ یہ جزیرہ کیا ہے، ایک مخروطی وضع کا مینار ہے جسے قدرت کے ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے۔ اس کا کُل رقبہ جو نہایت ہی مختصر ہے صرف ایک پہاڑ کی صورت میں ہے جسکی چوٹی سطح سمندر سے ایک ہزار دو سو فٹ بلند ہے۔ اس کے دامن میں ہموار زمین اتنی لمبی نہیں ہے کہ چند نفوس کشتی سے اُتر کر اطمینان سے اُسپر کھڑے ہو سکیں، کیونکہ سمندر کی طوفانی لہروں کے فوراً ہی بعد نہایت ڈھلوان چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ کُہر اور دُھند کے طوفان اُسے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں لیکن اس ترقی یافتہ زمانے کا انسان جو فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے اور پاتال کی گہرائی تک پہنچنے والے سمندروں کی تہ میں اترنے کی مہمیں سر کرچکا ہے، بھلا اس "گم شدہ دنیا" کی تحقیق سے کسطرح باز رہتا۔ چنانچہ پچھلے مہینے چند منچلے نوجوان اسپر پہلا قدم رکھنے میں کامیاب ہوگئے کیونکہ اسوقت موسم کی کیفیات کسیقدر موافق تھیں جو دس ہی منٹ بعد مخالف ہوگئیں۔ ان لوگوں میں شہر وکٹوریہ کے گیلونگ کالج کا ایک سائنسداں بھی شامل ہے۔ اسکا خیال ہے کہ اس پہاڑ پر بعض ایسے درخت اور جانور ملیں گے جن سے انسان ابھی تک لاعلم ہے کیونکہ ماہرینِ طبقات الارض کا خیال ہے کہ یہ جزیرہ جو شاید بیس ہزار سال پہلے براعظم آسٹریلیا کا ایک جزو تھا، زمین کے اندرونی انتشارات کے زیر اثر الگ ہوگیا تھا اور اسی وقت سے اسکے تعلقات بھی منقطع ہوگئے تھے۔ اس مہم سے کچھ عرصے پہلے آسٹریلیا کی ہوائی اور بحری فوج نے بھی اس جزیرے پر پہنچنے کی کوشش کی تھی مگر ناکامیاب رہ گئے تھے۔ اب دیکھنا ہے کہ یہ نوجوان زندہ سلامت لوٹنے پر وہاں سے کیا خبر لاتے ہیں۔

جرمنی میں کڑاکے کی سردی

سنا گیا ہے کہ وسطی یورپ میں اور وسطی یورپ میں بھی جرمنی میں اتنی کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہے کہ لوگوں کیلئے عرصۂ حیات تنگ ہوگیا ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ہر قسم کا ایندھن نہ صرف کمیاب بلکہ نایاب ہو، ایسی بلائے ناگہانی یقیناً ہلاکت آفریں ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسرے مقامات سے لکڑی اور کوئلہ لانے کی تدابیر اختیار کی گئیں لیکن ذرائع حمل و نقل نے ساتھ نہ دیا۔ بہت سے انجن ڈرائیور بیمار ہو جانے کے باعث اپنی خدمات انجام نہیں دے سکتے اور جب کوئلہ کشتیوں میں بھر کر دریاؤں کی راہ لانے کی کوشش کی گئی تو بہتے ہوئے دریاؤں کا پانی جم جانے سے کشتیاں جہاں تھیں وہیں رہ گئیں۔ قبرستانوں میں برف کی اتنی موٹی تہ جم گئی کہ ڈائنا میٹ سے اسکو اڑا کر قبریں کھودنے کا انتظام کرنا چاہا لیکن گورکن ناپید ہوگئے، اسلئے بہت سے مُردوں کو جلا ڈالنا پڑا ؛

شبہائے رفتہ

اختر شیرانی

آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے!

آہ، او سلمیٰ! وہ راتیں یاد آتی ہیں مجھے!
وہ ملاقاتیں، وہ باتیں یاد آتی ہیں مجھے!
حسن و الفت کی وہ گھاتیں یاد آتی ہیں مجھے!

آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے!

جب تمہاری یاد میں دیوانہ سا رہتا تھا میں!
جب سکون و صبر سے بیگانہ سا رہتا تھا میں!
بے پیئے مدہوش سا مستانہ سا رہتا تھا میں!

آہ، وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے!

جب تمہاری جستجو بیتاب رکھتی تھی مجھے!
جب تمہاری آرزو بے خواب رکھتی تھی مجھے!
مثلِ موجِ شعلۂ سیماب رکھتی تھی مجھے!

آہ، وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے!

منتظر میری، جب اپنے باغ میں رہتی تھیں تم!
ہر کلی سے اپنے دل کی داستاں کہتی تھیں تم!
نازنیں ہو کر بھی نازِ عاشقی سہتی تھیں تم!

آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے!

سردیوں کی چاندنی شبنم سے کملاتی تھی جب!
شبنم آکر چار سو، موتی سے برساتی تھی جب!
باغ پر، اک دھندلی دھندلی مستی چھا جاتی تھی جب!

آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے!

جب تم آجاتی تھیں با زلفِ پریشاں تاکمر!
عطر بیما تا بہ زانو، سنبلستاں تاکمر!
"مشک آگیں تا بدامن، عنبر افشاں تاکمر"!

آہ وہ راتیں، وہ راتیں، یاد آتی ہیں مجھے!

تبرکات

حافظ محمود شیرانی مرحوم

گر کروں شرحِ ستم گاریٔ تحریرِ جبیں — عرصۂ حشر بنے میرے قصیدے کی زمیں

ہائے وارونیٔ قسمت کہ نہ دولت ہے نہ صبر — وائے نیرنگیٔ تقدیر نہ دنیا ہے نہ دیں

کاوشِ خونِ جگر دل کو تسلی دیتی — دہر میں رسمِ وفا کا کوئی ہوتا آئیں

داغ بر سینہ ہوں اور خونِ تمنا در دل — سرِ فرہاد ہے مجھکو نہ ہوائے شیریں

اشک در دیدہ ہوں اور شکوۂ اختر بزباں — نہ دماغِ گل و گلشن نہ ہوائے نسریں

ہوں نظارہ کنِ عالم، بہ تحیّر لیکن — ساز و سامانِ گماں ہے، نہ سر و برگِ یقیں

ماتمِ اہلِ وفا ہوں نہ نشاطِ طفلاں — سر ہوں میں بردمِ شمشیر نہ دستِ گلچیں

عبرتِ اہلِ جہاں ہوں نہ تماشائے بہار — حسرتِ شمعِ فسردہ ہوں نہ خوابِ شیریں

پھرتا حیران ہوں مثلِ گلِ بازی ہر سو — فخرِ آشفتہ مزاجی ہوں نہ نازِ تمکیں

کیوں ہیں سرگرمِ تسلی مرے ہمدم، یارب — کہیں مٹتی ہے مٹائے سے یہ تحریرِ جبیں

ہوش دیوانگی بہتر کہ نہ شر ہو نہ فساد — طورِ بیگانگی بہتر کہ نہ فتنہ ہو نہ کیں

ترکِ فرزانگی بہتر کہ نہ دل ہو نہ دماغ — طرزِ آوارگی بہتر کہ نہ دنیا ہو نہ دیں

ہمکو معلوم ہے یاروں کی حقیقت ساری — ہم نے دیکھا اثرِ ماتمِ دلہائے حزیں

میری اُمید ہے وہ جو ہے گلوگیرِ اجل — میرے ارمان ہیں وہ جو کہ مقدر میں نہیں

داعیِ مرگ جو آئے تو پڑھوں میں لبیک ۔۔۔ ملک الموت جو آئے تو کہوں میں آئیں

نقش بر آب ہیں قانون قضائے قدرت ۔۔۔ خاک ہیں عیش و غم دہر و نقوشِ تکوین

اثرِ نقشِ قدم جو ہر ہستئ مکاں ۔۔۔ نفسِ سردِ وفا خونِ تمنّائے مکیں

خاک ہوں اور مرا عرش پہ جاتا ہے دماغ ۔۔۔ داغ ہوں لیکن ابھی ہے ہوسِ نقش و نگیں

موجِ یک قطرۂ دریا ہوں مگر طوفاں خیز ۔۔۔ چشمِ حیرانِ تماشا ہوں مگر ہوں خودبیں

خاکساری پہ مری تم نہ بہانا آنسو ۔۔۔ میں نے آنکھوں میں چھپا رکھا ہے بُتِ خانۂ چیں

سادہ لوحی پہ مری کوئی نہ جانا ہرگز ۔۔۔ میری صورت سے عیاں ہے مری شانِ تمکیں

سرد آہوں سے مری زنگِ کدورت ہو عیاں ۔۔۔ جوہرِ آئینہ جز یک الف بیش "نہیں"

شکوۂ بخت غلط، شوقِ تمنّا ناخوب ۔۔۔ دستِ بیداد سے رہتا ہوں میں فریاد گزیں

رات دن جلوۂ احباب سے آنکھیں تھیں چمن ۔۔۔ مردمِ چشم کہاں ہیں وہ ترے پیارے مکیں؟

میں تو میں، غیر بھی شرمندۂ احساں ہونگے ۔۔۔ گر مرے خون سے ہو صحنِ گلستاں رنگیں

غیر سے کیوں ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۔۔۔ مجھکو احباب نے بھولے سے نہ دی تھی تسکیں

میری بیدردی سے پژمردہ ریاضِ رضواں ۔۔۔ میری بے مہری سے افسردہ چراغِ بالیں

ہوش عاشق ہوں کہ ہو آمدِ محبوب سے گم ۔۔۔ فکر دانا ہوں مگر سیلِ حوادث سے غمیں

کس پہ میں ناز کروں جبکہ نہ جوہر ہے نہ ذات ۔۔۔ کس پہ اتراؤں یہاں تو نہ کماں ہے نہ کمیں

شدتِ رنج و غم و دردِ زمانِ غربت
کیا بیاں کیجیے کہ اب رخصتِ گفتار نہیں

حافظ محمود شیرانی

اویس احمد ادیب

سیدہ ہاشمی فرید آبادی نے حافظ محمود شیرانی کی وفات پر تاریخ لکھی تھی جو رسالہ "ہماری زبان" بابت یکم مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی اس کا ایک شعر ہے ؎

بت حجل و ریا کے توڑ گیا ہاں نام وہ اپنا چھوڑ گیا
محمود کے گرز سے کیا کم تھی شیرانی کی شمشیر قلم

واقعہ یہی ہے کہ حافظ محمود شیرانی کا قلم اس شمشیر کی حیثیت رکھتا تھا جو ہمیشہ انصاف کے لئے اٹھی ہو اور جس نے ہمیشہ حق کا سر بلند کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شمشیر قلم کی کارفرمائیاں دنیائے ادب میں آجتک انتہائی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور شاید رہتی دنیا تک رہیں۔ دنیا میں اور دنیا کے ہر دور میں ہزاروں اور لاکھوں اہل قلم پیدا ہوتے ہیں مگر وہ سب کے سب زندہ رہنے کے لئے نہیں ہوتے۔ وقتی جہل پہل اور وقتی رجحان کے مطابق وہ زندگی کے حامل ہوتے ہیں اور "وقت کی موت" کے ساتھ ساتھ مرتے جاتے ہیں۔ مگر ان میں سے بعض اور چند ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ذات کو وقتی ہنگاموں سے متعلق نہیں کرتے اور اپنے قلم کو وقتی ہنگامہ خیزیوں کا ذریعہ نہیں بناتے۔ وہ اپنی دوررس نگاہوں سے زمانے اور وقت کی ضروریات صحیحہ کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں اور اپنی مسلسل کوششوں کے ذریعہ سے ایسے کارنامے پیش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں جو انہیں دنیائے ادب میں ایک خاص جگہ دلاتے ہیں۔ اس طرح ان کی ادبی زندگی "ابدی" زندگی ہو جاتی ہے۔ ان کی مادی موت بھی واقع ہو جاتی ہے مگر ان کی ادبی موت واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ جتنی ادب کی زندگی بڑھتی جاتی ہے اسیقدر وہ بھی زیادہ اجاگر ہوتے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے کارنامے انہیں فنا نہیں ہونے دیتے۔ ایسے ہی اہل قلم میں حافظ محمود شیرانی کا شمار ہے۔ ان کے کارنامے اردو زبان و ادب کے سرمایہ میں گرانقدر اضافے ہیں جو رہتی دنیا تک انہیں زندہ رکھیں گے۔

۱۵ فروری ۱۹۴۶ء کی شب بڑی ہنگامہ خیز تھی۔ اس رات کے نصف حصہ میں حافظ محمود شیرانی جیسی ادب نواز ہستی اردو زبان و ادب کے علمبرداروں کی توقعات کو تشنہ چھوڑ کر عالم جاودانی کو کوچ کر گئی۔ حالانکہ ضعیفی کی وجہ سے ادبی خدمت میں وہ گرمی اور وہ تیزی باقی نہیں رہی تھی جو جوانی اور جوانی کے بعد کے زمانے میں تھی مگر دل میں جو لگن تھی اس میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اسوجہ سے آخر عمر تک کچھ نہ کچھ ادبی مشغلہ ضرور جاری رہا اور گاہے بگاہے وہ تشنہ کامان ادب کی سیری کے لئے اپنے پختہ کار قلم سے ادبی جواہر پارے پیش کرتے رہتے۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ وہ کمر کا ذی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ٹونک راج میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گذارنے کے لئے چلے آئے تھے۔ انہیں چین اور سکون کی ضرورت تھی اسوجہ سے انہوں نے آخری ایام زندگی گذارنے کے لئے نکراج گھاٹ پسند کیا تھا جو ٹونک سے تین میل کے فاصلہ پر تھا۔ وہیں کی زمین پر ایک باغ لگوایا۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرتے اور خوش ہوتے۔ اس باغ کی ملکیت وہ کسی اور کے سپرد کرنا نہ چاہتے تھے اسوجہ سے یہ وصیت کی تھی کہ انتقال کے بعد ان کو اسی باغ میں سپرد خاک کیا جائے تاکہ مادی زندگی کے فنا ہونے کے بعد بھی اپنے لگائے ہوئے باغ سے کبھی علیحدہ نہ ہوں۔ چنانچہ آج وہ اسی باغ میں آرام فرما رہے ہیں۔ عرصہ سے مولانا کو ضیق النفس ہو گیا تھا۔ یہ موذی مرض روز بروز بڑھتا گیا اور آخرکار مہلک ثابت ہوا۔ جسوقت ان کا چراغ حیات گل ہوا اس وقت انکی عمر ۶۶ برس کی تھی۔

پروفیسر محمود شیرانی ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی زندگی اپنے وطن میں گذاری مگر تعلیمی سلسلہ میں اپنے وطن کو خیرباد کہکر لاہور آنا پڑا۔ یہاں وہ اورنٹیل کالج کے طالب علم ہوئے۔ انتہائی محنت کے بعد ممتاز طور پر منشی فاضل کا امتحان پاس کیا مگر اتنی تعلیم سے طبیعت کو سیری نہ ہوئی۔ انتہائی مدارج طے کرنے کی دھن لگی ہوئی تھی اس وجہ سے غیر ممالک میں جانیکا خیال پیدا ہوا۔ خوش حال گھرانے کے فرد تھے، والد کا سایہ سر پر تھا، انگلستان روانہ ہو گئے۔ یہ ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی اسوقت ان کے والد ماجد کے پاس رہے، وہ ہندوستان ہی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ابھی بیرسٹری کی ڈگری حاصل بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ۱۹۰۶ء میں ان کے پدر بزرگوار کا انتقال ہو گیا۔ حیران و پریشان وارد ہندوستان ہوئے۔ یہاں وہ پھر زیادہ دن نہ رہ سکے کیونکہ ان کی منتہی تعلیم ابھی تشنہ تکمیل تھی۔ اس سانحۂ عظیم کے بعد برادر خورد کی جدائی گوارا نہ تھی اس وجہ سے ان کو بھی اپنے ہمراہ انگلستان لے گئے جنکو وہاں کی ہوا ایسی راس آئی کہ انہوں نے دوبارہ ہندوستان کا رخ نہ کیا۔ اس سلسلہ میں یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ حافظ محمود شیرانی پہلے ایسے ہندوستانی فرد تھے جو راجپوتانہ کی سرزمین سے نکل کر انگلستان گئے۔ ہندوستان کے دوسرے خطوں کی طرح وہاں کے باشندے بھی بڑے تنگ نظر اور قدامت پرست تھے۔ ایسے ماحول میں رہ کر یہ جرأت کرنا کہ فرنگیوں کے دیش میں جاکر تعلیم حاصل کی جائے یقیناً ہمت سے کام لیکر قدامت پرستی کی مضبوط زنجیر کو توڑنا تھا۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ ہندوستان سے باہر قدم نکالتے ہی اس قدامت پرستی کو خیرباد کہا۔

انگلستان کی مشغول زندگی میں پہنچکر انہوں نے اپنے آپ کو بھی اسی سانچے میں ڈھالا۔ وہاں معمولی ہندوستانی کی طرح اپنی زندگی نہیں گذاری بلکہ اپنی زندگی کے مختلف شعبوں کو کامیاب بنانے کے لئے انتہائی انہماک سے کام کیا۔ اسلامک سوسائٹی کے وہ جوائنٹ سکریٹری بنے۔ لندن مسجد تعمیری فنڈ کے وہ سکریٹری رہے۔ ان کے ساتھیوں میں اسوقت سر محمد اقبال۔ سر عبدالقادر۔ مسٹر آصف علی اور رائے بہادر سورج نرائن وغیرہ تھے۔ یہ سب آپ کے ساتھ سرگرم عمل رہتے تھے۔

آٹھ برس انہوں نے اپنے وطن سے دور گذارے۔ یہ آٹھ سال آئندہ زندگی بنانے کے بنیادی کاموں میں صرف کئے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ چند فوری ضرورتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے ہندوستان چلے آئے مگر ہندوستان میں قیام کی نیت سے نہ آئے تھے اور یہ ارادہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے پاس واپسی ٹکٹ تھا۔ جنگ عظیم کے چھڑ جانے کی وجہ سے مجبوراً انہیں ہندوستان میں قیام کرنا پڑا پھر چھ برس تک باہر جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وطن سے دور رہ کر خاکِ وطن کی قدر معلوم ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ وہ سمندری خطرات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ حکومت نے سواریوں کے جہازوں کی آمد و رفت کے سلسلہ کو بہت کم کر دیا تھا۔ اگر کچھ جہاز آتے اور جاتے بھی تو وہ مسافروں کی جانی اور مالی ذمہ داری نہ لیتے صرف چیدہ چیدہ لوگوں کو پاسپورٹ ملتا۔ بقیہ ناکام رہتے۔

مولانا کی زندگی کا یہ وقفہ دو خاص مشغلوں میں گذرا۔ ایک سیر و شکار اور دوسرا تعلیم و تحقیق۔ یہ دونوں کام ایسے ہیں کہ جب ان کے شیدا ان میں لگ جاتے ہیں تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ یہی حال مولانا کا بھی تھا۔ سیر و شکار میں مصروف ہوئے تو ایسے کہ پھر گھر بار بھی یاد نہ آیا۔ اور اگر تحقیق میں لگے تو خود فراموشی کی حدود بھی طے کر گئے۔ اس طرح یہ چھ سال کا زمانہ ۱۹۲۰ء تک مذکورہ بالا دونوں مشغلوں میں گذارا۔ چاہتے تھے کہ اسی طرح اپنی زندگی کے بقیہ اور دن بھی گذار دیں مگر قدرت کو تو انہیں منظرِ عام پر لانا تھا اور عروس شہرت سے ہمکنار کرنا تھا وہ کس طرح اپنی زندگی خاموشی کے ساتھ گذار سکتے تھے۔

۱۹۲۱ء میں پہلی بار انہوں نے ملازمت کی۔ اسلامیہ کالج لاہور میں وہ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں انہوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت اس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دی کہ پنجاب میں یہ تصور کیا جانے لگا کہ محمود شیرانی کے مقابلہ پر کوئی دوسرا اہل قلم نہیں آ سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے اور پھر ۱۹۴۰ء تک فائز رہے۔ اس تیرہ سال کے زمانے میں انہیں اردو زبان و ادب کی خدمت کا خوب موقع ملا۔ ان کی زیادہ تر تصانیف اسی زمانے کی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے اس عہدے سے سبکدوش ہو کر انجمن ترقی اردو میں شامل ہو گئے تھے مگر ضعیفی نے شدید محنت کی اجازت نہ دی۔ ضیق النفس کے مرض نے اور مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اس عملی، قومی، ملکی اور لسانی کام سے بھی علیحدگی اختیار کر کے ٹونک واپس چلے گئے۔

مولانا کی زندگی ہمیشہ علمی رہی۔ انگلستان جانے کے وقت تک انہماک اتنا تو نہیں تھا جتنا کہ بعد میں ہوا مگر وہاں کے قیام نے اس انہماک کو زبردست قوت بخشی۔ ان کے اس زمانۂ حیات سے ایک دلچسپ واقعہ وابستہ ہے جس کا بیان یہاں غیر مناسب نہ ہوگا۔ قیام انگلستان کے زمانے میں انہیں ایک انگریز ڈاکٹر ہنری اسٹب کی ایک ایسی کتاب مل گئی تھی جو اسوقت تک شائع نہ ہوئی تھی اور نہ انگریزی پریس اس کو شائع کرنے کے لئے تیار تھا کیونکہ اس کی اشاعت سے عوام پر برے اثرات مرتب ہونیکا خیال تھا۔ وہ برے اثرات یہ تھے کہ لوگوں کو اسلام کے محاسن معلوم ہو جاتے اور عیسائیت کے عیوب ظاہر ہو جاتے۔ مولانا محمود شیرانی نے اس کتاب کی افادیت کا اندازہ لگا کر اس کو شائع کرنا چاہا مگر اپنے آپ کو اس کے اخراجات کا کفیل نہ پا کر انہوں نے نہ صرف انگلستان میں چندہ کیا بلکہ مصر اور ترکی سے بھی چندہ کی اپیل کی۔ اسلامی ممالک نے بھی ان کی آواز پر سکّوں کی بارش کر دی۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی نہ صرف انگلستان میں بلکہ تمام انگریزی داں دنیا میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہنگامہ بھی ایسا تھا کہ محمود شیرانی کو جھوٹا بنایا گیا۔ بعض اخباروں نے تو غیر ذمہ دارانہ طور پر یہ بھی لکھدیا تھا کہ ڈاکٹر

تاریخ وفاتِ پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی

نتیجۂ فکر حافظ مولوی عبیداللہ بصیر ٹونکی

برلبِ[1] باناس در وادی اقامت گاہ کرد

۱۹۴۶ء

تا ببارد ابرِ رحمت بر مقامِ بیکسی!

۱۳۶۵ھ

[1] گگراج اور چاندماری کے درمیان دریائے باناس کا شہری کنارہ جہاں مرحوم نے اپنی حیات میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور جہاں مرحوم وصیت کے مطابق دفن کئے گئے۔

ہنری اسٹب کوئی شخص نہیں ہے یہ کتاب محمود شیرانی کی تالیف ہے اور انہوں نے یہ فرضی نام رکھ لیا ہے۔ مولانا اس لے دے سے پریشان نہ ہوئے بلکہ انگریزی پریس کی اس زہر افشانی کو اپنے لئے فال نیک سمجھے۔ اور اس کے بعد ہی ایک اور مختصر سی کتاب اس کتاب کے تعارف کے طور پر لکھی جس سے دنیا کو یہ اندازہ ہوگیا کہ محمود شیرانی دنیا کی کسی طاقت سے ڈرنے والے نہیں۔ یہی مولانا کا اولین کارنامہ تھا اور اس کی بدولت نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں نے حافظ محمود شیرانی کو جانا۔

مولانا کا ایک اور کارنامہ قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے ایک مضمون انتہائی تحقیق کے بعد "انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا کے" لئے بھی لکھا تھا جو بہت ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ "تاریخ ادب اردو" پر مختلف نظریوں سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر ان میں خاص طور پر قابل ذکر "پنجاب میں اردو" ہے جو حافظ صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ مولانا مرحوم نے "خالق باری" اور "تنقید شعر العجم" مرتب کیں یوں تو انہوں نے درجنوں اور کوڑیوں مضامین لکھے مگر ان میں "چند بردائی کی پرتھی راج راسا" قابل توجہ ہے۔ فردوسی اور شاہ نامے پر بھی ان کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات ہیں۔ ان کی علمی تحقیق اور ادبی ذوق کے بارے میں مدیر "ہماری زبان" کا خیال درج ذیل ہے جو "ہماری زبان" یکم مارچ سے ماخوذ ہے۔

"مرحوم کی زندگی خالص علمی زندگی تھی۔ ان کے علمی شغف کو دیکھکر حیرت ہوتی تھی۔ وہ عمر بھر ایک مستعد اور سچے طالب علم کی طرح علمی مطالعے اور تحقیق میں مصروف رہے ....

علمی اور تحقیقی مقالات اردو ادب کا بے بہا سرمایہ ہیں اور شائقین علم اور طلبار کے لئے چراغ ہدایت۔ ایسے فاضل محقق کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے ان کی موت فی الحقیقت قومی سانحہ ہے۔

مرحوم کی نظر بڑی غائر اور باریک بین تھی۔ اپنے خاص موضوعات میں انہیں کمال کا درجہ حاصل تھا۔ قدیم قلمی کتابوں اور تصویروں وغیرہ کی شناخت میں بھی بڑی اچھی نظر تھی۔ کاغذ روشنائی اور خط کو دیکھکر بتا دیتے تھے کہ یہ کتاب کس زمانے کی ہے۔

ان کی زندگی طالب علمانہ اور درویشانہ تھی جس کی مثال ہمیں صرف قدیم علما میں ملتی ہے۔ وہ بہت با اخلاق منکسر مزاج مہمان نواز اور قانع شخص تھے ان کا ایک ہی شوق تھا اور اسے آخر عمر تک ایسا نبھایا کہ وہ ہمارے لئے ایک مثال اور نمونہ ہے ......"

مذکورہ بالا اقتباس سے نہ صرف ان کی علم دوستی اور ادب نوازی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان کی بالغ نظری کا بھی پتا چلتا ہے۔ مخطوطات کا یہ اندازہ لگانا کہ وہ کس عہد میں لکھے گئے۔ ہر شخص کا کام نہیں۔ کاغذ روشنائی اور لکھائی سے یہ اندازہ لگانا دشوار امر ہے۔ اکثر اس میں بڑے بڑے ذی فہم اور دراک دھوکا کھا جاتے ہیں مگر مولانا کو اس کام میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ انہیں کبھی دھوکا ہو ہی نہ سکتا تھا۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ خود مولانا کے پاس "مخطوطات" کا ایک زبردست ذخیرہ موجود تھا۔ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران میں اس پر کام بھی کیا مگر جب وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے لگے تو اپنے اس قیمتی اور بیش بہا ادبی ذخیرے کو پنجاب یونیورسٹی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ان کو صرف قدیم کتابوں ہی کا ملکہ نہ تھا بلکہ انہیں سکوں اور وہ بھی مختلف ملکوں اور زمانوں کے سکوں کے جمع کرنے کا شوق بھی تھا انہوں نے پرانے سکوں کو جمع کرکے ان کی افادیت کا اندازہ لگایا اور اس کو بھی پنجاب یونیورسٹی میں دے دیا۔ مولانا کا صرف ادبی مذاق ہی بلند نہ تھا بلکہ تاریخی دلچسپیاں انتہائی کمال پر تھیں۔

اس اقتباس میں حافظ شیرانی بحیثیت ایک انسان کے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ آدمی میں جو خوبیاں شرط انسانیت ہیں وہ ان کے اندر موجود تھیں۔ یہ تو اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں لکھا ہی جاچکا ہے کہ وہ قدامت پرستی کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک وہ تمام باتیں جو رسم و رواج کہلاتی ہیں، توہم پرستی کی حدود میں داخل تھیں۔ وہ کبھی کسی قسم کی مصیبت سے بھی گھبراتے نہ تھے بلکہ ہر مصیبت کو انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے۔ مہمان نوازی اور منکسر مزاجی اس بات کی دلیل ہیں کہ ان کا کیرکٹر بہت بلند تھا۔ دوسروں کو اپنے گھر پر جگہ دینا اور اس قدر شہرت کے مالک ہوتے ہوئے بھی غرور اور گھمنڈ نہ ہونا انسانیت کے اعلیٰ جوہر ہیں۔ انسان دنیا میں دراصل اپنے اخلاق سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کا ہر قدم اس کی اخلاقی بلندی کا مظہر ہوتا ہے۔ اخلاق کی یہ خوبی مولانا میں موجود تھی کہ وہ بڑے اور چھوٹے سب سے انتہائی انکسار کے ساتھ گفتگو کرتے۔ ہر ایک کو گوشۂ دل میں جگہ دیتے۔ اس کے علاوہ ان کے کردار کی ایک اور خوبی نمایاں کرنے کی ضرورت ہے اور وہ "قناعت" ہے۔ اس کا دنیا میں حاصل ہونا ایک دشوار امر ہے۔ مگر مولانا میں یہ صفت ابتدا ہی سے پیدا ہو گئی تھی۔

مولانا جن تصانیف سے زیادہ مشہور ہوئے وہ خاص طور پر دو ہیں۔ اول "پنجاب میں اردو" اور دوم "تنقید شعر العجم"۔ ان کتابوں نے مولانا کو علیحدہ علیحدہ مرتبے دیئے ہیں۔ "پنجاب میں اردو" نے ان کو ایک مورخ اور محقق ثابت کیا۔ اس کتاب میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ "اردو پنجاب سے نکلی" ہے کیونکہ پنجاب مسلمانوں کے زیر حکومت ایک عرصہ تک رہا اس وجہ سے یہاں پر سورسینی خاندان کی مختلف پراکرتوں کے میل جول سے ایک مخلوط زبان پیدا ہو چکی تھی۔ جب مسلمان پنجاب سے دوسرے حصوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے آگے بڑھے تو وہ یہاں سے ایک مخلوط زبان لیکر گئے۔ اس طرح انہوں نے یہ بتایا کہ مسلمان جہاں گئے وہ پنجاب سے اردو زبان

بدلتے ہو گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ داخلی شہادتیں بھی پیش کی ہیں مثلاً ملتانی اور اردو کی بہت سی مشترک حالتیں یوں بتائیں۔

(۱) دونوں میں اسمار اور فعل کے آخر میں الف آتا ہے۔

(۲) دونوں میں جمع کا طریقہ مشترک ہے۔

(۳) دونوں زبانوں کے تذکیر و تانیث کے قواعد افعال مرکبہ و توابع میں متحد ہیں اس طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا لسانی تحقیق کے بھی ماہر تھے۔
ان کی دوسری کتاب "تنقید شعر العجم" ہے۔ یہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس کو تحقیقی اس وجہ سے کہا گیا کہ اس میں ان تاریخی واقعات کو تحقیق کی روشنی میں صحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جنکو یا تو مولانا شبلی نے غلط لکھدیا تھا یا وہ ان کو صحیح طور پر معلوم نہ کر سکے تھے۔ انہوں نے ایسی غلطیوں کا بھی ازالہ کیا ہے جو مولانا شبلی نے سن سنا کر لکھدی تھیں۔ یہ کتاب چھ سو دس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو تاریخی اور تنقیدی حیثیتیں حاصل ہیں۔ یوں تو انہوں نے ہر شاعر کے متعلق صحت کے ساتھ اس کے حالات زندگی، واقعات اور دوسرے مسائل پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر خاص طور پر رودکی، فردوسی، عمر خیام، انوری، نظامی گنجوی اور شیخ فرید الدین عطار کے متعلق غلط بیانیوں کی تصحیح اور تردید کی ہے۔ ان کے علاوہ ان کے کلام پر جگہ جگہ مختصر تبصرہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں مولانا خود فرماتے ہیں۔

"تنقید ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلت علمی کی منقصت نہیں ہے۔ بلکہ محض احتجاج ہے اس مروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ ہم تاریخی واقعات اور سوانح لکھتے وقت اسقدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اس کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور ان کی صحت اور درستی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں۔ میں ان بزرگوں کے ساتھ بھی اتفاق نہیں کرتا جو شعر العجم کو حسن و عشق کا صحیفہ کہکر اس کے تاریخی پہلو کی اہمیت کو گھٹانا چاہتے ہیں اور تنقید کی ضرورت کو اس سے مٹانا چاہتے ہیں۔"

ان کتابوں کو پڑھ کر اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا تنقید کے اصولوں سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ وہ تاریخی اور تحقیقی میدان میں اتر کر پہلے اپنا اطمینان کر لیتے ہیں تب کسی پر تنقید لکھتے ہیں یہ ایک نقاد کا اولین فرض ہے۔ اسے ضعیف روایتوں کو نظر انداز کرنا چاہیئے۔ اگر کسی واقعہ کی صحت میں ذرا بھی شبہ ہو تو تاریخی شہادتوں سے اس کی حقیقت معلوم کرنی چاہیے۔
یہ خوبیاں حافظ محمود شیرانی میں تھیں۔ ان کا خیال ہے کہ مولانا شبلی نے ان خصوصیات کو مدنظر نہیں رکھا۔ ان کا انداز بیان اور طرز تحریر سادہ ضرور ہے مگر وہ کہیں کہیں فارسی کا سہارا لیتے ہیں پھر بھی تنقید دیانتداری سے کرتے ہیں یعنی مبالغہ نہیں ہوتا۔ صرف بڑے بڑے اور بھاری بھرکم الفاظ بے معنی نہیں ہوتے، بلکہ زیر تنقید شئے کا فنی تجزیہ کرتے ہیں اور اس کی صداقت اور حقیقت کو آخری منزل تک پہنچاتے ہیں۔ مختصر جملوں میں اپنے مطلب کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں مگر نفس مضمون کبھی ہاتھ سے نہیں جانے پاتا۔

مولانا کی دیانتداری ضرب المثل بن چکی تھی۔ تاریخ، تحقیق اور تنقید میں کبھی وہ اس کو نہ چھوڑ سکے یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ ان کی تنقید کسی قدر تیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس دیانتداری سے ایک دلچسپ واقعہ وابستہ ہے جو ریاست دہلی، بابت ۱۸ مارچ ۱۹۴۶ء سے نقل کیا جاتا ہے۔

"دیانت کا یہ عالم تھا کہ امتحان کے جو پرچے جانچ کے لئے آتے تھے انہیں وہ تالوں میں مقفل رکھتے تھے کہ کہیں ان کے صاحبزادے (اختر شیرانی) اپنے کسی دوست کے پرچہ کے لئے کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں۔ ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ وہ منشی فاضل کے نظم کے پرچہ کے ممتحن تھے۔ ان کے صاحبزادے امتحان میں شریک تھے اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اسی پرچہ میں ان کو سو فیصدی نمبروں کی امید تھی۔ بایں ہمہ مرحوم نے صرف ۶۴ نمبر دیے اور پرچہ مولوی محمد شفیع ایم۔ اے وائس پرنسپل اورنٹیل کالج کے پاس بھیجدیا۔ غالباً یہ پرچہ سر عبدالقادر کو بھی دکھایا گیا تھا جس پر موصوف نے یہ فرمایا کہ آپ نے اس پر ظلم کیا ہے۔"

مولانا خود بھی شاعر تھے مگر دنیا نے آپ کو شاعر کی حیثیت سے نہ جانا۔ "ٹیپو سلطان" ان کی ایک زبردست نظم ہے جو قدردانانِ شعر و سخن سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ مگر ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد ان کی نثری کتابوں نے رکھا۔ آج وہی کتابیں مرحوم کی یادگار ہیں جو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔

شکوک

اضطرابِ بندگی پر رشک نہ کر — دیکھ اب میری خودی پر رشک نہ کر
جوشِ وحشت کی کمی پر رشک نہ کر — دیکھ میری خامشی پر رشک نہ کر
ساقیا دے اور جامِ زندگی — میری اس تشنہ لبی پر رشک نہ کر
رازِ ہستی فاش ہو سکتا نہیں — زندگی میں زندگی پر رشک نہ کر
چاک کرتا ہوں نقابِ کائنات — اب مری دیوانگی پر رشک نہ کر
آگ سینہ میں ابھی تک ہے دبی — سوزشِ دل کی کمی پر رشک نہ کر

سن لے اے پرواز رودادِ حیات
وقت کی فتنہ گری پر رشک نہ کر

پرواز جعفری

چھینک

افسانہ

بشیر الدین

شام کا سہانا وقت تھا۔ نفاست پسند افسر ایوان دتمیری چریاکوف دوسری صف میں بیٹھے ہوئے دور بین لگائے کارنوال کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ تماشہ کی دلکشی نے اس پر ایک کیف کا عالم طاری کر دیا تھا اور وہ اپنے آپ کو ہفت آسمان تصور کرتا تھا۔ اچانک ... قصے کہانیوں میں "اچانک" کا لفظ اکثر آتا ہے۔ مصنفین کی رائے صحیح ہے کہ زندگی درحقیقت تعبیر ہے ایک عالم تذبذب سے۔

اچانک افسر کے چہرہ پر تیوریاں پڑ گئیں، آنکھیں باہر کو نکل پڑیں۔ سانس رک گیا۔ اس نے کمر کو خم کیا جھکا اور ... آخ چھیں، وہ چھینکا۔ چھینکنا کوئی جرم نہیں ہے، ہر شخص کو چھینک آتی ہے۔ موسیقار چھینکتے ہیں خفیہ کار چھینکتے ہیں پولیس کے افسر اعلیٰ چھینکتے ہیں۔ چنانچہ چریاکو، کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ اس نے رومال سے منہ پوچھا اور ایک مہذب انسان کی طرح دائیں بائیں نگاہ ڈالی کہ اس کے چھینکنے سے کسی کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ پہلی صف میں ایک معمر شخص نہایت اطمینان کے ساتھ جیب سے رومال نکال کر منہ اور گردن پونچھ رہا ہے اور کچھ بڑبڑا رہا ہے۔ یہ شخص محکمہ اطلاع رسانی کا افسر جنرل برزرالو تھا۔

"میں نے اس کو سان دیا۔" چریاکو سوچنے لگا۔ "خیریت ہوئی کہ یہ میرا افسر اعلیٰ نہ ہوا۔ یہ تو ایک اجنبی ہے۔ تاہم مجھ سے ایک نازیبا حرکت ہوئی ہے۔ مجھے معافی مانگنی چاہیئے۔"

چریاکو کھانسا اور دبی آواز سے افسر کے کان میں کہا "معاف فرمایئے گا جناب والا۔ میں نے چھینک کر آپ کو سان دیا۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔"

"کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔"

"خدا کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ آپ یقین فرمایئے، میں نے جان کر ایسا نہیں کیا۔"

"اوہو۔ تشریف رکھئے مہربانی فرما کر اور مجھے تماشہ دیکھنے دیجئے۔"

چریاکو پر پریشانی غالب تھی۔ وہ احمقانہ طور پر مسکرایا اور اسٹیج کی طرف دیکھنے لگا۔ پر وہ اب ہفت آسمان پر نہ تھا۔ وہ ایک شدید بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ وقفہ ہوتے ہی وہ برزرالو کے پاس پہنچا اور اپنی ہچکچاہٹ پر قابو پا کر کہنے لگا۔

"میں نے جناب کو سان دیا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ میرا یہ فعل غیر شعوری تھا۔"

"ارے صاحب بس کیجئے۔ میں تو اس بات کو بھول چکا تھا۔ آپ دوبارہ یاد دلا رہے ہیں۔" جرنل نے کہا اور بے صبری کی علامت کے طور پر نچلا ہونٹ ہلایا۔

"بھول گیا۔ لیکن آنکھوں سے تو مکاری ظاہر ہے۔ یہ سوچ کر چریاکو نے جرنل کو شبہ کی نظر سے دیکھا۔" صاف کہنا نہیں چاہتا لہذا مجھے چاہیئے کہ میں اس سے کہہ دوں کہ چھینکنا ایک فطری عمل ہے۔ وہ سوچ رہا ہے کہ میں نے اس پر تھوکا۔ ممکن ہے اس وقت نہ سوچ رہا ہو اور بعد کو سوچنے لگے۔"

چریاکو نے گھر پہنچ کر بیوی سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا لیکن اُسے ایسا محسوس ہوا کہ بیوی نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ یہ واقعہ سن کر کچھ گھبرائی تو ضرور پر جب یہ سنا کہ برزرالو ایک اجنبی ہے تو وہ مطمئن ہو گئی اور اس نے کہا "بہتر ہے تم اس کے گھر جا کر معافی مانگ لو۔ ممکن ہے اس کو خیال ہو کہ تم سب کے سامنے وہ کچھ نہ کہہ سکے جو تم دراصل کہنا چاہتے ہو۔"

"یہی تو بات ہے۔ معافی تو میں نے مانگی۔ لیکن وہ عجیب انسان معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک لفظ نہیں کہا۔"

اگلے دن چریاکو نے بال بنوائے۔ نئی وردی پہنی اور برزرالو کے گھر پہنچا۔ جرنل دالان میں بیٹھا عرضیاں سن رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے چریاکو کو دیکھا۔ نگاہ ملتے ہی چریاکو بول اٹھا "جناب کو یاد ہو گا کل شام ارکادی کے تماشہ گھر میں مجھے چھینک آئی تھی اور میں نے نادانستہ جناب کو سان دیا تھا۔ اب معافی کا ..." چریاکو اتنا کہہ پایا تھا کہ جرنل نے چلا کر کہا "کیا فضول بات ہے۔ خدا معلوم تم چاہتے کیا ہو۔" یہ کہہ کر جرنل پھر عرضی داروں کی طرف مخاطب ہو گیا۔

چریاکو سوچنے لگا "یہ شخص میری بات سننا نہیں چاہتا ہے۔ خفا ہے۔ بہرحال میں صفائی پیش کئے بغیر یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔"

جرنل عرضیاں سن کر اٹھا اور اندر کی طرف بڑھا۔ چریاکو فوراً لپکا اور کہنے لگا "جناب والا مجھ سے گستاخی سرزد ہوئی ہے۔"

جرنل تنگ آ گیا اور اس کے چہرہ پر بے بسی کے آثار نمودار ہوئے۔ انکاراً ہاتھ ہلاتے ہوئے اس نے کہا "آپ معلوم ہوتا ہے مذاق کر رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی آڑ لی۔

"اس میں مذاق کی کونسی بات ہے۔" چریاکو سوچنے لگا۔ "میرا ارادہ مذاق کرنے کا ہرگز نہیں۔ دراصل جرنل بات سمجھنے سے قاصر ہے۔ لعنت ہو اس پر۔ میں اس بد دماغ سے معافی نہیں چاہوں گا۔ گھر جا کر اسے ایک خط لکھوں گا۔ اب اس کی شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔"

گھر پہنچ کر چریاکو نے اس مسئلہ پر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ خط لکھنا مناسب نہیں۔ جرنل کے گھر جا کر ہی معافی مانگنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ پھر جرنل کے گھر پہنچا۔ جرنل اس کو دیکھ کر سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ چریاکو نے کہنا شروع کر دیا۔

کل جناب کے حضور میں مجھ سے گستاخی سرزد ہوئی تھی۔ میں معافی

(باقی صفحہ پر)

میر شیر علی افسوس

میر شیر علی افسوس کے مختصر حالات بعض فہرستوں میں ملتے ہیں، مگر ذیل کے حالات زیادہ تر انہی کی ایک تصنیف "آرائشِ محفل" سے لئے گئے ہیں، جس کا قلمی نسخہ ۱۲۳۳ھ میں یعنی موٗلف کی وفات کے کل دس سال بعد تحریر ہوا۔ حسب نسب کے اعتبار سے یہ سیّد تھے خاندان کا سلسلہ حضرت جعفر صادق چھٹے امام تک پہنچتا ہے والد کا نام سید مظفر علیخاں تھا، غالبًا الہ آباد کے رہنے والے تھے، یا کم از کم اوائل عمر کا زمانہ وہیں بسر ہوا، کیونکہ اس شہر کے ایک بزرگ باکمال شاہ محمد اجمل صاحب کے حال میں لکھتے ہیں "موٗلف کو اس سراپا امتیاز کی خدمت میں ایام طفلی سے نیاز دلی اور رسوخ قلبی ہے" جوانی کے زمانے میں کچھ دن بنارس میں بھی رہے، لکھنؤ کا ذکر کسی قدر جوش کے ساتھ کرتے ہیں، اس کی وجہ غالبًا مذہبی عقیدہ ہے۔ اسکی صراحت ذیل کی ابیات سے ہوتی ہے جو بظاہر انہی کی طبع زاد ہیں اور آرائش محفل کے دیباچہ میں حضرت علیؓ کی شان میں لکھی گئی ہیں:

وہی دین و دنیا کا ہے بادشاہ — کرے گا بخوبی ہما را نباہ
خدا سے اسے دمبدم وصل ہے — نبی کا خلیفہ بلا فصل ہے

مزید شہادت علمار لکھنؤ کے حال میں ذیل کے الفاظ میں ملتی ہے:

"اور فرقۂ ناجیہ امامیہ میں مولانا سیّد دلدار علی سلمہ اللہ تعالےٰ وحید عصر ہے تبحر اس بزرگ کا اس کی تحریر سے ہویدا ہے اور خوش بیانی اس کی تقریر سے پیدا، سینکڑوں اشخاص اس کی بدولت گمراہی سے نکلے اور منزل ہدایت کو پہنچے، مذہب امامیہ کو ترقی کامل اس نے بخشی اور ہندوستان میں نماز جماعت و نماز جمعہ اس نے کی۔"

گو افسوس نے خود لکھنؤ کے تعلقات یا وہاں توطن اختیار کرنے کی کوئی تصریح نہیں کی تاہم نواب آصف الدولہ کے دولت خانے کے ذکر اور اس کی تاریخ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ سے انھیں گونہ دل بستگی نہیں بلکہ محبت تھی، نواب آصف الدولہ کے محل کو وہ خیر المکانات اور خود نواب کو جنتی لکھتے ہیں "تاریخ اس کی بنا کی 'دولت خانۂ عالی' موٗلف کے نتائج طبع سے ہے، لیکن خیر العمارات امام باڑہ ہے"

یہ الفاظ مزید وضاحت اور افسوس کے میلان طبع کو ظاہر کرتے ہیں کیا عجب کہ افسوس اس زمانہ میں لکھنؤ ہی میں موجود ہوں مگر دستور الفصاحت سے ان کے والد کے لکھنؤ کے تعلقات اور وہاں کے قیام سے اصلیت روشن ہو جاتی ہے۔ مرزا فخر الدین احمد خاں بہادر المشہور بہ مرزا جعفر سے نواب سرفراز الدولہ مرحوم کی بہن منسوب تھیں، اور یہ نائب وزیر یعنی نواب آصف الدولہ تھے، انہی کی سفارش و اعانت سے "در سرکار فیض مدار کمپنی بہادر بصیغۂ شاعری و اردو دانی نوکر شدہ مدتے در کلکتہ ماندہ، آخر ہمانجا باجل طبیعی درگزشت۔"

احد علی یکتاؔ، دستور الفصاحت کے مولف نے افسوس کی وفات پر ذیل کے اشعار میں اظہار غم کیا اور تاریخ بھی منظوم کی ہے۔

از جہاں رفت میر شیر علی — کرد ہر پیر و ہر جوان افسوس
بعد افسوس چوں تخلصِ او — ہمہ کردند شاعران افسوس
گفتم از روے درد خاموشے — رفت افسوس زیں جہان افسوس

حقیقت یہ ہے کہ یکتاؔ اور افسوس دونوں ہم سبق تھے "زبدۂ علماء ہندوستان، مجتہد زمان، محدث یگانہ، مسیحائے وقت، مخدومی و استاذی جناب حکیم آغا محمد باقر صاحب قبلہ، غفر اللہ ذنوبہٗ" یکتاؔ کے قول کے مطابق علم طب میں دونوں کے استاد تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی مولوی صاحبان کورے ملّا نہ تھے، بلکہ کسی نہ کسی دوسرے علم یا فن میں بھی اتنی دستگاہ رکھتے تھے کہ دوسروں کو اپنے فیض علم سے مستفید فرماتے، آج کل کی سی حالت نہ تھی کہ خالی وعظ سے سامعین کے ذہنوں کو تیّر کرتے تھے۔

افسوس کی استعداد علمی اور دستگاہ کا پتہ ان کے ایک دوست مولوی محمد اسلم کی ایک تاریخ سے بھی چلتا ہے، یہ تاریخ محمد اسلم صاحب نے آرائش محفل، ان کی ایک تصنیف کے حصہ اوّل کی تکمیل کے وقت کہی تھی چنانچہ ملاحظہ ہو۔

گزیں آل خیر خلق و خلیل ضیغم یزداں — کہ آمد از سما شیر علی خوش اسم آں افضل
چہ اوصافش بیاں سازم کہ ہست او جامع ہر فن
بہ نظم و نثر و طب و حکمت و فقہ و کلام اکمل
تخلص میکند افسوس، دارد لہجۂ اردو
زہم طرحان خود دارد دریں فن بہرہ اشمل

سیّد اظہر علی

۱۔ افسوس تخلص میر شیر علی نام خلف میر مظفر علی نواب عالی جاہ کے توپخانے کے داروغہ تھے ان کا اصلی وطن نارنول ہے ان دنوں میر حیدر علی حیراںؔ اور میر حسن کی صحبت سے مشق سخن اس درجہ بڑھالی ہے کہ نکتہ سنج بھی اسیر صاد کرتے ہیں، دستور الفصاحت طبع رامپور ۱۰۲، حاشیہ تختی۔

(۱)۔ دستور الفصاحت ۲۱ - ۱۲۰ - (۲) روے درد یعنی د کے عدد (۴) رفت افسوس زیں جہاں افسوس کے اعداد (۱۲۲۰) میں شامل ہوں گے۔ دستور الفصاحت کے مصحح جناب امتیاز علی صاحب عرشی نے بیل، قاموس اور دوسرے ماخذ کی غلطی اس ضمن میں ظاہر کی ہے، تختی صفحہ ۱۰۲۔

یکتا نے تو طب اور شاعری کا ذکر کیا ہے، مگر محمد اسلم صاحب نثر، حکمت، فقہ اور کلام کا مزید اضافہ کرتے ہیں۔ "دار دلہجۂ اردو" خصوصاً قابل توجہ ہے اوّل تو یہ کہ کلکتہ میں اس لب ولہجہ کے آدمی تھے کتنے، ان سے چند سال بیشتر میر قمر الدین منّت ملک الشعرا وہاں بے شک پہنچے تھے، مگر وہ فارسی میں ایسے محو تھے کہ اردو کی طرف انھوں نے کم توجہ کی، دوسرے ابتدا میں یہ میر سوزؔ کے شاگرد رہتے، سوز کا فیض تربیت ان کی ذاتی استعداد دونوں نے طبیعت کو جلا دی صاحب دیوان ہوئے، لکھنؤ میں میر حیدر علی حیرانؔ سے رجوع کیا مشق کلام کو سنجیدہ کیا، پھر احمد علی یکتا کے ساتھ دوستی اور یکجہتی بھی رہی، لہجۂ اردو پیدا ہو جانا کونسی بڑی بات تھی، بنگال والوں کو ان کا لہجہ یقیناً انوکھا اور پیارا لگتا ہوگا ورنہ اسلم صاحب اس کا ذکر کیوں کرتے۔

اس ضمن میں افسوس نے لکھنؤ کے شعرا کا ذکر کرتے ہوئے ایک پر لطف نکتہ حوالۂ قلم کیا ہے مگر اس میں ایک طرح کی چوٹ بھی ہے، لہذا ہم اسے معذرت کے ساتھ درج کرتے ہیں۔

"شعرا بھی جتنے اس شہر (لکھنؤ) میں ہیں کیا فارسی گو کیا ریختہ گو کہیں نہیں ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ بعد برہم ہونے شاہ جہاں آباد کے اکثر غریب امیر مرزایان ہندوستان سے نواب صفدر جنگ و شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں آکر اس شہر میں بسکونت دائمی ساکن ہوئے، پس شہر تو عبارت اشخاص یہ بھی دلی ہو گیا، اور باشندے اس کے بسبب کثرت صحبت و تتبع زبان تلفظ صحیح کرنے لگے، یہاں تک کہ جن کی طبع موزوں تھی شاعر ہو گئے، باوجود اسکے بھی لہجے میں تفاوت بہت رہ گیا، لیکن محاورہ میں کم کہ زباں داں ہی اس کو سمجھے اور اس کی طبیعت اس پر لگے۔"

احمد علی یکتا کا قول ہم نقل کر چکے ہیں کہ افسوس صاحب دیوان تھے، جو ان کی طبیعت کے لگاؤ اور ذاتی ذوق شاعری کی واضح دلیل ہے، دستور الفصاحت میں یکتا نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے مربی کے خلف اکبر مرزا قمر الدین احمد خاں بہادر صولت جنگ، قمر تخلص کے ہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے، جن میں شاہ نصیر دہلوی نے بھی ایک زمانہ میں شرکت کی، ان مشاعروں میں شاعروں کی جو تربیت ہوتی تھی وہ محتاج بیان نہیں، ان معلومات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میر شیر علی افسوس ادبی ذوق لے کر آئے تھے اور خوبی قسمت کہئے یا زمانہ کی ناسازی خدمت بھی انھیں ایسی ہی ملی جس میں انھیں زور قلم دکھانے کا موقع ملا، بلکہ یوں کہئے کہ جہاں میر امن دہلوی نے موجودہ اردو زبان کی داغ بیل میں صاحبان کمپنی کا ہاتھ بٹایا وہاں میر شیر علی افسوس نے بھی اس عمارت کو اٹھانے اور اس کی تکمیل میں کافی امداد دی۔ اب رہی یہ بات جو عام طور پر کہی جاتی ہے کہ صاحبان کمپنی نے محض یہاں کے علوم کو زندہ کرنے اور انھیں رواج دینے کے لئے یہ نئی تحریک پیدا کی، اس کے حق میں اور اس کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، میرے فاضل دوست ڈاکٹر اے، جے، آربری نائب مدیر انڈیا آفس لائبریری نے حال ہی میں ان صاحبان کی ادبی خدمات پر کافی روشنی ڈالی ہے اس لئے میں اس موضوع پر مفصل بحث کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

اب دیکھئے کہ میر شیر علی افسوس اپنے مربی کو کن الفاظ میں روشناس کرتے ہیں، میں خود انہی کے الفاظ نقل کرتا ہوں کیونکہ اوّل تو آپ اس طرح اب سے کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے کی زبان سے ملاقی ہوتے ہیں دوسرے تصنیف را مصنف نیکو کند بیان، یعنی مربی کو مربا ہی بھجوائے۔

میر صاحب لکھتے ہیں: "اور شکر گزاری افتخار مرزایان ہندوستان دولت خواہ صاحبان عالی شان، فخر خاندان، فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر ابن محسن الزماں خاں کی شب و روز کرنی ضروری ہے کیونکہ سرکار دولت مدار میں سبب اپنی رسائی کا وہی ہوا۔ والا امیر دل تک پہنچ فقیروں کی کہاں۔۔۔۔۔ غرض مرزا صاحب کی جوہر شناسی و آشنا پرستی اور صاحبان عالی شان کی قدر دانی اور مہربانی۔۔۔۔۔ اشارہ اس کا باغ اردو کے دیباچہ میں ہو گیا ہے۔۔۔۔"

اب ان کی ادبی خدمات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اس زنجیر کی پہلی کڑی باغ اردو ہے، افسوس جب اس کتاب کی تحریر سے فارغ ہوئے تو "مدرس ہندی مسٹر جان گلکرسٹ بہادر دام الطافہ نے اس کا چھاپا شروع کر دیا، چنانچہ پانسو کتاب چھپی اور دور دور تلک پہنچی بعد اس کے فرمایا تو اس فن میں دستگاہ کامل رکھتا ہے، تیرے کلام کی طرز سے ہم بہت محظوظ ہوئے اب جتنی کتابیں کہ لوگوں کی تالیف ہیں یا ترجمے تو انھیں اصلاح دے، زنہار اس امر میں کسی کی خاطر نہ کرنا، ان کی صحت و غلطی کی پرسش تجھی سے ہوگی، مولفوں مترجموں سے کچھ علاقہ نہیں،۔۔۔۔ چنانچہ چار کتابیں تو بالکل درست کیں، تفصیل ان کی دیباچہ رقمی میں لکھ چکا ہوں اور ایک آدھ کے جملے ہی مربوط کر دئے،۔۔۔۔ بعد اس کے چندے اوقات شریف شہنشاہ شعرا مرزا رفیع الدین سودا کے کلیات کی صحت میں کاٹی، از بسکہ وہ کاتبوں کے قلم جہل سے غلط ہو گیا تھا جیسا چاہئے ویسا صحیح نہ ہو سکا اور نسخہ بھی دوسرا کہ بمرتبہ صحیح ہو، ہم نہ پہنچا بسبب اس کے کہیں کہیں غلط رہ گیا!"

ان کی آخری تصنیف آرائش محفل ہے، یہ تالیف زیادہ تر سجان رائے بھنڈاری کی فارسی تاریخ خلاصۃ التواریخ پر مبنی ہے جس کا تعلق اورنگ زیب کے عہد اور اس سے ماقبل کی تاریخ سے ہے۔ مگر ضمناً اس میں دوسرے مصنفوں اور ان کی تالیفات سے بھی امداد لی گئی ہے۔ مثلاً اس میں سیر المتاخرین خلاصۃ الہند اور ایک دو اور کتابوں کا نام بھی آ گیا ہے۔ یہ مصنف کی نیک نیتی اور دیانت کی دلیل ہے، برخلاف اس کے دوسروں کی روش اور طبیعت کو دیکھئے اور خود ان کی زبانی سنئے، "بعض مولفین و مترجمین (یہ ان کے شریک کار رہتے) نے چھاپے کے وقت جو درخواست کی کہ نام کتب مسطورہ کے اگر دیباچے میں رہیں گے تو ہماری کسر شان ہوگی، ناگزیران کے پاس خاطر

(بقیہ صفحہ ۴۰ پر)

فرانسیسی افسانے اور فطرت نگاری

۲

اثر لکھنوی

اب نیچرلسٹ اسکول کے متعلق ایسی چار باتیں درج کی جاتی ہیں جو لکھنے والوں، پڑھنے والوں اور نقادوں کے لئے یکساں دلچسپ ہیں۔

(۱) طرز ادا کی انفرادیت۔
(۲) عموماً کس حد تک قوت اختراع سے کام لینا چاہیئے۔
(۳) بیانیہ حصوں کی نسبتی اہمیت۔
(۴) ادب میں اخلاق کا سوال جو بہت معرض بحث میں ہے۔

(۱) طرز ادا کی انفرادیت

اس قدرت کے بغیر کوئی ناولسٹ نمود حاصل کرنے کی توقع نہیں کر سکتا۔ بہت سے مصنف جن میں باقی صفات موجود ہیں اس لئے صف اول میں جگہ نہیں پاتے کہ دوسروں کی طرح لکھتے ہیں، ان کی صرف ونحو قطعاً درست، تحریر میں حسب منشا روانی، جملوں کی تراش خراش میں خوبی اور رنگ آمیزی بھی ہوتی ہے مگر کوئی ذاتی امتیازی شان نہیں پائی جاتی۔ ایک ظریف نقاد نے خوب کہا کہ ایسے ناول نویسوں کا طرز "بھاڑے کا ٹٹو ہے"۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ مروجہ انداز بیان کے دلدادہ ہوتے ہیں اور جو فقرے اور جملے ہوا میں مکھیوں کی طرح اڑتے پھرتے ہیں ان پر اوقات بسر ہوتی ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ انکی گرہ کا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ جیسے کوئی شخص پس پشت کھڑا ہوا بتاتا جاتا ہے اور یہ لکھتے جاتے ہیں تاہم ان لوگوں کو شہرت حاصل نہ ہونے سے استعجاب ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ امر بدیہی ہے کہ اب صرف انہی ناول نویس کی قدر ہوتی ہے جو حقیقت کا معقول احساس رکھتے ہوئے فطرت کی ترجمانی میں جدت سے کام لے اور اس ناول میں اپنی ذات کا بھڑکتا ہوا شعلہ نہاں کر دے۔

بلاشبہ سب سے افضل مثال انفرادی طرز ادا کی فرانسیسی ادب میں سینٹ سائمن ہے جو اپنی تصانیف میں اپنا خون جگر اور پوری طاقت صرف کر دیتا تھا۔ اس نے ایسے صفحات چھوڑے ہیں جن میں عمق اور نبض کی لپک ہے۔ بہت سے مقتدر مصنفین ہیں جن میں طلاقت اور خوبی ترتیب پائی جاتی ہے سینٹ سائمن کے خود نوشتہ حالات میں ان کا فقدان ہے مگر ہر جملے میں موج حیات جوش زن ہے، اس کی تصنیف انسان کی فریاد ہے، طویل گفتگو ہے ایک شخص کی اپنی ذات سے اور ایسے شخص کی جو اپنے وجود سے محفل آراستہ کرتا ہے۔

انفرادی شان سے مطلب زبان کی بوالعجبی نہیں ہے جس کا مآل صرف سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہو، طرز ادا محض طرز ادا کی خاطر کامیابی کی سند نہیں ہو سکتا۔ مصنف کو چاہیئے کہ اپنی تصنیف میں لہو پانی ایک کر دے اور اپنی دماغی قوتیں صفحات میں بکھیر دے۔

موسٹولنوں کلاڈل ایسا مصنف تھا جسے اپنے دیگر مماثل کی طرح یقین تھا کہ کسی تصنیف کے لئے سب سے ضروری بات جو اس کی بقا کی ضامن ہو صاف ستھری بےعیب زبان ہے۔ خلعت بقا حاصل کرنے کی دھن میں اس نے کوشش کی کہ اس کی تصانیف کا ہر جملہ ایک ڈال ہو۔ اس خیال میں ایسا محو ہوا کہ اس کی تخلیقات علمی سے قوت فنا ہو گئی۔ وہ ایسے جواہر چھوڑ گیا جنپر زنگ ہے، سنگ ہے مگر آب وتاب نہیں، جو حیرت میں تو ڈالتے ہیں مگر انبساط کی لہر نہیں دوڑاتے۔

نیچرلسٹ اسکول کے سربرآوردہ مصنفین کی کتابیں پڑھتے ان میں صرف انداز بیان کی چمک دمک صرف الفاظ کی ترتیب میں ہی صناعی نہ ہوگی بلکہ وہ انفرادی شان پائی جائے گی جو کسی تصنیف سے روح سلب کرنے کے بجائے زندگی بخشتی ہے۔ بالزک کو اس کی تصانیف کے مجموعہ سے جانچنا چاہیئے، اس کی تصنیف "کانٹ دروولاٹسک" میں انداز بیان کے نگینے اپنی تابندگی دکھاتے ہیں البتہ ناولوں کی عبارت میں بہت کچھ حشو و زوائد اور رنگانی ہے۔ اس کے بخلاف اسٹینڈہال میں انفرادیت کا مادہ بیشتر تھا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بےلاگ پر مغز اور دل میں جگہ کرنے والے جملے اس کی قوت تجزیہ سے دوش بدوش ہیں۔ یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ وہ طرز ادا کو دلکش بنانے کی کوشش کرتا ہے، اس کا انداز اس کی قابلیت کے لئے موزوں تھا، ایسا انداز جو اپنے اغلاط اور ظاہری بےپروائی میں ایسا انوکھا ہے کہ فرانسیسی ادب میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔ فلابیر جیسا کہا جا چکا صناع تھا۔ وہ اپنے جملوں کی جلا کرتا تھا تاہم شخصیت اور شگفتگی قائم رہتی تھی۔ گانکور، ڈاؤڈے اور زولا کے صفحات میں بھی شخصیت کی جھلک موجود ہے اور شعاعیں مچل رہی ہیں، مگر سب کے انداز میں انفرادی شان ہے اور یہی شان ان کے اکثر معاصرین سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔ یہ انداز بیان کا انوکھا پن محض انداز بیان کی غرض سے نہیں ہے بلکہ مصنف کی ذہانت کا جلوہ ہے۔ ان جذبات میں اس ڈھڈھاتی ہوئی آگ کی لپٹ ہے جو ان کے سینے میں فروزاں تھی اور جس نے صفحات کاغذ پر منتقل ہونے کے بعد ان کو زندہ جاوید بنا دیا۔

(۲) قوت اختراع

اگلے زمانے میں کسی ناول نویس کی اعلیٰ تعریف یہ تھی کہ قوت متخیلہ زبردست ہے۔ لیکن اگر آجکل ان الفاظ میں کسی کی تعریف کی جائے تو غالباً خردہ گیری متصور ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ناول نویسی کا چولا بدل گیا ہے۔ اب قوت متخیلہ سب سے اہم صفت شمار نہیں ہوتی۔ ڈوما اور ستوما میں اعلیٰ درجہ کی قوت متخیلہ تھی

نانرڈیم ڈی پیرس" میں ہیوگو نے ایسے اشخاص اور واقعات وضع کئے ہیں جو بے حد دلچسپ ہیں۔ موپریٹ کے مصنوعی عاشقوں سے جارج سینڈ نے پورے ایک قرن تک دلوں کو مسحور رکھا مگر کسی نقاد یا ناظر نے آج تک یہ جرأت نہیں کی کہ بالزک یا اسٹینڈ ہال کو قوت اختراع سے متصف کرے۔ فقط اس بات کی تعریف ہوتی ہے کہ ان کا مشاہدہ اور تجزیہ زبردست ہے۔ ان کی عظمت اس میں ہے کہ اپنے عہد کی مصوری کی نہ کہ اس میں کہ قصے گڑھے۔ ان کے جانشین فلابیر گانکور اور ڈاؤڈے کی شہرت اور کامیابی کا راز ان کے تخلیقی کارناموں میں نہیں ہے بلکہ وہ طباعی ہے جس نے فطرت کو اصل کے مطابق کر دکھایا۔

سچ ہے کہ ناول نویس کو کچھ نہ کچھ گڑھنا بھی پڑتا ہے، پلاٹ تیار کرنا ہوتا ہے جس کا انجام خوشی ہو یا غم لیکن یہ چیزیں بآسانی مل جاتی ہیں، گرد و پیش کے روزانہ واقعاتِ زندگی پر نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ علاوہ بریں وہی واقعات ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں جو اشخاص ناول کے ساتھ ساتھ متشکل ہوتے جاتے ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ انسانی ڈراما ہیں ان کو فطرت کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ ناول نویس کو دھیان رکھنا چاہیئے کہ اس کی تصنیف کا خیالی حصہ حقیقت میں مضمر ہے۔ افراد اور ماحول کے انتخاب میں دِقّتِ نظر اور مطالعہ کی ضرورت ہے، لہذا سب سے اہم صفت جو ناول نویس میں ہونا چاہیئے قوت اختراع نہیں ہے بلکہ حقیقت کا صحیح اندازہ ہے یعنی ایسی قابلیت جس سے فطرت اپنی اصلی حالت میں آنکھوں کے سامنے آجائے۔ بدقسمتی سے بہت کم لوگوں کو اس سے بہرہ ہے۔ کتنے ہی رنگ کے اندھے ہیں اور چیزوں کو ویسا نہیں دیکھتے جیسی ہیں۔ کتنے ہی ہیں جو دیکھتے ہی نہیں بعض ناقدین اس حقیقت پزدہی سے آگاہ ہو کر کہنے لگے کہ نیچر لزم محض فوٹو گرافی یا فطرت کی عکاسی ہے، لہذا منکر ہو گئے کہ اس کو فن کا رتبہ حاصل ہے۔ لیکن یہ غلطی ہے، نیچرلسٹ اسکول حقیقت وراستی کے وفادارانہ اتباع پر ناز کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ اپنی تخلیق کو حیات بخشنے کا بھی دعویدار ہے۔ یہ کیفیت اسی انفرادی طرزادا سے پیدا ہوتی ہے جسکا حوالہ دیا جا چکا۔ گو نیچرلسٹ متخیلہ کو اس اعتبار سے رد کر دیتے ہیں کہ اصلی چیزوں میں مصنوعی کا استعمال کیوں ہو تاہم وہ اپنی تمام کوشش اس مقصد کی تکمیل میں صرف کر دیتے ہیں کہ راستی ایک ذی روح شئی بن جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں جسکا ثبوت یہ ہے کہ نسبتاً بہت کم ناول نویس کامیاب ہوتے ہیں۔

(۳) "بیانیہ حصوں کی نسبتی اہمیت"

ناول کا پلاٹ یا موضوع اور اس کے کیریکٹر ہی سب کچھ نہیں ہیں۔ بیان اور اشخاص کے لئے مخصوص فضا پیدا کرنا بھی اہم ہے۔ یہاں قوت بیان کام آتی ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہم نے تاحال ایسے اجزا کو جو محض بیانیہ ہیں حسب مقتضائے فن محدود نہیں کیا ہے، مطلق اصول کے برخلاف ہماری تصانیف میں نیچر کی بھرمار ہے اور ہم میں سے کچھ ایسے ہیں (امیل زولا اپنے آپ کو بھی مستثنیٰ نہیں کرتا۔ اثر) جو فطرت کی محبت میں از خود رفتہ ہو جاتے ہیں۔ مناظر کی رعنائی، روشنی کی شعاعوں اور تازہ ہوا کے جھونکوں سے ان پر نشہ سا چھا جاتا ہے۔ خود ہر دوگانکور رلبا اوقات مناظر کو اشخاص کا ماتحت بنانے میں کامیاب نہیں ہوتے تھے، لیکن ان کے بیانیہ اجزا کے متعلق کم سے کم اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ کسی خاص موضوع پر محض لفاظی نہیں ہے بلکہ اس احساسات کا مذاکرہ ہے جو کسی منظر کو دیکھنے سے ابھرتے ہیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ظاہر ہوا اور اپنے ماحول میں مدغم ہو کر اپنے جذبات کی اعصابی لرزش ماحول میں منتقل کر دی۔ ماننا پڑے گا کہ گانکور کی بیانیہ عبارتیں حد اعتدال سے متجاوز ہو گئی ہیں لیکن ان میں انسانی دلچسپی کا سامان اور زندگی کا ارتعاش ضرور موجود ہے۔

خوبیٔ بیان کے کرشمے دیکھنے ہوں تو گسیٹو فلابیر کی تصنیفات دیکھئے ہر کیریکٹر کی صورتگری اور تکمیل میں ماحول کا عنصر ناگزیر معلوم ہوتا ہے، فلابیر اشخاص کو ماحول میں دفن نہیں کر دیتا بلکہ ماحول سے شخصیت کو نمایاں کرنے میں مدد لیتا ہے، اسی سبب سے اس کی تصنیف میڈم بوواری اور لاڈو کیشن سنٹیمنٹل میں اس قدر زور ہے۔ نیلام کنندہ کی فہرست اشیا کی طرح طویل بیانات سے بالزک اپنی اکثر تصنیفات میں شروع کے چند اوراق سیاہ کرکے ذوقِ سلیم کو صدمہ پہنچاتا ہے۔ فلابیر نے ایسے بیانات کو اتنا مختصر کر دیا کہ ضرورت بھر رہ گئے۔ وہ الفاظ میں کفایت سے کام لیتا اور صرف ضروری رنگ بھرتا تھا، صرف ضروری خط لگاتا اور ضروری نقش ونگار نمایاں کرتا تھا۔ یہی فنکاری ان تمام چیزوں کی یادگار ہوتی تھی جنہیں حذف کر دیا گیا۔ باوجود اس قدر جزرسی کے اس کی تصویریں ایسی ہیں جو بھول نہیں سکتیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو اصولاً کہوں گا کہ وہ مصنف مجرم ہے جو ماحول کی نقاشی کو اس سے زیادہ دخل دیتا ہے جتنی کہ اشخاص ناول کے کردار کو مکمل اور نمایاں کرنے کو درکار ہوتی ہے (زولا اپنے آپ کو بھی اس الزام سے بری نہیں سمجھتا۔ اثر)

(۴) ادبیات اور اخلاق

یہ مسئلہ کہ ادبیات میں اخلاق کو کس حد تک دخل ہے اختصار کے ساتھ بیان کیا جائیگا کیونکہ میرے خیالات کا سب کو علم ہے۔ نیچرلسٹ اسکول کا ناول انسانی جذبات دخواہشات کی تشریح ہوتا ہے اور ان کے اثرات مالبعد کا مرقع۔ سائنسداں کو اپنے دوران مطالعہ میں کتنی ہی گھنونی چیزوں کو چھونا پڑتا ہے، یہی حال ناول نویس کا ہے۔ نیچرلسٹ کو کسی شخصیت سے سروکار نہیں ہوتا، یوں سمجھ لیجئے کہ پبلک ایک عدالت ہے اور ناولسٹ اس کا محرر۔ اس کا یہ فرض نہیں کہ نتائج اخذ کرے اور فیصلہ سنائے۔ وہ صرف مسل مرتب کرتا ہے۔ سائنسداں کا بھی یہی فرض ہے کہ واقعات کا مطالعہ کرے اور تشریح کو اس کے متعلقہ نتیجے تک پہنچا دے بغیر اس کے کہ ترتیب و تدوین

کی سرزمین پر قدم رکھے۔ واقعات موجود ہیں، تجربہ یا تجزیہ فلاں فلاں شرائط کے ماتحت عمل میں لایا گیا اور یہ نتائج حاصل ہوتے، بس یہاں سائنس کا فرض ختم ہو گیا، اگر مصدقہ واقعات سے آگے قدم بڑھا یا تو قیاس کی سرحد میں داخل ہوا اور سائنس کو خیرباد کہہ کے خیالی گھوڑے دوڑانے لگا، یہ سائنس نہ ہوا۔ اسی طرح نیچرلسٹ ناول نویس واقعات کا دیانتداری سے مطالعہ کرتا اور حیطۂ تحریر میں لاتا ہے، اگر اس سے تجاوز کیا تو غلط اور دھوکا دینے والے راستوں میں پڑ کر گمراہ ہوا۔ وہ خود اپنے افسانے سے غائب ہو جاتا ہے، صرف ایسے واقعات سپرد قلم کرتا ہے جو دیکھے ہیں، حقیقت یہ ہے، پڑھنے والا کانپے یا مسکرائے اور جو نتیجہ چاہے نکالے۔ جو فرض مصنف نے اپنے ذمے لیا تھا صرف اس قدر تھا کہ اصلی دستاویزیں یعنی صحیح واقعات بلا رو و رعایت اور بے کم و کاست بیان کر دے۔ جو ناول نویس اپنی شخصیت کے بل بوتے پر بدی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے یا نیکی کو سراہتے ہیں اپنی دستاویزوں کی قیمت گرا دیتے ہیں، ان کی مداخلت بے سود ہونے کے علاوہ رکاوٹ پیدا کرتی ہے، تصنیف کا زور بھی گھٹ جاتا ہے۔ تصنیف سنگ مرمر کی ایسی چٹان نہیں رہتی جو پہاڑ سے تراش لی گئی بلکہ ایسی شے معلوم ہوتی ہے جو مختلف اجزا سے ترکیب دی گئی ہے جسکو مصنف کے جذبات نے اپنے رجحان کے خراد پر چڑھایا ہے۔ یاد رہے کہ جذبات میں ہمیشہ تعصب کا لگاؤ اور لغزش کا احتمال رہتا ہے۔ جو تصنیف حقیقت پر مبنی ہے لافانی ہے بخلاف اس تصنیف کے جس کو مصنف کے ذاتی جذبات کے اظہار نے بدنما کر دیا ہے، ایسی کتاب صرف ایک خاص وقت یا عہد کے لوگوں کو متاثر کر سکتی ہے۔

نیچرلسٹ ناول نویسوں پر درشتی کے ساتھ پستِ اخلاقی کا الزام لگایا جاتا ہے اور محض اس وجہ سے کہ نیکوکار اور بدکار کو اسٹیج پر بلا ان کے نتائج پیش کر دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدمعاشوں کے تریڈ کی اجازت ہے بشرطیکہ خاتمۂ کتاب پر ان کو سزا دی جائے یا مصنف کے غصہ اور نفرت کا باران کو پیس کے رکھ دے۔ رہے ایماندار اشخاص، نقاد کہتے ہیں کہ بہت نہیں تو چند ہی سطروں میں ان کی بھلائیوں کی تعریف کر دی جائے تاکہ ہمت بڑھی رہے۔ گویا سچائی اور ٹھنڈے دل سے کام کرنے کی بدولت جو تجزیہ کے لئے لازم ہیں ہم مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں۔ بے وقوفوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہم جھوٹے ہیں جب کہ ہم دراصل حرف بحرف سچ بول رہے تھے، وہ کہتے ہیں، "کیا خوب! جب دیکھو بدمعاشوں کے افسانے، کبھی کوئی ایسا کیریکٹر نہیں دکھایا جاتا جس سے ہمدردی ہو۔ ایسے کیریکٹر بھی ضرور ہو سکتے ہیں خواہ فطرت کے کاموں میں تھوڑی تلبیس کو دخل دیا جائے۔ ہمارا یہی فرض نہیں ہے کہ نیکی کو ترجیح دیں بلکہ حسب ضرورت لیپ پوت بھی کر دیں تاکہ دیکھنے والے کہیں واہ کیا چوکھا رنگ ہے"۔

ہمیں یہ بھی نصیحت کی گئی کہ کسی شخص کی خوبیاں جی کھول کے بیان کرو مگر برائیوں پر خاک ڈال دو۔ خلاصہ یہ کہ ہم اس لئے مجرم ہیں کہ فطرت کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور سختی سے راستی کے پابند ہیں۔

دنیا میں کامل صحت کی طرح کامل نیکی یا ایمانداری ناپید ہے۔ انسان میں بہیمیت کی جھلک موجود ہے جس طرح توانا سے توانا انسان میں امراض کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ عام اشخاص میں تو اچھا خاصا حیوانی مادہ ہوتا ہے۔ وہ عجیب و غریب دوشیزہ لڑکیاں عصمت و عفت کی پتلیاں، وہ بات کے دھنی جری اور وفادار نوجوان جو ناولوں کی زینت ہوتے ہیں اس دنیا کے تو ہیں نہیں۔ ان میں زندگی سے مشابہت پیدا کرنے کو بہت سی ایسی باتیں اضافہ کرنا ہونگی جو مصنف نے اپنے دل میں رکھیں۔ نیچرلسٹ مصنفین نے اپنا نصب العین یہ قرار دیا ہے کہ سارا کچا چٹھا کھول دیں گے، ہم انتخاب نہیں کرتے نہ حقیقت کو فسانہ بناتے ہیں۔ اور صرف اس بنا پر کہ ایسا کرنے سے انکار کرتے ہیں ہمکو مطعون کیا جاتا ہے کہ غلیظ میں لوٹنا پسند کرتے ہیں۔ غور سے دیکھئے تو ناول میں اخلاق کا سوال ان دو نظریوں میں محصور ہے۔ وہم پرست کہتے ہیں کہ اخلاق سدھارنے کے لئے جھوٹ بولنا ضروری ہے، نیچرلسٹ جواب دیتے ہیں کہ راستی سے انحراف کے بعد اخلاق کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ کوئی چیز اتنی خطرناک نہیں جتنی خیال پرستی ہے۔ بعض کتابیں اس دنیا کو جھوٹے رنگوں میں دکھا کر لوگوں کے دماغ میں فتور پیدا کر دیتی اور ان کو بہت ہی ہولناک و پُرضرر راستوں پر لگا دیتی ہیں۔ میں اس فیلسوفی سے بحث نہیں کرتا جسکو تہذیب کا خطاب دیا جاتا ہے نہ ان گھنونی باتوں کا جنکو دلفریب بنانے کے لئے پھولوں سے ڈھانکا جاتا ہے۔ نیچرلسٹ کسی برائی کو آراستہ نہیں کرتے، بلکہ زندگی کے تلخ سائنس سے متنبہ کرتے ہیں، لوگوں کو حقیقت و راستی کی درسگاہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ مجھے کسی دوسرے اسکول کا علم نہیں جس نے نیچرلسٹ اسکول کی طرح اس قدر اخلاق اور یکرنگی کا ثبوت دیا ہو۔ یقیناً ہم دودھ پیتے یا تتلا تتلا کے باتیں کرنے والے بچوں کے لئے نہیں لکھتے بلکہ تمام دنیا کے واسطے لکھتے ہیں، اس دنیا کے واسطے جو گناہ و بدی و جرم و مکر و دغا سے کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ ہم کسی کو بری نہیں کرتے تو کسی سے عداوت بھی نہیں رکھتے، انسان کو جیسا پاتے ہیں ویسا ہی نقشہ کھینچ دیتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ سب دیکھ لیں تاکہ سب شفا پائیں۔ یہاں ہمارا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ آگے عنان اختیار قوموں کے پیشواؤں اور محافظوں کے ہاتھ میں ہے۔

یونسکو کانفرنس

ہوائی جہاز نے پیرس کے ہوائی میدان کے گرد تین چکر لگائے اور جب اسے نیچے اترنے کی اجازت مل گئی تو ہوا باز نے جھپٹتے ہوئے شہباز کی طرح اسکا رُخ ہوائی میدان کی طرف پھیر دیا۔ گویا ہم پورے ایک گھنٹے اور چار منٹ میں لندن سے پیرس آن پہنچے۔ شام کے چھ بجے تھے مگر سردی کے موسم میں یہاں چار بجے سے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ہوائی میدان کی عمارتیں روشنی سے جگمگا رہی تھیں۔ ملازموں نے ہوائی جہاز کے برابر لاکر زینہ لگایا اور ہم سب مسافر ایک ایک کرکے نیچے اُترنے لگے۔

مجھے فرانسیسی زبان کا ایک لفظ نہیں آتا۔ مگر ہوائی میدان والوں نے جس شیرینی اور ملائمت سے ہمارا استقبال کیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ فرانسیسی آداب اور قاعدے مشرقی خلوص اور رسوم سے کچھ ایسے زیادہ دور نہیں ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر کسٹم والوں نے ہمارے سامان کو اور پولیس نے ہمارے پاسپورٹ کو دیکھ لیا۔ اب ہم ہوائی جہاز والی کمپنی کی ایک موٹر لاری میں بیٹھے پیرس شہر کی طرف جا رہے تھے۔ ہوائی میدان خاص پیرس شہر سے کوئی دس بارہ میل پر ہوگا۔ مگر ہوائی میدان سے لے کر ہوائی اسٹیشن تک برابر پُر رونق آبادی کے آثار ملے۔ بازاروں میں قہوہ خانے گاہکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ جنھیں شیشے کی دیواروں کے پیچھے بیٹھے ہم موٹر میں سے دیکھ سکتے تھے کہیں کہیں کسی ریستوراں میں رقص بھی ہو رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہی وہ پیرس ہے جو آج سے چند مہینے پہلے جنگ کا مرکز تھا جس پر پانچ سال تک دشمن کا قبضہ رہا جس کے رہنے والوں نے لڑائی کی کٹھن منزلیں طے کیں۔ مگر پیرس کی روائتی شادمانی اور پرانی رونق میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ہوائی اسٹیشن سے ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل جا اترے۔ رات کو ذرا سی دیر کے لئے پاس ہی سڑک پر گھومنے کے لئے نکل گئے۔ مگر سفر کی تکان نہ جانے کیوں غالب آگئی تھی اس لئے جلد ہی سو گئے۔

پروفیسر سیدین میرے رفیق سفر ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں گویا آج سے ۲۵ سال پہلے انہوں نے پیرس کی سیر کی تھی اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ جس طرح لندن میں انکی رہبری میں کرتا تھا پیرس میں میری رہنمائی سیدین صاحب کریں گے۔ اسکی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ سیدین صاحب فرانسیسی زبان میں اپنا مطلب خوب ادا کر لیتے ہیں اور مجھے اس میدان میں ان جیسے رہبر کی ضرورت ہے۔

دوسرے دن ۹ نومبر سے یونسکو کانفرنس کا جلسہ شروع ہو رہا تھا اسلئے صبح سے اس کی تیاری میں لگ گئے۔ تیسرے پہر پیرس کی سوربن یونیورسٹی میں کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ سوربن یونیورسٹی پیرس کے لاطینی حصے میں قائم ہے جہاں کی فضا پیرس کے دوسرے علاقوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس علاقے کے ریستوراں طالب علموں اور مصوروں سے بھرے رہتے ہیں۔ یہاں بازاروں میں غانوے اور حسن کی نمائش کے سامان کی نسبت کتابوں کی دکانیں زیادہ نظر آتی ہیں مگر قہوہ خانوں کی اسقدر شدت ہے کہ بلا مبالغہ اس علاقے کا سب سے بڑا کاروبار قہوہ خانوں کی نگہداشت ہی سمجھا جاتا ہے۔

آج یونسکو کانفرنس کا اجلاس دیکھنے کے لئے طالب علموں کا ہجوم کئی گھنٹے پہلے سے یونیورسٹی کے سامنے کھڑا تھا۔ مہمانوں کے خیر مقدم کے لئے سیاہ اور سرخ چغے پہنے ہوئے پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر جلدی جلدی اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مہمانوں میں عرب کے عبا اور قبا پہنے ہوئے شیخ بھی تھے جو سعودی عرب اور مراقش سے کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ یونان۔ چین۔ ترکی۔ ہالینڈ۔ بلجیم۔ ایران۔ مصر۔ امریکہ۔ برطانیہ اور پولینڈ کے نمائندے تھے جو اپنے ملک کی طرف سے کانفرنس میں بھیجے گئے تھے۔ انہی نمائندوں میں ہندوستان کے ڈیلی گیٹ بھی شامل تھے۔ ہندوستانی نمائندوں میں راجکماری امرت کور کی خوبصورت سیاہ بنارسی ساری پر سب کی نظریں بار بار پڑتی تھیں اور سیاہ شیروانی پہنے جب ہمارے لیڈر سر رادھا کرشنن ہال میں داخل ہوئے تو ادب سے سب انکی طرف دیکھنے لگے۔

کانفرنس کے بڑے کمرے میں پلیٹ فارم پر اتحادی قوموں کے جھنڈے اور نشان اس خوبصورتی سے آراستہ کئے گئے تھے۔ کہ ان کے پھریروں کی ایک قطار سی بن گئی تھی۔ ان جھنڈوں کے نیچے پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر فرانس کے وزیر اور مدبر اور یونسکو کانفرنس کے اعلیٰ عہدے دار بیٹھے تھے۔ پلیٹ فارم کے نیچے دس فرانسیسی نقیب سرخ بانات کی درباری پوشاک پہنے بُت بنے کھڑے تھے۔ ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی گیلری تماشائیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ پورے چار بجے ایک عصا بردار نے پلیٹ فارم کی پُشت پر ایک دروازہ کھولا۔ نقیبوں نے نیام سے تلواریں نکال کر سلامی دی اور سب حاضرین ادب سے کھڑے ہوگئے۔ اب ہمارے سامنے فرانس کے وزیر اعظم موسیو بیدو کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ان کے آتے ہی آرکسٹرا نے فرانس کا قومی ترانہ بجایا اور فرانسیسی طالب علموں نے اسے ایسے جوش سے گایا کہ سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ پیرس یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے تقریر کی۔ فرانس کے وزیر تعلیم بولے۔ برطانی وفد کے لیڈر نے کچھ کہا۔ اور سب کے آخر میں فرانس کے وزیر اعظم نے کانفرنس میں شریک ہونے والوں کا استقبال کیا۔ تقریروں کے درمیان میں فرانسیسی آرکسٹرا کے نغمے بھی سننے میں آرہے تھے۔ اس سے دماغ پر تقریروں کا زیادہ زور نہیں پڑتا تھا۔

پانچ بجے کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا اور

آغا محمد اشرف

ہم سب اپنے ہوٹل واپس آگئے۔

دوسرے روز ۲۰ نومبر سے کانفرنس کی کارروائی کھلے اجلاس میں شروع ہوئی۔ سب سے پہلے تمام نمائندوں نے مل کر فرانس کے مشہور سیاسی لیڈر موسیو بلوم کو کانفرنس کا صدر چنا۔ اس کے بعد یونسکو کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر ہکسلے نے اپنی رپورٹ سنائی۔ اور پھر اس رپورٹ پر بحث شروع ہوئی۔ اس بحث میں سب سے پہلی تقریر ہندوستانی ڈیلی گیشن کے لیڈر سر رادھا کرشنن نے کی۔ سر رادھا کرشنن کی فصاحت کا سکہ تمام کانفرنس پر ایسا بیٹھا کہ ہر شخص نے ان کی تقریر کی تعریف کی اور حق تو یہ ہے کہ مشرقی ملکوں کی طرف سے انہوں نے تمام دنیا کو ایسی صاف صاف باتیں سنائیں کہ شاید اس سے پہلے کسی بین الاقوامی کانفرنس میں کسی نے ہمارا نقطۂ نظر اتنی جرأت سے پیش نہیں کیا تھا۔ سر رادھا کرشنن کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) جنگ کے دوران میں اتحادی ملکوں نے سب سے بڑے بڑے وعدے کئے تھے اور انسانیت اور تہذیب کو بچانے کے لئے لاکھوں انسانوں نے اپنی وعدوں پر جان دی تھی۔ اب جنگ ختم ہونے کے بعد ان وعدوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

(۲) - امریکہ اور روس کے دو مختلف نظریے ہیں۔ امریکہ شخصی آزادی کا طرفدار ہے اور روس کمیونزم کا۔ مگر روس اور امریکہ دونوں نے اتحادی قوموں کے چارٹر پر دستخط کئے ہیں، جس کی رو سے ہر شخص کو کچھ حقوق ملتے ہیں۔ اسی چارٹر نے تمام قوموں کو برابر کا درجہ دیا ہے۔ چھوٹی اور بڑی قومیں نئی دنیا بنانے میں برابر کی شریک ہیں۔ اس نئی دنیا کی تعمیر میں رنگ اور نسل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔

(۳) یونسکو کے پروگرام میں ان ملکوں اور قوموں کی بھلائی اور بہبودی بھی شامل ہے جنہیں جنگ سے نقصان پہنچا ہے۔ مشرقی ملک بھی اس پروگرام میں شریک ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ان علاقوں میں جنگ کے بغیر بھی جہالت، اول کی بیماری اور غربت کی مصیبتیں چھائی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ جنگ نے مشرقی ممالک کو اور بھی نقصان پہنچایا ہے۔

(۴) بڑی قوموں کو یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا میں صرف یورپ اور امریکہ کے ملک ہی نہیں بستے بلکہ دنیا میں ہندوستان اور چین جیسے بڑے بڑے ملک بھی موجود ہیں۔ جب یونسکو کا کام کرنے کے لئے افسر مقرر کئے جائیں تو اس وقت ہندوستان کو بھی برابر کا حصہ ملنا چاہئے کیونکہ ہمارے ملک والوں میں بھی کام کرنے کی صلاحیت ہے۔

سر رادھا کرشنن کے علاوہ اس جلسے میں پروفیسر سیدین نے بھی تقریر کی اور ان کی تقریر کو بھی سب نے بہت پسند کیا۔ پروفیسر سیدین نے اس بات پر زور دیا کہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے بڑی بڑی رصدگاہوں سے زیادہ امن اور صلح کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ راجکماری امرت کور نے اپنی تقریر میں یہ تجویز پیش کی کہ یونسکو میں ہاری ہوئی قوموں کو بھی شرکت کی دعوت دی جانی چاہئے۔

پروفیسر بھابھا کو یونسکو کی سائنس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ اور ان کی تجویز سے یہ بات منظور ہو گئی کہ ہندوستان میں غذا کی چھان بین کرنے کے لئے ایک مرکز قائم کیا جائے تاکہ ان تجربوں سے قحط کی بلا دور کرنے میں مدد ملے۔

یونسکو کانفرنس کے علاوہ ہندوستان کی طرف سے بہت سی آرٹ کی تصویریں بھی نمائش میں بھیجی گئی تھیں جنہیں سب نے بہت پسند کیا۔ ہندوستانی مختصر فلم بھی اس دوران میں پیرس میں دکھلائے گئے اور پیرس یونیورسٹی کی انجمن ہند نے ہندوستانی ڈیلیگیٹوں کی دعوت کی۔ اس دعوت میں بہت سے فرانسیسی مستشرق شریک ہوئے اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ پیرس یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانیں پڑھانے کا انتظام بہت اچھا ہے۔ ۹ دسمبر کی شام کو پیرس میں پروفیسر سیدین نے اقبال پر ایک لکچر بھی دیا جسے سننے کے لئے بہت سے لوگ آئے تھے۔

غرض یونسکو کانفرنس ہندوستان کے نقطۂ نظر سے بے حد کامیاب رہی اور اس میں ہندوستان کے نمائندوں کا حصہ ہر لحاظ سے قابل اطمینان تھا۔ انگلستان کے مشہور ادیب مسٹر پریسٹلے نے لندن کے اخبار ڈیلی ہیرلڈ میں یونسکو پر ایک مضمون لکھا تھا اس میں مسٹر پریسٹلے لکھتے ہیں:-

"دماغی اور جسمانی اعتبار سے اگر یونسکو میں شریک ہونے والے نمائندوں کے لئے کوئی انعام مقرر ہوتا تو اس قسم کا اول انعام میں ہندوستانی نمائندوں کو دیتا"

یونسکو کانفرنس ابتدائی اجلاس کے بعد مختلف کمیٹیوں میں بٹ گئی تھی اور اس کی ہر کمیٹی میں ہندوستانی ڈیلی گیٹوں کا حصہ بہت نمایاں تھا۔ پیرس یونیورسٹی نے اس موقع پر دنیا کے بڑے بڑے مفکروں اور عالموں کو لکچر دینے کے لئے بلوایا تھا۔ ان مقرروں میں ہندوستان کے نمائندے سر رادھا کرشنن بھی شامل تھے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سر رادھا کرشنن کی تقریر ہندوستانی تہذیب کے موضوع پر اپنی قسم کی بہترین تقریر تھی۔ اپنی تقریر میں انہوں نے ہندوستان کی تہذیب کا قرون وسطیٰ سے لے کر موجودہ دور تک کا نقشہ ایسا خوبی سے کھینچا تھا کہ ہندوستان کے بارے میں جو غلط فہمیاں عام طور سے غیر ملکوں میں رائج ہیں، ان کا خاتمہ ہو گیا۔

یونسکو کانفرنس کے جلسوں میں انگریزی یا فرانسیسی زبانوں میں تقریر کی جاتی تھی اور ہر تقریر کا فوراً دوسری زبان میں ترجمہ سنا دیا جاتا تھا۔ مجھے مترجموں کی مہارت اور ان کا کمال دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ پہلے یہ تقریر کو شارٹ ہینڈ میں لکھ لیتے تھے اور پھر بے تکلف اسکا انگریزی سے فرانسیسی میں یا فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کر کے سنا دیتے تھے۔ چنانچہ جب ریڈیو کے موضوع پر میں نے تقریر کی تو اسکا بھی ترجمہ فرانسیسی زبان میں سنایا گیا اور بعد میں میں نے فرانسیسی ترجمہ اصل سے ملا کر سنا تو رتی برابر اسمیں فرق نہیں تھا۔

یونسکو کا ہیڈ کوارٹر پیرس کے ایک بہت بڑے ہوٹل میں ہے اور اسے اب یونسکو ہاؤس کہا جاتا ہے۔ اس میں کئی سو کمرے ہیں اور اسکا بندوبست ایسا عمدہ ہے کہ یہ ہوٹل خود ایک مختصر سا شہر بن گیا ہے۔ کھانے پینے کے لئے ریستوراں، خط اور تار بھیجنے کے لئے ڈاک خانہ۔ تصویریں لینے کے لئے فوٹوگرافر، کتابیں اور اخبار بیچنے کے لئے کتابوں کی دکان۔ بنک۔ تھیئٹر، سینما کے ٹکٹ خریدنے کی جگہ۔ ہوائی جہاز اور ریل کے سفر کا بندوبست کرنے کے لئے دفتر، ہسپتال راشن کی دکان۔ غرض دنیا کا ہر کام یونسکو ہاؤس میں ہو سکتا ہے۔ اس چھوٹی سی بستی میں ۴۸ قوموں کے نمائندے جمع ہیں۔ مگر سب کی آنکھیں اس انجمن میں بار بار روسی نمائندوں کو تلاش کرتی ہیں۔ کیونکہ ابھی تک روس یونسکو میں شامل نہیں ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے لئے یونسکو نے ساڑھے سات ملین ڈالر کا بجٹ منظور کیا ہے۔ یہ رقم تمام قومیں مل کر ادا کرینگی اور یونسکو کے پروگرام کو دیکھا جائے تو ۷½ ملین ڈالر کی یہ رقم کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں ہے۔ جب ہمارے سامنے ایک ایسی نئی دنیا بنانے کا سوال ہو کہ جس میں شہریوں کو امن و امان اور صلح صفائی سے رہنے کے طریقے بتلائے جائیں گے۔ دنیا کی قوموں میں آپس میں رنجشیں دور کر کے انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقعہ دیا جائے گا۔ دنیا بھر کے ملکوں میں جہالت دور کرنے کی کوشش ہوگی اور سائنس کو انسانی ترقی کے لئے استعمال کیا جائیگا تو پھر ان فائدوں کے سامنے یہ رقم کوئی ایسی زیادہ معلوم نہیں دیتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یونسکو ۱۹۴۷ء میں اپنا پروگرام کس حد تک پورا کرتی ہے۔

سب سے آخر میں مجھے فرانس کی گورنمنٹ کا ذکر کرنا ہے۔ کیونکہ کانفرنس کے دوران میں فرانسیسی حکومت نے جس فراخدلی اور خلوص سے اتحادی قوموں کی خاطر مدارات کی اسکا ہم سب پر بہت اثر ہوا۔ فرانس ابھی تک جنگ کی مشکلوں میں سے گذر رہا ہے، ملک میں بے حد گرانی ہے۔ جنگ کی وجہ سے فرانس کو جو نقصان پہنچا ہے اور اس کی روح جس طرح گھائل ہے ان زخموں کے بھرنے میں بہت عرصہ لگے گا مگر ان مشکلوں کے باوجود فرانس کی حکومت نے کانفرنس کے نمائندوں کے آرام کا بندوبست بہت اچھا کیا۔ ہر وقت سواری کے لئے موٹریں موجود تھیں۔ ہر روز فرانسیسی حکومت کی طرف سے دعوتیں ہوتی تھیں اور فرانس کے مشہور تھیئٹر کانفرنس کے نمائندوں کی دلچسپی کے لئے اپنے آرٹ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں کو اس بات پر اعتراض ہے کہ یونسکو کا صدر مقام پیرس کو کیوں بنایا گیا۔ مگر چونکہ یونسکو اتحادی قوموں کے کلچر تعلیم اور سائنس کی سب سے بڑی انجمن ہے اس لئے اسکا صدر مقام بھی پیرس جیسا شہر ہی ہونا چاہیئے تھا جو کئی سو سال سے آرٹ۔ تہذیب فنونِ لطیفہ اور علم و ہنر کا مرکز رہا ہے۔

ایک رنگین یاد

وجدی بنگلوری

یاد آتے ہیں مجھے وہ مے گساری کے مزے
وہ نگاہِ کیف زا کی کیف باری کے مزے

انتظارِ دوست میں وہ شب گذاری کے مزے
آہ و زاری کے مزے اختر شماری کے مزے

وہ کسی کی کم نگاہی بے رخی چینِ جبیں
وہ مرے جوشِ وفا وہ جاں نثاری کے مزے

وہ رباب و چنگ وہ دلکش جوانی کی بہار
وہ شکستِ توبہ اور وہ بادہ خواری کے مزے

وہ جمالِ جانستاں کا جلوۂ مستی فروش
وہ نگاہِ شوق کی بے اختیاری کے مزے

اللہ اللہ وہ ہماری باہمی سرگوشیاں
چاندنی راتوں میں پہروں رازداری کے مزے

وہ جبینِ شوق میں بے تابیٔ شوقِ سجود
جبہہ سائی کے مزے پھر اشکباری کے مزے

عشق کی فریاد پر وہ حسن کی بے مہریاں
وہ شکستِ آرزو پر شرمساری کے مزے

دن کی وہ بیتابیاں راتوں کی وہ بے خوابیاں
وہ ہماری اشکباری بے قراری کے مزے

ہجر کی بے کیف راتیں وصل کی وہ حسرتیں
جانِ مضطر کی تڑپ شب زندہ داری کے مزے

عشق کی بیتابیوں پر مسکرانا دیر تک
پھر نگاہِ حسن کی وہ غمگساری کے مزے

داستانِ بے کسی رو رو کے وہ کہنا مرا
وہ نگاہِ شرمگیں کی شرمساری کے مزے

مجکو آدابِ محبت کا وہ ہر لحظہ خیال
اور وہ ان کی وفا کی پاسداری کے مزے

ہائے وہ آزادیاں ہر روز حسن و عشق کی
آہ وہ ہر وقت کی بے اختیاری کے مزے

اب نہ وہ ساقی ہے اے وجدی نہ وہ دورِ نشاط
باغِ عشرت کی زمانے نے الٹ دی ہے بساط

سچّی کہانی

افسانہ

صادق قریشی

نوراں، تم کہتی ہو کہ کوئی سچی کہانی سناؤں۔ بادشاہوں اور شہزادیوں کے قصوں سے شاید تم اکتا گئی ہو۔ میں کل سے سوچ رہی تھی کہ تمہیں کونسی سچی کہانی سناؤں۔ آخر بچپن کی رازدار سہیلی کی بھولی بسری داستان یاد آئی ہے۔

بڑھیا نے یہ کہہ کر ایک انگڑائی لی۔ اور آنکھوں کو اچھی طرح ملا۔ اس کی پوتی نوراں ٹھوڑی پر ہاتھ دھرے اس کے جھریوں والے چہرے کی طرف تک رہی تھی۔ چاندنی کیکر کی ٹہنیوں میں سے چھن چھن کر ان کی چارپائی پر پڑ رہی تھی۔

نوراں نے اٹھ کر دیوار کے پار جھانکا اور ادھر ادھر دور تک نگاہیں دوڑائیں۔

"چراغ بیلوں کو باندھ گیا ہے؟" بڑھیا نے نوراں کے چارپائی پر واپس آنے کے بعد پوچھا۔

"یہی ہی دیکھنے گئی تھی بیل بندھے ہیں۔ چھوڑ گیا ہوگا۔ اچھا تو اماں۔ اب شروع کرونا وہ داستان!"

"نوراں، یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہ کیکر کا درخت چھوٹا بچہ سا تھا۔ آٹا پیسنے کی مشینوں۔ موٹروں اور ریل گاڑیوں کا کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ آج تو تم جا کر گھڑی بھر میں من دو من آٹا پسوا لاتی ہو۔ اس وقت گھر گھر سے صبح سویرے چکی کی گھوکر اٹھتی تھی۔ یہ قصہ ریشمے نامی ایک جوان لڑکی کا ہے۔ وہ بھی چکی خوب پیسا کرتی تھی۔ بھرا گھر تھا۔ کھانے پینے کو عام تھا۔ ڈھور ڈنگر نوکر چاکر دو تین سو بیگھے زمین بہت بڑی حویلی اور عیش و آرام کی سب چیزیں موجود تھیں۔"

"جیسے چوہدری الہ داد کے پاس ہیں" نوراں نے کہا۔

"ہاں بالکل ایسے ہی۔ ریشمے کا باپ بھی چوہدری تھا۔ ریشمے جوان تھی۔ سڈول بھرا ہوا جسم۔ لال انگاروں جیسے گال۔ گورا چہرا۔ سیاہ آنکھیں۔۔۔"

"اماں۔ تمہارا رنگ بھی تو گورا ہے۔ جوانی میں تم بھی بہت خوبصورت ہوگی۔"

"دیکھو کہانی میں ادھر ادھر کی باتیں نہ کرو، میں کہاں کی گوری ہوں۔ ریشمے تو شہری عورتوں کی طرح سرخ و سفید تھی۔ جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ باہر نکلتی تو گاؤں کے نوجوان کسی نہ کسی بہانے اسے دیکھنے کے لئے اس کے پاس سے گذرتے۔ ان نوجوانوں میں ایک کریم بھی تھا۔ جوان کا مزارع تھا۔ کریم ان کے گھر بھی اکثر آتا جاتا تھا۔ کبھی بیلوں کو باندھنے جاتا۔ کبھی چارہ کاٹنے، کبھی کسی کام، کبھی کسی۔ ہر بار وہ نظر بچا کر ریشمے کو ضرور دیکھ لیا کرتا تھا۔"

"اور ریشمے بھی اسے دیکھا کرتی تھی؟" نوراں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ریشمے کے دل میں بھی اس کی چاہ پیدا ہوگئی۔"

"اماں کیا یہ سچ ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے؟" نوراں نے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"یہ تو بات سے بات نکلتی ہے۔ تم نے جو ایسی بات شروع کر رکھی ہے۔" نوراں نے شرما کر کہا۔

"اچھا۔ میں یہ بات ہی نہیں سناتی۔ کوئی اور ذکر کرتی ہوں۔"

"نہیں نہیں اماں۔ اب میں کچھ نہیں پوچھوں گی۔ یہی کہانی سناؤ۔ میں اور کچھ نہیں سنوں گی۔"

"اچھا تو پھر کریم اور ریشمے میں ملاقاتیں ہونے لگیں گھر والوں کی آنکھ بچا وہ کہیں نہ کہیں کھڑے ہو کر دو ایک باتیں کر لیتے۔ کبھی وہ کنوئیں پر ملتے۔ کبھی کھیتوں کے کنارے۔"

"بھلا کیا باتیں ہوں گی وہ؟" نوراں پھر پوچھ بیٹھی۔

"بس محبت پیار کی باتیں۔ کریم کہتا — ریشمے تمہیں نہ دیکھوں تو مجھے چین نہیں آتا —"

اس وقت نوراں نے دیکھا کہ بڑھیا کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پیدا ہوگئی ہے۔

"ریشمے جواب دیتی! کریم میرا دل ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہے۔ ایک چاندنی رات کو دونوں کھیتوں کے کنارے ملے۔ کریم نے کہا — ریشمے میں بڑی دیر سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ دل ڈرتا ہے کہ پوچھوں یا نہ پوچھوں۔ آج میں نے ٹھان لی ہے کہ پوچھ ہی لوں گا۔ بات یہ ہے کہ میں تم سے بیاہ۔۔۔۔۔ اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور آواز بھرا گئی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک معمولی مزارع ہے۔ اور ریشمے زمیندار کی بیٹی ہے۔ عین اس وقت دور کسی کے قہقہہ لگانے کی آواز آئی۔ وہ دونوں ڈر گئے۔ کریم کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ کھیتوں میں فصلوں کی سائیں سائیں بھی پراسرار معلوم ہونے لگی۔ یہی فصلیں اور کھیت ان دونوں کی زندگی کی راہوں میں حائل تھے۔ چند لمحوں کے لئے دونوں خاموش رہے۔ کریم پھر آہستہ سے بولا — ریشمے مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت بڑی بات منہ سے نکالی ہے۔ یہ میری دیوانگی ہے۔ کہاں گاؤں کے بڑے زمیندار کی چاند سی بیٹی اور کہاں ان کے کھیتوں میں کام کرنے والا ایک مفلس اور قلاش مزارع۔ جس کا نہ گھر ہے نہ گھاٹ۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ یہ چچا کے روکھے سوکھے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے — اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

ریشمے نے بات کاٹ کر کہا — بس بس کریم، میری نظروں میں تم سب کچھ ہو۔ میرا بس ہو تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ تیرے ساتھ چل دوں۔ حویلیوں

اور پکے مکانوں کو پھوس کی ایک جھونپڑی پر قربان کر دوں۔ ریشمی کپڑوں کو پھونک دوں اور گھر کے کتے ہوئے کھدر کو ریشم سے بڑھ کر سمجھوں.....“
نوراں نے اس موقع پر پھر دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”اماں کیا سچ مچ کسی کی خاطر سب کچھ قربان ہو سکتا ہے؟ امیر آدمی غریبوں کے لئے اپنی دولت عیش آرام چھوڑ سکتے ہیں؟“
”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ رانجھا ہیر کی خاطر اپنی ساری زمینداری چھوڑ چھاڑ ہیر کا چاک بن گیا تھا۔ سسی پنوں کے لئے تھل میں.....
”چھوڑو چھوڑو اماں ان باتوں کو۔ مجھے جلدی بتاؤ ریشمے نے کیا کیا؟“ نوراں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔
”کرنا کیا تھا۔ وہ مجبور تھی۔ اس کے ماں باپ اس کی شادی کے سلسلے میں دوسرے گاؤں کے کسی چوہدری سے بات چیت کر رہے تھے۔ اس نے کریم کو یہ سب حال کہہ سنایا۔ اور اپنی بے بسی اور مجبوری کا ذکر کیا۔“
کریم نے کہا۔ ”اگر تو مجبور ہے تو پھر دیکھ۔ خدا کی اس پاک خشک مٹی پر بیٹھے ہوئے میں اقرار کرتا ہوں کہ اگر تجھ سے شادی نہ ہوئی تو..... ریشمے نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ خدا کے لئے کچھ نہ کہو۔ خدا کے لئے کچھ نہ کہو۔“ مگر ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہو گیا اور بولا ”اے چاند تو میرا گواہ ہے۔ میں تیرے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ اگر میرا بیاہ ریشمے سے نہ ہوا تو ساری عمر کنوارا رہوں گا۔“
اب پھر اسی قہقہے کی آواز آئی۔ دونوں کا دل دہل گیا۔ ریشمے نے کہا۔ اب ہمیں گھر جانا چاہئے۔ دونوں چپ چاپ گھر کو واپس آ گئے۔
”اماں یہ قہقہہ کون مارتا تھا؟“ نوراں نے پوچھا۔
”کوئی بھی نہیں۔ درختوں میں الّو بولتا تھا اور اس کی آواز قہقہے سے ملتی جلتی تھی۔ اچھا تو بیٹی پھر یہ ہوا کہ ریشمے کی شادی جالندھر ڈویژن کے گاؤں میں ایک زمیندار کے بیٹے سے کر دی گئی۔ باپ نے بیٹی کو زیور سے لاد دیا۔ اور شادی پر اتنا دل کھول کر روپیہ خرچ کیا کہ دور دور تک واہ واہ مچ گئی۔ کیوں نہ ہوتا۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔“
”اور کریم کا کیا بنا؟“ نوراں نے غمگین سی صورت بنا کر پوچھا۔
”کریم اس شادی سے ایک دن پہلے گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے وہ ریشمے سے کہہ گیا۔ ریشمے، دنیا میں غریب آدمی کی کوئی قدر نہیں۔ خدا تیرا سہاگ قائم رکھے۔ جس لڑکے کے ساتھ تیری شادی ہوئی ہے وہ مریض ہے۔ بدصورت ہے۔ اور سب سے بری بات یہ ہے کہ آوارہ ہے۔ میرا بس چلے تو اپنے چاند کو یہ گہن نہ لگنے دوں۔ مگر اس کے پاس سب عیبوں کو ڈھانپ لینے والی سونے چاندی کے تاروں سے بنی ہوئی چادر ہے۔ یہ چادر جس کے پاس ہو اس کے سب عیب خوبیاں بن جاتے ہیں۔ اور جس کے پاس نہ ہو اس کی خوبیاں بھی عیب نظر آتی ہیں۔ اچھا ریشمے خدا تمہیں خوش رکھے۔ آباد رکھے۔ اپنے غریب چاہنے والے کو بھول نہ جانا۔“
”اماں! میں پھر ایک بات پوچھوں؟ کیا کریم نے ریشمے کے ماں باپ سے شادی کا ذکر نہیں کیا تھا؟“ نوراں نے پریشان سی صورت بنا کر پوچھا۔
”او ہو یہ تو میں بتانا ہی بھول گئی۔ ریشمے نے ایک دن اپنی ماں سے اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ڈرڈر کر اور سہم سہم کر۔ ماں نے کہا ”بیٹی ہوش کی دوا کر۔ یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ خبردار، جو پھر اس کا ذکر کبھی تو نے کیا۔ تیرے باپ کے کان میں اس بات کی بھنک پڑ گئی تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ بیٹیاں ایسی باتیں نہیں کیا کرتیں۔ کھاتے پیتے گھروں کی لڑکیوں کو کنگالوں کے پلے کیونکر باندھا جا سکتا ہے۔ چوبارے کی اینٹ کو موری میں کون لگاتا ہے؟“
ریشمے نے یہ سب کچھ سنا۔ اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر چپ ہو گئی۔
”اور پھر سسرال میں جا کر خوش خوش رہنے لگی؟“ نوراں نے ناک چڑھا کر طنزیہ انداز میں پوچھا۔
”تو اور کیا کرتی۔ عورت کی شادی جس مرد سے کر دی جائے وہ اسے پسند ہو یا ناپسند۔ اس کی خدمت کرنا اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ ریشمے نے بھی سچے دل سے اپنے خاوند کی خدمت میں وقت گذارنا شروع کیا۔ مگر وہ آدمی ویسا ہی تھا جیسا کریم نے کہا تھا۔ شراب پینا اور بدمعاشوں کے ساتھ دن رات باہر پھرتے رہنا اس کا کام تھا۔ کئی مرتبہ ریشمے بیچاری ساری ساری رات اس کے انتظار میں گذار دیتی۔“
”اسے کریم یاد نہیں آتا تھا؟“ نوراں نے پوچھا۔
”آتا کیوں نہیں تھا۔ اس کے گاؤں سے جو کبھی آتا اس سے کسی نہ کسی بہانے کریم کی بابت ضرور پوچھتی۔ مگر اسے ایک ہی جواب ملتا — کریم

غزل — مسعود حسین

جاں بھی پرسوز ہوا انجام تمنا کیا ہے
میری آنکھوں میں نمی بھی ہو تو واللہ کیا ہے

وہ نہ چاہیں تو مزہ چاہ میں بھی خاک ملے
جی سلگتا ہے سلگتا رہے جلتا ہے جلے

ایک ہی بات کہ چاہت میں سمجھتے نہ بنی
عقل سمجھائے گی، بہلائے گی، پھسلائے گی

کوئی بتلائے کہ جینے کا بہانہ کیا ہے
جس کو کوئی بھی نہ دیکھے وہ تماشا کیا ہے

ہم انھیں چاہیں بھی بالفرض تو ہوتا کیا ہے
ایسی باتوں سے بھلا عشق بھی بنتا کیا ہے

درد بھی شوق بھی بڑھتا ہی تو گھٹتا کیا ہے
دل کی چھلنی سے مگر دیکھئے چھنتا کیا ہے

ہم سے منسوب ہیں امید و تمنا و خیال
کوئی دیکھے تو ذرا آپ کا نقشا کیا ہے

تو جب سے گیا ہے پھر واپس گاؤں میں نہیں آیا۔ اسی طرح دن اور مہینے گذرتے گئے۔ ریشمے کبھی میکے جاتی کبھی سسرال۔ اس کے شوہر کا حال بد سے بدتر ہو گیا۔ ادھر اس کے باپ کی قسمت کا ستارہ بھی گردش میں آنے لگا۔ بیٹی کی شادی پر جو جمع تھی سب خرچ ہو گئی۔ اگلے سال فصلیں اچھی نہ ہوئیں اور اسے اپنے بڑھے ہوئے خرچ کو پورا کرنے کے لئے قرض لینا پڑا۔ پھر یہ حالت رہنے لگی کہ کبھی سو پچاس ہاتھ میں اور کبھی سر پہ۔

"اور کریم کا پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں چلا گیا"۔ نوراں نے پوچھا۔

"کریم کچھ دور ایک گاؤں میں چلا گیا تھا۔ اور وہاں کے بڑے زمیندار کے کھیتوں میں اس نے کام شروع کر دیا تھا۔ محنتی اور جفاکش تو تھا ہی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے وہیں چھوٹا سا مکان بنا لیا۔ اور آرام سے زندگی کے دن کاٹنے لگا"۔

"اب ریشمے کی سنو۔ اس کے میاں دو سال بعد کچھ دن بیمار رہ کر چل بسے۔ شراب نوشی کی کثرت نے اس کی صحت تباہ کر رکھی تھی۔ آخر شراب نے ریشمے کی قسمت کو ڈبو کر ہی چھوڑا۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا باپ اسے اپنے گاؤں واپس لے آیا۔ کریم نے سنا تو افسوس کے لئے آیا"۔

"اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی؟ نوراں قدرے خوش ہو کر بولی۔

"نہیں۔ اس کا سنجوگ ریشمے کے ساتھ لکھا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد ریشمے کے ماں باپ نے کریم کو بلا کر ریشمے کی شادی اس سے کرنے خواہش ظاہر کی"۔

"یہ بھی بہت اچھا ہوا کہ کریم کی دو سال پہلے کی درخواست کا علم ریشمے کے باپ کو نہیں ہوا تھا۔ ورنہ مردوں کی غیرت ریشمے اور کریم کے رستے میں آ کھڑی ہوتی"۔ نوراں نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے اظہارِ خیال کیا۔

"شاید ایسا ہی ہوتا۔ بہر حال کریم اور ریشمے کی شادی ہو گئی۔ اور ریشمے کریم کے نئے گاؤں میں جا کر آرام کی زندگی بسر کرنے لگی"۔

"آخر بچھڑے دلوں کو خدا نے ملا دیا۔ کیا اب بھی دونوں میں ویسی ہی محبت تھی؟" نوراں نے سوال کیا۔

"ہاں، وہ بدستور ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور عمر بھر چاہتے رہے"۔

"اب کیا وہ مر چکے ہیں؟" نوراں نے پھر پوچھا۔

"کریم۔ خدا اسے مغفرت کرے۔ خدا کو پیارا ہو چکا ہے۔ ریشمے ابھی زندگی کے آخری دن کاٹ رہی ہے"۔

"کہاں رہتی ہے وہ بڑھیا۔ میں اسے ملنا چاہتی ہوں؟" نوراں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی کسی کو بتانا نہیں۔ ریشمے میں ہی ہوں۔ تمہاری دادی"۔

نوراں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "سچ کہتی ہو اماں؟ سچ؟ — مگر تمہارا نام ریشمے تو نہیں"۔

"نہیں یہ ریشمے کریم ہم دونوں نے اپنے فرضی نام رکھے تھے۔ یہ ہمارے گاؤں کے تین چار چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیوں کے نام تھے۔ شادی سے پہلے وہ مجھے ریشمے کہا کرتا تھا اور اسے کریم کے نام سے بلاتی تھی۔

اچھا بیٹی اب جاؤ سو رہو۔ اپنی ہڈ بیتی تمہیں سنا چکی ہوں۔ صرف تمہارے اصرار پر کہ کوئی سچی کہانی سناؤں۔ کسی اور کو نہ سناتی پھرنا۔

بڑی اماں سونے کے لئے چارپائی پر دراز ہو گئیں۔ نوراں اٹھی۔ اور اپنے گاؤں کے چھوٹے بچوں کے نام یاد کرنے لگی۔ حمیداں اور شریف یہ دونوں نام اسے پسند آئے۔

اگلے دن وہ کھانا لے کر کھیت کو چلی تو چوہدری الہ داد کا لڑکا اکبر اسے حسب معمول رستے میں ملا۔

نوراں آج پہلے سے زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

"نور! آج تم نے بہت دیر کر دی"۔

"آج سے آپ کا اور میرا نام شریف اور حمیداں رہے گا"۔ نوراں نے آہستہ سے کہا۔

تاکہ اگر ہم ایک دوسرے کا نام لیں تو کسی کو شک نہ گذرے۔

میں حیران ہوں نور نہ نہ حمیداں! یہ تم نے اتنی عقل کہاں سے سیکھی ہے؟

سہانا خواب

شمع کی مانند، جلتا ہوں مگر خاموش ہوں
چشم تر سے اشک حسرت ہیں رواں
جانتا ہوں میں کہ تم نزدیک ہو کر دور ہو
اور حائل ہیں ہمارے درمیاں وہ مشکلات
جن کا حل شاید کسی تدبیر سے ممکن نہیں
آہ اپنی بے بسی کو دیکھ کر
غرق ہو جاتا ہوں بحرِ یاس میں
پھر بھی، — جیسے گھُپ اندھیری رات میں
برق کا شعلہ چمک جائے ذرا سی دیر کو
اور تھوڑی دور سطحِ آب پر آئے نظر
ایک منظر دلفریب

ناؤ میں بیٹھی ہوئی اک نازنیں
جانے کہاں جاتی ہوئی
چار سو پانی میں ہوں بکھرے ہوئے پر کیف پھول
دیدہ زیب و دلفریب!
اور یہ نظارۂ رنگیں چھپے
دفعتاً پھر رات کے ظلمات میں ——
اے دلربا!
جب کبھی تم سے ملاتا ہوں نگاہ
ایک جلوہ دیکھتا ہوں اس سہانے خواب کا
جس کی رنگینی ہے رشکِ نزہتِ باغِ جناں
آہ! پھر؟
غرق ہو جاتا ہوں بحرِ یاس میں

سیفی سوپوری

ایک ملاقات

تعارف کرنے والے نے تو میری آن رکھی تھی
مگر کچھ اس طرح اٹھی نگاہِ بے نیازانہ
کہ خود میری ادائے شاعری کہنے لگی مجھ سے
تم، اور افسانوی خاتون سے اسطرح گھبرانا!

سنا ہے ان کو مجھ سے مل کے مایوسی ہوئی لیکن
خدا شاہد ہے، ان کو سوچ کر میں کانپ جاتا ہوں
نہ جانے کیوں غرورِ صنفِ نازک ہی کی شہ پا کر
میں ان کی زندگی کی تلخیوں کو بھانپ جاتا ہوں

بہر صورت، مجھے جینا ہے، جی لوں گا۔ بہ ظاہر ہے
ہماری زندگی بھی ساحرِ ماحول کا فن ہے
مگر آہستہ چل۔ آہستہ چل، اے سرپھری دنیا!
کہ میرے کانپتے ہاتھوں میں اب تک تیرا دامن ہے!!

سلام مچھلی شہری

پنچھی سے

اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی!
یاں گھر گھر دُکھوں کا ڈیرا
جیون اپنا رین بسیرا
چھایا ہے گھنگور اندھیرا
دور ابھی ہے سکھ کا سویرا
اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی!
اس بستی کے رہنے والے
غربت کے غم سہنے والے
دکھ ساگر میں بہنے والے
اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی!
پھوٹ رہے ہیں خون کے سوتے
حال ہوا یہ ہوتے ہوتے
کڑھتے کڑھتے ملتے روتے
جیون گذرا روتے دھوتے
اُڑ جا اس بستی سے پنچھی! —— اُڑ جا بھولے پنچھی

کرشن موہن

نقوش طاق بستاں

ایران کے شہر کرمان شاہ کے قرب و جوار میں پرانے کتبے اور تاریخی عمارتیں بکثرت ملتی ہیں ان میں سے کچھ ساسانی عہد کی یادگار ہیں اور کچھ آل بویہ کے زمانے کی۔ یہ سب ایلورا اور اجنتا کی طرح پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ ان میں ' طاق بستاں ' کو خاص اہمیت حاصل ہے جو ساسانی زمانے کی یادگار ہے اور دو بڑے کمروں پر مشتمل ہے۔ بڑا کمرہ نسبتاً زیادہ خوبصورت اور سنگ تراشی کا ایک اعلی نمونہ ہے چھوٹے کمرے میں پہلوی زبان کا
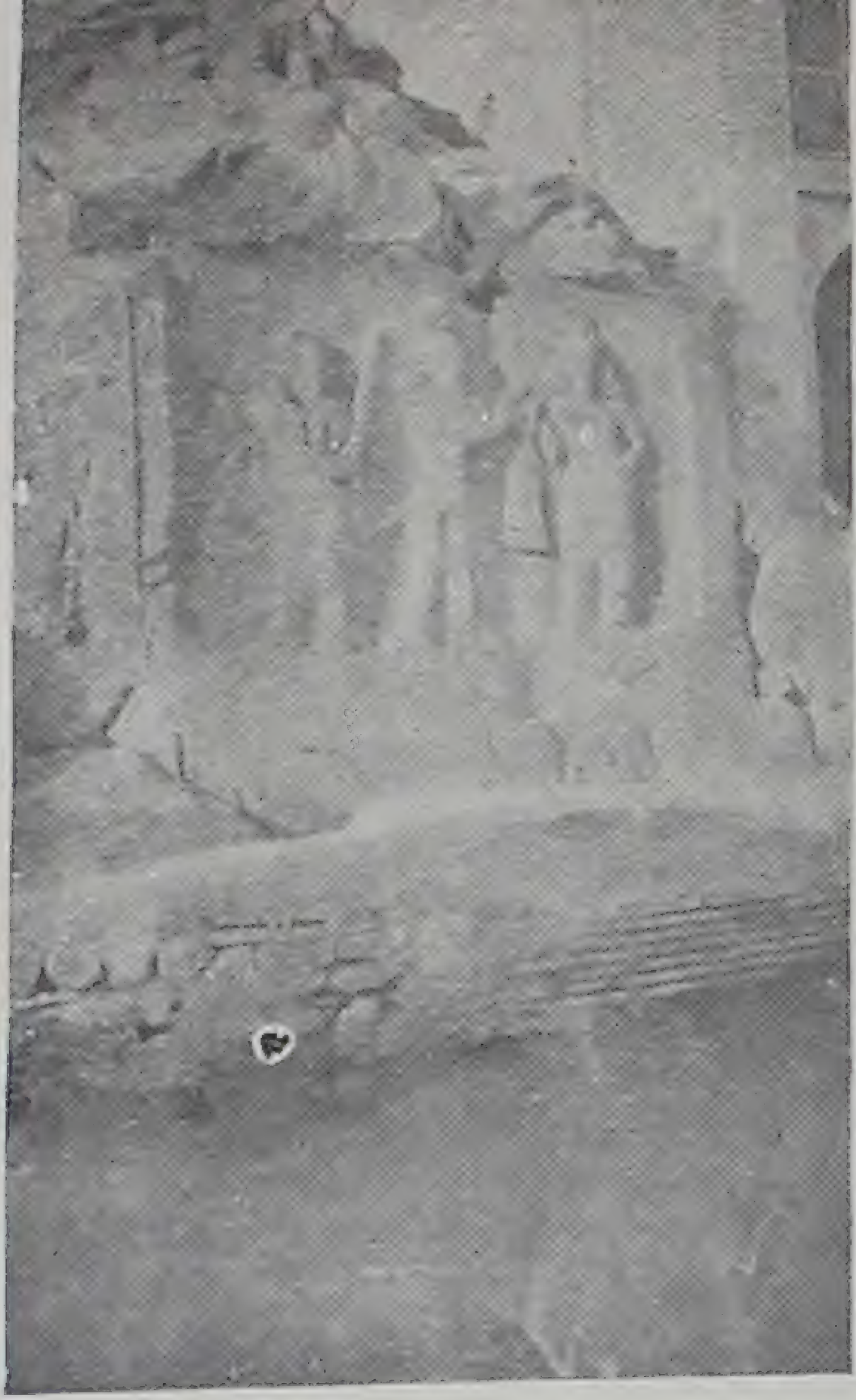
چھوٹے کمرے کے ایک حصے پر یہ چند نقوش باقی رہ گئے ہیں۔

ایک کتبہ خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کمرے کسی بڑی عمارت کے حصے ہیں۔ ان کی بیرونی دیواروں پر پتھروں پر کھدے ہوئے مجسمے ہیں۔ کہیں دو فرشتے ایک تاج کو سنبھالے ہوئے ہیں تو کہیں کوئی نیزہ بردار سپاہی ڈٹا کھڑا ہے۔ کہیں بادشاہ ہاتھ میں تلوار لئے اپنے مصاحبوں کے درمیان موجود ہے تو کہیں شکار کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ طاق بستاں کی ایک خصوصیت پانی کا وہ چشمہ ہے جو ابھی تک جاری ہے۔

محراب دار طاق کے اندر پتھر پر کھدی ہوئی یہ مورتیں ابتک بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

۱۸۵۳ء میں نواب سکندر جہاں بیگم کے عہد حکومت میں بھوپال کی موتی مسجد سنگ سرخ اور سنگ مرمر سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے میناروں پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں اسکی بیرونی وضع قطع اور سیڑھیوں کا انداز بتاتا ہے کہ اسکی تعمیر کا نقشہ تیار کرتے وقت دہلی کی شاہی
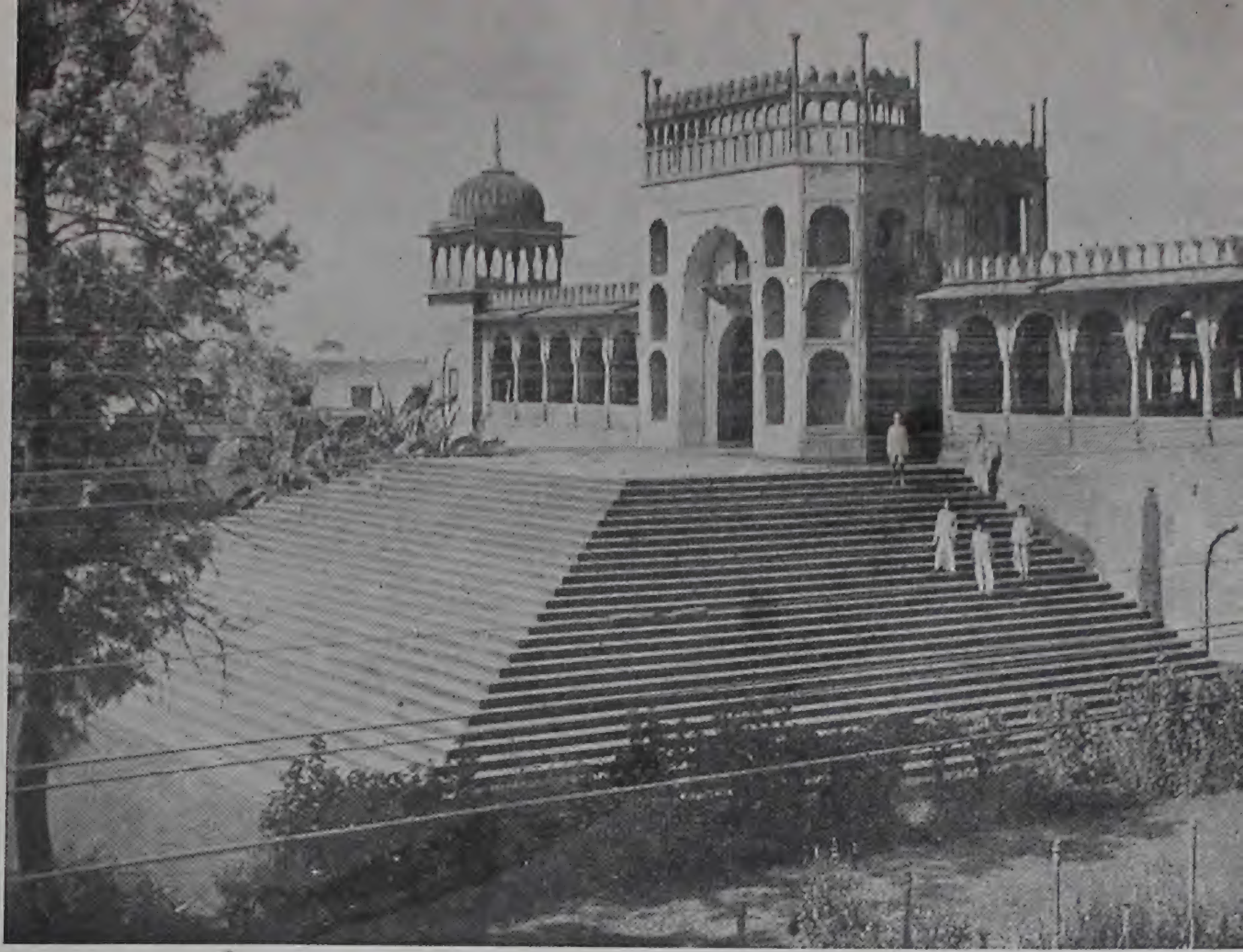
بھوپال کی شاہی مسجدیں

جامع مسجد کو ضرور مدّ نظر رکھا گیا تھا۔ اوپر کی تصویر میں اس مسجد کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ بائیں طرف بھوپال کی نوے سال پرانی جامع مسجد کا ایک دالان دکھایا گیا ہے۔ جوہر لحاظ سے قابل دید ہے۔ اسکی تعمیر کا فخر نواب گوہر بیگم کو حاصل ہوا جو قدسیہ بیگم کے نام سے زیادہ مشہور تھیں۔ یہ مسجد پچیس سال میں بن کر تیار ہوئی اور اسپر ساڑھے پانچ لاکھ روپیہ صرف ہوئے۔ اسکے مینار اور گنبد جن پر سونے کے پترے چڑھے ہوئے ہیں میلوں پرے سے نظر آتے ہیں کیونکہ مسجد کی کرسی بہت اونچی

لیبیا میں

الجدابیہ کے مقام پر هزایکسیلنسی السید ادریس السینوسی کی آمد کے وقت عرب گارڈ کے رضاکار پرچ
لہراکر ان کا استقبال کررھے ھیں۔ ایک جھنڈے کے پھریرے پر « عمر المختار » لکھاھے۔ یہ اس ۸۰ سا
کے بوڑھے سردار کا نام ھے جسے ۱۹۳۱ء میں حفاظت وطن کے الزام میں اطالویوں نے نشانۂ اجل بنادیا

لیبیا میں سینوسی تحریک ۱۸۳۵ء کے لگ بھگ شروع ھوئی تھی۔ اسکا مفصل حال اسی ش
کے صفحہ ۴۷ پر درج ھے۔ هز ایکسلنسی السید ادریس السینوسی اسی تحریک کے خاندان سے تعلق
ھیں۔ جب اطالیہ میں فاشیت کا آغاز ھوا اور اسکے علمبرداروں نے لیبیا والوں پر ظلم و ستم کا سک
شروع کیا تو سید صاحب ترک وطن کرکے یورپ چلے گئے اور وھیں سے اپنی تحریک کو برقرار
اور ھموطنوں کو پنجۂ ظلم سے رھا کرنے کی کوشش کرتے رھے۔ اس دوسری جنگ عظیم سے
اطالیہ کا دم خم ٹوٹ گیا تو لیبیا والوں کو اطمینان کا سانس لینا نصیب ھوا اور سید صاحب بھی بیس
بعد اپنے وطن پہنچ گئے۔ اس صفحے کی تصویریں لیبیا میں ان کی واپسی پر کھینچی گئی تھ

بیس سال کی جلاوطنی کے بعد هز ایکسیلنسی
السید ادریس السینوسی لیبیا میں واپس آئے،
تو ایک بوڑھے ھم وطن نے بڑی گرمجوشی
کے ساتھ قومی دستور کے مطابق ان سے
معانقہ کیا۔ سید صاحب بظاھر بہت متاثر
معلوم ھو رھے ھیں۔

—:o:—

لیبیا میں هز ایکسیلنسی السید ادریس السینوسی
ھم وطنوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے
تقریر کر رھے ھیں۔ تمام اھم قبیلوں کے
نمائندے جمع ھیں۔
←

سائنس کانگریس میں دو برطانوی نمائندے۔ سر هیرالڈ اسپنس
جونز اور پروفیسر ڈڈلے اسٹامپ۔ اول الذکر کوشاهی منجم هونے
کا اعزاز حاصل هے۔

ں کا جلوس جنهوں نے انڈین سائنس
ں سرشانتی سروپ بھٹناگر اور ڈاکٹر
فرمارهے هیں۔

ر پنڈت جواهرلال نهرو برطانیه کے
سن سے مصافحه کر رهے هیں۔

دائیں طرف بیٹھے هوئے پروفیسر ڈی بی وولگن روسی سائنسدانوں کے
اس وفد کے لیڈر تھے جس نے سائنس کانگریس میں شرکت کی۔

آسٹریلیا کی نئی عمارتیں

آسٹریلیا کی عمارتوں کی یہ تصاویر دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ آجکل انہیں نت نئے نقشوں اور نمونوں پر تعمیر کیا جارہا ہے۔ یہ عمارتیں نہ صرف مستحکم اور پائیدار ہیں بلکہ دیدہ زیب اور جاذب نظر بھی ہیں۔ سرکاری دفتروں، تجارتی منڈیوں، عبادتگاہوں، تعلیمی اداروں اور مفاد عامہ کی دوسری عمارتوں میں یہی جدت کارفرما ہے۔ رہائشی مکانوں اور کوٹھیوں میں برطانوی اور امریکی نمونوں ہی کو مد نظر رکھا گیا ہے سوائے اسکے کہ موسم کا لحاظ رکھتے ہوئے برآمدے ذرا وسیع کر دئے گئے ہیں تاکہ گھروالوں کو اچھی طرح دھوپ کھانے کا موقع مل سکے۔ یہ تصاویر رسالہ «آسٹریلیا» سے لی گئی ہیں جو نیویورک سے شائع ہوتا ہے۔

ODDFELLOWS BUILDING
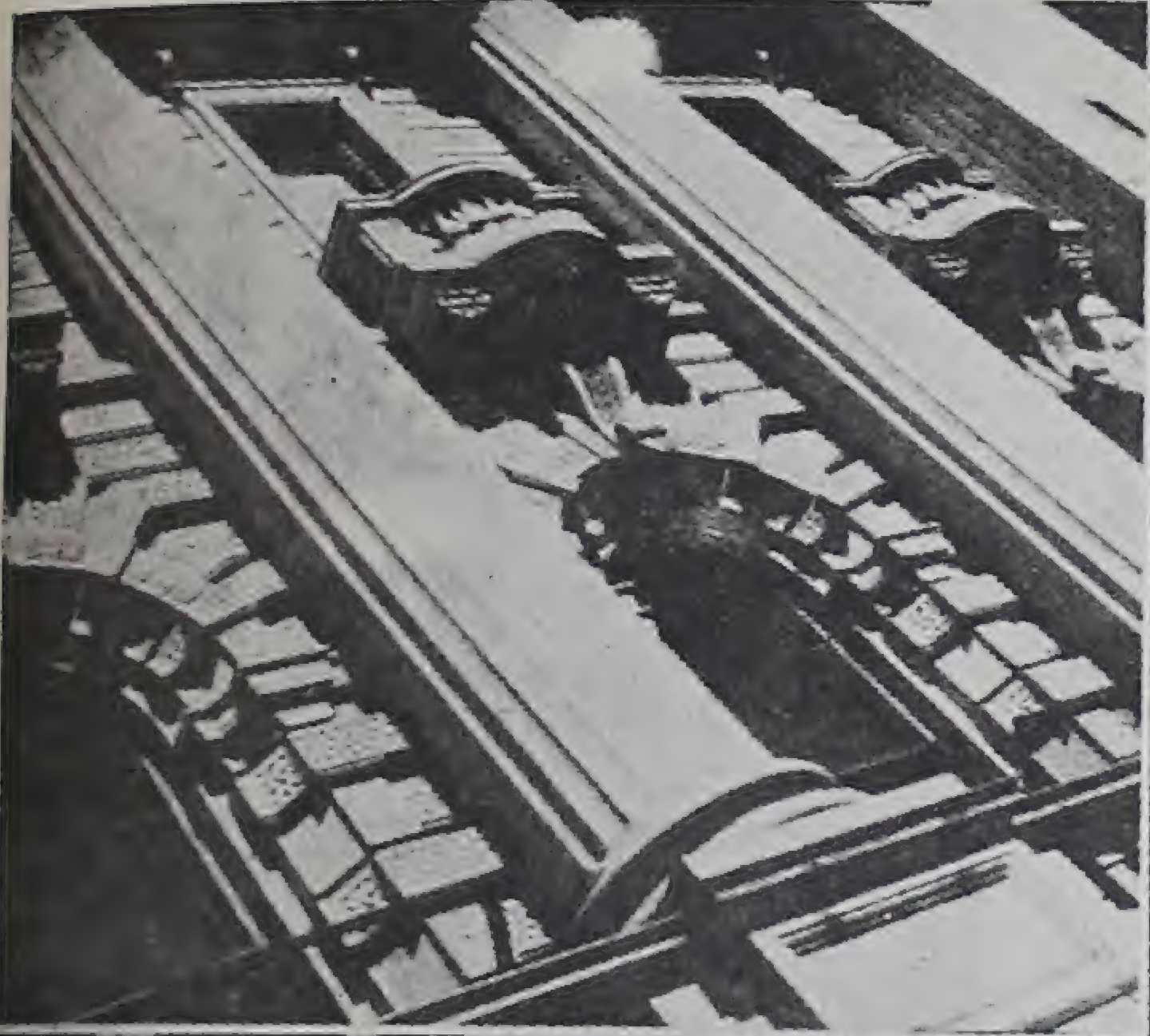
پیرس میں یونیسکو کانفرنس

«یونیسکو» کا پہلا اجلاس ۱۹ نومبر ۱۹۴۶ء کو پیرس میں شروع ہوا تھا۔ یہ تصویریں اسی موقع پر لی گئی تھیں۔ اوپر کی تصویر ان ہندوستانی نمائندوں کی ہے جنھوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ (بائیں طرف سے) پروفیسر بھابھا' سر رادھا کرشنن' خواجہ غلام السیدین' راجکماری امرت کور' سرجان سارجنٹ' مس بوس اور آغا محمد اشرف۔ نیچے دائیں طرف سائنس کا اجلاس ہو رہا ہے جس کے صدر پروفیسر بھابھا تھے۔ بائیں طرف کی تصویر میں دنیا بھر کے نمائندے جمع ہیں اور فرانس کے وزیر اعظم موسیو بیدو **کانفرنس** کا افتتاح کر رہے ہیں۔ یہ تصویریں ہمیں آغا محمد اشرف صاحب نے عنایت کی ہیں۔ اس شمارہ میں آغا محمد اشرف کا مضمون یونیسکو کانفرنس بھی شامل ہے۔ اگلے پرچے میں خواجہ غلام السیدین صاحب کی ایک اہم تقریر کا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ہندوستان کی ایک مشہور فلم ایکٹرس۔ وینا

پنڈت سوریا کانت ترپاٹھی - نرالا

(کانتی چندر سونرکسا)

موجودہ ہندی ادب کے تین سب سے بڑے شاعروں میں سے ایک پنڈت سوریا کانت ترپاٹھی نرالا ایک ہمہ رنگ آرٹسٹ ہیں ۱۸۹۶ء میں بسنت پنچمی کے مہینہ میں نرالا جی بنگال کے ایک گاؤں میں ایک قدامت پسند برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دیہات کی آزاد فضا میں پروان چڑھ کر کشتی، سواری اور موسیقی کا یہ شوقین بچہ ایک لمبا چوڑا اور خوبصورت نوجوان بنا — اور اس کے جسم کا یہی حسن، یہی قوت اس کی شاعری کے جوہر ہیں۔ یہاں تک کہ اب اس کا شمار ہندی کے بہترین فن کاروں میں ہے۔ نرالا کی تعلیم سنسکرت اور بنگالی سے شروع ہوئی اور پھر انھوں نے اردو، فارسی اور انگریزی میں دستگاہ حاصل کی — لیکن سب سے زیادہ قدرت انھیں اپنی مادری زبان اودھی پر ہے۔

انقلاب، نرالا، کی زندگی کی سب سے اہم آواز ہے، پھر بھی ان کا شمار ہندی کے بہترین کلاسیکی شاعروں میں ہوتا ہے۔ اپنی جوانی ہی میں نرالا، بلور کے رام کرشن مشن میں بنگالی رسالے 'سون دایا' کے ایڈیٹر ہوگئے۔ وہاں انھوں نے یوگا اور ویدانت کا مطالعہ کیا۔ ۲۲ برس تک بنگال میں رہ کر وویکانند، ٹیگور اور یورپین کلاسکی مصنفوں کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ بنگال ہی میں انھوں نے اپنی آزاد نظموں کا پہلا مجموعہ شائع کیا۔

نرالا جی ہندی میں آزاد نظم کے بانی ہیں اور اب تک ان کی نظموں کے جو دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں وہ انھیں زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہیں۔ پریمل، گیت کا، انامیکا دیں ان کی بہترین نغماتی شاعری ہے۔ تلسی داس، ان کا غیر فانی ایپک شاہکار ہے۔ بیلا، اور پتے، میں ہیئت اور فکر کے بعض نئے تجربے ہیں۔ نرالا نے چھ ناول بھی لکھے ہیں اور ان کا شمار ہندی کے بہترین کلاسیکی اور رومانی ناول نگاروں میں ہے۔ وہ چھ سوانح عمریوں کے بھی مصنف ہیں اور ہندی میں اس لحاظ سے ان کی جدت پسندی آپ اپنی مثال ہے۔ نرالا کی کہانیوں کے بھی چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے بھی ہندی میں نرالا کا کوئی جواب نہیں — علم وفضل، وقت نظر کے ساتھ ساتھ ایک ہمدردانہ نظر رکھنے والا نقاد۔ ان کی تین تنقیدی کتابیں چھپ بھی چکی ہیں اور اب تک ان کی تصانیف کی تعداد ۳۵ ہے۔

نرالا موسیقی، رقص اور مصوری کا ایک خمیری مجموعہ ہے۔ اسے اس کا احساس بھی ہے اور اس نے آج تک کہیں اپنا سر نہیں جھکایا۔ لیکن اس کے سر نے غریبوں کے آگے جھکنا سیکھا ہے۔ وہ اپنا سب کچھ غریبوں کو دے سکتا ہے — اس کا تن من دھن سب انھیں کے لئے ہے۔ وہ ہندی کا بے نادار لیکن سب سے زیادہ سخی شاعر ہے۔ اس کے سینے میں انسان کا دل ہے اور وہ ہندی کے لئے ایک بڑی دولت ہے۔

بھر دیتے ہو

بھر دیتے ہو بار بار پریہ، کرونا کی کرنوں سے
کشبدھ ہردے کو پلکت کر دیتے ہو!
میرے انتر میں آتے ہو دیو نرنتر
کر جاتے ہو ویتھا بھار لگھو
بار بار کر کنج بڑھا کر!
اندھکار میں میرا رودن
سکت دھرا کے انچل کو
کرتا ہے شنر شنر
کسم کپولوں پر وے لال شنشر کنڑ
تم کرنوں سے اشرو پونچھ لیتے ہو
نو پربھات جیون میں بھر دیتے ہو

بھر دیتے ہو

اے مرے محبوب! تم بار بار دردمندی کی کرنوں سے بھر دیتے ہو
میرے غم نصیب دل کو شادماں کر دیتے ہو
اے میرے دیوتا! تم سدا میری یاد میں آتے ہو
اور دکھ کے بوجھ کو ہلکا کر جاتے ہو
بار بار ہاتھ کا کنول بڑھا کر!
اندھیرے میں میرا رونا
زمین کے آنچل کو
ہر لمحہ ہر گھڑی نم کر دیتا ہے
کنول کے گالوں پر وہ لال، سردی کی شبنم
تم کرنوں سے آنسو پونچھ لیتے ہو
(اور) زندگی کو ایک نئی صبح سے بھر دیتے ہو

جواری

افسانہ

غلام عباس

پولیس نے ایسی ہوشیاری سے چھاپہ مارا تھا کہ ان میں سے ایک بھی بچکر نہیں نکل سکا تھا۔ اور پھر جاتا بھی تو کہاں۔ بیٹھک کا ایک ہی زینہ تھا جس پر پولیس کے سپاہیوں نے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا۔ رہی کھڑکی۔ اگر کوئی من چلا جان کی پروا نہ کرکے اس میں سے کود بھی پڑتا تو اول تو اس کے گھٹنے ہی سلامت نہ رہتے۔ اور بالفرض زیادہ چوٹ نہ آتی تو بھی اسے بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔ کیونکہ پولیس کے نصف درجن سپاہی نیچے بازار میں بیٹھک کو گھیرے ہوئے کھڑے تھے —— اور یوں وہ سب کے سب جواری جن کی تعداد دس تھی پکڑ لیے گئے تھے۔

اتفاق سے اس دن جو جواری اس بیٹھک میں آئے تھے۔ ان میں دو ایک پیشہ وروں کو چھوڑ کر باقی سب کبھی کبھار کے شوقیہ کھیلنے والے تھے اور یوں بھی عزت دار اور آسودہ حال تھے۔ ایک ٹھیکہ دار تھا۔ ایک سرکاری دفتر کا عہدہ دار۔ ایک مہاجن کا بیٹا تھا۔ ایک لاری ڈرائیور تھا اور ایک شخص چمڑے کا کاروبار کرتا تھا۔

ان میں دو شخص ایسے بھی تھے جو بے گناہ پکڑ لیے گئے تھے۔ ان میں ایک تو من سکھ پٹواری تھا۔ ہر چند وہ کبھی کبھی کھیل بھی لیا کرتا تھا۔ مگر اس شام وہ قطعاً اس مقصد سے یہاں نہیں گیا تھا۔ وہ دکان پر ایک دوست کو بٹھا کر دس کے نوٹ کی ریزگاری لینے آیا تھا۔ ریزگاری لے چکا تو چلتے چلتے ایک کھلاڑی کے پتوں پر نظر پڑ گئی جو غیر معمولی طور پر اچھے تھے۔ یہ دیکھنے کو کہ وہ کھلاڑی کیا چال چلتا ہے۔ یہ ذرا کی ذرا رکا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آ گئی بس پھر کہاں جا سکتا تھا!

دوسرا شخص ایک عمر رسیدہ وثیقہ نویس تھا۔ جو ٹھیکہ دار کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا اس بیٹھک میں پہنچ گیا تھا۔ ٹھیکہ دار سے اس کی پرانی صاحب سلامت تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ٹھیکہ دار اس کے بیٹے کو بھی چھوٹا موٹا ٹھیکہ کا کام دلا دیا کرے۔ یہ وثیقہ نویس کئی دن سے ٹھیکہ دار کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اور آخر ملا بھی تو کہاں جہاں نہ تو ٹھیکہ دار کو کھیل سے فرصت تھی۔ اور نہ اسے اتنے آدمیوں کے سامنے مطلب کی بات کہنے کا یارا۔ ٹھیکہ دار کھیل میں منہمک تھا اور وثیقہ نویس اس سوچ میں کہ وہ کون سی ترکیب ہو سکتی ہے۔ جس سے یہ کھیل گھڑی بھر کے لئے ختم ہو جائے اور دوسرے سب لوگ اٹھ کر باہر چلے جائیں مگر اس قسم کی کوئی صورت اسے نظر نہ آتی تھی۔ اُدھر ٹھیکہ دار تھا کہ گھنٹوں سے برابر کھیلے چلا جا رہا تھا۔ آخر وثیقہ نویس مایوس ہو کر چلنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے ہی میں پولیس آ گئی اور جواریوں کے ساتھ اسے بھی دھر لیا گیا۔

ان دونوں نے اپنی بے گناہی کے بہتیرے ثبوت پیش کئے مگر پولیس نے ایک نہ منی۔ باقی کے لوگ پولیس کے اس اچانک دھاوے سے ایسے دم بخود رہ گئے تھے کہ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ سپاہیوں نے بڑی حفاظت کے ساتھ پہلے تو سب کو بیٹھک سے نیچے اتارا۔ پھر ان کے گرد گھیرا ڈال انھیں پیدل تھانے لے چلے۔

یہ بھی غنیمت ہی ہوا کہ جھٹپٹا وقت تھا۔ دھندلکے میں زیادہ لوگوں کی نظر نہ پڑی اور یہ لوگ کوٹ کے کالر یا پگڑی کے شملے میں منہ چھپائے، تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جلد ہی تھانے پہنچ گئے۔ جہاں تھانہ دار کے حکم سے ان سب کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حوالات کی ایکانت میں جب ان لوگوں کو تماشائیوں کی استہزا بھری نظروں اور سپاہیوں کے کڑے تیوروں اور کرخت لہجوں سے امان ملی اور جان پہچان کے لوگوں سے مڈبھیڑ کا خوف بھی نہ رہا۔ تو قدرتی طور پر سب سے پہلے ان کا دھیان بیٹھک کے مالک کی طرف گیا جو ان سب کے ساتھ ہی حوالات میں بند تھا۔ ہر شخص اسی کو اپنی بربادی کا باعث سمجھتا تھا چنانچہ سب کو اس پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اگر یہ شخص احتیاط کو کام میں لاتا۔ مکان کو سرائے نہ بنا لیتا کہ ہر ایرا غیرا منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ بیٹھک کے باہر کسی مخبر کا انتظام کرتا۔ نیز پولیس والوں سے اپنے تعلقات خوشگوار رکھتا تو ان لوگوں پر برا وقت کبھی نہ آتا۔

بیٹھک کے مالک کا نام تو خدا جانے کیا تھا مگر سب لوگ اسے نکّو نکّو کہا کرتے تھے۔ یہ شخص درمیانے قد اور چھریرے بدن کا تھا۔ شربتی آنکھیں جن میں سرمے کے ڈورے۔ سفید رنگت۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ چہرے پر چیچک کے مٹے مٹے سے داغ۔ دانت پانوں کے کثرت استعمال سے سیاہی مائل سرخ ہو گئے تھے۔ گھنگھریالے بال جو ہر وقت آنولے کے تیل میں بسے رہتے۔ بائیں طرف سے مانگ نکلی ہوئی۔ دائیں طرف کے بال ایک لہر کی صورت میں پیشانی پر پڑے ہوئے۔ ململ کا کرتا جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے۔ گلے میں چھوٹا سا سونے کا تعویذ۔ سیاہ ڈورے میں بندھا ہوا۔ اس کا کرتا ہمیشہ اجلا ہوتا۔ مگر دھوتی ہمیشہ میلی۔ سردیوں میں اس لباس پر ایک پرانا سرخ دوشالہ زری کے حاشیے والا اوڑھ لیا کرتا۔ اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی تھی۔ جتنی دیر میں کوئی مشاق سے مشاق جواری ایک دفعہ تاش پھینٹے اور بانٹے۔ یہ اتنی دیر میں کم سے کم دو دفعہ تاش پھینٹا اور بانٹ لیتا تھا۔

نکّو پہلے ہی سے اس حملے کے لئے تیار تھا۔ پولیس کے چھاپہ مارنے سے لے کر اس وقت تک تو اس نے چپ سادھے رکھی تھی اور اس سارے قضیے میں اس کا رویہ ایک بیگانے کا سا رہا تھا۔ مگر اب جبکہ سب طرف سے اس پر تیز تیز نظروں کے حملے شروع ہوئے تو اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنی مدافعت میں ایک لطیف مسکراہٹ جس میں خفیف سی شوخی بھی ملی ہوئی تھی، اپنے ہونٹوں پر طاری کی۔ یہ مسکراہٹ چند لمحے قائم رہی۔ پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ سب پر ایک نظر ڈالی اور بڑی خود اعتمادی کے

لہجہ میں یوں کہا:۔

"آپ لوگ بالکل بھی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے ہاں پچھلے پانچ برس میں آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ اسے تو، کیا کہنا چاہیئے، مذاق سمجھو مذاق!"

جواریوں نے نکو کی اس بات کو سنا پر اس سے ان کے غصے میں ذرا بھی کمی نہ ہوئی۔ بعض نے گردن ہلائی، بعض نے بازو جھٹک دیئے۔

"ہوں۔ مذاق سمجھیں۔ یہ اچھی رہی!" ٹھیکہ دار نے کہا۔

"لاحول ولاقوۃ" چمڑے کے سوداگر نے ذرا چمک کر کہا۔ "عجب آدمی ہو یار۔ یہاں لاکھ کی عزت خاک میں مل رہی ہے اور تم اسے مذاق بتا رہے ہو!"

"ناراض کیوں ہوتے ہو شیخ جی" نکو نے کہا "میں نے جو کہا۔ آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے نکلیئے گا مونچھوں پر تاؤ دیتے!"

"چل ہٹ۔ بہاڑ یا کہیں کا" ٹھیکہ دار نے کہا۔

"بہاڑیا کون؟ میں؟" نکو نے تنک کر کہا۔ "خیر جو جی میں آئے کہہ لو۔ مگر میں پھر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی پر بھی آنچ تک نہ آئے گی"

وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا اسے جوئے سے سخت نفرت تھی مگر جب کبھی اس کی بیوی، بچوں کو لیکر میلے جاتی تو اسے اس بیٹھک ہی کی سوجھتی۔ دفتر سے اٹھ کر سیدھا وہیں کا رخ کیا کرتا ہر بار ہارتا اور اپنے کو سنتا عہد کرتا پھر کبھی نہ آؤں گا۔ مگر اگلے روز سب سے پہلے پہنچتا۔ اس شخص نے نکو کی یہ بات سنی ان سنی کر کے فریاد کے لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"ارے بھائی میں لٹ گیا۔ میں سرکاری آدمی۔ میری عزت دو کوڑی کی ہوگئی ہائے میرے بیوی بچے۔ نکو تو نے مجھے برباد کر دیا، ہائے ——"

"سنو تو سہی ملک صاحب ——"

"ارے کیا خاک سنوں، ہائے وہ کولسا منحوس دن تھا جب میں نے تیری صورت دیکھی۔ ارے یار دیں سرکاری ملازم۔ اگر میرے دفتر والوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو بدنامی —— ارے بدنامی کو تو گولی مارو۔ یہاں پندرہ برس کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ ہائے میرے بیوی بچے ——"

مہاجن کا بیٹا جس نے دولت کمانے کا یہ سہل اور دلچسپ طریقہ نیا نیا سیکھا تھا۔ اب تک تو بڑے ضبط سے کام لے رہا تھا۔ مگر ملک کا یہ واویلا سن کر یکبارگی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"صبر کرو چھوٹے شاہ جی صبر کرو۔" نکو نے کہا: "تم تو یار عورتوں کی طرح رونے لگے۔ مرد بنو۔ ارے بھائی یہ تو بات ہی کچھ نہیں ہے۔"

"میرے پتاجی کو پتہ چل گیا۔" مہاجن کے بیٹے نے سسکیاں لے لے کے کہا۔ "تو وہ ایک دم مجھے گھر سے نکال دینگے۔"

"ارے یار چھوڑو بھی۔ کوئی گھر سے نہ نکالے گا"، نکو نے کہا۔

"نکو" ملک نے کہا: "یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔"

"ملک صاحب" نکو نے پر زور لہجہ میں کہا: "آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں۔ آپ میری بات مانیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ آپ پر ذرا آنچ نہ آئے گی۔ یوں نکال لاؤں گا جیسے مکھن میں سے بال نکالتے ہیں۔"

"بس رہنے دے بھائی"۔ ملک نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا: "اگر یہی دم خم تھا تو پولیس کو آنے ہی کیوں دیا ہوتا!"

"ملک صاحب آپ میری بات مانیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں آپ کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ بات اصل میں یوں ہے کہ تھانے دار اپنا ہی آدمی ہے۔ سمجھے آپ۔ وہ میرا بڑا مہربان ہے۔ وہ آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ میرے منہ پر تھوک دینا اگر کچھ کہا"

نکو کی یہ بات سن کر سب جواری پل بھر کو خاموش کچھ سوچتے رہے بعض تو ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس کی بات پر یقین کر لینا چاہتے تھے اور بعض کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکے کہ انھیں نکو پر بھروسہ کرنا چاہیئے یا نہیں۔ البتہ یہ ظاہر تھا کہ رفتہ رفتہ ان کا غصہ اترتا جا رہا تھا۔

"دیکھو نکو" چمڑے والے شیخ جی نے کہا "میں سو پچاس کی پروا نہیں کرتا۔ مگر میری عزت بچ جائے ویسے بات تو کچھ بھی نہیں ہے اور یوں خود میرا بہنوئی سب انسپکٹر پولیس ہے مگر توبہ توبہ کسی سے کہنے والی بات ہے!"

"شیخ جی۔ آپ ذرا بھی جلیتا نہ کریں۔ میں جو کہہ رہا ہوں اسے آپ مذاق ہی سمجھیں۔ کبھی کبھی دل لگی کر لیا کرتا ہے میرا یار۔"

"کون؟" من سکھ پنواڑی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ وہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں کو اس مصیبت میں اپنا ساجھی دیکھ کر اپنا دکھڑا بھول گیا تھا۔

"اجی یہی آپ کے تھانے دار صاحب بہادر" یہ کہہ کر نکو ہنس پڑا۔

وہ جواری جو لاری چلاتا تھا کونے میں کھڑا کچھ دیر نکو کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا:۔

"دیکھو نکو۔ مجھے صبح سویرے لاری میں خشک میوہ بھر کے دورے جانا ہے۔ سیٹھ وہاں میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ اگر تیری واقعی یہاں کسی سے واقفیت ہے تو کوئی ایسی ترکیب کر کہ میں صبح سے پہلے پہلے یہاں سے خلاصی پا جاؤں۔"

یوں تو دھیرے دھیرے سبھی لوگ آخر کار نکو کی باتوں پر کان دھرنے لگے تھے مگر اس لاری ڈرائیور نے جس لہجہ میں نکو سے خطاب کیا۔ اس نے قطعی طور پر نکو کے ساتھیوں میں اسکا اقتدار قائم کر دیا۔ نکو نے بھی اسے محسوس کیا اور اپنی اس کامیابی پر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ البتہ لاری ڈرائیور نے جماعت سے علیحدہ ہو کر تنہا اپنی ذات کے لئے جو سفارش کی تھی اس کو سب نے ناپسند کیا اور اسے لاری ڈرائیور کی خود غرضی اور کمینگی پر محمول کیا گیا۔

نکو نے، جس کے لہجہ میں اب اور بھی زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ لاری ڈرائیور سے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا:۔

"مرزاجی میری جان۔ گھبراؤ نہیں۔ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

انتظام ونتظام خاک نہیں ہوگا۔" اچانک وثیقہ نویس نے جھلاکر کہا۔

"مرزا تم بھی اس ڈینگیے کی باتوں میں آگئے جو سر پر پڑی ہے اسے خود ہی بھگتو۔"

نکو نے وثیقہ نویس کے اس غیر متوقع حملے کو بڑی چابکدستی سے روکا۔ وہ کھل کھلاکر ہنس پڑا۔

"تو بڑے میاں کی بات سنو،" اس نے کہا۔" ہوں انتظام نہیں ہوگا اور یہاں مال جو کھلایا جاتا ہے ہر مہینے بھائیوں میں پھر کہتا ہوں کہ اسے مذاق ہی سمجھو۔ میں ہندو مسلمان والی قسم کھاکے کہتا ہوں کہ کسی کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ وہ یوں کہ تھانے دار ——— اب کیا بتاؤں ہتیں"۔ وہ ہنس پڑا۔ "کہہ جو دیا اپنا ہی آدمی ہے۔ اب تم کہلوا کے ہی رہوگے۔ پر ذکر و کرنہ کر بیٹھنا کسی سے، ورنہ پھنس جاؤگے۔ میرا دوش نہیں ہوگا وہ بات یوں ہے کہ تھانے دار ——— اب تم سے کیا چھپانا ——— بھئی میری اس کی رشتہ داری ہے۔ سن لیا! کیوں بڑے میاں اب تو ہوگئی تسلی۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو پچھلے پانچ برس سے اتنے بڑے شہر میں یہ دھندا بھلا کیسے چلتا رہتا۔"

نکو نے اپنے چاروں طرف نظر ڈالی۔ اقتدار کی عمارت پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہوچکی تھی۔

ان جواریوں میں ایک شخص تھا جس کے بشرے سے کوئی صدمہ یا رنج ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سارے واقعہ کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا وہ ۲۸ برس کا ایک دبلا پتلا نوجوان تھا۔ لباس اور وضع قطع کی طرف سے خاصا بے پروا معلوم ہوتا تھا۔ مدت ہوئی اس شخص نے ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایک خاصی معقول رقم ہار دی تھی بس اسی دن سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ جس روز ہاری ہوئی رقم کو واپس جیت لوں گا جوئے کا پھر کبھی نام نہ لوں گا۔ اس بیٹھک میں آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے کسی باغ میں بیٹھ کر کھیل کا ایک پروگرام سا بنا لیا کرتا۔ چالیس تک سوتح رکھتا۔ بے حد احتیاط سے کھیلتا۔ نہ تاؤ کھاتا نہ جوش میں آتا۔ مگر بدقسمتی سے ہاری ہوئی رقم روز بروز بڑھتی ہی چلی جارہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا قرض بھی۔

اس شخص کو رہائی یا قید اور جرمانے کا تو ذرا غم نہ تھا۔ البتہ اس بات کی فکر ضرور تھی کہ یہ سب کے سب ڈرپوک ہیں۔ بچ گئے جب بھی اور پھنس گئے جب بھی اس بیٹھک کا پھر کبھی رخ نہ کرینگے۔

اُدھر نکو نے اب حالات پر پورا قابو پا لیا تھا۔ اگرچہ وہ رات رات میں کسی کی مخلصی کا بھی انتظام نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح ہر شخص کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ تھانے دار اگر اسکا نزدیب کا نہیں تو دور کا قرابت دار ضرور ہے اور صبح ہوتے ہی اسے رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سب لوگ زمین پر وہ پھٹے پرانے بدبو دار کمبل بچھا کر جو سپاہیوں نے لا دیئے تھے، نچنت سے ہوکر پڑ رہے۔

"اوہو غضب ہوگیا!" اچانک نکو نے کہا اور وہ لیٹے لیٹے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیوں کیوں خیر تو ہے؟" اندھیرے میں کئی جواریوں نے پوچھا۔

"بھئی اگر پتہ ہوتا کہ یہاں رات کاٹنی پڑے گی تو تاش ساتھ لیتے آتے۔ اور مزے سے ساری رات کھیلتے۔۔۔۔۔ کہو تو ابھی کسی سپاہی کو بھیجکر تاش اور موم بتی منگا لوں؟"

"نہ نہ بابا معاف کرو،" سب نے یک زبان ہوکر کہا۔

"تم جانو" نکو نے بے پروائی سے کہا گویا ایسا نہ کرنے میں انہیں کا نقصان ہے۔ "اچھی خاصی دل لگی رہتی۔ صبح کو تھانے دار کو سناتے تو وہ بھی خوب ہنستا۔۔۔۔"

اگلے روز صبح کو کوئی نو بجے کے قریب ایک سپاہی حوالات کے سلاخ دار دروازے کے باہر آکر کھڑا ہوا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا:۔

"او جوارِیو اٹھو۔ تمہاری داروغہ صاحب کے سامنے پیشی ہے۔"

جواری دیر سے اس حکم کے منتظر تھے۔ سب کی نظریں بے اختیار نکو کی طرف اٹھ گئیں نکو نظریں ترچھی کرکے ایک خاص ادا سے مسکرا دیا۔

پانچ منٹ کے بعد یہ دسوں آدمی تھانے کے چھوٹے سے میدان میں قطار باندھے کھڑے تھے۔ پانچ منٹ، دس منٹ۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا مگر تھانے دار کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس دوران میں نکو برابر اپنے لطیفوں، پھبتیوں اور ہنسی مذاق کی باتوں سے اپنے ساتھیوں کا جی بہلاتا رہا مگر جب ایک گھنٹہ گزر گیا اور تھانے دار نظر نہ آیا تب تو سب جواری بہت گھبرائے۔ ہنسی ان کے ہونٹوں سے غائب ہوگئی۔ سب کے چہرے اتر گئے اور ایک بدگمانی کی لہر ان میں پھیل چلی وہ بار بار فکرمندی کے ساتھ نکو کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے اور نکو جواب میں ہر ایک کو ہاتھ سے صبر کا اشارہ کر دیتا۔ اس عرصے میں دو تین سپاہی ان جواریوں کے پاس سے گزرے اور نکو نے ہر ایک کو "خان صاحب جی" "خان صاحب جی" کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ مگر نہ تو انہوں نے نکو کی بات کا کوئی جواب دیا اور نہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

آخر جب انہیں کھڑے کھڑے پورے دو گھنٹے گزر گئے اور انکی ٹانگیں تھک کر چور ہوگئیں تو ایک سیاہ لاری تھانے کے اندر داخل ہوئی۔ اس میں سے تھانے دار اور کئی سپاہی نکلے۔ تھانے دار کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے اور سپاہیوں کے کندھوں پر بندوقیں۔ انہیں خالی ہاتھ لوٹتے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ جس مہم پر وہ صبح ہی صبح گئے تھے اس میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی اور یہ مہم ضرور کچھ بڑی ہی اہم مہم ہوگی، جبھی تو تھانے دار پریشان پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

نکو دور ہی سے تھانے دار کو دیکھ کر اچھل پڑا۔

"وہ آگیا میرا موتیوں والا" اس نے کہا "بس اب گھبراؤ نہیں۔ دو تین ہی منٹ میں بیڑا پار ہوا چاہتا ہے۔"

یہ کہہ کر نکو نے دور ہی سے تھانے دار کو ایک فرشی سلام کیا۔ تھانے دار کی یا تو اس پر نظر نہیں پڑی یا پھر اس نے دانستہ نظریں پھیر لیں اور وہ سپاہیوں کی

بارکوں میں چلا گیا۔

"بکّو" وثیقہ نویس نے طعن آمیز لہجہ میں کہا "میں جانوں تھانے دار کی تم پر نظر نہیں پڑی ورنہ وہ تمہارے سلام کا جواب تو ضرور دیتا"۔

"اجی توبہ کرو" بکّو نے کہا۔ "تھانے دار میرے سلام کا جواب کبھی نہیں دیگا۔ بھائی وہ اس وقت رعب میں ہے رعب میں۔ کیا سمجھے! تھانے داری ہے کچھ مذاق تھوڑا ہی ہے۔ ہم سے بیدھے منہ بات کرے تو سپاہیوں پر رعب کیسے جمارہے۔ یکل کو یہی سپاہی اُسے ناک چنے نہ چبوادیں اور سپاہی تم جانو مداری کے بندر کی طرح ہوتے ہیں کہ جب تک لاٹھی نظر آتی رہے۔ ڈگڈگی پر ناچتے رہتے ہیں، جہاں مداری نے ذرا ڈھیل دی لبس لگے اینٹھنے، سر پر سوار ہونے ......"

پانچ منٹ کے بعد تھانے دار چند سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا بارکوں میں سے نکلا اور ان جواریوں کے پاس سے گذرتا ہوا تھانے کے پھاٹک پر جا کھڑا ہوا اور وہاں کھڑے کھڑے بدستور سپاہیوں سے باتیں کرتا رہا۔

اتنے میں تھانے کے دفتر میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ذرا سی دیر میں ایک سپاہی دوڑتا ہوا تھانے دار کے پاس پہنچا۔ جب تھانے دار تنہا واپس آ رہا تھا تو بکّو نے ایک بار پھر اسے سلام کیا، تھانے دار نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر میں چلا گیا۔

"کہا تھا نا" بکّو نے فتحمندانہ لہجہ میں کہا "میرے سلام کا جواب نہیں دیگا۔ کیوں دیا جواب؟"

سب جواری خاموش رہے۔

"ایک دن" بکّو نے پھر کہنا شروع کیا "تھانے میں بس وہ اور میں ہی تھے۔ کوئی سپاہی آس پاس نہیں تھا بس پھر کیا تھا۔ اتنی گدگدیاں کیں کہ ہنسا ہنسا کے بُرا حال کر دیا"۔

تھانے دار کوئی آدھ گھنٹے تک دفتر کے اندر ہی رہا۔ یہ لوگ پھر بے صبر ہو چلے تھے کہ اتنے میں وہی سپاہی جس نے صبح آ کر بیٹھی کی اطلاع دی تھی، دفتر سے نکلا اور سیدھا ان کے پاس آ کر کہنے لگا:۔

"او جواریو! سنو۔ داروغہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم سب کے سب دھوتی پاجامہ کھول کے زمین پر ایک قطار میں اوندھے لیٹ جاؤ۔ پھر تم میں سے سرے والا آدمی ایک ایک کرکے اُٹھے اور ہر ایک کے دس دس جوتے لگا کے خود دوسرے سرے پر اوندھا لیٹتا جائے۔ غرض اسی طرح سب کے سب باری باری ہر ایک کے دس دس جوتے لگائیں"۔

تھانے دار کا یہ حکم اتنا غیر متوقع تھا کہ سب جواری ہکّا بکّا رہ گئے، اور سراسیمہ ہو کر سپاہی کا منہ تکنے لگے۔

"اُلّوؤں کی طرح میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اگر حکم سمجھ میں نہ آیا ہو تو پھر سنا دوں؟" یہ کہہ جواب کا انتظار کئے بغیر سپاہی نے وہی الفاظ پھر دہرا دیئے۔

اس پر وثیقہ نویس اور من سکھ نیوا اڑی بے اختیار آگے بڑھ کر سپاہی کے قدموں سے لپٹ گئے۔

"خانصاحب ہم بالکل بے قصور ہیں"۔ انہوں نے یک زبان ہو کر گڑگڑا کر کہا "یہ سب لوگ گواہی دینگے کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں جس وقت پولیس آئی ہم نہ تو کھیل رہے تھے اور نہ اس ارادے سے وہاں گئے تھے۔ ہم بے گناہ ہیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم بالکل بے قصور ہیں"۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا" سپاہی نے کہا "داروغہ صاحب کا یہی حکم ہے"۔

"خان صاحب جی! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ آپ ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر حضور سے کہہ دیں کہ ہم دونوں بے گناہ پکڑے گئے ہیں۔ سب لوگ اس بات کی گواہی دیتے ہیں"۔

"میں گواہی ووہی کچھ نہیں جانتا" سپاہی نے کہا "داروغہ صاحب نے سب کے لئے یہی حکم دیا ہے ہاں اور سنو۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ راضی نہ ہوں تو ان سب کو پھر حوالات میں بند کر دیا جائے۔ دیکھو دیر نہ کرو۔ مجھے داروغہ صاحب کے ساتھ ابھی ابھی باہر جانا ہے۔ لاری تیار کھڑی ہے۔ تم نے دیر کی تو میں پھر سب کو حوالات میں بند کر دوں گا"۔

وثیقہ نویس اور من سکھ دونوں مایوس ہو کے پھر قطار میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کا یہ انجام دیکھ کر کسی جواری کو لب ہلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور وہ سخت پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ان کی نظریں بار بار بکّو پر پڑتی تھیں۔ مگر وہ انکی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اس کی نظریں تھانے کے دفتر کی دیواروں پر گڑی ہوئی تھیں جو گویا دیواروں کو چھیدتی ہوئی تھانے دار کو ڈھونڈ نکالنا چاہتی تھیں۔

"دیکھو دیکھو" سپاہی نے کہا "تم لوگ دیر کر رہے ہو۔ مجھے مجبوراً تم سب کو حوالات ہی میں بند کر دینا پڑے گا"۔

اس پر بھی جواری ابھی لیت و لعل ہی کر رہے تھے کہ اچانک کسی کے دھڑام سے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔

یہ بکّو تھا جو دھوتی کھولے زمین پر اوندھا پڑا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر من سکھ کی ہمت بندھی اور اس نے بھی بکّو کی پیروی کر ہی دی۔ اکاؤنٹنٹ ملک اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ سپاہی نے پیچھے سے آ، گدی سے پکڑ زبردستی نیچے بٹھا دیا۔ اور اس نے ناچار اپنے نیکر کے بٹن کھول دیئے۔

سپاہی کے اس سلوک کو دیکھ کر دوسرے جواری آپ ہی آپ زمین پر لیٹ گئے۔ صرف چمڑے والے شیخ جی کھڑے رہ گئے انکی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور صورت سے انتہا درجہ کی مظلومی برس رہی تھی ان کا ہاتھ بار بار کمر بند پر پڑتا تھا مگر وہیں رہ جاتا تھا۔

ایسے معزز اور شریف صورت آدمی کو ایسی پریشانی میں دیکھ کر سپاہی کا دل پسیج گیا اور وہ جان بوجھ کر وہاں سے ٹل گیا، شیخ جی نے دل کڑا کیا۔

پگڑی کے شملے سے آنسو پونچھے۔ گردن پھرا کر اپنے اردگرد نظر ڈالی، اور پھر انتہائی مجبوری کے ساتھ بالآخر انہوں نے بھی تھانے دار کے حکم کی تعمیل کر دی۔

سرے پر لاری ڈرائیور تھا۔ سب سے پہلے جوتے لگانے کی اسی کی باری تھی۔ جس وقت وہ اٹھا تو نکو زور سے کھنکھارا۔ "مرزا جی سنبھل کے"۔ اس نے کہا "سب اپنے ہی آدمی ہیں ہاں۔ دیکھنے میں زور کا ہاتھ پڑے مگر..... سمجھ گئے نا....."

لاری ڈرائیور نے ابھی پانچ تک ہی گنتی کی تھی کہ وہی سپاہی تھانے کے دفتر سے نکلا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "داروغہ صاحب کہتے ہیں"۔ اس نے پاس آکر کہا۔ "اگر تم لوگوں نے ٹھیک طرح سے جوتے نہ لگائے تو میں اپنے سپاہیوں سے جوتے لگواؤں گا"۔ یہ کہہ کر وہ پھر چلا گیا۔

جواریوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ خود ہی آپس میں زور زور کے جوتے لگوالیں۔ چنانچہ کوئی بیس پچیس منٹ کے بعد، جب ہر ایک نے ہر ایک کے دس دس جوتے لگا لئے تو وہ اس کام سے نمٹ کر کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں وہی سپاہی پھر آیا اور کہنے لگا۔ "جاؤ۔ اب کے داروغہ صاحب نے تمہارا قصور معاف کر دیا ہے۔ پھر کبھی جوا نہ کھیلنا"۔

یہ لوگ تھانے میں سے یوں نکلے جیسے اپنے کسی بڑے ہی عزیز قریبی رشتہ دار کو دفن کر کے قبرستان سے نکلے ہوں۔ تھانے سے نکل کر کوئی سو گز تک تو وہ چپ چاپ گردنیں ڈالے چلا کئے۔ اس کے بعد نکو نے یکبارگی زور کا قہقہہ لگایا۔ اتنے زور کا کہ وہ ہنستے ہنستے دہرا ہو گیا۔ "کیوں دیکھا"۔ اس نے کہا "نہ چالان، نہ مقدمہ۔ نہ قید۔ نہ جرمانہ! میں نہ کہتا تھا، اسے مذاق ہی سمجھو!"

میر شیر علی افسوس

بقیہ صفحہ ۱۶

راقم نے صفحۂ تحریر سے نکال ڈالے اور ترجمہ خلاصۃ التواریخ کا نہیں کیا، ہاں مضمون اس کا اس زبان میں لکھا ہے اور کمی اور زیادتی بھی جہاں موقع دیکھا ہے وہاں کی ہے"...... "اور بعض صوفیائے کرامت و خرق عادت اور ان کے درگاہوں کے احوال و تصرفات جو ثبت کئے فقط کتاب مذکور کی مطابقت کے لئے، بلکہ اس لحاظ سے ہنود کے فقرا اور معابد کے اوصاف و احوال کہ..... لکھنے میں آئے نہ از راہِ اعتقاد کیونکہ اس خاکسار کا مذہب یہ ہے ؎

"گر دو عالم پر از ولی باشد ۔ پیر ما مرتضےٰ علی باشد"

یا یہ کہئے کہ اس صاف بیانی سے اپنی بریت کا اثبات کر دیا بلکہ حق یہ ہے کہ کہیں اپنی چشم دید بات لکھی تو اس کی صراحت کر دی، یا کوئی سنی سنائی بات لکھی تو اس کے حوالہ یا راوی کا ذکر بھی کر دیا مثلاً ایک دو باتیں انھوں نے اپنے والد سے سنیں تو صاف لکھ دیا کہ میں نے اپنے والد صاحب سے اسطرح سنا، لکھنؤ کے متعلق بعض تفصیلات لکھیں تو وہ اپنے ذاتی مشاہدے یا علم کی بنا پر، مگر تعجب ہے کہ علم طب کے اپنے استاد کی نسبت ان کے قلم سے ایک حرف نہ نکلا۔ خدا جزائے خیر دے احمد علی یکتا کو کہ اس نے اشارتاً کچھ لکھا تو سہی

نواب سعد اللہ خاں

نور احمد خاں فریدی

ما طفلِ کم سواد و سبق قصہ ہائے دوست
صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

۱۰۱۹ھ کے قریب چنیوٹ میں امیر بخش نامی ایک غریب الحال کسان رہتا تھا۔ وہ دن بھر اپنی زمین میں کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔ اس کی محنت اور دیانت داری علاقہ بھر میں مشہور تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ تنگ دست رہتا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس کی بیوی کھیت میں پہنچاتی تھی۔ مگر اب چند دنوں سے اسے دوپہر کے وقت خود گھر آنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی کے وضع حمل کے ایام قریب تھے اس لئے وہ کھانا پہنچانے کے لئے کھیت میں نہیں آسکتی تھی۔ ایک دن جب وہ روٹی کھانے کے لئے گھر آیا تو بیوی نے کمال عاجزی سے گڑگڑا کر کہا۔ کہ

انار لاؤ ورنہ مرتی ہوں

میرا جی انار کھانے کو چاہتا ہے۔ اگر تو نے لاکر نہ دیا تو میں مر جاؤں گی۔ امیر بخش نے ہنس کر کہا۔ بے وقوف! ہم غریبوں کا انار سے کیا کام! اگر شلغم مولی کہو تو لا دوں!!

بیوی بولی تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر ایسی حالت میں جبکہ مجھے آٹھ ماہ کا حمل ہے۔ مجھے انار کے لئے نہ ترساؤ۔ اس نیک بخت نے کانوں کی بالیاں اتار کر حوالے کیں۔ اور کہا۔ یہ بالیاں لے جاؤ۔ اور جہاں سے بھی ممکن ہو انار خرید لاؤ۔

امیر بخش نے بالیاں جیب میں ڈالیں۔ اور شہر کو روانہ ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ گھاٹ کے قریب ہی کابلی میوہ فروشوں کا قافلہ اترا ہے۔ اور وہ انار و انگور دہلی لئے جاتے ہیں۔

ملک الیاس

امیر بخش بلا توقف لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا قافلے میں پہنچا۔ اتفاق سے سالار قافلہ ملک الیاس سامان کی دیکھ بھال کرتا پھرتا تھا۔ لوگوں نے اشارے سے بتایا، ذرمقصود یہی ہے۔ اگر کچھ لینا ہے۔ تو قدموں میں جھک جاؤ۔ ورنہ پھر کف افسوس ملنے سے کچھ نہ بنے گا۔ امیر بخش لپک کر آگے بڑھا۔ اور ملک الیاس کے آگے دوزانو جھک گیا۔ پاؤں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ خدا کے لئے ایک انار دے دو۔ ورنہ میری بیوی مر جائے گی۔

سوداگر نے ہاتھوں سے امیر بخش کو اٹھا کھڑا کیا۔ اور ملائمت سے بولا۔

"شریف آدمی! میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔ پھر کہو۔"

امیر بخش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور دل گیر آواز میں بولا

"اے فرشتۂ رحمت! میری بیوی حاملہ ہے۔ اور وہ اناروں کے لئے دیوانی ہو رہی ہے۔ اگر انار لے کر نہ گیا۔ تو وہ جان دیدے گی۔ ایک حاملہ عورت کی زندگی اور موت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خدا کے لئے مجھے مایوس نہ کیجئے۔ یہ بالیاں لیجئے اور ایک انار دے دیجئے۔" سوداگر دفعتہً خاموش ہو گیا اور سائل کے ماتھے کی سلوٹوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا اس کی تقدیر کے نوشتے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے بہت جلد معلوم کر لیا۔ کہ اس کی بیوی کے شکم میں یقیناً کوئی صاحب اقبال فرزند ہے۔ امیر بخش سے کہا۔ بڑے میاں یہ میوے جہانگیر اعظم شہنشاہ ہند کے لئے دہلی لئے جاتا ہوں۔ راستہ میں مجھے یہ میوے بیچنے یا کسی کو تحفہ کے طور پر دینے کی اجازت نہیں۔ لیکن اگر تم مجھے اس مائی کے پاس لے چلو۔ تو پھر دانے انار بلکہ انگور بھی بلا قیمت پیش کر سکوں گا۔"

"بلا تکلف تشریف لے چلئے۔ اتنا بڑا سوداگر غریب خانہ قدم رنجہ کی تکلیف کرے۔ میرے لئے اس سے اور بڑا فخر کیا ہو سکتا ہے۔" امیر بخش نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

ملک الیاس نے چند انار اور انگوروں کے گچھے ٹوکری میں ترتیب سے رکھ نوکر کے حوالے کئے۔ اور امیر بخش کے ہمراہ اس کے گھر کو روانہ ہوا۔

سند لکھ دو

امیر بخش کی بیوی بڑی بے تابی سے اناروں کا انتظار کر رہی تھی۔ خاوند کو خالی ہاتھ آتا دیکھ کر مایوس ہو گئی۔ امیر بخش نے کہا گھبراؤ نہیں۔ انار اور انگور لایا ہوں۔ مگر سوداگر تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

"کیا کہے گا؟" بیوی نے گھبرا کر کہا۔

"کیا معلوم!" میاں نے متفکرانہ انداز میں جواب دیا۔

بیوی نے پردہ کر لیا۔ دروازے کے باہر چارپائی بچھوا دی۔ اور کہا۔ لے آیئے۔

سوداگر نے اندر آکر ادب سے سلام کیا۔ اور کہا۔ "مائی! میں یہ چند انار اور انگور ہدیہ کے طور پر لایا ہوں۔ تمہارے میاں نے قیمت دینی چاہی تھی۔ میں نے نہیں لی۔ میری شرط یہ ہے۔ کہ تو مجھے یہ سند لکھ دے۔ کہ اگر تیرا بیٹا صاحب اقبال ہو تو مجھ سے مروت سے پیش آئے۔"

مائی کے چہرے پر خوشی کی ایک جھلک دوڑ گئی۔ کہا۔ میرا لال صاحب اقبال ہو گا تبھی تو انار مانگتا ہے۔ آپ جو لکھوانا چاہتے ہیں۔ لکھ لیں۔ میں نشان کرنے کو تیار ہوں۔ سوداگر پہلے سے چند سطور لکھ کر لایا تھا۔ ان کے نیچے مائی کا نام لکھ کر نشان کرا لیا۔

دُرِّ یتیم

۱۰ صفر ۱۰۱۹ھ کو جمعرات کے دن امیر بخش کے گھر میں ایک خوبصورت بچہ پیدا ہوا۔ اس نے خوب جی کھول کر خیرات کی مسجد کے

مولوی صاحب سے مشورہ کرکے سعد اللہ نام رکھا۔ زچہ اتنی خوش تھی کہ اسے دردِ زہ کا احساس بھی نہ رہا تھا۔ خدا کی بے نیازی دیکھئے کہ عصر کے قریب اچانک امیر بخش کے پہلو میں درد اٹھا۔ اور گھڑی کے اندر اندر چل بسا۔ لوگوں میں بچے کے خلاف نفرت سی پیدا ہو گئی۔ کہ کیسا منحوس ہے۔ پیدا ہوتے ہی باپ کو کھایا۔ زچہ نے میاں کی بے وقت موت کی خبر سنی۔ تو شدتِ غم سے بیہوش ہو گئی۔ ہزاروں تدبیروں سے اسے ہوش میں لایا گیا۔ ماں بہنوں نے بہتیرا حوصلہ دلایا۔ مگر اس کا سہاگ الٹ چکا تھا۔ دنیا اندھیر نظر آئی لیکن مرتی کیا نہ کرتی۔ بچے کو چھاتی سے چمٹا اس کی پرورش شروع کی۔ مگر قدرت کو یہ سہارا ابھی پسند نہ آیا۔ سعد اللہ نے ابھی پانچ بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں۔ کہ سوداگر کی زبان سے بیٹے کے صاحب اقبال ہونے کی پیشنگوئی سننے والی ماں ہزاروں حسرتیں دل میں لئے آخرت کو سدھار گئی۔ اور سعد اللہ ماں باپ دونوں کی طرف سے یتیم ہو کر رہ گیا۔

جستجوئے علم میں لاہور اور سیالکوٹ کا سفر

یہ "دُرِّ یتیم" دس برس کی عمر تک چنیوٹ کی مسجدوں میں دینیات کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ جب ذرا سفر کے قابل ہوا۔ تو شوقِ علم کشاں کشاں دار السلطنت لاہور کو لے چلا۔ وہاں دہلی دروازے کے اندر ایک مسجد میں پڑے رہنے کی جگہ مل گئی۔ دن کو آفتاب کی روشنی میں اور رات کو مٹی کے چراغ میں سرسوں کا نہیں بلکہ آنکھوں کا تیل جلا کر علم کی تلاش بجھاتا تھا۔ کھانے کا بندوبست کہاں سے ہوتا۔ قریبی مسلمانوں کے گھروں سے ادھر ادھر کی روٹیاں لے کر پیٹ کے جہنم کو بھر لیتا۔ یہاں سے سیالکوٹ کو روانہ ہوا۔ اور علامہ کمال الدین[۵۱] کاشمیری سے حدیث و تفسیر، منطق و فلسفہ اور علم کلام کی سند حاصل کی حضرت سے اجازت لے کر پھر لاہور پہنچا۔ ان دنوں یہاں ملّا خواجہ بہت مشہور ہو رہے تھے۔

وزیر بادشاہِ ہند را الطلبید!

بزرگ میاں میر رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور ملّا شاہ بدخشی کے پیر بھائی تھے۔ خواجہ بختاور مرآۃ العالم میں لکھتا ہے کہ نواب سعد اللہ خاں اپنی افلاس اور پریشانی کے زمانہ میں ملّا صاحب کے پاس کسبِ علوم کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ ایک دن ملّا صاحب بول اٹھے۔

"وزیر بادشاہِ ہند را الطلبید"

یعنی شہنشاہِ ہندوستان کے وزیر کو طلب کرو۔ حاضرین متحیّر ہوئے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کسی وزیر کو مجلس میں موجود نہ پایا۔ اور نہ ہی ان دنوں لاہور میں کسی وزیر کا ورود ہوا تھا۔ ایک بے تکلف عقیدتمند نے جرأت کر کے عرض کیا۔ کہ حضور کا خطاب کس سے ہے۔ فرمایا۔

"ملّا سعد اللہ را مے گویم"

سعد اللہ اٹھ کر حضور کا دست بوس ہوا۔ جتنے اصحاب اس وقت وہاں موجود تھے۔ سب اسے مبارک باد دینے لگے۔ اس واقعہ سے سعد اللہ کے دل میں دہلی دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ بشارت شاہ نامی ایک درویش دہلی کو جاتا تھا۔ اس کے ہمراہ ہو لیا۔ کرنال تک پہنچے ہی تھے کہ بشارت شاہ تھک کر بیٹھ گیا۔ کہ

دہلی کی کشش

تو اس ویران اور بنجر علاقے میں سفر نہیں کر سکتا۔ لیکن سعد اللہ نے ہمت نہ ہاری اور سموم ہوا کے تند و تیز طوفان میں فقر و فاقہ کی مصیبتیں برداشت کرتا دہلی جا ہی پہنچا۔ چوراہی محلہ کی مسجد میں مولوی محمد صالح کے ہاں مسجد میں جھاڑو دینے اور وضو کی سبیل بھرنے پر دونو وقت کی روٹی ملنے لگی۔ اتفاق سے نواب[۵۲] آصف خاں وزیر اعظم کا محل پاس ہی تھا۔ ان کے دو صاحبزادے مولوی صاحب کے ہاں پڑھنے آیا کرتے تھے۔

عروج و اقبال کی منزلیں

ایک دن اتفاق ایسا ہوا۔ کہ نواب صاحب کے بچے ایسے وقت پڑھنے آئے۔ کہ مولوی صاحب مسجد میں موجود نہ تھے۔ سعد اللہ نے ان سے تختیاں لے کر اصلاح دے دی۔ رات کو جب نواب صاحب نے اصلاح شدہ عبارت دیکھی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ پوچھا کہ یہ کس کا خط ہے؟ لڑکوں نے عرض کیا مولوی صاحب کے نہیں۔ مسجد کے ملازم سعد اللہ نے اصلاح دے دی۔ نواب صاحب نے نوکر بھیج کر سعد اللہ کو بلوایا۔ اور کہا۔ کہ آپ یہاں آکر بچوں کو اصلاح دے جایا کیجئے۔ آپ کو دس روپے ماہوار ملا کریں گے۔ سعد اللہ نے انتہائی تنگدستی کے عالم میں اس وظیفہ کو غنیمت سمجھ کر قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اور ایسا واقعہ ظہور میں آیا جس سے سعد اللہ کی کایا ہی پلٹ گئی۔ ایک دن نواب صاحب کے بچے ملّا محمد صالح سے مقاماتِ ابو الفضل پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً کوئی مشکل سی عبارت آگئی۔ مولانا نے لاکھ کوشش کی مگر اس کے معنیٰ و مطالب بچوں کی سمجھ میں نہ آسکے۔ سعد اللہ نے موقعہ پا کر اس عبارت کی اس طرح وضاحت کی کہ تمام مطالب فوراً بچوں کے ذہن میں آگئے۔ بچوں نے رات کو نواب صاحب سے دن کا واقعہ ذکر کیا۔ انھوں نے صبح کو بلا کر چالیس روپے ماہوار اور دو وقتہ خوراک پر بچوں کا مستقل اتالیق مقرر کر دیا۔

ان دنوں ہندوستان کی باگ ڈور شاہ جہاں بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور ان کی شاہ ایران سے خط و کتابت رہتی تھی۔ انہی ایام میں جبکہ ملّا سعد اللہ نواب آصف خاں کے صاحبزادوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ شاہ ایران کا ایلچی دربار میں حاضر ہوا۔ اور ایرانی تحائف کے ساتھ اپنے بادشاہ کا خط بھی پیش کیا۔ خط میں ملکی معاملات اور دوستانہ باتوں کے علاوہ ایک سطر خاص صنعت میں لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ کے تمام درباری امراء فضلاء کئی دنوں تک فکر آزمائی کرتے رہے لیکن اس عبارت

---

۵۱ علامہ کمال الدین کاشمیری کے متعلق مشہور تھا۔ کہ جو ان سے تلمذ کا شرف حاصل کر لیتا ہے وہ ضرور صاحب کمال بن جاتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی بھی آپ کے ہی شاگرد تھے۔

۵۲ نواب آصف خاں ملکہ عالیہ نورجہاں کا بھائی تھا۔ جہانگیر کے زمانہ میں وزارتِ عظمیٰ کے مرتبہ پر فائز ہوا۔ بادشاہ نے اپنے ولی عہد سلطنت شاہ جہاں کی شادی اس کی لڑکی ممتاز زمانی سے کر دی۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اپنی آخیر عمر تک اس عہدے پر سر بلند رہا۔

کے مفہوم کو نہ پاسکے۔ بادشاہ اور وزیر اعظم سخت پریشان تھے۔ کہ اگر وایسی مکتوب میں اس عبارت کا جواب نہ گیا تو ہندوستان کے علما، فضلاء کی کرکری ہوگی۔

ملا سعد اللہ کی نکتہ آفرینی

ایک دن نواب صاحب اس کو اپنے ہمراہ گھر پر لائے۔ رات کو شمعدان آگے رکھ کر دریائے فکر میں ایسا غوطہ مارا کہ صبح ہی کو سر ابھارا۔ مگر دُرِ مقصود پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ صبح کو بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ کیوں صاحب! شب بیداری کا نتیجہ بھی نکلا۔ نواب نے کہا۔ کچھ نہیں۔ کم بخت نے ایسی صنعت میں لکھا ہے۔ کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

ملا صاحب کو بھی شاگردوں کی زبانی اس مکتوب کی حقیقت معلوم ہوگئی تھی۔ جب نواب صاحب محلسرائے سے دیوان خانے میں آئے۔ تو ملا صاحب نے وہ خط دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ نواب صاحب نے کہا۔ ملاجی بڑے بڑے عالم فاضل تھک کر ہار بیٹھے مگر کسی کے عقدہ کشائی نہ ہوسکی۔ تم دیکھ کر کیا کروگے۔ ملا صاحب نے دست بستہ التماس کی۔ حضور والا کا ارشاد بجا۔ مگر دکھانے میں کیا ہرج ہے۔ کبھی نادانوں سے بھی دانائی کی بات ہو جاتی ہے۔ نواب صاحب نے مسکرا کر خط بڑھا دیا۔ اور کہا۔ دو گھڑی کے بعد بھجوا دیجئے گا۔ کیونکہ قلعے میں ہمراہ لے جانا ہے۔

ملا صاحب خط کو لے کر اپنے کمرے میں جا گھسے۔ دو گھڑی کے بعد ہشاش بشاش باہر نکلے خط نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر کے عرض کیا۔ "جناب والا فدوی مطلب سمجھ گیا۔ ایک ظرافت کی بات ہے جب اس کا جواب لکھا جائے گا تو فدوی اس کے آخر میں اس سطر کا جواب لکھ دے گا۔"

نواب صاحب نے ہر چند دریافت کیا۔ کہ ہمیں بھی تو معلوم ہو۔ کہ وہ ظرافت کی کونسی بات ہے" تاکہ میں جہاں پناہ کی خدمت میں عرض کر کے تمہیں انعام دلاؤں۔ ملا صاحب نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ حضور والا! غلام کو بتا دینے میں کچھ عذر نہیں۔ لیکن لطف جاتا رہے گا۔ اس کا لطف اس وقت آئے گا۔ جب شاہ ایران اس جواب کی نسبت کچھ لکھیں گے۔ پس جہاں پناہ سے حضور یہی عرض کر دیں۔"

نواب صاحب نے قلعے میں جا کر بادشاہ کی خدمت میں تمام امر واقعہ عرض کیا۔ اور جس وقت خط کا جواب تحریر ہونے لگا۔ ملاجی سے بھی جواب لکھوا دیا گیا۔

ملاجی مرغی خانے کے داروغہ بنتے ہیں

ملا صاحب کے لئے جہاں پناہ نے حکم دیا کہ اگر کوئی خدمت خالی ہو تو ملاجی کو دی جائے۔" اتفاق سے مرغی خانے کے داروغہ کی آسامی خالی تھی۔ ملا صاحب اس خدمت پر مامور ہو گئے۔ بھلا ایک عالم کو مرغی خانے سے کیا نسبت! لیکن قابلیت یہاں بھی کام کر گئی جہاں مرغی خانے پر ماہوار سینکڑوں روپے خرچ ہوتے تھے اس دفعہ وہاں ایک پائی بھی نہ لگی۔ فرد ملاحظہ کرنے پر بادشاہ نے تعجب فرمایا کہ کیا ہمارے مرغی خانے کا خاتمہ ہو گیا کہ ان کی خوراک کا خرچ فرد میں درج نہیں۔ لیکن جب حضور نے تشریف لے جا کر دیکھا۔ تو مرغ پہلے سے زیادہ تیار نظر آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ شاہی باورچی خانے میں دیگوں کے منہ خام کرنے کا آٹا جو ضائع جاتا تھا۔ اسے چکنی دیگوں میں ملوا کر ملا صاحب مرغوں کو کھلاتے ہیں۔ بادشاہ کو ملا صاحب کی یہ سلیقہ شعاری بہت پسند آئی۔ جب رخصت ہونے لگے تو ملا صاحب نے عرض کیا۔ جہاں پناہ نے جو خدمت غلام کے سپرد کی تھی۔ فدوی نے اس سے عہدہ برآ ہونے کی پوری کوشش کی۔ مگر یہ کام بندہ کی طبع کے خلاف ہے۔ اگر مرغی خانے کی جگہ کتب خانہ کی دیکھ بھال اس غلام کے سپرد کی جائے۔ تو عین احسان ہوگا۔ باشاہ نے منظور کر لیا۔ اور ملاجی اب

شاہی کتب خانے کا نیا لائبریرین

لائبریرین بن گئے۔ کچھ عرصے کے بعد بادشاہ کو کتب خانے کے دیکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تشریف لا کر دیکھا۔ کہ تمام کتابوں پر زربفت کی چولیاں اور کمخواب کے جزدان چڑھے ہیں اور تمام الماریاں لگا رنگ کی چولیوں اور جزدانوں سے عجیب کیفیت دکھا رہی ہیں۔ فرمایا: "ملاجی۔ مرغی خانے کی کسر یہاں پوری کر دی۔ مگر فرد ابھی تک ملاحظہ سے نہیں گذری۔" عرض کیا: "حضور والا اگر کچھ خرچ ہوتا۔ تو فرد بھی پیش ہوتی۔" فرمایا: "پھر یہ چولیاں کہاں سے آگئیں؟"

ملا صاحب نے عرض کیا: "حضور والا! دربار شہنشاہی میں مراسلے اور عرضیاں جن خریطوں میں آتی ہیں۔ وہ منشی خانے میں بیکار پڑے تھے۔ فدوی نے وہاں سے منگوا کر توشے خانے کے درزیوں سے ان کی چولیاں اور جزدان سلوا لئے۔"

بادشاہ اس جواب سے بہت مسرور ہوئے۔ اور سوچنے لگے ایسا شخص تو وزارت کے لائق ہے۔ انہی ایام میں ایران سے خط کا جواب بھی آگیا۔ لکھا تھا کہ "ہم کو یقین ہے کہ جس شخص نے ہمارے مراسلے کا جواب لکھا ہے۔ وہ آپ کا وزیر ہوگا۔ اگر یہ بات نہیں ہے۔ اور وہ ایران آنا منظور کرے۔ تو ہم نے اسے اسی تاریخ سے اپنا وزیر مقرر کیا۔ جس تاریخ سے وہ ہندوستان سے روانہ ہوگا۔"

بادشاہ نے ملا صاحب بلا کر کہا: "اب تو بتاؤ۔ وہ کیا معمہ تھا" سعد اللہ نے عرض کیا: "جہاں پناہ! شاہ ایران نے لکھا۔ کہ آپ تو صرف ہند کے بادشاہ ہیں۔ پھر آپ نے شاہ جہاں اپنا خطاب کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ غلام نے اس کے جواب میں یہ لکھ دیا۔ کہ ہند[1] اور جہاں کے عدد ایک ہیں۔ ہم نے ہند کی بجائے جہاں اختیار کر لیا۔ تو اس میں ہرج کیا ہو گیا؟"

ملا کی تقریر سے بادشاہ اور اہل دربار پھڑک اٹھے۔ ہر طرف سے واہ واہ اور مرحبا کی صدا آنے لگی۔ جہاں پناہ تخت سے اٹھ کر نیچے تشریف لائے اور اپنے ہاتھوں اپنا قیمتی جیغہ اتار کر ملا سعد اللہ کے کندھوں پر ڈال دیا اور وزارت کا قلمدان طلب کر کے مع خلعت وزارت کے ملا کو عطا فرمایا۔ اب ملا سعد اللہ

[1] ہند: ہ، ن، د : ۵۹ ج، ہ، ا، ن : ۵۹ -

نواب سعد اللہ بن کر وزارت کے پردے میں ہندوستان پر راج کرنے لگے۔ یہ واقعہ ۱۰۵۵ھ کا ہے۔ وزارت کا چارج نواب اسلام خاں سے دلوایا گیا۔ اور منصب چار ہزاری ہزار سوار کا عطا ہوا۔ ماہ رجب ۱۰۵۵ھ میں وزارت عظمیٰ کا منصب، خلعت خاصہ از اصل و اضافہ منصب پنج ہزاری ذات و ڈیڑھ ہزار سوار کا عنایت ہوا۔ ۱۰۵۶ھ میں منصب شش ہزاری دو ہزار سوار مرحمت ہوا۔ ۱۰۵۸ھ میں سعد اللہ خاں منصب ہفت ہزاری ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ پر سر بلند ہوا۔ ۱۰۵۹ھ میں چونکہ نواب سعد اللہ خان امارت کے تمام مناصب حاصل کر چکے تھے۔ اور کوئی رتبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لئے دو کروڑ دام جس کی مقدار تیس لاکھ روپے کے برابر ہوتی تھی بطور انعام کے عطا ہوا۔

اس زمانے میں امیر بخش کے یتیم کا اثر و نفوذ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ شہنشاہ کا ولیعہد سلطنت سلطان داراشکوہ بھی اس سے خم کھاتا تھا۔

ہم دشمن کو پشاور پر روکیں گے

شاہ جہاں بادشاہ نے جب شہر شاہ جہاں آباد (دہلی) تعمیر کیا۔ تو لال قلعے کے سامنے ایک پہاڑی پر جامع مسجد کی تجویز ہوئی۔ امرا نے دست بستہ عرض کیا کہ اگر خدا نخواستہ دشمن شہر میں گھس آیا تو اس مسجد کو بطور دمدمہ کے استعمال کرے گا۔ اور توپیں چڑھا کر لال قلعہ کو سرمہ بنا کر رکھ دے گا۔ بادشاہ کے چہرے پر تردد کے آثار ظاہر ہوئے۔ نواب سعد اللہ خاں نے بڑھ کر عرض کیا: "جہاں پناہ ہم دشمن کو پشاور پر روکیں گے"۔ وزیر کی بلند ہمتی نے بادشاہ کے فکر کو دور کر دیا۔ خوش ہو کر فرمایا: "تو پھر اس مسجد کی تعمیر کا کام تم ہی سنبھالو"۔ وزیر اعظم کی تو خواہش ہی یہی تھی۔ کہ یہ کار ثواب اس کے ہاتھوں تکمیل پائے چنانچہ اس نے بڑے انہماک سے اس کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔

سعد اللہ خاں کی قرآن فہمی

نواب سعد اللہ خاں کی ذات بہت سی خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ بہترین سپاہی بھی تھے اور پختہ کار حساب داں بھی، وہ معاملہ فہم منصف بھی تھے اور پرہیزگار عالم دین بھی۔ اپنے اپنے موقعہ پر انھوں نے اپنی قابلیت کے خوب جوہر دکھائے۔ ایک دفعہ دربار میں کوئی پادری حاضر ہوا۔ بادشاہ سے دوران گفتگو میں عرض پرداز ہوا: حضور والا! قرآن میں جو یہ آیا ہے کہ رطب اور یابس سب اس میں موجود ہے۔ بھلا یہ تو فرمائیے "دنوں" کا قرآن کے اندر کہیں ذکر ہے۔ بادشاہ نے فرمایا: "ہاں وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ (چاند سے منزلوں کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں) سے دن ہی تو مراد ہیں"۔ پادری نے کہا: "حضور نے درست فرمایا مگر سال میں دن کتنے ہیں۔ یہ تو ظاہر نہیں ہوتا"۔ بادشاہ نے وزیر اعظم کی طرف دیکھا۔ نواب صاحب نے بلا تامل عرض کیا: جہاں پناہ، قرآن مجید نے پادری صاحب کے سوال کا جواب اسی آیت میں ہی دے دیا ہے"۔ پادری نے کہا: "وزیر صاحب ذرا واضح کر کے سمجھائیے"۔ نواب صاحب نے بادشاہ کی طرف متوجہ ہو کر عرض کیا۔ "حضور والا۔ قَدَّرْنٰهُ کے اعداد ابجد کے لحاظ سے ۳۶۰ ہوتے ہیں۔ اس سے قرآن کی ہمہ گیری کا زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے"۔ نواب صاحب کے اس جواب پر ہر طرف سے تحسین و آفرین کی آوازیں آنے لگیں۔ اور بادشاہ نے خوش ہو کر اسی وقت اپنی خلعت فاخرہ مرحمت فرمائی۔ اور اٹھ کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ ادھر پادری صاحب کے لئے اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

سنگ لرزاں کی مسجد

نواب سعد اللہ خاں کے اعمال خیر میں سے اس کی ایک بے نظیر مسجد چنیوٹ میں اب تک موجود ہے۔ جب خدا نے اسے ہندوستان کی وزارت عنایت فرمائی تو اس نے وطن مالوف کی اس مسجد کو جہاں اس نے پہلے پہل بسم اللہ شروع کی تھی وسیع کر کے اعلیٰ پیمانہ پر سنگ سرخ اور سنگ لرزاں سے تعمیر کیا۔ یہ بہت کشادہ مسجد ہے۔ اس کے ستون مشہور ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ شمار میں نہیں آتے۔ اوپر جو مینار ہیں۔ وہ سنگ لرزاں سے بنے ہیں۔ ان میں خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی ہاتھ لگائے تو وہ ہلنے لگ جاتے ہیں۔

بشارت شاہ کی آمد

بشارت شاہ کرنال سے واپس ہو گیا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا ہم سفر سعد اللہ آجکل ہندوستان کا وزیر اعظم بنا ہوا ہے تو وہ دہلی میں حاضر ہوا اور نواب کے محل میں داخل ہونے لگا۔ دربانوں نے روکا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا چاندنی چوک میں بیٹھ گیا۔ جب وزیر کی سواری گذرنے لگی تو سامنے آگیا اور جھلا کر بولا:

" او بدمعاش حرام زادے! اب یہ دماغ ہے کہ دروازوں پر دربان بٹھا رکھے ہیں؟"

نواب سعد اللہ خاں دانا آدمی تھا چپ ہو رہا۔ جب اندر گیا۔ تو خزانچی سے کہا۔ "دس ہزار اشرفیاں لے آؤ۔ اور دیوان خانے میں خلوت کرا دو"۔ پھر حکم دیا۔ "باہر ایک مجذوب کھڑا ہے۔ اسے لے آؤ!"

خزانچی لپک کر بشارت شاہ کو اندر لے آیا۔ وہ اپنی قدیم عادت کے مطابق گالیاں دینے لگا۔ نواب صاحب نے اس کی بکواس پر توجہ نہ دی۔ اور اسے اپنی یہ طبعزاد رباعی سنائی ؎

از خیال پریشاں بگذر — آدمی را بچشم حال نگر
سنگ ہست ابتدائے لعل و گہر — نافہ آہو خوں بود

دس ہزار اشرفیاں اپنے ہاتھ سے شاہ صاحب کی نذر کیں۔ اور چار سپاہیوں کو بلا کر حکم دیا کہ اسی وقت قبلہ شاہ صاحب کو لے کر لاہور روانہ ہو جائیں اور وہاں پہنچا کر واپس آئیں۔

ملک الیاس کی باریابی

سوداگر پیشہ لوگوں کا دستور ہے کہ جب کسی شہر میں وارد ہوتے ہیں تو اس جگہ کے اکابر و معارف کا حال پوچھ لیتے ہیں۔ بخت کی یاوری کہ ملک الیاس کو جس نے سعد اللہ خاں کی والدہ کو انار اور انگور پیش کئے تھے

دہلی میں لے آئی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وزیر اعظم چنیوٹ کا باشندہ ہے اور اس کے والدین غریب آدمی تھے۔ تو اسے یقین ہوگیا کہ ہونہ ہو وہی بچہ ہے جس کے متعلق میں نے پیشنگوئی کی تھی۔ کہ ایک دن نصرت واقبال اس کے قدم چومیں گے۔ وہ اپنے قیافہ کے صحیح ہونے پر بہت خوش ہوا۔ فوراً گھر سے وہی سند نکالی اور وزیر اعظم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ان کی والدہ کا دستخطی کاغذ پیش کیا۔ نواب صاحب کو ماں کی شکل بھی یاد نہ تھی۔ انگوٹھے کے نشان کو دیکھ کر فرط محبت سے ان کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ کاغذ کو سر آنکھوں سے لگایا۔ کہا: "اے عمّ مہربان! آپ نے میرے ماں باپ کو دیکھا ہے اور ایک وقت میں ان کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ اس لئے آپ بمنزل میرے ماں باپ کے ہیں۔ اس غریب خانہ کو اپنا گھر سمجھئے۔ اور جو خدمت میرے لائق ہو بلاتکلف ارشاد فرمائیے۔"

ملک الیاس نے وزیر اعظم کی اس قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے علائق خاندانی کا ذکر کرکے رہائش سے معافی چاہی۔ کہا کہ اگر میرے مال و اسباب پر سے محصول ہٹا دیا جائے۔ تو یہ میری بہت بڑی خدمت ہوگی۔ نواب صاحب نے اسی وقت معافی کا فرمان لکھ دیا۔ اور سوداگر شاد کام رخصت ہوا۔

نواب سعد اللہ خاں کا سفر آخرت

صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے: "سعد اللہ خاں وزیر بعارضہ قولنج کہ از مدتے داشت و تقرب خاں علاج مے نمود بعمر ۷۴ سال بتاریخ ۲۲ جمادی الثانی سنہ ۱۰۶۰ھ فوت شد۔"

اب خافی خاں کا بیان سنئے۔ لکھتا ہے۔

"نواب سعد اللہ خاں عارضہ قولنج میں پانچ چار مہینے مبتلا رہا۔ اس کی عیادت کو بادشاہ کئی بار گیا۔ طبیبوں کو اس نے بار بار بدل کر علاج کے لئے مقرر کیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اور آخری جمادی الاخری سنہ ۱۰۶۶ھ کو اس سرائے فانی سے روضہ جاودانی کو اس نے انتقال کیا۔ بادشاہ کو ایسا ملال ہوا۔ کہ وہ اس کے لئے بے اختیار زار زار رویا۔"

برنی ار لکھتا ہے کہ دارا شکوہ نے زہر دے کر اس جلیل القدر امیر کو شہید کرایا۔ لیکن فارسی تاریخوں سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اگر دارا کا اس کی وفات میں کچھ دخل ہوتا تو اورنگ زیب جو کہ بھائی کی معمولی سی لغزش کو بھی دامن عفو میں چھپانے کے لئے تیار نہ تھا اس کا ضرور ذکر کرتا یا اس کے طرفدار مورخ ضرور لکھتے۔

حکیم داؤد خاں مخاطب بہ تقرب خاں جو کہ بادشاہ کا معالج خاص تھا۔ اس کا علاج کرتا رہا اور خود بادشاہ کئی بار چل کر اس کی عیادت کو پہنچا۔ خافی خاں نے اگرچہ سعد اللہ خاں اور دارا شکوہ کے باہمی حسد اور بے جا کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ مگر وہ صاف تسلیم کرتا ہے کہ جملہ اختیارات رکھنے اور ولیعہدی کے امیدوار ہونے کے باوجود دارا شکوہ مرتے دم تک سعد اللہ خاں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ کیونکہ امرا اس پر جان دیتے تھے اور بادشاہ فدا تھا۔ برنی ار کی تاریخ کا قلعہ قیاس کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ہر جگہ افواہوں اور باہمی تعلقات سے بہت سے غلط نتائج مرتب کرلیئے ہے۔ چنانچہ الفنسٹن صاحب نے اپنی تاریخ میں اس امر کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اگرچہ وہ اپنی تاریخ میں ہر جگہ برنی ار کے حوالے دیتا ہے۔

آثار باقیہ

نواب سعد اللہ خاں کے انتقال کے وقت اس کے بڑے بیٹے لطف اللہ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ اسے بادشاہ نے ہفت صدی صد سوار کا منصب عطا فرمایا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں صوبہ داری کے عہدہ تک ترقی کی۔ لاہور میں اس نے اپنے لئے سنگ سیاہ کا عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ قبر کا تعویذ، فرش، دیواریں سب سنگ سیاہ کی تھیں۔ مگر طوائف الملوکی کے زمانہ میں سیاہ پتھر اکھڑوا لیا گیا۔ اب خشتی قبر رہ گئی ہے۔ چونکہ ان کی اولاد نہ رہی تھی۔ اس لئے محکمہ نزول نے -/۲۲۵۰ روپے میں یہ مقبرہ اور ملحقہ باغ نواب علی رضا قزلباش کو دے دیا۔

نواب سعد اللہ خاں کی قبر کا حال معلوم نہ ہوسکا۔ اس نے دہلی، لاہور اور چنیوٹ میں کئی شاندار حویلیاں تعمیر کی تھیں۔ رنگ محل (لاہور) جہاں اب مشن اسکول ہے۔ یہ اسی کی حویلی کا کچھ حصہ ہے باقی حصہ اس کے جنوب میں تھا۔ موچی دروازہ میں حویلی پتھراں والی کے نام سے نواب مرحوم کی ایک اور حویلی بھی تھی۔

اس وقت چنیوٹ میں نواب سعد اللہ خاں کی اولاد سے کوئی شخص نہیں ہے۔ مگر اس کی بنائی ہوئی سنگ لرزاں کی عالیشان مسجد اور اس کے محلات کے کھنڈر اس کی یاد کو تازہ کر رہے ہیں۔ ؎

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بہ عدل ٭ گرچہ بسے گزشت کہ نوشیرواں نماند
خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر ٭ زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند

چھینک — بقیہ

صفحہ ۱۴

مانگنے حاضر ہوا ہوں۔ میرا مطلب مذاق کرنا نہیں ہے جیسا کہ جناب کو گمان ہے۔ میں نے چھینک کر جناب کو سان دیا تھا۔۔۔"

جرنل غصہ میں کانپنے لگا اور چیخ کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے۔"

چریا کو خوف کے مارے سمجھ نہ سکا کہ جرنل نے کیا کہا۔ دبی آواز میں اس نے پوچھا "کیا فرمایا حضور نے۔"

جرنل نے زمین پر زور سے پاؤں مارا اور چلا کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے۔"

جرنل کی پرغیظ ڈانٹ کا چریا کو یہ برا اثر پڑا۔ ڈر کے مارے اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ کانوں سے اس کو سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بمشکل تمام گھسٹتا ہوا مکان سے نکلا اور میکانے کی قوت سے چلتا ہوا گھر پہنچا۔ وردی اتارے بغیر بستر میں داخل ہوا۔ جرنل کی ڈانٹ کا اسے اتنا صدمہ ہوا کہ وہ پھر جانبر نہ ہوسکا۔

اختر شیرانی کا نیا شاہکار

شہناز: اختر صاحب کی تازہ غزلوں، نظموں کا پانچواں مجموعۂ کلام۔ اس میں نئے ماہیئے بھی شامل ہیں۔ خوبصورت گرد پوشش (زیر طبع ہے آرڈر درج کروایئے) مجلد قیمت ہے۔

اختر صاحب کی دوسری تصانیف: صبح بہار۔ پہلا مجموعۂ کلام۔ ہے اختر ستان۔ دوسرا مجموعۂ کلام۔ ہے۔ لالۂ طور۔ تیسرا مجموعۂ کلام ہے۔ طیور آوارہ۔ چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔

دھڑکتے دل، ہندوستان کے رومانوی شاعر کے بہترین ادبی مضامین کا مجموعہ۔ مضامین جو مقبولیت عامہ حاصل کر چکے ہیں۔ اختر شیرانی کا نام ہی مضامین کی خوبی کا ضامن ہے۔ قیمت مجلد ہے۔

وہ کبھی دیکھا یہ بھی دیکھ، ملک کے چیدہ و مشہور کے معمول کا مجموعہ، یہ کتاب چوٹی کے ڈرامہ ٹسٹ فن کاروں کی کدو کاوش کا مجموعہ ہے۔ جس کو اختر شیرانی کے قلم نے تصنیف بنا دیا ہے۔ مجلد للعہ۔

مقالات شیرانی مصنفہ حافظ محمود شیرانی۔ ادبی حلقوں میں حافظ صاحب کے ذہنی ادبی نقش و نگار جس قدر و منزلت سے دیکھے جاتے ہیں ان کے پیش نظر یہ کتاب آپ کے جذبات کی ترجمان اور رنگین اس میں حافظ صاحب کے بہترین ادبی مضامین کو جمع کیا گیا ہے۔ ہے

ماڈرن اردو ڈکشنری مرتبہ صاحبزادہ عبدالحکیم اس نشتر جالندھری ایم اے۔ اس میں ہر حرف کے تحت تمام ضروری الفاظ درج کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں۔ یہ کتاب انتہائی طور پر مستند اور مفید ہے عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بالعموم اور غریب طلبہ کے لئے بالخصوص یہ لغت ایک نعمت غیر مترقبہ ہے ضخامت ۵۵۲ صفحات مجلد ہے۔

ہمارا قائد قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن انکی قومی خدمات کے بعض پوشیدہ پہلو انگریزی کتاب ٹامی لیڈر کے فاضل مصنف زیڈ اے سلہری نے نہایت خوبی سے اجاگر کئے ہیں یہ اسی کا ترجمہ ہے مجلد ہے۔

ملنے کا پتہ: — کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

حیات محمد علی جناح

از رئیس احمد جعفری

قائد اعظم کے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اسلامی سیاسیات پر یہ مکمل و مدلل کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ تنسیخ بنگال اور مسلم لیگ کی داغ بیل سے وزارتی وفد کے فیصلے تک ملک کے تمام اہم واقعات و حادثات درج ہیں۔ پونے نو سو صفحات مع تصاویر مجلد سات روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ: کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی ۳

ذاکر صاحب (از رشید احمد صدیقی۔ پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی شخصیت اور سیرت کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ مداح و ممدوح دونوں میں سے کوئی محتاج تعارف نہیں۔ ایک ہندوستان کا مایۂ ناز ماہر تعلیم اور دوسرا صف اول کا ادیب۔ اگرچہ یہ ذکر حبیب ہے لیکن اس میں کہیں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا۔ کتاب کی طباعت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

بچوں کیلئے تحفے بچوں کے لئے رنگین تصاویر کی کہانیوں کی کتابیں جو بلاک سے چھپی ہیں تیار ہو گئیں۔ یہ کتابیں اردو میں اپنی قسم کی بالکل نئی ہیں جو یورپ اور امریکہ کے طرز پر تیار کرائی گئی ہیں۔ ان کو ملک کے مایۂ ناز ماہرین تعلیم نے بہت پسند کیا ہے۔ اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو بھی پسند آئیں گی۔ کاغذ ولائتی۔ نہایت دیدہ زیب

ظالم کسان: — از شفیع الدین نیر قیمت ۱۱ر چیلا بلا: — از ڈاکٹر سید عابد حسین۔ قیمت ۱۲ر انوکھی ملاقات: — پروفیسر عبدالغفور قیمت ۱۱ر

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: — کتابی دنیا لمیٹڈ فیض بازار دہلی ۵

لیبیا کی قومی تحریک

قاسم حسن

لیبیا افریقہ کے شمالی ساحل پر بحیرۂ روم کے کنارے واقع ہے اس کے مشرق میں مصر ہے۔ اور مغرب میں ٹیونس، کل رقبہ ۴۰۶،۵۰۰ مربع میل ہے۔ پورا ساحل دو صوبوں میں بٹا ہوا ہے۔ مشرقی صوبہ سائرینیکا کہلاتا ہے۔ اور مغربی صوبہ ٹری پولی ٹینا۔ ٹری پولی ٹینا کا پایۂ تخت ٹری پولی (طرابلس المغرب) ہے اور سائرینیکا کا صدر مقام بن غازی۔ دونوں صوبوں کی آبادی تقریباً نو لاکھ ہے۔ اور آبادی میں اکثریت عربوں اور بربروں کی ہے۔

دونوں صوبوں کی شروع زمانہ کی تاریخ قریب قریب ایک سی ہے حضرت مسیح سے تقریباً ساڑھے چھ سو برس قبل فونیقی قوم نے ان دونوں صوبوں میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ فونیقیوں سے یہ دونوں صوبے یونانیوں کے پاس آئے یونانیوں سے رومیوں کو ملے اور پانچویں صدی عیسوی میں بازنطنی سلطنت میں شامل کئے گئے۔ پھر ساتویں صدی عیسوی میں پورا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

ساتویں صدی سے سولہویں صدی تک لیبیا کی تاریخ میں کوئی اہم واقعہ نظر نہیں آتا۔ عربوں کی مرکزی طاقت کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے عرب سلطنت کے تمام ملک خود مختار ہو گئے تھے۔ چنانچہ لیبیا بھی خود مختار تھا۔ لیکن اس ملک میں اس تمام زمانہ میں خانہ جنگی اور طوائف الملوکی رہی۔ سیاسی انتشار کے اس دور میں ناممکن تھا کہ قوم متحد ہو کر اپنا کوئی نصب العین مقرر کرتی اور قومی زندگی کو کسی اونچے معیار پر لانے کی کوشش کی جاتی۔

ریگستانوں کے بسنے والوں قبائلی سرداروں کے ساتھ وفاداری کا جذبہ ہوتا ہے۔ قومی اتحاد کے اصول کو سمجھنا ان کے لئے آجتک مشکل ہے۔ پھر قرونِ وسطیٰ میں تو اس کا ذکر ہی کیا؟ چنانچہ لیبیا میں صدیوں تک قبائلی اختلافات اور جنگیں جاری رہیں، اسی ابتری کی وجہ سے ملک پر بیرونی حکومتوں کی للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔ چنانچہ اس دوران میں لیبیا ٹیونس کے قبضہ میں چلا گیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں جب عربوں کی جگہ ترکوں کو اقتدار حاصل ہوا تو لیبیا بھی سنہ ۱۵۵۲ء میں ترکی سلطنت کی ایک ولایت بن گیا۔ اور یہاں ایک ترکی گورنر مقرر ہوا۔

اٹھارویں صدی تک لیبیا کو ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۷۱۱ء میں طرابلس کے کرمانلی خاندان کے ایک شخص احمد پاشا نے جو ینگ چری ترکوں کی نسل سے تھا۔ لیبیا میں خود مختار حکومت قائم کی لیکن اس نے اور اس کے خاندان نے ترکی خلیفہ کے قائم مقام کی حیثیت سے حکومت کی، یہ لوگ خلیفہ کو باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اس خاندان پر زوال آیا اور سنہ ۱۸۳۵ء میں ملک میں پھر خانہ جنگی چھڑی ترکوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر دوبارہ لیبیا پر اپنا پورا اثر قائم کر لیا۔ اور یہ ملک پھر ترکی حکومت کی ایک ولایت بن گیا۔ ترکوں کے قبضہ میں آجانے کے بعد بھی لیبیا کے اندرونی اختلافات نہ مٹے۔ البتہ اسی زمانہ میں سائرینیکا میں قومی اتحاد کی ایک تحریک شروع ہوئی جسے سنوسی تحریک کہتے ہیں۔ اس تحریک نے سائرینیکا کے تمام قبائل کو اس طرح متحد کر دیا کہ وہ باقاعدہ ایک ملکی طاقت سمجھے جانے لگے۔

سنوسی تحریک کے بانی کا نام سید محمد بن علی بن السنوسی الخطابی الحسینی الادریسی المناحری تھا۔ ان کو عرف عام میں شیخ سنوسی کہا جاتا ہے۔ یہ فاطمی سید تھے۔ الجزائر کے شہر مستغنم میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۰۳ء ہے انہوں نے فیض کے شہر میں دین کی تعلیم حاصل کی ابتدا ہی سے مذہبی احساس رکھتے تھے۔ چنانچہ قوم اور مذہب کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا۔ انہوں نے قوم اصلاح کا ایک مکمل پروگرام تیار کیا جس کی بنیاد دین کی اصلاح پر رکھی۔ تیس سال کی عمر میں انہوں نے مراقش چھوڑ دیا۔ اور دینی اصلاح کی تبلیغ کے سلسلہ میں الجزائر کے صحرا میں دورہ شروع کیا۔ الجزائر سے ٹیونس پہنچے۔ اور وہاں سے طرابلس آئے اور ان ملکوں میں کافی مسلمان ان کی تبلیغی اور اصلاحی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور ان کی تحریک ترقی کرنے لگی۔

شیخ سنوسی کی تعلیم اور تبلیغ کے اصول خالص اسلامی اصول تھے، انہوں نے قرآن اور حدیث کا نہایت غور سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تیرہ سو برس میں مسلمانوں کی دینی زندگی کے اندر اس قدر خرافات شامل ہو گئی ہیں۔ کہ اسلام کی اصل تعلیم بالکل چھپ گئی۔ اور مسلمان اس تعلیم سے دور جا پڑے جس کا پیغمبر اسلام نے دنیا کو سبق دیا تھا۔ اس تعلیم کو دوبارہ اجاگر کرنے کا ان کے نزدیک صرف ایک طریقہ تھا۔ اور وہ یہ کہ پیغمبر اسلام نے جس سیدھے اور صاف انداز میں اسلام پیش کیا اور شروع زمانہ کے مسلمانوں نے جس طرح اسلام کو سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ وہی طریقہ کار اُمّت کو اختیار کرنا چاہئے۔ وہ آزادی کو اسلام کی بنیادی تعلیم قرار دیتے تھے۔ اسی وجہ سے فکری اور سیاسی دونوں قسم کی آزادی کی تبلیغ کرتے تھے، فکری آزادی سے ان کی یہ مراد تھی۔ کہ مسلمان کا ذہن دوسروں کا غلام نہ بنے اسے چاہئے کہ خدا اور رسول کے احکام کی پیروی کرے، اس کے بعد کسی مذہبی پیشوا یا بزرگ کی تقلید اس پر فرض نہیں، یہی وجہ ہے کہ گو شیخ سنوسی اپنے آپ کو مالکی، فقہ کا پیرو کہتے تھے لیکن اس کی پیروی اس سختی، کے ساتھ نہ کرتے تھے جیسی اس فرقہ کے لوگ عام طور پر کرتے ہیں فقہ تو فقہ ہے وہ قرآن کو سمجھنے کے لئے مفسروں کی رائے کو ضروری نہ بتاتے تھے، ان کا خیال تھا کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے بس حدیث کافی

ہے۔جب تک علماء کی تقلید کی جاتے گی ۔قرآن کی حقیقت پڑھنے والے کے ذہن پر روشن نہ ہوگی ۔وہ ابتدائی دور کے اسلام کو عقائد اور عمل کا نمونہ قرار دیتے تھے ۔ اور اپنے پیروں کو اسی نمونہ پر چلنے کی تبلیغ کرتے تھے ۔وہ کہتے تھے کہ اسلام میں سیاست اور مذہب دو جُدا چیزیں نہیں اور اسلام کا ابتدائی دور اس کی مثال ہے ۔ انہوں نے بھی اپنی تحریک میں اپنا مقصد یہی قرار دیا تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم اس ڈھنگ پر کی جائے کہ ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی بنیاد اسلام کی تعلیم پر ہو، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس ایک پورا پروگرام تھا۔جسے وہ اسلامی ملکوں میں جاری کرنا چاہتے تھے ۔اسی پروگرام کے چلانے کیلئے انہوں نے درویشوں کا وہ سلسلہ قائم کیا تھا جسے سنوسی فرقہ کہتے ہیں ۔

اب تک شیخ سنوسی کی تبلیغ الجزائر، ٹیونس اور طرابلس میں ہوئی تھی ۔ اور ان تینوں ملکوں میں انہیں اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ۔لیکن جب وہ مصر میں قاہرہ پہنچے تو جامعہ ازہر کے علماء نے ان کو غیر مقلد قرار دیکر ان کی مخالفت کی جس کی وجہ سے شیخ قاہرہ سے مکہ چلے گئے ۔یہاں ۱۸۳۵ء میں انہوں نے ابوقبیس میں اپنی پہلی خانقاہ قائم کی ۔عرب کے قیام کے زمانہ میں شیخ سنوسی نے وہاں کے وہابی فرقہ کے ساتھ اپنے تعلقات قائم کیے ۔اس فرقہ کے عقائد میں بھی ان کو وہی چیز نظر آتی تھی ۔جس کی تلاش میں وہ خود تھے ۔ وہابی فرقہ کے ساتھ شیخ کا ربط ضبط دیکھ کر مکہ کے علماء بھی ان کے خلاف ہو گئے ۔جب یہ مخالفت زیادہ ہوئی تو ۱۸۴۳ء میں شیخ نے مکہ چھوڑ دیا اور سائیرینیکا میں آکر قیام کیا ۔یہاں درنا کے پہاڑوں میں انہوں نے اپنی مشہور خانقاہ "زاویہ بیضا" کے نام سے قائم کی لبیا میں یہی خانقاہ ان کی تبلیغ کا مرکز بنی ۔

سنوسیوں کا تبلیغی پروگرام یہ تھا کہ سب سے پہلے یہ اپنی تبلیغی کوششوں کے لئے ایک علاقہ منتخب کرتے تھے ۔اس علاقہ میں کسی ایک مقام کو اپنا مرکز قرار دیتے تھے ۔ یہ مرکز "زاویہ" کہلاتا تھا ۔اور اسی "زاویہ" سے اس پورے علاقہ کی تنظیم کیلئے کوشش جاری ہوتی تھی ۔ یہ تنظیم اسلام کے بالکل شروع زمانہ کی تنظیم کے اصول پر کی جاتی تھی ۔ہر زاویہ ایک شیخ کے ماتحت ہوتا تھا یہ شیخ اسلام کی تعلیم سے بخوبی واقف ہوتا تھا ۔ اور اپنی تحریک کے مقاصد سے بھی پوری طرح باخبر ہوتا تھا ۔اپنے حلقہ میں مذہبی تعلیم دینے کے ساتھ ہی ساتھ وہ قبائلی اور انفرادی جھگڑوں کو بھی فیصل کرتا تھا ۔اس سلسلہ میں سنوسی شیوخ کو وہ کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی ۔ جو کبھی ترکوں کو میسر نہ آئی تھی ۔ شیخ کے تمام پیروؤں پر فرض تھا کہ وہ تحریک کے چلانے کے لئے اپنے زاویہ کو مالی امداد دیں ۔اس طرح جو رقم وصول ہوتی تھی اس کا زیادہ حصہ زاویہ کی کوششوں کے سلسلہ میں صرف ہوتا تھا ۔جو باقی بچتا تھا وہ تحریک کے مرکزی سردار کے پاس بھیج دیا جاتا تھا ۔اس طرح شیخ محمدؐ علی سنوسی کے زاویوں نے بہت جلد ترکوں کی سلطنت کے اندر ایک دوسری سلطنت کی سی حیثیت اختیار کر لی ۔سنوسیوں کو سب سے زیادہ اثر اور اقتدار سائیرینیکا میں حاصل ہوا ۔کیونکہ یہاں ترکی اثر پہلے سے ہی کم تھا ۔ اور اسی وجہ سے سنوسیوں نے سب سے پہلے اسی کو اپنے لئے عمل کا میدان بنایا ۔

سنوسیوں کے ہر زاویہ کے زیر اثر جو علاقہ ہوتا تھا ۔اس کا انتظام کرنے میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ مقامی رسموں اور رواجی قانون کو نظر انداز نہ کیا جائے ۔بشرطیکہ یہ رسمیں اور رواجی قانون اسلام کے اصولوں کے خلاف نہ ہوں ۔ ملک کے بسنے والے زیادہ تر گلہ بان تھے ۔اس قسم کی سیدھی سادی سماج میں لازمی تھا کہ سنوسیوں کا انتظامی اصول مقبول ہو ۔

ترکوں کو سنوسیوں کی یہ ترقی پسند نہ آئی ۔اسی وجہ سے سنوسیوں کی برابر یہ کوشش رہی کہ ترکوں کے ساتھ ان کا تصادم نہ ہو ۔ ۱۸۵۵ء میں جب ترکوں نے سنوسیوں کا مقابلہ کرنا چاہا ۔تو اس ٹکر کو بچانے ہی کی غرض سے سنوسیوں نے سائیرینیکا کو چھوڑ دیا ۔ اور پہلے تو جغبوب کے نخلستان کو اپنا مرکز بنایا ۔ لیکن اب ان کی جماعت فوجی رنگ اختیار کرنے لگی ، اس نئی خصوصیت نے جماعت میں اتحاد اور یہیں شیخ احمد سنوسی نے انتقال کیا اور شیخ نے دو لڑکے چھوڑے شیخ محمدؐ شریف اور المہدی ۔ دوسرے کو خلیفہ بنایا ۔

شیخ مہدی سنوسی کو بھی اپنے تقدس اور سیاسی دوراندیشی کیوجہ سے قوم میں وہی مقبولیت حاصل ہوئی جو اُن کے باپ کو حاصل تھی ۔ انکے زمانہ میں سنوسی زاوے لبیا سے باہر الجزائر، فلسطین، ترکی اور ہندوستان میں بھی قائم ہوئے ۔شمالی افریقہ میں مشرق کی طرف مصر کی مغربی سرحد سے سوڈان کے وسط تک اور مشرقی صحرا میں اور شمال میں ٹری پولی ٹینیا کے ساحلی علاقہ تک شیخ مہدی سنوسی کا اثر قائم ہو گیا ۔اور ان کو بادشاہی اختیارات حاصل ہو گئے ۔

سنوسیوں نے لبیا کے نخلستانوں پر قبضہ کر لیا ۔ اور ان میں زراعت شروع کر دی ۔ ساتھ ہی صحرا نشین بدوؤں کی تنظیم کی طرف قدم اٹھایا ۔ اور لبیا اور لبیا سے باہر وسطی سوڈان تک ان کی تبلیغ پھیل گئی ۔اور عربوں کی ایک بڑی تعداد ان کی تحریک میں شامل ہو گئی ۔ سنوسیوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت نے ترکوں کو پریشان کر دیا ، اس زمانہ سلطان عبدالحمید دوئم ترکی کے خلیفہ تھے ۔وہ دیکھ رہے تھے کہ ٹری پولی ٹینیا اور سائیرینیکا کے اکثر حصوں میں ترکی گورنر سے کہیں زیادہ سنوسی شیوخ کی عزت اور ان کا اثر تھا ترکوں کی طرف سے سنوسیوں کے خلاف کاروائیاں شروع ہوئیں ۔ اور اسی مخالفت کی وجہ سے شیخ سنوسی نے ۱۸۸۹ء میں جغبوب کو چھوڑ کر بن غازی سے سات سو میل دور کفرا کے ریگستان کو اپنا مرکز بنایا ۔یہاں آس پاس کی حبشی سلطنتوں کے ساتھ سنوسیوں کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے

جس سے سنوسی تحریک کو اور بھی امداد ملی اور تھوڑے ہی عرصہ میں سنوسی زاوئے جھیل چھاڈ کے ارد گرد تقریباً سو میل کے رقبہ میں پھیل گئے۔

اس علاقہ میں سنوسیوں کے لئے ایک نیا خطرہ پیدا ہو رہا تھا اور وہ فرانسیسیوں کا خطرہ تھا فرانسیسی کانگو کی طرف سے وسط سوڈان کی طرف بڑھ رہے تھے اور یہ سنوسی علاقہ تھا، سنوسیوں کو اپنے بچاؤ کے لئے فرانسیسیوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۱ء تک فرانسیسیوں کے ساتھ ان کی جنگ ہوتی رہی لیکن اخیر میں سنوسیوں کو کفرہ سے نیچے کا علاقہ فرانسیسیوں کو دینا پڑا اور جنگ ختم ہو گئی۔

فرانسیسیوں کے ساتھ سنوسیوں کی یہ جنگ اس وجہ سے خاص کر اہم ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ سنوسی جماعت نے ہتھیار سنبھالے لیکن اس دس سال میں لڑائی میں پہل کبھی سنوسیوں کی طرف سے نہیں ہوئی وہ ہمیشہ اپنے بچاؤ کے لئے لڑے لیکن بچاؤ کے سلسلہ میں ان کو جو تیاری کرنی پڑی اس نے ان کے دلوں میں فوجی جذبہ پیدا کر دیا اور ان کے آپس کے اتحاد کو بہت بڑھا دیا۔ اسی اتحاد کی بدولت ان کی تحریک اس قدر کامیاب ہوئی کہ بہت جلد پورے سائیرینیکا نے ان کی اطاعت قبول کر لی۔

فرانسیسیوں کے ساتھ سنوسیوں کی جنگ ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے لیبیا پر حملہ کر دیا۔ دنیا کی تاریخ میں ہر ملک کے بسنے والوں میں قومی جذبہ سب سے زیادہ اسی وقت ابھرا ہے جب کسی بیرونی طاقت نے ان پر حملہ کیا ہے۔ اپنے ملک کی آزادی کو بچانے کے لئے ملک والے ہمیشہ متحد ہوتے ہیں اور وطن اور قوم کی خدمت کے لئے تن من دھن سے تیار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ لیبیا کے باشندوں میں بھی اٹلی کے حملے نے قومیت کے احساس کو جگا دیا۔ ترکوں کو اٹلی کے حملہ کا پہلے سے اندازہ تھا چنانچہ پچھلے پندرہ سال کے عرصہ میں وہ لیبیا والوں کو خوش رکھنے کی برابر کوشش کرتے رہے تھے۔ انھوں نے لیبیا کے قصبوں میں مدرسے کھلوائے تھے، قبائلی معاملات کے ساتھ برابر ہمدردی کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ حکومت کے انتظام میں لیبیا والوں کو شریک کرنے کی غرض سے اکثر ذمہ داری کے عہدوں پر ملکی لوگوں کو مقرر کر دیا گیا تھا، ان تمام کوششوں کے علاوہ ترکی سلطنت میں اتحاد قائم رکھنے اور اس سلطنت میں اتحاد قائم رکھنے اور اس سلطنت کے ملکوں کو یورپ والوں کی دست برد سے بچانے کے لئے ترکی نے ایک تحریک جاری کی تھی جسے تحریک اتحاد اسلامی یا "عالمگیر اسلامیت" کہا جاتا ہے اور جو انگریزی میں پان اسلامزم کہلاتی ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں یہ تحریک اپنی پوری ترقی تک پہونچ چکی تھی۔ ترکی سلطنت کے تمام ممالک اس تحریک میں حصہ لے رہے تھے اور ان کے اندر غیر معمولی طریقے پر قومی جذبہ پیدا ہو گیا تھا، لیبیا پر بھی اس تحریک کا پورا اثر تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جس وقت اٹلی نے لیبیا پر حملہ کیا ہے تو اس وقت اس ملک میں دو جماعتیں تھیں، طرابلسی عرب یعنی ٹری پولی ٹینا کے قبائل اور سنوسی فرقہ۔ یہ دونوں جماعتیں اب تک ترکوں سے برگشتہ تھیں لیکن اس وقت اٹلی کے مقابلہ میں نہایت خوشی کے ساتھ ترکوں کا ساتھ دینے کے لئے آمادہ ہو گئیں۔ طرابلس کی جنگ میں اٹلی کا صرف ترکوں اور لیبیا کے باشندوں ہی سے مقابلہ نہ تھا بلکہ کل اسلامی دنیا کی مخالفت کا سامنا تھا۔

اگرچہ ٹری پولی ٹینا اب تک سائیرینیکا سنوسی تحریک سے الگ تھا لیکن دونوں صوبے اپنی اپنی آزادی کے لئے تقریباً بیس سال تک ترکوں کے ساتھ یورپی طاقتوں سے لڑتے رہے۔ ۱۹۱۸ء میں ترکوں کو جنگ عظیم میں شکست ہوئی ٹری پولی ٹینا اس وقت تک ترکوں کے ساتھ رہا اسی طرح سنوسی بھی سائیرینیکا، سرطیقہ فیضان میں اپنی آزادی کے لئے کبھی تنہا اور کبھی ترکوں کے ساتھ اخیر تک اٹلی کا مقابلہ کرتے رہے لیکن ترکوں کی طاقت روز بروز کمزور ہوتی جاتی تھی اور اٹلی لیبیا پر قابو پاتا جاتا تھا، لیبیا پر اٹلی کا اثر جتنا بڑھتا جاتا تھا لیبیا والوں میں قومی جذبہ اتنا ہی اور زیادہ ہوتا جاتا تھا اور آزادی کی خواہش اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔

۲۵ رفروری ۱۹۱۲ء کو اٹلی نے لیبیا پر اپنے سیاسی اقتدار کا اعلان کیا، لیکن اس اعلان کو نہ ترکوں نے تسلیم کیا، نہ طرابلسی عربوں (یعنی ٹری پولی ٹینا) نے اور نہ سنوسیوں (یعنی سائیرینیکا) نے پھر ابھی تک ملک پر اٹلی کا قبضہ بھی نہ ہوا تھا اس لئے ترکوں کو ایک موقع ہاتھ آگیا اور ترکی خلیفہ نے لیبیا کی آزادی کا اعلان کر دیا، اس اعلان میں عربوں کے نقطۂ نظر سے جو دفعہ خاص طور پر لیبیا کے لئے مفید تھی اس کے الفاظ یہ تھے "تمہارے ملک میں امن اور خوش حالی قائم کرنے کے خیال سے میں بحیثیت اس ملک کے بادشاہ کے تمہیں مکمل آزادی بخشتا ہوں"

اسی زمانہ میں بلقان کی پہلی جنگ چھڑ گئی، ترک اپنی فوجی طاقت کو بلقان کے محاذ پر اکٹھا کرنا چاہتے تھے اس کی خاطر ان کو لیبیا چھوڑنا پڑا چنانچہ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کو اٹلی کے ساتھ انھوں نے صلح کر لی۔ یہ صلح لوزان کے مقام پر ہوئی تھی اس لئے یہ صلح نامہ لوزان کا صلح نامہ کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے ترکوں نے لیبیا پر اٹلی کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیا، لیکن ترک اس سے پہلے عربوں کی آزادی کا اعلان کر چکے تھے اس لئے عربوں نے اس صلح نامہ کو تسلیم نہ کیا اور اٹلی کے سیاسی اقتدار کا مقابلہ کرنے لگے۔

لیبیا سے ترکوں کے چلے جانے کے بعد بھی اٹلی اس ملک کو فتح نہ کر سکا۔ ۱۹۱۵ء تک عربوں نے اٹلی والوں کو بہت سی شکستیں دیں اور اٹلی کا ٹری پولی ٹینا میں صرف دو شہروں یعنی طرابلس اور حمص پر قبضہ ہو سکا۔ اسی طرح سائیرینیکا میں سولم کے قریب سنوسی فوج سے اٹلی کا مقابلہ ہوا لیکن اٹلی والوں کو شکست ہوئی اور سائیرینیکا پر ان کا بس اتنا اثر قائم ہو سکا کہ ان کی چند فوجوں نے سرحد پر اڈے جمالئے۔

اس زمانہ میں سنوسی جماعت کے صدر نشین سید احمد شریف سنوسی تھے

جو تحریک کے بانی سید محمد بن علی کے پوتے تھے۔ یہ "تحریک اتحاد اسلامی" کے زبردست حامی تھے، چنانچہ "باب عالی" (ترکی خلافت) کی طرف سے ان کو شمالی افریقہ کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۹) کے دوران میں چونکہ سنوسی فرقہ ترکوں کے ساتھ تھا اس لئے ترکوں کی مدد کی خاطر شیخ احمد سنوسی نے اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ وسطی سوڈان، اینگلو مصری سوڈان اور جھیل چھڈ کے علاقہ میں اتحادی طاقتوں کے ساتھ سنوسیوں کی جنگ چھڑ گئی۔ ۱۹۱۵ء میں سنوسیوں نے مصر پر بھی حملہ کر دیا اور یہ لڑائی دو سال جاری رہی لیکن اخیر میں سنوسیوں کو شکست ہوئی اور شیخ احمد سنوسی کو سائیبری نیکا سے جلا وطن ہونا پڑا۔ اٹلی والوں نے شیخ سید محمد ادریس سنوسی کو جو شیخ احمد شریف سنوسی کے چچا زاد بھائی تھے اور مدت سے مصر میں مقیم تھے بلا کر سنوسیوں کا سردار بنا یا۔ اٹلی والوں نے ان کے ساتھ معاہدہ کر لیا کہ ان مقامات کو چھوڑ کر جو فوجوں کے قبضہ میں ہیں باقی کل سائیبری نیکا شیخ ادریس کے قبضہ میں رہے گا۔ اور وہی یہاں کے حاکم ہوں گے۔

۱۹۱۸ء میں جب ترکی کو جنگ عظیم میں شکست ہوئی تو ٹری پولی ٹنیا والوں نے اپنے ملک میں جمہوریت کا اعلان کر دیا، اور گو قبائلی سرداروں میں آپس کے اختلاف تھے لیکن ۱۹۲۰ء میں غریان کے مقام پر سب نے متفق ہو کر یہ طے کر لیا کہ سائیبری نیکا کے شیخ محمد ادریس کو جمہوریہ کا صدر بنا یا جائے۔ شیخ ادریس کو یہ دعوت بھیجی گئی اور ۱۹۲۲ء میں انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ ظاہر ہے یہ بات اٹلی والوں کو پسند نہیں آسکتی تھی، اتفاق سے اسی زمانہ میں اٹلی کی اندرونی حکومت میں انقلاب ہوا فسطائی جماعت برسر اقتدار آئی اور اٹلی میں آمریت (ڈکٹیٹر شپ) قائم ہوگئی، اٹلی کی نئی حکومت لیبیا کی آزادی کو کب گوارا کر سکتی تھی، اس نے عوام کی آزادی اور ان کے حقوق کو دبا کر بھیڑیا راج قائم کر دیا اور اٹلی کی طرف سے لیبیا میں اتنا دباؤ پڑا کہ اخیر میں شیخ ادریس سنوسی کو لیبیا چھوڑنا پڑا اور انھوں نے مصر میں پناہ لی۔ گو شیخ ادریس مصر کو جلا وطن ہو گئے لیکن لیبیا کی جنگ آزادی بدستور جاری رہی اور ٹری پولی ٹینا کے قبائلی سردار اور سنوسی شیخ اسی طرح لیبیا پر اٹلی کی حکومت کے مخالف رہے چنانچہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۱ء تک اٹلی والوں کو مجبوراً لیبیا کے دونوں صوبوں میں ملک کے باشندوں کو انتظام حکومت میں کچھ اختیارات دینے پڑے، لیکن انتظام حکومت میں محض حصہ دار بنا لینے سے لیبیا والوں کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی، ان کا مطالبہ تھا مکمل آزادی اور اسی آزادی کی خاطر انھوں نے اٹلی کے خلاف جان کی بازی لگائی تھی، اٹلی کی طرف سے آزادی کی تحریک کو کچلنے کی جتنی زیادہ کوشش کی گئی تحریک اتنی ہی زیادہ بڑھی۔ یہاں تک کہ ملک میں ایک عام بغاوت پھیل گئی۔ اس بغاوت کو دور کرنے کے لئے اٹلی والوں کی طرف سے قتل وغارت شروع ہوا اور شہر کے شہر اجاڑ ڈالے گئے۔ اٹلی کی اس مہم کے ہیرو جنرل گرازیانی تھے انھوں نے باغیوں پر ان کی بستیوں کے کنوئیں بند کرا دیئے۔ ہزارہا عرب پیاس کی تکلیف سے مر گئے۔ ہری بھری کھیتیاں سوکھ گئیں بن غازی کے شہر میں روزانہ ایک درجن عرب شارع عام پر پھانسی کے تختے پر لٹکائے جاتے تھے۔ عربوں کے سرداروں کو ہوائی جہازوں پر سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا اور ان کی موت سے اشتہار کا کام لیا جاتا تھا جس آدمی کے پاس کوئی ہتھیار نکلتا اسے سزائے موت دی جاتی تھی۔ کل عرب آبادی پر یا تو پولس کا سخت پہرہ رہتا تھا یا انھیں ساحل کے کنارے کے ریگستانوں میں قید کیا جاتا تھا، اٹلی کے یہ مظالم نو سال تک جاری رہے عرب نہایت بہادری سے ان کا مقابلہ کرتے رہے لیکن اخیر میں سنوسی جماعت کو اپنا مرکز (سائیبری نیکا) اٹلی کی فوجوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس جنگ میں سائیرینیکا کی آبادی میں سے ایک تہائی مرد مارے گئے۔

دنیا میں قومیت کے جذبہ کو جس چیز نے سب سے زیادہ تقویت پہنچائی ہے وہ حاکموں کا محکوموں پر ظلم تھا، چنانچہ لیبیا کی قومیت کو بھی اٹلی کے ظلم نے انتہائی ترقی تک پہنچا دیا اور باوجودیکہ ملک پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا تحریک اسی زور شور کے ساتھ جاری رہی۔ سائیبری نیکا کے عرب باشندے سنوسی حکومت ہی کو ملک کی اصلی حکومت قرار دیتے تھے اور گو شیخ محمد ادریس مصر میں جلا وطن تھے لیکن لیبیا میں اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا اور اٹلی کے خلاف جتنی کارروائیاں ہوتی تھیں وہ سب اس کے نام سے کی جاتی تھیں اٹلی والے شیخ ادریس کے خلاف ہر ممکن طریقہ پر پروپیگنڈا کر رہے تھے لیکن لیبیا کے لوگ شیخ کی طرف سے بدگمان نہیں ہوتے تھے۔ شیخ ادریس لیبیا والوں کے قومی ہیرو تھے اور ان کی قربانیوں کی وجہ سے انکی مقبولیت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ٹری پولی ٹنیا والے بھی لیبیا میں ایک انھیں کو ایسا شخص سمجھتے تھے جو پورے ملک پر حکومت کا مستحق تھا۔ اس چیز سے ملک کے اتحاد کو بڑی مدد ملی اور اس اتحاد ہی کی وجہ سے لیبیا کی آزادی کی تحریک زندہ رہ سکی۔

اٹلی کے قبضہ کے بعد بہت سے عرب لیڈر ایسے تھے جن کو لیبیا سے جلا وطن ہونا پڑا۔ ان سب نے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں پناہ لی اور وہاں اپنا پروپیگنڈا جاری کیا۔ پروپیگنڈا کے لئے دمشق میں ٹری پولی ٹنیا سائیری نیکا ڈفینس کمیٹی کے نام کی ایک انجمن قائم کی۔ یہ انجمن لیبیا سے باہر رہ کر اٹلی کی مخالفت کر رہی تھی۔ اسلامی ملکوں کے اخبار انجمن کے حمایتی تھے۔ چنانچہ بہت جلد دوسرے عربی ممالک کو بھی لیبیا کے عربوں کے ساتھ ہمدردی ہو گئی اور اس ہمدردی نے لیبیا کی تحریک آزادی کو بہت تقویت پہنچائی۔

۱۹۳۹ء میں جس وقت یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی ہے تو اس وقت لیبیا کے عربوں کی ایک بڑی تعداد جلا وطنی کی زندگی گزار

رہی تھی، ان میں زیادہ تر ایسے لیڈر تھے جو اٹلی کے خلاف لڑ چکے تھے ۱۹۳۹ء میں ان سب نے مصر میں اسکندریہ کے مقام پر جمع ہو کر اپنی ایک کانفرنس کی جس میں ایک قرارداد کے ذریعہ یہ منظور کیا گیا کہ سائبری نیکا اور ٹری پولی ٹینا دونوں سید ادریس سنوسی کو امیر تسلیم کرتے ہیں اور انھیں یہ حق دیتے ہیں کہ وہ لیبیا کے پورے ملک کی نمایندگی کریں۔ اس قرارداد کی ایک نقل مصر کے وزیر اعظم کو بھیجی گئی اور دوسری برطانوی سفیر مقیم مصر کو۔ اس کے بعد کانفرنس ہی کی تحریک پر سید ادریس سنوسی برطانوی فوجی افسروں سے ملے اور ان سے کہا کہ اگر یہ وعدہ کیا جائے کہ برطانیہ لیبیا کو آزاد کر دے گا اور سید ادریس سنوسی کو وہاں کا حکمران تسلیم کرے گا تو لیبیا کے باشندے انگریزوں کو اٹلی کے خلاف مدد دینے کو تیار ہیں۔ انگریز اس شرط کو ماننے پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۰ء میں جوں ہی اٹلی اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوا ہے لیبیا کے سربرا اور دہ لیڈروں نے انگریزوں کا ساتھ دینے کے لئے ایک ملکی فوج تیار کرنی شروع کر دی۔ اس فوج میں زیادہ تر وہ فوجی سردار تھے جو اٹلی والوں کے خلاف اب تک لڑ رہے تھے۔ لیبیا کی اس فوج کا نام لیبین عرب فورس رکھا گیا۔ ۱۹۴۲ء میں اس کی تعداد پانچ ٹبلین یعنی تقریباً پانچ ہزار سپاہی تھے۔ اس فوج میں سب کے سب وہی لوگ تھے جو یا تو اٹلی کے ظلم کی وجہ سے لیبیا چھوڑ کر جلا وطن ہو گئے تھے یا اٹلی سے باغی ہو کر اٹلی کے خلاف لڑتے کے لئے بے چین تھے۔ ان سب میں اکثریت سائبری نیکا والوں کی تھی۔ نومبر ۱۹۴۲ء میں انگریزوں نے اٹلی کو شکست دے دی اور ۹ر جنوری ۱۹۴۲ء کو برطانیہ کے ناظم امور خارجہ نے ایک اعلان کے ذریعہ سید ادریس سنوسی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "ملک معظم کی حکومت کا ارادہ ہے کہ جنگ کے ختم ہونے پر کسی حال میں بھی سائبری نیکا میں اٹلی کا دوبارہ اقتدار قائم نہ ہونے دیا جائے گا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی ساتھ لیبیا میں انگریزوں نے اپنا "عارضی تسلّط" قائم کر لیا۔ ملک کا نظام حکومت انگریزی فوج کے ہاتھوں میں آ گیا۔ البتہ بعض وہ عہدے جو اب تک اٹلی والوں کے پاس تھے عربوں کو دے دئے گئے۔ وہ زراعتی فارم بھی جن کو اٹلی والے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے عربوں کو مل گئے۔ لیکن ان چیزوں سے عربوں کی تشفی نہیں ہو سکتی تھی، انھوں نے مطالبہ کیا کہ سید ادریس کو امیر لیبیا مقرر کیا جائے، اس کے جواب میں انگریزوں نے یہ کہا کہ ہیگ کے معاہدے کی رو سے ہم اس وقت تک دشمن سے چھینے ہوئے ملکوں کی آزادی کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتے جب تک اتحادی قومیں متفقہ طور پر نئے نظام کے متعلق یہ طے نہ کر دیں کہ کون سا ملک کس کے پاس رہے گا۔

لیبیا میں اس وقت جو چیز قومی خدمت کو بہت زیادہ ترقی دے رہی ہے وہ ملک کی ڈانوا ڈول سیاست ہے۔ سیاسی حالت کے متعلق عربوں کو اب تک نہیں معلوم کہ ان کی آزادی کے متعلق آخری فیصلہ کیا ہوگا۔ سید ادریس کے ساتھ جوان کو دلی شغف حاصل ہے وہ انھیں مجبور کر رہا ہے کہ شیخ کو جلد سے جلد لیبیا کا حکمراں دیکھیں، اب تک دو بار لیبیا والے اپنے اس قومی ہیرو کو مصر سے مہمان کے بطور لیبیا بلا چکے ہیں، ملک میں ان کا بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور گوشہ گوشہ میں ان کے آنے پر خوشی منائی گئی، آزادی ملنے میں جتنی دیر ہو رہی ہے قومی تحریک اسی قدر مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

ملک کی اقتصادی حالت سے بھی قومی جذبہ کو بہت تقویت پہنچ رہی ہے اٹلی والوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں لیبیا میں تعمیری کام تو کیا لیکن ترقی کی ساری اسکیمیں ان آبادکاروں کے لئے تھیں جو اٹلی سے آکر لیبیا میں بس گئے تھے۔ عربوں کی زمینیں ان سے زبردستی چھین گئی تھیں اور زراعت کے لئے اٹلی کے آبادکاروں کو دی گئی تھیں۔ آج بھی یہ لوگ ان پر قابض ہیں۔ یہ خبر عربوں کے دل کے لئے بڑی تکلیف دہ ہے اور ان کو مشتعل کرنے اور ان کی قومی غیرت کو ابھارنے کے لئے کافی ہے۔

اس کے علاوہ ملک کی عام اقتصادی حالت بہت کمزور ہے، زراعت نہایت خراب حالت میں ہے۔ ملک کی معدنی پیداوار قدرتی طور پر نہ ہونے کے برابر ہے گلہ بانی پر عربوں کا دار و مدار ہے سو اس کو ترقی دینے کی بھی کسی نے کبھی فکر نہ کی۔ اٹلی کی معاشی لوٹ کھسوٹ نے اور جنگ کی تباہ کاریوں نے ملک کی رہی سہی دولت بھی ختم کر دی۔ اٹلی کی حکومت کے زمانہ میں لیبیا کے میزانیہ میں ہمیشہ خسارہ رہا اور لیبیا اٹلی کا مقروض رہا۔ حالانکہ اٹلی کی حکومت قائم ہونے سے پہلے لیبیا کو کوئی مالی مشکل پیش نہ تھی، یہ سچ ہے کہ اس زمانہ کے مقابلہ میں آج شہری عربوں کی زندگی کا معیار اونچا ہو گیا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اس معیار کو قائم رکھنے کے لئے جس قسم کے معاشی وسائل کی ضرورت ہے ملک کو ان سے بالکل محروم رکھا گیا۔ سامراجی طاقتوں نے جن پسماندہ ملکوں پر قبضہ کیا وہاں ان کا اصول یہی رہا اور اسی اصول کی بدولت ملک میں اقتصادی بدحالی پھیلی جو آگے چل کر اس ملک میں قومی بیداری کا باعث ہوئی۔ چنانچہ لیبیا والوں کو بھی اپنی تباہحالی کا بہت احساس ہے اور وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اس کے وجوہ دو ہیں ایک تو غیر ملکی حکومت کا تسلّط اور دوسرے خود ان کے اندرونی اختلافات اور نا اتفاقی۔ انھیں دو چیزوں پر آج ان کی قومی تحریک کی بنیاد ہے۔

ضروری:- رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

—— ادارہ

"بے بس"

افسانہ

فہمیدہ زہرا قزلباش

جب دولہا دولہن نے محفل کو پہلی بار سلام کیا ـــــ دعائیں تو بعد میں نکلیں پہلے ان کی موزونیت پر تنقیدی نظریں دوڑ گئیں۔

زبیدہ مہتابی رنگ ... اس کی شرمیلی مخمور آنکھیں ... اس کے جسم کے دلربا پیچ و خم ان سب پر سے نظریں گذر کر اس کے چار فٹ آٹھ انچ کے غیر معمولی چھوٹے قد پر جم کر رہ گئیں بالکل جیسے چاند کا لامتناہی حسن ابر کے ایک ننھے سے ٹکڑے کے دامن میں جھلملا جاتا ہے۔

"دولہا کس قدر بلند قد اور وجیہہ ہے"

"دولہن" ـــــ ایک طنزیہ تبسم

"جیسے دراز بالوں میں کوئی ننھی سی جوں رینگ رہی ہو"

یہ طعنوں میں سموئے ہوئے فقرے سجی بنی عورتوں کا محبوب مشغلہ ہیں۔

یہ سرگوشیاں دلہن تک پہنچ ہی گئیں۔ ممکن ہے دولہا نے نہ سنی ہوں کیونکہ اس کے بارے میں نہ تھیں۔ زبیدہ کے دل میں احساس کروٹیں بدلنے لگا۔

سورج کی آخری شعاعیں پھولوں کے الوداعی بوسے لے رہی تھیں اور پرندوں کی آواز میں نقاہت پیدا ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ دریچہ کھلا تھا۔

کتنی دلفریب شام ہے۔ شاہد نے شرمائے ہوئے غنچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہوں، زبیدہ نے جواب دیا "لیکن آپ باہر نہیں جا سکتے"

بڑی خشک ہو زیب

آپ کے بخار کی ہوا ہی ایسی ہے

وہ مسکرا دیا

صبح آپ نے دوا کہاں رکھی تھی

نہایت بدمذاق ہو تم

تیماردار کو بدمذاق بننا ہی پڑتا ہے۔ اس کے چہرہ پر کچھ ناگوار سلوٹیں پڑ گئیں۔

کاش بیویاں نازک مزاج نہ ہوتیں۔ وہ مسکرا دیا۔

اچھا جائیے الماری پر سے اتار لائیے۔

وہ ہنس دی اور شاہد بولا ہم جانتے تھے ان سلوٹوں میں بھی قہقہے تھے۔

عورت کے خاموش تبسم مردوں کے احساس فرزانگی کا اکثر مذاق اڑاتے ہیں۔

وہ مسکرا دی ـــــ ایک فاتحانہ مسکراہٹ۔ اور تیزی سے چل دی۔

جس قدر سرعت سے بڑھی تھی اتنی ہی بے بسی سے رک گئی۔ دو انچ اونچی ایڑی کا سینڈل پہننے کے باوجود اس کے ہاتھ دوا تک پہنچنے سے معذور رہے اس کے چہرہ پر بیچارگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انسان انتہائی کوشش کے باوجود کسی کمی کو پورا نہ کر سکے ـــــ تو

کیا کرنے لگیں آپ۔ شاہد نے آواز دی۔

"آپ اتار لیجئے" باوجود کئی مرتبہ دل میں دہرانے کے وہ اس مختصر سے فقرہ کو ادا نہیں کر سکی۔

شاہد اٹھ کر چلا آیا ـــ کیا بات ہے ؟ ـــ ہیں۔

جو لوگ ایک چیز کے مالک ہوتے ہیں وہ دوسرے کی محرومی کا احساس کر سکتے ہیں ؟ اگر حقیقت یوں ہوتی ـــ کوئی غریب ہاتھ پھیلاتا نظر نہ آتا۔

جیسے آپ سمجھ نہیں سکتے۔ میرا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ وہ جھنجلا گئی۔

اوہ ! شاہد نے کہا۔ اور سوچنے لگی جس بات کو میں اس قدر شدت سے محسوس کرتی وہ شاہد کیوں خود نہ سمجھ سکے۔

شاہد نے شیشی اتار دی شبنم نے اس کے بلند قد کو دیکھا۔ اور اسے محسوس ہوا۔ "جیسے دراز بالوں میں کوئی ننھی سی جوں رینگ رہی ہو"۔

ایٹ ہوم ـــ بڑے پیمانہ پر تھا۔ زبیدہ خاص مہمان تھی۔ نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ آخر آئی۔ سی۔ ایس کی نئی دلہن تھی۔

زمانہ کی ذہنیت کے مطابق ایک آئی۔ سی۔ ایس کی بیوی کو بے پناہ ذہین، بے انتہا حسین اور مکمل طور پر موڈرن ہونا چاہئے ـــ اور حسن۔ بینظیر حسن تو لازمی چیز ہے ورنہ خواب میں بھی نظر نہیں آ سکتے ـــ فش ! یہ آئی۔ سی۔ ایس !

زبیدہ جس وقت متعارف ہوئی اس کو سب متبسم نظر آئے۔ پہلی بات جو اس نے محسوس کی "یہ سب عورتیں کیسی دراز قد ہیں" ساتھ ہی "چار فٹ آٹھ انچ" اس کے کانوں میں چیخ اٹھا۔

وہ تمام وقت مسکراتی رہی ہنستی رہی ـــ بعض بعض دفعہ تو اس نے بہت طویل قہقہے لگائے۔

اس کی مسکراہٹ بھی ـــــ ایک چبھن تھی۔

اس کی ہنسی بھی ـــــ ایک خلش تھی۔ اور

اس کا قہقہہ ـــــ ایک مسلسل اضطراب تھا۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ پرخلوص نگاہیں بھی نکتہ چیں نظر آئیں۔

باتیں سنانے کے لئے ہی کی جاتی ہیں۔ "جب تک قد بلند نہ ہو شخصیت حقیر حقیر سی معلوم ہوتی ہے"۔ کسی لڑکی ہی نے کہا ہوگا۔ جس سے یہ برداشت نہ ہو سکا ہوگا کہ ایسے بیہودہ قد کی لڑکی ایک آئی۔ سی۔ ایس کی بیوی ہو۔ "اس سے بہتر تو وہی تھی"۔ آہ ذہنیت ! اور پستی خیال ـــ کیا وہ کانا اور کوڑھ مغز ہی کیوں نہ ہو۔

زبیدہ جزبز ہو کر رہ گئی۔ اس کا دل چاہا وہ اٹھ کر بھاگ جائے۔ اس خیال کی کھٹک کون مٹا سکتا ہے۔ خدا ! اس کے ہاتھ کیوں نہیں جھڑتے۔ وہ کہتا ہے "میں سب سے بڑا عادل ہوں" کیا خوب عدل ہے یہ۔

"کیا کفر بک رہی ہو"۔ اس نے ایک نامعلوم سی آواز محسوس کی۔ وہ

باغیانہ خیالات کو دبانے کوشش کرنے لگی ــــ لیکن وہ بھڑکتے ہی رہے۔

آسمان ابر آلود تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو"۔ شاہد نے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا

"کچھ نہیں"۔ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

کوئی گیت یاد ہے۔

بس سو جایئے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ اس نے ریشمین لحاف میں اپنا چہرہ چھپالیا مسلسل آنسوؤں نے اسے رات بھر جگائے رکھا۔

انسان اپنی کمی کو بھلائے رکھتا ہے لیکن جب دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا جائے تو وہ کرب زندگی پر آسیب بن کر چھا جاتا ہے چھیڑنے والے چاہے اس کا احساس نہ کر سکیں۔

کیا پڑھ رہے ہیں آپ۔ اس نے اٹھلاتے ہوئے پوچھا۔

ایک کتاب۔

یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں ــــ کوئی داستان عشق ہوگی۔

انارکلی۔

اس کا سرورق مجھے بے حد پسند ہے ــــ کیوں نا۔

خوبصورت سرورق میں ایک غمگین داستان پنہاں ہے۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ ــــ وہ کچھ سوچنے لگی۔

قدیم لباس جلیل ہوتا تھا ــــ سلیم شاہی۔

بہت پسند ہیں ــ وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔

مجھے بھی عورتوں کے پاؤں میں بیحد اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ورق الٹ دیا۔

زبیدہ ــ کسی نے بڑے پیار سے پکارا۔

اوہ آپ!

کیا آپ کو شک تھا۔

"بہت دیر کردی آج"۔ اس نے ایک سرخ گلاب کا پھول کوٹ میں لگاتے ہوئے کہا۔ خرید و فروخت میں دیر ہوگئی۔ بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے سلیم شاہی جوتے نکال کر رکھ دیئے۔

یہ تمہارے نازک سفید پاؤں میں بے حد جچیں گے۔

ہاں بہت خوبصورت ہیں۔ اس نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

وہ حیران رہ گیا۔

زبیدہ کھل کیوں نہیں اٹھی ــ عورتیں شوہر کے تحفہ کو بہت عزیز رکھتی ہیں۔ کیا تم کو پسند نہیں آئیں۔

مجھے آپ کا تحفہ ناپسند کیسے ہوسکتا ہے لیکن ــــ اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید آنسو چھپانے کی کوشش کی ہوگی۔

لیکن ــــ کیا۔ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

یہ صرف دراز قد عورتوں کے لئے ہیں۔

ہاں ٹھیک تو ہے اس کا مجھے خیال ہی نہ رہا ــ اس کے چہرہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ اسے ایک عجیب قسم کی تکلیف ــــ "کاش ایسا نہ ہوتا" ــــ "ہاں ٹھیک تو ہے"۔ شاہدہ چونک اٹھی۔ شاہد بھی سوچتے ہیں۔ انھوں نے حقیقت کو حقیقت کیوں سمجھا۔ اگر مجھے بھی تو یوں کہنے کی کیا ضرورت تھی "ہاں ٹھیک تو ہے"۔ اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ ایسا کیوں ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ اس کا سر جھک گیا۔ میرے شریک حیات ہو کر بھی۔ وہ تسلی کے فقرے نہیں کہہ سکتے تھے۔

نہیں زبیدہ تم مجھے ایسی ہی پیاری لگتی ہو حقیقت تو یہ ہے دراز عورتوں میں کچھ مردانہ حسن جھلکنے لگتا ہے۔ ہمیں اوروں سے کیا مطلب۔ تم میرے لئے ہنو۔ مجھے تم حسین لگو گی، ہر انداز میں حسین لگو گی زیب"۔ وہ جھنجلا گئی۔

وہ بچپن کا زمانہ بھی کیسا حسین دور تھا۔ بڑے ہونے پر بھی مجھے خیال نہیں ہوا۔ بس ایک دن چچا نورے پر غصہ آیا تھا جب انھوں نے بڑی آواز سے کہا تھا۔

"دو انچ ہی بڑھا لو بیٹی"۔

مجھے کس قدر طیش آیا تھا، اور اپنے وجود سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اب یاد آتا ہے بڑبڑھیاں کیسی کانا پھوسی کیا کرتی تھیں ــ اے ہے اس کا بیاہ کیسے ہوگا - - - اور اماں میرے چہرے کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کرتی تھیں۔

یہ لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ جیسے انسان کے ہاتھ میں ہے۔ کہنا ہے تو خدا سے جا کر کہو۔ لیکن جہاں طنز کا جواب نہ ملے وہاں سے یہ کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ کیا خدا کو اس کا احساس نہیں کہ یہ مجھ پر نہیں ــــ خود اس کی صناعی پر پھبتی ہے۔ شاید اس میں طاقت ہے کہ وہ اتنے طنزیہ اور حقیر جملے برداشت کر سکے۔

لیکن ــــ انسان ایک کمزور انسان میں اتنی تاب کہاں۔

میں اس مہتابی رنگ اور ہرن جیسی آنکھوں کو کیا کروں۔

ہر دوا بیکار ــــ ہر دعا ناکام ــــ ہر آہ بے اثر۔

جب خدا کو رحم نہیں آیا ــــ تو ان ظالم انسانوں کی حقارت اور طنز کا کیا گلہ کروں۔ آج وہ روئی نہیں۔ غصہ سے کانپ اٹھی۔

"ہمیشہ رہے نام اللہ کا"۔

کوئی شاہ صاحب ہیں ــ بڑے پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ خادمہ نے بڑی عقیدت سے کہا۔

کیا اس سے قبل زبیدہ کو ان صحت مند تم برہنہ پہنچے ہوؤں پر اعتقاد تھا۔ لیکن حسرت کی شدت دماغی توازن کو تتر بتر کر دیتی ہے۔ خدا مراد دے یا نہ دے لیکن امید کی کرن کو کبھی غروب نہیں ہونے دیتا۔

"میرے پاس نے آؤ"۔ خادمہ بہت خوش خوش گئی۔

شاہ صاحب نے آتے ہی غمزدہ سلوٹوں کو پہچان لیا۔
کوئی اس کا علاج بھی ہے؟
کوئی مرض لاعلاج بھی ہے بیٹی؟
زبیدہ کی آنکھیں چمکیں اور سائیں جی کی لالچ دمک اٹھی۔
اس نے بہت آہستگی سے شیشی نکالی اور چپکے سے کہا بس رات کے بارہ بجے پی لو۔
ایک دم —— ایک شیشی۔
ہاں یہی ایک خوراک ہے۔
بس ایک خوراک!
اسی کو تو کرامات کہتے ہیں بیگم صاحب، خادمہ بڑے جوش سے بولی۔
آپ کو کیا دوں؟
ہم اللہ والے لوگ کچھ نہیں لیا کرتے۔ خدا کی راہ میں خیرات کریں بس یہی سو روپے دے تاکہ چند بکرے تیرے صدقے میں ذبح کر دوں۔
زبیدہ ہچکچائی۔
دل بڑا کر بیٹی۔ اگر ہم پر یقین نہیں تو شیشی لے اور ہم کو کچھ نہ دے۔ لیکن صدقہ اگر ہو گا تو ہمارے ہی ہاتھ سے . . .
زبیدہ نے سو روپے دیدیئے اور شاہ صاحب اللہ ہو اللہ ہو کے نعرے لگاتے چلے گئے۔
زبیدہ نے دوا احتیاط سے رکھ دی۔ وہ شاہد کو ہم راز بنانا چاہتی تھی —— نوکرنی! اوں ہوں وہ بیوقوف کیا کہے گی۔ اسے غصہ تھا شدید غصہ۔ اس کے زخم کچھ سوتے سوتے سے تھے لیکن شاہد کے احساس سے ان میں سے پیپ رس رہی تھی۔ شاہد نے کیوں کہا —— آخر کیوں کہا —— کیا میں نے بھی کبھی کہا —— تمہارا رنگ ضرورت سے زیادہ سانولا ہے۔ مجھے تو اس میں بھی ایک حسن نظر آتا تھا۔
دنیا اس وقت کمتر سمجھتی ہے جب تم خود اپنے کو حقیر سمجھنے لگتے ہو۔
اس رات بہت ستارے ٹوٹ رہے تھے۔
ادھر آؤ زیب آج تو تم بڑی دلکش لگ رہی ہو۔
نہ وہ مسکراتی نہ وہ ہنستی۔
آج کچھ طبیعت عجب بے سکون ہے —— وہ ٹہلانے لگا۔ لیکن زبیدہ ٹس سے مس نہ ہوئی جیسے کوئی بات ہی نہیں —— تمہاری طبیعت بے سکون ہے تو کیا کروں . . . میری طبیعت تو خدا جانے کب سے بے چین ہے۔ اس کی نگاہیں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں —— بارہ بجنے میں ایک منٹ . . .
ابھی آئی —— وہ تیزی سے اٹھی۔
کہاں جا رہی ہو
ذرا پانی پینے۔
یہیں آ جائے گا۔
ہیں —— اور وہ چلی گئی
اسے شاہد کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے اندھیرے ہی میں شیشی خالی کر دی۔ شاہد نے بٹن دبایا اور زبیدہ کا دل ہل گیا —— دوا کی شیشی بھری تھی اور ٹنکچر آئیڈین کی خالی ——
یہاں اندھیرے میں کیا کر رہی تھیں۔
وہ خاموش شیشیوں کو تک رہی تھی۔
پانی پی چکیں شاہد نے زور سے پوچھا
'ہاں' وہ سکتہ میں بولی۔
"چلو پھر"
"چلو"
"یہاں بیٹھ جاؤ"
وہ بیٹھ گئی
آج طبیعت مضمحل ہے۔ غالب کی مخصوص غزل سناؤ۔
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
اس نے شعر گنگنایا —— وہ جلد سو گیا۔
وہ تڑپ تڑپ کر سوئی —— دونوں کی نیند میں بڑا فرق تھا۔

نقد و نظر

ہمایوں جوبلی نمبر

۲۰۰ صفحات قیمت عہ

اردو کے مشہور اور مقتدر رسالہ ہمایوں نے اپنی پچیس سال کی خدمت کے اختتام پر بسلور جوبلی، منائی ہے' اسی کی یادگار یہ رسالہ ہے۔ رسالہ میں عموماً جس طرح کے مضامین اور جس طرح کی نظمیں اور غزلیں ہمیشہ چھپتی ہیں ویسی ہی (زیادہ تعداد میں) اس رسالہ میں بھی ہیں اور وہ ہمایوں کی روایات کے مطابق سب کی سب ایسی ہیں کہ ان سے ایک خاص نمبر مرتب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان مضامین اور نظموں اور غزلوں کے علاوہ مضامین کا ایک بے حد مفید سلسلہ بھی اس خاص نمبر میں شامل ہے۔ اراکین ہمایوں کی فرمائش پر ملک کے اچھے اچھے لکھنے والوں نے اردو ادب کی مختلف اصنافِ نثر و نظم کا پچیس سالہ جائزہ لیا ہے۔ اور ہمیں بتایا ہے کہ اس پچیس سال میں مختصر افسانے تنقید اور غزل نے کیا کیا منزلیں طے کی ہیں۔ اس پچیس سال کے اردو ادب میں خواتین کا کیا حصہ رہا ہے اور نفسیات نے اسے کس حد تک متاثر کیا ہے۔ یہ سارے مضامین مل کر ہمایوں کے اس جوبلی نمبر کو ایک ایسی چیز بنا دیتے ہیں جسے ہر اردو داں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اور دوسروں سے اس کے پڑھنے اور خریدنے کی سفارش کرتا ہے۔ لیکن حقیقت میں ہمایوں کی اہمیت صرف اس خاص نمبر کی وجہ سے نہیں۔ ایک خاص نمبر تو اس کے تین چار پرچوں کے مضامین کو یکجا کر کے ہمیشہ ہی بنایا جا سکتا ہے۔ اصل میں اہمیت اس اہم خدمت کی اور اس خدمت کو انجام دینے کی، اس روشِ خاص کی ہے جو اردو کے رسالوں میں میرے نزدیک ہمایوں سے زیادہ اور کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔ اس خاصی طویل مدت میں ہمایوں نے کبھی ایسی چیزوں کی اشاعت نہیں کی جن سے ادب کی بلند قدروں کو ٹھیس لگے۔ اسکے باوجود وہ برابر ادب کی ہر منزل میں رہبر اور رہنما کے فرائض انجام دیتا رہا ہے۔ اردو کے کئی اچھے لکھنے والوں کو ہم نے صرف ہمایوں ہی کے وسیلہ سے پہچانا ہے۔ ہمایوں کو پڑھ کر ہمیں ادب اور زندگی کی رفتار کا ایک ناسنجیدہ اندازہ بھی ہوتا رہا ہے۔ اس طرح کے رسالوں کی اردو کو ہر زمانہ میں ضرورت رہی ہے۔ اور خاص کر آج جب کہ ادب کی بہت سی اصناف تجربہ کے عبوری دور سے گذر رہی ہیں ان کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ ہے۔ وہ حال کو انتشار سے نکالنے میں مدد دیتے ہیں اور مستقبل میں منزل کی جستجو کرنے والوں کے لئے سنگِ میل کا کام دیتے ہیں۔ ہمایوں کے اس جوبلی نمبر کے نکلنے کی تقریب کے موقع پر اردو والوں کو ان سب کا ممنون ہونا چاہیے جنہوں نے ہمایوں کو ادب کی صحیح اور سلیم راہوں پر چلنے میں مدد دی۔

سویرا

ضخامت ۲۲۰ صفحات قیمت عہ

اس نام کا ایک پرچہ نیا ادارہ، لاہور نے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ پرچہ پر پہلی نظر پڑتے ہی اس پر قبضہ کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ بے حد فنکارانہ چمکیلا لیکن سادہ سرورق آنکھوں میں کھُب جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل آتی ہے، مطالعہ کی۔ اور یہ منزل ختم ہونے کے بعد پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے روپے ایک اچھے کام میں صرف کئے، یا رسالہ مفت بھیجنے والوں نے مجھے واقعی ایک لطیف و جمیل تحفہ بھیجا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ رسالہ کے مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مقالات، منظومات، افسانے اور ڈرامے اور جائزے۔ اور ان حصوں میں سے کسی میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں جسے بھرتی کی کہا جا سکے۔ اچھی تو سب ہی ہیں، لیکن ان اچھی چیزوں میں کئی بہت اچھی بھی ہیں، اور یہ بات رسالہ کے چاروں حصوں میں ہے۔ مقالات منظومات، افسانے اور ڈرامے اور جائزے لیکن رسالہ کی تین خصوصیتوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ پہلی یہ کہ مضامین اور جائزوں میں نہ صرف ادبی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا گیا ہے بلکہ زندگی کے زیادہ اہم معاشی اور فکری مسائل کی طرف بھی توجہ دی گئی ہے۔ دوسری یہ کہ نظموں کا حصہ مجموعی حیثیت سے ایسا ہے جسے دیکھ کر اچھے خاصے انتخاب کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ معاشی، ادبی، اور فلمی جائزوں میں اس ایجاز و اختصار کو دخل نہیں دیا گیا جو ہمارے جائزوں اور تبصروں کی خصوصیت بن گئی ہے۔

سویرا، کا پہلا پرچہ صحافت میں ایک صبح درخشندہ کا پیامی بن کر آیا ہے۔ اور اس میں شروع ہی سے 'مہر نیم روز' کی تابانیاں جھانکتی نظر آ رہی ہیں۔

و۔ ع

نیا دور ۹

کتابی سائز کا یہ رسالہ کوئی ڈیڑھ سال سے بنگلور سے نکل رہا ہے۔ اس کے پہلے ہی پرچہ کو دیکھ کر کہنے والوں نے یہ کہا تھا کہ خدا کرے اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ اردو والوں کو خوش ہونا چاہیے کہ اسے نظر نہیں لگی اور نیا دور، برابر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے تقریباً سارے نئے اچھے لکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اس کے ہر پرچہ میں اچھے ادب کا خاصا مسالہ جمع ہو جاتا ہے۔ افسانوں اور نظموں کی طرف نیا دور نے شروع سے خاص طور پر توجہ کی ہے۔ تنقیدی حصہ کو بھی ہمیشہ متوازن رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس طرح مجموعی حیثیت سے نیا دور کا ہر پرچہ متوازن بھی ہوتا ہے اور متنوع بھی، لیکن اس پرچہ کے متعلق ادارہ کا یہ دعویٰ کہ "یہ نمبر ہر طرح سے متوازن اور متنوع ہے" اور بھی صحیح ہے۔ اس کا اندازہ صرف مضمون نگاروں کے ناموں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اس نمبر کی محفل میں رشید احمد صدیقی،

باقی صفحہ ۶۱ پر

فجی میں ہندوستانی

۲

رام لال

سماجی اور اقتصادی حالت

عورتوں اور مردوں کی آبادی میں عہد نامہ کے مطابق شروع ہی سے جو تناسب تھا اس کے اثرات اب بھی نظر آتے ہیں۔ شروع شروع میں اس آبادی میں عورتوں کی تعداد صرف پچیس فیصدی تھی۔ اور بعد میں بڑھ کر ۳۲ فیصدی ہوگئی۔ یہ تناسب رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ ۱۹۳۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق فجی میں ہندوستانیوں کی پیدائش کا تناسب کچھ زیادہ تھا یعنی فجی میں ہندوستانیوں کی پیدائش کی تعداد ۱۹۵۲ اور دوسرے مقامات پر ۱۳۱۴ تھی۔ ۱۹۳۶ء میں چار عورتوں کے مقابلے پانچ مردوں کی نسبت تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نو آبادی قائم کرنے کا عمل گھرانوں کے آباد کرنے کے اصول پر ہونا چاہیئے۔ ۱۹۴۰ء تک ہندوستانی عورتوں کی تعداد مردوں کی تعداد سے تقریباً دس ہزار کم تھی۔ شادی کے موقع پر لڑکیوں کو بیچ دینے کی رسم اب بھی ہندوستانی معاشرتی زندگی کا ایک تاریک پہلو ہے۔ بے ضابطہ شادیوں کے مقابلے میں باضابطہ شادیاں بہتر سمجھی جانے لگی ہیں۔ اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی خواتین نے ہندوستانی عورتوں کی ایک جماعت بنائی ہے اور معاشرتی خرابیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔

ابھی چند سال پہلے تک ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق جو شادیاں ہوتی تھیں انہیں فجی قانون کی رو سے جائز نہیں مانا جاتا تھا۔ اس لئے وہ شہری قانون کے لحاظ سے ناجائز رہتی تھیں۔ اس لئے ازدواجی رشتہ میں پختگی کی شدید کمی رہتی تھی۔ اور اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی تھیں۔ حال ہی میں شادی سے متعلق فرمان جاری ہوا ہے۔ اس میں شرط ہے کہ صرف ہندوستانی شادیوں کے افسر" اور "پادری شادیوں کو رجسٹر کریں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے اس طرح کے لوگوں کے لئے جو بے قاعدہ شادیوں کی رجسٹری کر دیتے ہیں کوئی سزا نہیں ہے۔ اس لئے پچھلی برائیوں میں سے اکثر اب بھی موجود ہیں۔

۱۹۱۷ء میں سی ایف انڈریوز نے کمپنی سے مطالبہ کیا تھا کہ ہندوستانی مزدوروں کی مزدوری ایک شلنگ یومیہ سے بڑھا کر ایک شلنگ تین پنس کر دی جائے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس کی تجویز تھی کہ ہندوستانی مزدوروں کی کم سے کم اجرت تین شلنگ چار پنس ہونی چاہیئے۔ ایک سرکاری افسر نے اجرت کے مسئلہ پر خاص طور سے غور کیا اور تجویز پیش کی کہ اچھی بود و باش کیلئے کم از کم چار شلنگ اجرت ہونی چاہیئے۔ پھر بھی ۱۹۳۹ء میں اجرت دو شلنگ تین پنس یومیہ سے دو شلنگ چھ پنس یومیہ تک بڑھتی گھٹتی رہی۔ جو کہ ۱۹۱۹ء کے کمیشن کی تجویز کردہ اجرت سے بھی کم تھی۔

فجی میں ہمیشہ سے ہندوستانی مزدوروں کے مقروض ہونے کی بڑی وجہ ان کی اجرتوں کی کمی رہی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں حکومت نے فجی کی مجلس آئین ساز میں ایک شہادت پیش کی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ریلوا۔ نادی اور با کے علاقوں میں ہندوستانیوں کی جو زمینیں دوسروں کے ہاتھ گروی تھیں وہ ۱۹۲۵ء میں ۵۴۴۶ ایکڑ تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں ۷ ۱۸۵۹ ایکڑ۔ اور وہ ۱۹۳۶ء میں بڑھتے بڑھتے ۱۱۰۵۰۸ ایکڑ ہوگئیں۔ اسی طرح ہندوستانی مزدوروں کا قرضہ جو ۱۹۲۵ء میں ۱۹۹۶۹ پونڈ تھا بڑھتے بڑھتے ۱۹۳۵ء میں ۴۸۲۳۶ پونڈ اور ۱۹۳۶ء میں ۹۶۲۲۸ پونڈ ہو گیا۔ مجلس آئین ساز میں اندازاً یہ بھی بتایا گیا کہ نو آبادی کے تمام ضلعوں میں ہندوستانیوں کا کل قرضہ ۵،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ کے لگ بھگ تھا اور اس فرقہ کی کل زراعتی آمدنی ۱۹۳۷ء میں اندازاً ۶،۰۰۰،۰۰۰ پونڈ تھی۔ جون وبزلی کولڑ اپنی کتاب "بحرالکاہل کا چھوٹا ہندوستان۔ فجی میں (مطبوعہ ۱۹۴۱ء) لکھتا ہے "قرضداری کا ایک سبب یہ ہے کہ کمپنی اپنے ملازموں کو بہت کم اجرت دیتی ہے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کمپنی کے ملازموں میں نوے فیصدی دیوالئے ہیں"۔ جو ہندوستانی حکومت اور فجی کے باشندوں سے زمینیں پٹہ پر لیکر گنے کی کاشت کرتے ہیں بہت زیادہ مقروض ہیں۔ کمپنی سے پٹہ پر زمین لینے والوں پر اتنا قرضہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول الذکر تو اپنی فصلوں کو ساہوکار کے ہاتھ گروی رکھ دیتے ہیں لیکن کمپنی سے پٹہ پر زمین لینے والے ایسا نہیں کر سکتے۔ قرضہ کی زیادتی کا ایک اور سبب وہ ہندوستانی پیشہ ور ساہوکار ہیں جو بہت زیادہ اور ناجائز سود وصول کرتے ہیں۔ ہندوستانی دکاندار ادھار پر ۲۰ فیصدی زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں۔ روپیہ قرض دینے کی روک تھام کا قانون بالکل بیکار ثابت ہوا۔ فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت کی طرف سے ایک زراعتی بنک کھولا جائے جس کی شاخیں گنے کی کاشت کرنے والے تمام ضلعوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔

مزدوروں اور کسانوں سے متعلق کچھ قوانین بھی ہیں۔ ۱۹۴۱ء کے صنعتی ایسوسی ایشن سے متعلق اٹھارویں آرڈیننس کی شرط ہے کہ کسانوں کی جو جماعتیں بنائی جائیں وہ باقاعدہ اور رجسٹرڈ ہوں قانون کی رو سے رجسٹری لازمی ہے۔ اس کی رو سے ان دیہاتی

کاشتکاروں کو بھی جو ملازم نہیں ہیں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی جماعتیں بنائیں ۱۹۴۱ء کے کسانوں کے جھگڑوں سے متعلق انیسواں فرمان جو پنچائت اور آپس کے میل جول کے بارے میں ہے اس کی رو سے کسانوں کے تمام جھگڑوں کی تفتیش اور ان کا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ اگر کسی ایسی انڈسٹری میں جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جہاں کوئی فیصلے کی تدبیر نہ ہو سکے تو گورنر کو اختیار ہے کہ وہ فریقین کا فیصلہ کر دے۔ لیکن اگر میل ملاپ کے یہ طریقے کارگر نہ ہوں یا اگر فریقین ایسی درخواست کریں تو کونسل کا گورنر فریقین سے کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنے جھگڑے کو ایک جھگڑا چکانے والی عدالت میں پیش کریں۔ جس کے فیصلے کی دونوں پر پابندی ہوگی۔ مزدوروں کی انجمنیں بنانے کی تحریک آہستہ آہستہ جڑ پکڑ رہی ہے۔ اور اس کا ثبوت کسانوں کی جماعت کسان سنگھ اور مزدوروں کی جماعت مزدور سنگھ کا وجود میں آنا ہے۔ ان کے مطالبوں میں اپنے ہر گروہ یا سردار کے انتخاب کرنے کا حق ہے۔ ۱۹۴۱ء کے مزدوروں کی خوشحالی سے متعلق بیسواں آرڈیننس اس بات کا اختیار دیتا ہے کہ ایک لیبر کمشنر مقرر کیا جائے۔ جو اس نوآبادی کے مزدوروں کی عام خوشحالی کی نگہبانی ہی نہیں بلکہ اس کو ترقی بھی دے۔ اسے کچھ اندراج اور جانچ پڑتال کے اختیارات بھی دئے گئے ہیں تاکہ وہ اپنے فرائض کو جو اس پر اس آرڈیننس کی رو سے عائد ہوتے ہیں انجام دے سکے۔

۱۹۳۶ء کے نوآبادیات کے فرمان کی وہ شرائط جنکا تعلق ضمانتوں اور ان پابندیوں سے ہے جو اس خطۂ زمین پر ہندوستانیوں کے اترنے اور پہلے تین سال کے قیام پر لگائی گئی ہیں۔ ہندوستانیوں کو وہاں آباد ہونے سے کھلم کھلا باز رکھتی ہیں۔ نوآبادی کی حکومت کے آباد کرنے کی پالیسی کا ایک کھلا مقصد یہ ہے کہ فجی میں پیدا ہونے والے ہندوستانیوں کے مفاد کی خاطر غیر شادی شدہ مردوں کو آنے سے روکا جائے۔ ان شادی شدہ ہندوستانیوں کو جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہوں اور جنہیں کاشتکاری کی مستقل ملازمت کا یقین دلایا گیا ہو انہیں داخل ہونے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ ان ہندوستانیوں کو بھی جن کی تجارت فجی میں جڑ پکڑ گئی ہو۔ ان کو اپنی بیویاں اور چھوٹے بچوں کو ہندوستان سے لاکر اپنے ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ غیر شادی شدہ مردوں میں صرف ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت ملتی ہے جن کی تجارت کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں ضرورت ہے۔ فجی میں پیدا شدہ ہندوستانی جو معاشرتی معاشی اور سیاسی مقبولیت کی کشمکش میں پیش پیش ہیں۔ ہندوستانیوں کے وہاں آباد ہونے پر پوری پوری روک نہیں تو اس سے زیادہ سخت پابندی عائد کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ ایسے ہندوستانی ہیں جو شہروں میں بڑی بڑی اسامیاں چاہتے ہیں۔

۱۹۳۷ء کے آخر میں گورنر نے فجی حکومت کی ہندوستانی آبادی سے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی تاکہ ہندوستانی نوآبادی کے سلسلہ پر اپنی تجویز پیش کرے۔ اس کمیٹی میں فجی دستور ساز کونسل کے دو نامزد ہندوستانی ممبر تھے لیکن منتخب شدہ تین ممبروں میں کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ ہندوستانی امور کا ایک محکمہ بھی ہے جسے ہندوستانی مشاورتی کمیٹیاں مدد دیتی ہیں۔ لیکن یہ کمیٹیاں فائدہ مند ثابت نہیں ہوئیں۔ کیونکہ ضلعوں کے کمشنر اپنی ہی پسند کے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہندوستانی افسروں کی ایک نئی جماعت بھی ہے۔ اور وہ ضلعوں کے کمشنروں کے نائب ہیں یہ محکمہ ان ہندوستانیوں کی خاص حمایت کی وجہ سے بدنام ہو گیا ہے جنہوں نے ہندوستانیوں کے آباد ہونے پر زیادہ پابندی عائد کرنے کی تائید کی۔

۱۹۱۶ء تک اس نوآبادی کی تعلیم عیسائیوں کی تبلیغی جماعت کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن اس کے بعد سے حکومت نے بھی اپنے صوبجاتی عملوں کے ذریعے تعلیم کی ذمہ داری میں ان کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ آٹھ ممبروں کا ایک تعلیمی بورڈ ہے جس میں دو ہندوستانی ممبر ہیں۔ تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کے سلسلے ہندوستانیوں کے خلاف کافی نسلی امتیاز برتا گیا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں یورپ والوں پر کل تعلیمی خرچہ ۲۹.۸ فیصدی تھا حالانکہ ان کی تعداد کل آبادی کا ۲.۰۴۱ فیصدی تھی اور ہندوستانیوں کی تعلیم پر خرچہ ۱۵.۰۵ فیصدی تھا حالانکہ ان کی تعداد آبادی کا ۴۲.۰۱۸ فیصدی تھی اس سے زیادہ خراب بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں سے ان کی تعلیمی اخراجات کا ۹۰ فیصدی حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ حالانکہ ان کا تعلق اس طبقہ سے تھا جو معاشی اعتبار سے سب سے زیادہ غریب تھے۔ یورپ والوں کی تعلیم کیلئے فجی کی تعلیمی بجٹ میں پہلے ہی ایک حصہ مقرر کر لیا جاتا تھا۔ اور فجی حکومت بھی یورپ والوں کی تعلیم کا پچاس فیصدی خرچ خود برداشت کرتی ہے۔

۱۹۴۰ء میں سکول جانے کی عمر والوں میں سے کل ۲۰ فیصدی ہندوستانی لڑکے اور ۱۱ فیصدی لڑکیاں سکول میں پڑھتی تھیں۔ ۱۹۴۲ء کے آخر میں رجسٹر شدہ ہندوستانیوں کے سکولوں کی تعداد ۸۸ تھی اور اس کے مقابلے میں فجی اور یورپ والوں کے رجسٹر شدہ سکولوں کی تعداد ۲۳۰ تھی۔ سکول۔ یونیورسٹی اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں ابھی کم ہیں۔ کیونکہ آبادی میں مختلف صوبوں کے اور مختلف زبانیں بولنے والے ہندوستانی ہیں۔ اس لئے سکولوں میں ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں بڑی دقت پڑتی ہے۔ لیکن ہندوؤں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ان کی زبان زیادہ بولی جاتی تھی۔ اس لئے ہندوستانی ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ خاص خاص موقعہ پر ایک مزید ہندوستانی زبان کے تعلیم دینے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔ اس طرح ہندوستانی کی تعلیم پہلی چار جماعتوں میں

ضروری تھی - اور انگریزی زبان کا پڑھنا اپنی مرضی پر تھا - تمام نوآبادی میں بہت سے ہندوستانی جوان انگریزی بولتے ہیں -

سیاسی حالت

فجی میں ایک مجلس عاملہ اور ایک مجلس آئین ساز ہے - جن کی شکل مشاورتی ہے - بڑے حکام کی ایک کونسل بھی ہے جو گورنر کو مشورے دیتی ہے ۱۹۱۷ء تک ۶۰,۰۰۰ ہندوستانیوں کی نمائندگی ایک نامزد ممبر کرتا تھا - لیکن ۱۹۲۴ء میں ان کی نمائندگی دو منتخب شدہ ممبر کرنے لگے - ۱۹۲۹ء میں انہیں تین فرقہ وارانہ نشستیں مل گئیں - ۵ نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک منتخب شدہ ہندوستانی ممبر نے مجلس آئین ساز میں تجویز پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ جس طرح نوآبادی کی برطانوی آبادی کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے اسی طرح ہندوستانیوں کو بھی عام ووٹ دینے کا حق ملنا چاہیئے - یورپ والے مشترکہ انتخاب کی مخالفت کرتے رہے ہیں - کیونکہ ہندوستانی ووٹ دینے والوں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے - ہندوستانی کونسل سے مستعفی ہو گئے اور ۱۹۳۲ء تک عدم تعاون کی پالیسی پر چلتے رہے - ۱۹۳۷ء کے دستور العمل کے ماتحت مجلس آئین ساز میں سولہ سرکاری ممبر اور پندرہ غیر سرکاری ممبر ہوتے ہیں - غیر سرکاری ممبروں میں تین منتخب شدہ اور دو نامزدہ یورپی ممبر ہوتے ہیں - پانچ نامزدہ اصلی باشندوں کے ممبر اور باقی پانچ ہندوستانی ممبر جن میں تین منتخب شدہ ہیں اور دو نامزدہ ۱۹۳۶ء کی مردم شماری کے مطابق فجی میں ۹۹۵۹۵ دیسی باشندے تھے - ۸۹۳۳۳ ہندوستانی اور ۴۲۳۸ یورپ والے تھے - ان میں سے ہر ایک کو پانچ پانچ نشستیں دی گئیں - اور اسے برابر کی نمائندگی کہا گیا - مجلس عاملہ میں ہندوستانیوں کا کوئی نمائندہ نہیں - سوا کونسل میں سات سرکاری اور چھ غیر سرکاری ممبر ہیں - چھ غیر سرکاری ممبروں میں دو ہندوستانی دو فجی کے اور دو یورپی ممبر ہیں -

نوآبادی کا سرکاری ڈاکٹر ہندوستانی امور کے سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتا ہے - ہندوستانی اس انتظام سے بالکل ناخوش ہیں - ہندوستانیوں کا خیال ہے کہ بحیثیت سکریٹری اس کا یہ فرض ایک ضمنی چیز ہے - اور اس طرح ہندوستانی امور کو کافی توجہ نہیں ملتی - ہر ایک تسلیم کرتا ہے کہ نوآبادی کی معاشی ترقی میں ہندوستانیوں کا بڑا حصہ ہے - جب ہندوستانی دوسروں کے ساتھ مساوات کا دعوےٰ کرتے ہیں - تو اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ فجی والوں کے سیاسی اقتدار کی برتری کا خیال نہیں کرتے - ان کا دعوےٰ ان کے کچل جانے کے خوف سے ہے - لیکن وہ دوسرے آباد ہونے والے فرقوں سے مثلاً یورپ والوں سے رتی برابر بھی مساوات کی کمی کو برداشت نہیں کر سکتے -

نقد و نظر

بقیہ صفحہ ۵۶

قاضی عبدالغفار، علی عباس حسینی اور احمد ندیم قاسمی کے علاوہ ابن انشاء، عزیز احمد علی جواد زیدی، محمود جالندھری، فکر تونسوی، یوسف ظفر، علی سردار جعفری ممتاز مفتی اور اختر الایمان بھی شامل ہیں - ان کے علاوہ نسبتاً کم معروف لکھنے والوں کی چیزیں بھی ادبی حیثیت سے قابلِ تعریف ہیں -

نیا دور کا ادارہ ہم سب کی مبارک باد کا مستحق ہے کہ وہ بنگلور جیسے دور افتادہ مقام سے ایک ایسا رسالہ نکال رہا ہے جو ہر طرح ہمارے موجودہ ادبی رجحانات کا عکاس ہے -

نسوانی دنیا (لاہور)

جنوری ۱۹۴۷ء - یہ پرچہ نسوانی دنیا کا کوئی خاص نمبر نہیں ہے - پھر بھی پہلی ہی نظر میں پڑھنے والوں کو اس کی انفرادیت اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے - اب تک اردو میں جتنے نسوانی رسالے نکل رہے ہیں ان کی نظر عورت کی زندگی کے صرف اس پہلو پر ہے جو اسے سیاست سے الگ رکھتا ہے - حالانکہ ہماری موجودہ زندگی کا انداز کچھ ایسا ہے کہ سیاست اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ ہی نہیں کیا جا سکتا - "نسوانی دنیا" یہی احساس پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے - اور میرے نزدیک ایک مستحسن کوشش -

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین دلی پرنٹنگ پریس دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۲۶ سے شائع کیا
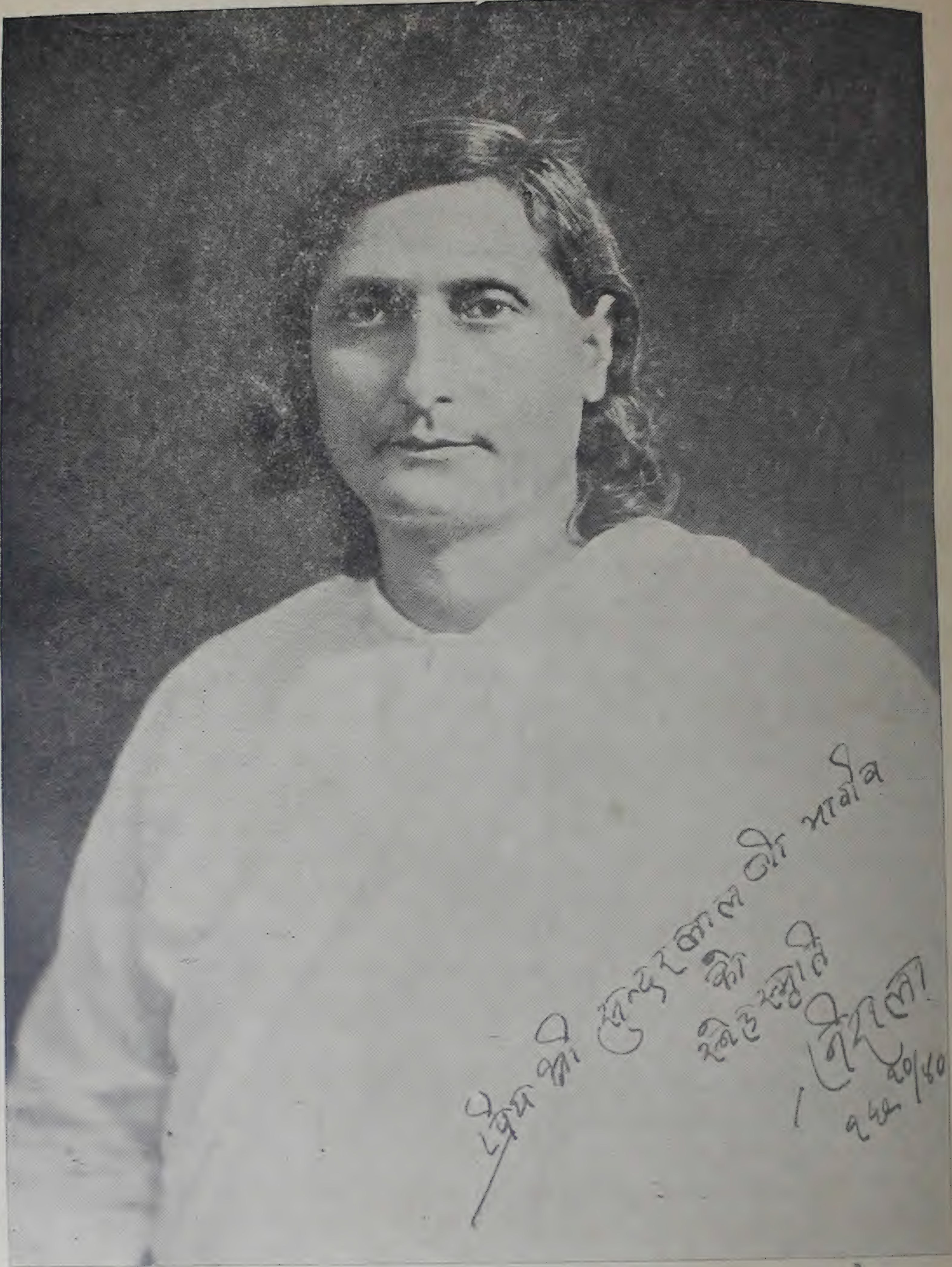
پنڈت سوریا کانت ترپاٹھی نرالا۔

آپ موجودہ ہندی ادب کے تین سب سے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ ۱۸۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ۲۷ جنوری کو آپکی گولڈن جوبلی نہایت شان کے ساتھ منائی گئی۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحده

			چنده سالانه	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماهوار)	باره روپیه	ایک روپیه
شیپور	(فارسی)	(ماهوار)	باره روپیه	ایک روپیه
آهنگ	(فارسی انگریزی)	(سه ماهی)	چار روپیه	ایک روپیه
العرب	(عربی)	(ماهوار)	باره روپیه	ایک روپیه
آجکل	(اردو)	(پندره روزه)	نو روپیه	چھ آنه
آجکل	(هندی)	(ماهوار)	چار روپیه آٹھ آنه	چھ آنه
نو نهال	(اردو)	(ماهوار)	تین روپیه	چار آنه
هے ڈے	(انگریزی)	(ماهوار)	تین روپیه	چار آنه
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماهوار)	چار روپیه	آٹھ آنه
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماهوار)	چھ روپیه	آٹھ آنه
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سه ماهی)	تین روپیه	چار آنه
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سه ماهی)	چھ روپیه	ایک روپیه آٹھ آنه
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - هندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماهوار)	تین روپیه	چار آنه
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانه)	-	ایک روپیه آٹھ آنه
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندره روزه)	تین روپیه	دو آنه

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں - ایک سو اسی صفحات - دو نقشے - کپڑے کی جلد - قیمت دو روپیه (بہت تھوڑی کاپیاں باقی ره گئی ہیں) -

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) -

خاص رعایت «عربی - انگریزی جملے» نوے صفحات - گتے کی جلد - قیمت دو روپیه آٹھ آنه - کپڑے کی جلد قیمت تین روپیه آٹھ آنه -

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد - قیمت تین روپیه آٹھ آنه (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) -

منیجر اداره مطبوعات متحده - پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ - دهلی

آج کل

اردو کا پندرہ روزہ باتصویر رسالہ

سالانہ چندہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۸ | ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ

سید وقار عظیم
ایم۔اے

نائب مدیران

فضل حق قریشی
دہلوی

بھگت سروپ کھلر
ایم اے

سید آفاق حسین آفاق
بی اے

ادارہ مطبوعات متحدہ — پوسٹ بکس ۱۲۶ دہلی

رفتار زمانہ

فلمی حصّوں پر مہر احتساب

کچھ عرصے سے محسوس کیا جا رہا تھا کہ بعض ہندوستانی فلموں میں عریاں یا مخرب اخلاق منظروں، گیتوں یا مکالموں کو روا رکھا جانے لگا ہے یا بصورت دیگر بعض فلموں میں مذہبی احساسات کو صدمہ پہنچانے والے حصے شامل کر لئے جاتے ہیں۔ اس لئے ذوق سلیم رکھنے والے بہت سے حضرات جو فلم بینی کو برا بھی نہیں سمجھتے، ایسے فلموں سے اجتناب کرنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ فلم پبلک میں پیش ہونے سے قبل محکمۂ احتساب کی سند حاصل کر لیتے تھے۔ بہت سے ادبی اور فلمی رسائل نے ارباب فلم کی اس غلط روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی لیکن نتیجہ خاطر خواہ برآمد نہ ہو سکا۔ تاہم یہ سن کر خوشی ہوئی کہ صوبہ بمبئی کے ہوم منسٹر مسٹر مورار جی ڈیسائی نے اس سلسلے میں پہلا نیک قدم اٹھایا اور چار ایسے پرانے فلموں کے قابل اعتراض حصّے حذف کرنے کے احکامات صادر کر دئے جن کی نمائش کافی عرصے ہوتی رہی ہے۔ ان میں بعض فلم تین تین چار چار سال پرانے ہیں۔ آئندہ کے لئے بھی انھوں نے محکمۂ احتساب کو ہدایت کر دی ہے کہ نئے فلموں پر زیادہ گہری تنقیدی نظر ڈال کر جائزہ لیا جائے تاکہ وہ طوفان بدتمیزی جسے دبانے کی اب کوشش کی گئی ہے، بار دگر کسی پردۂ فلم پر اپنا رنگ نہ جما سکے۔ بمبئی کے ہوم منسٹر کی یہ کاوشیں ہر اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔ قارئین کی معلومات کے لئے ان فلموں کے نام اور قابل اعتراض حصوں کی لمبائی وغیرہ نیچے درج کی جاتی ہے۔

۱۔ دس بجے ۔ پربھات کمپنی ۔ ایک گیت ۔ ۶۱ فٹ
۲۔ رتن ۔ جمنا پروڈکشن ۔ چند مکالمے ۔ ۱۹۹ فٹ
۳۔ بچوں کا کھیل ۔ رمنیک پروڈکشن ۔ دو گیت ۔ ۴۰۶ فٹ
۴۔ مہارانا پرتاپ ۔ جینت ڈیسائی ۔ ایک گیت ۔ ۴۰۰ فٹ

ان کے علاوہ حسب ذیل اٹھارہ فلموں میں سے جو تیار ہو چکے ہیں یا زیر ترتیب ہیں، بہت سے حصّے الگ کر دئے گئے ہیں (۱) سالگرہ (۲)، قیمت (۳)، میرا گیت (۴)، شہر مصر یا فرعون (۵)، جگ بیتی (۶)، برہمن کنیا (۷)، قسمت کا دھنی (۸)، ایرمیل (۹)، کانگو (۱۰)، شاہی خزانہ (۱۱)، بھیدی دشمن (۱۲)، طوفان کوئین (۱۳)، ہوائی کھٹولا (۱۴)، روپا (۱۵)، چمکتی بجلی (۱۶)، حور بغداد (۱۷)، ہچکولے اور (۱۸) دوستی۔

حذف شدہ مکالموں یا گیتوں کی تفصیل ادارے کے پاس موجود ہے لیکن ان کی اشاعت سے اس لئے احتراز کیا جاتا ہے کہ ان کا اعادہ بجائے خود ایک فعل مذموم ہے۔ امید ہے کہ اس مہر احتساب سے اثر لیتے ہوئے فلم کمپنیاں آئندہ خود ہی اس امر کا خیال رکھا کریں گی کہ ان کی ادبی اور فنی خدمات ہر لحاظ سے اتنی قابل قبول ہوا کریں کہ ان میں کسی قسم کی کتر بیونت کا امکان نہ رہے۔

ایندھن کا مسئلہ

دنیائے شاعری میں تسلیم کیا جاتا ہے کہ محبوب اپنے حسن و جمال کی تابشوں سے جب چاہے عاشق نامراد پر بجلی گرا کے تڑپا دے۔ اسی لئے ایسے محبوب کو برق وش، برق افگن، برق آسا اور برق آہنگ جیسے خطابات سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ اطالیہ میں جیتی جاگتی ایک ایسی لڑکی بھی موجود ہے جس کے جسم سے کپڑوں کی رگڑ برقی لہریں پیدا کر دیتی ہے اور وہ لہریں معمولی نہیں، بہت قوی ہوتی ہیں۔ آجکل سارے ملک میں بلکہ تمام براعظم یورپ میں اس کا چرچا ہو رہا ہے اور اسے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ سولستان کے سائنسدانوں نے اسے دعوت دی ہے تاکہ وہ اس کے جسم کا معائنہ کر کے یہ معلوم کر سکیں کہ اس برق تابی کا اصل سبب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض کپڑوں کی رگڑ اس کے جسم سے اتنی حرارت پیدا کر دیتی ہے کہ اسے موسم سرما میں جبکہ انتہائی سردی کے باعث ہزاروں لوگ مرے جا رہے ہیں وہ اطمینان سے گرم رہتی ہے بلکہ فالتو حرارت سے وہ چائے یا کافی پکا لیتی ہے۔ اس طرح ایندھن کا مسئلہ جو یورپ بھر میں نہایت نازک صورت اختیار کر گیا ہے کم سے کم اس کے لئے حل ہو جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سائنسداں اسکے جسم کا معائنہ کر کے کیا بال کی کھال نکالتے ہیں۔ اس سے پہلے ایک اور لڑکی کے متعلق سنا گیا تھا کہ وہ بجلی کے مثبت و منفی دونوں تار پکڑ لیتی تھی اور اسے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا تھا۔ بلکہ اس حالت میں اگر بجلی کا بلب اس کے جسم کے کسی حصے پر رکھ دیا جاتا تو وہ جل اٹھتا اور سارے گھر میں روشنی ہو جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ اس لڑکی کی اس کیفیت کا سائنسی تجزیہ نہیں کیا جا سکا۔

ایک یونانی جہاز کی تباہی

دوسری جنگ عظیم کو ختم ہوئے خاصہ عرصہ گذر چکا لیکن اس دوران میں پھیلائے ہوئے جال اب بھی کبھی کبھی تباہی کا رنگ جاتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یونان کی وزارتِ بحریہ کے ایک بیان سے پتہ چلا ہے کہ حال ہی میں "ہمارہ" نامی بارہ سو ٹن وزنی جہاز سمندر میں پڑی ہوئی ایک نامعلوم سرنگ سے ٹکرا کر تباہ و برباد اور غرق ہو گیا۔ اس جہاز پر ۴۵۲ مسافر اور ۸۰ ملاح وغیرہ موجود تھے۔ ان میں سے ۳۶۸ ڈوب گئے اور ان کی لاشوں کا بھی کوئی پتہ نہ چل سکا۔ ۲۰۶ امدادی کشتیوں کے ذریعے بچا لئے گئے۔ ۲۰ اشخاص کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ جزیرہ یوربا کی چند چھوٹی بندرگاہوں پر پہنچ گئے ہیں۔ مسافروں میں چالیس ایسے سیاسی قیدی بھی شامل تھے جو حکومت کے خلاف ہونے کے باعث موردِ عتاب تھے۔ ان کو اثینیہ (ایتھنز) اس لئے لایا جا رہا تھا کہ عدالتی فیصلے کے بعد وہ جلاوطن کر دئے جائیں۔ دنیوی عدالت کی بجائے ان کی قسمت کا فیصلہ قانون قدرت کے ماتحت ہوا اور وہ وطن کی بجائے دنیا ہی سے رخصت کر دئے گئے۔

لوہے کا پھیپھڑا

تقریباً دس سال گذرے، آسٹریلیا کے مشہور شہر سڈنی میں جون بکماہن نامی ایک بچے کے پھیپھڑے میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہو گئی جس کے باعث اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اس بچے کی عمر صرف نو سال تھی۔ ڈاکٹروں نے غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ اگر پھیپھڑا تبدیل کر دیا جائے تو زندگی ممکن ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی دوسرے انسان کا یہ عضو نہیں ملنا مشکل تھا، اس لئے مصنوعی طور پر لوہے کا پھیپھڑا تیار کر کے اس کے جسم میں رکھا اور سانس کی آمد و شد کو قوت برقی کے ذریعہ بدستور قائم کر دیا۔ صورت یہ تھی کہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے سوتے جاگتے بجلی کا سوئچ لگا رہتا تھا اور اس طرح وہ شخص جس کی عمر اب انیس سال ہو گئی تھی، اس دنیا میں جیتا رہا۔ لیکن افسوس ہے کہ کسی غیر متوقع حادثے کے تحت بجلی گھر میں ایسی گڑبڑ ہوئی کہ بجلی کی رو کا سلسلہ منقطع ہوا اور اس شخص کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔ کامل ایک گھنٹے تک بجلی گھر کے اربابِ حل و عقد کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح بجلی تیار کرنے کی مشین ٹھیک ہو جائے مگر بے سود۔ آخر اس شخص نے جس کی زندگی کا ہر لمحہ بجلی کی ایک لہر پر منحصر تھا سانس گھٹنے کے باعث تڑپ تڑپ کر جان دیدی۔ سائنسدانوں اور ڈاکٹروں کا دماغ اب کسی اور طریقے سے اسے نہ بچا سکا۔ استعارے کے طور پر سنگدل انسان کا وجود تو بہت سننے میں آیا ہے لیکن بہ صحیح معنوں میں لوہے کے پھیپھڑے کا انسان تھا جو دس سال تک قانون قدرت کا مقابلہ کرتا رہا اور آخر ہار کر گوشۂ قبر میں جا چھپا۔

سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے اس میں سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قسم اناج	مقدار یکم سے ۱۶ر جنوری ۱۹۴۷ء تک
گیہوں	۱۳,۹۰۰ ٹن
چاول	۳,۷۰۰ ٹن
جو	۹,۰۰۰ ٹن
کل مقدار	۲۶,۶۰۰ ٹن

بمبئی میں نئے تھیٹر

ہنگامۂ غدر ختم ہونے کے کئی سال بعد سب سے پہلے بمبئی میں ایک تھیٹریکل کمپنی قائم ہوئی اور پھر آئے دن نت نئی کمپنیاں کھلتی چلی گئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس روایت قومی کو برقرار رکھتے ہوئے آج بھی جب کہ دوسرے شہروں نے اس طریقۂ لطف و نشاط کو بالکل ترک یا کم کر دیا ہے، وہاں جو ۳۵ تھیٹر موجود ہیں اور تازہ ترین منصوبوں کے مطابق سولہ مزید تھیٹر کھلنے والے ہیں۔ ایک ایسے شہر میں جو فلمی دنیا کا مرکز بنا ہوا ہے، یہ اقدامات تعجب خیز ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ تحسین بھی ہیں۔ ایسے دو فنی اداروں کو جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہوں، دوش بدوش قائم رکھنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ حکومت بمبئی کو تھیٹریکل کمپنیوں کے لائسنس وغیرہ سے کچھ زیادہ آمدنی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اس میں اضافہ کر لیا جائے تو ان اداروں کو حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے کیونکہ فی الحال اس پہلو سے ان کا وجود قابلِ اعتراض حیثیت رکھتا ہے۔ بمبئی کی مثال کو سامنے رکھ کر اگر دوسرے شہروں میں بھی تھیٹروں کی بنیادیں رکھی جائیں تو ہمارے ملک میں ان کو نئے سرے سے دوبارہ زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔

روسی سائنسداں انجمن ترقی اُردو کے دفتر میں

۸ر جنوری ۱۹۴۷ء کی شام کو روسی سائنسدانوں کا وفد جس نے انڈین سائنس کانگریس میں شرکت کی تھی انجمن ترقی اردو (ہند) کے دفتر میں تشریف لے گیا اور انجمن کی مطبوعات اور بعض نادر قلمی کتب کو دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ اس وفد میں پروفیسر ایس۔ یو۔ عمراف بھی شامل تھے جو مسلمان ہیں اور فارسی زبان خوب جانتے اور بلا تکلف بولتے ہیں۔ انھوں نے فارسی مخطوطات کا معائنہ بڑے شوق سے کیا۔ پروفیسر بارنی کوف بوجہ علالت اس وفد کے ساتھ ہندوستان نہ آ سکے۔ وہ ماسکو میں اردو زبان کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے روسی زبان میں صرف و نحو پر ایک اچھی کتاب لکھی ہے، اردو شاعروں کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور زبان سے متعلق کئی کتابیں اور مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ انجمن کے سکریٹری ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے انھوں نے ہمیشہ اردو ہی میں خط و کتابت کی ہے۔ انجمن سے رخصت کے وقت "روسی ادب" مصنفہ

پروفیسر محمد مجیب ایم اے اور "گورکی کی آپ بیتی" مترجمہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری بی اے پی ایچ ڈی کا ایک ایک نسخہ تحفتہً پیش کیا گیا - وہ اس سوغات کو اپنے ساتھ روس لے گئے۔

ترکی سے فالتو گیہوں

حکومتِ ہند کے اڈیشنل فوڈ کمشنر میجر جنرل اے سی آرنلڈ نے ایک بیان میں فرمایا کہ حکومت ترکیہ نے اپنے اناج کے فالتو ذخیرے میں سے باسٹھ ہزار ٹن گیہوں ہندوستان کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اگر حمل و نقل کی تمام سہولتیں میسر آگئیں تو یہ اناج فروری کے آخر تک ہندوستان کی بندرگاہ پر پہنچ جائے گا۔ انھوں نے بتایا کہ ترکی میں ٹاٹ کی بوریوں کی بہت کمی ہے۔ اگر یہ مشکل کسی طرح آسان ہوگئی تو اناج کی روانگی کا انتظام فوراً ممکن ہو جائیگا۔ اسی مقصد کے ماتحت موصوف جنوری کے تیسرے ہفتے میں ترکی چلے گئے ہیں تاکہ وہاں کی ذمہ دار ہستیوں سے مل ملا کر اس کارِ خیر کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ میجر جنرل آرنلڈ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک برطانوی سفارتخانے میں ایک سیاسی رکن کی حیثیت سے رہ چکے ہیں۔ اگر ان کی کوششیں بہت جلد بار آور ہوگئیں اور اناج کا یہ بڑا ذخیرہ بخیر و خوبی ہندوستان آگیا تو موجودہ پریشانیوں میں کسی قدر کمی ہو جائے گی۔ ترکی کا بہت بڑا علاقہ نہایت زرخیز ہے اور مقامی ضروریات پوری کرنے کے بعد ہر سال اناج کا بہت سا حصہ فالتو رہ جاتا ہے۔ امید ہے کہ ترکی کی یہ وقتی پیش کش آئندہ کے تجارتی تعلقات کو خوشگوار بنانے میں ایک اچھی مثال بن سکے گی۔

تین نئی ایجادیں

(۱) زندگی کی موجودہ ضروریات میں ٹائپ کی مشین کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ سرکاری دفتروں سے لے کر تجارتی منڈیوں تک ہی نہیں بلکہ گھروں میں بھی اس کا استعمال عام ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سہولت حاصل کرنے کے علاوہ اُس وقت میں بھی بچت ممکن ہو سکتی ہے جو ہاتھ سے عبارت نقل کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ہر زبان کی الگ الگ ٹائپ مشینیں موجود ہیں لیکن اب لندن کے ایک کارخانے نے ایسا انتظام کیا ہے کہ حروف کی تبدیلی سے جس میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی ہر زبان کی عبارت ایک ہی مشین پر ٹائپ کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کاغذ کی چوڑائی کے مطابق جب چاہیں مشین کو چھوٹا بڑا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک مکمل مشین کے علاوہ پرزوں کی صورت میں فالتو اجزا خرید کر بہت سی مشینوں کا کام ایک ہی سے نکالا جا سکتا ہے۔

(۲) موٹروں، ہوائی جہازوں اور دوسری مشینوں کو حرکت میں رکھنے کے لئے پٹرول کا خرچ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اور یہ بھی اندیشہ دامنگیر ہے کہ کہیں اس کا ذخیرہ ختم نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس میں کفایت کے خیال سے روز بروز نئی تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ حال ہی میں لندن کے ایک سرکس میں البرٹ بروک وے نے ایسی موٹر سائیکل کا مظاہرہ کیا جو پٹرول کے چند قطروں میں ایک میل جا سکتی ہے یا یوں سمجھئے کہ وہ پٹرول جو ایک معمولی سگرٹ لائٹر میں پڑتا ہے، اس موٹر سائیکل کو تقریباً نصف میل چلا سکتا ہے۔

(۳) نورویج کے ایک ماہر نے ایسی سائیکل ایجاد کی ہے جس کا وزن مروجہ سائیکلوں سے نصف ہے حالانکہ ضرورت کی کوئی چیز کم ہونے نہیں پائی اور نہ اس کی مضبوطی میں کوئی فرق پیدا ہوا ہے۔ اس سائیکل کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہ توڑ مروڑ کر اس طرح بند کیا جا سکتا ہے کہ وہ موٹر میں بیٹھتے وقت اپنے پاس رکھ لی جاتی ہے۔ اسے معمولی پارسل کی صورت میں لپیٹ کر بھیجنا بھی آسان ہے۔ اس سائیکل کے پرزے برطانیہ میں نہیں مل سکتے۔ بڑے پیمانہ پر ان کی تیاری آسٹریلیا میں عمل میں آرہی ہے۔

وائی، ڈبلیو، سی، اے کا جشنِ زرّین

ہندوستان میں وائی، ڈبلیو، سی، اے (ینگ ویمنز کرسچین ایسوسی ایشن) کی داغ بیل بمبئی میں آج سے ستر سال پہلے چار معزز خواتین نے ڈالی تھی۔ ان میں سے ایک ہندوستانی، ایک اینگلو انڈین اور دو انگریز تھیں۔ انجمن کی شاخیں تمام ہندوستان کے علاوہ لنکا اور برما میں بھی قائم ہوگئیں اور پھر آج سے پچاس سال پہلے ان سب کو ایک نظام کے ماتحت کر کے اس کا نام قومی وائی ڈبلیو سی اے رکھا گیا۔ اس قسم کی انجمنیں ہندوستان ہی میں نہیں دنیا کے تمام متمدن ملکوں میں موجود ہیں اور طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود کے لئے نہایت مفید خدمات انجام دے رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے لائحۂ عمل میں ہر قسم کے علمی و فنی اور سماجی و معاشرتی تعلیم و تربیت کے اہم مقاصد بھی شامل ہیں۔ اس سال یکم فروری کو اس قومی انجمن کا جشنِ زرین نئی دہلی میں منایا گیا جس میں ہمارے ہندوستان اور بیرونجات کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس موقع پر انجمن کی کارگزاریوں کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا کہ وہ اب تک ہندوستانی خواتین کے لئے کیسے کیسے مفید کام انجام دے چکی ہے۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے میں آئی کہ دنیائے فلم کے مشہور اداکار کندن لال سہگل کچھ عرصہ بیمار رہ کر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ موصوف نے نیو تھیٹرز کے "دیو داس" میں سب سے پہلے اپنی فطری اداکاری کے صحیح جوہر دکھائے اور ایسا نام پیدا کیا کہ ان کی شخصیت قابلِ رشک ہو گئی۔ انہوں نے گانے کا ایک ایسا خاص انداز بھی تخلیق کیا جو فنی اعتبار سے مکمل نہ سہی لیکن سامعین کو متاثر کر دینے کے اعتبار سے لائقِ تقلید ہو گیا۔ انکی وفات سے دنیائے فلم کو یقیناً ایک صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔

اپنے ترکِ مے نوشی پر غالب کا قطعۂ تاریخ

سیّد وزیر الحسن

غالب نے ترک شراب کی کئی دفعہ کوشش کی مگر یہ توبہ ٹوٹتی رہی، کبھی "روزِ ابر میں" کبھی "شبِ ماہتاب میں"، کبھی "ہوسِ طبیعی" کے ہاتھوں، کبھی ہیجانِ قوتِ غضبی کی تسکین کی خاطر کبھی "اک گونہ بیخودی" کی غرض سے، کبھی دوریٔ احباب، کا غم غلط کرنے کیلئے، کبھی "غم گیتی" کو گوارا بنانے کیلئے چنانچہ اس فسخ عزائم کو اسکے حساس ضمیر نے خود بیان کیا ہے:-

یک روز بہ ترکِ بادہ گوئی غالب ٭ رُخ روزِ دگر بہ بادہ خوئی غالب
زین توبہ بے بقا چہ جوئی غالب ٭ توبہ تبِ توبہ است گوئی غالب، [۱]

مگر سہ شنبہ، ۱۰ نومبر ۱۸۶۸ء کی توبہ جسکو اس نے خود اتنی اہمیت دی کہ ایک ہفتے کے کامیاب پرہیز پر اس توبہ کی تاریخ کہی یقیناً تادمِ مرگ قائم رہی ہوگی۔ یہ اس کی آخری علالت کا زمانہ تھا اور "اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا" [۵]

دم واپسیں برسرِ راہ ہے ٭ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

حکیم محمود خاں مرحوم اور حکیم احسن اللہ خاں مرحوم — یہ دونوں بزرگ [۲] جن کی شخصیتیں طبابت اور ثقاہت کے کمالات کی جامع تھیں اس توبہ کے محرک تھے اور اعزا کی سخت نگرانی جسکی طرف قطعۂ تاریخ میں اشارہ ہے۔ اس توبہ کی محافظ تھی۔ غالب کی رندانہ شوخی اس انابت نامے میں بھی قائم ہے جس نے پرہیز کو بے بسی اور بے زری کا عطیہ ظاہر کیا ہے اور توبہ کو امتناع کا رنگ دیا ہے۔ بہرحال اس توبہ یا امتناع کے امتحانی دور کو ابھی کچھ کم تین مہینے گزرے تھے کہ غم گیتی جاں گسل ثابت ہوا، ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو یہ آزاد مرد، قیدِ حیات و بندِ غم سے رہا ہوگیا۔ خواجہ حالی مرحوم کا بیان ہے "مرنے سے چند روز پہلے بیہوشی طاری ہوگئی تھی پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کیلئے افاقہ ہو جاتا تھا، پھر بیہوش ہو جاتے تھے۔" ظاہر ہے کہ یہ حالت مسلسل پونے تین مہینے کے ترکِ شراب سے ہوگئی ہوگی۔ اب غالب کے سوانح نگار کا یہ مسئلہ شاید حل ہو سکے کہ "غالب اگرچہ ہمہ تن مجموعۂ امراض بن چکے تھے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ موت کا فوری سبب کونسا مرض بنا":

اب ہم وہ قطعۂ تاریخ درج کرتے ہیں جو غالب نے سہ شنبہ یکم شعبان ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۶۸ء) سے شراب ترک کرنے کی تقریب میں شبِ ہفتم شعبان ۱۲۸۵ھ (مطابق شبِ بست و سوم نومبر ۱۸۶۸ء) نظم کیا تھا۔ یہ منظومہ نہ صرف اس لئے اہم ہے کہ غالب کی زندگی کے ایک انقلابی نقطے کا پتہ دیتا ہے۔ بلکہ اس لئے بھی اہم ہے کہ نظم میں اس شاعرِ اعظم کی یہ آخری نگارش ہے۔ اس کے بعد کی کوئی نگارش ہمارے علم میں نہیں۔ اس قطعے کا ماخذ "سبد باغ دو در" ہے جو غالب کی فارسی نظم و نثر کے نایاب ذخیرے پر مشتمل ہے میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت طباعت کی غرض سے مصنف کی زندگی میں ۱۲۸۳ھ (مطابق ۶۷-۱۸۶۶ء) میں شروع ہوئی تھی اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد، ربیع الآخر ۱۲۸۶ھ (مطابق ۷ جولائی ۱۸۶۹ء) کو ختم ہوئی۔ مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ "سبد باغ دو در" غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغازِ کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے۔ کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کھتری کی فرمائش پر لکھا تھا۔ یہ منشی ہیرا سنگھ حوض قاضی کے قریب گندھی گلی میں رہتے تھے۔ اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اسکا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گزرا تھا۔

قطعہ

هر شب بقدح ریختمی بادۂ گلفام ٭ آری ز دو سی سال مرا قاعده این بود
شش روز شد اینک که نے بستر سم طیست ٭ شد غمزده تر دل که از این بیش حزین بود
امشب چه سرایم که شبِ اول گو راست ٭ شش روز به بیتابی و تلواسه چنین بود
ناگاه در آن وقت که در قطعِ رهِ عمر ٭ از من دو قدم تا بدمِ باز پسین بود
یکره دو تن از شرب مِیَم منع نوشتند ٭ وآن منع نه از بغض بل از غیرتِ دین بود
هر چند بدان منع من از مے نگزشتم ٭ اما دمِ گیرائی عزیزان بکمین بود
دانی که چه شد چوں زرِ سودا گرِ صهبا ٭ کش داد و ستد با منِ ویرانه نشین بود (ق)
بگزشت ز اندازهٔ بایست، همین گفت ٭ دیگر ندهم باده که معمول نه این بود
با کاسهٔ خالی چه کند کیسهٔ خالی ٭ ناخواسته در خواسته دل صبر گزین بود
گر زر بکفے از جائے دگر مے طلبیدم ٭ که نقد در آن دست که پیشش بزمین بود
در غرهٔ شعبان چو ز من باده گرفتند ٭ خود غالب پژمرده نشانِ زِ سنین بود
روشش بدر آر از مهِ شعبان که درینجا ٭ مقصود ز من از تخرجه البته همین بود

۱۲۹۱ — ۶ = ۱۲۸۵ھ

---

[۱] یہ غیر مطبوعہ رباعی میں نے غالب کے کلیات فارسی قلمی ۱۸۶۱ء سے نقل کی ہے جو کتاب خانہ ریاست عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔ اسکے لئے میں ناظم کتاب خانہ مولانا عرشی صاحب کا ممنون ہوں موصوف نے یہ بھی بتایا کہ یہ رباعی غالب کے اپنے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ [۲] قطعۂ تاریخ میں "دو تن" سے مراد شاید یہی دو بزرگ ہیں۔ زین العابدین خاں عارف مرحوم کی نواسی محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کے بیان سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

دلّی کے ایک اہم نعتیہ مشاعرے کی تضمینیں

سید وزیر الحسن

سعدی کے نعتیہ قطعہ کی طرح شاہجہانی دربار کے ملک الشعرا قدسی کی نعتیہ غزل کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اسکا کچھ اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس غزل کی اب تک سینکڑوں تضمینیں ہوچکی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں ان تضمینوں کے صرف ایک مجموعے کا ذکر کرنا ہے جسے قاضی محمد عمر ساکن دہلی نے ۱۸۵۶ء کے اواخر میں 'حدیث قدسی' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مگر اس کی طباعت ایک مدت بعد ہوئی۔ یہ مجموعہ دلّی کے ایک نعتیہ مشاعرے کا گلدستہ ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا غالباً آخری نعتیہ مشاعرہ تھا۔

اس مجموعہ کی اہمیت اس سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالب کی بھی فارسی تضمین اس میں شامل ہے جو ان کے مطبوعہ کلام میں موجود نہیں نہ ان کے کلیات نظم کے معلومہ قلمی نسخوں میں ہے۔ البتہ سبد باغ دو در[1] اور بیاض حسرت[2] میں موجود ہے۔ اس طرح اس تضمین کے استناد کے بارے میں یہ دونوں قلمی نسخے 'حدیث قدسی' کی تصدیق کرتے ہیں اور 'حدیث قدسی' سے ان دونوں قلمی نسخوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان تینوں ماخذوں میں تضمین کا متن صرف دو تین جگہ مختلف ہے مگر یہ اختلاف سہو کاتب تک محدود ہے۔

'حدیث قدسی' کے تضمین نگاروں میں بہادر شاہ ظفر، غالب، مومن، مجروح، صہبائی، غلام امام شہید اکبرآبادی اور حکیم آغا جان عیش کے علاوہ میرزا محمد سلطان فتح الملک رمز (ولیعہد بہادر شاہ ظفر) صاحب عالم میرزا رحیم الدین حیا، صاحب عالم میرزا فخرالدین حشمت ابن میرزا معظم بخت بہادر، میرزا محمد ظہیرالدین مغل، مرزا قادر بخش صابر، مرزا قادر شکوہ شکوہ، نواب مرزا والا جاہ بہادر لکھنوی المتخلص بہ عاشق، مرزا عالیجاہ بہادر لکھنوی المتخلص بہ شیدا محمد عبداللہ علوی، احمد حسن وحشت، میر امیر مرزا خورشید، مرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی (مولف ساطع برہان) حزین شاگرد عارف، مولا بخش قلق میرٹھی، منشی عزت سنگھ عیش، سدرلال شگفتہ لکھنوی اور بدرالدین مہرکن نقشی تخلص قابل ذکر ہیں۔ یہ وہی بدرالدین ہیں جن سے غالب مہریں بنوایا کرتے تھے۔ مہرکنی کی مناسبت سے یہ نقشی تخلص کرتے تھے اور اپنی مہرکنی کا التزام انھیں اس درجہ ملحوظ تھا کہ انھوں نے اپنی تضمین اس مصرعے سے شروع کی ہے

ع اے نگین خاتم اللہ تو ہے ختم نبی

'حدیث قدسی' کے مرتب قاضی محمد عمر نے ایک غزل میں جو اس مجموعے کے آخری صفحات میں درج ہے تضمین نگاروں کے تخلص نظم کئے ہیں۔ شروع کے چار شعر یہ ہیں :-

آج پھر بزم سعادت کی ہے ترتیب نئی
جمع ہوتے ہیں سبھی مدح سرایان نبی
گوہر مملکت و سایۂ حق مہر عطا
شاہ ذیجاہ ظفر مظہر نور قدسی
خازن جوہر عرفان خدا حضرت رمز
جس کی پیشانی سے ظاہر تھے فیوض ابدی
منبع فضل و کرم معدن فیاض ازل
ساقیٔ میکدۂ علم و ہنر صہبائی

پانچویں شعر میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

شیر میدان سخن غالب یکتائے زمن ٭ فخر خوش فہمی و خوش گوئی و شیریں سخنی

مومن کا ذکر دسویں شعر میں یوں آتا ہے :-

مومن و مضطر و مدہوش و حیات و حیدر ٭ بسمل و طائب و آشفتہ و اسحٰق و غنی

ظفر، مومن، مجروح، شہید اور صہبائی کی تضمینیں ان کے اپنے اپنے مطبوعہ مجموعوں میں موجود ہیں، اسلئے ہم صرف غالب کی تضمین پیش کر رہے ہیں۔

تضمین غالب کے ادبی آثار میں ایک نادر چیز ہے۔ انکے بعض ممتاز معاصرین نے انکے کلام پر تضمین کی مگر انکی فنی غیرت نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ وہ بھی کسی کے کلام پر تضمین کریں۔ معاصرین تو کجا انہوں نے متقدمین کے کلام پر بھی تضمین نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ تضمین نگار ایک ادبی طفیلیہ ہوتا ہے اور ادبی طفیلیہ ہونا انکی اجتہادی شان کے خلاف تھا۔ ورنہ ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف نے انکی دو غزلوں کی تضمین کی مگر انھوں نے اخلاقاً بھی کبھی ایسا نہیں کیا کہ ان کی ایک آدھ غزل پر تضمین کر دیں۔ اور صرف فنی خودداری ہی کا سوال نہیں حقیقتاً یہ ہے کہ تضمین اور تخلیق میں بیر ہے۔ تضمین مستقل نظم کی حیثیت سے غالب کے فن سخن میں گویا صنف ممنوعہ ہے۔ انھوں نے صرف نعت گوئی کے لئے اپنا یہ اصول توڑا ہے۔ قدسی کے کلام پر تضمین کرنا غالب کے لئے ایک نہایت تنگ میدان میں شہسواری کا کمال دکھانے کے مترادف تھا۔ مگر اس باکمال شاعر نے تضمین بھی کی ہے تو اسے بھی ایک ادبی تخلیق کی عظمت بخش دی ہے اور تضمین کی بندشوں کے باوجود اپنے فنی معیار کو قائم رکھا ہے۔

---

[1] بحوالہ صفحہ۔ [2] عہد غالب کی ایک قلمی بیاض جس میں غالب کا کلام ہے

[3] مجموعے کی طباعت سے بہت پہلے ان کی وفات ہوچکی تھی۔

غالبؔ کی تضمین قدسیؒ کی نعتیہ غزل پر

کیستم تا بخروش آورَدم بے ادبی — قدسیاں پیشِ تو درموقف حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمۂ زیر لبی — مرحبا سیّد مکّی مدنی العربی

دل وجاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روئے تو دہد روشنئ ایمانم — کافرم کافر اگر مہرِ منیرش خوانم
صورتِ خویش کشیداست مصور دانم — مِن بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم

اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے گلِ تازہ کہ زیب چمنی آدم را — باعث رابطۂ جان وتنی آدم را
کردہ دریوزۂ فیضِ تو غنی آدم را — نسبتے نیست بذاتِ تو بنی آدم را

برتر از عالم وآدم تو چہ عالی نسبی

اے لبت رالبوئے خلق ز خالق پیغام — روح رالطفِ کلامِ تو کند شیریں کام
ابر فیضی کہ بود از اثرِ رحمتِ عام — نخل بستانِ مدینہ ۔ تو سرِ سبز مدام

زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

خواست چوں ایزد دانا کہ لبساطے از نور — گسترد درہمہ آفاق چہ نزدیک چہ دور
حکمِ اِصدارِ تو درارض و سما یافت صدور — ذاتِ پاکِ تو دریں ملک عرب کرد ظہور

زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی

وصفِ رخش تو اگر دردلِ ادراک گزشت — نہ ہمیں است کہ ازدائرۂ خاک گزشت
ہمچو آں شعلہ کہ گرم ازخس وخاشاک گزشت — شب معراج عروجِ توز افلاک گزشت

بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

چہ کنم چارہ کہ پیوند خجالت گِلم — من کہ جزچشمۂ حیواں نبود آب وگلم
من کہ چوں مہر درخشاں بدمد نورِ دلم — نسبت خود بسگت کردم وبس منفعلم

زانکہ نسبت بسگِ کوئے تو شد بے ادبی

دل زغم مردہ وغم بردہ زما صبر وثبات — ساری کن و بنمائی بما راہِ نجات
داد سوزِ جگرِ ما کہ دہد نیل وفرات؟ — ما ہمہ تشنہ لبانیم وتوئی آبِ حیات

رحم فرما کہ زحد می گزرد تشنہ لبی

غالبِ غمزدہ رانیست دریں غمزدگی — جز بامیدِ دلائے تو تمنّائے بہی
ازتب وتابِ دل سوختہ غافل نشوی — سیّدی انت حبیبی وطبیبُ قلبی

آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی

غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط

اطہر ہاپوڑی

میرے پاس مرزا غالب کے قلم سے لکھی ہوئی ایک مستند نثر ہے جو مہاراجہ سردار سنگھ والئی بیکانیر کو بطور عرضداشت لکھی گئی ہے اس کے آخر میں تحریر ہے۔

نیازمند اسد اللہ خاں شاعر غالب تخلص نگاشتہ پنجم جنوری سنہ ۱۸۵۹ء

اس کے بعد مرزا صاحب کی اپنی مہر ہے جو اردوئے معلیٰ کے آخر میں اور وثیقہ جانشینی نواب علاؤالدین خاں والئی لوہارو پر ثبت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ سردار سنگھ والئی بیکانیر کو اپنی ریاست میں نیا سکہ جاری کرنا منظور ہے اور سکہ کے ایک جانب ملکہ وکٹوریہ کا نام اور ایک جانب ایک شعر اپنے نام کا لکھوانا چاہتے ہیں اور مسودہ عرضداشت فارسی زبان میں ملکہ معظمہ کے نام لکھنے کی فرمائش ہے۔ اسی غرض کے لئے مرزا غالب کے پاس مہاراجہ نے اپنے ایک معتمد منشی کشوری لال کو بھیجا ہے اور وہ دہلی آکر مرزا صاحب سے ملے ہیں اور سکہ کے نقش کی اور شعر کی معہ عرضداشت فارسی فرمائش کی ہے۔ مرزا صاحب نے تین نقشے سکہ کے اور دو شعر کہہ کر عرضداشت بنام ملکہ معظمہ کا فارسی مسودہ تیار کر کے اس اردو عرضداشت کے ساتھ مہاراجہ کی خدمت میں منشی کشوری لال کے ہاتھ بھیجا ہے دونوں شعر یہ ہیں:۔

بعہد دولت وکٹوریہ بہ بیکانیر ❊ نمود سکہ سردار سنگھ زر را زیر
نمود سکہ سردار سنگھ زر را زیر ❊ ز روئے نام و نشاں در دربار بیکانیر

مرزا غالب نے سکہ کے لئے تین نقشے بھی تجویز کئے ہیں۔ ایک میں ملکہ زماں کوئن وکٹوریہ سریر آرائے ہند و انگلینڈ۔ دوسرے میں کوئن وکٹوریہ تخت نشین ہند و انگلینڈ۔ تیسرے میں کوئن وکٹوریہ اورنگ آرائے ہند و انگلینڈ لکھا ہوا ہے۔

ان تینوں نقشوں کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہے
ان سب میں جون سا آپ کے نزدیک موزوں اور فصیح ہو اس پر صواد کر دیجئے۔
نمبر ۳ کے نقشہ پر صواد بنا ہوا ہے اور اس کے قریب حاشیہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

منشی شیو پرشاد نے یہ سکہ پسند کر کے صواد کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی کشوری لال کے سوا منشی شیو پرشاد ایک شخص اور ہیں جن کی پسندیدگی بھی کوئی وزن رکھتی ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ منشی شیو پرشاد کون ہیں اور ان کے مہاراجہ سے کیا تعلقات ہیں۔

اب میں مرزا صاحب کی عرضداشت اردو نثر بنام مہاراجہ بیکانیر پیش کرتا ہوں۔ یہ نثر غیر مطبوعہ ہے اور اس کی مثل مہاراجہ بیکانیر کے دفتر میں موجود ہے۔ مثل میں یہ بھی درج ہے کہ مرزا صاحب کو ایک ہزار روپیہ بطور صلہ دیا گیا ہے۔

نقل عرضداشت

بحضور والا فر السرور جناب سری مہاراجہ صاحب والا مناقب عالیشان قلزم فیض و احسان دام اقبالہٗ و زاد افضالہٗ - لوازم نیاز و تسلیم از روئے مودت و ارادت بجا لا کر۔ و مطالب و مقاصد را بزبان اردو عرضہ میدہد۔ یہ گوشہ نشین سرکار فیض آثار انگریزی بعوض جاگیر پنشن دار اور گورنمنٹ کے دربار میں سات پارچہ اور تین رقم خلعت پانے والا اور حضرت قدر قدرت ملکہ معظمہ دوران کا مداح اور بتقلم وزرائے شاہنشاہی سارٹی فکٹ خوشنودی پائے ہوئے ہے۔ درین ولا منشی کشوری لال صاحب نے کہ وہ میرے دوست اور حضور کے خیر خواہ ہیں مجھ پر مسودہ عرضداشت اور سکہ حضور کی فرمائش کی۔ میں حضور کی خدمت بجا لانے کو اپنا فخر و سعادت سمجھتا ہوں اور عرضداشت کا مسودہ اس نیاز نامہ میں ملفوف بھیج کر عرض کرتا ہوں کہ اگر یہ مسودہ پسند نہ آئے تو یہ کاغذ مجھ کو واپس مل جائے اور اگر اس مسودہ کے موافق عرضداشت لکھنی منظور ہو تو میرا بھیجا ہوا یہ مسودہ کہ بہ مہر دستخط میرے ہے دفتر میں رہے اور حرف بحرف مطابق اس کے عرضداشت لکھی جائے۔ میرے لکھے ہوئے لفظوں میں اور فقرے داخل نہ کئے جائیں اور کوئی لفظ بدلا نہ جائے۔ اسم مبارک کے سکہ کے باب میں عرض یہ ہے کہ اگر سنہ اسکو قرار دیجئے کہ ہندوستان میں بادشاہی عملداری ہوئی تو یہ بات نامناسب ہے۔ کیا وہ اس سے پہلے بادشاہ نہ تھیں اور اگر وہ سال منظور رکھئے کہ جس سال میں ولایت میں تخت پر بیٹھی ہیں تو یہ تکلف محض ہے۔ بہتر یہ ہے کہ دو سن لکھے جائیں ایک از روئے اطاعت سنہ ۱۸۵۹ عیسوی اور ایک موافق رواج ملک و ملت۔ سنبت ۱۹۱۵۔ سکہ مبارک کے تین نقشے بھیجتا ہوں دو مع تصویر اور اس میں سکہ منظوم یعنی ایک شعر جیسا کہ سلاطین ماضی کا ہر ملک میں دستور رہا ہے اور ایک نثر۔ ان نقشوں میں سے جو نقشہ سری مہاراج کی پسند آئے وہ حضور کو مبارک ہو۔ اب نیازمند اس عنایت کا متوقع ہے کہ آئندہ میں راج کا متوسل اور سری مہاراج کا دولت خواہ اور دعاگو گنا جاؤں گا اور جو کام میرے لائق ہو بے تکلف اس کے سرانجام کا مجھکو حکم ہوا کرے۔ زیادہ حد ادب۔ بہار شان جاہ و جلال بیخزاں بہار دولت و اقبال جاوداں باد۔

نیازنامہ اسد اللہ خاں شاعر غالب تخلص نگاشتہ پنجم جنوری سنہ ۱۸۵۹ء

خان بہادر نظام جنگ
نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ
۱۲۶۷ھ

غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک

حمید احمد خاں

چاندنی چوک سے مڑ کر بلّی ماروں کے اندر کچھ دور تک چلے جایئے تو شمسی دواخانے کی عمارت اور حکیم محمد شریف خاں کی مسجد کے درمیان ایک کشادہ گلی نظر آتی ہے۔ کچھ نئی کچھ پرانی عمارتیں، کچھ سنورتے کچھ بگڑتے ہوئے مکان ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ گلی میں ذرا فاصلے پر داہنے ہاتھ کو کوڑے کا ڈھیر ایک خاک انداز کے پاس پڑا ہے اور ہمیشہ پڑا رہتا ہے۔ گلی کے دونوں طرف کی عمارتیں زیادہ تر چھوٹی اینٹ کی پرانی عمارتیں ہیں۔ لیکن جس خاص بات کو آپ ایک سرسری نظر میں محسوس کئے بغیر نہیں رہتے، وہ ان نیم منہدم عمارتوں میں اونچی اونچی محرابوں کی کثرت ہے۔ ان بلند محرابوں سے پتا چلتا ہے کہ اس گلی کے گزشتہ مکینوں کی زندگی عظمت و شان سے خالی نہ تھی۔ یہ گلی قاسم جان کی گلی کہلاتی ہے اور اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف سے لے کر آج کے دن تک اسی نام سے مشہور ہے۔ گلی کے اس نام کے پیچھے ایک کہانی ہے جو شاہ عالم بادشاہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے کے قریب تین شریف زادے، جو آپس میں بھائی بھائی تھے قسمت آزمائی کے لئے بخارا سے روانہ ہوئے اور منزل بہ منزل اٹک اور پنجاب سے گزرتے ہوئے، مٹتی ہوئی مغلیہ سلطنت کی راجدھانی میں پہنچے۔ شہر میں پہنچ کر وہ بالآخر اسی گلی میں آباد ہوئے جس کے نکڑ پر ہم آپ کھڑے اس وقت باتیں کر رہے ہیں۔ شہرت اور دولت ان تین بھائیوں میں سے کم از کم دو کے حصے میں ضرور آئی۔ پہلے قاسم جان کے اقبال کا ستارہ چمکا۔ خود گلی کا نام اس کا شاہد ہے کہ جاہ و ثروت کے لحاظ سے قاسم جان اپنے بھائیوں کے سرتاج تھے۔ لیکن انیسویں صدی کے شروع میں تقدیر ایک بار پھر مسکرائی اور اس مرتبہ عارف جان کا بیٹا لوہارو اور فیروزپور جھرکہ کی ریاست پر متمکن نظر آیا۔ قاسم جان اور عارف جان کی اولاد اب بھی اس گلی کی حویلیوں اور محل سراؤں میں موجود ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کھڑے ہونے اور اس عام رہ گزر پر عقیدت کی آنکھوں کا فرش بچھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ پرانے شرفا کی اولاد یہاں آباد ہے یا بجائے خود اس گلی کی پرانی داستان سے ہمیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔ ایک اور کشش ایسی ہے جو لوگوں کو دور دور سے کھینچ کر یہاں لاتی رہے گی۔ اس کشش کو چار حرفوں کا ایک لفظ بیان کر دیتا ہے، اور وہ لفظ ہے: **غالب**۔

گلی قاسم جان کے چپے چپے کے ساتھ غالب کی زندگی کو کسی نہ کسی پہلو سے، کسی نہ کسی منزل میں تعلق رہا ہے۔ غالب کا اصل وطن آگرہ تھا۔ لیکن ابتدائے شباب ہی میں وہ آگرے کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دلّی میں آ رہے تھے۔ اس تبدیلیٔ وطن کے بعد وہ پچاس پچپن برس تک دلّی میں رہے لیکن ذاتی مکان کبھی نصیب نہ ہوا۔ ہمیشہ کرایے کے مکانوں میں اور کبھی کبھی کسی مفت ملے ہوئے مکان میں رہے۔ اس تمام مدت کا بیشتر حصہ انھوں نے گلی قاسم جان ہی کے کسی نہ کسی مکان میں گزارا اور اگر کبھی تھوڑے عرصے کے لئے باہر نکلنا بھی پڑا تو اسی محور کے گرد چکر کھاتے رہے لیکن غالب کی ذات سے قطع نظر، اس تعلق کا سلسلہ خود غالب کے خاندان تک پہنچتا ہے۔ اسی گلی میں، شاید غالب کی پیدائش سے بھی پہلے، غالب کے چچا کا عقد عارف جان کی بیٹی سے ہوا تھا۔ دس پندرہ برس بعد جب غالب خود بالک دولھا بنے ہوئے عارف جان کی پوتی امراؤ بیگم کو بیاہنے آئے تو اپنی برات یہیں قاسم جان کی گلی میں لائے تھے۔ اور پھر تقریباً ساٹھ سال بعد جب بوڑھے شاعر کا جنازہ اٹھا تو اسی گلی کی ایک ڈیوڑھی سے دوست اور شاگرد اور عزیز میت کو کندھا دیتے ہوئے، جامع مسجد اور دلّی دروازے کی راہ سے، درگاہ حضرت نظام الدین کو روانہ ہوئے۔ اس دن اسی گلی کے ایک مکان میں ستر برس کی ایک بڑھیا ماتم میں جھکے ہوئے سر پر ایک سفید دوپٹہ اوڑھے اپنی اس بیوگی کے غم میں آنسو بہا رہی تھی جس کی میعاد کو سال بھر بعد مرحوم شوہر کی پہلی برسی کے دن موت کے ہاتھوں ختم ہونا تھا۔

سامنے کے سرے پر، جہاں گلی ختم ہونے سے پہلے بائیں ہاتھ کو گھومتی ہے، ایک بڑی محراب نظر آ رہی ہے۔ اگر اس محراب سے گزر کر اندر چلے جائیں تو چند پرانی عمارتیں ملتی ہیں جن میں سے ایک عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو کی حویلی ہے۔ روایت کہتی ہے کہ یہی حویلی غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کا بھی مسکن تھی۔ اگر اس روایت کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب اٹھارہ بیس برس کی عمر میں جب ہمیشہ کے لئے دلّی چلے آئے، تو پہلے پہل چند سال تک اسی مکان میں رہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ غالب کی زندگی کے آخری چند سال ایک ایسے مکان میں بسر ہوئے جو گلی کے اس دوسرے سرے پر ہے جدھر ہم مسجد اور دواخانے کے درمیان کھڑے ہیں۔ دلّی میں ان کے پہلے مکان اور آخری مکان کی یہ باہمی نسبت معنی خیز ہے۔ گلی کے پرلے سرے سے چل کر اس سرے تک آ جایئے تو گویا آپ نے غالب کے شباب سے لے کر وفات تک کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ دلّی میں ان کی زندگی لوہارو والوں کی عظیم الشان حویلی

سے شروع ہوئی اور اس کھنڈر میں ختم ہوئی جس کی زیارت کے لئے ہم آپ گلی کے اس سرے پر کھڑے ہیں۔

گلی میں چند قدم چلئے تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر ہمیں ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی ہے۔ اندر جا کر دیکھئے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے بھر بھر کر کچھ اور مختصر ہو گیا ہے۔ صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ سے کمرے جو غالباً پشتِ مسجد کا سہارا لئے ہوئے ہیں ابھی تک اپنی سخت جانی کے اظہار کے لئے کھڑے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی، یہ صحن اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فرودگاہ کی یادگاریں ہیں۔ وہ بالا خانہ جو، خود ان کے بقول، ان کے "بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل" تھا اب باقی نہیں رہا۔ بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ اینٹوں کا یہ ڈھیر اب تک کھڑا کس طرح رہا۔ گلی کے دوسری طرف، غالب کے دیوان خانے کے تقریباً سامنے، ہندوستانی دواخانے سے متصل غالب کا زنان خانہ تھا۔ یہاں اب ہندوستانی دواخانے کا کارخانۂ دواسازی ہے لیکن اس کا حلیہ اب اتنا بدل چکا ہے کہ اگر بیگم غالب پھر کسی طرح یہاں پہنچ سکیں تو انھیں اپنے گھر کو پہچاننے میں خاصی دقت محسوس ہو۔

غالب دن کا بیشتر حصہ دیوان خانے میں گزارتے تھے۔ جب تک بڑھاپے کے ضعف اور امراض نے غلبہ نہ پالیا، ان کا معمول یہ تھا کہ صبح ناشتے کے بعد اپنے بالا خانے کے دالان میں دوستوں کو خط لکھنے بیٹھ جاتے۔ خط لکھ کر اوپر لفافہ رکھ دیتے اور داروغہ کلو بند کر کے ٹکٹ لگا دیتے تھے۔ دوپہر کو قصے کہانی کی کوئی کتاب لے لیتے یا چوسر اور شطرنج سے جی بہلاتے۔ کبھی عارف جان یا قاسم جان والوں میں سے کوئی لڑکا گلی میں سے آتا ہوا دکھائی دیتا تو اسے آواز دے کر اوپر بلا لیتے۔ تھوڑی دیر اسی سے ہنسی مذاق کی باتیں کر کے کچھ اپنا گھر زیادہ اس کا دل خوش کرتے۔ گرمیوں میں دوپہر کو بالعموم سو جاتے تھے۔ سہ پہر کو اٹھتے تو ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ ملاقاتیں زیادہ تر اس ڈیوڑھی میں ہوتیں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ اسی ڈیوڑھی میں مونڈھے پڑے رہتے تھے۔ غالب بالا خانے سے نیچے اترتے۔ دوست اور شاگرد اپنے اپنے وقت اور سہولت کے لحاظ سے جمع ہوتے اور یہیں بیٹھتے۔ غالب ایک بڑے چوڑے مونڈھے پر جو لال کھاروے سے منڈھا ہوا تھا ٹانگیں سمیٹے ہوئے بیٹھا کرتے جیلیں آگے پڑی رہتیں۔ ذرا دائیں ہاتھ کی طرف حقہ ہوتا۔ غالب اس عمر میں اونچا سننے لگے تھے۔ جب کوئی شخص بات کرتا تو سننے کے لئے کان اس طرف کو جھکا دیا کرتے تھے۔ ملنے والے اگر کہیں قریب سے آتے تو پیدل چلے آتے تھے۔ فاصلے سے آنے والوں میں پابندِ وضع بزرگ پالکی میں تشریف لاتے۔ پالکی دروازے کے سامنے رکی، وہ بزرگ نیچے اترے۔ غالب نے ذرا دیکھا اور پھر اپنے خاص لہجے میں لفظوں کو خوب پھیلاتے ہوئے کہا: "آئیے، آئیے! آپ کا مزاج اچھا ہے؟"

یہ دیوان خانے کی زندگی کی تصویر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حرم سرا میں زندگی کا کیا نقشہ تھا جہاں غالب کی نصف صدی سے زائد کی رفیقۂ حیات کے دن گزرتے تھے؟ غالب کا ہر روز کا معمول تھا کہ ایک موٹی سی لکڑی ٹیکتے ٹیکتے کم از کم ایک مرتبہ زنان خانے کو ضرور جاتے۔ یہاں وقت کس طرح گزرتا، کیا باتیں ہوتیں، کیا قصے قضیے طے ہوتے، ان تفصیلات پر بظاہر ایک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے پہلے اسی گلی قاسم جان کے اندر، لوہارو والوں کی اس حویلی میں جس کا ذکر ابھی آ چکا ہے، ایک سن رسیدہ بی بی موجود تھیں جنھوں نے غالب کی زندگی کے آخری دور کا یہ پہلو اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ یہ بی بی عارف جان کی پڑپوتی، غالب کے دوست نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں کی بیٹی اور مرزا زین العابدین خاں عارف کی بہو نواب معظم زمانی بیگم عرف بگّا بیگم تھیں۔ مجھے جولائی ۱۹۳۸ء میں اپنے کرم فرما اور محترم دوست حکیم محمد کامل خاں صاحب دہلوی کی معرفت بگّا بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تھا۔ بگّا بیگم صاحبہ اپنی حویلی کے ایک دالان میں پردے کے پیچھے تشریف لے آئیں۔ پردے کے دوسری طرف ایک تخت پر حکیم صاحب اور میں بیٹھ گئے۔ میں نے مرزا غالب اور ان کی بیگم صاحبہ کے متعلق کئی سوالات کئے جن کا جواب بگّا بیگم صاحبہ مجھے تفصیل سے دیتی رہیں۔ ان کی عمر اس وقت نوے برس کے لگ بھگ تھی، مگر آواز میں بڑھاپے کی کمزوری کا کوئی خفیف سا اثر بھی میں نے محسوس نہیں کیا۔ برجستہ اور بے تکان بات کرتی تھیں گفتگو کی ہر منزل پر مجھے ان کے ذہن کی بیداری اور احساسِ ظرافت کی موجودگی کے ثبوت ملے ہیں ان کے ہر جواب کی یادداشتیں قلم بند کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن بار بار میں نے محسوس کیا کہ میرا قلم ان کی شستہ تقریر کی روانی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

جو کچھ میں نے ان سے سنا، اس کی کیفیت یہاں لکھنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ غالب کی خانگی زندگی سے متعلق بگّا بیگم صاحبہ کو کیا خصوصیت حاصل تھی جس کی بنا پر ان کی دی ہوئی معلومات ہمارے لئے قابل قدر ہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غالب کی اولاد میں سے کسی بچے نے بھی برس سوا برس سے زیادہ کی عمر نہ پائی۔ ان کی بیگم صاحبہ نے اولاد سے مایوس ہو کر آخر اپنے بھانجے (اور قاسم جان کے پڑپوتے) زین العابدین خاں عارف کو متبنیٰ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ مرزا غالب بھی عارف سے حقیقی اولاد کی سی محبت کرتے تھے جس کا اظہار مرزا صاحب کے اردو اور فارسی کلام دونوں میں موجود ہے۔ جب عارف کا انتقال[1] ہو گیا تو غالب

---

[1] ۱۸۵۲ء میں

ان کے دونوں بیٹوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں، کو اپنے پاس لے آئے اور انھیں اسی لاڈ پیار سے رکھا جس سے اپنی اولاد کو رکھتے۔[۵] بڑے لڑکے باقر علی خاں کی شادی غالب نے خود اپنی زندگی میں کی۔ اس طریقے سے جو بہو غالب کے گھر میں آئی، وہ یہی بگا بیگم صاحبہ تھیں۔ ان تمام رشتوں کی کیفیت ذیل کے شجرے سے بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی:

عارف جان

قاسم جان

نواب احمد بخش خاں

مرزا الٰہی بخش خاں معروف

نواب فیض اللہ بیگ خاں

امراؤ بیگم
(مرزا اسد اللہ خاں غالب)

بنیادی بیگم = نواب غلام حسین خاں مسرور

نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں

مرزا زین العابدین خاں عارف

نواب معظم زمانی بیگم = مرزا باقر علی خاں کامل
عرف
بگا بیگم

مرزا حسین علی خاں شاداں
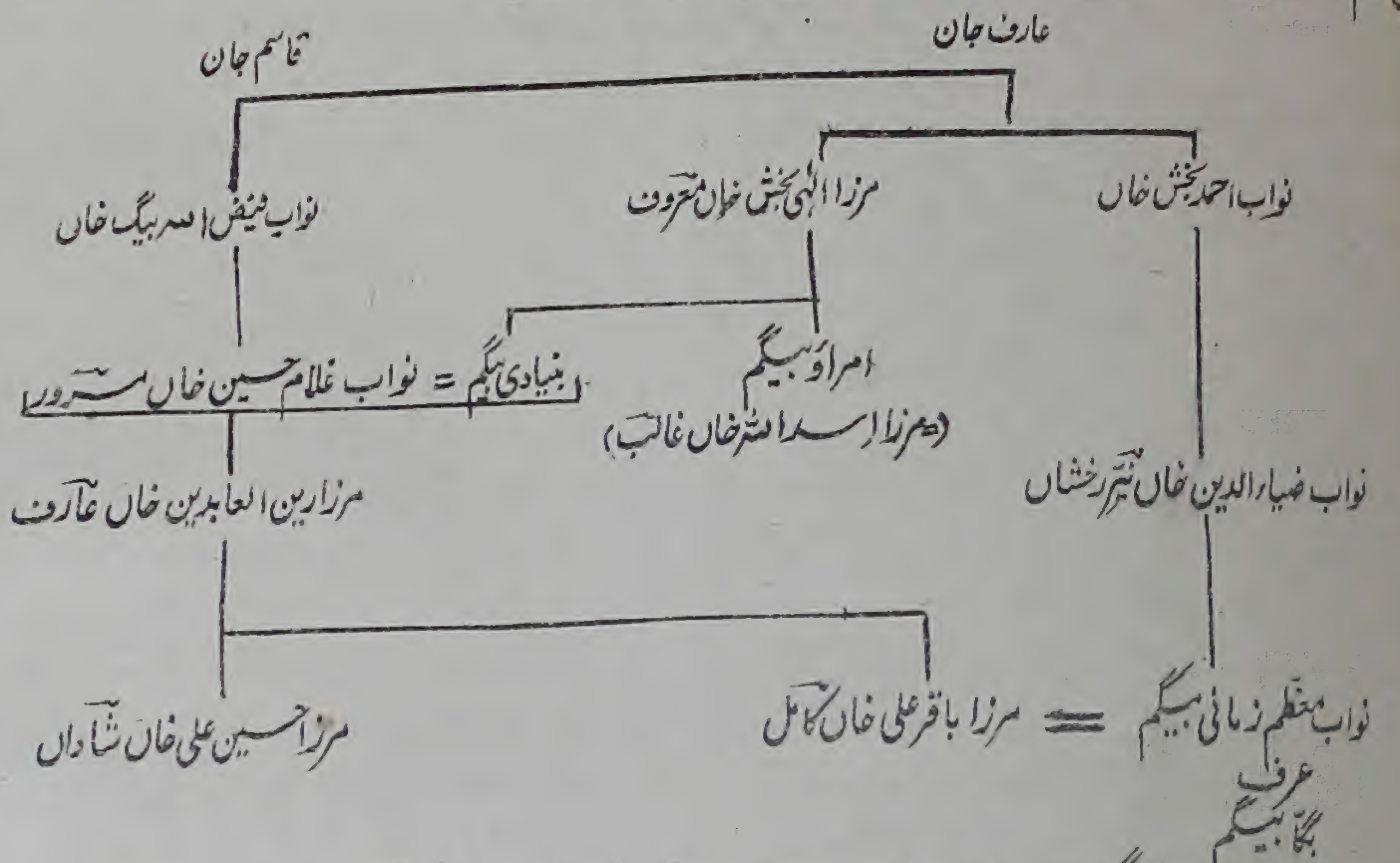
اس میں شک نہیں کہ بگا بیگم صاحبہ نے غالب کا صرف آخری زمانہ دیکھا لیکن چونکہ وہ رات دن گھر میں رہتی تھیں اس لئے ان کے بیان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کہیں کہیں جہاں انھوں نے قیاس سے بات کی، ان کا بیان درست نہیں ہے (مثلاً غالب کی عمر کے متعلق) مگر جو باتیں ان کی دیکھی ہوئی تھیں، ان کی صحت میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ مثلاً جب میں نے پوچھا کہ مرزا صاحب کے چلنے کا انداز کیا تھا تو فوراً بولیں: "سہج سہج چلتے تھے، بڈھے تھے، اسی برس کی عمر تھی"۔ ظاہر ہے کہ اس قول کا صرف پہلا حصہ بالکل درست اور دوسرا تخمیناً درست ہے۔ لیکن ہم کتنے ہی صحت پسند ہوں ہمارا یہ تقاضا ضرورت سے زیادہ سخت ہوگا کہ بگا بیگم صاحبہ کے کسی تخمینے میں بھی کوئی فرق نہ نکلے۔

اتنا تو سب جانتے ہیں کہ جس قدر مرزا غالب طبیعت کے لحاظ سے آزاد رو تھے، اسی قدر ان کی بیگم صاحبہ اپنے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کی طرح پرہیزگار اور نماز

---

[۵] غالب کے اردو خطوں میں اس کی طرف جابجا اشارے ملتے ہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک خط (بنام میر مہدی مجروح) میں لکھتے ہیں: "لو بھئی اب تم چاہو بیٹھے رہو، چاہو اپنے گھر جاؤ۔ میں تو روٹی کھانے جاتا ہوں۔ اندر باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی۔ صرف ایک میں اور ایک میرا پیارا بیٹا حسین علی خاں، یہ ہم روزہ خوار ہیں؛ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے: 'کھلونے منگا دو۔ میں بھی بجار جاؤں گا'۔"

بگا بیگم صاحبہ کے پھوپھی زاد بھائی خضر مرزا مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے: میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں مرزا غالب سے شوخیاں کرتے اور کبھی ان کی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی ان کی بہت ناز برداری ہوئی۔ مرزا صاحب نے کہا "ارے حسین علی، آکر پڑھ لے"۔ انھوں نے جواب دیا "دادا جان، آتا ہوں"۔ اور دوسری طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انھیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر مرزا صاحب کے پاس منہ بسورتے ہوئے آئے کہ دادا جان بیس روپے دلوا دیجئے۔ مرزا صاحب نے کلو کو بلا کر کہا "بھئی، انھوں نے ایک پتھر اور مارا۔ دے دے بیس روپے"۔

خضر مرزا مرحوم نے اپنے بچپن کے دنوں کا ایک اور واقعہ مجھے اس طرح سنایا: "ایک دن میں چلا جا رہا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی "ابے لمڈو! یہاں آؤ"۔ ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لئے مٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابے یہ کیا! منہ سے کھاؤ، میرے مرغی کے بچے یوں ہی چگا کرتے ہیں!"

روزے کی پابند تھیں۔ اس وجہ سے میاں بیوی کے درمیان اکثر نوک جھونک ہوتی تھی[۵۱] چنانچہ غالب بیوی کو "حضرت موسیٰؑ کی بہن" کہتے تھے اور اگر زیادہ بگڑتے تو یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ "میرا تو ناک میں دم کر دیا ہے!" مگر یہ جھگڑا محض رندی و زہد کے اختلاف تک محدود نہ تھا۔ جو کچھ میں نے سنا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اختلافِ مزاج کو بھی گھر کی چپقلش میں خاصا دخل تھا۔ چنانچہ خود بگا بیگم صاحبہ کی موجودگی میں میاں بیوی کی لڑائی ہوتی تھی۔ امراؤ بیگم خفا ہوتی تھیں مگر خاموش ہو جاتیں۔ ان سے کہتی تھیں: "بیٹی تُو تو بچہ ہے۔ بڈھے کی باتوں کا خیال نہ کیا کر، بڈھا تو دیوانہ ہو گیا ہے!"

اسی قسم کا ایک واقعہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ (مرزا صاحب) پچھلے پہر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے۔ ایک روز عصر کے بعد واپس آئے۔ میں اور میری ساس عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ لوٹ بھی اسی تخت پر، نکڑ پر ہو بیٹھے۔ جب ہم نے سلام پھیرا تو کہنے لگے: "واہ وا! خوب! بہو کو بھی اپنا سا کر لیا۔ کمہاری بُونٹ کا کیڑا اپنے گھر لے جاتی ہے تو چالیس دن میں اسے بھی اپنا سا کر کے نکال دیتی ہے!"

ایک اور لطیفہ بگا بیگم صاحبہ نے مجھے یوں سنایا کہ برسات کے دن تھے۔ مینہ بہت برسنے لگا۔ پوتوں (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) نے کھانا کھایا اور چلے گئے۔ نیاز علی (ملازم) بھی چلا گیا۔ (مرزا صاحب) بیٹھے بیوی سے باتیں کرتے تھے۔ میں یوں بیٹھی تھی، گاؤ تکیے کے کونے سے لگی ہوئی۔ کہنے لگے: "ایک بیوی، دو میں، تیسرا آنکھوں میں ٹھیکرا! بہو، میں اور میری بیوی بیٹھے ہیں، تم کیوں بیٹھی ہو؟" اس پر میری ساس بولیں: "لے توبہ! بڈھا تو دیوانہ ہے۔ اسے تو ٹھٹھے کے لئے کوئی چاہئے۔ اب بہو ہی مل گئی۔" میں اتنے میں اٹھ کر ایک کونے میں جا چھپی۔ اب انھیں یہ فکر کہ برسات کا موسم ہے اور کیڑے پتنگے کا عالم مجھے ڈھونڈتے پھریں اور کہتے جائیں: "مجھے کیا خبر تھی بہو اس بات کو اتنا برا مانے گی!"

میں نے نوکروں اور بچوں کے متعلق پوچھا کہ غالب ان سے کس طرح پیش آتے تھے۔ حسین علی خاں کے متعلق بتایا کہ "چھوٹے پوتے کو دھمکایا کرتے تھے۔" نوکروں میں کلّو کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا: "کلّو داروغہ کو مرے ہوئے پندرہ برس ہو گئے۔ لوگ ان کی زیارت کو بہت آتے تھے۔ یہ چودہ برس کی عمر میں مرزا صاحب کے پاس آ کر رہے۔ کلّو داروغہ کا یہ حال تھا کہ پاؤں کی آہٹ سے پہچان لیتے تھے کہ لڑکیاں ہیں، بہوئیں ہیں یا بوڑھیاں۔ ایک اور نوکر مدار خاں تھا۔ ان دونوں کا بیاہ انھوں نے خود کیا۔ یہ مجھ سے پہلے کا ذکر ہے۔ میں نے سنا ہے۔ مدار خاں کے لڑکے کا نام نیاز علی تھا۔ یہ مرزا صاحب نے لے لیا۔ مدار خاں کی بیٹی آبادی کو کلّو نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔"

"کھانا ایک وقت کھاتے تھے۔ دوسرے وقت کباب تلے ہوئے دال، مربّہ، پسے ہوئے بادام اور حلوا سوہن[۵۲]۔ جب کھانا خراب ہوتا تو پکانے والے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ پکانے والا کون تھا؟ ددا تھیں۔ مرزا صاحب پان نہیں کھاتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی کھاتے نہیں دیکھا۔ چنے کی دال میں کڑھی پھلکیاں بہت کھاتے تھے۔ چنے کی دال ہر سالن میں ایک ایک چمچہ ضرور پڑتی تھی۔ میرے بیاہ کے بعد کی بات ہے کہ چنے کی دال سالن میں پڑی ہوئی میرے سامنے بھی آئی۔ مجھے پسند نہیں تھی۔ مغلانی نے میری ساس سے شکایت کی کہ بہو نہیں کھاتیں چنے کی دال۔ مرزا صاحب یہ بات سن رہے تھے۔ کہنے لگے: "ددا، یہاں تو آ" ددا گئیں تو ان سے کہا: "پیسے نہیں تھے تیرے پاس؟ بہو کی پسند کی چیز پکالی ہوتی"۔ ددا نے جواب دیا: "نہیں، بہو چنے نہیں کھاتی ہیں"۔ بولے: "اوہو، خدا سے بھی بڑھ گئیں بہو؟ توبہ توبہ!" پھر میری ساس سے کہنے لگے: "بیوی سنو" وہ بولیں: "میں نہیں سنتی!" اس پر مجھ سے کہا: "بیٹی، برا نہ مانیو۔ ایک بات سناتا ہوں۔ خدا کے آگے چنا گیا اور فریاد کی کہ باری تعالیٰ یہ کیا بات ہے مجھ کو لوگ طرح طرح سے تنگ کرتے ہیں۔ بھونتے ہیں، تلتے ہیں، ابالتے ہیں، پیستے ہیں۔ آخر میرا گناہ کیا ہے؟ خدا نے چنے کی طرف دیکھا اور کہا، دور ہو۔ نہیں میں بھی تجھے کھا جاؤں گا!"

یہ بات سناتے ہوئے خود بھی ہنستی رہیں۔

میں نے پوچھا "مرزا صاحب کی یادگار کی کوئی چیز آپ کے پاس ہے؟" کہنے لگیں: "مجھے کیا خبر تھی کہ لوگ ان کی چیزوں کو اس طرح ڈھونڈیں گے؟ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں ہے۔ ہاں معظم میاں (نواب معظم علی خاں) کے پاس ان کا پیالہ اب تک ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تھے۔"

جب میں نے غالب کے مذہب کے متعلق سوال کیا تو بولیں: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا؟ جہاں بیٹھے اسی مذہب میں ہو گئے۔" میں نے یہ بھی پوچھا کہ مرزا صاحب کس زمانے میں اونچا سننے لگے تھے؟ جواب دیا: "میں نے تو انھیں بہرا ہی دیکھا۔ جب میرا بیاہ ہوا تو بہرے ہی تھے۔" غالب کے بھائی مرزا یوسف[۵۳] کی وفات کے متعلق دریافت کیا تو کہا: "سرس کی گلی میں مارے گئے تھے۔ مسجد تہور خاں میں دفن ہوئے۔" میں نے غالب کے متعلق بھی پوچھا کہ کس جگہ انتقال کیا تو جواب دیا: "دیوان خانے میں، جہاں مجید خاں نے اصطبل بنوایا ہے۔ اس وقت حکیم محمود خاں، حکیم غلام مرتضیٰ اور حکیم احسن اللہ خاں وغیرہ سب وہیں تھے۔"

اس سوال کے جواب میں کہ مرزا صاحب نے کس مرض میں انتقال کیا، بگا بیگم صاحبہ نے کہا: "وہ کچھ بیمار تو ہوئے نہیں۔

---

۵۱ اس ضمن میں "یادگارِ غالب" کی متعلقہ عبارت بھی پڑھنے کے قابل ہے۔

۵۲ بگا بیگم صاحبہ نے قدرۃً غالب کی شام کی شراب کا ذکر نہیں کیا لیکن عجب نہیں یہ حلوا سوہن ہی شراب کا قائم مقام ہو۔ سقوطِ دہلی کے بعد ۱۸۵۷ء،

بس مرہی گئے۔ ہوا یہ کہ کھانا کھانے آئے۔ بنت[1] بیگم کو بہت چاہتے تھے۔ پوچھا "جیون بیگ کہاں ہیں؟ بلاؤ"۔ احمد بیگ ان کے خادم تھے، انھیں بھیجا۔ مرزا صاحب کہنے لگے "اچھا جب وہ آئیں گی تو کھانا کھاؤنگا"۔ یہ کہہ کر لیٹ گئے۔ کروٹ لے کر لیٹے ہی تھے کہ بے ہوش ہو گئے۔ اسی حالت میں ان کا دم نکلا"۔

امراؤ بیگم کے متعلق بگا بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا: "جب میں بیاہی گئی تو وہ اچھوہ کی پھانک تھیں۔ جا نماز پر بیٹھ کر کہا کرتیں: "اے اللہ! تو کب بلائے گا"۔ ایک روز میں نے پوچھا: "پھپھی جان، آپ کو قبر سے ڈر نہیں لگتا؟" کہنے لگیں: "بیٹی، تھکا بیل سرا کو دیکھتا ہے"۔

یہ ہے ان معلومات کا بڑا حصہ جو مجھے بگا بیگم صاحبہ سے حاصل ہوئیں۔ یہیں اس تحریر کو ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن آخر میں مجھے ذاتی حیثیت کی ایک چھوٹی سی بات کا ذکر بھی کرنا ہے۔ جس دن مجھے بگا بیگم صاحبہ سے باتیں سننے کا موقع ملا، اسی شام میں نے اپنی والدۂ مرحومہ کو (جو اس وقت زندہ تھیں) معمول کے مطابق ایک خط لکھا۔ یہ خط محفوظ ہے اور اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں مجھے یہ عبارت نظر آتی ہے:

> آج صبح ہوٹل سے نکل کر میں پھر حکیم صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے بگا بیگم صاحبہ (منتظم زمانی بیگم) دختر نواب ضیاء الدین نیر رخشاں کے پاس لے گئے۔ یہ غالب کی بہو ہیں۔ نوے برس کی عمر ہے۔ گھر کی باتیں بتاتی رہیں۔ بہت مہربانی سے پیش آئیں۔ بار بار اصرار سے پان دینا چاہتی تھیں مگر حکیم صاحب (جنھیں علم تھا کہ میں پان نہیں کھاتا) روک دیتے تھے۔ انھیں بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اتنی دور سے آئے ہیں تو ان کی تواضع ضرور ہونی چاہیے۔۔۔۔۔۔۔

میں اب بھی پان نہیں کھاتا ہوں۔ لیکن جب اس عبارت کو پڑھتا ہوں تو یہ افسوس ضرور ہوتا ہے کہ میں اس دن ایک تبرک سے محروم رہا۔

---

[1] بگا بیگم صاحبہ کی بڑی صاحبزادی کا عرف ہے جو اس وقت اپنی عمر کے چوتھے سال میں تھیں۔ مرزا غالب انھیں محبت سے "جیون بیگ" کہتے تھے۔ ان کی شادی نواب شجاع الدین خاں سے ہوئی۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

جرأت رندانہ — عشرت جلالی

یہ میخانے کا تیرے آج کیسا رنگ ہے ساقی؟
ارے پینا تو پینا آہ! جینا تنگ ہے ساقی!
خودی و بیخودی میں اف یہ کیسی جنگ ہے ساقی!
خرد کا ذکر ہی کیا خود جنوں بھی دنگ ہے ساقی!
ارادے سرد، ہمت پست، دل پر زنگ ہے ساقی!
تو پھر کس کام کی صہبائے شعلہ رنگ ہے ساقی!

لرزتی، لڑکھڑاتی، کرب و غم میں ڈوبی ڈوبی سی!
یہ فریادِ خودی ہے یا صدائے چنگ ہے ساقی
یہ نغماتِ طرب ہیں یا ہیں دیپک راگ کی بانیں!
ترانہ آہ سے کیوں آج ہم آہنگ ہے ساقی؟
ذرا تو سوچ! کچھ تو غور کر! یہ تیرے شیشوں میں
غریبوں کا لہو ہے یا مئے گلرنگ ہے ساقی؟

ہزاروں کچلی کچلی حسرتوں کا خون ہوتا ہے!
کہیں تب جا کے بنتا بادۂ خوش رنگ ہے ساقی!
یہ رقصِ جام و مینا ہے کہ عقل و ہوش کا ماتم؟
کہ افلاس و امارت کی سیاسی جنگ ہے ساقی؟
یہ بہکا بہکا سا عالم! یہ ہر ہر گام پر لغزش!
خطائے نامناسب ہے کہ عقلی لنگ ہے ساقی؟

ارے رہنے بھی دے! جینے کی خاطر کون پیتا ہے!
تصنع ہے! یہ دھوکا ہے! یہ عذر لنگ ہے ساقی!
یہ پینا کوئی پینا ہے! یہ جینا کوئی جینا ہے!
خوشی مفقود ہے! دنیائے مستی تنگ ہے ساقی!
ہمیں اب جرأت رندانہ دنیا کو دکھانا ہے!!
سنبھلنے والے! سوالِ پاسِ نام و ننگ ہے ساقی!

یہ شیشے توڑ بھی دے اب! یہ ساغر پھینک بھی دے اب!
یہ دورِ تیغ ہے ساقی! یہ دورِ جنگ ہے ساقی!
بجائے جام کوئی پرچم خونیں اٹھا تو بھی!
کہ تیرے میکشوں پر آج جینا تنگ ہے ساقی!

یونیسکو کے بنیادی عقائد

(پچھلے شمارہ میں ہم نے یونیسکو کانفرنس کے ہندوستانی وفد کے ایک رکن آغا محمد اشرف صاحب کا مضمون ہدیۂ ناظرین کیا تھا۔ موجودہ شمارہ کی کتابت تقریباً ختم ہو چکی تھی کہ اس وفد کے ایک دوسرے رکن خواجہ غلام السیدین صاحب نے ہمیں اس 'فی البدیہہ' تقریر کی رپورٹ مرحمت فرمائی جو موصوف نے کانفرنس کے آخری اجلاس میں کی تھی۔ یہ تقریر اس اجلاس کی بالکل آخری تقریر تھی اس لئے اس کے ابتدائی حصہ میں سیدین صاحب نے کانفرنس کے اراکین کو اس ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی جو کانفرنس کا کام ختم ہونے کے بعد ان سب پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے بعد فرانس کی حکومت اور اہل پیرس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فاضل مقرر نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو ہر امن پسند متمدن انسان کے لئے اہمیت رکھتی ہیں۔ ہم اس تقریر کے نصفِ آخر کا اقتباس سیدین صاحب موصوف کے شکریہ کے ساتھ ناظرینِ 'آجکل' کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ——— ادارہ)

کانفرنس کے کام کا سرسری جائزہ لیتے وقت برابر میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا رہا: کس حد تک اس کانفرنس نے ہمیں ان قدرے مبہم اور غیر متعین مسائل کے تعین اور توضیح میں مدد دی ہے جن سے ہم نے اپنا کام شروع کیا تھا؟ میرا خیال ہے کہ ہم آسانی سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ سکرٹریٹ، پریپریٹری کمیشن اور خود یہاں کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں نے جو کام کیا ہے اس کے بعد ہمیں اپنے آگے کی زمین زیادہ اچھی طرح نظر آنے لگی ہے اور اب ہم اپنے منصوبے زیادہ اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ بنا سکتے ہیں۔ میں ان اسکیموں اور منصوبوں کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ کام ڈرافٹنگ کمیٹی زیادہ بہتر طریقہ سے انجام دے چکی ہے اور پچھلے دو دنوں میں مختلف مقرر بھی ان کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ میں تو آپ کی توجہ اپنے مسلک کے دو عملی اور بے حد اہم بنیادی عقیدوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ـــ وہ عقیدے جو کانفرنس میں ہماری بحث تمحیص کے بعد برآمد ہوئے ہیں۔ ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارا اولین مقصد امن ہے ـــ اسی امن کا ایوان ہمیں ساری دنیا کے عوام کے دلوں میں تعمیر کرنا ہے۔ کوئی منصوبہ وہ بجائے خود کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، امن کے منصوبوں سے برتر نہیں ہو سکتا۔ ہر منصوبہ کی پرکھ صرف اس اصول کی ترازو پر ہونی چاہئے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ امن کا پیامی ہے یا نہیں۔ شاید کبھی وہ وقت آ جائے، اور خدا کرے کہ جلد آ جائے، جب ہم سب یکسوئی کے ساتھ کلچرل زندگی اور اسکے بے پایاں مظاہر کی جستجو میں سرگرم سفر رہ سکیں۔ لیکن وہ وقت ابھی آیا نہیں۔ اور موجودہ حالات کی شدت کا تقاضا ہے کہ ہم ان اسباب کی بیخ کنی کریں جو حقیقی کلچرل زندگی کو ناممکن بنا رہے ہیں ـــ اور اسی چیز کے پیش نظر کانفرنس نے بین الاقوامی رضاجوئی اور رواداری پیدا کرنے کے لئے مختلف منصوبے تجویز کئے ہیں۔

ہمارے مسلک کا دوسرا اہم عقیدہ یہ یقین ہے کہ ایک ایسی دنیا میں جسمیں نہ صرف سیاسی عناصر نے بلکہ معاشی، تمدنی اور تعلیمی مواقع کی کمی اور تفاوت نے ایک انتشار پیدا کر رکھا ہے نہ امن ممکن ہے نہ آزادی اور نہ کلچر۔ یہی تفاوت اور مساوات کی کمی ہے جو دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان صحیح ذہنی ارتباط نہیں پیدا ہونے دیتی۔ یہی کمی ہے جس نے دنیا کے بعض حصوں کی ایک کثیر تعداد کو ـــ بلکہ یوں کہیئے کہ ساری کی ساری آبادی کو ایک ایسی زندگی کے دوزخ میں دھکیل دیا ہے، جس میں غربت ہے، ویرانی ہے اور تنگی۔ ہمیں کسی طرح بھی یہ بات برداشت نہیں کرنی چاہئے کہ ان "تنگ و تاریک خطوں" کے برابر بڑے بڑے "روشن خطے" بھی قائم رہیں ـــ یہ راستہ خطرہ کا راستہ ہے۔ اور اسی لئے یونیسکو نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کی آواز دور افتادہ خیالی ماضی کے لئے نہ ہو بلکہ حال کے لئے ہو، اسی وقت کے لئے ـــ اس کا کام یہ ہو کہ ایسے ملکوں میں جو اب تک تعلیم، کلچر اور سائنس کی نعمتوں سے محروم رہے ہیں، تعلیم، کلچر اور سائنٹفک علم کا معیار بڑھائے اور اس طرح عام انسان کی زندگی کو بہتر بنا سکے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جنگیں صرف آمروں کی مجرمانہ حرکتوں سے، خطیبوں کی حماقتوں سے یا روپے سے کھیلنے والوں کی چالوں سے نہیں پیدا ہوتیں۔ بلکہ اس لئے بھی ہوتی ہیں کہ دنیا میں کروڑوں انسان اب بھی ناداری اور مایوسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور سکون و آرام کے ایک لمحہ اور کلچر کی بے شمار نعمتوں سے یکسر محروم ہیں۔ اور اس لئے وہ بڑی آسانی سے ہر اس شخص کی چرب زبانی کا شکار بن جاتے ہیں جو ان کی ساری بدنصیبیوں کا مداوا اپنے ایک معاشی یا سیاسی نسخے سے کرنا جانتا ہے۔ اگر ہم دنیا کو اس خطرے سے بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں عام انسانوں کی زندگی کو بدنصیبی کی اس تاریکی سے نکالنا ہوگا، ہمیں اس کی زندگی کو بامعنی بنانا پڑے گا۔ انسان کو، قوموں کو جنگ کی تباہیوں سے بچانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم اسے یہ محسوس کرنے کے قابل بنائیں کہ زندگی واقعی زندہ رہنے کی چیز ہے اور اس لئے اسے ہر نا کام "اشتہار باز" گلی کوچہ میں خطابت کرنے والے ہر خطیب یا ہر

خواجہ غلام السیدین

چالاک لفع باز کے اشارے پر قربان کر دینے میں نہ دانش مندی ہے نہ ذاتی مفاد۔ کانفرنس نے بنیادی تعلیم، تعلیم بالغان، عوام کے مفاد کے لئے سائنس کے وسائل کا استعمال، ریڈیو، فلم، تھیٹر اور اخباروں میں ایسے پروگراموں کا معیار بہتر بنانے کی کوشش جو عوام کے لئے مخصوص ہیں، جیسی چیزوں پر زور دیا ہے۔ اور ان ساری چیزوں کے پیچھے یہ خواہش کام کر رہی ہے کہ عوام کی زندگی کو کلچرل حیثیت سے زیادہ بامعنی بنایا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مقصد کے حصول کا لازمی پیش خیمہ یہ ہے کہ انکے معاشی معیار کو اونچا کیا جائے۔ لیکن اس وقت مجھے اس اہم مسئلہ کے متعلق کچھ نہیں کہنا۔

لیکن آپ کی اجازت سے سب نمائندوں کی خدمت میں صرف ایک آخری بات اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اب جب کہ کانفرنس ختم ہو چکی، آپ سب اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں گے جہاں اپنی ذاتی شخصیت یا سرکاری حیثیت کی وجہ سے آپ کا خاصا اثر اور اقتدار ہے۔ اب یہ آپ کا فریضہ ہے (اور میرے نزدیک اعزاز بھی) کہ آپ یونیسکو کے خیالات اپنے حلقۂ اثر میں پھیلائیں۔ ان خیالات کا بنیادی عنصر یہ احساس ہے کہ دنیا کے سارے حصے بنیادی طور پر متحد اور باہم ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ یہ احساس اپنے بچوں اور بالغوں کے دلوں میں ہر طریقے سے جاگزیں کیجئے یہاں تک کہ وہ ان کے فکر اور تخیل میں رچ بس جائے۔ وہ یہ سمجھنے اور محسوس کرنے لگیں کہ دنیا کی بہبودی ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔ اس کی طرف سے غافل ہونا اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ نسلوں پہلے کسی نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ "کیا میں اپنے بھائی کا نگہبان ہوں؟" آپ نے اس سوال کے بہت سے جواب سنے ہوں گے۔ میں اس سوال کا جواب آپ کو ایک ایسے بچے کی زبان سے دوں گا جو اپنے سے چھوٹے ایک اور بچے کو اپنی پیٹھ پر لادے ہانپتا کانپتا پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ ایک راہگیر نے ہمدردی کے لہجہ میں اس سے کہا "صاحبزادے کیا تمہیں یہ بوجھ بھاری نہیں لگتا؟" لڑکا اس سوال پر چلتے چلتے رک گیا اور حیرت سے سوال کرنے والے کا منہ دیکھ کر بولا "بوجھ؟ لیکن یہ بوجھ کب ہے یہ تو میرا بھائی ہے!" جب ہم میں بھی اس بچہ کی سی دانش مندی، فیاضی اور نیکی پیدا ہو جائے گی تو ہمیں بھی ان اندھیرے جنگلوں میں روشنی کی کرن نظر آنے لگے گی، جن میں ہم راہ بھول کر بھٹکتے پھر رہے ہیں جب تک ایسا نہ ہو ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ ہم قرآن پاک کی اس سخت تاکید کو یاد رکھیں جو اس نے ان لوگوں کو کی ہے جو عام بہبودی کیلئے، عام ذمہ داری کی طرف سے غافل ہیں اور صرف اپنے آشیانہ کیلئے تنکے اکٹھے کرنے یا اپنی کشتی کو سلامتی کے ساحل تک پہنچانے کے خیال میں مگن ہیں۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً کیا دنیا کی موجودہ صورت حال سے زیادہ کوئی اور چیز اس ابدی صداقت کی مظہر ہو سکتی ہے؟ ایک ایسی صورت حال جس سے دنیا کو نجات دلانے کیلئے یونیسکو کو بھی (دوسرے اداروں کی طرح) پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ ہم سب نے یہاں اسی نجات کلی کی طرف کچھ یقینی قدم اٹھائے ہیں۔

کسی سے

مانا کہ فصلِ گل بھی ہے، ابر بھی کیف بار ہے!
آج چمن کی ہر روش نازشِ صد نگار ہے!
جاگ اٹھیں ہیں مستیاں، زمزمۂ بہار ہے!
کیسے کہوں بہار میں سوگ بھی آشکار ہے!؟
فطرت کے دستِ ناز میں آج ہے جام بیخودی
جھوم رہے ہیں برگ و بر، وجد میں ہے کلی کلی
سبزۂ نو دمیدہ پر کھیل رہی ہے چاندنی
میرا جہانِ آرزو آج بھی سوگوار ہے!!
میری مجال یہ کہاں، آپ کو حور کہہ سکوں!
آپ کو پھول کہہ سکوں، نغمۂ و نور کہہ سکوں!
میری زباں کو تاب کب شعلۂ طور کہہ سکوں!
جرأت کہاں کہ یہ کہوں آپ پہ دل نثار ہے!!
آپ کی بزمِ ناز میں، میرا بھلا شمار کیا؟
لاکھوں ہوں مضطرب جہاں اک دلِ بیقرار کیا؟
اک دلِ بیقرار کیا، اشکوں کی جوئبار کیا؟
حسنِ جفا شعار پر کس کو کچھ اختیار ہے!!
ہے یہ کمال عاشقی نالوں میں کچھ اثر نہ ہو
میری جبیں جھکی رہے آپ کو کچھ خبر نہ ہو

شمس ضحی

غزل

اللہ اللہ شباب کا عالم ... ایسے ہے جیسے خواب کا عالم
پہلی پہلی سی ہر ادا ان کی ... سر سے پا تک شراب کا عالم
زندگی جس کو کہتی ہے دنیا ... سر بسر ہے سراب کا عالم
کاش وہ دیکھتے کبھی آ کر ... اپنے خانہ خراب کا عالم
حسن زیرِ نقاب اف توبہ ... منجمد آفتاب کا عالم
ہر طرف وہ ہی جلوہ گر ہیں ندیم ... دیدۂ کامیاب کا عالم
کیسے اظہارِ مدعا ہو شمیمؔ؟
کون دیکھے عتاب کا عالم؟

کشور شمیم

۵۵۵

افسانہ

نتھنوں کے کونوں سے لے کر ناک کی آخری حد تک جیسے گندہ نکوٹین کی تہہ جم گئی ہو۔ اس کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا ہر سانس کلوروفارم کی ایک پلیٹ کے ساتھ اس کے نتھنوں سے لے کر دماغ کی مہین شریانوں تک دھنس جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگا، میز پر مسلوں کی ڈھیر میں مدفون کھوپڑی کو کتنی ہی بار اس نے اسی کثیف دھوئیں کی موجوں سے کھنگال کھنگال کر دھویا ہے اور کتنے ہی بار دھوئیں کی ان موجوں نے گرد آلود کھوپڑی کو اتنا صاف کر دیا ہے کہ لبا اوقات اس کا ماضی کھوپڑی کی شفاف سطح پر ابھر کر جھانکنے لگا ہے ——— ایک کش اور گرد اڑ گئی ——— دوسرا کش اور نقوش ابھر گئے ——— تیسرا کش اور تصویر نمایاں ہو گئی ——— ماں کی گود سے لے کر عورت کی آغوش تک ——— کتنی ہی زہریلی سانسیں اس نے اس طویل عرصہ میں کھینچی ہیں۔ زندگی کے اس لمبے فاصلے میں اس کو صرف خلا ہی خلا نظر آیا ہے ——— عورت کی آغوش سے لے کر زمین کی گود تک کتنی ہی ایسی اور زہریلی سانسیں اس کو کھینچنی ہیں ——— اور یہ خلا شاید اس وقت تک پر نہ ہوگا ——— لیکن آج ایک ہی کش میں وہ زندگی کے اس طویل خلا کو پر کر دینا چاہتا تھا۔ ایک ہی کش میں اپنی اس مفلسی سے انتقام لینا چاہتا تھا جو اس کے باپ سے لے کر اس کے بیٹے تک کی روح پر محیط تھی ——— یہ سگریٹ کیوں اتنا پیتے ہو۔ اور مریل ہو جاؤ گے۔ قحط کے بیل کہیں کے ——— بڈھے حکیم نے حقے کا کش لیتے ہوئے کہا تھا اور اس کے پھینکے ہوئے دھوئیں کی چادر کفن بن کر اس کے اطراف پھیل گئی تھی ——— لیکن آج۔ آج ایک ہی کش میں وہ ایسی کئی دھوئیں کی چادریں اس حکیم کے اطراف پھیلا دے گا۔ ——— جیب میں چمٹے ہوئے نوٹوں کا خیال آتے ہی اس کی چھاتی دھک دھک کرنے لگی ——— لگا دوں ایک جست؟ پر کر دوں یہ سارا خلا۔ نکوٹین تو اس میں بھی ہوگی لیکن خوشبو کے ساتھ ——— زہر کی گولی پر شکر کی تہہ لپیٹ دی جائے تو زہر کہاں رہتا ہے۔ آدمی شکر کی تہہ لپیٹ کر کتنی ہی گولیاں ہڑپ کر جاتا ہے ——— لیکن کوئی چھپے ہوئے زہر کو نہیں دیکھتا سب آنکھیں بند کر لیتے ہیں ——— حکیم بیچ کہتا ہے۔ قحط کے بیل سگریٹ چھوڑ دے۔ ڈاکٹر چندر کہتا ہے فرحت اور چستی کے لئے فلاں سگریٹ پیا کیجیے۔ بڑا صاحب فلاں سگریٹ کے کش لگاتا اور موٹا ہوتا ہے۔ زہر ہم دونوں کھاتے ہیں لیکن میں کڑوی گولی نگل لیتا ہوں اور وہ شکر کی تہہ چڑھا کر۔ سطح کے نیچے جھانک کر آدمی کتنا پست ہو جاتا ہے ——— ماں کی گود سے لے کر عورت کی آغوش تک میں نے ہمیشہ سطح کے نیچے ہی کچھ تلاش کیا ہے۔ بڑا صاحب صرف سطح کے اوپر دیکھتا ہے۔ لوگ بھی اس کے اندر نہیں جھانکتے۔ فلالین اور ٹوئیڈ کے لباس کو چھید کر کوئی نگاہیں آگے نکل جانے کی قوت ہی نہیں رکھتیں۔ اور دھجیوں اور چیتھڑوں سے ہٹ کر یہی نگاہیں میرے گوشت اور ہڈیوں تک کو چھید دیتی ہیں۔ اور آج؟ ——— آج ایک ہی کش میں دھوئیں کے کئی کفن وہ ان نگاہوں کے اطراف پھیلا دے گا اور اس نے کچھ اور سوچے بغیر ایک جست لگا دی ——— ۵۵۵ کا ایک حسین ٹن اس کی گرفت میں تھا۔ اس نے محسوس کیا، دکان والے کی تیز نگاہیں اس کے گوشت اور ہڈیوں کو اسی طرح چھید رہی ہیں۔ ٹن پر اس کے پنجے کی گرفت اور بڑھ گئی۔ اس نے چاہا کہ یکبارگی یہ تمام سگریٹ دھونک دے اور دھوئیں کی اس پھیلی ہوئی چادر میں دوکان والے، بڈھے حکیم، ڈاکٹر چندر اور بڑا صاحب سب کو کفنا دے ——— اور ——— یہ کفنائے ہوئے مردے اس کے ماضی کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں کہیں پھینک دیئے جائیں ——— لمحہ بھر میں اس کے خشک ہونٹوں کے بیچ میں ایک حسین سگریٹ کپکپا رہا تھا۔ دوکان والے کی نگاہیں اور شدید ہو گئی تھیں۔ اس نے دھوئیں کا ایک ننھا سا چھلا دوکان کی طرف پھونک دیا اور شکر میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی گولی نگل لی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بڑا صاحب اس وقت کہیں سے آ دھمکے اور ——— اور وہ بڑے صاحب کو اتنی شدت سے گھورے کہ اس کی نگاہیں فلالین اور ٹوئیڈ کو چھید کر اس کی ہڈیوں میں پیوست ہو جائیں اور بڑا صاحب پریشان ہو جائے۔ اور چھپ چھپ کر دبک دبک کر کہیں غائب ہو جائے۔ جیسے وہ خود بڑے صاحب کی نوکیلی نگاہوں سے چھپ چھپ کر، دبک دبک کر ——— اور اس نے ایک لمبا کش لگا لیا ——— پاؤں خود بخود سڑک کی طرف اٹھ گئے۔

یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد کوئی دو سال تک اس کے اطراف صرف ڈگری ہی ناچتی رہی تھی۔ خالی جیب کو مٹ مٹ کر جب وہ منہ پر تشفی کر لیتا اور بس، بس اسٹانڈ سے نکل جاتی یا رکشا والا دو سواریاں مکمل کر کے روڈ پر تیرنے لگتا تو اس دوڑتی ہوئی بس اور کھسکتی ہوئی رکشا کی پشت پر اس کو بی اے کی ڈگریاں چپکی ہوئی نظر آتیں ——— اس دو سال کے طویل عرصہ میں اس نے اپنی ڈگری کو بیسیوں مقامات پر سایہ کی طرح چمٹے ہوئے دیکھا تھا ——— پہلے پہل تو یہ ڈگری پی۔ ڈی۔ سی کے اطراف ہی ناچا کرتی تھی۔ لیکن اس کے بہت جلد بعد ہی سکریٹریٹ، تعمیرات، اور آبکاری کے دفاتر سے لے کر اس کے تنگ و تاریک مکان تک ہزاروں ڈگریاں اس کے اطراف قہقہے لگاتی ہوئی ناچنے لگی تھیں ——— اور اب ——— اب دھوئیں کی کثیف موجوں میں ہی یہ ڈگری ہلکورے لیتی ہوئی کبھی کبھار ابھر جاتی تو وہ ایک اور ریلا اس پر بہا کر اسے غرق کر دیتا۔

لیکن آج ——— آج اسے پہلی تنخواہ ملی تھی۔ دس دس کے ایک نہیں دو نہیں تین نوٹ اس کے سینے سے چمٹے ہوئے تھے۔ دھوئیں کی موجوں میں بی اے کی ڈگری ابھرتی تو آج وہ اس کو غرق

بیگم سلیم

کردینے کی کوشش نہ کرتا۔ آج ڈگری اس پر استہزا نہیں کر رہی تھی، وہ ڈگری پر مسکرا رہا تھا۔ بس اسٹانڈ پر کھڑی ہوئی بس، سواریوں کے لئے چیختا ہوا رکشا والا سب اس کو اپنے تابع نظر آرہے تھے۔ آج وہ اپنی مفلسی سے خوب انتقام لینا چاہتا تھا۔ ۵۵۵ کے ٹن کو کچھ ذرا آگے کی طرف کر کے وہ بس میں سوار ہو گیا۔ بس دوڑنے لگی۔ ٹن سے ایک سگریٹ نکال کر اس نے ہونٹوں کی بجائے باچھوں میں داب لیا۔ سگریٹ کے لکھے ہوئے حصے کو نمایاں کرتے ہوئے اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اس کو محسوس ہوا کہ آج یہ نگاہیں اس کے گوشت اور ہڈیوں کو نہ چھید سکیں گی بلکہ ۵۵۵ کے ٹن ہی پر جم کر رہ جائیں گی ——— کہاں جاؤ گے۔ اور اس نے آواز اور نگاہوں کی تیروں سے بچنے کے لئے ۵۵۵ کے ٹن کی ڈھال کو کچھ آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ———

جہاں تک تمہاری بس جائے۔

سگریٹ کے ٹن کو گھورتے ہوئے کنڈکٹر نے ایک ٹکٹ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

صرف سکندرآباد تک ———

——— پلازا ——— کون کھیل چل رہا ہے ؟ ———

(Bathing Beauty)

جناب۔ "جناب" اس نے محسوس کیا جیسے وہ بڑا صاحب ہو گیا ہے۔ یونیورسٹی کی باونڈری سے نکلتے وقت ہی اس نے جناب اور مسٹر کے سارے القاب وہیں چھوڑ دئے تھے۔ اس کے بعد سے آج تک اس کو کسی نے جناب یا مسٹر نہیں کہا تھا لیکن آج ۔ آج کوئی ہاتھ جوڑے ہوئے اسے جناب کہہ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم اب تو اسکا بڑا صاحب یہاں آجائے ۔ یا ۔ یا وہ بڈھا حکیم یا وہ ڈاکٹر چندریا اور کوئی بھی نہیں تو وہ دکان والا ہی ———

بہت مزے دار کھیل ہے حضور (Esther Williams) کام کر رہی ہے مچھلی ہے مچھلی ——— وہ سوچنے لگا۔ کون جانے کون بلا ہے یہ اونہہ ہو گی کوئی بندر کی بچی۔ ڈاروین کی نامکمل تھیوری۔ لیکن اس نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ بارہا اس کو دیکھ چکا ہے۔ ایک سگریٹ پھر اس کی باچھوں میں لرزنے لگا ——— سینما ہال میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنے ملاقاتی کو کن انکھیوں سے دیکھا جو گیٹ پر کھڑا ہوا اس کو تاک رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ آج واقعی وہ بڑا صاحب ہے اور چند ملتجی نگاہیں اسکا بھی تعاقب کر سکتی ہیں ہڈیوں

کی طرح اس کے گوشت اور ہڈیوں میں پیوست ہونے والی کتنی نگاہیں آج چاندی کے نرم نرم تار بن کر اس کے اطراف بکھر رہی تھیں۔ اور آج وہ ہر چاندی کے جال میں پھنس جانے کے لئے تیار تھا۔

——— پردے چھوٹ رہے تھے۔ ہال بالکل تاریک ہو گیا تھا۔ پچھلی دیوار سے پردے کو گھورتی ہوئی تیز شعاعیں اسکرین کو اس طرح روشن کئے ہوئے تھیں جیسے اس کے ماضی کے گھٹاٹوپ اندھیارے کو آج کا دن ——— اُجالا چاروں طرف پھیل گیا۔ پردے اُٹھ گئے پنکھے رک گئے اور وہ ہیروئن کو دماغ میں محفوظ کئے ہوئے باہر نکل آیا۔ حوض کے نیلے پانی میں پہیہ کی طرح گھومتے ہوئے پریوں کے گول حلقے کے بیچ سے تھرک تھرک کر تڑپ تڑپ کر اِدھر اُدھر نکلنے والی کچی چاندی سے بنی ہوئی

(Esther Williams)

اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔

پسند آیا سرکار ——— اس کا نیا ملاقاتی ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

بہت پسند آئی ——— آئی!!

——— ملاقاتی نے دبی زبان میں "آئی" کو دُہرا دیا۔

ہاں ہاں بہت پسند آئی ——— میں نے تو پھر دیکھنے ——— اور اس نے لجاتے ہوئے بات کاٹ دی۔ ہوں، ھی ھی ھی ——— میں سمجھا یعنی جناب کو وہ ——— وہ پسند آگئی۔ مگر یعنی۔ یعنی کہ کیا حقیقت ہے اس کی صاحب۔ پانی بھرے گی پانی۔

پانی بھرے گی ؟ ہاں ہاں پانی بھرے گی صاحب ڈبہ ہے ڈبہ، ڈالڈا ونا سپتی کا ڈبہ ہے فقط۔ ——— ہی ہی ہی ارے میاں کیا کہتے ہو آخر ——— جھوٹ نہیں کہتا مسٹر۔ اٹھارہ برس کی ہو گی بس۔ اور کیا کہوں جیسے، جیسے ——— جیسے سمجھ لیجیے کہ دودھ پیڑی ہو پنڈلیاں اور اور۔ ہی ہی۔

اوہ! تو یہ بات ہے۔ یوں کیوں نہ کہہ دیا۔

ہاں ہاں واقعی یوں کیوں نہ ——— یونہی تو کہہ رہا تھا جناب۔

——— سوچ رہے ہیں؟ کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں، بہت کم دیجئے، بس ایک نوٹ دس کا۔ ہی ہی ہی۔

کیا زیادہ ہے یہ ——— روپیہ بھی زیادہ نہیں اسکے لئے تو۔ ہی ہی جینے کی

غزل

دل پہ جو گزری کوئی کیا جانے
یہ تو ہم جانیں یا خدا جانے

خاک جھیلے گا وہ مصیبتِ عشق
ابتدا کو جو انتہا جانے

کیا کہوں اس سے اپنے دل کی لگی
جو لگا کر نہ پھر بجھا جانے

بادہ نوشوں کا حشر کیا ہو گا
مجھ بلانوش کی بلا جانے

کیا کہے عرضِ مدعا وہ بشر
جو تمہیں اپنا مدعا جانے

تو ہی اپنا مقام جانتا ہے
اک ظلوم و جہول کیا جانے

دل کو کل تک تو چین حاصل تھا
آج کیا ہو گیا خدا جانے

بات رندی کی مجھ کو آتی ہے
پارسائی کی پارسا جانے

ناتوانی پہ زندگی ہے گراں
مار ڈالا نفس کی آ۔ جا۔ نے

تجھ کو اپنی خبر نہیں اے جوش
تو خدائی کا راز کیا جانے

جوش ملسیانی

گرٹو باہے خالص - ایک نظر بس ایک ذرا - ورنہ منہ پر تھوک دیتے ہیں صاحب -

دھڑکتے ہوئے سینے سے چمٹی ہوئی نوٹوں کو انگلیوں کی پوروں سے چھوتے ہوئے وہ سوچنے لگا - کیوں نہ ڈوب کر دیکھوں اس ڈالڈا وناسپتی کے ڈبے میں — کیوں نہ میری نگاہیں، میری انگلیاں بھی کسی کے گوشت اور ہڈیوں کو چھید کر نکل جائیں - جب یہ نوٹ - یہ کاغذ کے پرزے مجھ پر ہنس سکتے ہیں تو میں ان پر کیوں نہیں ہنس سکتا - لیکن چمٹائے ہوئے ہوں اپنے سینے سے جیسے ان کے بغیر جی ہی نہ سکوں گا ——— بس اسٹانڈ سے لے کر سینما ہال تک، سینما ہال سے لے کر جمیس اسٹریٹ تک آج سوئیوں کی طرح جسم کو چھیدنے والی تمام نگاہیں چاندی کے "تاروں کی طرح میرے قدموں پر بکھر رہی ہیں ——— کاغذ کے پرزوں کو سینے سے چمٹائے رکھو - سوئیاں نرم تار بن کر راستے میں بچھ جائیں گی - کاغذ کے پرزوں کی تلاش میں بی اے کی ڈگری کو کشکول بنائے رکھو - نرم تار سوئیاں بن کر ہڈیوں میں دھنس جائینگے - جیسے میں کچھ بھی نہیں ہوں - جو کچھ ہیں یہ کاغذ کے پرزے ہی تو ہیں ——— میری کوئی شخصیت ہی نہیں - انفرادیت ہی نہیں - وجود ہی نہیں ہستی ہی نہیں ——— کچھ بھی نہیں ہوں میں — نوٹ اس کے کلیجے کو ڈسنے لگے - اس نے محسوس کیا جیسے ۵۵۵ کاسٹن انگارے کی طرح اس کی ہتیلی کو جھلس رہا ہے ——— باچھوں سے ہٹ کر ہونٹوں میں ایک سگریٹ کانپا - دہوئیں کی چادر ہوا میں پھیلی - اس نے محسوس کیا جیسے یہ کفن صرف اسی کے لئے ہے ——— اور — اور بڈھا حکیم - بڑا صاب دو کان والا جیسے اس پر قہقہے مار رہے ہوں ——— وہ جھنجلا اٹھا - ذلیل کہیں کا ہاتھ جوڑتا ہے — "جناب" — اور کل کہاں مرگیا تھا یہ جناب کا بچہ" — وہ چاہتا تھا کہ اس نئے ملاقاتی کے منہ پر ایک تھپٹر رسید کردے — بس اسٹانڈ سے لے کر جمیس اسٹریٹ تک چاندی کے تار بکھیرنے والی ہر آنکھ کو پانوں تلے کچل دے ——— بڑے صاب کے منہ پر تھپٹر - نئے ملاقاتی کے منہ پر تھپٹر - سماج کے منہ پر تھپٹر - زندگی کے منہ پر تھپٹر - اور ——— اور ڈالڈا وناسپتی کے ڈبے کے منہ پر تھپٹر ——— اور وہ کہیں ڈوب مرے -

کیا بک رہے ہو - چلے جاؤ یہاں سے نکل جاؤ ——— دور ہو جاؤ میری نظروں سے ——— ہی ہی ہی -

اور اس نے محسوس کیا جیسے اسکا باپ ہنس رہا ہے - ماں ہنس رہی ہے - دبلی تپلی مریل بہن ہنس رہی ہے — منہ چڑا رہی ہے - ہی ہی ہی -

۵۵۵ کاسٹن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا - سگریٹ زمین پر بکھر گئے اور وہ پھر اپنے ماضی کے گھٹ ٹوپ اندھیارے میں جھانکنے لگا -

اعلان

دفتر رسالہ آجکل میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں - اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں - (ادارہ)

اولاد

رشید احمد صدیقی

سب سے پہلی بات جو میں اپنے بارے میں عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ والدین ہونا میری تقدیر ہے میری ذات نہیں۔ اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ اولاد کے بارے میں ایک صاحب اولاد کے اظہار خیال کو کس حد تک جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ قرار دیں گے اور اس میں نفسیات یا نفسانیت کے کون کون سے پہلو دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا ماہر نہیں ہوں۔ اور کیا عجب آپ میری اس کوتاہی سے فائدہ اٹھا کر میری باتوں کا کچھ ایسا مطلب نکالیں اور اس مطلب کی کچھ اس طرح تشہیر کریں کہ اولاد کی پوری قوم مجھ سے بدظن ہوجائے اور آپ تو جانتے ہیں نفظ قوم کے ساتھ بدظنی کچھ اس طرح پر مدغم ہے کہ قوم کی ڈیفنیشن یا تو اب صرف اتنی اور یہ رہ گئی ہے کہ وہ جو بدظن ہو۔ ضمناً لیکن حلفاً یہ بھی عرض کروں گا کہ بدظن میں اردو املے کی اصلاح میں نے مد نظر نہیں رکھی ہے۔

جن دو امور کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے یعنی نفسیات اور نفسانیت ان کا عجیب دستور ہے۔ ان کے پردے میں یا ان کے بہانے کسی بات سے کوئی مطلب نکالا جاسکتا ہے مثلاً اگر میں یہ کہوں کہ اولاد نالائق ہوتی ہے تو آپ یہ نتیجہ نکالیں گے کہ میں خود اپنے والدین کی نالائق اولاد میں ہوں اور یہ کہوں کہ اولاد لائق ہوتی ہے اور والدین کو ہنساتی ہے تو آپ بڑے وثوق وخلوص سے کہدیں گے کہ میرے خاندان کی ستر ویں یا ایک سو ستر ویں پیڑھی میں کوئی مرد معقول بھی گذرا ہے جس کے چہرے کی ہڈی فلاں عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ اور یہ کہوں کہ اولاد لائق ہوتی ہے اور نالائق بھی یعنی ہنساتی بھی ہے اور رلاتی بھی ہے تو آپ کہیں گے کہ یہی تو ہم بھی کہتے ہیں۔ اس کا جواب میرے پاس اس کے سوا کوئی نہیں کہ میں دل مسوس کر رہ جاوٴں اور دبی زبان سے یہ کہدوں کہ آپ کس سے کم ہیں۔ آپ متعجب نہ ہوں مطلب نکالنے کا یہ طریقہ بہت عام ہے۔ اور ادھر کچھ عرصہ سے ادب میں بھی اسے بڑا فروغ ہورہا ہے۔ شاید آپ کو معلوم ہو اور یہ میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو یقیناً نہ معلوم ہوگا کہ ادبی اصطلاح میں اسے تنقید کہنے لگے ہیں۔ اس فن میں مہارت کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ تنقید کرنے والا خود بھی کہاں تک ہنستا ہے اور دوسرے روتے ہیں یا خود روتا ہے اور دوسرے تالیاں بجاتے ہیں۔ اس بوالعجبی کو ایک مصرعہ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے۔

لیکن میرے ماہر نفسیات نہ ہونے سے آپ بددل نہ ہوں۔ اس اظہار واقعہ کو آپ میری خاکساری پر محمول نہ فرمانا چاہیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ جس موضوع پر مجھے آپ سے گفتگو کرنی ہے وہ ہے کچھ ایسا کہ اس میں فن کے لحاظ سے جو جتنا ماہر ہوتا ہے۔ ذاتی تجربہ کے معاملہ میں اتنا ہی بے بس ثابت ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے اولاد کو خدا کی دین بھی کہتے ہیں اور ہنسنے اور رونے دو مواقع کو اس سے یوں متعلق کر رکھا ہے کہ اولاد پر ہنستے اور خوش ہوتے ہیں اور اس کے حال پر روتے رلاتے ہیں۔ اولاد کا خدا کی دین ہونا والدین کی سمجھ میں اس وقت ذرا زیادہ آنے لگتا ہے جب اولاد اس دین میں اپنی طرف سے لین کا تعلق بڑھا لیتی ہے۔ اور جب اس لین دین کا سلسلہ دور تک پہنچتا ہے تو اکثر والدین کے ذہن میں یہ بات بھی آنے لگتی ہے کہ اگر اولاد خدا کی دین ہے تو والدین خدا کے کون ہیں۔ اسی لئے میں اس موضوع سے کتراتا ہوں۔ اور براہ راست اولاد کے بارے میں گفتگو کرنے کے بجائے خیر وعافیت دونوں کی اسی میں سمجھتا ہوں کہ والدین ہی زیر بحث رہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہندوستانی تعریف کرنے کے لئے دوسری قوموں کو اور برا بھلا کہنے کے لئے اپنی قوم کو منتخب کرتا ہے۔ خاص طور سے ایسے نازک وقت میں جبکہ اولاد اور والدین دونوں اپنی اپنی الگ الگ قومیت منوانے پر مصر ہوں کیا ہوا جو سننے والی برادری میں اولاد اور والدین کا جو تناسب ہے وہ خطرہ میں پڑ گیا یا کچھ اور نہیں تو جوانوں کی سعادتمندی میری دانائی کو میری کمزوری ہی سمجھ بیٹھی۔ یہ دونوں صورتیں خطرناک ہیں۔ اور جب انسان خطروں میں گھرا ہو تو محض خطرے کی گھنٹی بجاتے رہنے سے بہتر ہے کہ یا تو انھیں خاطر میں لانے سے یکسر انکار کردے یا خود خطرہ بن جائے۔ لیکن خطروں کا ذکر یا اعلان وہ بھی ریڈیو پر شاید آپ کو پسند نہ آئے۔ اور شاید ہی نہیں بلکہ یقیناً ریڈیو والے بھی اس کے متحمل نہ ہوں گے۔ اس لئے میں ایک محفوظ سی بات عرض کروں گا اور بات کے محفوظ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس بات کے لئے آپ کو حفاظت خود اختیاری کو کام میں نہ لانا پڑے۔ یہ بھی مراد ہوسکتی ہے کہ وہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے تو آپ کچھ نہ کرسکیں اور سمجھ میں نہ آئے تو سب کچھ کر ڈالیں۔ وہ بات یہ ہے کہ دنیا میں سب سے انوکھی وہی قوم ہے جس کا ذکر ہوچکا ہے اور جس کے افراد والدین کہلاتے ہیں۔ یہ قوم دنیا کے ہر حصہ میں ملتی ہے۔ ہر جگہ اس کی حیثیت یکساں ہے۔ وہی جو انسانوں میں خدا کی ہے۔ مصیبت پڑی تو اللہ اللہ ورنہ لاحول ولا۔ اس قوم کی اکثر خصوصیات عام طور پر مشترک ہیں مثلاً یہ کہ ان میں سے ہر ایک خواہ کتنا ہی افلاطون زمانہ کیوں نہ ہو لیکن اس میں ان کی بڑی آسانی سے بیوقوف بنائے جانے کی صلاحیت دیکھ لیتی ہے یا پیدا کرلیتی ہے۔ اور جہاں اس میں کامیاب نہیں ہوتی وہاں ان کو خبطی یا بوڑھا فاذل (esmoog) کا لقب دے کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ شاید ہی کوئی قوم ہو جو فریب کھانے اور زیادہ سے زیادہ وقت تک فریب میں مبتلا رہے پر اسی طرح اور اتنی خوشی سے آمادہ رہتی ہو جتنی کہ والدین کی قوم۔

یہی نہیں بلکہ لطف اس وقت آتا ہے جب اپنی اپنی اولاد کے فریب میں مبتلا والدین اس فریب کو اپنا اپنا کارنامہ بنا کر ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے ہیں اور بھید کو خاطر میں نہیں لاتے کہ اولاد اپنے والدین کا کارنامہ ہوں یا نہیں والدین اپنی اولاد کا کارنامہ ضرور ہوتے ہیں۔ اولاد پیدا کرنا والدین کا فعل طبعی ہوتا ہے اور والدین کو دوست رکھنا اولاد کا فعل اخلاقی۔ یہاں اخلاق سے مراد اکثر اولاد کا وہ اخلاق ہوتا ہے جو والدین کے اخلاق کی خبر لیتا رہتا ہے۔ میں مذہبی باتوں کا عالم نہیں ہوں لیکن مجھے مذہبی روایات سے بڑی دلچسپی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو نہ ان روایات سے بیر ہوگا نہ مجھے اس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جو روایات میں آپ کو سناؤں گا ان کو آپ صحیح یا دلچسپ پائیں تو میری تعریف دوسروں سے کریں اور غلط اور غیر دلچسپ پائیں تو صرف مجھے آگاہ کر دیں اولاد یا والدین کا یہ شیوہ ہو یا نہیں شریفوں کا یہی شیوہ ہے۔ ایک روایت تو یہ بیان کی جاتی ہے کہ اولاد کی کثرت والدین کے لئے باعث مغفرت ہے۔ جس کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اولاد کی زیادہ تعداد مغفرت کی دعا کرے گی تو والدین کی بخشائش ہو جائے گی۔ اس کی توجیہہ بعض اعصابی مرض میں مبتلا والدین یہ بھی کرتے ہیں کہ یہ اولاد کی دعائے مغفرت نہیں ہے۔ بلکہ والدین کے ساتھ ان کا حسن سلوک ہے جو ان کی بخشائش کا موجب ہوتا ہے۔

دوسری روایت ہے اگر پچھلے جنم میں آپ نے کسی پر مظالم توڑے تھے اور وہ آپ سے بدلہ نہ لے سکا تھا تو کسی نہ کسی جنم میں عورت یا اولاد کی شکل میں نمودار ہوگا اور آپ سے ایسی کسر لے گا کہ وہ سب کچھ کرے گا آپ کچھ نہ کر سکیں گے۔ یہ دونوں روایتیں بظاہر مختلف معلوم ہوتی ہیں لیکن ان سے ایک بات ثابت ہے وہ یہ کہ آپ کی نجات اولاد ہی سے وابستہ ہے۔ رہا یہ کہ اولاد کی نجات کس سے وابستہ ہے وہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ بعض والدین کبھی اپنی اولاد کے لئے کچھ کم عذاب نہیں ہوتے۔

میں ظالم اور خود غرض والدین کو کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھتا جو اپنی اولاد کو رلاتے ہیں۔ میرے نزدیک اولاد کا والدین کو رلانا اتنا برا نہیں ہے جتنا والدین کا اپنی اولاد کو رلانا۔ اس لئے کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اولاد کو وجود میں لانے کی ذمہ داری والدین پر ہے۔ اس لئے والدین کا فرض ہے کہ وہ جس ہستی کو زندگی کے بھنور میں لا ڈالنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے لئے سختیاں جھیلیں نہ یہ کہ اس کو مصیبتوں میں پھنسائیں یا پھنسنے دیں! بذات خود میں اولاد سے بالکل مساویانہ حیثیت سے نپٹنا پسند کرتا ہوں یعنی عاقل اور بالغ ہونے پر اولاد ابتدا ہی سے یہ فیصلہ کرے بحیثیت ایک فرد آزاد کے کون کسی کی خدمت خلوص سے بجا لاتا ہے

خدمت اور خیر اندیشی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو کسی کے سمجھ میں نہ آئیں یا جن کا مفہوم کہیں اور ہو اور کہیں اور۔ ان کا کوئی معاوضہ نہیں لیکن ان کا احترام نہ کرنا انسانیت سے گذر جانا ہے جو انسانوں میں سب سے گھٹیا بات سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان میں آپ ایسے بہت سے بزرگوں سے واقف ہوں گے (میرے اور آپ کے علاوہ) جن کی نہ خوشی اپنی نہ غم اپنا ان کے رنج و راحت کا انحصار ان بے شمار بچوں کے اوپر ہوتا ہے جن میں ہر عمر اور قد و قامت کے نمونے شامل ہوتے ہیں۔ جن کو یکے بعد دیگرے ایک قطار میں کھڑا کر دیا جائے تو اہرام مصر کے زینے نہ سہی ایک خاص قسم کی شاعری کے مصرع ضرور معلوم ہونے لگیں گے۔ اس ہجوم میں بزرگ محض ذوا ضعاف اقل بنے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر والدین ہونے کا فخر یا فریب اس مرتبہ کی تلافی کر دیتا ہے۔ ان کو ان سب بچوں کے سلسلے وار نام نہ بھی یاد ہوں لیکن ان کی تعداد ازبر ہوگی۔ اس تعداد کا ذکر یہ ہچشمیوں میں اس طرح کریں گے گویا یہ ان "زمینوں" کو آسمان سے توڑ کر لائے ہیں۔ جہاں اولاد اتنی اور ایسی ہو وہاں کے حادثات اور ہنگاموں کا پوچھنا کیا! اور یہ حضرت جیسا کہ ایک اور بہت بڑے حضرت کہہ گئے ہیں ان ہنگاموں ہی کو "گھر کی رونق" سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کوئی طول ہے تو ان کو فکر ہے کہ دنیا کس آشوب میں مبتلا ہونے والی ہے۔ کوئی قہقہے مار رہا ہے تو یہ پریشان کہ ضرور اس نے ہمسایہ کی مرغی چرائی ہوگی۔ کوئی انفلوئنزا یا ٹائیفائڈ کی تواضع میں لگا ہوا ہے تو اس کے لئے پھل دوائیں اور کھلونے فراہم کرنے کی فکر میں ہیں۔ کوئی گھر سے باہر پردیس میں علم کی پیاس بجھا رہا ہے تو گھر کی یاد میں اس کے حسرت بھرے خطوط چلے آ رہے ہیں جو کسی مشتبہ کارنامے سے شروع ہو کر کسی یقینی فرمائش پر ختم ہوتا ہے۔ کوئی زندگی اور زمانہ سے بیزار ہو کر دونوں کو خیر باد کہنے کے منصوبے باندھ رہا ہے تو کسی کو یہ شکایت کہ خدا کو انھیں پیدا کرنے پر اتنا اصرار ہی تھا تو والدین کے انتخاب میں خود ان کی رائے لے لی ہوتی مثلاً خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟ — نعروں، فرمائشوں، منصوبوں اور شکایتوں کے اس ناگھ میلا میں ایک طرف سے ہنستی کھیلتی دھوم مچاتی بچی نے آکر ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں تو سارے غم ڈھل گئے اور کسی ٹوتھ پیسٹ یا پاؤڈر کا اشتہار نظر آنے لگے۔

اولاد کے ہنسانے یا رلانے کے عمل سے واقف ہونے کے لئے اس امر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اولاد یا والدین ہمارے معاشرہ کے کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں بالعموم یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جو والدین جتنے کھاتے پیتے اور ذی اقتدار ہوتے ہیں اتنی ہی ان کی اولاد نالائق یا نامعقول ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مفلوک الحال

والدین کی اولاد اکثر سعادتمند اور وفاشعار ہوتی ہے۔ دولت و اقتدار کا بڑا خطرہ یہ ہے کہ احتیاج جو انسان کو انسان سے ربط دیتی ہے اور ایک دوسرے قریب اور متوازن رکھتی ہے وہ باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولتمند اور ذی اقتدار کی اولاد۔ بیوی۔ دوست سبب کے سبب کسی نہ کسی حد تک اس سے مشتبہ رہتے ہیں اور ظاہر ہے کوئی شخص جو کسی سے مشتبہ ہو اس کو ہنسانے کی فکر نہ کرے گا۔ انتقاماً رلانے پر آمادہ ہو جائے تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔

دوسری طرف حاجتمند کی اولاد ہوتی ہے جو اپنی بے مایہ والدین سے محبت نہ بھی کرے تو بھی اس سے مشتبہ نہیں ہو سکتی۔ دونوں زندگی کو قائم رکھنے اور مبارک بنانے کے لئے ریاضت کرتے ہیں۔ یہ ریاضت ان کے جسم و جان سے برائی اور بدمی کے فضلوں کو طرح طرح سے دور کرتی رہتی ہے اور اس طرح جسم و جان کو تازہ اور توانا رکھتی ہے اور اولاد و والدین دونوں کو ایک دوسرے کا انعام بنا دیتی ہے۔

میں جو کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ والدین کو اولاد کی طرف سے جو خوشی اولاد کے بچپن میں میسر آجاتی ہے وہ والدین کے لئے کافی ہوتی ہے سیانے ہونے پر اولاد کی توجہ بھی ہٹ جاتی ہے اور ذمہ داری بھی بڑھ جاتی ہے۔ شاید والدین کے مطالبہ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے تعلقات اتنے خوشگوار یا ہموار نہیں رہتے جتنا کہ والدین چاہتے ہیں۔ مگر اولاد کی بچپن کی معصومانہ سرگرمیوں کا عمل و ردّعمل والدین کی فخر و بہر خوشی کا موجب ہوتا ہی وہ والدین کے لئے تمام عمر کو کافی ہوتا ہے۔ یہ والدین کی زیادتی ہے کہ وہ دم واپسین تک اولاد سے اسی قسم کی خوشی دیکھنا پانا چاہتے ہیں۔

اولاد کب ہنساتی ہے اور کب رلاتی ہے۔ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے لمحوں کا راز ہے جب زندگی کے سائے گہرے ہو کر مستقبل کے مدھم غیر واضح ورق پر امید و حسرت کے عجیب و غریب نقوش بکھیرنے لگتے ہیں۔ ایسے نقوش جن کے سانچے میں صدیاں نسلیں بن جاتی ہیں اور وقت کی کبھی اور کہیں نہ ختم ہونے والی پہنائی ان آنے والی نسلوں کو ایک ایسے تار کی طرح پروئی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کا ایک سرا ہماری اپنی ذات ہوتی ہے اور دوسرا ابد سے ہمکنار! شباب کی منزل سے گذر کر کبھی نہ پورے ہونے والے حوصلوں کی جھلاتی شمع کے لئے اولاد کا یہ تصور ایک فانوس بن جاتا ہے جس سے مستقبل کا دھندلکا دیر تک تابناک اور پر امید نظر آتا ہے۔

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

ضروری:— ان حضرات سے جو اپنے اخبارات و رسائل میں "آجکل" کے مضامین حوالے اور اطلاع کے بغیر نقل کر لیتے ہیں درخواست ہے کہ مضمون نقل کرنے کے بعد وہ ہمیں مطلع فرما دیا کریں ــــ (ادارہ)

غزل

متین مچھلی شہری

جلوۂ حسن یار پر میری پڑی نظر کہاں
بے خودیٔ نظارہ میں اس کی مجھے خبر کہاں

درخورِ دیدِ حسن ہے عشق شکستہ پر کہاں
دیکھنے کی طرح پڑی ان پہ مری نظر کہاں

رہروِ راہِ عشق کو ہوتی ہے یہ خبر کہاں
رات کہاں گذر گئی، اور ہوئی سحر کہاں

عالم بے خودی ہے اور محویتِ خیال ہے
ان کی خبر نہیں ہے جب اپنی مجھے خبر کہاں

سجدۂ نقشِ پا کا ہے شوق سرِ نیاز کو
کاش بتا دے خضرِ شوق ہے تری رہگذر کہاں

دیکھئے جس طرف اُدھر جلوۂ حسن آشکار
ایسے ہجوم میں اسے ڈھونڈ سکے نظر کہاں

عالم بیخودی مرا، دونوں جہاں سے ہو جدا
پائے گا کیا کوئی پتا، اب ہے یہ بیخبر کہاں

دیکھی ہیں میں نے ہر طرف اسکی تجلیاں مگر
جلوۂ طورِ دل کہاں، جلوۂ رہگذر کہاں

پردے سے اور شوقِ دید اہل نظارہ کا بڑھا
پردے سے بڑھ کے حسن کا ہے کوئی پردہ در کہاں

فیضِ تصورات سے پھول بھی ہیں چمن بھی ہے
کنج قفس نہیں، پھر غم بال و پر کہاں

بے خودِ عشق کی خودی طرفہ کرشمہ ساز ہے
ہوش جسے کچھ آگیا، اپنی اسے خبر کہاں

کعبہ و دیر سے غرض تیرے نیاز مند کو
چھوڑ کے تیرا آستاں جائے اِدھر اُدھر کہاں

جس نے کیا ہے دل میں گھر آہ وہ شوخ اور ہے
قابلِ خلوتِ جمال، جلوۂ رہگذر کہاں

میرا خیال تھا کہ ہے حسن مجاز کی طرف
چشمِ حقیقت آشنا جا کے پڑی نگر کہاں

درخورِ سیر تھا کہ ہے وسعتِ صحنِ بوستاں
کنج قفس کو چھوڑ کر جائے یہ مشت پر کہاں

یہ بھی مجھے نہیں امید صبح ہے اسکی صبحِ حشر
میری شبِ فراق کی ہوتی ہے اب سحر کہاں

نئی کوشش — موج علیگ

رات نے دہشتِ ظلمات کا اگلا ہے زہر
روشنی اپنا کفن اوڑھے ہوئے سوتی ہے
درد ہی درد میں ڈوبے ہوئے غم خانے میں
زندگی اپنی شکستوں پہ لہو روتی ہے

زخم گہرے ہی سہی، پاؤں میں زنجیر سہی
زیرِ افلاک ستم سہنے ہیں جینا ہے مجھے
اپنی تقدیر کے الزام سے آنکھوں کا لہو
آج پیتا ہوں اور آئندہ بھی پینا ہے مجھے

مجھ کو اٹھنا ہے کئی بار ابھی پستی سے
نامرادی مرے جذبات کی قیمت تو نہیں
عبرتیں راہ بنی جاتی ہیں امیدوں کی
عشق افسردہ سہی، عشق ہلاکت تو نہیں

قافلے بڑھنے لگے اپنی منازل کی طرف
میں بھی بیمار ارادوں کو توانا کر لوں
زندگی بہتی ہے بہتی ہی رہے گی شاید
میں بھی رگ رگ میں وہی برق کی لہریں بھر لوں

زیرِ افلاک ستم سہنے ہیں جینا ہے مجھے

غزل — قدیر لکھنوی

عاشق کے دل سے درد کی لذّت نہ پوچھئے
کتنی لطیف شے ہے محبّت نہ پوچھئے

جیسے حیات و موت کی مخلوط چاشنی
لمحاتِ انتظار کی لذّت نہ پوچھئے

کلمہ نفس نفس پہ ہے سجدہ قدم قدم
پابندیٔ نمازِ محبّت نہ پوچھئے

بے اختیار پھر کوئی یاد آگیا مجھے
اب عالمِ خیال کی وسعت نہ پوچھئے

کچھ کہہ کے ہم خموش ہیں کچھ سن کے وہ خموش
تفصیلِ داستانِ محبّت نہ پوچھئے

میری نظر سے آپ اگر مطمئن نہیں
خود آئینے سے اپنی حقیقت نہ پوچھئے!

وہ اشکِ خوں جو زینتِ دامانِ یار ہو
اس لعلِ شب چراغ کی قیمت نہ پوچھئے

غنچہ نے ہنس کے چاکِ گریباں کیا ہے جب
شبنم کو جو ہوئی ہے ندامت نہ پوچھئے

چہرہ عرق عرق ہے نگاہیں جھکی جھکی
اندازِ اعترافِ محبّت نہ پوچھئے

مرکز ہیں حسن و عشق کے دیر و حرم قدیرؔ
کیا ہے مجاز کیا ہے حقیقت نہ پوچھئے

غزل — شاد عارفی

یہ جگمگاتے ہوئے ستارے۔ یہ پھول جو مسکرا رہے ہیں
اِدھر سے شرما کے جا رہے ہیں اُدھر سے اٹھلا کے آ رہے ہیں
یہاں کھڑے مسکرا رہے ہیں وہاں کھڑے مسکرا رہے ہیں
وہی نتیجہ کہ جس سے میں ابتدائے الفت میں کانپتا تھا
سحر کے چھٹتے ہوئے اندھیرے یہ جو بھی تمثیل دل کو بھائے
غمِ جدائی نہ چھپ سکے گا رہی جو یہ مختلف بیانی
محبت اور ترکِ شرکتِ بزمِ حسن مہمل سا ادّعا تھا
نقاب کی جنبشوں سے پیدا ہیں جلوہ ہائے "حجابِ دشمن"
ہم ان کو کھو کر نہ پا سکے ہیں نہ کوئی پانے کا آسرا ہے
ترنّمِ صبحِ گلستاں پر۔ ذرا تصوّر ملاحظہ ہو
ہمیں جو اے شادؔ پیش آتے ہیں روزِ دنیائے آرزو میں

ابھی مصیبت نہیں پڑی ہے فریبِ آغاز کھا رہے ہیں
زہے تقاضائے دلربائی مجھے محبّت سکھا رہے ہیں
یہ ہوش کس کو ہے؟ لبھا رہے ہیں کہ دل پہ بجلی گرا رہے ہیں
یہ الجھنیں ہیں کہ آج وہ بھی اسی نتیجے پہ آ رہے ہیں
وہ اپنے چہرے سے رفتہ رفتہ سیاہ چادر اٹھا رہے ہیں
کسی کو میں کچھ بتا رہا ہوں، کسی کو وہ کچھ بتا رہے ہیں
یہ اس بھروسے نے بات رکھ لی کہ ہم "کسی" کو "ستا رہے ہیں
شباب کے ولولوں میں ڈوبی ہوئی ادائیں لٹا رہے ہیں
مشاہدہ میں یہ آ رہا ہے جو کھو رہے ہیں وہ پا رہے ہیں
" وہ زیرِ رخسار ہاتھ رکھے مری غزل گنگنا رہے ہیں
تمہیں کبھی وہ واقعات پر لطف جستہ جستہ سنا رہے ہیں

روسی سائنسد

۸ جنوری ۱۹۴۷ء کو انڈین
کانگریس کی مجلس استقبالیه نے
کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے
غیر ملکی نمائندوں کو امپریل ہو
دھلی میں چائے کی دعوت پر مدعو
جس میں لارڈ اور لیڈی ویول کے
عارضی حکومت کے اراکین نے بھی
کی۔ تصویر میں بائیں طرف سے آ
سردار عبدالرب نشتر' پروفیسر ای
پاولوفسکی (روسی سائنس اکیڈیمی
نمائندے) آنریبل پنڈت جواهرلال
اور مسز همفریز تشریف فرما ہیں۔

دس هزار سال پرانی قبر میں

امریکه کے صوبۂ پیرو میں 'ویرو' نامی وادی کے
قریب کولمبیا یونیورسٹی کے محققین نے ایک ایسی قبر
کا کھوج لگایا ہے جو تقریباً ایک هزار سال پرانی ہے
قیاس لگایا گیا ہے که اسمیں ایک کاھن کی لاش دفن کیگئی تھی
جو اپنے آپکو 'آئی پائس'
دیوتا کا اوتار بتاتا تھا۔
قبر میں لاش کے علاوہ اور
بھی بہت سی چیزیں رکھی
گئی تھیں۔ تصویر ملاحظه
هو۔ بائیں طرف تونبے کے
بنے هوئے چند کشکول
پڑے هیں۔ بیچ میں پروں
کی بنی هوئی ٹوپی ہے اور
دائیں طرف شراب کی
صراحیاں جنکو کھوپری کی
وضع پر بنایا جاتا تھا۔ بیچ
میں دو 'عصے' بھی پڑے
هیں جنکے دستوں کی نقاشی
قابل تعریف ہے۔ ان میں سے ایک کی موٹھ پر ا
شکل ہے اور دوسری پر انسان کی صورت۔ اس تحق
سہرا ڈاکٹر ڈبلیو ڈی اسٹرونگ کے سر ہے (یه
'لندن نیوز' سے لی گئی ہے۔)

مستقبل ایران کے ماہرین تعمیرات

طلبا کیمیا کی لیبوریٹری میں خورد بین سے بعض نمونوں کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔

ٹکنیکل کالج کے طبیعات کے دارالتجربے میں روشنی کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک ادق آلے سے کام لیا جا رہا ہے۔

ایک استاد اپنے شاگردوں کا خاکہ کشی کا کام دیکھ رہا ہے۔

ایران کچھ سال سے برابر صنعتی ترقی کر رہا ہے۔ تمام ملک مین ٹکنیکل کالج اور سکول کھول دئے گئے ہیں۔ ان میں ٹکنیکل ٹریننگ کالج۔ فائن آرٹس ٹکنیکل کالج۔ زنانہ ٹکنیکل سکول کانوں کے سروے کرنے اور لوہے سے فولاد بنانے والے کارخانے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں کی بدولت ماہرین فن کا ہر سال اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ٹکنیکل ٹریننگ کالج میں الیکٹریکل۔ مکنیکل۔ مائننگ اور کیمیکل انجینرنگ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طہران انڈسٹریل انسٹی ٹیوٹ میں بڑھئی اور لوہار کا کام سکھاتے ہیں۔ فائن آرٹس انسٹی ٹیوٹ میں فائن آرٹ اور زنانہ ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں سینا پرونا اور ہیٹ بنانا سکھاتے ہیں۔

صنوعی سمندر
کی ته میں

شہر فلوریڈا کے « میرین اسٹوڈیو » نامی
ِن گھر » میں بہت سے آبی جانوروں کی
پرورش کا خاص اہتمام کیا جاتا ھے - اس
ِن گھر » کو دنیا کا سب سے بڑا مصنوعی
سمندر کہا جاسکتا ھے - لڑائی کے دنوں میں
ے بند کردیا تھا لیکن اب پھر کام جاری
وگیا ھے - بڑے بڑے ٹینکوں میں دیو پیکر
ارکوں کے علاوہ ھر قسم کی چھوٹی بڑی
چھلیوں کے نمونے جمع ھیں جن کو موکھوں
یں سے جھانک کر دیکھا جاسکتا ھے - بالکل
مندری نظام کی طرح ھر مچھلی اپنے

وجود کو قایم رکھنے کے لئے جد و جہد کرتی ھے - اس « بن گھر » کا اصل مقصد سائنس تحقیقات تھا لیکن ھزاروں شوقین اسے دیکھنے کے لئے روزانہ آتے ھیں - حال ھی میں « رے » نامی ایک بہت بڑی مچھلی اس میں اتاری گئی ھے جس کے لئے پچیس آدمیوں کی اور ایک جر ثقیل کی ضرورت پڑی تھی - اس سے قبل اتنے بڑے قد و قامت کی مچھلی کو قید کرکے کہیں نہیں رکھا گیا تھا - گرم خون، سانس لینے اور دودھ پلانے والی مچھلیوں کو « بن گھر » کے ملازم دو ھفتے میں اسطرح سدھالیتے ھیں کہ وہ انکے ھاتھ سے چارہ کھانے لگتی ھیں - بعض مچھلیاں دل لگی کی عادی ھوجاتی ھیں - وہ ربڑ کی ان رنگین گیندوں کو جنہیں پانی کی سطح پر ڈالدیا جاتا ھے منہ میں پکڑ کر ته میں لے جاتی اور وھاں سے چھوڑ کر ان کے پیچھے لپکتی ھیں - کبھی کبھی وہ ان ڈھائی ڈھائی من کے کچھووں کو ستانے لگتی ھیں جو مصنوعی چٹانوں کے پاس بوڑھے فلسفیوں کی طرح خاموش بیٹھے رہتے ھیں . (یہ تصاویر « لندن نیوز » سے لی گئی ھیں).

« چارہ کھلانے کے وقت کا ایک منظر - مچھلیوں ، کچھووں اور دوسرے جانوروں نے اپنے « ان داتا » کو گھیر رکھا ھے

غوطے خور ایک پانچسو پونڈ وزنی مچھلی کو چارہ کھلا رہا ھے چھوٹا رشک کی نگاھوں سے دیکھ رھا ھے

دنیا کے سب سے بڑے « بن گھر » میں سطح سے گیارہ فٹ نیچے ایک عجیب و غریب گول مول مچھلی کو چھوٹی قسم کی مچھلیاں کھلائی جارھی ھیں !

پانچ فٹ لمبی شارک مچھلی ایک غوطہ خور کے پاس سے گذر رھی ھے جسنے اپنی حفاظت کے لئے ایک خاص قسم کا لباس پہن رکھا ھے

غالب سے متعلق چند یادگاریں

اس صفحہ پر آپ کو پانچ تصویریں نظر آتی ہیں جن کا تعلق غالب کے سفر حیات کی کسی نہ کسی منزل سے ہے۔ جوں جوں زمانہ گذر رہا ہے وہ یادگاریں کم ہوتی جارہی ہیں جن سے غالب کا شخصی تعلق رہا ہے۔ اس لحاظ سے ان پانچوں تصویروں کی حیثیت ادبی تبرّکات کی سی ہے۔ داہنے صفحہ پر اوپر کی طرف گلی قاسم جان کی تصویر ہے۔ اس گلی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے صفحہ ۱۳ سے شروع ہونے والے مضمون میں آیا ہے۔ لوہارو والوں کی جس حویلی کا تذکرہ اس مضمون میں ہے اسکا پھاٹک گلی کے اس سرے پر ہے جدھر سے یہ تصویر لی گئی ہے۔ سامنے جہاں گلی تنگ ہوتی نظر آتی ہے وہاں داہنے ہاتھ کی طرف غالب کا مردانہ مکان اور اس کے تقریباً سامنے زنانخانہ تھا۔ غالب کے دیوانخانہ کا بیرونی پھاٹک اور ڈیوڑھی اب تک قائم ہے۔ گلی قاسم جان کی تصویر کے نیچے اسی پھاٹک اور

ڈیوڑھی کی تصویر ہے جس میں اندر کے صحن کی جھلک بھی نظر آرہی ہے۔

غالب کے دیوانخانہ کی پشت پر حکیم محمد شریف خان مرحوم کی مسجد اچھی حالت میں اب بھی موجود ہے۔ اس مسجد کا ذکر غالب نے اپنے اس مشہور شعر میں کیا ہے۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

مسجد بالائی منزل پر ہے۔ اس کی تصویر بائیں صفحے کی بڑی تصویر کے ایک کونہ میں نظر آرہی ہے۔ یہ بڑی تصویر غالب کی قبر کی ہے۔ اسکی لوح پر میر مہدی مجروح کا کہا ہوا قطعہ ہے جس سے غالب کی وفات کی تاریخ نکلتی ہے۔ اس تصویر کے اوپر درگاہ حضرت نظام الدین اولیا سے ملحق قبروں کے اس احاطے کی تصویر ہے جس میں مرزا غالب دفن ہیں۔ غالب کی قبر وہ ہے جس کے سرہانے مدیر آجکل اور پروفیسر حمید احمد خاں کھڑے ہیں۔
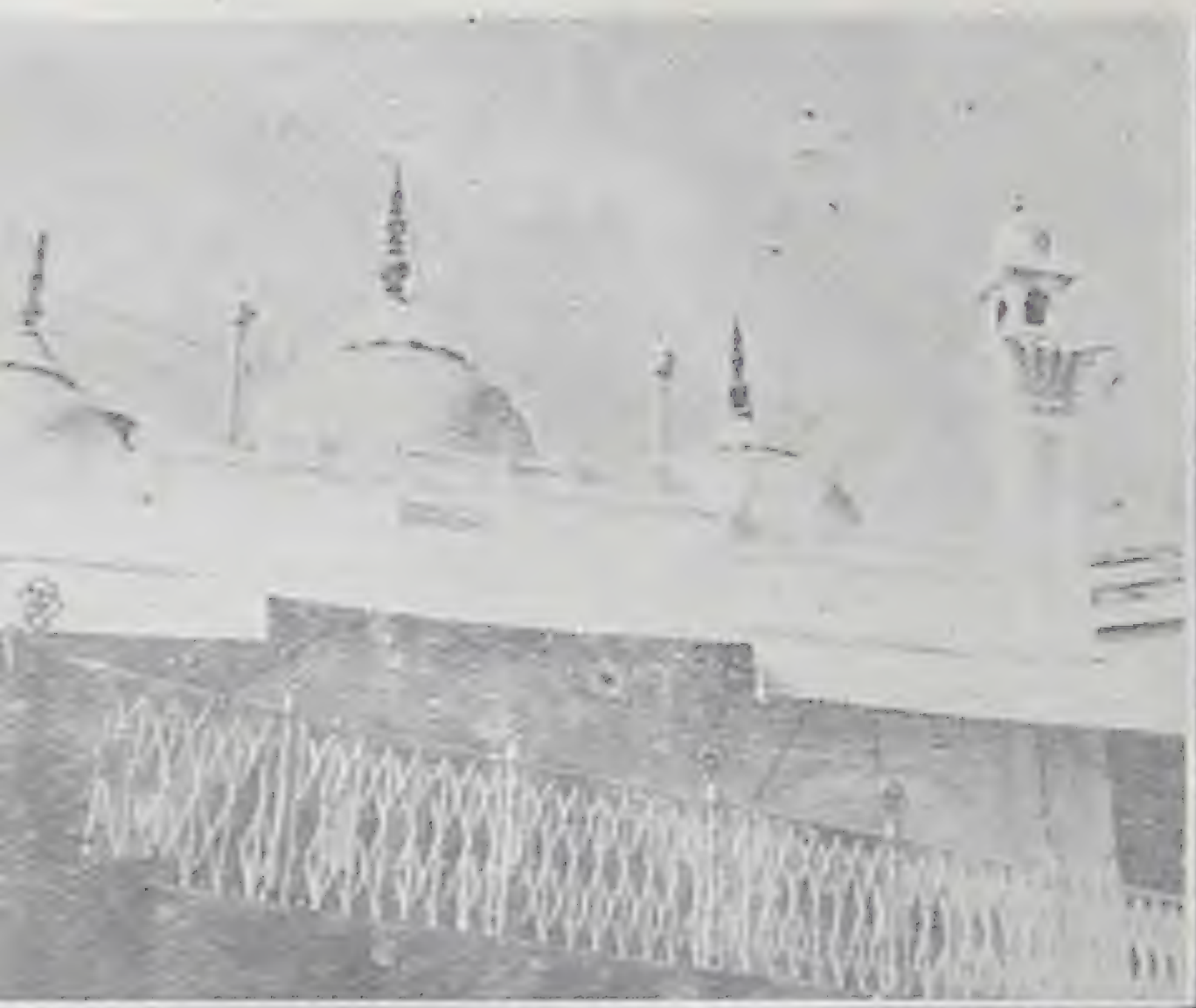
باربادوس
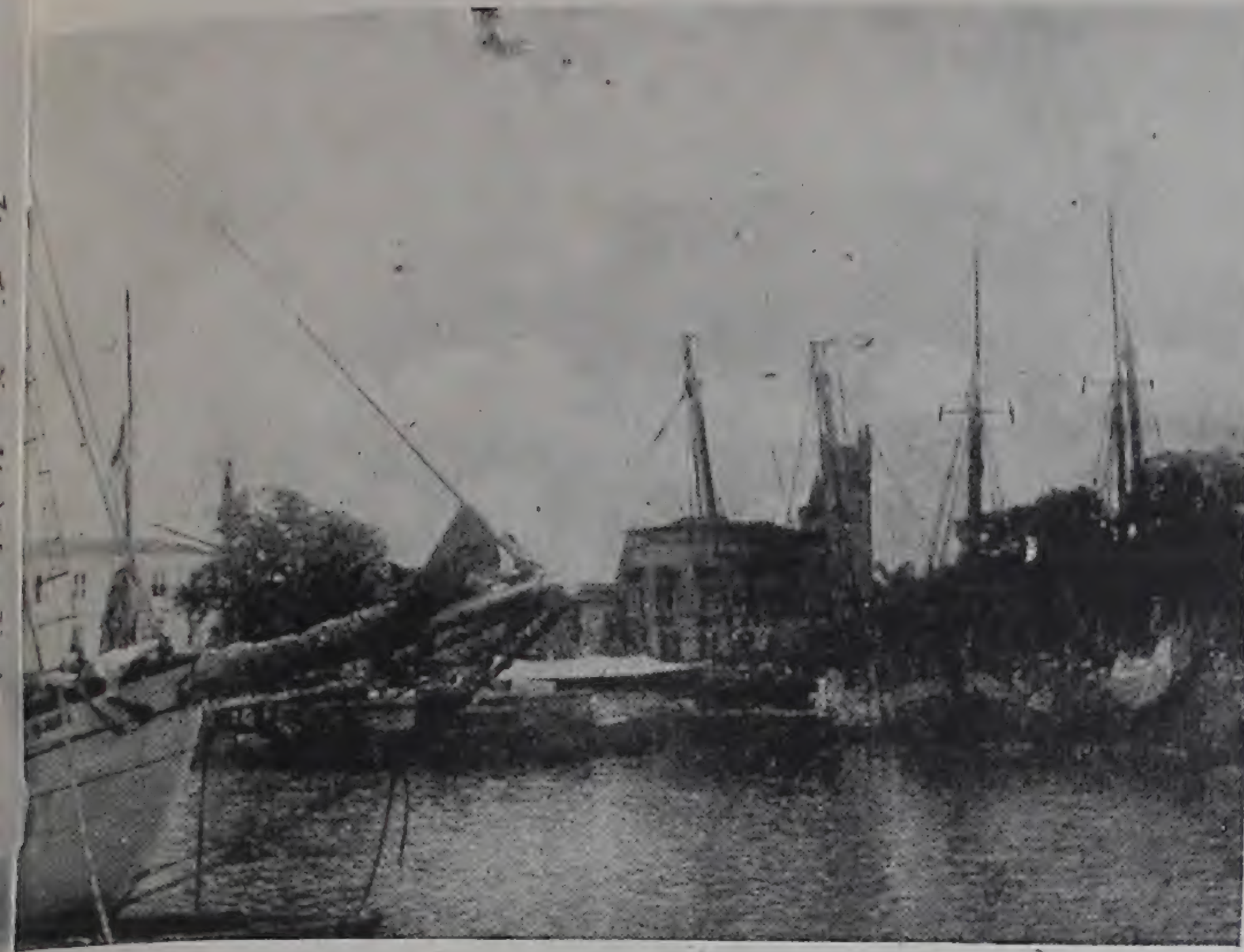
برج ٹاؤن کی بندرگاہ پر جزائر غرب الہند کے تمام حصوں کے جہاز آکر ٹھیرتے ہیں۔ وہاں کی ظاہری حالت انگلستان کی ہر چھوٹی سی بندرگاہ سے ملتی جلتی ہے۔

برج ٹاؤن میں براڈ اسٹریٹ کاروبار کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اس بازار میں ہمیشہ بڑی گہما گہمی رہتی ہے۔

مجمع جزائر غرب الہند میں بالکل مشرقی سرے پر باربادوس ایک ایسا جزیرہ ہے جس میں رہ کر برطانیہ والوں کے دلوں میں اپنے وطن کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے اسے جزائر غرب الہند کا «چھوٹا انگلستان» کہتے ہیں۔ ان تصاویر پر سرسری نظر ڈالنے سے مناظر قدرت کے علاوہ جزیرہ کے عام محل وقوع کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ خصوصا اسکا مشہور شہر برج ٹاؤن انگلستان کا نمونہ معلوم ہوتا ہے۔ کولمبس نے سب سے پہلے اسی جزیرے کو دریافت کیا تھا۔ اس کا رقبہ ۱۶۶ مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ڈھائی لاکھ ہے۔

اس مختصر سے جزیرہ پر درختوں کے جھنڈ میں یہ دلفریب منظر انگلستان کے جنگلوں جیسا لطف پیدا کردیتا ہے۔ ←

'بغالا' کشتی پہلی بار پانی میں

« بغل » کے لفظی معنی عربی میں مادۂ خچر کے ہیں۔ عربوں نے شروع شروع میں اپنی کشتیوں کو یہ نام دیا کہ ہزاروں برس پہلے سمندروں میں انہیں پر سفر اختیار کیا۔ اسطرح کی کشتیوں میں ۲۰۰ ٹن سے زیادہ وزن لادا جاسکتا ہے۔ خلیج فارس اور عرب کے تقریباً سارے خاص خاص بندرگاہوں میں یہ کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں جب جہازوں کی بہت کمی تھی ان کشتیوں نے عدن اور جنوبی افریقہ کے درمیان سامان اور مسافر لانے لیجانے کا

بغالا کشتی کا سکان۔ موٹی رسیوں کو دیکھئے ج
کو پانی میں اتارتے وقت سہارے رکھتی ہیں۔ ش
لوگ کشتی کو تنقیدی نظر سے دیکھ رہے ہ

———:o:———

کام بڑی خوبی سے انجام دیا۔ یہ کشتیاں عرب میں ہوکر ہندوستان آتی ہیں اور یہا
چاء سن اور لکڑی لاد کر خلیج فارس او
کے بندرگاہوں تک پہنچاتی ہیں۔

ایک نئی کشتی جسے جھنڈوں اور تاڑ کی شاخوں سے سجا رکھا ہے

———:o:———

کشتی کو سیدھا رکھنے کیلئے آڑ لگا رکھی ہے۔ جزر کے وقت یہ آڑ کشتی کو سنبھالے رکھتی ہے۔

نرگس

مصنفہ
ظہور بخش

ہم پرشیڈنٹ ہیں

مترجمہ
آغا محمد یعقوب دوانی

سیٹھ دھنامل پڑھے لکھے تو واجبی ہی تھے پر تھے اندھوں میں کانے راجا۔ جو قسمت اور دولت نے زور مارا تو سینی ٹیشن کمیٹی کے ممبر ہی نہیں پریزیڈنٹ بن بیٹھے۔ پھر کیا تھا قصبے بھر میں ان کا طوطی بولنے لگے۔ وہ جہاں نکل جاتے، بھونچال سا آجاتا، بچے کھیل کود بھول کر ادھر اُدھر بھاگ جاتے، راستے چلتی عورتیں گھونگھٹ میں سمٹ کر فٹ پاتھ میں دبک رہتیں اور لوگ سر جھکا جھکا کر سلامی داغنے لگتے۔ مگر سیٹھ جی ڈانٹ پھٹکار کا سوٹا بہاتے، بکتے جھکتے آگے قدم بڑھاتے جاتے۔ اس طرح گھر پہنچتے پہنچتے نہ جانے کتنے لوگوں پر ظاہر کر دیتے: ”تم نے ہمیں کیا سمجھا ہے۔ یاد رکھو ہم پرشیڈنٹ ہیں پرشیڈنٹ، لالائی کہیں کے!“

حکومت کی اس جھونک میں سیٹھ جی کبھی کبھی سینی ٹیشن کمیٹی کے سکرٹری پنڈت رام سکھ پچولی پر بری طرح برس پڑتے تھے: ”آخر تم ہو کس مرض کی دوا؟ اب تمہیں کتنی بار سمجھایا جاوے کہ ہم پرشیڈنٹ ہیں۔ قانون کی کس کتاب میں لکھا ہے کہ سکرٹری ہمیشہ پرشیڈنٹ کے حکم پر ٹال مٹول کیا کرے؟ ہم تو رحمدل آدمی ہیں یہ نہیں چاہتے کہ کسی کو نقصان پہنچے۔ اسی لئے غم کھا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر تم ہو کہ اپنی حرکتوں سے باز ہی نہیں آتے۔ جانتے ہو کہ ہمارے قلم میں کتنی طاقت ہے؟ ہم پرشیڈنٹ ہیں کوئی ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں۔ جس دن بڑے صاحب کے پاس رپٹ لکھ کر بھیجیں گے اس دن آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

پچولی جی اصل میں ہندی مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہ تنخواہ تو بہت معمولی پاتے تھے مگر تھے بڑے زندہ دل اور خوش مزاج۔ دن بھر خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسایا کرتے تھے۔ اس لئے قصبے کے سبھی فرقوں میں بڑی ریجھ بوجھ تھی۔ سکرٹری شپ تو ان کے لئے محض ندی ناؤ سنیوگ کی بات تھی۔ پھر بھی وہ سیٹھ جی کے ساتھ کسی طرح کی بحث میں نہیں پڑتے تھے ان کے رعب کو اپنی میٹھی ہنسی میں اڑا دیا کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھی اتنا ضرور کہہ دیا کرتے تھے ”آپ رعب گانٹھتے ہیں میں ڈر جاتا ہوں۔ اگر یہی حال رہا تو کسی دن سکرٹری شپ سے ہاتھ جوڑ لوں گا۔“

مگر سیٹھ جی یوں ماننے والے آدمی نہ تھے۔ انھوں نے دو چار بار پچولی جی کی عرض سننے کے بعد صاف صاف کہہ ڈالا: ”سکٹر جی یہ مجھے کسی ہوتوف کو دیا کرو۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ ہمارے سامنے تمہارا یہ رنگ نہ چلے گا۔ سکٹر جی کام کرتے ہو تو پانچ روپیہ مہینہ الاؤنس بھی پاتے ہو۔ آخر تمہیں تنخواہ ملتی کتنی ہے؟ پندرہ روپلی یا اور کچھ؟ سو ماسٹر جی، پانچ روپے سے ہاتھ جوڑ لینا تمہارے بوتے کی بات نہیں۔ غرض ہو تو ہزار بار ہمارا رعب سہو، ورنہ لاؤ استعفیٰ پیش کرو۔ ہمیں باون گنڈے سکٹر مل جائیں گے۔ یہ درجہ اور یہ الاونس پانے کے لئے تمہارے ہی نائب ماشٹر ہماری جوتیوں پر دس دس بار ناک رگڑ دیں گے۔ سمجھے؟“

”جی ہاں سمجھ گیا۔ میں تو غریب آدمی ہوں۔ خدمت میں عرضی پیش کرنا میرا کام ہے۔ اس پر غور کریں یا نہ کریں یہ آپ کی مرضی ہے۔“ اتنا کہتے کہتے پچولی جی خاموش ہو گئے۔

”اب آئے ماشٹر جی تم راستے پر۔ ہم مالک ہیں تم نوکر۔ ہم رعب گانٹھیں تم بنا کان پونچھ ہلائے رعب سہو۔ بس یہی قاعدے کی بات ہے۔ دیکھنا تو کچھ دنوں میں کیا ہوتا ہے۔ اگر تمام قصبے کو کچل کر نہ رکھ دوں تو ہم سیٹھ دھنامل نہیں۔ نہیں پرشیڈنٹ ہی کیسے؟“ کہتے کہتے سیٹھ جی بڑے رعب کے ساتھ اپنی لمبی مونچھیں اینٹھنے لگے۔

ایک دن کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ قریباً ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ حال ہی کی آئی ہوئی ڈاک میز پر پڑی تھی اور پچولی جی پوسٹ کارڈ لفافے، پیکٹ وغیرہ چھانٹ چھانٹ کر سلسلے سے رکھتے جاتے تھے اتنے میں سیٹھ جی بھی وہاں آ پہونچے اور لگے زوروں سے دن دنانے: ”کیا ہو رہا ہے ماشٹر جی؟ ارے تم تو ڈاک دیکھ رہے ہو۔ کچھ ہمارے نام پر بھی آیا ہے؟“

پچولی جی نے ایک میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ ان کی طرف کرسی بڑھاتے ہوئے کہا: ”میں خود ہی آپ کو بلانے والا تھا۔ واقعی آپ بڑے اچھے موقعہ پر آئے۔ تشریف رکھئے۔“

”کیوں، بات کیا ہے؟“ سیٹھ جی نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے سوال کیا۔

”بس یہی سمجھ لیجئے کہ پانچوں گھی میں ہیں اور سر کڑھائی میں مگر پہلے منہ میٹھا کروا دیجئے۔“ پچولی جی نے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

”منہ میٹھا کروانا کون بڑی بات ہے مٹھائی سے پاٹ دیں گے ماشٹر جی۔ ذرا سناؤ تو سہی کیا ہمیں کہیں کا راج مل گیا ہے؟“ مسکرا کر سیٹھ جی نے پوچھا۔

”یہ دیکھئے۔“ کہتے ہوئے پچولی جی نے ایک لفافہ سیٹھ جی کی طرف بڑھا دیا۔

”ارے یہ تو انگریزی میں ہے۔ بھلا ہم انگریزی وِنگریزی کیا جانیں۔

اگر معلوم ہو تو اس کا مطلب سمجھا دو۔" سیٹھ جی نے لفافہ کے اندر رکھا ہوا کاغذ نکالا اور اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ بڑے صاحب کا پروانہ ہے۔ انھوں نے خوش ہو کر آپ کو کئی بڑے بڑے اختیارات دئے ہیں۔" پچولی جی نے ذرا خوشی کے لہجے میں بتلایا۔

"ایں۔ بڑے صاحب نے ہمیں بڑے بڑے اختیارات دئے ہیں؟ ذرا اچھی طرح پڑھ کر سمجھاؤ، ماسٹر جی۔ یہ لو اپنا انعام" یہ کہتے کہتے سیٹھ جی کا چہرہ کھل اٹھا اور انھوں نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر پچولی جی کی طرف بڑھا دیا۔

"واہ اس کی کیا ضرورت ہے"، کہہ کر پچولی جی نے نوٹ اپنی جیب میں ڈالا اور سیٹھ جی کے ہاتھ سے لفافہ لے کر پڑھنا شروع کیا۔

مسٹر دھنا مل سیٹھ۔

آپ نے اب تک سینی ٹیشن کمیٹی کا کام بہت اچھی طرح چلایا ہے۔ اس لئے ہم نہایت خوش ہیں اور آپ کو نیچے لکھے اختیار دیتے ہیں۔

(۱) آپ اپنے قصبے کے کسی آدمی پر جرمانہ کر سکتے ہیں مگر جرمانے کی رقم دو سو روپے سے زیادہ نہ ہو۔

(۲) آپ اپنے قصبے کا کوئی بھی مکان بے دھڑک گروا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بغیر آپ کی مرضی کے بنوایا گیا ہو۔

(۳) آپ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو جیل بھیج سکتے ہیں مگر سزا کی میعاد چھ ماہ سے زیادہ نہ ہو۔

(۴) اوپر لکھے ہوئے اختیار آپ جب چاہیں سینی ٹیشن کمیٹی کے سکرٹری کی صلاح سے عمل میں لا سکتے ہیں۔

(دہر)

جی۔ ایم۔ بھرٹھریا۔ ڈپٹی کمشنر

یہ سنتے ہی سیٹھ جی اچھل پڑے۔ پچولی جی بولے: "سچ کہئے، کتنی بڑھیا خبر ہے۔ ایسے اختیارات آج تک شاید ہی کسی ہندوستانی کو ملے ہوں۔"

"دھن بھاگ، ہم تو تر گئے ماسٹر جی۔ بھگوان کرے بڑے صاحب جگ جگ جئیں۔ دودھوں نہائیں پوتوں پھلیں۔ اگر ان کی ایسی ہی مہربانی بنی رہی تو کیوں ماسٹر جی کسی دن ہمیں پھانسی دینے کا اختیار بھی مل جائیگا۔"

"اگر آپ اسی طرح سینی ٹیشن کمیٹی کا کام چلاتے رہیں تو میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سال تین مہینے کے اندر پھانسی کی سزا کا اختیار بھی مل جائے گا۔ مگر ایک بات ہے۔ آئندہ قصبے میں جو سرکاری افسر آئیں ان کی خاطر تواضع دل کھول کر کیا کیجیے گا۔ آپ تو خود جانتے ہیں کہ روٹی کا ٹکڑا پانے سے کتا بھی خوش ہو جاتا ہے، پھر سرکاری آفیسر تو آدمی ٹھیرے۔ اگر آپ ان کی خاطر تواضع کریں گے تو وہ کیوں نہ خوش ہوں گے۔ جہاں انھوں نے ضلع صاحب سے آپ کی سفارش کی تہاں آپ پھانسی دینے کا اختیار ملا ہی سمجھئے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ آئندہ اس معاملے پر ہم خاص طور سے خیال رکھینگے۔ ہاں ماسٹر جی، کیا ضلع صاحب نے ہمیں 'مسٹر' کا خطاب بھی دیا ہے؟"

"اور نہیں تو کیا؟ یہ دیکھئے۔ صاف تو لکھا ہے۔ ایم۔ آئی۔ ایس۔ ٹی۔ آر۔ مسٹر۔ اب تو ہوا آپ کو بھروسہ؟"

"آہا! تب تو بڑے صاحب سچ مچ بھلے آدمی ہیں۔ اچھا دیکھو ماسٹر جی، اب ہمیں آئندہ 'مسٹر سیٹھ' ہی کہا کرو۔ سمجھے؟ ہاں ایک بات اور بتلاؤ۔ اب ہم مسٹر ہو چکے ہیں، اتنے بڑے بڑے اختیار پا چکے ہیں۔ اس لئے کچھ جلسہ ولسہ بھی ہونا چاہیے۔ بہ داہ نہیں ہزاروں ہی پھنک جائیں مگر دھوم دھام ایسی رہے کہ لوگ واہ واہ کر اٹھیں۔ بولو کیا کہنا ہے تمہیں؟"

"کہنا کیا ہے؟ کل سویرے ہی ڈھنڈورا پٹوا دیجئے۔ جس سے لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ کو کونسا خطاب ملا ہے۔ کون کون سے اختیار ملے ہیں۔ اس کے بعد علاقے کے اور قصبے کے خاص خاص لوگوں کو ٹھسے دار دعوتیں دیجئے۔ شہر سے چار پانچ طوائفیں بلوا لیجئے۔ روز شام کو آتشبازی ہو تو اور بھی اچھا۔ پھر تمام رات ناچ مجرے میں گذرے۔"

"کیوں نہ ہو، ماسٹر ہی تو ٹھیرے۔ تم نے صلاح کیا دی ہمارے من کی بات کہہ دی۔ سچ مانو ہم ایسا ہی کریں گے۔ اچھا لاؤ یہ پروانہ ہمیں دیدو۔ اب چلیں طوائفیں بلوائیں اور آتشبازی منگانے کا کچھ انتظام کریں۔" یہ کہتے کہتے سیٹھ جی کھڑے ہو گئے۔

"پروانہ تو آپ کو نہیں مل سکتا۔ یہ سرکاری کاغذ ہے۔ دفتر کے فائل میں رہے گا۔ آپ اس پر دستخط کر دیجئے۔" پچولی جی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" کہہ کر سیٹھ جی نے کاغذ پر دستخط کر دئے۔

اس کے بعد وہ باہر نکلے اور جھومتے جھامتے آگے بڑھے۔ مگر راستے میں جو ملتا اسی کو دیکھ کر رک جاتے اور کہنے لگتے: "بھیا ہماری تپسیا سدھ ہو گئی۔ پریسیڈنٹ تو ہم تھے ہی، اب مسٹر بھی ہو گئے ہیں۔ چاہے جس پر جرمانہ ٹھوک دیں، چاہے جسے بڑے گھر کی ہوا کھانے بھیج دیں۔ چاہے جس کا گھر گروا دیں۔ آج ہی تو ضلع صاحب کا پروانہ آیا ہے۔ اب بجے گا قصبے بھر میں ہمارا ڈنکا۔ آس پاس کے رہنے والوں کو بھی یہ خبر سنا دینا۔ سویرے تو ہم ڈھنڈورا پٹوا ہی دیں گے۔ جلسے بھی سات دن تک ہوں گے۔ آتشبازی ہوگی۔ رنڈیوں کا ناچ ہوگا۔ کھانا پینا ہوگا۔ تم بھی آنا۔ تماشا دیکھنا۔ بھلا؟"

دھوم دھام سے فرصت ملی تو سیٹھ جی کا وہی حال ہوا کہ ایک تو کریلا دوسرا نیم چڑھا۔ وہ اب سینی ٹیشن کمیٹی کے چپراسی کو ساتھ لیتے اور بلاناغہ صبح و شام قصبے کا چکر لگانے نکل پڑتے۔ جہاں چار آدمی بیٹھے پاتے

وہیں ٹھہر جاتے اور بڑبڑانے لگتے: "ایں! یہ پنچایت کس کے حکم سے ہو رہی ہے؟ ہم پریشیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں، چاہیں تو تم پر جرمانہ ٹھونک دیں، تمہیں جیل بھیجدیں، تمہارے گھر دھول میں ملوا دیں۔ خبردار جواب ہم سے حکم لئے بغیر کسی طرح کا جماؤ کیا۔ بنا سینگ کے گدھے۔ بے وقوف۔ پاجی کہیں کے!"

جہاں کہیں چار بچے کھیلتے نظر آتے وہیں رک جاتے اور چپراسی کو حکم دیتے: "ابے الو کے پٹھے! ان بنا دم کے بندروں کو سمجھا کہ سرکاری سڑک پر اودھم مچانا قانون کے خلاف ہے۔ سو بھی منسٹر سیٹھ کی عملداری ہیں۔ وہ پریشیڈنٹ ہیں، چاہیں تو تمہیں جیل بھجوا دیں اور تمہارے گھر کھدوا کر پھینک دیں۔ کسی پر جرمانہ ٹھونک دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے...... ابے جا، انکو سمجھا جلدی کر۔ نہیں تو ہم تجھے ہی جیل بھیجتے ہیں۔"

اگر کسی غریب کے دروازے پر کوڑا کرکٹ پڑا دیکھتے، تو آپے سے باہر ہو جاتے اسے بلا کر خوب ڈانٹ پھٹکار دکھاتے: "تجھے معلوم ہے ہم کون ہیں، تو جانتا ہے ہمیں کتنے بڑے بڑے اختیار حاصل ہیں؟ سن ہم پریشیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں۔ چاہیں تو کسی کو بھی جرمانہ کر دیں، کسی کو بھی جیل بھیجدیں اور کسی کا بھی گھر مٹی میں ملوا دیں۔ اگر کبھی کوڑا کچرا دکھائی دیا تو ہم ایکدم تیرا گھر ہی پھنکوا دیں گے، سمجھا؟"

اس طرح سب لوگوں پر سیٹھ جی کا رعب غالب ہو گیا۔ وہ آپس میں ملتے جلتے اور گپ شپ کرتے بھی خوف کھاتے کہ کہیں سیٹھ جی نہ آ پہنچیں۔ مگر سیٹھ جی کی حکومت کی پیاس اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لئے بےچین رہتے اور بات بات میں چڑا اٹھتے تھے۔ نوکروں چاکروں اور بال بچوں پر بگڑ پڑتے یہاں تک کہ ہاتھ چلا بیٹھتے تھے۔ ایک دن انھوں نے بچولی جی سے کہا: "اختیار ملے پورا ایک ماہ ہونے کو آیا مگر ہم نے نہ کسی پر جرمانہ کیا، نہ کسی کو جیل بھیجا، نہ کسی کا گھر گروا دیا۔ بڑے صاحب کیا کہتے ہوں گے کہ ہم نے بھی کس نکھٹو کو اختیار دئے۔ تم تو کوئی صلاح مشورہ دیتے ہی نہیں۔"

"منسٹر سیٹھ، اختیار عمل میں لانا نہ لانا تو آپ کی مرضی پر ہے۔ میں تو آپ کے حکم کا تابعدار ہوں۔ صلاح مشورہ دینے سے میں نے کب انکار کیا ہے؟ کسی پر جرمانہ ٹھونکئے، کسی کو جیل بھیجئے، نہ ہو کسی کا گھر ہی گروا دیجئے۔ اگر آپ یوں خاموش بیٹھے رہیں گے تو کسی دن بڑے صاحب تمام اختیار چھین لیں گے۔"

"یہی تو ہم سوچتے ہیں۔ ہمارا منشا یہ ہے کہ پہلے کسی کو جیل بھیجنا چاہئے۔ پھر تو تمام قصبہ کانپ اٹھے گا اور بڑے بڑے افسروں کو معلوم ہو جائے گا کہ منسٹر سیٹھ نے بھی کسی کو سزا دی ہے۔ بولو کیا رائے ہے تمہاری؟"

"سوچا تو آپ نے اچھا ہے۔ ہے کوئی مجرم آپکی نظر میں؟"

"ہے کیوں نہیں سینی ٹیشن کا یہ چپراسی۔ بدمعاش۔ کام چور بے ایمان جنگی۔ ہم پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں، جنگی نے کوئی قصور کیا ہے کیا؟"

"قصور؟ قصور تو اس نے بہت بڑا کیا ہے۔ کیا تم حکم عدولی کو کوئی معمولی قصور سمجھتے ہو۔ آج کی ہی بات سنو۔ دوکان میں چھٹن نے پاخانہ پھر دیا۔ جنگی سامنے بیٹھا تھا۔ ہم نے اسے حکم دیا: "یہ پاخانہ صاف کر دو۔" اس پر اس نے پاخانہ تو صاف کیا نہیں الٹا گستاخانہ جواب دیا: "میں جھاڑو کرتا ہوں، پاخانہ صاف کرنا میرا کام نہیں۔" تب تو ماسٹر جی ہماری طبیعت جل کر خاک ہو گئی۔ ہم نے من میں کہا: "رہو بیٹا، اگر تمہیں جیل بھیجنے بڑے گھر کی ہوا نہ کھلائی ہو تو ہمارا نام بھی منسٹر دھنا لال نہیں۔ آخر ہم پریشیڈنٹ ہیں کچھ مذاق نہیں۔"

"سچ ہے جب چینٹیوں کی شامت آتی ہے تو ان کے پنکھ نکلتے ہیں۔ سرکار قصور تو جنگی نے اتنا بڑا کیا ہے کہ اسے ایکدم پھانسی پر لٹکا دینا چاہئے۔ مگر افسوس ابھی آپ کو پھانسی دینے کا اختیار ملا ہی نہیں ہے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ چلئے کل سویرے اسے گرفتار کریں۔"

"مگر ہمارے پاس ہتھکڑیاں تو ہیں ہی نہیں۔"

"ہتھکڑیاں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ ہم اسے رسی سے ہی باندھ لائیں گے۔ آپ تیار رہئے۔ میں پو پھٹتے ہی حاضر ہو جاؤں گا۔ پھر دیکھیں گے کہ وہ کیسا جنگی ہے کتنے پانی میں ہے؟"

دوسرے دن سویرا ہوتے ہی دونوں آدمی جنگی کے دروازے پر جا پہنچے۔ بچولی جی نے آواز دی: "جنگی باہر نکلو!"

یہ سنتے ہی جنگی باہر نکلا اور باہر نکلتے ہی ایک طرف کو بھاگا۔ پھر کیا تھا، دونوں نے اس کا پیچھا کیا۔ بچولی جی دبلے پتلے پست قد جوان تھے اسلئے جنگی کے پیچھے کچھ دوڑ بھی لیتے تھے مگر سیٹھ جی کا برا حال تھا۔ وہ بار بار

غزل
شہید بدایونی

فریب حسن میں انسان اکثر آ ہی جاتا ہے
سمجھتا ہے یہ سب کچھ پھر بھی دھوکا کھا ہی جاتا ہے

کبھی پوری بھی ہو جاتی ہیں امیدیں محبت میں
مگر اکثر نظام آرزو بدلا ہی جاتا ہے

نہ شکوہ لب پہ آتا ہے نہ آنکھیں نم ہی ہوتی ہیں
مگر چہرے پہ رنگ بےقراری آ ہی جاتا ہے

نہیں دکھتے ہیں بار غم سے شانے گو محبت میں
مگر اک وقت آتا ہے کہ دل گھبرا ہی جاتا ہے

یہ چپ رہنا کہیں وجہ غلط فہمی نہ بن جائے
خموشی کو زبان آرزو سمجھا ہی جاتا ہے

شہید اب عشق کے ہونٹوں میں وہ گرمی نہیں باقی
مگر چہرے پہ پھولوں کے پسینہ آ ہی جاتا ہے

اپنی توند اور ڈھیلی ڈھالی دھوتی سنبھالتے، ٹھمک ٹھمک چلتے اور آواز لگاتے جاتے تھے: "ابے کھڑا رہ، او جنگی کے بچے، کھڑا رہ۔ ہم پریشیڈنٹ ہیں، مشٹر ہیں۔ ذرا ٹھہر تو، ابھی تجھے بڑے گھر کی ہوا کھلانے بھیجتا ہوں"۔

یہ سن کر جنگی کبھی کبھی ٹھہر جاتا تھا مگر جوں ہی وہ دونوں پاس پہنچتے تھے بھاگ کھڑا ہوتا تھا۔ یہ دوڑ گھنٹوں ہوتی رہی۔ جنگی نے پہلے تو انھیں قصبے کی سڑکوں اور گلیوں کے خوب چکر کٹوائے، پھر وہ ان کو قصبے کے باہر اونچی نیچی ناہموار زمین پر لے گیا۔ اب تو سیٹھ جی اور بھی آفت میں پڑے۔ جھاڑیوں نے ان کی دھوتی جگہ جگہ سے نوچ ڈالی اور وہ خود کئی بار ٹھوکر کھا کر گرے۔ آخر بے چارے بیدم ہو کر ہانپنے لگے اور ایک چٹان پر بیٹھتے بیٹھتے بولے: "رہنے دو ماشٹر جی، بدمعاش نے بہت پریشان کیا۔ اب اور کوئی ترکیب سوچیں گے"۔

بچولی جی نے ان کے سامنے دوسری چٹان پر ڈیرہ ڈالتے ہوئے کہا: "سرکار یہ تو بڑی شرم کی بات ہوئی۔ پہلی ہی بار مجرم کو گرفتار نہ کر سکے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"خیر چنتا کی کوئی بات نہیں۔ ہم کل ہی اس کا گھر زمین دوز کرا دیں گے۔ پھر تو لوگ آپ ہی سمجھ جائیں گے کہ بدمعاش اور مجرم کسی طرح ہمارے چنگل سے بچ کر نکل نہیں سکتے"۔

"بڑی غلطی ہوئی۔ اگر آپ نے پہلے ہی یہ بات کہی ہوتی تو اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔ دوڑتے دوڑتے میری تو بری حالت ہو گئی"۔

"اور ہماری حالت؟ ذرا یہ دھوتی تو دیکھو کیسی چیتھڑے چیتھڑے ہو گئی ہے۔ مگر اس ہائے ہائے سے کیا فائدہ؟ آج چار پانچ مزدوروں سے کہدو کل سویرے سات بجے گینتی پھاوڑے لے کر ٹھکانے پر آجائیں۔ پھر دیکھیں گے بیٹا جنگی کتنی اچھل کود مچاتے ہیں"۔

اگلے دن سات بجتے ہی جنگی کے گھر پر دھاوا بولا گیا۔ سیٹھ جی نے مزدوروں سے کہا: "ٹکر ٹکر کیا دیکھتے ہو چلاؤ نا گینتی۔ اس گھر کو ابھی کھود کر مٹی میں ملا دو۔ جھجکنے کی کیا ضرورت؟ ہم حکم تو دے رہے ہیں۔ چلاؤ چلاؤ گینتی۔ دیر مت کرو"۔

اتنے میں جنگی لٹھ لئے باہر آیا اور بولا: "جو مجور گینتی پھاوڑے لئے کاہے کھڑا رے؟"

سیٹھ جی نے جواب دیا: "کاہے ٹھاڑے ہیں؟ تیرا گھر گرا دے۔ اور نیں مان ہما لے حکم۔ ابھی مالوم پڑے جات۔ ہم پریشیڈنٹ آہیں"۔

یہ سنتے ہی جنگی نے لٹھ گھمانا شروع کیا اور مزدوروں سے گرج کر کہا: "جا سمجھ لو کہ تم نے گینتی چلائی اور ہم نے تمائی مونڈیں چور چور کریں۔ جات ہو اتیں سیں کے نیش؟ ان کھیں تو ہم ابیں دیکھیں لیت۔ ہم سو دُن ٹھا کرائیں"۔

اب تو بچولی جی وہاں سے چیختے چلاتے بھاگے۔ ان کے پیچھے پیچھے سیٹھ جی بھی گرتے پڑتے لپے ہوئے۔ دونوں ایک دم سکول میں پہنچنے پر ہی رکے۔ بچولی جی کرسی پر گرتے گرتے بولے: "مسٹر سیٹھ اس معاملے میں تو ہم لوگوں کی بڑی کرکری ہوئی۔ اگر وہاں سے نہ بھاگتے تو جنگی ہم دونوں کو زندہ نہ چھوڑتا۔ ذرا اس کی ہمت تو دیکھئے۔ پاجی نے ایک دم لٹھ گھمانا ہی شروع کر دیا"۔

سیٹھ جی پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں گھبراہٹ تھی اور چھاتی دھونکنی سے ٹکر لینے لگی تھی۔ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے کہ کہیں جنگی نہ آتا ہو۔ جب طبیعت کچھ ٹھکانے پر آئی تو انھوں نے کہا: "ہمارا خیال تھا کہ جنگی غریب ہے، دبو ہے۔ ہم اسے آن فانن میں پکڑ کر جیل بھیج دیں گے۔ مگر وہ تو شیر نکلا ماشٹر جی، پورا شیر۔ جب اس نے لٹھ گھمایا تو ایسا جان پڑا جیسے ہماری جان ہی نکل گئی ہو۔ اب تمہیں کوئی اُپائے نکالو۔ اگر وہ سزا نہ پا سکا تو لوگوں پر سے ہماری دھاک اٹھ جائے گی"۔

"دھاک اٹھ جائے گی؟ کیا سرکار نے دھاک اٹھانے کے لئے ہی اتنے اختیار سونپے ہیں؟ بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ چوروں معاشوں کی شیطانی سے کسی کی دھاک نہیں اٹھتی۔ آپ ٹھہرئے تو، میں اسے جیل بھجواؤں گا۔ ذرا دماغ ٹٹولنے دیجئے۔ دیکھوں کوئی اپائے سوجھتا ہے یا نہیں۔ یہ کہتے کہتے بچولی جی آنکھ بند کر گم سم ہو گئے۔

"ٹھیک ہے۔ ایک چھوڑ دو دماغ کام کریں گے تو کامیابی کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ اچھا ہم بھی سوچتے ہیں"۔ کہتے ہوئے سیٹھ جی نے آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد بچولی جی نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا: "کیوں مسٹر سیٹھ، سوجھا کوئی اُپائے؟"

سیٹھ جی نے آنکھیں کھول کر جواب دیا: "اپائے تو ایک بھی نہیں سوجھا ماشٹر جی۔ کیا اس معاملے میں ہمیں پولس سے کچھ سہاتیا نہیں مل سکتا؟"

بچولی جی اچھل پڑے اور بولے: "واہ کیا کہنا! اپائے تو آپ نے بہت بڑھیا سوچا۔ بس لکھئے تھانیدار صاحب کو ابھی ایک آرڈر۔ پھر تو وہ جنگی کو پکڑ کر جیل بھیج ہی دیں گے۔ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے"۔

سیٹھ جی نے تعجب سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بچولی جی کو دیکھتے ہوئے کہا: "کہتے کیا ہو ماشٹر جی۔ تھانیدار صاحب کو آڈر لکھ دوں؟ وہ ناراض نہ ہوں گے؟"

"ناراض کیوں ہوں گے؟ وہ تنخواہ کس بات کی پاتے ہیں؟ چوروں بدمعاشوں کو پکڑ کر جیل بھیجنا تو ان کا کام ہی ہے۔ پھر آپ پریسیڈنٹ ہیں، مسٹر ہیں اور ہیں آنریری مجسٹریٹ"۔

"ارے تو کیا ہم آنا ڑی مجسٹر بھی ہیں؟"

"تعجب ہے ابھی آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں۔ بھلا جرمانہ کرنے، جیل بھیجنے اور مکان گروانے کے اختیار مجسٹریٹ کے سوا اور کسے ملتے ہیں؟ مجسٹریٹ حکم دیتا ہے اور پولس اس کی پابندی کرتی کراتی ہے۔ آپ نے

کچہری میں دیکھا ہوگا مجسٹریٹ نے سزا سنائی نہیں کہ پولس نے آگے بڑھ کر مجرم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھر دیں۔ یہ تو میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مجسٹریٹ خود ہی مجرم کو جیل بھیجنے جاتا ہو۔ آپ تھانیدار صاحب کو آڈر دیجئے تو سہی۔"

"واہ ماسٹر جی،" اتنی بڑی بات اور تم نے ہمیں اب تک نہ بتلائی اچھا تو تم لکھو مگر ذرا گڑگڑ کر جس سے تھانیدار صاحب کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ ہم خالی پریسیڈنٹ اور منسٹری نہیں ہیں انارڑی مجسٹریٹ بھی ہیں۔"

"نہیں حضور، میرا لکھا غیر قانونی ہوگا۔ فیصلہ یا حکم تو مجسٹریٹ کو اپنے ہی ہاتھوں سے لکھنا پڑتا ہے۔ اس لئے آپ خود لکھئے۔ مضمون میں بولے جاتا ہوں۔"

"تو لاؤ کاغذ قلم دوات، ہمیں لکھتے ہیں۔ جب تک جنگی جیل نہ جائیگا۔ ہمیں چین نہیں ملے گا۔"

کاغذ سامنے اور قلم ہاتھ میں آتے ہی سیٹھ جی لکھنے کے لئے بیٹھ گئے۔ بچولی جی نے مضمون بولنا شروع کیا:

"سدھی شری شانتی ورگ جہاتشیہ تھانے سروا ئیری براجنانے شری پانچ تھانیدار صاحب کو منسٹر دھنامل سیٹھ کا سلام پہونچے۔ بھگوان کی دیا سے یہاں کشل منگل ہے۔ آپ کا کشل منگل چاہئے۔ تو پیچھے سماچار یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہم اس قصبے کے پریسیڈنٹ ہیں۔ انارڑی مجسٹر ہیں سینی ٹیشن کمیٹی کا چپراسی جنگی ٹھاکر سولہ آنے تو کیا ہیں آنے بدمعاش ہے۔ اس لئے ہم نے غصے میں آکر اسے پورے چھ ماہ کی کڑی سزا دی ہے۔ اب آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اسے فوراً سے پیشتر گرفتار کر کے جیل بھیجدیجئے۔ یہ یاد رکھئے کہ اگر آپ کسی طرح کی غفلت کریں گے تو اپنے کئے کا پھل پا دیں گے۔ تھوڑا لکھا بہت سمجھنا۔

(دستخط)

منسٹر دھنامل سیٹھ

پریسیڈنٹ اور انارڑی مجسٹر

جب قلم آرام کرنے کے لئے میز پر لیٹ رہا تو بچولی جی نے کاغذ اٹھا لئے اور کہا: "اب لگی جنگی کے گلے میں پھانسی۔ یہ حکم پڑھتے ہی تھانیدار صاحب کا پتا پانی ہوجائیگا۔ حضرت ابھی سپاہیوں کو ساتھ لے کر جنگی کے پیچھے پیچھے دوڑتے نظر آویں گے۔"

اس کے بعد انھوں نے یہ حکم ڈاک ہی پر چڑھا کر تھانیدار صاحب کے پاس بھیجدیا۔ تھانیدار صاحب خود موجی انسان تھے۔ اکثر بچولی جی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دل بہلایا کرتے تھے۔ یہ حکم پڑھتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑے منشی جی سامنے بیٹھے ڈائری لکھ رہے تھے۔ تھانیدار صاحب کو اس طرح ہنستے دیکھکر دھیرے سے بولے: "کیوں، کیا بات ہے حضور؟"

تھانیدار صاحب نے وہ کاغذ منشی جی کے سامنے پھینک دیا اور کہا:

"اب تو یہ بنیا حکومت کے نشے میں پاگل ہوگیا ہے۔ بالکل پاگل۔"

منشی جی کاغذ پڑھتے ہوئے بولے: "اس کا یہ نشہ جتنی جلدی ہرن ہو جائے اتنا ہی اچھا۔ لوگ باگ بہت پریشان ہیں۔ اگر کسی دن کوئی فساد کھڑا ہو گیا تو جوابدہی آپ کو کرنی پڑے گی۔ کل جنگی کو گرفتار کرنے کے لئے وہ بچولی جی کے ساتھ قصبے بھر میں دوڑ لگاتا پھرا تھا۔ آج سویرے سویرے مزدور لے کر اس کا گھر کھدوانے پہنچا تھا۔ میں تو یہ ناپسند کرتا ہوں۔ ذرا اس کی جرأت تو دیکھئے وہ آپ ہی کو حکم دینے لگا، دھمکی دینے لگا۔ نالائق کے دماغ میں گوبر بھرا ہے بالکل گوبر۔"

یہ کہتے کہتے انھوں نے کانسٹبل کو آواز دی: "بلا تو لاؤ دھنامل کو۔"

کانسٹبل بات کی بات میں دھنامل کو بلا لایا۔ ان کو دیکھتے ہی تھانیدار صاحب اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور بڑے ادب سے بولے:

"آیئے آیئے۔ تشریف رکھئے۔"

تھانیدار صاحب اتنے ادب سے پیش آئے تو سیٹھ جی بھول کر کپا ہوگئے۔ انھوں نے پہلے تو کرسی پر اڈا جمایا، پھر آواز کو بھاری بنا کر سوال کیا: "آپ نے جنگی کو جیل بھیجدیا؟"

"بھلا آپ حکم دیں اور میں اس کی تعمیل نہ کروں؟ ابھی ابھی دو سپاہی اسے ہتھکڑیاں ڈال کر شہر کی طرف لے گئے ہیں۔" تھانیدار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔

"سچ مچ! تب تو آپ بہت ہوشیار ہیں۔ ہم ضلع صاحب سے آپکی سفارش کریں گے اور آپ کو ترقی دلوائیں گے۔ بات نیرے جنگیا کی اور کرنا بدمعاشی!" کہتے ہوئے سیٹھ جی اچھل پڑے اور خوشی ان کے چہرہ پر چمک اٹھی۔

"یہ آپ کی عین مہربانی ہے۔ مگر گستاخی معاف ہو، میں جنگی کے بارے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ نے کل بچولی جی کے ساتھ اسے گرفتار کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں کی تو تھی۔"

"کیا آج سویرے آپ مزدور لے کر اس کا گھر گرانے گئے تھے؟"

"ہاں گیا تو تھا۔"

"کس کے حکم سے؟"

"ہاہاہاہا۔ کس کے حکم سے؟ ہاہاہاہا! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ہم پریسیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں، انارڑی مجسٹر ہیں؟ آپ اب تک رہے کہاں؟ ہاہاہاہا!"

"یوں دانت دکھانے کی ضرورت نہیں آپ پریسیڈنٹ ہیں مگر آنریری مجسٹریٹ ہرگز نہیں ہیں۔ آپ نے جنگی کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے وہ غیر قانونی ہے۔ اگر اس نے کوئی کارروائی کی تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا؟ پھر یہ ہاہاہی ہی سب بھول جائیں گے۔ دن کو تارے دکھائی دینے لگیں گے۔ بیرسنے

باقی صفحہ ۴۵ پر

احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ — قید خانہ

جلال الدین

اس مجموعے میں احمد علی کے چار افسانے شامل ہیں جو انہوں نے چند مہینوں کے وقفے سے یکے بعد دیگرے لکھے ہیں، اور جو ایک مخصوص ذہنی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شروع میں پیش لفظ بھی ہے:-

"میرے افسانوں میں یہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ نہ صرف افسانوی بلکہ فنی نقطۂ نظر سے"

"ہماری گلی" کے مصنف نے انگریزی کے علاوہ خود اردو میں اچھے فسانہ نگار کی حیثیت سے جو جگہ حاصل کرلی ہے وہ کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوسکی ہے۔ لیکن انتہائی رومانیت اور بے باکی کے باوجود "انگارے" کی کہانیوں یا خود "مارچ کی ایک رات" کا سا طرز بیان اس مجموعے میں نظر نہیں آتا، نہ وہ تیزی ہے، نہ وہ خودسری، یہاں حزن نہ سطحی ہے، نہ خارجی نہ درشت اور نہ بیزار کن۔ اس میں انتہا سپردگی اور ملائمت آگئی ہے، اور گہری داخلیت بھی! یہ نہیں کہ موضوع میں کوئی بڑا فرق آگیا ہو یا ان کے بنیادی محرکات مختلف ہوگئے ہیں۔ ایسا بالکل نہیں۔ ان کہانیوں میں ہمیں طنز بھی ملتا ہے، اور شرابیوں کا کھردرا مذاق بھی۔ جگہ جگہ زندگی کی محرومیوں کا ذکر آتا ہے اور فطرت کے اندھادھند چکر کے علاوہ خود انسان پہ انسان کی اس بیداد کا حوالہ بھی ملتا ہے جو اکثر بلا ارادہ یا مجبوری کی بنا پر ہوتی ہے لیکن بیشتر زندگیوں کو، معصومانہ زندگیوں کو، کہیں کا نہیں رکھتی!

یہ سب کچھ ہے، لیکن اس کے باوجود یہاں احمد علی کا لہجہ اتنا مایوس کن نہیں، جتنا پرسکون اور پروقار ہے۔ یہ یاسانیت اندھی و بے حوصلہ نہیں، خلاقیانہ اور خیال انگیز ہے، پہلے کی طرح پگھلے ہوئے لوہے کے بجائے یہاں لفظ لفظ میں پارے کی تڑپ اور رقت ہے۔ اس کا اثر اچھا بھی پڑا ہے، اور برا بھی، برا یوں کہ زندگی کی وہ تصویر جو ان افسانوں میں ملتی ہے ایک حد تک تشنہ اور یک رخی ہے — یعنی صرف وہ جو غیر ذمہ داری اور رومان کے آس پاس بھٹکتی رہتی ہے۔ اور اچھا یوں کہ اسی کے طفیل اس میں وہ المیہ طابزت یا طرب ناکی آگئی ہے جو کسی بھی فنی تخلیق میں تاثر اور دلکشی کی ضامن ہے!

یہ کہانیاں سرتاسر مغربی نہج کی ہیں۔ نہ صرف کردار بلکہ ماحول، طرز بیان، اور استعارے و تشبیہیں تک سب یورپی ادب کی یاد دلاتے ہیں۔ احمد علی نے یہ اقدام بڑی ہمت کا کیا ہے۔ ہمارے اکثر لکھنے والے کردار اور طرز تو مغربی رکھتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے کتابوں میں وہی اور اسی طرح پڑھا ہے لیکن ماحول ہندوستانی رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ ترقی پسندی کی رو میں بہنے والے اکثر ادبا کے مرقعے ہندوستانی معاشرت سے میل نہیں کھاتے۔ اس کے برعکس آزادروی اور قلندری کی وہ ذہنیت جو "قید خانے" کے ان چاروں افسانوں میں مشترک ہے۔ مجموعی حیثیت سے ایک ایسی تہذیب پیش کرتی ہے جس میں نہ ذاتی روابط ملتے ہیں نہ روحانی، جو صرف مادی محبت یا زیادہ سے زیادہ دوستانہ تعلقات کو فلسفیانہ رنگ دے کر زندگی کے سپاٹ خاکے میں رنگ آمیزی کرتی رہتی ہے۔ وہ وسعت، اور وہ اطمینان و مسرت جو ایشیائی قناعت پسندی اور روحانیت کا مقدس سرمایہ ہے، ان افسانوں میں قطعاً مفقود ہے، اور بیکلی اور بے یقینی کا یہ جذبہ جگہ جگہ خود مغربی تہذیب پر ایک گہری طنز کی شکل میں پھوٹ بھی پڑتا ہے۔

اسی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ احمد علی دراصل انگریزی کے ادیب ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے لارنس اسٹرن کو فرانسیسی کا ادیب کہا جاسکتا ہے!

مغربی لکھنے والوں، خاص طور سے فرانسیسی ادبا کا ان پر بہت گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ "شعلے" کے اکثر افسانوں میں یہ تاثر ڈھکا ڈھکا سا ہے، لیکن "ہماری گلی"، کی بہت سی کہانیوں کو پڑھتے وقت صاف ایمیل زولا کی فطرتیت (Naturalism) اور اس کی عریاں حقیقت نگاری یاد آتی ہے — اور اس مجموعے کے افسانوں میں تو یہ فرانسیسی رنگ اتنا نمایاں ہے کہ جگہ جگہ جذبات اور پس منظر کی ہم آہنگی بیک وقت مصوری اور غنائیت میں تبدیل ہوتی نظر آتی ہے!

ہمارے اردو لکھنے والوں میں یہ انداز کرشن چندر کے ساتھ کچھ مخصوص سا ہوگیا ہے — کرشن جی کے طرز بیان میں غزل کی سی گھلاوٹ اور نزاکت ہے، اور جنہیں پڑھتے وقت شدت تاثر سے تھوڑی دیر کے لئے واقعی دل میں میٹھا میٹھا سا درد معلوم ہونے لگتا ہے! تقریباً یہی جذبہ احمد علی کے افسانے "پریم کہانی"، کو پڑھتے وقت طاری ہوجاتا ہے پلاٹ کی سادگی اور کردار کی یکرنگی کے باوجود کوئی طاقت ہے جو یاسانیت کی اس تاریکی میں ہمیں ایک موہوم سی امید دلاکر گھسیٹے لئے جاتی ہے۔ یہ امید کہ شاید انجام وہ نہ ہو جو کہانی کا ہر ہر لفظ کہتا ہے کہ ہونے والا ہے۔ یہ امید ظاہر ہے کہ ٹوٹ جاتی ہے، لیکن ٹوٹ کر بھی مایوس نہیں کرتی۔ زندگی اور فطرت کے اٹل اصولوں سے اس کا رشتہ

اس طرح ملا ہوا ہے کہ اس میں کسی پر الزام نہیں آتا، کسی کی غلطی نہیں معلوم ہوتی فراق نے ٹھیک ہی کہا ہے :۔

ہم بھی سچے، تم بھی سچے عشق میں سچ ہی ہارونا ہے

اس میں سچ کی سچ سے، خودداری کی خودداری سے، حجاب کی حجاب سے لڑائی ہے۔ اس لڑائی میں فتح یا شکست کچھ بھی نہیں ہوتی۔ بس یہ جنگ ہوتی رہتی ہے، اور پھر یہ جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ اور تخئیل کی بھول بھلیاں میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ غلط کون ہے اور صحیح کیا ہے؟ شاید اسی لئے پریم کہانی اس مجموعے کی سب سے زیادہ دلفریب کہانی ہے!

"پریم کہانی" میں نام کوئی نہیں، صرف "میں" اور "وہ"۔ اور جن کے نام آتے ہیں، انہیں کہانی سے کم سے کم یا بالکل بھی تعلق نہیں! یہ "میں" ہیرو ہے، جو، جیسا کہ پریم کہانیوں کا قاعدہ ہے جوانی کے طوفان سے گذر چکنے کے بعد بیتے ہوئے دنوں پر نظر ڈال رہا ہے۔ ن ۔ م ۔ راشد نے اپنی ایک نظم میں شباب کو "گناہ کی حلاوتوں" سے بھرہ لینے کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خیال یا حوصلہ جیسا کچھ ہے، ظاہر ہے، لیکن احمد علی نے اس کا عجیب رُخ پیش کیا ہے۔ ہیرو ایک عورت سے بے انتہا محبت کرتا ہے، ایسی محبت جس کے والہانہ پن کو ہم کیٹس کے خطوں میں محسوس کر سکتے ہیں۔ لیکن اس شدید اور بے پناہ محبت کے باوجود وہ تخئیل پرست بھی ہے اور تمثالیت کا جویا بھی، چنانچہ محبت، محبوب کی بلندی اور اس کے تقدس کا جو غیر معمولی تصور قائم کر لیتی ہے۔ اس نے اسے مجبور کیا کہ محبت کے سخت ترین طوفان میں بھی نام نہاد "جسمانی قرب" سے دور رہے۔ اس کا نقشہ احمد علی نے یوں کھینچا ہے :۔

دوبارہ پھر اس نے اپنا سر پیچھے جھکا لیا، اور اس قدر جھکی کہ سر زمین سے لگ گیا۔ اس کے کالے بال ہری ہری گھاس پر بکھر گئے، اور اس کی گلابی ساری نے سیاہ چاند کے گرد ہالہ بنا لیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور ...... اس کی آنکھوں میں بوسے کی دعوت جھلک اٹھی ....

"یہ صرف میرا گمان ہے" میں نے کہا، "وہ تو آسمان کو دیکھ رہی ہے"

اور ایسی کتنی ہی دعوتوں کے بعد مایوس ہو کر

وہ اٹھ بیٹھی اور دور مغرب کی بڑھتی ہوئی تاریکی کو گھورنے لگی۔ پھر تھکی ہوئی آواز سے بولی اب تو دیر ہو گئی، ہمیں چلنا چاہیئے ـــ"

پریم کہانی دل میں پیدا ہوتی ہے، لیکن جسم کی طاقت اسے حاصل نہ ہو تو شبنم کے قطروں کی طرح پتوں سے پھسل کر مٹی میں غائب ہو جاتی ہے۔ یہی انجام ہے اس "پریم کہانی" کا۔

اس کے بعد پھر اس سے ملاقات نہ ہوئی اور کچھ ہی عرصے میں وہ مر گئی۔ اس کی لاش پانی میں سے پائی گئی۔ وہ گلابی ساری اور ولایتی مٹر کا ہار پہنے ہوئے تھی لیکن نہ میرے دل میں پہلے کی طرح طوفان ہی پیدا ہوا، اور نہ اس کی یاد خواب بن کے آئی۔ وہ تو میرے دل میں بس چکی تھی ـــ اس سنگ دل دنیا کی طرح میری روح کی گہرائیوں میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی، جیسے ہوا درختوں کو ایک لازوال محبت بھری لوری سنا رہی ہے ....

پریم کہانی کے اس انجام پر صدیاں گذر چکی ہیں، اور صدیاں یونہی گذر جائینگی لیکن اس انجام میں فرق نہ آئے گا۔ المیہ کی روح ہمیشہ انہیں تیلیوں میں پھڑپھڑاتی رہی ہے اور پھڑپھڑاتی رہے گی، لیکن یہاں نہ پریم کہانی کی اہمیت ہے، نہ اس انجام کی، صرف اس ازلی خلش کی کھٹک رہ جاتی ہے جسے عورت کی فطرت کہتے ہیں، جو ہاں ہو کر بھی نہیں ہو سکتی ہے اور نہیں ہو کر بھی ہاں۔ اس مجموعے کا ایک اور افسانہ ہے "گذرے دنوں کی یاد" ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے۔ اس سرے پر ہیرو بیٹھا یاد کی مرتی ہوئی زندگی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے، دوسرے سرے پر فاصلے کی مجبوریوں کو عبور کرتی ہوئی، درخت اور دریا اور پہاڑوں کو کودتی پھاندتی، تیز روی اور ثابت قدمی کے ساتھ کسی کی نرم اور جذبے سے بھری ہوئی آواز آتی ہے "بتاؤ میں کون ہوں؟"

ہیرو اپنی تمام گذشتہ زندگی کو آنکھوں کے سامنے گذرتے دیکھ رہا ہے، یہ آواز جانی پہچانی ہے، لیکن جانی پہچانی آوازیں ایک سے زیادہ ہوتی ہیں، عیش کی ان تھکی ہاری، مٹتی ہوئی یادوں میں وہ نہیں جانتا کہ کون کون ہے ...... وہ اپنی سب عورتوں کے نام بتا رہا ہے ـــ شیلا؟ سنتوش؟ مایا؟ ـــ سب ہی تو اسے یاد ہیں، سب ہی کی آوازیں اس کی جانی پہچانی ہیں، سب ہی سے اس نے پیمان وفا باندھے ہیں اور اس وقت زیست کے یہ سب تار رگ جاں کی طرح لرزتے جا رہے ہیں، لیکن وہ ناموں کے ان دھندلے نقوش کو الگ الگ ہیئت نہیں دے پاتا۔ ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور بھولی بسری یادیں جگمگ جگمگ کر کے نمایاں ہونے سے پہلے ہی ایک چھا جانے والی کیفیت کے اندھیرے میں کھو جاتی ہیں۔ لمحے۔ دو لمحے، وقت گذرتا جاتا ہے، اور ٹیلیفون کی گھنٹی پھر بجتی ہے ـــ وہی آواز، وہی درد، وہی جذبہ۔

نہ تو میں شیلا ہوں، نہ سنتوش؛ اور نہ مایا۔ میں ماضی کی ایک آواز ہوں۔ میں کون ہوں، یہ تم بتاؤ، کیا میں ابھی تک تم کو یاد ہوں ۔۔؟

گر ٹیلیفون محض کہی ہوئی بات کو ادھر سے ادھر پہنچا سکتا ہے۔ وہ محبت کی خوابیدہ یادوں کو کیسے جگا دے، وہ جلی ہوئی راکھ سے چنگاری کیسے اڑائے، ماضی پھر ماضی ہے —— گذرے ہوئے شباب کا ماضی! آواز پہچانی نہیں جاتی، یاد کا سانپ لہرا گیا ہے لیکن تخئیل کو لکیر پیٹنے کا شوق ہے:-

زندگی ایک بند گنبد ہے، اس کونے میں ماضی ہے، اس میں حال، اس میں مستقبل۔ ماضی پر سے پردہ ہٹ چکا ہے، اور اس کی تصویر ایک سبزہ زار کی طرح پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔۔۔۔ یہ لیلا ہے، یہ مایا، یہ سنتوش، یہ سلیمہ ہے، یہ انجیلا ۔۔۔۔ یہ وہ آنکھیں ہیں جو نرگس سے زیادہ نرم اور عشق سے زیادہ بیمار ہیں، ان کی تہ میں میرے دل کی قبر ہے، اور ان کی چمک میں میرے عشق کی آگ۔ یہ وہ بانہیں ہیں ۔۔۔۔۔ یہ وہ بال ۔۔۔۔ یہ وہ ۔۔۔۔۔۔

زندگی ایک غبار ہے۔ جب تک ہوا میں رہا، آندھی رہا، جب بیٹھ گیا تو ریت بن گیا۔ میں نے آندھی کی جھنجھلاہٹیں بھی کھوئیں اور نہ کچھ حاصل کیا اور نہ پایا۔ اب تو آندھی جم کے رہ گئی ہے۔ نہ آگے بڑھتی ہے اور نہ مطلع صاف ہوتا ہے۔ ایک مستقل ریت کی جھڑی ہے کہ دن رات برستی ہے نہ کھلتی ہے، اور نہ ہیجان ہی پیدا کرتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔

یہ خود کلامی بہکتی ہے، سنبھلتی ہے، سوچتی ہے کہ حسن ناپائدار سہی، یاد ناپائدار نہیں، اور عشق تو لازوال ہے۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ وقت ہر چیز پر خاک ڈالتا جاتا ہے۔ اور ماضی کے نقوش اتنے مدھم پڑ گئے ہیں؟ کیوں عشق کی آگ اتنی سرد ہو گئی ہے؟ جو لازوال تھا، اس نے کیوں ماضی کے پردے میں منہ چھپا لیا ہے؟ جو یاد پر سے زیادہ ہلکی تھی، وہ کیوں پہاڑوں سے زیادہ بھاری ہو گئی ہے؟ اور ایک اور سوال، ان سب سے بڑا، جو "پریم کہانی" کا ہیرو "گذرے دنوں کی یاد" کے ہیرو سے بزبانِ حال پوچھتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ "میں نے ٹھیک کیا یا تم نے؟ ہم میں سے کون فائدے میں رہا، کون گھاٹے میں؟" ان کا جواب نہیں ملتا، خود یہ سوال الگ الگ نہیں، ایک میں ایک ملے جاتے ہیں، گم ہوئے جاتے ہیں —— اور ٹیلیفون پر آخری آواز، پھیلتی، اٹھتی، مضطرب سی آتی ہے، "نہیں اب جانے دو، میں بند کرتی ہوں، اچھا خدا حافظ۔۔۔۔" ٹیلیفون کٹ جاتا ہے اور یاد کی چنگاریاں جگنو بن کر تخئیل کی تاریکی کا منہ چڑانے لگتی ہیں:-

عورت کا دل کسی قدر سخت ہوتا ہے، اور ملائم بھی!
جب میں عشق کرتا تھا تو اس کا دل پتھر کا تھا، اور اب جب کہ وہ محبت میں مبتلا تھی تو اس کا دل موم تھا۔ لیکن یاد کے برفانی طوفان نے اس کو اور بھی جما دیا، اور موم بھی میرے لئے سنگ خارا بن گیا ۔۔۔۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ اکیلے میرے دل میں بستی تھی۔ ماضی کی اور بھی آوازیں اس میں بند تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ میرا دل اب ویرانہ ہے۔ اس کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر ریت بن چکی ہیں، اور اب ماضی کی آوازیں بھی اس میں نہیں گونجتیں ۔۔۔۔۔

یاد ایک پر کی طرح ہلکی بھی ہوتی ہے، اور ایک پہاڑ کی طرح بھاری بھی۔ میں یادوں کے بار کو اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں۔ ان کے قافلے میرے دماغ میں گشت کرتے ہیں لیکن مجھے بوجھ تک نہیں معلوم ہوتا ۔۔۔۔۔

لیکن نہ کسی عورت کو مجھ سے محبت تھی، نہ میں نے کبھی عشق کیا۔ یہ سب میرے تخئیل کی تصویریں تھیں جو پٹ بیجنوں کی طرح چمکیں اور غائب ہو گئیں، نہ میں تھا، نہ وہ تھیں، نہ محبت —— میرے ہونے نے ان کو مجھ سے چھین لیا ۔۔۔۔۔۔

—— زندگی بہت کٹھن، دردانگیز، اور سنگلاخ ہے۔

اس حزن آلود خود کلامی کے تار دیر تک جھنجھناتے رہتے ہیں اور انجام کا کوئی واضح تصور نہ ہونے کے باوجود اس میں اس المیہ طرب آفرینی کا احساس ملتا ہے جو بڑے سے بڑے غم کو فنی خلوص کی بھٹیوں میں پگھلا کر حسن اور طمانیت کے کندن میں تبدیل کر دیتا ہے۔

طرز بیان کی اس دلآویزی سے الگ ہٹ کر ہمیں پھر چند سوالوں پر غور کرنا ہوگا۔ یہ دلگیر حزن انفرادی ہے یا اجتماعی؟ زندگی کا یہ نظریہ کسی تخلیقی ارتقا اور رجائیت کی نمائندگی کرتا ہے یا فرار اور تشکیک کی؟ اور اگر یہ بے یقینی ہی زندگی کا آخری سہارا اور قناعت پسندی کی آخری حد ہے تو فن کا جواز یا اس کی ضرورت کیا ہے، اور وہ معیار کیا ہیں جو آج کو کل سے، لطیف کو کثیف سے اور خود امید آفرینی کو یاس انگیزی سے ممتاز کرتے ہیں؟ اس کیلئے ہمیں بقیہ دو افسانوں "قید خانہ" اور "قلعہ" کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی ہوگی۔ ان کا جواب تو وہاں بھی نہ ملے گا، لیکن وہ فضا ضرور مل جائے گی، جس کی وسعتوں میں کھو کر انسان "یہ یا وہ" قسم کے سوال پوچھ ہی نہیں سکتا، دن کی پھیلی ہوئی ہمہ گیر روشنی میں بجلی کے یہ قمقمے کچھ نہیں جاتے لیکن پھیکے، دھندلائے ہوئے، بے وقعت نظر آنے لگتے ہیں، بلکہ اکثر تو نظر ہی نہیں آتے۔ قدروں کا سوال اٹھانے میں سب سے زیادہ اہم اور ساتھ ہی دلچسپ پہلو یہی ہے کہ مذہب یا اخلاق یا کوئی اور احساس فرض،

یہ تمام چیزیں بڑی اہم اور قابل وقعت ہونے کے باوجود بعض حالتوں میں بے ضرورت اور اکثر بے معنی بھی معلوم ہونے لگتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے کوئی اُمّی ہو کر بھی پیغمبر ہو سکتا ہے! ذمہ داری کا یہ احساس اور بنیادی قدروں سے وفاداری کا مطالبہ عام انسانوں سے ضرور کیا جانا چاہیئے، جیسے کسی اسپتال میں مریضوں کی ایک خاص طرح سے نگہداشت کی جاتی ہے ان کے لئے ایک مقررہ نظام الاوقات ہوتا ہے، ان کے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سوتے جاگنے، سب پر مخصوص بندشیں رکھی جاتی ہیں لیکن معالج اور دوسرے تندرست و توانا لوگوں پر یہ پابندی عائد نہیں ہوتی اور نہ ہونی چاہیے۔ نہ ان کا ٹمپریچر چارٹ رکھنے کی ضرورت ہے نہ دوا پر دوا پلانے کی۔ مذہب یا اخلاق کی یہ "دوا نہانہ" حیثیت پیش نظر ہو تو فن اور فنکار کو اس کبھی نہ ختم ہونے والی، اور کبھی نہ مانی جانے والی جواب دہی سے نجات مل جائے جو اس کی تخلیقی قوتوں کا معتدبہ حصہ ان مورچوں پر بیکار ضائع کرتی رہتی ہے!

یہ تصور ان افسانوں میں اتنا صاف اور واضح تو نہیں ملتا مگر "قلعہ" اور "قید خانہ" دونوں میں اس کے لگ بھگ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ "قلعہ" کا بنیادی تصور گنجلک ہے، اس میں ایک نیم سیاسی زیریں دھارا بہتا ہے جو آخر تک پہنچتے پہنچتے تمثیلیت سے بہکتا رہتا معلوم ہوتا ہے اور اس میں پرومی تھی اس (Prometheus) کی کشمکش آزادی کا بھی ہلکا سا ذائقہ ہے، لیکن اس روحِ اضطراب کی سب سے زیادہ واضح اور پرخلوص کارفرمائی ہمیں "قید خانہ" میں ملتی ہے "قید خانہ" اس مجموعے کا خالصتاً فلسفیانہ افسانہ ہے۔ اسٹیشن، شراب خانہ، گھر — ان تین قید خانوں کی کھڑکیوں سے جھانک کر احمد علی نے دنیا کے اس وسیع قید خانے کی حدود پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے جسے ہم زیست کی پہنائی کہتے ہیں — مگر باہر برفباری ہو رہی ہے۔ کہر اور دھند، اور تاریکی ان سب نے مل جل کر زندگی کی کال کوٹھڑی میں تنگ دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں۔ یہاں سانس لیتے جی الجھتا ہے۔ نگاہوں کے تار روشنی کی خبر لانے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور اس بند گنبد میں آواز کے پردے بس ایک مبہم سی گونج سے لرز کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب ہے، مگر تخئیل پھر بھی زندہ و تابندہ ہے، اور حسن کی آنکھوں میں زرکار خوابوں کے موتی جھلک رہے ہیں۔ اور فنی تسکین کی شاہراہ کہکشاں سے بھی پرے نکلتی چلی گئی ہے! اس پس منظر میں یہ اکھڑے اکھڑے فقرے اور الجھے سلجھے الفاظ عجیب و غریب طور پر وسیع اور گہرے مفہوم سے بھر جاتے ہیں:۔

زندگی بہت وسیع ہے، اور خیالات کا سلسلہ انتھک ہو۔ ویرانہ میری ہے نہ تیری۔ زندگی کی پہنچ بہت دور تک ہے اور تخیل کے لئے موت اور زیست یکساں ہے۔ مکان میرا گھر نہیں زندگی ہے، جس کی ہر سمت نرالی، اور ہر مدت نئی ہے مکان صرف رہائش کی جگہ نہیں بلکہ تخیل ہے۔ اگر ادھر نگاہ اٹھائی تو پہاڑ ہیں، اور ادھر، تو لندن کی سڑکیں اور مقام۔ ایک کروٹ میں گرمی ہے تو دوسری میں سردی اور بارش۔ ایک ہی وقت میں ماضی، حال، اور مستقبل، زندگی اور موت دکھائی دیتے ہیں ....

ان الفاظ کا لکھنے والا ایک قصہ گو ہو یا نہیں (احمد علی کی یہ حیثیت ہمیشہ مشتبہ رہی ہے، اور اس مجموعے میں تو خاص طور سے) لیکن وہ ایک حساس اور واقعیت پسند مفکر ضرور ہے۔ ان کے اس "علامیت (Symbolism) کا ہتھیار سنبھالنے" پر اعتراض کیا گیا ہے، اور ایک حد تک یہ اعتراض درست بھی ہے، خاص طور سے اس وقت جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یوں احمد علی کو مابعد الطبیعات سے نہ ادبی دلچسپی ہے نہ اخلاقی ہمدردی اور بحیثیت ایک مخصوص حقیقت پسند اور "حقیقت نگار" مصنف کے، ان سے اس دلچسپی و ہمدردی کی توقع کی جانی چاہیئے، نہ اس کا مطالبہ۔ لیکن ایسا نہیں۔ باطنی اور روحانی زندگی بھی ان کے لئے اتنی ہی واضح "حقیقت" ہے جتنی ظاہری اور جسمانی زندگی۔ اسی لئے ان کی تخلیق میں ایک تار فلسفیانہ تخیل کا ضرور رہتا ہے، اس تار کو تصوف یا مابعد الطبیعات سے اتنا تعلق نہیں ہوتا جتنا ایک گہرے حزن سے، "حزن" جس کا اول و آخر دیوی حسن کا! اس کے یہ معنی نہیں کہ "المیہ" ہی سب کچھ ہے، یا زندگی کا یہی اساسی رجحان، فن کا ترجمان، اس کا محافظ، اور اس کی سب سے بڑی پہنچ یا فتح ہے اور خوش دلی اور سرفرازی کو خلوص، گہرائی اور سنجیدگی سے بیر ہے! ایسا بالکل نہیں، بلکہ اصولاً اس کا الٹ ہی زیادہ درست ہے — یعنی انسان کی "اچھائی" کے لئے مایوسی و اضطراب کی فضا ظاہر ہے اتنی سازگار نہیں ہو سکتی، جتنی خوشی اور اطمینان کی۔ لیکن اس دنیا میں جہاں فرصت یک دو نفس حاصل عمر خضر ہے، اور جہاں ہر طرف خوشی کی شرابیں لنڈھائی جانے کے باوجود انفرادی زندگی کے پیمانے ہی کچھ تشنہ اور کمزور ہیں، یا ان کی تہ میں ازلی تشنگی کا تلچھٹ موجود ہے، یہ تسلیم کرنے میں کس کو باک ہو گا کہ زندگی کی ہر تخلیقی تعبیر تشکیل میں اس بے پایاں غم کا لحاظ رکھنا ہو گا جو صدیوں اور نسلوں سے بے نیاز ہو کر ہر خوشی کی ابتدا، انتہا، اور اس کا مستقبل پس منظر بنا ہوا ہے! جس طرح اجتماعی زندگی میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ اوسط رفتار، "یاران تیز گام" سے نہیں بلکہ ان سست روؤں

سے زیادہ قریب ہوتی ہے جو "محو نالۂ جرس کارواں" رہتے ہیں، یا جس طرح معاشی بہتری کے لئے مٹھی بھر امیروں سے زیادہ ان کروروں کے مسائل سامنے رکھنے اور انہیں حل کرنے کی ضرورت ہے جو "غریب" کہلاتے ہیں ـــــ اسی طرح فنکار کا اخلاقی ہی نہیں فنی فرض بھی ہے کہ وہ فارغ البالی اور بے فکری سے زیادہ، کہیں زیادہ، اس پھیلے ہوئے غم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرے، اور اس کی ایسی تعبیر، تنقید، اصلاح کرے (جو کچھ اور جتنا کچھ بھی کر سکے) کہ اس ویرانے میں بھی مسرت، تسکین، اور خوش ذوقی کے پھول کھل سکیں!

ان افسانوں میں ہمیں کچھ ایسی ہی فنی تسکین کا احساس ہوتا ہے یہاں احمد علی نے حزن کو ڈرامائی انداز دینے کے بجائے اسے سیدھی سادی اور عام واقعیت سے اس قدر لبریز کر دیا ہے کہ زندگی کا بد پیمانی رجحان نہ انفرادی رہ گیا ہے، نہ محض رومانی و مریضانہ۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ان مٹ نقش کی طرح بابل کے میناروں سے چیخ چیخ کر جوانی کی طرب انگیزیوں کی داستان ایک ہمہ گیر، دلدوز طنز کے ساتھ دہرا رہا ہے ـــــ لیکن بابل افتراق کا مینار ہے۔ اتحاد کا نہیں ـــ اور اسی انتشار، اسی تجزیئے میں احمد علی کی سب سے بڑی کامیابی پوشیدہ ہے۔ کرشن چندر کا زندگی سے بھرپور ناول "شکست" ایک ہارے ہوئے ملک کی داستان ہے۔ اس لئے شیام کی شکست اور ونتی کا انجام دونوں ایک سیاسی نظریے کی تائید کرتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں، مگر "قید خانہ" تو آزاد انسانوں کی کہانی ہے، "بریم کہانی" بھی، "مقلعہ" بھی، اور ایک حد تک خود "گذرے دنوں کی یاد" بھی، لیکن حقیقت کی تلخی پھیلی ہوئی انسانیت کی ایک عام اور مشترک میراث ہے۔ اس میں ہندوستان اور انگلستان کی قید نہیں، نئے اور پرانے کی بھی نہیں!

غزل
احمد اورنگ آبادی

دل مرا گھبرا رہا ہے کیا کروں
یاد پھر وہ آرہا ہے کیا کروں

یاد آئیں جب وفائیں بعدِ قتل
ہائے اب پچھتا رہا ہے کیا کروں

شوق دیدارِ جمالِ پاک کا
رات دن تڑپا رہا ہے کیا کروں

ہو رہے ہیں زخم سب اچھے مگر
کوئی بگڑا جا رہا ہے کیا کروں

آنکھ ملتے ہی نگاہِ مست سے
ہاتھ سے دل جا رہا ہے کیا کروں

ناتوانی سے ہلا جاتا نہیں
اور وہ بلوا رہا ہے کیا کروں

منہ کو آنچل سے چھپا کر سو گیا
وصل میں شرما رہا ہے کیا کروں

نذر کیا دوں۔ جان یا دل یا جگر
آج وہ یار آرہا ہے کیا کروں

شعر میں احمد مرے اوستاد کا
کیوں نہیں رنگ آرہا ہے کیا کروں

غزل
ابر احسنی گنوری

لبوں تک یوں مرے سینے سے آہ بیقرار آئی
کہ خود بڑھ کر نقابِ چہرۂ جاناں اتار آئی

کسے منصور! الفت اس جہاں میں سازگار آئی
مری قسمت میں غم آیا ترے حصہ میں دار آئی

نگاہِ آرزو محفل سے اُن کی شرمسار آئی
سکوں کی بھیک لینے کو گئی تھی بے قرار آئی

بتا کیا مشکل ہے ضبط جنوں کی پردہ رہنے کی
فدائے رنگ و بو سب لوگ کہتے ہیں بہار آئی

مصیبت پر مصیبت داغ پر داغ اور غم پر غم
مرے حصہ میں جو دولت بھی آئی بے شمار آئی

بچانے کے لئے توہین سے دم بھر کو آجاؤ
ستارے مجھ پہ ہنستے ہیں کہ شام انتظار آئی

نظر کو یہ ملا ہے ابر طفیل اپنے طوافوں کا
سکون و صبر کی بازی درِ جاناں پہ ہار آئی

دو غیر فانی شہزادیاں

افسانہ

تراں وان تنگ

نون کن کے چھوٹے سے گاؤں سوُن تے میں یہ دونوں لڑکیاں کنول یا چنبیلی کے دو پھولوں کی طرح بڑھتی رہیں۔ بڑی لڑکی کا نام ٹرنگ ٹریس اور چھوٹی لڑکی کا نام ٹرنگ ہنی۔

ٹرنگ ٹریس مسحور کن حسن کی ملکہ تھی۔ اس کی آنکھیں جن میں جذبات شعلوں کی طرح روشن تھے، ہر دل میں محبت کی آگ بھڑکاتی تھیں۔ اس کا تبسم جس میں مہکتے ہوئے گلاب کے پھولوں کی مٹھاس تھی۔ ہر روح میں تلاطم برپا کر دیتی۔ اور اس کی آواز سے جو نسیم سحری کی طرح ہلکی تھی پتھروں اور چٹانوں پر بھی ایک کیف طاری ہو جاتا۔ انسان تو انسان چرند و پرند بھی اس کے حلقہ بگوش تھے۔ تمام کرہ ارض اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا تھا۔ یہ پیاری شخصیت دنیا میں سب سے زیادہ اچھے اور سچی دل کی مالک تھی۔ اس کی پیاری فطرت میں عفت، عصمت، تقدس، سعادتمندی اور حب الوطنی اس طرح چمکتی تھی جیسے آسمان پر جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے ستارے۔

ٹرنگ ہنی جب اپنی بہن کے ساتھ ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ایک گلاب کے پھول کے پاس دوسرا گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ یا جیسے دو ستارے برابر برابر چمک رہے ہیں۔ حسین پھولوں کی طرح، وہ حسن، مہک اور رنگینی میں ایک دوسرے کا جواب تھیں۔ دو پھولوں کی طرح انھوں نے اپنے وطن اور اپنے باپ کے گھر کو اپنی خوشبو سے بسا رکھا تھا۔ وہ دونوں وطن اور گھرانے کے چمن کی زینت تھیں۔

بوڑھا بادشاہ ہنگ وی یونگ جو غاصب و جابر چینی گورنر ٹوڈنھ سے نفرت کرتا تھا اور اس کے خلاف طرح طرح کے منصوبے باندھا کرتا تھا جادی قربان گاہ پر جھکا۔ منتر پڑھ پڑھ کر اس نے اپنے اجداد کی روحوں کو بیدار کیا۔ پیشنگوئی کرنے والوں، رمّالوں اور جادوگروں سے مشورہ کر کے اس نے اپنے اجداد کی ابدی آرام گاہوں کو بدلا۔

ایک رمّال نے عرض کی "حضور۔ اب آپ کے پدر بزرگوار کا مقبرہ ایک اژدہے کی پشت پر ہے۔ شہزادیاں آپ کا بدلہ لے لیں گی۔ وہ چینی جرگوں کا پیچھا کرتے کرتے انھیں ہماری مقدس سرزمین سے نکال دیں گی۔ اور اپنے حکمران ہونے کا اعلان کر دیں گی۔"

بادشاہ نے کہا "میں نے شاہی خاندان کی قسمت کا فیصلہ بدھ دیوتا کے طاقتور ہاتھوں میں دے دیا ہے۔"

حضور۔ یہ سب کچھ مقدس آسمانی کتاب میں یاقوتی حرفوں سے لکھا ہوا ہے۔ حضور۔ اگر دونوں شہزادیاں نام وائٹ کی حکمراں نہ بنیں تو میں اپنا سر اتروا دونگا۔ ان کی تلواریں بڑے سے بڑے جنگجو سے زیادہ ہیبتناک ہیں۔ یہ دونوں اہل چین پر فتح حاصل کریں گی۔

ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ ہنی نے بچپن ہی میں تلوار چلانا، نیزہ بازی اور گھوڑے کی سواری سیکھی تھی۔ فن سپہ گری سکھلانے کے لئے شاہ ہنگ وی یونگ نے ان دونوں کی تعلیم و تربیت اپنے وفادار جرنیلوں میں سے ایک جرنیل کے سپرد کی تھی۔

اس طرح دونوں شہزادیوں کے دلوں میں انتقام کا جذبہ پرورش پا رہا۔ جس دن سے ٹوڈنھ نے شاہ ہنگ وی یونگ کو تخت سے اتار کر اس کی جگہ خود غصب کر لی تھی۔ اسی دن سے سلطنت انام میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ماندرین کے طبقے میں سے جس کسی نے ذرا مخالفت کی اس کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ گاؤں کے گاؤں اور صوبے کے صوبے نذر آتش کر کے تخت و تاراج کر دیے گئے اور وہاں کے باشندے تیغ کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ انام کے بہادر اور امن پسند کسانوں پر اتنے زیادہ ٹیکس لگائے گئے کہ وہ ان کا بوجھ برداشت نہ کر سکے۔ انام حب الوطنوں کو سب سے زیادہ ہیبتناک تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ خوفناک بھوتوں کی طرح قحط۔ زبوں حالی اور موت نے اس سرزمین پر اپنا تسلط جما لیا۔ نام وائٹ کے لوگ خاموش تھے۔ ان کے دلوں میں نفرت کا جذبہ برابر بڑھ رہا تھا۔ اور وہ بدلہ لینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

اگرچہ ٹرنگ ٹریک فن سپہ گری میں کامل ہو گئی تھی پھر بھی وہ محبت کی زہر آلود برچھیوں کے وار نہ سہ سکتی تھی۔ ہر حسین عورت کی طرح وہ بھی محبت کے سخت لیکن دلکش میدان میں مات کھا جاتی تھی۔

گاؤں سون تے میں اس روز ایک تہوار منایا جا رہا تھا۔ جھنڈے جن پر اژدہوں اور دوسرے چینی نشانات کی زرکاری کی گئی تھی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی زنانی سنہری چھتریاں کھلی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے موسم خزاں میں کنول کے پھول کی پتیاں کھلی ہوئی ہیں۔ جس طرح دعائیں اور منتر آسمان کا رخ کرتے ہیں اسی طرح ڈھولوں کی آوازوں سے آسمان گونج رہا تھا۔ سب جوان لڑکے لڑکیاں اپنا اچھے سے اچھا لباس پہنے ہاتھوں میں چاول۔ بھنا ہوا گوشت۔ بھرے ہوئے چوزے۔ چھالیہ۔ منتی کاغذ۔ لوبان اور اگر کی بتیاں کشتیوں میں لئے مخروطی شکل کے مندر میں داخل ہوئے۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ ہنی بھی اپنی کنیزوں کے ساتھ اپنی سنہری گاڑی میں سوار ہو کر وہاں پہنچیں۔ اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھے لوبان اور اگر کی بتیاں سنبھالے وہ بدھ دیوتا کے سامنے جھکیں، حفظ و امان کی دعا کی اور دیوتا سے مدد چاہی۔

وہ قربان گاہ پر چار بار جھکیں اور جب بدھ دیوتا کی عبادت سے مطمئن ہو گئیں تو وہ اٹھیں اور اپنی سنہری گاڑی میں سوار ہونے کیلئے آگے بڑھیں۔

تھائی ساج ٹرنگ ٹریک کے سامنے جھکا اور کہا" شہزادی۔ اچھی شہزادی۔ اپنی غریب رعایا میں سے ایک فرد کو اجازت دیجئے کہ آپ کی خدمت میں یہ کنول کے پھول پیش کرکے شاہی خاندان سے وفاداری اور اس کی تحسین و بہی خواہی کا ثبوت دے"۔

وہ ذرا ٹھٹکی لیکن پھولوں کا گلدستہ لے لیا۔ پھر شرماکر بولی۔ "جناب آپ کے کنول کے پھول بہت خوبصورت ہیں۔ میں پھولوں سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ ان کو بکھیرنے کی جرأت نہیں کر سکتی"۔

ٹرنگ ٹریک کے اس اچھے برتاؤ سے پُرحوصلہ ہو کر اس نوجوان ماندرین نے کہا" اچھی شہزادی۔ آپ کی نیک شخصیت تک رسائی، آپ کی آواز کا سننا اور آپ کے جسم کی مقدس خوشبو کا سونگھنا میرے لئے عزت کا باعث ہے۔ شہزادی، ایک سنہرے بادلوں کی طرح آپ کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ میری پیاسی روح آپ کی طرف اس طرح کھنچی جا رہی ہے جیسے کوئی ابابیل آسمان کی طرف اڑے۔ میرا دل آپ کی طرف ایک فاختہ کی طرح اڑ کر جاتا ہے۔ میرے خیالات نے آپ کے گرداگرد ہزاروں مسحور کن خواب بُن دئے ہیں۔ شہزادی جب آپ سامنے ہوتی ہیں تو میں اتنا کھویا جاتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ میں جاگ رہا ہوں یا سو رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ حقیقت ہیں یا ایک خواب۔ سچی زندگی اور خواب، اور وہم و یقین میں کتنا کم فرق ہے"۔

شہزادی بولی" جناب آپ کے الفاظ میری روح پر ایسا اثر کر رہے ہیں جیسے آسمان کی بارش کا نغمہ۔ آپ کی آواز میرے دل میں محبت کی طرح گھر کر رہی ہے۔ آپ کا ممتاز نام میرے گھر میں جس کی دیواروں پر ارغوانی رنگ کی لکڑی لگی ہوئی ہے۔ گلاب کے پھولوں کی مہک کی طرح داخل ہو گیا ہے۔

تھائی ساج نے کہا" شہزادی۔ آپ کے الفاظ سے میرے ویران دل میں امید اور خوشی پھوٹ رہی ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو آپ کے محل اور اس یاقوت کی انگوٹھی کا جو آپ اپنی انگوٹھی میں پہنے ہوئے ہیں منتظم و محافظ بن جاؤں"۔

شہزادی بولی: "جناب۔ آپ کی ستائش سے مجھے شرم آتی ہے۔ لیکن ایک سنہرے ریشمی کپڑے کی طرح میرا نا پائدار مقدر والد بزرگوار کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ مجھے کسی پہاڑ پر چڑھنے کا حکم دیں تو میں اس پر چڑھ جاؤنگی اگر وہ کہیں کہ میں سمندر میں جا پڑوں تو سمندر میں جا پڑوں گی۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ دیر ہو رہی ہے۔ میری بہن میرے انتظار میں ہے"۔

ٹرنگ ٹریک تھائی ساج کے سامنے ایک خاص انداز سے جھکی اور اپنے دل میں ہزاروں جذبات لئے اپنی سنہری گاڑی میں بیٹھ کر ایک مسحور کن مسکراہٹ کے ساتھ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

تھائی ساج اس کے حسن و کشش سے مخمور اپنی خوابوں کی دنیا میں ایسا کھو گیا کہ بہت دیر تک وہ بت بنا کھڑا رہا جیسے اس جگہ اسے کیلوں سے گاڑ دیا گیا ہو مخروطی شکل کے مندر میں تہوار ہوتا رہا۔

رباعیات

صفیہ شمیم ملیح آبادی

گلشن کی ہر اک کلی چٹک جاتی ہے
جب ناز سے کچھ وہ مسکرا دیتے ہیں
پیشانئ آفاق دمک جاتی ہے
گلزار میں چاندنی چھٹک جاتی ہے

⁂

اب دل سے ہوا ہے باغ عشرت لے جا
جاتا ہے جو تو یاد بھی لے جا اپنی
غم بخش دے ہر ایک مسرت لے جا
یعنی مرے دل سے کیف الفت لے جا

⁂

طوفان میں کشتی کو بڑھاؤں کیسے؟
یہ قہر حوادث یہ ہجوم آلام
آندھی میں چراغ دل جلاؤں کیسے؟
اللہ یہ بارِ غم اٹھاؤں کیسے؟

⁂

بیزارِ تصنع ہوں صداقت کی قسم
اب طالب ظلمت ہوں تجلی کیسی
وارفتۂ نفرت ہوں محبت کی قسم
سرشارِ غم ہوں مسرت کی قسم

اس کے کئی ہفتے بعد تھائی ساج ایک لمبے نیلے چغے میں ملبوس اپنے نوکروں اور رشتہ داروں کے ساتھ بادشاہ ہنگ ویونگ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شادی کے تحفے پیتل کی بڑی بڑی منقش کشتیوں میں بادشاہ کے تخت کے سامنے رکھے گئے۔ تحائف میں جنتیانا شراب کی دو سو بوتلیں۔ بیس نوکیلے ہاتھی دانتوں کی جوڑیاں۔ چینی ریشم کے سو لپٹے ہوئے تھان۔ سونے کے ایک ہزار ڈھلے ہوئے ٹھوس گولے۔ دو مرصع کنگن ٹھوس سونے کا ہار۔ چھالیا رکھنے کے لئے سیپی کی سو ڈبیاں اور بہت سی نایاب اور قیمتی چیزیں شامل تھیں۔ تھائی ساج کی شاہی خاندان سے وفاداری اور سپہ گری کی عظیم صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے بادشاہ ہنگ ویونگ نے اپنی پیاری اور خوبصورت بیٹی ٹرنگ ٹریک کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

شاہی خاندان کا سردار بن کر تھائی ساج نے جس کی رگوں میں جنگ آزمائی کا خون دوڑ رہا تھا۔ فیصلہ کر لیا کہ اہل چین کو اس سلطنت سے نکال کر تخت دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ اپنی بیوی اور اپنی سالی ٹرنگ نہی کے ساتھ مل کر اس نے آدمی بھرتی کرنے شروع کئے۔ فوج بنائی۔ ایک مہم کے منصوبے باندھے اور تخت نشینی کا اعلان تیار کیا۔ ادھر تو دنھ کے جاسوس بھی غافل نہیں تھے۔ قلیوں، ڈاکٹروں، سوداگروں اور فقیروں کے بھیس میں تھائی ساج

کے ہر قدم پر اس کے ساتھ تھے اور اس کے ہر لفظ اور ہر عمل کو گہری نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرح جابر ٹوڈ تھ کو تھائی ساچ کے ہر لمحے کی خبر ملتی رہتی تھی۔ ان سب باتوں سے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے اس نے اپنے محل میں بہت بڑی دعوت کی جس میں ٹرنگ ٹریس کے شوہر کو بھی بلایا۔ ہر قسم کے شبہ کو دور کرنے کے لئے تھائی ساچ بالکل اکیلا اور نہتا دعوت میں گیا۔ ٹوڈ تھ نے مسکراتے ہوئے خوش خلقی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا پرجوش اور بے تپاک استقبال کیا۔ اس کی اتنی عزت کی جتنی ایک ٹرے نامدار کی کرنی چاہیئے۔

ٹوڈ تھ نے حکم دیا "ہمیں کچھ شراب دو اور اتنی شراب دو کہ ہم ڈیوک تھائی سلچ کی صحت و سلامتی کے لئے جی بھر کر شراب پئیں"۔

مصاحب جو چاروں طرف کھڑے ہوئے تھے مسکرائے اور فرمانبرداری کے انداز میں تھائی ساچ کو شراب سے لبالب پیمانے دئے۔ اور تھائی سلچ یکے بعد دیگرے ان کو خالی کرتا رہا۔

ٹوڈ تھ نے حکم دیا "ہمیں گانا سناؤ اور محترم مہمان کے لئے کوئی محبت کا گیت گاؤ"۔ چھتاروں اور چکاروں کی آوازیں وطن کے نغمے گانے لگیں۔ خوش نوا مطربوں کے گلے میں ہار تھے اور چہروں پر غازہ۔ انھوں نے تھائی سلچ کے متحیر دل کو تاروں بھری راتوں کے گیت سنائے مطرب تھائی سلچ کو اپنے نغموں سے مدہوش کر رہے تھے اور مصاحب اسے شراب کے جام پر جام دئے جا رہے تھے۔ اس طرح تھائی سلچ نے شراب کی تین بوتلیں پیں۔

ٹوڈ تھ نے حکم دیا "ہمیں کچھ رقص بھی دکھاؤ۔ ڈیوک تھائی ساچ کے اعزاز میں روپہلی اژدہے والا ناچ ناچو"۔

ڈھول اور جھانجھوں کے سروں میں موزونیت ختم ہو جانے کے بعد ناچنے والوں نے اپنے سروں، اپنے ہاتھوں، بازوؤں اور ٹانگوں سے ایک ایسی تصویر کھینچ دی جیسے روپہلی اژدہا بادلوں میں اڑ رہا ہو۔ شراب، رقص اور سرود نے تھائی سلچ کو ترونا کے سایوں میں پہنچا دیا۔ بجھتی ہوئی آگ کی طرح اپنی بیوی، اپنی سالی، اپنے خاندان اور اپنے وطن کی یاد اس کے دماغ میں جھلملائی۔ ٹوڈ تھ خون کا پیاسا ٹوڈ تھ ہی صرف ایسا تھا جو اپنے ہوش میں تھا۔ ایک طوفان کی طرح غصہ اس کے دل میں اٹھا۔ ان خطرات کو بھول کر جن کا اندیشہ تھا تھائی سلچ کے منہ پر تھوکا۔ اس کو زخمی کیا اور بغاوت اور غداری کے الزام میں تھائی سلچ کو فوراً خوفناک موت کی سزا دے دی گئی۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور اسے باندھ کر ایک خالی اچار کے مرتبان میں ڈال دیا گیا۔ ٹوڈ تھ کے احکام پر سرتاپا اس قیدی کے جسم پر کھولتا ہوا پانی ڈالا گیا۔ یہ تکلیف دو گھنٹے سے زیادہ تک جاری رہی۔ جب تھائی سلچ کا جسم ایک چوزے کی طرح پک گیا تو ٹوڈ تھ نے اسے اپنے محل کے بائیں جانب دفن کرا دیا۔

ٹرنگ ٹریک نے جب یہ خبر سنی تو وہ دل شکستہ اور خشم آلود پہاڑوں میں بھاگ گئی۔ اس نے لوگوں میں دل ہلا دینے والا اعلان کیا۔ انام کے سینکڑوں، ہزاروں محب الوطن پہاڑوں پر جمع ہوئے اور ٹرنگ ٹریک کی محکومی اختیار کر لی۔ اپنی بہن ٹرنگ نہی اور کئی وفادار جرنیلوں کی رائے سے اس نے جنگ کے لئے ایک فوج بنائی۔ ایک سال کی لگاتار محنت کے بعد دونوں شہزادیاں ایک ہزار ہتھیار بند اور جنگجو آدمیوں کی فوج بنانے میں کامیاب ہوئیں۔ انھوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور ٹوڈ تھ پر ٹوٹ پڑیں۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی دو سفید گھوڑوں پر سوار سنہری تلواریں لئے جنگی احکام جاری کر رہی تھیں۔ انام کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہم جنگ دونوں شہزادیوں کی فوج اور چینی فوج کے درمیان ہوئی۔ اپنے بھالوں، تلواروں اور برچھوں سے دونوں شہزادیوں کی فوج نے ٹوڈ تھ کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ دست بدست لڑائی ہو رہی تھی۔

دونوں رانیوں کی بہادری اور حب الوطنی کی گرمجوشی نے انام کے سپاہیوں میں اتنا جوش پیدا کیا کہ وہ شیروں کی طرح لڑے۔ ٹوڈ تھ کی فوج بھاگ گئی اور وہ قید کر لیا گیا۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے ایک مہینے میں ساٹھ شہروں سے زیادہ فتح کئے۔

تھائی ساچ کا بدلہ لے کر انھوں نے قوم کی لاج رکھ لی اور نام وائٹ کی رانیاں ہونے کا اعلان کر دیا۔

فغفور چین قوانگ وو نے جب ان دونوں رانیوں کی طاقت اور مقبولیت کا ذکر سنا۔ تو تین سال تک انھیں گفت و شنید کے دھوکے میں رکھا۔ ہر سال اپنے سفیروں کے ہاتھوں قیمتی تحفے، عمدہ عمدہ اعلانات اور قصیدے بھیجتا رہا۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے بھی فغفور چین کے یہاں اپنے سفیر بھیجے۔ جب یہ بات چیت چل رہی تھی تو چینی فوجوں نے ماوائن کی کمان میں نام وائٹ کی سرحد کو عبور کر لیا۔

ماں وائن کے غصے یا حملے کے زور سے ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی مرعوب نہ ہوئیں۔ وہ اپنے سفید گھوڑوں پر سوار ہوئیں اور دشمن پر جا ٹوٹیں۔ دونوں فوجوں کے درمیان بڑا خونریز مقابلہ ہوا۔ تلواروں، بھالوں اور نیزوں کی زبردست جنگ چھڑ گئی۔ اپنی دونوں رانیوں کے فرمان کے مطابق انام کی فوجوں نے اپنے وطن کی چپہ چپہ زمین کے لئے سخت مقابلہ کیا۔ تیروں کی چھاؤں میں اور تلواروں اور بھالوں کے سایہ میں یہ دونوں رانیاں خاموشی اور فخر کے ساتھ بغیر کسی ضرر کے اپنے سپاہیوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رہیں۔ ان کی تلواروں کے وار سے ہر طرف چینی سپاہیوں کے سر سوکھے پتوں کی طرح اڑ رہے تھے اور پکے ہوئے پھل کی طرح گر رہے تھے۔ ماوائن ان دونوں رانیوں کی بہادری اور دلیری کے سامنے بے بس تھا۔ ایک جکڑے ہوئے شیر کی طرح خشم آلود ہو کر اس نے اپنی چالوں کو بدل دیا۔ ہتھیاروں سے لڑنے کے بجائے اس نے صوبہ سون ٹے کو ان دو رانیوں سمیت جلا کر راکھ کر دینے کی ٹھان لی۔ اس نے شہر کے چاروں طرف گھاس پھونس اور لکڑیوں کے

ڈھیر جمع کئے اور انھیں تیل سے بھگویا۔ ایک رات جب ہوا بہت تیز چل رہی تھی اس نے اس گھاس پھونس میں آگ لگا دی۔ ہوا کے جھونکوں سے آگ شہر کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ آگ کے اس پھیلتے ہوئے دائرے اور جہنم میں دونوں رانیاں مع اپنی فوج کے جل کر خاک کا ڈھیر ہونے والی تھیں لیکن انام کی روحیں ان دونوں شہزادیوں کا مقدر دیکھ رہی تھیں۔ انھوں نے آگ پر خوب بارش کی۔ آگ کا حلقہ ٹوٹ گیا اور دونوں رانیوں کی فوج سانڈوں کے ریلے کی طرح دشمن پر جا ٹوٹی۔ چینی فوج پھر بھاگ گئی اور مقبوضہ علاقے کو خالی کر دیا۔ ماوائن کا غصہ بحر چین کی طرح تند و تیز ہو گیا۔ لاج کا خیال ایک افعی کی طرح اس کا کلا ڈسے جا رہا تھا۔ دل میں کہتا۔ "ماوائن جو جنگ کا ماہر اور چین کا سب سے بڑا جرنیل ہے۔ دو کمزور عورتوں سے کبھی ہار نہ مانے گا۔ میں موت کو شکست پر ہزار درجہ ترجیح دیتا ہوں۔"
تین روز تک اس نے کچھ نہ کھایا۔ تین راتوں تک وہ بالکل نہ سویا اور سوچتا رہا۔ تیسری رات کو ماقوئی کے فیضان سے اس نے لڑائی کی ایک اور چال سوچی۔ وہ نام وائٹ کی رانیوں کی عفت و عصمت جانتا تھا۔ اس نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ گھڑیالوں، خطرے کی گھنٹیوں اور ڈھول گھنٹوں کی آواز پر جنگ روز پکڑ گئی۔ رانیوں کے جنگ آزماؤں نے ہاتھیوں پر سوار ہو کر مغلوب دشمن کا شدت کے ساتھ پیچھا کیا۔ فتح کا یقین اور اپنی فوج کی جنگی قوت پر بھروسہ کر کے ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی اپنے سفید گھوڑوں پر سوار جنگی احکام دے رہی تھیں۔ ماوائن نے اپنی فوج کو پہاڑ کی سیدھی ڈھلوان پر جمع کیا اور سب سپاہیوں کو ننگا ہو جانے کا حکم دیا۔ اور کہا کہ جوان دونوں خوبصورت عورتوں کو زندہ قید کر لائے گا اس سے ان کی شادی کر دوں گا۔ یہ کہہ کر ان شکاری کتوں کو دونوں رانیوں کی طرف للکار دیا۔ بندروں جیسے بالوں والے بھوکے بھیڑیوں کی طرح خونخوار اور جنسی خواہش کے بھوکے بارہ سنگے کی مانند ماوائن کی فوج فحش الفاظ بکتی دونوں رانیوں پر پل پڑی۔
اس خوفناک منظر اور حیا سے متاثر ہو کر ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے اپنے چہرے جھنڈوں سے چھپا لئے اور بھاگ گئیں۔ دونوں کی سحر اندازی اور حسن سے متاثر ہو کر چینی فوج نے بھیڑیوں کے ریلے کی طرح ان کا پیچھا کیا۔ دونوں رانیوں نے اپنی تلواروں اور بھالوں کی مدد سے ان بالوں والے آدمیوں میں سے راستہ کاٹ کر نکال لیا۔ ہر طرف سینکڑوں سر گر رہے تھے۔ ننگے آدمیوں کی قطاریں ٹڈی دل کی طرح ان کا گھیرا کئے ہوئے تھیں۔ غصے اور تھکن کی ماری ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی جن کا رنگ شرم کے مارے قرمزی ہو گیا بھاگیں۔ ماوائن کو اس شیطانی تدبیر کی کامیابی نے دلیر بنا دیا۔ اس نے بھی اپنے کپڑے اتار لئے۔ پسینے سے شرابور اس کا بالوں والا جسم ایک طوفان زدہ مکئی کے کھیت سے مشابہ تھا۔ اس وقت اس سے زیادہ کریہہ منظر کوئی شخص نہ تھا۔ وہ بالکل ایک انسان صورت بندر یا دیو معلوم ہوتا تھا۔ دونوں رانیوں کے تعاقب میں شامل ہونے کے لئے وہ اپنے چست گھوڑے پر سوار ہوا۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی پیچھے مڑ کر کیسے دیکھتیں سیدھی بھاگتی رہیں۔ اور ماوائن کی خونخوار فوج اشتعال دینے والے نعرے لگاتی ان کا پیچھا کرتی رہی۔ انام کی شکستہ دل فوج جس میں سخت ابتری پھیل گئی تھی مایوس ہو کر بھاگ گئی۔ ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی نے فوج کو جمع کر کے دفاعی حملہ کرنے کی آخری کوشش کی۔ لیکن افسوس وقت گزر چکا تھا۔
دونوں رانیاں اگرچہ گھری ہوئی اور ہر طرف سے حملے کی زد میں تھیں لیکن وہ دو شیرنیوں کی طرح مقابلہ کرتی رہیں۔ ان کی تربیت کامل جرنیلوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ دونوں کی ٹانگیں زخمی ہو گئی تھیں پھر بھی انھوں نے ہزاروں چینیوں کے سر اڑا دئے اور لڑتی بھڑتی اپنا راستہ کاٹ پھر بھاگ نکلیں۔
جب دونوں دریائے ڈے پر پہنچیں تو ان کے جرنیل اور فوج کے سپاہی سب بھاگ چکے تھے۔ دونوں رانیاں وما اژدہوں کی طرح اپنے گھوڑوں سمیت تیز رو اور جھاگ دار پانی میں کود پڑیں۔
ٹرنگ ٹریک نے کہا۔ "ایک شاندار موت بے حیائی سے بہتر ہے۔"
ٹرنگ نہی نے جواب دیا۔ "بے شک ایک شاندار موت بے غرتی سے بہتر ہے۔"

ساجن سے

تم لاکھ چھپو سو پردوں میں، یہ آنکھیں پتہ لگا لیں گی
پہچان بھلا کیسے بھولے   آنکھوں میں سُندر چھبی جھولے
لاکھوں میں اپنے ساجن کو یہ آنکھیں ڈھونڈ نکالیں گی
پھولوں میں تم مسکاتے ہو   مدھر نوں میں تم گاتے ہو
چھپ کر بھی تو تم چھپ نہ سکے، یہ آنکھیں درشن پا لیں گی
کتنی گھنگھور گھٹائیں ہوں   اندھیاری دسوں دشائیں ہوں
پونو کا چاند نہ چھپ سکتا، کرنیں ہی پتہ بتا دیں گی

چترنجیت

دریائے ڈے کا لہریں مارتا ہوا پانی دونوں کو بہا کر لے گیا۔ ماوائن اور اس کی فوج جب دریائے ڈے تک پہنچی تو کنارے کو ویران اور درختوں کو اداس پایا۔ چینی جرنیل نے جھاڑیوں میں شکاری کتوں کو چھوڑ دیا۔ کتوں نے ادھر ادھر سونگھا۔ زمین کو کھرچا اور بھونکنے لگے۔ انام کی خوبصورت رانیاں جھاڑیوں میں روپوش نہ ہوئی تھیں۔

ماوائن کے حکم سے ہزاروں بلیاں۔ کشتیاں اور چینی ڈونگے دریا میں ڈال دئے گئے۔ ماہر سے ماہر غوطہ خوروں نے دلیر سے دلیر مچھیروں اور دوسرے لوگوں نے پانی میں کود کر دونوں رانیوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ پورے دن کی مسلسل تلاش کے بعد یہ لوگ ان دونوں کی لاشیں نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ ماوائن نے اپنے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ان دونوں کی لاشوں کو چیر ڈالو اور ان کے دل میرے سامنے پیش کرو۔ ڈھولوں کی آواز کے ساتھ ماوائن کے سنہری تخت کے سامنے ایسی رکابیوں میں جو سیپیوں سے منقش تھیں دونوں کے دل پیش کئے گئے۔ ان دلوں کو جنتیانا شراب سے بھرے ہوئے چینی کے دو گلدانوں میں ڈال کر ماوائن نے تحفہ کے طور پر فغفور چین کو بھیجدیا۔ پھر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ان دونوں رانیوں کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دو۔

ٹرنگ ٹریک اور ٹرنگ نہی کی یاد اور اعزاز میں سونگ ٹے کے سبز و شاداب کناروں پر ایک مندر بنا ہوا ہے جو خوبصورتی اور سجاوٹ میں انام کے کسی مندر سے کم نہیں۔ انام کے بادشاہ نے ان قوموں کے بہادروں کو "نام وائٹ کے رشی" کے خطاب دئے۔ اور ان کے مندر کو "تھان تھائی یعنی کامل عورتوں کے شہر" کے شہر سے موسوم کیا ہے۔

دونوں شہزادیاں مرگئیں، لیکن ان کی یاد غیر فانی ہے۔ وہ مر کر بھی زندہ جاوید ہیں۔

ہم پرشیڈنٹ ہیں

بقیہ صفحہ ۳۹

کیا کہا کچھ سمجھے آپ؟"

"ہا ہا ہا ہا! آپ ہیں کس پھیر میں؟ ضلع صاحب نے ہمیں بڑے بڑے اختیار دے رکھے ہیں۔ ہم چاہے جس پر جرمانہ کر دیں، چاہے جس کو جیل بھیجدیں، چاہے جس کا مکان دھول میں ملوا دیں۔ ہمیں بہت جلدی پھانسی دینے کا اختیار بھی ملنے والا ہے۔ سکول میں بڑے صاحب کا پروانہ آیا تھا۔ ماسٹر جی نے اس پہ ہمارے دستخط بھی لئے تھے۔ زیادہ سٹرپٹر کیجئے گا تو ہم آپکو بھی...... کچھ آیا سمجھ میں یا نہیں؟"

"آپ نے پاگل خانے کی ہوا کھائی ہے؟"

"پاگل خانے کی ہوا کھائیں ہمارے دشمن۔"

"کچھ تو آپ کو بھی کھانی چاہیئے۔" یہ کہہ کر تھانیدار صاحب نے ایک کانسٹبل کو حکم دیا: "دیکھتے کیا ہو۔ ان کو حوالات میں بند کر دو کل پاگل خانے بھجوا دیں گے۔"

یہ حکم پاتے ہی کانسٹبل نے سیٹھ جی کو حوالات کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔ اب تو سیٹھ جی کی عجب حالت ہوئی۔ وہ کبھی کانسٹبل سے کہتے تھے۔ "اے جمعدار صاحب سنئے" "تو ہم پرشیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں"۔ "ابے گردن اتنے زور سے تو نہ دبایئے۔ انا ڑی مجسٹریٹ ہوں۔ آپ کو مٹھائی کھلوا دیں گے" کبھی تھانیدار صاحب کو تاکتے تاکتے پکارنے لگتے تھے: "کچھ تو لحاظ کیجئے، تھانیدار صاحب بھگوان قسم ہم پرشیڈنٹ ہیں، منسٹر ہیں۔ انا ڑی مجسٹریٹ ہیں۔ کیا اندھیر ہے۔ آپ تو سنتے ہی نہیں۔ بھگوان قسم ہمارے سکتر کو بلوا لیجئے۔ اور بڑے صاحب کا وہ پروانہ......"

تھانیدار صاحب قہقہہ لگا کر بولے: "دیکھا ہے، دیکھا ہے۔ وہ لپٹن کی چائے کا اشتہار ہے جو لی جی ہمارے ہی پاس سے لے گئے تھے۔"

(ہندی آجکل سے ماخوذ)

قطعات

پروین مرادآبادی

موجِ سراب

چار دن کا شباب ہے دنیا
خواب ہے ایک خواب ہے دنیا
دلِ ناداں! سمجھ نہ آبِ حیات
ایک موجِ سراب ہے دنیا

دولتِ دل

ہر نشاں وجہِ بے نشانی ہے
اک فسانہ ہے اک کہانی ہے
دولتِ دل ہے جاوداں پرویںؔ
اور جو کچھ یہاں ہے فانی ہے

تلخ حقیقت

سینہ کاوی ہے دل فگاری ہے
زندگی ایک بیقراری ہے
بزمِ عالم کے ذرے ذرے پر
کیفیتِ یاس طاری ہے

روس میں کتابوں کی اشاعت

سوویٹ یونین میں کتابیں انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئی ہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔

ملک میں سیاسی زندگی کا ایک خاص انداز، حکومت اور سماج کے کاموں میں ہر طبقہ اور گروہ کے لوگوں کی دلچسپی، مدرسہ کی تعلیم کا بلند معیار اور کالج میں تعلیم کی سہولتیں، اور ملک میں عام طور پر ایک وسیع پیمانہ پر پھیلی ہوئی کلچرل سرگرمیاں ——— ان سب چیزوں کا اثر کتابوں کی اشاعت پر پڑتا ہے۔

سوویٹ عہد نے ملک میں ایک نئی طرح کے پڑھنے والے پیدا کر دئے ہیں ——— ایسے پڑھنے والے جن کے ذہن تحقیق اور تفتیش کے شیدائی اور حصول علم کے سچے جویا ہیں۔ ایسے لوگ بغیر کتابوں کے جی ہی نہیں سکتے۔ یہ بات پچھلی جنگ نے پوری طرح ثابت کر دی۔ سرخ فوج کا ہر سپاہی، اس کی زندگی خواہ کتنی ہی سخت کیوں نہ ہو اپنے پاس ایک کتاب ضرور رکھتا تھا۔ بہت سی ایسی کتابیں پچھلے دنوں عجائب گھروں میں داخل کی گئی ہیں، جو یا تو چھلنی ہوئی تھیں یا ان پر خون کے دھبے تھے ——— یہ ایسے سپاہیوں کی کتابیں ہیں جنھوں نے میدان جنگ میں مرتے وقت بھی انھیں اپنے سے جدا نہیں کیا۔

انقلاب سے پہلے ساری کتابیں عموماً غیر سرکاری ناشر شائع کرتے تھے یہ کتابیں صرف ایک محدود طبقہ کے لوگوں کے لئے چھپتی تھیں ——— صرف ایسے لوگ جو کتابوں پر بہت سی رقم خرچ کر سکتے تھے۔ یہ کتابیں ملک کے اکثر لوگوں تک پہنچ سکتی تھیں ——— نہ صرف اس لئے کہ ان کی رقمیں بہت زیادہ تھیں، بلکہ اس لئے بھی کہ اکثر لوگ پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔

۱۹۱۷ء کے بعد کتابوں کی اشاعت کا کام حکومت کے ہاتھ میں آگیا۔ اور پہلا کام یہ کیا گیا کہ اشاعت گھروں کی تعداد بڑھائی جائے اور ان کے دائرۂ عمل کو وسیع کیا جائے۔ سنہ ۱۹۳۰ء تک تقریباً ۱۷۰ سوویٹ اشاعت گھر ہوگئے اور ان کے علاوہ مختلف علمی اداروں اور وزارتوں کے مرکزوں پر پچاس ادارتی اور اشاعتی شعبہ اور قائم ہوئے۔ اس سال ادارتی اور اشاعتی کام کرنے والوں کی تعداد آٹھ ہزار سے بھی اونچی تھی۔ اس تعداد میں چھاپہ خانوں اور اشاعت گھروں کا انتظامی اور ٹکنکل اسٹاف شامل نہیں ہے۔

۱۹۳۷ء میں ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں دوگنی کتابیں شائع ہوئیں اور ان کی مجموعی تعداد ۱۹۱۳ء کے مقابلہ میں آٹھ گنی تھی۔ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۳۷ء میں طباعت کی نسبت ۳۳۰۰ اور ۱۸۰۰۰ تھی۔

انقلاب سے پہلے کے زمانہ میں اکثر کتابیں روسی زبان میں تھیں اور سینٹ پیٹرزبرگ اور ماسکو میں چھپتی تھیں ان میں کچھ کتابیں ایسی تھیں جو خاص خاص علاقوں کی مقامی زبانوں میں چھپتی تھیں لیکن ان کی تعداد کل تعداد کے دسویں حصہ سے بھی کچھ کم تھی۔ ۱۹۳۷ء میں مقامی زبانوں میں چھپنے والی کتابوں کی تعداد کل تعداد کے چوتھائی حصہ سے بھی کچھ زیادہ ہوگئی۔ علاوہ بریں ۱۹۱۳ء میں روسی علاقوں کی ۴۸ مختلف زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں اور آج ۱۱۵ مختلف زبانوں میں چھپتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سوویٹ انقلاب کے بعد ۴۰ مختلف روسی قوموں کی زبانیں اس قابل ہو گئی ہیں کہ ان میں کتابیں چھپ سکتی ہیں۔

کتابوں کے موضوعوں میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انقلاب سے پہلے کی اشاعتوں میں سب سے نمایاں جگہ مذہبی ادب کو ملتی تھی اور تقریباً ساری کتابوں میں حاکم گروہ کے مفاد کی جھلک نمایاں تھی۔ اور آج کل سب سے اہم جگہ سائنس، سیاست اور افسانہ کی کتابوں کا حاصل ہے۔

سماجی اور معاشی مسائل کی کتابوں کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ مارکسیت اور لینینیت پر جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان کی تعداد حیرت انگیز ہے ۱۹۳۷ء تک مارکس، انجلس، لنن اور اسٹالن کی لکھی ہوئی کتابیں سوویٹ کی ۸۵ زبانوں میں ۳۶۰،۰۰۰،۰۰۰ کی تعداد چھپ چکی تھیں۔ جنگ کے دوران میں صرف اسٹیٹ پولٹکل پبلشنگ ہاؤس نے اسٹالن کی کتابوں کے ۷۰،۰۰۰،۰۰۰ نسخے شائع کئے۔

زراعت، ریاضی، نیچرل ہسٹری، طب، زبان اور آرٹ کی کتابیں بھی افسانوی ادب کی طرح بڑی بڑی تعدادوں میں چھپتی ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں افسانوی ادب کے صرف ۱۶،۰۰۰،۰۰۰ نسخے چھپے تھے ۱۹۳۷ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۱۱۸،۰۰۰،۰۰۰ ہوگئی۔ کسی ناول کی اوسط اشاعت ۱۹۱۳ء میں ۲۴۰۰ تھی تو ۱۹۴۱ء میں ۳۰،۰۰۰ ہوگئی۔

ذیل میں کلاسیکی ادب کی اشاعت کا ایک تقابلی نقشہ درج کیا جاتا ہے۔

اے۔ نزاروف

روسی کلاسیکی ادب

	۱۸۹۷ — ۱۹۱۷	۱۹۱۷ — ۱۹۳۷
گورکی	۱۰۸۳،۰۰۰	۳۶،۹۲۳،۰۰۰
پشکن	۹۱۶۵،۰۰۰	۲۶،۴۲۶،۰۰۰
لیوٹالسٹائی	۸۹۹۱،۰۰۰	۱۵،۹۲۶،۰۰۰
چیخوف	۵۲۰،۰۰۰	۱۳،۰۲۹،۰۰۰
نکراسوف	۱۹۴،۰۰۰	۵،۸۶۰،۰۰۰
سالتکوشادرین	۶۵،۰۰۰	۵،۲۶۱،۰۰۰

لرمانتف	۲۴۹۶،۰۰۰	۳،۷۸۶،۰۰۰
شوخنکو	۶۲۹،۰۰۰	۲،۷۰۵،۰۰۰
آستروسکی	۱۳۵،۰۰۰	۲،۶۹۳،۰۰۰

مغربی کلاسیکی ادب

مالپساں	۱،۳۰۷،۰۰۰	۲،۹۳۳،۰۰۰
ہیوگو	۳۹۷،۰۰۰	۲،۶۷۸،۰۰۰
زولا	۸۴۸،۰۰۰	۱،۹۲۶،۰۰۰
ڈکنس	۷۴۷،۰۰۰	۱،۷۱۰،۰۰۰
فرانس	۵۲۳،۰۰۰	۱،۵۷۸،۰۰۰
بالزک	۱۰۰،۰۰۰	۱،۲۷۳،۰۰۰
شیکسپیر	۵۱۵،۰۰۰	۹۲۵،۰۰۰
ہائنے	۱۲۳،۰۰۰	۷۵۳،۰۰۰
سروانٹیز	۱۰۸،۰۰۰	۴۶۲،۰۰۰
بائرن	۱۴۷،۰۰۰	۲۷۸،۰۰۰

جہاں تک شیکسپیر کا تعلق ہے روس کے لوگ اس کے ڈرامے پڑھنے کے بجائے انھیں اسٹیج پر زیادہ دیکھتے ہیں۔ اور روسی اسٹیج پر شیکسپیر کے ڈرامے دنیا کے ہر حصہ سے زیادہ دکھائے جاتے ہیں۔

انقلاب کے بعد ہی سے یہ ممکن ہو سکا ہے کہ سوویٹ قوموں کے اکثر لوگ دوسرے ملکوں کا کلاسیکی ادب اپنی اپنی زبانوں میں پڑھ سکیں۔ جن صنفوں کے نام یہاں لکھے گئے ہیں، ان کی اور ان کے علاوہ دوسرے ادیبوں کی کتابوں کے ترجمے تقریباً ساری اہم سوویٹ زبانوں میں ہو چکے ہیں۔

جنگ کے دوران میں چھاپے خانوں اور اشاعت گھروں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے چھاپہ خانوں پر نازیوں نے قبضہ کر کے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ لینن گراڈ روسی طباعت و اشاعت کا خاص مرکز ہے اور جرمنوں کے محاصرہ نے یہاں کے کام میں بڑا خلل ڈالا تھا۔ چھاپہ خانوں اور اشاعت گھروں کے اکثر کام کرنے والوں کو فوجوں میں بھرتی کر لیا گیا تھا۔ اور اس کے علاوہ کاغذ، گتے اور جلد سازی کے سامان کی بھی بے حد کمی تھی۔ ان ساری دقتوں کے باوجود ۱۹۴۳ء میں ۱۵،۰۰۰، ۱۹۴۴ء میں ۱۷،۰۰۰ اور ۱۹۴۵ء میں ۱۸،۰۰۰ جلدیں چھپیں۔ جنگ کے شروع شروع میں چھوٹے چھوٹے حجم کے رسالے شائع ہوتے رہے۔ لیکن آگے چل کر سیاسی، علمی اور فسانوی ادب کی ضخیم کتابیں بھی شائع ہونے لگیں۔

سوویٹ اشاعت گھر اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ جنگ کے بعد کے زمانہ میں اشاعتوں کی تعداد اتنی کثیر ہونی چاہیے کہ جنگ سے پہلے کی تعداد اس کے مقابلہ میں بالکل حقیر بن جائے۔

بلبلا

ناظم صدیقی

بلبلا جسقدر نازک اور حسین ہوتا ہے اسیقدر دلکش اور دلفریب بھی اس کی مدور شکل، اس کے شوخ اور ہر آن بدلتے رہنے والے بے شمار رنگ، اس کی انتہائی نزاکت ہمیں صابن کے آبی محلول سے اس کی تخلیق، باد صبا کے دوش پر اس کی سبک روی، کچھ ایسی خصوصیات جو ہمیشہ سے اس کو بچوں اور بڑوں کے لئے جاذب نظر بنائے ہوئے ہیں اس کی ذات سے اتنے عجیب استعارات اور ایسی لطیف تشبیہات متعلق ہیں کہ پرواز تخیل اور ندرت خیال کی داد دئے بغیر چارہ نہیں۔ ملاحظہ ہو۔

چھوٹا سا ایک خیمہ آبی کہوں اسے ... یا گنبد فلک سے میں تشبیہ دوں اسے
جام بلور ہے جو کروں واژگوں اسے ... کس مست بادہ خوار نے پھینکا نکال اسے
کس نازنیں کی بزم کا یارب یہ جام ہے ... سارے جہاں کی نازکی جس پر تمام ہے

(محروم)

لگا کے بحر میں غوطے حباب ابھر نکلے ... صدف کے منہ کے چمکتے ہوئے گہر نکلے

(اوج)

کس نے دیکھا اس سوا بہتا ہوا ... آب پر الٹا کٹورا سیم کا

(نظیر)

اس کی حیات مختصر اگر نادر کا کوری کی نظروں کے آگے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی ناپائیدار کی بے بضاعتی کا نقشہ کھینچ دیتی ہے کہ

ہے حباب بحر کے مانند انجام حیات ... ایک غوطہ کھانے میں لبریز ہے جام حیات

تو غالب کو ہمت و جسارت کا سبق پڑھاتی ہے۔

از حباب آموز ہمت را کہ با صد احتیاج
خالی از دریا برون آرد سبوئے خویش را

اور محروم کو اپنی آن بان میں ایک مغرورانہ شان دکھاتی ہے۔

پھولا ہوا ہے کس لئے کیا بلبلے میں ہے
اللہ کونسی یہ ہوا بلبلے میں ہے
اُف کسقدر غرور بھرا بلبلے میں ہے
فرعون کیا یہ آکے چھپا بلبلے میں ہے
کتنا ابھار کتنی اکڑ کیسی شان ہے
پانی کی ایک بوند میں کیا آن بان ہے

لیکن جس بلبلے نے ہمیشہ فکر و نظر کو دعوت دی، دنیا اس کی حقیقت سے زمانۂ قریب تک آشنا نہ ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ مشاہدہ اور تجربہ کی مدد سے طبعی اور کیمیائی نظرئے قائم ہو چکے تھے مگر حسابی تحلیل سے جب تک ان کی تصدیق و توثیق نہ ہوئی بلبلے کی عجیب اور حیرت افزا خصوصیات کی تشریح و توضیح تشفی بخش ثابت نہ ہو سکی لیکن ان طبعی اور کیمیائی نظریوں پر روشنی ڈالنے سے قبل بلبلے کا مطالعہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بلبلا دراصل ہوا کے دباؤ کیوجہ سے بنتا ہے یہ بالعموم منہ سے پھونکنے پر اور بعض اوقات مصنوعی پمپ کے ذریعہ ایسے ہی ابھر آتا ہے جیسے بچوں کے کھیلنے کا غبارہ یا فٹ بال کا بلیڈر ہوا بھرنے سے پھول جاتا ہے۔ ایک اور لائق توجہ چیز اس کے خوشنما رنگ ہیں اور اس کے بعد بلبلے کی انتہائی لطافت یا سبک پن قابل غور ہے۔ صابن کے ایک محلول کے قطرے سے اگر ایک ہی بلبلا بنایا جا سکتا تو یہ ایک سنگ خانہ کے برابر بڑا ہوتا۔

بلبلے کے ہوا پر اڑنے کا راز دراصل اس کے سبک پن میں پوشیدہ ہے۔ ان تمام امور کو سمجھنے اور بلبلے کے متعلق کچھ سائنسی معلومات حاصل کرنے کے لئے سطحی تناؤ سے واقف ہونا ضروری ہے۔

سطحی تناؤ

کسی غبارہ یا بلیڈر میں جب دباؤ کے تحت ہوا بھری جائے تو وہ ربڑ کو پھاڑ کر نکل جانے کی متقاضی ہوتی ہے اگر ربڑ میں کوئی ایسی قوت موجود نہ ہو جو ہوا کے دباؤ کا مقابلہ کرے اور ربڑ کو پھٹنے سے روکے تو ہوا کا مقید رکھنا ممکن نہیں۔ لیکن ربر کی یہ قوت مزاحمت محدود ہوتی ہے اگر پمپ کے ذریعہ برابر ہوا بھرتے رہیں تو ایک حد ایسی آجاتی ہے جب ربر کی قوتِ مزاحمت ہوا کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے مقابلہ میں کمزور پڑ جاتی ہے۔ اور اس وقت غبارہ پھٹ جاتا ہے۔ یہی حال بلبلے کا بھی ہے۔ ہم اس میں آہستہ آہستہ منہ سے ہوا بھرتے رہتے ہیں۔ اور وہ بتدریج بڑھتا رہتا ہے۔ مگر بالآخر ٹوٹ جاتا ہے۔ بلبلے کی وہ جھلی، جسکے اندر ہوا بند ہو جاتی ہے، وہی کام کرتی ہے جو غبارہ میں ربر انجام دیتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ بلبلا بظاہر ٹھوس نظر آتا ہے مگر درحقیقت مائع ہوتا ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تناؤ یعنی سکڑنے اور پھیلنے کی خصوصیت بلبلے میں اسی طرح موجود ہوتی ہے جس طرح ہوا بھرے ہوئے غبارہ میں چونکہ یہ تناؤ کی قوت جھلی یا ربر کی سطح پر ہر جگہ مساوی عمل کرتی ہے اس کو سطحی تناؤ کہتے ہیں۔

یہ تناؤ کچھ بلبلوں تک محدود نہیں بلکہ تمام مائعات کی سطحوں پر موجود ہوتا ہے۔ مائعات کی سطح بالعموم چپٹی ہوتی ہے اور ایسی تمام سطحوں کا عمل ہوتا ہے گویا وہ ایک تنی ہوئی جلد سے ڈھکی ہوئی ہیں اور یہی وہ عجیب خصوصیت ہے جو بہت سے حیرت انگیز واقعات کا باعث ہوتی ہے۔ مثلاً پٹرول کے چند قطرے پانی کی ایک کافی وسیع چادر پر ڈالے جائیں تو وہ بہت تیزی سے ہر طرف کو پھیلنے لگتے ہیں حتیٰ کہ پانی کی سطح پر پٹرول کی ایک بہت پتلی تہہ قائم ہو جاتی ہے اور قوس قزح کے وہ تمام رنگ جو ہم بلبلے میں دیکھتے ہیں اس میں بھی نظر آنے لگتے ہیں۔

پٹرول جب پانی پر ڈالا جاتا ہے تو وہ قطروں کی شکل میں

پانی پر کیوں نہیں تیرتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں پانی اور پٹرول کی سطحیں ملتی ہیں وہاں سطحی تناؤ گھٹ جاتا ہے۔ اندر اس کے اطراف کی سطح جہاں تناؤ زیادہ ہوتا ہے کمزور تناؤ کی جگہ پر اثر انداز ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سطح کا رقبہ جہاں پانی اور پٹرول ملتے ہیں تیزی کے ساتھ مسلسل بڑھتا رہتا ہے۔ بالفاظ دیگر پٹرول ہر طرف کو سرعت سے پھیلنے لگتا ہے اس طرح کافور کا ایک ٹکڑا پانی کی سطح پر اضطراب کے سے عالم میں ادھر ادھر ناچتا پھرتا ہے گویا غیر مرئی قوتیں اس پر زور آزما ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کافور جس مقام پر پانی کی سطح سے مس کرتا ہے وہاں سطحی تناؤ کم ہو جاتا ہے اور اطراف کا بڑھا ہوا تناؤ کافور کو سطح آب پر متحرک کر دیتا ہے۔ پانی کے برتن میں اگر دونوں طرف سے کھلی ہوئی ایک باریک نلی کو عموماً کھڑا کیا جائے تو سطحی تناؤ کے باعث پانی نلی میں چڑھ جاتا ہے۔ ایسی پتلی نلی کو شعری نلی کہتے ہیں۔ اور یہ خاصیت شعریت یا شعری جذب و دفع کی طاقت کہلاتی ہے۔

اگر شکر کا ایک ڈلا چائے کی پیالی پر اس طرح رکھیں کہ اس کی سطح چائے سے مس کرتی رہے تو چائے اوپر چڑھنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ سارا ڈلا تر ہو جاتا ہے۔ شکر کا ڈلا ٹھوس نہیں ہوتا۔ اس کے اندر ہوا کی باریک باریک نالیاں موجود ہوتی ہیں جو بے شمار شعری نلیوں کی مانند عمل کرتی ہیں اسی کی وجہ سے چائے اوپر چڑھ جاتی ہے۔

بعض دیگر خصوصیات

اب یہ دیکھنا ہے کہ بلبلا مدور کیوں ہوتا ہے؟ بیضوی یا مکعب شکل کا کیوں نہیں ہوتا؟ ہم یہ دیکھ چکے کہ بلبلے کی جھلی اندر کی ہوا پر دباؤ ڈالتی ہے جس کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ہوا کو باہر نکال دے۔ جھلی میں سکڑنے کا میلان ہوتا ہے اور درحقیقت یہ سکڑ کر کم سے کم رقبہ اختیار کر لیتی ہے۔ کسی خاص حجم کی چیز کو رکھنے کے لئے کم سے کم سطحی رقبہ کا برتن اصولاً ایک کرہ ہی ہو سکتا ہے چنانچہ جب ایک ترمچی ترم بجاتا ہے تو جہاں تک اس کے چہرے کی ساخت اجازت دیتی ہے اس کے گلے کروی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

بلبلے کے اندرونی دباؤ کو اگر ایک دم آزاد کر دیا جائے تو ایک جلتی ہوئی شمع کو گل کرنے کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ غالباً یہ بات بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ ایک بڑے بلبلے کے مقابلے میں چھوٹے بلبلے کا اندرونی دباؤ زیادہ ہوتا ہے اس کو عملی طور پر بھی آسانی کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ شکل (۱) میں بنائے ہوئے آلے کے ذریعہ ایک چھوٹے اور ایک بڑے بلبلے میں ربط قائم کیا جائے تو چھوٹا بلبلا بڑے کو اور پھلا دیتا ہے۔ چھوٹا اور چھوٹا ہو جاتا ہے اور بڑا بڑھنے لگتا ہے۔ آلے میں مقامات ۱ و ۲ و ۳ پر ٹونٹیاں لگی رہتی ہیں۔ ب ۱ پر ایک

شکل (۱)

چھوٹا اور ب ۲ پر ایک بڑا بلبلا پھونکنے کے بعد تمام ٹونٹیاں بند کر دی جاتی ہیں جب ٹونٹی نمبر ۲ کو کھولتے ہیں تو بڑا بلبلا پھولنے لگتا ہے اور آخر ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک ب ۲ میں ہوا داخل نہ ہو اس کا پھولنا ممکن نہیں اور اس میں ہوا اسی وقت داخل ہو سکتی ہے جبکہ ب ۱ کے اندر کا دباؤ ب ۲ کے دباؤ سے زیادہ ہو۔

بلبلے یا جھاگ (کیونکہ جھاگ بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے بلبلوں کا مجموعہ ہے) پیدا کرنا مائعات کی کوئی مشترکہ خصوصیت نہیں ہے معمولی صاف پانی، میتھل ملی ہوئی روح شراب، وہسکی اور برانڈی میں بلبلے یا جھاگ اڑانا امر محال ہے۔ سمندر کے پانی، مدوجزری دریا کے میلے پانی، بیر، سٹاوٹ اور ایسے تمام سیال مادوں میں جن کا تعلق حیوانی یا نباتاتی اجسام سے ہو، اور ان سب سے زیادہ صابن کے محلول میں جھاگ یا بلبلے پیدا کرنے کی خصوصیت بہت نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام سیال لعابدار ہوتے۔ ان میں چپچپاہٹ پائی جاتی ہے۔ مثلاً نشاستہ یا گوند کا محلول ان کے سالمات غیر معمولی بڑے ہوتے ہیں اور یہ معمولی سالمات کے باہم چمٹ جانے سے بنتے ہیں۔ ان غیر معمولی بڑے سالمات میں برقی بار ہی موجود ہوتا ہے۔ لعابی محلول اپنے اکثر خواص میں معمولی محلولوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جھلی میں سے نہیں گزر سکتے۔

غرض جب ہم صابن کے محلول سے بلبلے بنتے ہوئے، یا بیر میں سے جھاگ اٹھتے ہوئے یا سمندر کے پانی سے کف پیدا ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمارے پیش نظر کوئی معمولی محلول نہیں بلکہ لعابی محلول

ہوتا ہے سمندر کا پانی معمولی نمک کا ایک ہلکا سا محلول ضرور ہے۔ لیکن اس میں لعابی مادے بھی موجود ہوتے ہیں۔ اور بالخصوص ساحل کے قریب جہاں پانی میں حیوانی اور نباتی مادے پڑے ہوئے سڑتے رہتے ہیں۔ ان تمام مادوں میں لعابدار اشیاء کثرت سے موجود ہوتی ہیں۔

بلبلے کے شوخ رنگ

کسی جوہڑ میں گدلے پانی کی سطح پر جو رنگ نظر آتے ہیں یا گیلی سڑک پر بکھرے ہوئے پٹرول میں۔ وجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتی ہے۔ البتہ رنگ نمودار ہونے کے لئے جھلی کا بہت باریک ہونا ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جھلی کتنی باریک ہو؟ اس کا جواب ایک انچ کی کسی کسر میں آسانی سے دیا جا سکتا ہے لیکن اس سے جھلی کی دبازت کا کوئی واضح تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ البتہ زیادہ بہتر اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ایک پیسہ کو کوٹ پیٹ کر بلبلے کی جھلی کے برابر باریک ورق بنایا جائے تو وہ کھانے کے ایک بڑے کمرے کے رقبے کے مساوی ہوگا۔

تقریباً سو سال گذرے جب تھامس ینگ نے یہ بتایا تھا کہ صابن کے بلبلے کے رنگوں کی تشریح نظریہ امواج نور کے ایک ضمنی نتیجہ کے طور پر کی جا سکتی ہے۔

سمندر میں جب دو مختلف مقامات سے موجیں اٹھ کر کسی ایک جگہ ملتی ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ یہی کہ اوج اگر اوج سے ملے تو دگنی بلندی کی اوج پیدا ہوگی۔ اور جب حوض حوض سے ملے گی تو نتیجہ میں دگنی گہرائی کی حوض قائم ہوگی۔ لیکن اوج اور حوض آپس میں ملیں تو موج کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ رقمی جمع و خرج کی طرح امواج کو جمع کرنے کا یہ اصول تعرض یا تداخل کہلاتا ہے۔ آواز اور نور کی موجوں میں بھی یہی صورتیں پیش آتی ہیں۔ ان کی موجوں کے دو جوڑ جب ایک دوسرے تعرض کرتے ہیں تو بلند آواز تیز روشنی یا خاموشی اور تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ تعرض کے لئے موجوں کے دو جوڑ ہونے چاہئیں۔ بلبلے میں نور کی شعاعیں صابن کی جھلی کی بیرونی اور اندرونی سطح منعکس ہوتی ہیں تو موجوں کے دو جوڑ بنجاتے ہیں۔ جھلی چونکہ سیال مادے سے بنی ہوتی ہے اس کی موٹائی مختلف حصوں میں مختلف ہوتی ہے۔ کہیں یہ بہت باریک ہوتی ہے اور کہیں نسبتاً موٹی مگر مجموعی حیثیت سے اس کی دبازت نور کی موجوں کے طول کے قریب قریب مساوی رہتی ہے۔ جھلی کی بیرونی سطح سے نور کی شعاعیں منعکس ہوتی ہیں اور اندرونی سطح سے منعکس ہونے والی شعاعوں سے تعرض کرتی ہیں۔ اس تعرض کی نوعیت جھلی کی دبازت پر موقوف ہوتی ہے۔ شکل (۲) میں فرض کیجئے کہ ا۔ ب۔ ج۔ د صابن کی جھلی کا ایک حصہ ہے جس میں خط اب جھلی کی بیرونی سطح کو اور ج د اندرونی سطح کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک شعاع واقع ک د جھلی کی بیرونی سطح ا ب سے راستہ و م پر منعکس ہوتی ہے۔ اور دوسری شعاع اندرونی سطح سے منعکس ہو کر راستہ ہ ن، پر نکلتی ہے۔ و۔ م اور ہ، ن ایک دوسرے سے متعرض ہوتی ہیں۔ ان کے اوج، ملینگے یا حوض۔ یہ فاصلہ و، ن، اور ن، ہ، یعنی جھلی کی دبازت پر منحصر ہوگا۔ اگر یہ دبازت سرخ روشنی کی شدت کو دگنا کر دینے کے لئے موزوں ہے تو نیلی روشنی کو مٹانے کے لئے اس کا کافی ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ مختلف رنگوں کی روشنیوں کی موجوں کے طول مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا اس مقام پر سرخ روشنی کا انعکاس زیادہ ہوگا۔ نیلی منعکس ہی نہ ہوگی، اور باقی رنگوں کی روشنیاں ہلکی نظر آئینگی۔ غرض اس مقام پر سرخ رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہوگا۔ کسی دوسرے مقام پر جہاں جھلی کی دبازت مختلف ہے نیلی روشنی غالب ہوگی۔ و علی ہذا طیف کے تمام رنگ نمایاں ہو جائینگے۔ جھلی کی دبازت میں عام یکسانیت ہی مختلف رنگوں کی روشنیوں کی ترتیب سے قوس قزح کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ تار کے ایک حلقہ کو صابن کے محلول میں ڈبونے سے اس کے اندر ایک جھلی قائم ہو جائے گی۔ اس کے بعد حلقہ کو عمودی سمت میں لٹکا دیا جائے تو صابن کا محلول نیچے کی طرف بہنے لگتا ہے جس کی وجہ سے اوپر سے نیچے کی جانب جھلی کی دبازت بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اور مختلف رنگوں کی انتی پٹیاں ظاہر ہو کر ایک بڑا عجیب منظر پیش نظر کر دیتی ہیں۔

شکل (۲)

(رسالہ سائنس سے ماخوذ)

بسنت

برقِ موسوی

پھر بسنت آئی، گئے جاڑے، ہوئی رُت خوش گوار
مسکراتی، ناچتی، گاتی ہوئی آئی بہار

چپہ چپہ بن گیا میرے وطن کا رنگ پاش
اللہ اللہ دید کے قابل ہے سرسوں کا نکھار

جاگتی ہے جس طرح نوخیز کوئی خواب سے
یوں اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی صبحِ بہار

گل بداماں رُت، پھر آئی ناز کرتی اس طرح
مسکراتی جس طرح آئے کوئی جانِ بہار

بھینی بھینی موتیا کی بو ہوئی پھر عطر بیز
ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہیں پھر ہوائیں خوش گوار

کھلتے کھلتے یوں کھلی اس سرد موسم کی کلی
دھیرے دھیرے صبح وا ہوتی ہے جیسے چشمِ یار

عطر افشاں، نیم کے پھولوں کی خوشبو دن کو ہے
"رات کی رانی" کی نکہت رات کو ہے مشک بار

پھاگ اڑاتا آیا، پھاگن ماس پھر اس دھوم سے
ہر طرف گرنے لگے بھارت میں رنگیں آبشار

واہ کیا رنگینیاں ہیں ان دنوں صبح و مسا
واہ کیا دل چسپیاں ہیں آج کل لیل و نہار

گاؤں کے "بھولے جتیں" کھیتوں میں نکلے سیر کو
جن پہ قرباں، شہر کے پُرکار و فتنہ جو نگار

کیوں نہ موضوعِ سخن ہو، یہ بھی شاعر کے لئے!
کوئی دیکھے تو "بسنتی پوش پریوں" کا سنگار

رُخ پہ ہلدی، مانگ میں سیندور، ماتھے پر تلک
زرد کپڑے سب کے سب اور زرد ہی پھولوں کے ہار

رنگ رلیاں، اک طرف ہولی کی، آبادی میں ہیں
اک طرف جنگل میں منگل ہے، یہ سرسوں کی بہار

مختلف رنگین پوشاکیں پہن کر تتلیاں
کر رہی ہیں رقص کس انداز سے طاؤس وار

اڑ رہے ہیں بن پہ تکبیر کارواں در کارواں
چر رہی ہیں کھیت میں بھیڑیں قطار اندر قطار

آم کی شاخوں میں نکلیں ننھی ننھی کیریاں
گر رہی ہے، جھوم کر باغوں پہ کیا توتوں کی ڈار

تپتے تپتے پر ہے رقصاں فصلِ گل کی تازگی
ڈالی ڈالی پر غزل خواں مطربانِ نوبہار

چاندنی کا لطف شب کو، صبح کو کھیتوں کی سیر
کس مزے سے کٹ رہے ہیں پھر مرے لیل و نہار

خلد کی رنگین وادی میں پہنچ جاتا ہوں میں
مست کوئل کوکتی ہے صبح کو جب بار بار

کیا بتاؤں، کس خوشی سے گنگناتا اٹھتا ہوں میں
صبح جب بجتا ہے "سورج کی شعاعوں کا ستار"

کروٹیں لیتی ہے کس کس رنگ سے دل میں اُمنگ
جھٹپٹے کو پھولتا ہے جب شفق کا لالہ زار

رات کو جب آسماں پر مسکراتا ہے قمر
دل کی پھلواری پہ پڑتی ہے مسرت کی پھوار

تو کہے، پورب میں یہ کوئی اڑاتی ہے گلال
آج کل اس رنگ سے ہوتی ہیں صبحیں آشکار

تو پکارے، ہو نہ ہو، پچھم میں یہ ہوتا ہے پھاگ
یوں شفق کے شام کو بن جاتے ہیں نقش و نگار

چہرۂ خوباں سے روشن تر ہے رخسارِ سحر
گیسوئے جاناں سے بڑھ کر زلفِ شب ہے مشک بار

یہ مرا دیوان ہے، یا صبح کی رنگیں جھلک
گلشنِ کشمیر ہے، یا شام کے نقش و نگار

صبح کو گیتی پہ بہتی ہیں سنہلی ندیاں
رات کو گردوں سے گرتے ہیں رُوپہلے آبشار

کڑکڑاتی سردیوں کی گرم بازاری گئی،
اب نہ سردی ہے نہ گرمی، کیسی رُت ہے خوش گوار

اس طرح بدلا ہے موسم، جس طرح کوئی حسیں
"سرد مہری چھوڑ" "گرم مہر" ہو پایانِ کار

دیکھتے ہی دیکھتے، آجائیں گی اب گرمیاں
ہائے کیا جلدی چلا جاتا ہے یہ عہدِ بہار!

روک لیتا، کوئی دن، اس جانے والی رت کو اور
کاش برقِ موسوی! ہوتا یہ میرا اختیار

نقد و نظر

ذاکر صاحب

مصنفہ رشید احمد صدیقی، ناشر کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

اس چھوٹی سی کتاب میں ذاکر صاحب کا ذکر ہے اور رشید صاحب کی زبان سے ہے۔ موضوع بھی محبوب اور بیان بھی۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کتاب شروع کیجئے تو اسے ایک ہی سانس میں ختم کئے بغیر جی نہیں مانتا۔ یہ سب کچھ اس لئے بھی ہے کہ رشید صاحب نے ہمیں ذاکر صاحب کے متعلق وہ باتیں بتلانے کی کوشش نہیں کی جو ہم سب کم و بیش جانتے ہیں۔ ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مفکر تعلیم کی حیثیت سے، اور ملک و قوم کو ایثار اور اخلاص کا درس دینے والی ایک محبوب ذات کی حیثیت سے اب ذاکر صاحب کو کسی عقیدتمند دوست کی مدح سرائی یا نغز بیانی کے سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ان کا نام تو اب دوسروں کا سہارا بنتا ہے لیکن ایک ایسے شخص کے متعلق ایسی باتیں سننے کی تمنا ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جن کا تعلق خالص ذاتی سیرت اور اخلاق سے ہو۔ ذاکر صاحب اسی طرح کی کتاب ہے۔ رشید صاحب نے ذاکر صاحب کو ہر رنگ میں دیکھا ہے، اور اس کتاب میں ان سارے رنگوں کو ملا کر ایک بے حد حسین تصویر بنائی ہے۔ رنگوں کو اچھی طرح سمونے کی کوشش تو نہیں کی گئی (رشید صاحب کا فن اصل میں اس جاں سوزی کا قائل ہی نہیں) لیکن ان بکھرے ہوئے رنگوں میں بھی ایک کشش ہے۔

مضامین رشیدہ والے رشید صاحب اب اردو کیلئے ایک بھولی بسری یاد بن گئی ہیں لیکن ذاکر صاحب، کے بعض حصے اس بھولی بسری یاد کو تازہ کر دیتے ہیں۔ یہ غالباً ذاکر مرشد کا فیض ہے۔

کتاب اپنی معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ظاہری محاسن سے بھی مزین ہے۔ آرٹ پیپر پر چھپی ہے، کتابت اور طباعت بھی بہت اچھی ہے (سوائے شروع کے چند صفحوں کے جن میں کتابت کی بھی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں اور طباعت میں بھی صفائی نہیں آئی)

کتاب پر تبصرہ کرتے وقت انسان کو سنجیدہ ہونا پڑتا ہے اور سنجیدگی کی بارگاہ میں شکوہ و شکایت کا عمل دخل نہیں۔ پھر بھی رشید صاحب سے یہ شکوہ ہے کہ یہ کتاب اتنی مختصر کیوں ہے۔

و-ع

سازِ ہستی

مصنفہ بیگم صالحہ عابد حسین، ناشر کتابی دنیا لمیٹڈ۔ صفحات ۳۰۶، قیمت تین روپے

بیگم صالحہ عابد حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ نقش اول کئی برس ہوئے شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ گویا نقش ثانی ہے اور مجموعی حیثیت سے ان ساری خصوصیات کا حامل ہے جو نقاش کے نقش ثانی کو اس کے نقش اول سے بہتر و برتر بناتی ہیں۔ مجموعہ میں نو افسانے ہیں۔ سب کے سب زندگی کے سچے مرقعے ہیں اور سب میں زندگی کی سچائیوں کے باوجود افسانہ کی دلکشی ہے۔ موضوع کے انتخاب میں بھی اور زبان و بیان کی سادگی اور شیرینی میں بھی۔

اردو میں پچھلے چند برسوں میں کئی افسانہ نگار خواتین ایک نمایاں حیثیت سے ہماری افسانہ نگاری کے میدان میں آئی ہیں اور ان میں سے اکثر نے اپنے لئے فن کی کوئی نہ کوئی جدت مخصوص کر لی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اس جدت طرازی کی کوشش میں لغزشیں بھی ہوئی ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین افسانہ نگار خواتین میں تنہا ایسی ہیں جنہوں نے اپنے مسلک کو بدلے بغیر بھی ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ انہیں کسی نئے سہارے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ زندگی کا صحیح مشاہدہ، اس پر ایک صالح تنقید اور ان دونوں چیزوں کو خوش گوار انداز میں پڑھنے والوں کے سامنے پیش کر دینا۔ ان کی افسانہ نگاری کا اساس ان تین چیزوں پر ہے۔ اور یہ سہارے بجائے خود اتنے مستحکم ہیں کہ لکھنے والے کو کسی اور سہارے کی ضرورت ہی نہیں۔

بات چیت

مصنفہ بیگم صالحہ عابد حسین۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے
ملنے کا پتہ:۔ کتابی دنیا، لمیٹڈ، دہلی۔

یہ کتاب ان تیرہ تقریروں کا مجموعہ ہے جو بیگم صالحہ عابد حسین نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ کی تھیں۔ تقریروں کو مناسب عنوان کے ماتحت تین مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصہ (اپنی باتیں) میں میں نے لکھنا کیسے شروع کیا، استانی جی، عورت کے فرائض، تیمار داری، ہماری عید، بد مزاج بیوی، میل جول اور ہمارا اخلاق جیسے عنوانوں پر تقریریں ہیں۔ دوسرے حصہ (اپنوں کی باتیں) میں یہ تقریریں ہیں: اسلام میں عورت کے حقوق، حالی کے خطوط اور حالی کا اصلاحی ادب تیسرے حصہ (اوروں کی باتیں) کی تقریروں کے عنوان ہیں — مصطفےٰ کمال نے عورتوں کے لئے کیا کیا، خالدہ ادیب خانم اور عورتیں اور آزادی جمہوری ملکوں میں۔ ان سب تقریروں کی ایک سب سے بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ بات چیت کے انداز میں لکھی گئی ہیں اور پیرایۂ بیان بے حد دلنشین ہے اور دوسری خصوصیت یہ کہ ہر تقریر میں فکر کا وہ عنصر بھی شامل ہے جس کے بغیر بات چیت پُر تاثیر نہیں بنتی۔ مجموعی حیثیت سے یہ تقریریں عورتوں کے ادب میں مفید اضافہ ہیں۔

ظالم کسان

بچوں کی یہ چھوٹی سی کہانی شفیع الدین صاحب نیر نے لکھی ہے اور کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی نے شائع کی ہے۔

کہانی بچوں کے لئے دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ لیکن زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ ہر صفحہ بلاک بنوا کر چھپوایا گیا ہے اور کہانی کے ۹ صفحوں کے ساتھ ساتھ پورے صفحے کی چار بے حد جاذب نظر رنگین تصویریں ہیں۔ اردو پڑھنے والے بچوں کے لئے کتاب ایک نادر تحفہ ہے۔ کتاب کی قیمت گیارہ آنے بظاہر زیادہ ہے، لیکن کتاب پر جو کچھ خرچ کیا گیا ہوگا اسے دیکھتے ہوئے قیمت زیادہ نہیں۔

چاند کی شہزادی

افسانہ

فضل حق قریشی

[1]عرصہ دراز کی بات ہے، سنوگی نو میا کو نامی ایک بڈھا جاپان کے ایک دیہات میں رہتا تھا۔ وہ روزانہ جنگل سے بانس کاٹ کر شہر کے بازاروں میں بیچتا اور اس آمدنی پر گزارا کرتا تھا۔ ایک روز بانسوں کے جھنڈ میں اسے کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک حسین و جمیل چھوٹی سی لڑکی ہے۔ اس کا قد صرف چار انچ تھا۔ وہ اسے احتیاط سے اٹھا کر اپنے گھر بیوی کے پاس لے گیا۔ وہ لڑکی اس قدر نازک تھی کہ اسے ریشم کی ٹوکری میں لٹا کر پالنا پڑا۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی روز سے اس بنس کٹے کا روزگار چمکنے لگا۔ ہر دفعہ بانس کاٹنے پر اسے سونے چاندی کے ڈھیر ملنے لگے اور اس طرح وہ برابر دولت مند ہوتا چلا گیا۔

اس لڑکی کو ان سیدھے سادے لوگوں میں زندگی بسر کرتے مشکل سے تین مہینے گذرے ہوں گے کہ وہ ایک دم بڑھ کر جوان ہو گئی۔ اس کے سر کے بال بھی جو دونوں شانوں پر بکھرے رہتے تھے، خوب طویل ہو گئے اور اس لئے ضرورت ہوئی کہ جوڑا باندھ کر انھیں سر کی زینت بنا دیا جائے۔ بنس کٹے نے اس کا نام کاگویا ہیمے رکھ دیا جس کے لفظی معنی ہیں "میدانِ خزاں کا سید ھا تیتی بانس"۔ اور یہ اس لئے کہ وہ بانسوں کے جھنڈ میں سے ملی تھی۔ نام رکھنے کی رسم ادا کرتے وقت شاندار دعوت بھی کی گئی۔

کاگویا آس پاس کی تمام عورتوں میں سب سے زیادہ حسین تھی، اس لئے دعوت کے دوران میں سب کی نظر اس پر پڑی اور جلدی ہی اس کا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔ اس روز سے منچلے نوجوان اس کے گھر کے کاوے کاٹنے لگے اس آرزو میں کہ باغیچے کی باڑ سے جھانک کر اسے ایک نظر ہی دیکھ لیا کریں۔ لیکن ان کی یہ آرزو کبھی بر نہ آتی کیونکہ انھیں زیادہ نزدیک جانے کا موقع نہ ملتا اور غریب لوگ تو دور ہی سے دھتکار دئے جاتے تھے۔ تاہم پانچ مالدار عاشقوں نے ہمت نہ ہاری اور وہ مسلسل اپنی کوششوں میں سرگرداں رہے۔ یہ پانچوں شہزادے یعنی اشیزوکوری، کوراموچی، سداجن، چی اناگون اور موروتادا وہیں قرب و جوار میں رہتے تھے۔ وہ پورے ضبط و تحمل کے ساتھ زمانے کے سرد و گرم کو برداشت کرتے اپنے ارادے پر قائم رہے، یہاں تک کہ ایک روز وہ حرفِ مدعا زبان پر لائے اور بڈھے بنس کٹے سے کہا کہ اپنی لڑکی ہم میں سے کسی ایک کے ساتھ بیاہ دو۔ بڈھے نے صاف جواب دیا کہ وہ میری حقیقی بیٹی نہیں ہے اور اسی لئے اس کی شادی کے معاملے میں صرف میری رائے کوئی اہمیت نہیں رکھ سکتی۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئے لیکن پھر بھی کوئی مناسب موقع دیکھ کر بڈھے کے سامنے ذکر چھیڑتے رہے۔ آخر اس نے مجبور ہو کر کاگویا کی توجہ اس موضوع کی طرف مبذول کرائی اور اس سے کہا کہ تم جیسی حسین لڑکی سے شادی کر لینا، ان میں سے ہر شہزادے کے لئے باعثِ فخر ہے لیکن تمہیں اپنی پسند کے معاملے میں پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ اس پر وہ بولی کہ ان منچلے نوجوانوں پر بھروسہ کرنا مشکل ہے۔ پتہ نہیں، کس روز ان کا من میری طرف سے پلٹ جائے اور میں مایوسی کے دامن میں منہ چھپا کر روتی رہ جاؤں۔ اس لئے جب تک ان کو اچھی طرح آزما نہ لیا جائے، شادی کے لئے حامی نہیں بھری جا سکتی۔ آخر طے پایا کہ وہ صرف اس نوجوان سے شادی کرے گی جو اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر دے۔ یہ سن کر ان پانچوں کے مرجھائے ہوئے دل یکبارگی ہرے ہو گئے اور وہ سب کے سب خوب بن ٹھن کر خوشی کے شادیانے بجاتے اس کے گھر پہنچے تاکہ یہ معلوم کریں کہ آزمائش کی صورت کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ اس ہنگامے کا علم ہوتے ہی کاگویا باہر نکل آئی اور انھیں مخاطب کر کے بولی:۔

"شمالی ہندوستان کے شہر نخو کو میں پتھر کا بنا ہوا ایک کاسۂ گدائی موجود ہے جو کسی زمانے میں مہاتما بدھ کے پاس تھا۔ میں چاہتی ہوں کہ شہزادہ اشیزوکوری فوراً جائیں اور اسے لاکر میری خدمت میں پیش کریں۔ اور کوہ ہورائی کی چوٹی پر جو مشرقی سمندر پر سایہ فگن رہتا ہے، ایک سرسبز و شاداب درخت ہے جس کی جڑیں چاندی کے تاروں کی، تنا خالص سونے کا اور پھل سفید پکھراج کے ہیں۔ میں حکم دیتی ہوں شہزادہ کوراموچی کو کہ وہ فوراً جائیں اور اس کی ایک شاخ توڑ کر میرے پاس لے آئیں۔ اسی طرح سرزمین مورو کوشی کے لوگ ایسے چوہوں کے سمور سے پوشاک تیار کرتے ہیں جن پر آگ اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ شہزادہ سداجن وہاں سے ایک پوشاک لاکر بھیج دیں۔ اور شہزادہ چی اناگون قوسِ قزح کے رنگ کا وہ ہیرا میرے حضور میں پیش کریں جس کی چمک دمک اب تک اژدھے کے سر میں چھپی ہوئی ہے۔ اب رہ گئے شہزادہ موروتادا۔ وہ ان خوبصورت کوڑیوں کا ایک جوڑا لائیں جن کو ابابیلیں اپنی چونچوں میں اٹھا کر سمندر پار سے لاتی ہیں۔"

شہزادہ اشیزوکوری نے گھر جا کر غور و خوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک کاسۂ گدائی کی تلاش میں شمالی ہندوستان تک جانا محض حماقت اور ایک حد تک بے جا دردسری ہے۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ اس جیسا ایک جعلی کاسہ بنوا آنا یا کہیں سے حاصل کر لینا مناسب ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے ایسی صورت پیدا کی کہ کاگویا کو اس کے عزمِ سفر کا علم ہو گیا۔ درانحالیکہ وہ مکار شہر یاتو میں تین سال تک چھپا بیٹھا رہا اور اس اثنا میں شہر تو چی کی پہاڑی خانقاہ سے قدیم زمانے کا ایک پیالہ مل گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا اور زربفت کے ایک ٹکڑے میں لپیٹ کر مصنوعی پھولوں کے دستے کے ساتھ اپنی محبوبہ کے پاس بھیج دیا۔ لیکن جب

---

[1] یہ افسانہ جس کو جاپان کے ضمیاتی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے آج سے ہزار سال پہلے قلمبند کیا گیا تھا۔ مترجم

کاگویا نے اس میں نورِ سماوی کی کوئی جھلک نہ دیکھی تو اسے فوراً محسوس ہوگیا کہ وہ پیالہ مہاتما بدھ کا نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے اسی رائے کے ساتھ پیالہ واپس کردیا اور شہزادے کو مایوس ہوکر خاموش ہوجانا پڑا۔

شہزادہ کوراموچی بھی اتنا ہی مکار اور چالاک تھا۔ اس نے بھی لوگوں میں مشہور کرادیا کہ شہزادہ سیم وزر کے ایسے درخت کی تلاش میں سرزمینِ ہوکوشی کی جانب عازمِ سفر ہے جس میں پکھراج کے پھل لگتے ہیں۔ لیکن دراصل اس نے خاندانِ ادچیمارو کے چھ فنکار کی خدمات حاصل کیں اور اپنے ساتھ ان کی رہائش کا انتظام ایک ایسے دور افتادہ مکان میں کیا جہاں انسان کا گذر بڑی چیز ہے، پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ وہاں تنہائی میں رہ کر اس نے کاگویا کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق مصنوعی شاخ تیار کرائی شروع کی اور جب فنکاروں نے حسبِ منشا اسے بالکل مکمل کردیا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے کر کاگویا کی خدمت میں جا پہنچا اور شاخ پیش کرتے ہوئے اپنے سفر کے فرضی حالات بھی بیان کرتا رہا۔ کاگویا سکوت و استعجاب کے عالم میں سب باتیں سنتی رہی۔ شہزادے نے کہا کہ میں نے خوفناک سمندروں کو طے کرتے وقت محیر العقل جانوروں کا مقابلہ کیا اور بھوک پیاس کے صدمے برداشت کئے۔ نیز سوہانِ روح بننے والی بیماریوں میں مبتلا رہا تب کہیں گوہرِ مقصود ہاتھ آسکا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جب میں سمندر کے کنارے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو ایک ایسی سہ رنگ ندی کو بہتے دیکھا جس کی ایک لہر سنہری، ایک روپہلی اور ایک نیلگوں تھی اور عبور کرنے کے لئے سیپیوں کی پشت ہائے نگارین کے پل بنے ہوئے تھے۔ اسی ندی کے کنارے وہ درخت اگا ہوا تھا جس کی تفصیل آپ نے بیان کی تھی۔ میں نے فوراً ایک شاخ توڑ لی اور اب اسے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔ یہ کہانی اس خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی گئی تھی کہ کاگویا اسے سچ سمجھنے کے لئے مجبور ہوگئی اور ساتھ ہی اس کو شہزادے کے مصائب و آلام پر ترس بھی آنے لگا لیکن عین اس وقت جبکہ ان میں یہ گفتگو ہورہی تھی خاندان ادچیارو کے چھ فن کار دَرّانہ اندر گھس آئے اور شہزادے سے مصنوعی شاخ بنانے کی اجرت طلب کرنے لگے جو اس وقت تک ادا نہیں کی گئی تھی۔ اس انکشافِ حقیقت کو کاگویا نے غنیمت جانا اور فنکاروں کو اپنے پاس سے انعام دے کر رخصت کردیا۔ نیز وہ شاخ جو اصلی نہیں تھی، شہزادے کو واپس دے کر اسے بھی چلتا کردیا۔

سدائجن نے بھی وو کئی نامی ایک سوداگر کو جو اپنا سامانِ تجارت ساتھ لے کر موروکوشی کی جانب جا رہا تھا، تخلئے میں بلایا اور اس سے کہا کہ میری خاطر چوہوں کے سمور سے بنی ہوئی ایک ایسی پوشاک لیتے آنا جس پر آگ اثر انداز نہ ہوسکتی ہو۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد جب تجارتی جہاز واپس آیا تو شہزادے کو پوشاک مل گئی۔ اس لباس کا کیا کہنا۔ کپڑے کی زمین سمندر کے پانی کی طرح سبزی مائل نیلی تھی اور اس پر ابھرا ہوا سنہرا رواں عجیب بہار دکھا رہا تھا۔ اس کی نزاکت و رعنائی بھی لاجواب تھی۔ شہزادے کو اس سوداگر پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا، اس لئے اپنی کامیابی کا اسے پورا یقین ہوگیا اور اسی لئے وہ پوشاک کو کاگویا کی خدمت میں لے گیا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی لیکن ساتھ ہی اس کی آزمائش کو ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس نے فوراً آگ جلوائی اور لباس اس میں ڈال دیا۔ ایک دم شعلوں نے تیزی پکڑی اور وہ قیمتی پوشاک نذرِ آتش ہوگئی۔ یہ نتیجہ شہزادے کے لئے موجبِ الم لیکن کاگویا کے لئے باعثِ مسرت تھا۔ کیونکہ اس طرح وہ تیسرے مکار کے پھندے سے بچ گئی۔

شہزادہ چی اناگون نے بھی اپنے ہوا خواہوں کو جمع کیا اور اژدھے کے سر میں چھپے ہوئے ہیرے کا ذکر کرکے اسے حاصل کرنے کی تدبیر معلوم کرنی چاہی۔ دوستوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور کہا کہ آپ کو اس مہم پر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کام کو بخوشی انجام دیں گے۔ چنانچہ شہزادہ انھیں رخصت کرکے اپنے محل کی آرائش و تزئین کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس نے تمام دیواروں پر نئے رنگ و روغن سے بیل بوٹے بنوائے چھتوں اور محرابوں میں جھاڑ فانوس لٹکوائے، ستونوں پر سنہرے روپہلے کپڑے کی پٹیاں لپٹوائیں اور فرش کو بھی رنگین ٹائلوں سے دوبارہ زیب بنادیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر اس نے لوگوں کی واپسی کا انتظار شروع کیا کہ کب وہ لوٹیں اور وصلِ محبوب کے مزے حاصل ہوں۔ انتظار کی یہ گھڑیاں اس کے لئے بہت ہی کٹھن تھیں۔ آخر جب صبر نہ ہوسکا تو وہ خود ننا ہوا کے ساحل تک گیا۔ ملاحوں سے یہ پوچھنے کے لئے کہ وہ لوگ جو اژدھے کی تلاش میں کشتیاں لے کر گئے تھے، واپس آگئے یا نہیں۔ لیکن یہ سن کر اسے تعجب ہوا کہ کسی شخص نے اس مقصد کے لئے ایک بھی کشتی کرائے پر نہیں لی۔ آخر وہ خود اس مہم پر روانہ ہوگیا۔ اس کی روانگی کے فوراً ہی بعد برق و رعد کے دیوتا کی ناراضگی زمین و آسمان کے درمیان تہلکہ مچانے لگی چمک اور گڑگڑاہٹ کے علاوہ ہوا کی رفتار تیز ہوئی اور سمندر کی لہریں بری طرح سر اٹھانے لگیں۔ چند دن میں جب یہ طوفان بڑھنے لگا اور ڈوبنے کی نوبت آگئی تو کشتی کے ناخدا نے کہا کہ ہوا کا زور، موجوں کا شور، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک صاف بتا رہی ہے کہ آسمان کے دیوتا اس لئے ناراض ہیں کہ ایک انسان نے سمندر کے اژدھے کو قتل کرنے کے لئے کمر کس رکھی ہے جبکہ وہ اژدھا بجائے خود ایک دیوتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم فوراً توبہ کرو اور اپنی سلامتی کی دعا مانگو۔ شہزادے نے اپنی غلطی تسلیم کی اور فوراً ہزار بار دعا مانگنے کے لئے ہاتھ اٹھائے ساتھ ہی قسم کھائی کہ آئندہ اس ارادے سے باز رہوں گا۔ اس کی دعائیں قبول ہوگئیں اور طوفان کا زور ختم ہوگیا لیکن ان ناگوار اثرات سے اس کا جسم زخمی اور روح مضمحل ہوگئی۔ تاہم غنیمت ہے کہ وہ اپنے وطن پہنچ گیا۔ تب اس کے دوست احباب بھی آئے اور ہیرے کی تلاش میں اپنی ناکامی کی داستان

سنانے لگے۔ شہزادے نے حرفِ شکایت زبان پر لانے کی بجائے ان کو یقین دلایا کہ بہتری اسی میں رہی ورنہ وہ بھی مریضِ جسم و جاں ہو کر لوٹتے۔ اس نے کہا کہ کاگویا کا دلی منشا ہماری تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس لئے آئندہ میں اس ظالم عورت کی طرف رخ بھی نہیں کروں گا۔ چنانچہ عشق کا بھوت اسکے سر سے اتر گیا اور وہ اس محل کی طرف سے لاپروا ہو گیا جسے بڑی محنت سے سجایا تھا حتیٰ کہ چڑیاں دیواروں پر ٹنگے ہوئے زرلفت کے پردوں کے سنہرے تار نکال نکال کر اپنے گھونسلوں میں لے گئیں اور اس نے مطلق پروا نہیں کی۔

پانچویں شہزادے صاحب بھی اسی طرح ناکام رہے۔

اس کے بعد کاگویا کے حسن و جمال کی شہرت سینہ بہ سینہ ہو کر دربارِ شاہی تک پہنچ گئی اور شہنشاہ نے اسے ایک نظر دیکھ لینے کے لئے اپنے حرم کی ایک معتبر خاتون فوساگو کو روانہ کیا کہ وہ جا کر بنس کٹے کی لڑکی کو دیکھے اور صورتِ حالات سے مطلع کرے۔ لیکن جب وہ خاتون وہاں پہنچی تو کاگویا نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ لہٰذا وہ مایوس ہو کر واپس چلی گئی اور شہنشاہ سے اپنی ناکامی کا حال بیان کر دیا۔ وہ کاگویا کے اس روکھے پن پر ناراض نہیں ہوا بلکہ ایک بار اور قسمت آزمائی کے خیال سے بنس کٹے کو دربار میں بلا بھیجا اور یہ بھی کہلوا دیا کہ اپنی لڑکی کو ساتھ لیتے آنا تاکہ اگر ممکن ہو سکے تو تم کو شاہی خلعت فاخرہ سے سرفراز کیا جا سکے۔ بنس کٹا اگرچہ شاہی انعامات کا خواہاں تھا اور انہیں حاصل کر لینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا تاہم وہ فطرتاً نیک مزاج تھا اور باپ ہونے کے لحاظ سے اپنے فرائض کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اسلئے اس نے اپنی متبنّٰی لڑکی پر کوئی ناجائز دباؤ ڈالنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ بادشاہ کا پیغام سنا کر اس سے مشورہ کر لینا کافی جانا۔ کاگویا نے جواب دیا کہ مجھے دربار میں حاضری دینے سے اس لئے تامل ہے کہ وہاں جاتے ہی میری موت یقینی ہے اور اگر تم اپنے انعامات کی خاطر مجھے قربان کر دینا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں وہاں چلی جاؤں گی۔ اس کے باپ کو اس بیان سے رنج ہوا لیکن اس نے یہی فیصلہ شہنشاہ کے گوش گذار کر دیا۔

شہنشاہ نے اس دوسری ناکامی پر بھی ہمت نہ ہاری اور فوراً شاہی شکار کے انتظامات شروع کرا دئے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بہانے بنس کٹو کے مکان کی طرف سے گذرے اور لڑکی کو ایک نظر دیکھ لے۔ چنانچہ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ جب اس نے کمرے میں قدم رکھا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ایک آسمانی نور کی تابشوں سے جگمگا رہا ہے اور وہ نور صرف کاگویا کے جسم خصوصاً چہرے کا پرتو ہے۔ جب وہ قریب پہنچا تو لڑکی نے اپنے کمونو کی آستینوں سے منہ چھپا لیا اور شہنشاہ کو اپنے خد و خال اچھی طرح دیکھنے نہ دئے۔

شہنشاہ نے جو ایک ہی جھلک دیکھ کر بے تاب ہو گیا تھا۔ فوراً شاہی پالکی منگائی تاکہ اسے بٹھا کر محل میں لے جائے لیکن پالکی کے آتے ہی کاگویا سب کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس غیر معمولی کرشمے پر بادشاہ نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ وہ زنِ ارضی نہیں ہے بلکہ مخلوقِ سماوی سے تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا اس نے یہ سمجھ کر کہ وہ نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود وہیں کمرے میں کھڑی ہوئی ہے، اسے مخاطب کر کے کہا۔ "اے بے مثل حسینہ! اگر تو میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہے تو نہ سہی لیکن تو اپنی اصل حالت پر ضرور آجا تاکہ میں تیرے جمالِ بے نظیر کی ایک جھلک اور دیکھ لوں"۔ کاگویا دوبارہ انسانی صورت میں جلوہ گر ہو گئی لیکن بادشاہ کو بے نیل و مرام جانا پڑا۔

اس واقعہ کے تین سال بعد موسم بہار کے شروع ہوتے ہی کاگویا نے مستقل طور پر چاند کو نظر جما کر دیکھنا شروع کر دیا اور جب ساتویں مہینے کی چودھویں رات آئی تو اس کا دلی رنج و غم جو آتشِ خاموش کی مانند سینے کے نیچے چھپا ہوا تھا سیلاب اشک بن کر نمودار ہونے لگا۔ اس کی حالتِ زار اتنی قابلِ رحم ہو گئی کہ گھر کی کنیزیں بھی اسے دیکھ دیکھ کر رونے لگیں۔ بنس کٹے کے استفسار پر اس نے بتایا کہ مجھے چاند کے عمیق مطالعے سے دنیا کی تباہی کا اندازہ ہو رہا ہے اور اسی لئے میں آنسو بہا رہی ہوں۔

چاند کے آٹھویں مہینے کے شروع میں اس نے اپنی کنیزوں کو بتایا کہ میں آفریدۂ ارضی نہیں ہوں بلکہ دنیائے قمر کا صدر مقام میرا وطنِ مالوف ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ میں اس کرۂ ارض کو چھوڑ کر وہاں واپس چلی جاؤں۔ اس خبرِ وحشت اثر نے صرف کاگویا کے فرضی باپ ہی کو غمگین و ملول نہیں کیا بلکہ شہنشاہ بھی اس صدمہ کی بنا پر سخت پریشان ہو گیا اور جب اسے بتایا گیا کہ اگلے مہینے کی چودھویں تاریخ کو ایک جماعت اسے واپس لے جانے کے لئے اس کرۂ نور و ضیا سے اس ظلمت کدہ دہر پر اترے گی تو اس نے اپنے محافظ دستے کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ہتھیار بند ہو کر کاگویا کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیں اور جب چاند کے رہنے والے نظر آئیں تو فوراً تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دیں تاکہ انہیں گھبرا کر بے نیل و مرام لوٹ جانا پڑے۔

یہ انتظامات دیکھ کر کاگویا نے بتایا کہ اس قسم کے محاصرے بالکل بے سود ہیں۔ باشندگانِ قمر کو تیروں کی بارش کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیگی بلکہ ان کے وارد ہوتے ہی ہر بند دروازہ خود بخود کھل جائے گا اور کسی بھی تیر انداز میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ وہ اپنی کمان کا چلّہ چڑھا کر ان پر حملہ کر سکے۔ محافظ دستے کے سپاہی اس بیان سے ناراض ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم ان بدتمیزوں کو آنِ واحد میں گھائل و مجروح کر کے رکھ دینگے۔

حتیٰ کہ اس مقررہ رات کی وہ گھڑی نزدیک آپہنچی جس کا سب کو انتظار تھا۔ محافظ دستے کے سپاہی جو مکان کے چاروں طرف دور دور تک پہرا لگائے بیٹھے تھے، فوراً ہوشیار اور چوکنے ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چاند ستاروں کی ضیا بتدریج اتنی زیادہ ہوتی جا رہی ہے کہ تمام دنیا بقعۂ نور بن گئی ہے اور ابھی اس لمعہ افروزی کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ عجیب و غریب قسم کے بادل کا ایک بڑا ٹکڑا نمودار ہوا جس پر باشندگانِ قمر پوری تابانیوں کے ساتھ رونق افروز تھے۔ انہیں دیکھتے ہی کسی سپاہی میں اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی اور ان کے دلوں نے جو کسی قدر رک رک کر حرکت کر رہے تھے گواہی دی کہ مقابلہ کی طاقت موجود نہیں ہے۔ بادل کی وسیع سطح پر ایک شاندار گاڑی رکھی تھی جس پر ایک زرکار چھتر لگا ہوا تھا اور کھڑکیوں پر زربفت کے ایسے پردے آویزاں تھے جن کی مثال دنیا میں کہیں بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ گاڑی کے اندر سے ایک گرجدار آواز سنائی دی "ادھر آؤ، میاکو مارو!"۔

اور جب بنس کٹا اس حکم کی تعمیل میں لرزتا کپکپاتا قریب پہنچا تو اس کو دوسرا حکم ملا کہ کاگویا کو بلاتاخیر روانگی کے لئے تیار کردو اور ساتھ ہی اسی آواز میں کاگویا کو مخاطب کرکے کہا گیا "اے ملکۂ قمر! آخر کب تک آپ اس دارالمحن میں اپنی زندگی خراب کرتی رہیں گی"۔

فوراً اندرونی اور بیرونی تمام دروازے کھل گئے اور کاگویا اپنی سہیلیوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں باہر نکل آئی۔ اس نے اپنے باپ کو مخاطب کرکے کہا: "اگر میں نے اسی کرۂ ارض پر جنم لیا ہوتا تو میں آپ کو رنج و غم کے عالم میں چھوڑ کر کہیں بھی جانا پسند نہ کرتی۔ لیکن اب مجبوری ہے اور مجھے چاند میں واپس جانا ہی پڑے گا جہاں سے شہابِ ثاقب کی مثال اس دنیا میں آئی تھی۔ میں اپنا نقاب بطور یادگار چھوڑے جاتی ہوں تاکہ اسے دیکھکر آپ اپنا دل ٹھنڈا کر لیا کریں"۔

پھر اس نے شہنشاہ کے نام ایک خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا۔

"عالیجاہ! آپ نے کوشش کی کہ کسی طرح باشندگانِ قمر کو گھائل کرکے میری روانگی میں رخنہ پیدا کر دیں لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ میں عالیجاہ کی کوئی خدمت انجام نہ دے سکی۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسی دنیا میں رہ جاتی۔ اب آسمانی نمائندے مجھے لینے کے لئے آگئے ہیں اور مجھے ان کے ساتھ جانا ہی پڑے گا۔ آپ بھول کر بھی یہ خیال دل میں نہ لائیں کہ میں جان بوجھ کر احکام شاہی کی خلاف ورزی کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ یہ الفاظ آپ کی بارگاہ میں پہنچکر میری طرف سے صفائی پیش کر سکیں گے۔ میں انہیں قلمبند کرتے وقت دلی رنج محسوس کر رہی ہوں"۔

یہ خط بھیجکر اس نے وہ آبِ حیات پیا جسے باشندگانِ قمر اپنے ساتھ لائے تھے اسکے زیرِ اثر وہ دنیا کی تمام باتوں سے خالی الذہن اور ساتھ ہی غیر فانی ہو گئی۔ اس نے پروں کا بنا ہوا ایک حلۂ آسمانی بھی پہنا اور گاڑی میں جا بیٹھی۔ اس کے سوار ہوتے ہی بادل کے ٹکڑے میں حرکت ہوئی اور وہ آسمان کی طرف اٹھتا چلا گیا۔

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱- میں نظم ـــــــ پنڈت آنند نرائن ملا۔
۲- پنڈت آنند نرائن ملا (مع تصویر) ـــ پروفیسر سید احتشام حسین
۳- ماں (افسانہ) ـــــــ جناب شفیع انصاری
۴- غزل ـــــــ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی
۵- ترکی کا آئین ـــــــ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
۶- چینی موسیقی ـــــــ جناب شاہد احمد دہلوی
۷- ایک پرانی صحبت ـــــــ نواب خواجہ عبدالمجید
۸- سواد (افسانہ) ـــــــ جناب مسلم جالندہری
۹- جنگ عظیم سے پہلے کی کہانیاں ـــ محترمہ حمیدہ سلطان
۱۰- ان کی ذات (افسانہ) ـــــ محترمہ سیتہ دتی ملک
۱۱- نفسیاتی گتھیاں اور اردو شاعری- جناب مرزا عابد عباس
۱۲- صحرا میں پھول (افسانہ) ـــــ جناب اکمل قاسمی
۱۳- شیر افگن کا قتل ـــــ جناب شبیر حسن
۱۴- عربوں کا ذوق علمی ـــــ جناب عبید محمد زبیر

مضامین دلی پرنٹنگ پریس میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۶۶ سے شائع کیا

ڈیم نائٹ اکیڈیمی کی ایک تصویر پر کام کرنے کیلئے تیار ہو رہی ہیں۔
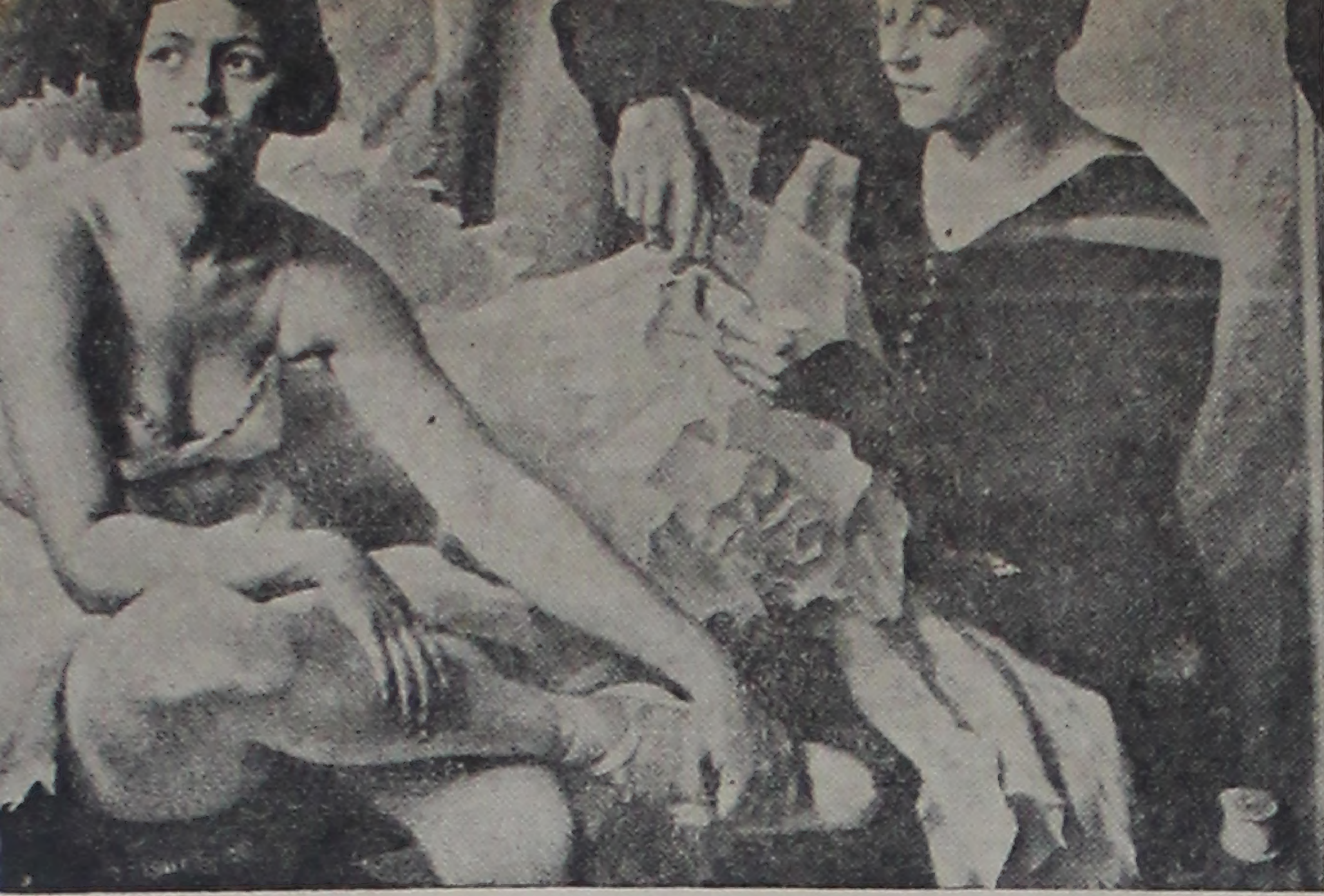
ڈیم لورا نائٹ کی مصوری کا ایک خصوصی نمونہ جس میں ... کی رقاصہ اپنے نمبر پر ناچنے کے لئے تیار ہو رہی ہے۔

ایک ممتاز مصورہ - لورانائٹ

لورا نائٹ بلا شبہ برطانیہ کی سب سے بڑی مصورہ ہے۔ جن تکلیفوں میں رہ کر لورانائٹ کو کام کرنا پڑا ہے انہیں دیکھتے ہوئے انکی کامیابی حیرت انگیز ہے۔ انہوں نے پوری خود اعتمادی اور اولوالعزمی سے اپنے کام کو جاری رکھا اور اس فن کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرتی رہیں۔ یہ الفاظ لورانائٹ کے فنی مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ایک آرٹسٹ کا یہ مشن ہے کہ وہ دنیا کو غیر محسوس طریقہ پر پہلے سے بہتر بنائے اور دیکھنے والے آرٹسٹ کی نظر میں اپنے احساسات کی تصویر دیکھ سکیں۔ دنیا ان گنت پوشیدہ حسن سے بھری ہوئی ہے۔ جو کوئی اس حسن کو اسکے اصلی مفہوم میں دیکھتا ہے وہ گویا اس حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میری آنکھوں میں بصارت پیدا ہو جائے اور میں چیزوں کو اس نظر سے دیکھنا سیکھ جاؤں۔

لورا نائٹ کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد اس کا باپ چل بسا اور اسکی ماں سکول کے بچوں کو آرٹ کی تعلیم دیکر گزارہ کرتی رہی۔ لورا بھی اسی سکول میں پڑھتی تھی فرانس کی ایک آنٹ نے خاکہ کشی اور مصوری کے کام میں اسکی ہمت بڑھائی۔ جب وہ چودہ سال کی ہوئی تو اس کی ماں بھی چل بسی۔ اب اسے اپنی اور اپنی بہن کیلئے روزی کمانی پڑی۔

اگرچہ وہ لڑکی تھی لیکن وہ اپنی ماں کے کچھ شاگردو... کو پڑھاتی رہی اسے اس حسد کا بھی مقابلہ کرنا پڑا جو ک... عورت کے فن کار ہوجانے پر لوگوں کے دل میں پیدا ہو ج... ہے۔ ۱۹۰۳ء میں اسکو پہلی کامیابی نصیب ہوئی جبکہ را... اکیڈیمی کی نمائش میں اسکی تصویر لٹکائی گئی۔ اسی س... اس نے ایک مصور سے شادی کی۔ چند ہی سالوں میں ا... ایسے ایسے اعزاز حاصل ہوئے جو عورتوں کو نہ ملے تھے...

لورانائٹ دوسری عورت تھی جو رائل اکیڈیمی ک... ایک رکن بنی اور ۱۹۳۶ء میں رائل اکیڈیمین ہو... اس سے بھی بڑا اعزاز حاصل کیا۔

مشہور مصورہ 'سرکس' کی معروف تصاویر پر کام میں لگی ہوئی ہے۔ ←

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی۔ چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی۔ فارسی) (اردو۔ ہندی) (پشتو۔ روسی) (برمی۔ رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)		ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں ۔ ایک سو اسی صفحات ۔ دو نقشے ۔ کپڑے کی جلد ۔ قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) ۔

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) ۔

خاص رعایت «عربی ۔ انگریزی جملے» نوے صفحات ۔ گتے کی جلد ۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ۔ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ۔

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد ۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) ۔

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ ۔ دھلی

A UNITED PUBLICATION, Delhi. Regd. No. L. 4785